افلا یتدبرون القرآن

تدبرِ قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

یونس ۱۰ — مریم ۱۹

تدبرِ قرآن

۲۹

العنکبوت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

اس سورہ کا آغاز ان لوگوں کو مخاطب کر کے ہوا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے جرم میں ستائے جا رہے تھے۔ خاص کر نوجوان اور غلام، سورہ کے نزول کے دور میں، اپنے باپوں اور آقاؤں کے ہاتھوں بڑی سخت آزمائش کے دور سے گزر رہے تھے۔ قدرتی طور پر اس صورت حال نے کمزور ارادے کے لوگوں کے اندر بہت سے سوالات قرآن اور رسولؐ کی صداقت سے متعلق پیدا کر دیے۔ جن کا برمحل جواب دیا جانا ضروری ہوا تاکہ مظلوموں اور کمزوروں کی ہمت افزائی بھی ہو اور جو لوگ خدا کی ڈھیل کو اپنی فتح سمجھ کر ظلم و ستم میں بالکل بے باک ہوتے جا رہے تھے ان کو بھی تنبیہ ہو۔

حالات کے تقاضے سے اس میں ہجرت کی طرف بھی اشارات ہیں اور مظلوم مسلمانوں کو یہ رہنمائی دی گئی ہے کہ انھیں بہر حال ظلم کے آگے سپر نہیں ڈالنی چاہیے۔ اگر حق کی خاطر انھیں اپنے وطن کو چھوڑنا پڑ جائے تو اس کے لیے بھی انھیں تیار رہنا چاہیے۔ نہ خدا کی زمین تنگ ہے اور نہ اس کے خزانۂ رزق میں کمی ہے۔ جو لوگ خدا کی راہ میں ہجرت کریں گے خدا ان کے لیے خود اپنا دامنِ رحمت پھیلائے گا اور ان کی ساری ضروریات کا کفیل ہو گا۔

پچھلی سورہ میں اہل کتاب کی مخالفت کی طرف بعض اشارات گزرے ہیں۔ اس سورہ میں ان کی مخالفت کھل کر سامنے آگئی ہے اس وجہ سے مسلمانوں کو یہ رہنمائی بھی دی گئی ہے کہ اہل کتاب کے ساتھ بحث میں ان کو کیا روش اختیار کرنی چاہیے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۷) اس حقیقت کی طرف اشارہ کہ حق کی راہ میں آزمائشیں لازماً پیش آتی ہیں۔ یہی پہلے بھی ہوا ہے اور یہی آئندہ بھی ہو گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سنت ہے۔ اسی سے مومن و منافق میں امتیاز ہوتا ہے۔ البتہ آج جن لوگوں کو اللہ نے ڈھیل دے رکھی ہے وہ اس بات کو یاد رکھیں کہ وہ خدا کی گرفت سے باہر نہیں نکل سکتے اور جو لوگ ظلم و ستم کا ہدف بنے ہوئے ہیں وہ یہ یقین رکھیں کہ آج ایمان کی راہ میں جو دکھ وہ جھیل رہے ہیں ان سے کہیں بڑھ کر وہ اس کا صلہ پانے والے ہیں۔

(۸-۱۳) والدین اور بزرگوں کی اطاعت کے حدود کی وضاحت کہ ان کی اطاعت خدا کی اطاعت کے تحت

ہے اس وجہ سے اگر کسی کے ماں باپ اس سے خدا کی نافرمانی کا مطالبہ کریں تو اس معاملے میں ان کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ خدا کے ہاں کوئی دوسرے کے اعمال کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ ہر شخص کو اپنے اعمال کی جواب دہی خود کرنی ہے۔

(۱۴-۴۰) حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ اور مدین، عاد، ثمود، قارون، فرعون اور ہامان کے واقعات کی طرف اجمالی اشارہ جس سے مقصود انہی باتوں کو تاریخ کی روشنی میں مدلل کرنا ہے جو تمہید میں مذکور ہوئی ہیں۔ یعنی

— حق کی راہ میں امتحان کے مراحل سے گزرنا اللہ تعالیٰ کی ایک مقرر کردہ سنت ہے۔

— حق کے مقابل میں رشتوں، قرابتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ سب سے بڑا حق اللہ کا ہے۔

— جو لوگ اللہ کے بندوں اور بندیوں کو فتنوں میں ڈالتے ہیں وہ خدا کی گرفت سے باہر نہیں جا سکتے۔

(۴۱-۴۵) ان لوگوں کے زور و اثر کی تمثیل جو دوسرے سہاروں کے بل پر خدا کے حریف بن کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ فرمایا کہ ان لوگوں کی تمام سعی و تدبیر کی مثال مکڑی کے جالے کی ہے جس سے زیادہ کمزور اور بے بنیاد تعمیر کوئی بھی نہیں ہے۔ ان کے مزعومہ شرکاء و شفعاء کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ دنیا کوئی بازیچۂ اطفال نہیں ہے بلکہ ایک غایت و حکمت کے ساتھ خدا نے اس کو بنایا ہے اور وہ غایت و حکمت ایک دن لازماً ظہور میں آئے گی۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ تم تمام مخالفتوں سے بے پروا ہو کر لوگوں کو اللہ کی کتاب سناؤ اور نماز کا اہتمام کرو۔ اسی نماز کے اندر اہل ایمان کے لیے تمام شرور و آفات سے امان اور یہی طاقت کا اصل خزانہ ہے۔

(۴۶-۵۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر اہل کتاب کے بعض اعتراضات کا جواب۔ ان کے ساتھ بحث میں مسلمانوں کو جو روش اختیار کرنی چاہیے اس کی ہدایت۔ اچھے اہل کتاب کی تحسین۔ جو لوگ کسی معجزہ کا مطالبہ کر رہے تھے ان کو جواب۔

(۵۳-۵۵) عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں کو جواب اور اس بات میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہے اس کی وضاحت۔

(۵۶-۶۰) جو مسلمان ایمان لانے کے جرم میں کفار کے ہاتھوں ستائے جا رہے تھے ان کو ہجرت کی ہدایت اور دنیا و آخرت دونوں میں ان کو فوز و فلاح کی بشارت۔

(۶۱-۶۹) خاتمۂ سورہ جس میں خود مشرکین کے مسلمات سے ان پر توحید کے باب میں حجت تمام کی گئی ہے اور ساتھ ہی ان کو ملامت کی گئی ہے کہ اس سرزمین میں تمہیں امن و رفاہیت تو خدا کے حرم کی بدولت حاصل ہوئی لیکن تم خدا کی نعمت کی ناشکری کر رہے ہو اور عین خدا کے حرم میں بیٹھ کر اپنے خود تراشیدہ معبودوں کے گن گا رہے ہو۔ ان کی اس ناشکری کا جو انجام ان کے سامنے آنے والا ہے اس کا بیان اور اہل حق کو خدا کی مدد و نصرت کی بشارت جو اس تاریک ماحول میں حق کا نور پھیلانے کے لیے جد و جہد کر رہے تھے۔

سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوْتِ (۲۹)

مَكِّيَّةٌ — اٰيَاتُهَا ۶۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۝١ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ آیات ۱-۱۳
لَا يُفْتَنُوْنَ ۝٢ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ
اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝٣ اَمْ حَسِبَ
الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝٤
مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاۗءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ
الْعَلِيْمُ ۝٥ وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ
عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝٦ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ
عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝٧
وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۭ وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ
مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۭ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝٨ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ
فِي الصّٰلِحِيْنَ ۝٩ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ

فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ۖ وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ
مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۚ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ
صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠﴾ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ
الْمُنٰفِقِيْنَ ﴿١١﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا
وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ
اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿١٢﴾ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ۡ
وَلَيُسْئَلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿١٣﴾ ع ۱۳ ۱۲

ترجمہ آیات ۱ - ۱۳

یہ الٓـمّٓ ہے۔ کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ محض یہ کہہ دینے پر چھوڑ دیے
جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہیں جائیں گے؟ اور ہم نے تو ان لوگوں کو بھی
آزمایا جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ سو اللہ ان لوگوں کو ممیز کرے گا جو سچے ہیں اور جھوٹوں
کو بھی ممیز کر کے رہے گا۔ ۱ - ۳

کیا جو لوگ برائیوں کا ارتکاب کر رہے ہیں وہ گمان رکھتے ہیں کہ ہمارے قابو سے باہر
نکل جائیں گے! بہت ہی برا فیصلہ ہے جو وہ کر رہے ہیں! جو اللہ کی ملاقات کا متوقع ہے
وہ اطمینان رکھے کہ اللہ کا مقرر کردہ وقت ضرور آ کے رہے گا اور وہ سننے والا جاننے والا
ہے۔ اور جو ہماری راہ میں جدوجہد کر رہا ہے تو وہ اپنے ہی فائدے کے لیے جدوجہد کر رہا
ہے۔ اللہ عالم والوں سے بے نیاز ہے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال
کیے تو ہم ان کی برائیاں ان پر سے جھاڑ دیں گے اور ان کو ان کے عمل کا بہترین بدلہ دیں گے۔
اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت کی۔ اور اگر وہ تجھ

پر زبا ؤ ڈالیں کہ تو کسی چیز کو میرا شریک ٹھہرا جس کے بارے میں تجھے کوئی علم نہیں، تو ان کی بات نہ مان۔ میری ہی طرف تم سب کی واپسی ہے تو جو کچھ تم کرتے رہے ہو میں اس سے تمھیں آگاہ کروں گا اور جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے تو ہم ان کو صالحین کے زمرہ میں داخل کریں گے۔ ۸-۹

اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں، جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے لیکن جب اللہ کی راہ میں انھیں دکھ پہنچتا ہے تو وہ لوگوں کے پہنچائے ہوئے دکھ کو خدا کے عذاب کے مانند قرار دے بیٹھتے ہیں اور اگر تمھارے رب کی طرف سے کوئی مدد ظاہر ہوگی تو کہیں گے کہ ہم تو آپ لوگوں کے ساتھ تھے۔ کیا لوگوں کے دلوں میں جو کچھ ہے اللہ اس سے اچھی طرح باخبر نہیں ہے! اور اللہ ایمان والوں کو بھی ممیز کر کے رہے گا اور منافقوں کو بھی ممیز کر کے رہے گا۔ ۱۰-۱۱

اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہماری راہ پر چلتے رہو، ہم تمھارے گناہوں کا بوجھ اٹھا لیں گے۔ حالانکہ وہ ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی اٹھانے والے نہیں بنیں گے۔ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ اور یہ لوگ اپنے گناہ لادے ہوئے ہوں گے اور اپنے گناہوں کے ساتھ کچھ اور بوجھ بھی۔ اور جو افتراء وہ کر رہے ہیں قیامت کے دن اس کی بابت ان سے پرسش ہونی ہے۔ ۱۲-۱۳

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓمّٓ ۚ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (۱-۲)

'الٓمّٓ'، اس سورہ کا نام ہے۔ اس کی تحقیق سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

راہِ حق میں آزمائشیں لازماً پیش آتی ہیں

'اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ الآیۃ'، بات اگرچہ عام صیغہ سے فرمائی گئی ہے لیکن اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو مکی پُرمحن زندگی سے گھبرا اٹھے تھے۔ بعض لوگ اسلام میں داخل تو ہو گئے تھے لیکن ان کو اس راہ کی

صعوبتوں کا اندازہ نہیں تھا۔ ان کو گمان تھا کہ جب انھوں نے نیکی کی راہ میں قدم رکھا ہے تو راہ ہموار ملے گی اور وہ ٹھنڈی سڑک سے منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں گے۔ ان لوگوں کو جب کفار کے ہاتھوں زہرہ گداز مصائب سے سابقہ پیش آیا تو ان کے قدم ہل گئے اور اس طرح کے حالات میں خام ذہن کے لوگوں کو جس طرح کے شبہات لاحق ہوتے ہیں ان کے ذہنوں میں بھی اسی قسم کے شبہات پیدا ہونے لگے۔ مثلاً یہ کہ اگر یہ اللہ کا راستہ ہے تو یہ اتنا دشوار گزار کیوں ہے؟ اگر اس کی دعوت دینے والے اللہ کے رسول ہیں تو ان پر ایمان لانا اتنا جان جوکھم کا کام کیوں ہے؛ ہم جب اللہ کے کام کے لیے اٹھے ہیں تو ہم دین کی خدمت کر رہے ہیں، پھر ہماری راہ میں یہ رکاوٹیں اور یہ اڑنگے کیوں ڈال دیے گئے ہیں! اس طرح کے سوالات کا پیدا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لوگ راہِ حق اور اس کے تقاضوں سے اچھی طرح آشنا نہیں تھے اور نہایت آسانی سے نفاق کے فتنہ میں مبتلا ہو سکتے تھے۔ اس سورہ میں سب سے پہلے انہی لوگوں کی بیماری کی طرف توجہ فرمائی گئی۔ ارشاد ہوا کہ اگر لوگوں نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ وہ ایمان کا دعویٰ کریں گے اور پھر ان کے اس دعوے کی بنا پر ان کا نام مومنین صادقین کے رجسٹر میں درج ہو جائے گا، ان کے کھرے کھوٹے ہونے کی کوئی جانچ نہیں ہوگی، تو یہ انھوں نے نہایت غلط سمجھا تھا۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ (۳)

یہ اللہ تعالیٰ نے نہایت مؤکد الفاظ میں اپنی اس سنت کی یاد دہانی فرمائی جس سے ان لوگوں کو لازماً سابقہ پیش آتا ہے جو ایمان و اسلام کا دعویٰ لے کر اٹھتے ہیں۔ فرمایا کہ ان لوگوں سے پہلے جو لوگ یہ دعویٰ لے کر اٹھے ہم نے ان کو بھی آزمائشوں میں ڈال کر ان کا امتحان کیا، اسی طرح ان کا بھی امتحان کریں گے۔ یہ اشارہ پچھلے رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کی طرف ہے۔ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ یعنی اگر یہ امتحان نہ ہو تو آخر یہ کس طرح ثابت ہوگا کہ کون اپنے دعوے میں سچا ہے، کون جھوٹا ہے؟ اس وجہ سے اللہ لازماً راست بازوں اور جھوٹے مدعیوں میں امتیاز کرے گا۔ 'عِلْم' یہاں تمیز و معین کرنے کے معنی میں ہے۔ اس کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے اور صیغہ یہاں وہ استعمال ہوا ہے جو تاکید کے لیے آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک مقررہ سنت ہے اس وجہ سے یہ کسی کو ناگوار ہو یا گوارا بہر حال اس امتحان سے ہر ایک کو گزرنا ہے۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے علم کا تعلق ہے وہ ہر چیز کو محیط ہے۔ وہ ہر ایک کے باطن سے اچھی طرح باخبر ہے کہ کون مخلص ہے اور کون منافق، لیکن وہ لوگوں کے ساتھ جزا و سزا کا معاملہ مجرد اپنے علم کی بنیاد پر نہیں کرتا بلکہ لوگوں کے عمل کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اس وجہ سے وہ ہر ایک کو امتحان میں ڈال کر پرکھتا ہے اور اسی امتحان سے ہر ایک کے مدارج معین ہوتے ہیں۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۴)

شریروں کو تنبیہ

ایمان کا دعوے کرنے والوں کو تنبیہ کرنے کے بعد یہ ان لوگوں کو بھی متنبہ فرمادیا جو کمزور مسلمانوں کو ظلم وستم کا ہدف بنائے ہوئے تھے۔ فرمایا اگر ان لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ یہ اسی طرح ظلم وستم کرنے کے لیے چھوڑے رکھے جائیں گے اور کبھی ہماری گرفت میں نہیں آئیں گے تو ان کا یہ گمان بالکل غلط ہے۔ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ اگرچہ لفظاً عام ہے لیکن اشارہ انہی ناہنجار لوگوں کی طرف ہے جو بے بس مسلمانوں پر ظلم ڈھا رہے تھے اور خدا کی ڈھیل سے شہ پا کر دن پر دن دلیر ہوتے جا رہے تھے۔ فرمایا کہ یہ لوگ اگر اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ خدا اسی طرح ان کو ڈھیل دیے رکھے گا تو وہ بڑی سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ۔ یعنی ان کا یہ فیصلہ خدا کے بارے میں نہایت برا فیصلہ ہے۔ خدا کو اگر انھوں نے کمزور سمجھا ہے کہ وہ ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا جب بھی ان کا یہ فیصلہ نہایت برا ہے اور اگر انھوں نے اپنی ان تمام ستم رانیوں پر اس کو راضی اور اس معاملے سے بالکل بے تعلق و بے پروا سمجھ رکھا ہے جب بھی ان کا یہ فیصلہ نہایت غلط اور نہایت بُرا ہے۔

مَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ط وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (۵)

مظلوم مسلمانوں کو تسلی

یہ مظلوم مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ بہر حال تمھیں ہر کام آخرت کی امید پر کرنا ہے اور اگر تم یہ امید رکھتے ہو تو اطمینان رکھو کہ اللہ نے اس کے لیے جو مدت ٹھہرا رکھی ہے وہ لازماً پوری ہو کے رہے گی۔ ایک دن تم اپنے رب سے ملو گے اور اس دن تم اپنی ہر اس محنت و زحمت کا صلہ پاؤ گے جو اس کی خاطر تم نے جھیلی ہو گی۔ خدا سمیع و علیم ہے۔ کوئی چیز اس کے احاطۂ علم سے باہر نہیں ہے۔ تمھاری سرفروشیاں بھی اس کے علم میں ہوں گی اور تمھارے دشمنوں کی ستم رانیاں بھی اس کے سامنے ہوں گی۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا یُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ط اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ (۶)

ایک برموقع آگاہی

یہ متنبہ فرمایا ہے کہ جو شخص ایمان لاتا اور اس راہ میں مشقتیں اٹھاتا ہے وہ یاد رکھے کہ وہ اپنا ہی مستقبل سنوارتا اور اپنا ہی گھر بھرتا ہے، وہ خدا اور اس کے دین پر کوئی احسان نہیں کرتا۔ اس وجہ سے اسے اس بات سے دل گرفتہ نہیں ہونا چاہیے کہ اسے کوئی مصیبت پیش آئی۔ اگر اسے کوئی مصیبت پیش آئی تو خدا کسی کا محتاج نہیں ہے۔ وہ تمام عالم سے مستغنی ہے۔ البتہ لوگ اس کے محتاج ہیں اس وجہ سے خدا کی راہ میں بڑی سے بڑی قربانی بھی جو کوئی دیتا ہے وہ درحقیقت اپنے ہی نفع کے لیے دیتا ہے، اس سے خدا کو کوئی نفع نہیں پہنچتا۔ یہاں یہ حقیقت اچھی طرح ملحوظ رہے کہ دنیا کی طرح دین بھی خدا کے کام آنے والی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ بندوں ہی کے کام آنے والی چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ راستہ انسان ہی کی سعادت کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ جس طرح ایک کسان اپنے کھیت میں مشقت کرتا ہے تو وہ اپنے ہی لیے کرتا ہے، کسی دوسرے کے لیے نہیں کرتا اسی طرح انسان دین کی راہ میں چل کر اپنی ہی منزلیں طے کرتا ہے۔ خدا کی منزل نہیں طے کرتا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۷)

اہل ایمان کے ساتھ اللہ کا معاملہ

قرینہ دلیل ہے کہ لفظ 'سَیِّاٰتْ' یہاں صغائر یعنی چھوٹے گناہوں کے مفہوم میں ہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر صاحبِ ایمان و عمل کے ساتھ یہ معاملہ کرنے والا ہے کہ اس کی لغزشوں اور کوتاہیوں سے وہ درگزر فرمائے گا اور اس نے جو نیک اعمال کیے ہوں گے ان کا وہ اُن سے کہیں بڑھ کر صلہ دے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جب بندوں کے ساتھ خدا کا معاملہ یہ ہے کہ ہر ایک اپنے ہر چھوٹے بڑے عمل کا صلہ پانے والا ہے تو پھر اس کے دل میں یہ وسوسہ کیوں پیدا ہو کہ اس نے خدا کی راہ میں کوئی تکلیف جھیلی تو یہ اس نے اللہ اور اس کے دین پر کوئی احسان کیا!

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۭ وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۭ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۸)

باپ ماں کے حقوق خدا کے حقوق کے تحت ہیں

اوپر کی آیات میں جس آزمائش کا ذکر ہوا ہے اس میں ایک بڑا حصہ اس آزمائش کا بھی تھا جو اسلام لانے والے نوجوانوں کو اپنے کافر باپوں اور سرپرستوں کے ہاتھوں پیش آئی۔ باپ ماں کے حقوق چونکہ ہر دین میں مسلّم رہے ہیں اس وجہ سے اس حق سے باپوں نے بسا اوقات بہت غلط فائدہ اٹھایا ہے کہ اپنے حق کے نام پر انھوں نے اپنی اولاد کو خدا کے حقوق سے روکنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں انھوں نے ظلم و ستم سے بھی دریغ نہیں کیا ہے۔ اس کی مثالیں ہر دعوتِ حق کی تاریخ میں موجود ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جو کچھ ان کے باپ کے ہاتھوں گزری اس کی تفصیل اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی دعوت کے دور میں نوجوانوں کو جن حالات سے سابقہ پیش آیا ان کی طرف بھی پچھلی سورتوں میں اشارے گزر چکے ہیں۔ یہی صورتِ حال ان نوجوانوں کو بھی پیش آئی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے، وہ بھی اسلام لانے کے جرم میں اپنے باپوں اور سرپرستوں کے ظلم و ستم کے ہدف بن گئے۔ اس صورتِ حال کا تقاضا یہ ہوا کہ اس باب میں نوجوانوں کو واضح ہدایت دے دی جائے کہ والدین اگر ان کے دین کے معاملے میں مداخلت کریں تو انھیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت کی ہے اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی اس کو فرمائی ہے کہ اگر وہ تجھ پر اس بات کے لیے دباؤ ڈالیں کہ تو کسی چیز کو بے دلیل میرا شریک ٹھہرا تو اس معاملے میں ان کی اطاعت نہ کیجیو۔ 'توصیۃ' یہاں ہدایت دینے کے مفہوم میں ہے اور اس معنی میں یہ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ قرآن نے اس کو یہاں تمام مذاہب اور تمام انبیاء کی مسلّم تعلیم کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ تورات، انجیل اور زبور سب میں والدین کی اطاعت کو خدا کی اطاعت کے تحت جگہ دی گئی ہے۔ والدین کو جو حق اولاد پر ملا ہے وہ خدا ہی کا عطا کردہ ہے اس وجہ سے ان کو یہ

حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اولاد کو خدا کے حقوق سے روکیں اور جب والدین کو یہ حق حاصل نہیں ہے، جن کا حق خدا کے حق کے بعد سب سے بڑا ہے تو پھر دوسروں کے لیے اس حق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ اسلام میں قانون ہے کہ لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ خالق کے حکم کے خلاف کسی مخلوق کی اطاعت بھی جائز نہیں۔

شرک ایک بے دلیل چیز ہے

'مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ' یہ شرک کی نفی کی دلیل ہے جو قرآن میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔ 'علم' کے معنی دلیل و برہان کے ہیں جہاں تک ایک خدا کا تعلق ہے وہ تو ایک بدیہی حقیقت ہے جس کو ایک مشرک بھی بہرحال مانتا ہے۔ رہے دوسرے اس کے شریک تو ان کی دلیل پیش کرنا ان لوگوں کی ذمہ داری ہے جو ان کو شریکِ خدا ٹھہراتے ہیں اور جب تک ان کے حق میں کوئی دلیل نہ ہو کسی عاقل کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ ان کو خدائی میں شریک کر کے ان کی غلامی کا قلادہ بھی اپنی گردن میں ڈال لے۔

تنبیہ اور تسلی دونوں

'اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ' میں تسلی بھی ہے اور تنبیہ بھی۔ مطلب یہ ہے کہ سب کی واپسی میری ہی طرف ہونی ہے کوئی اور مرجع و ماویٰ بننے والا نہیں ہے تو میں سب کو ان کے اعمال سے باخبر کروں گا۔ باخبر کرنے سے مراد ظاہر ہے کہ اعمال کی جزا اور سزا دینے کے ہیں۔ یعنی آج جو لوگ میرے بندوں کو میری راہ سے روکنے کے لیے ان پر ظلم و ستم ڈھا رہے ہیں ان کی کرتوتیں بھی میں ان کے سامنے رکھوں گا اور میرے جو بندے میری راہ میں استقامت دکھائیں گے ان کی جانبازیوں کا انعام بھی ان کو بھرپور دوں گا۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِی الصّٰلِحِیْنَ (۹)

اوپر کی آیت میں نمایاں پہلو تنبیہ کا تھا اس آیت میں تسلی کے پہلو کا صریح الفاظ میں ذکر فرمادیا۔ 'اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ' یہاں اپنے حقیقی مفہوم میں ہے۔ یعنی جو لوگ اپنے دشمنوں کی تمام دشمنی کے علی الرغم ایمان و عمل صالح پر قائم و استوار رہیں گے۔ فرمایا کہ ان لوگوں کو ہم بلاشبہ زمرۂ صالحین میں داخل کریں گے۔ زمرۂ صالحین سے مراد اللہ کے ان خالص و مخلص بندوں کا گروہ ہے جن کو اس دنیا کی مختلف آزمائشوں سے گزار کر اللہ تعالیٰ آخرت کی ابدی بادشاہی کے لیے منتخب فرما رہا ہے۔ اس گروہ میں ہر مدعی کے لیے جگہ نہیں ہے۔ اس میں صرف وہی لوگ بار پائیں گے جو اپنے آپ کو امتحان کی کسوٹیوں پر کھرا ثابت کریں گے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِیَ فِی اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ کَعَذَابِ اللّٰهِ وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّکَ لَیَقُوْلُنَّ اِنَّا کُنَّا مَعَکُمْ اَوَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِیْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِیْنَ (۱۰)

ایمان کے مدعیوں کو تنبیہ

یہ ایمان کے مدعیوں کا ذکر فرمایا کہ یہ لوگ ایمان کا دعویٰ کرنے کو تو کر بیٹھے لیکن جب اس راہ کی آزمائشوں سے سابقہ پیش آیا ہے تو وہ لوگوں کی پہنچائی ہوئی اذیت سے اس طرح گھبرا اٹھے ہیں جس طرح خدا کے عذاب سے ڈرنا اور گھبرانا چاہیے۔ حالانکہ اس دنیا میں جو دکھ بھی پہنچے گا بہر حال وہ چندروزہ ہے۔ برعکس اس کے خدا جس عذاب میں پکڑنے والا ہے وہ ابدی ہے۔ اس وجہ سے حق کی خاطر اس دنیا میں بڑی سے بڑی مصیبت جھیل لینا بھی آسان ہے بمقابلہ اس کے کہ اس سے مرعوب ہو کر آدمی اپنے آپ کو ابدی عذاب کا سزاوار بنالے۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت جاری ہے اس کے تحت ہر شخص کو بہر حال دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ یا تو وہ حق کا راستہ انتخاب کرے اور پھر پوری پامردی کے ساتھ خلق کی بے مہری بلکہ اس کے ظلم و ستم کا مقابلہ کرے اور اگر اس کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا تو پھر باطل کے ساتھ چلے اور آخرت میں ابدی خسران سے دوچار ہو۔ ان دو کے سوا اور کوئی راہ نہیں ہے۔

یہاں یہ چیز بھی قابلِ توجہ ہے کہ لوگوں کے ہاتھوں آدمی کو جو دکھ پہنچے ہیں ان کو 'فتنہ' یعنی آزمائش سے تعبیر فرمایا ہے اس لیے کہ ان کی حیثیت بہرحال ایک آزمائش سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ پیش آئے گا اس کو عذاب سے تعبیر فرمایا اس لیے کہ وہ درحقیقت عذاب ہو گا جس سے مفر کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔

'وَلَئِنۡ جَآءَ نَصۡرٌ مِّنۡ رَّبِّكَ لَيَقُوۡلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمۡ'۔ یعنی اس وقت تو آزمائشوں نے ان کے قدم ہلا دیے ہیں اور یہ دشمنانِ حق کے ہم نوا بن بیٹھے ہیں لیکن کل جب خدا کی مدد و نصرت کے آثار ظاہر ہوں گے تو یہ بڑے دعوے کے ساتھ کہیں گے کہ ہم نے بھی اس حق کی خاطر بڑی قربانیاں دی ہیں اس راہ میں ہم کسی سے پیچھے نہیں رہے ہیں۔

'اَوَلَيۡسَ اللّٰهُ بِاَعۡلَمَ بِمَا فِىۡ صُدُوۡرِ الۡعٰلَمِيۡنَ'۔ فرمایا کہ یہ دعویٰ تو اس کے آگے کارگر ہو سکتا ہے جو دلوں کے بھیدوں سے بے خبر ہو، جس پر سارا ظاہر و باطن آشکارا ہو اس پر یہ فریب کیا چلے گا!

وَلَيَعۡلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَيَعۡلَمَنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ (۱۱)

مطلب یہ ہے کہ جب اس طرح مخلصین کے ساتھ منافقین بھی ملے ہوئے ہیں تو اللہ ان کو اسی طرح چھوڑے نہیں رکھے گا بلکہ وہ ان دونوں کو چھانٹ کر الگ الگ کرے گا۔ 'اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا' سے یہاں مومنین مخلصین مراد ہیں۔ اس لیے کہ اس کے مقابل میں منافقین کا ذکر ہے جن کا کردار اوپر والی آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ وہ ایمان کے مدعی تو بن بیٹھے ہیں لیکن اس راہ میں چوٹ کھانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ بات بصیغۂ تاکید بیان ہوئی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ فرق و امتیاز اللہ تعالیٰ کی صفات کا لازمی تقاضا ہے، اگر وہ ایسا نہ کرے تو یہ بات اس کے عدل کے منافی ہوگی۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ۡ وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۱۲-۱۳)

بزرگوں کی غلط منطق

'اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا' اگرچہ باعتبار لفظ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد وہ کفار ہیں جن کی اولاد یا دوسرے زیردست افراد اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ لوگ اپنے زیردستوں کو اسلام سے پھیرنے کے لیے ان پر جبر و ظلم بھی کرتے اور یہ اخلاقی دباؤ بھی ڈالتے کہ ہم نیک و بد اور خیر و شر کو تم سے زیادہ سمجھنے اور پرکھنے والے ہیں۔ اس وجہ سے تم ہمارے طریقے پر چلتے رہو، اگر ہمارا طریقہ غلط ہوا تو اس کا عذاب و ثواب ہماری گردن پر ہے، تم اس کی ذمہ داری سے بری ہو، تمہارا بوجھ ہم اٹھا لیں گے۔ یہ منطق بزرگوں، سرپرستوں، باپوں، استادوں، پیروں اور لیڈروں کی طرف سے، اپنے چھوٹوں کے مقابل میں، پہلے بھی ہمیشہ استعمال کی گئی ہے اور اب بھی استعمال کی جاتی ہے اور بسا اوقات یہ مؤثر بھی ہوتی ہے۔ ایک خاص حد تک اس کی تاثیر ایک امر فطری ہے اور اس میں چنداں ہرج بھی نہیں ہے۔ لیکن دین کا معاملہ نہایت اہم ہے۔ اس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے اس کے اپنے کندھوں پر ڈالی ہے۔ اس معاملے میں بے سوچے سمجھے نہ کسی کی تقلید جائز ہے اور نہ کسی کو اپنی تقلید پر مجبور کرنا جائز ہے۔ خدا کے ہاں کوئی بھی کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والا نہیں بن سکے گا۔ 'لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى' یہاں اسی حقیقت کی وضاحت فرمائی گئی ہے کہ جو لوگ اپنے زیردستوں کو یہ اطمینان دلا رہے ہیں کہ وہ ان کے بوجھ اٹھا لیں گے وہ بڑی غلط فہمی میں ہیں اور بالکل جھوٹا اطمینان دلا رہے ہیں۔ قیامت کے دن ایسے لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ یہ اپنے گناہوں کے بوجھ بھی اٹھائے ہوئے ہوں گے اور ان لوگوں کے بوجھ میں سے بھی ان کو حصہ بٹانا پڑے گا جو ان کے گمراہ کرنے سے گمراہ ہوں گے۔

'عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ' سے مراد وہ بدعتیں ہیں جو ایجاد تو انھوں نے خود کیں لیکن ان کو منسوب اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں اور ان کی حمایت میں اتنا غلو ہے کہ دوسروں کو بھی ان پر مجبور کرتے ہیں اور ان کے عذاب و ثواب کی ذمہ داری اپنے سر لینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ فرمایا کہ ان سب کی بابت قیامت کے دن ان سے پرسش ہونی ہے۔

۲- آگے کا مضمون- آیات ۱۴-۴۰

اوپر کی آیات میں تین باتیں مذکور ہوئی ہیں:

ایک یہ کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں اٹھتے ہیں وہ ٹھنڈی سڑک سے منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ جاتے بلکہ ان کو اس راہ میں بہت سے امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے، ان سے گزرے بغیر اللہ تعالیٰ کے

ہاں کسی کو صادقین و مخلصین کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔

دوسری یہ کہ دین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر شخص خود مسئول و ذمہ دار ہے، کوئی دوسرا اس کا بوجھ اٹھانے والا نہیں بن سکے گا اس وجہ سے اس عذر پر تکیہ کرنا کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ اس نے کوئی بے راہروی دوسرے کے دباؤ سے اختیار کی، خواہ یہ دباؤ اخلاقی ہو یا مادی۔

تیسری یہ کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حق پرست بندوں کو مختلف قسم کی مصیبتوں میں مبتلا کر کے ان کو حق سے پھیرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو ایک حد تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل تو ملتی ہے لیکن اس ڈھیل سے اگر ان کا طغیان بڑھ جاتا ہے تو وہ لازماً اللہ تعالیٰ کے قانون کی گرفت میں آ جاتے ہیں اور جب اس کی گرفت میں آ جاتے ہیں تو پھر ان کے لیے کوئی مفر باقی نہیں رہتا۔

آگے کی آیات میں انہی حقائق کو حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے مخالفین و مکذبین کے احوال و واقعات سے مبرہن کیا ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا
خَمْسِيْنَ عَامًا ۭ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ
وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۵﴾ وَاِبْرٰهِيْمَ
اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ
اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا
وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا
يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ
وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ
اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۸﴾
اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ
عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۱۹﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ

الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ
قَدِيْرٌ ۚ ﴿٢٠﴾ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاِلَيْهِ
تُقْلَبُوْنَ ﴿٢١﴾ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ ؗ
وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿٢٢﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا ع ٢ ٩ ١٤
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖۤ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِىْ وَاُولٰٓئِكَ
لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٢٣﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا
اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ
لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٢٤﴾ وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ
مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ
بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۫ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا
لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٢٥﴾ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّىْ مُهَاجِرٌ وقف لازم
اِلٰى رَبِّىْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٢٦﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ
وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِىْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ
فِى الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٢٧﴾ وَلُوْطًا اِذْ قَالَ
لِقَوْمِهٖۤ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۫ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ
مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٨﴾ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ
وَتَاْتُوْنَ فِىْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ
قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٢٩﴾ قَالَ

٣ ع ٨ ١٥ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٣٠﴾ وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ
بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا
كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿٣١﴾ قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ؕ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ
فِيْهَا ۫ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿٣٢﴾
وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا
وَّقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ ۫ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ
كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿٣٣﴾ اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا
مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿٣٤﴾ وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ
بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ
يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ
مُفْسِدِيْنَ ﴿٣٦﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ
دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٣٧﴾ ۡ وَعَادًا وَّثَمُوْدَاۡ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ
مَّسٰكِنِهِمْ ۫ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ
وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ﴿٣٨﴾ ۙ وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۫ وَلَقَدْ
جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِى الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا
سٰبِقِيْنَ ﴿٣٩﴾ ۚ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ
حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا
بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ

كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۰﴾

اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تو وہ ان کے اندر پچاس سال کم ایک ہزار سال رہا۔ تو ان کو طوفان نے آ پکڑا اور وہ اپنی جانوں پر خود ظلم ڈھانے والے بنے۔ پس ہم نے اس کو اور کشتی والوں کو نجات دی اور اس واقعہ کو دنیا والوں کے لیے ایک عظیم نشانی بنایا۔ ۱۴-۱۵

ترجمۂ آیات ۱۴-۴۰

اور ابراہیم کو بھی رسول بنا کر بھیجا جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر جانو۔ تم اللہ کے سوا بس بتوں کی پوجا کر رہے ہو اور بہتان گھڑ رہے ہو۔ جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو یہ تمھارے لیے رزق پر کوئی اختیار نہیں رکھتے تو اللہ ہی کے پاس رزق کے طالب بنو اور اسی کی بندگی کرو اور اسی کے شکر گزار رہو۔ اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۱۶-۱۷

اور اگر تم جھٹلاؤ گے تو یاد رکھو کہ تم سے پہلے بھی بہت سی قوموں نے جھٹلایا اور رسول پر واضح طور پر پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ ۱۸

کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ کس طرح اللہ خلق کا آغاز کرتا ہے پھر اس کا اعادہ کر دیتا ہے۔ بے شک یہ اللہ کے لیے نہایت آسان ہے۔ ان سے کہو، زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ کس طرح اللہ نے خلق کا آغاز کیا اور پھر اس کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ جس کو چاہے گا عذاب دے گا اور جس پر چاہے گا رحم کرے گا اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ اور نہ تم زمین میں خدا کے قابو سے باہر نکل سکو گے اور نہ آسمان میں اور تمھارے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی کارساز ہے اور نہ کوئی مددگار۔ اور جن لوگوں

نے اللہ کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا تو وہی لوگ ہیں جو میری رحمت سے محروم ہوئے اور وہی لوگ ہیں جن کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ ۱۹-۲۳

تو اس کی قوم کا جواب صرف یہ ہوا کہ انھوں نے کہا کہ اس کو قتل کردو یا جلا دو۔ تو اللہ نے اس کو آگ سے نجات دی۔ بے شک اس کے اندر بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ ۲۴

اور اس نے کہا تم نے اللہ کے سوا جو بُت بنائے ہیں، تمھاری آپس کی دوستی بس دنیا کی زندگی تک ہے۔ پھر قیامت کے دن تم میں سے ہر ایک دوسرے کا انکار کرے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا اور تمھارا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور تمھارا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ ۲۵

پس لوط نے اس کی تصدیق کی اور کہا، میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں۔ بے شک وہی عزیز و حکیم ہے۔ ۲۶

اور ہم نے اس کو عطا کیے اسحاق اور یعقوب اور اس کی ذریّت میں نبوّت اور کتاب کا سلسلہ جاری کیا۔ اور ہم نے اس کا صلہ اس کو دنیا میں بھی دیا اور وہ آخرت میں بھی نیکوکاروں کے زمرے میں سے ہوگا۔ ۲۷

اور لوط کو بھی ہم نے رسول بنایا۔ جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم لوگ ایک کھلی ہوئی بدکاری کا ارتکاب کرتے ہو۔ تم سے پہلے دنیا میں کسی قوم نے بھی اس کا ارتکاب نہیں کیا! کیا تم مردوں سے شہوت رانی کرتے اور فطرت کی راہ مارتے ہو! اور اپنی مجلسوں میں بے حیائی کے مرتکب ہوتے ہو! تو اس کی قوم کا جواب صرف یہ ہوا کہ وہ بولے کہ اگر تم

سچے ہو تو ہمارے اوپر اللہ کا عذاب لاؤ! ۲۸-۲۹

اس نے دعا کی، اے رب! اس مفسد قوم کے مقابل میں میری مدد کر۔ اور جب ہمارے فرستادے ابراہیم کے پاس خوش خبری لے کر آئے، انھوں نے کہا، ہم اس بستی والوں کو ہلاک کر دینے والے ہیں۔ اس کے باشندے بڑے ہی نابکار ہیں! اس نے کہا، اس میں تو لوط بھی ہے! انھوں نے جواب دیا کہ جو اس میں ہیں ہم ان کو خوب جانتے ہیں۔ ہم اس کو اور اس کے متعلقین کو بچا لیں گے مگر اس کی بیوی کو، وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہو گی۔ ۳۰-۳۲

اور جب یوں ہوا کہ آئے ہمارے فرستادے لُوط کے پاس تو وہ ان سے آزردہ اور دل تنگ ہوا اور وہ بولے کہ تم نہ کوئی اندیشہ کرو، نہ غم، ہم تم کو اور تمھارے متعلقین کو بچا لیں گے بجز تمھاری بیوی کے، وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہو گی۔ ہم اس بستی والوں پر، ان کی نافرمانیوں کی پاداش میں، آسمان سے ایک آفت اتارنے والے ہیں! اور ہم نے اس کی ایک واضح نشانی باقی رکھی ان لوگوں کے لیے جو سوچنا سمجھنا چاہیں۔ ۳۳-۳۵

اور ہم نے مدین والوں کے پاس ان کے بھائی شعیب کو بھیجا تو اس نے دعوت دی، اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو اور یوم آخرت کے منتظر رہو اور زمین میں فساد مچانے والے بن کر نہ بڑھو۔ تو انھوں نے اس کو جھٹلا دیا تو ان کو زلزلہ نے آ پکڑا۔ پس وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ ۳۶-۳۷

اور عاد اور ثمود کو بھی ہم نے ہلاک کر دیا۔ اور تم پر ان کی بستیوں کے نشان واضح ہیں۔ اور شیطان نے ان کے مشاغل ان کی نگاہوں میں کُھبا دیے اور اس طرح ان کو صحیح راہ سے روک دیا، حالانکہ وہ بڑے ہی ہوشیار لوگ تھے۔ ۳۸

اور قارون و فرعون اور ہامان کو بھی ہم نے ہلاک کر دیا اور موسیٰ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آیا تو انھوں نے ملک میں گھمنڈ کیا اور وہ ہمارے قابو سے باہر نکل جانے والے نہ بن سکے۔ ۳۹

پس ہم نے ان میں سے ہر ایک کو اس کے گناہ کی پاداش میں پکڑا۔ ان میں سے بعض پر ہم نے گرد باد کا طوفان بھیجا۔ اور ان میں سے بعض کو کڑک نے آ پکڑا، اور ان میں سے بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے بعض کو ہم نے غرق کر دیا اور اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ ۴۰

۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖ فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ (۱۴)

حضرت نوحؑ کا طویل امتحان

حضرت نوح علیہ السلام کی ساڑھے نو سو سال عمر کا ذکر صرف اسی سورہ میں آیا ہے۔ عمر کی یہ تصریح اس سورہ کے عمود کے تقاضے سے ہوئی ہے۔ اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ جو لوگ حق کی راہ اختیار کریں ان کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ جلدی سے، بغیر کوئی زحمت و مشقت جھیلے، منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے بلکہ انھیں ایک طویل مدت تک آزمائشوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی حقیقت کو مبرہن کرنے کے لیے یہاں حضرت نوحؑ کی عمر کا حوالہ دیا کہ انھیں اپنی قوم کے ساتھ ایک طویل مدت تک کشمکش کرنی پڑی تب کہیں جا کر وہ اللہ تعالیٰ کے امتحان میں سرخرو اور اپنے فرض سے فارغ ہوئے۔

حضرت نوحؑ کے زمانہ میں عمروں کا اوسط

حضرت نوح علیہ السلام کی جو عمر یہاں مذکور ہوئی ہے بالکل تورات کے بیان کے مطابق ہے۔ تورات میں ہے:

"اور طوفان کے بعد نوح ساڑھے تین سو برس اور جیتا رہا اور نوح کی کل عمر ساڑھے نو سو برس کی ہوئی، تب اس نے وفات پائی۔" (پیدائش: ۹-۲۸-۲۹)

تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں عمروں کا اوسط آج کی نسبت بہت زیادہ تھا۔ حضرت نوحؑ کے والد کی عمر سات سو ستتر برس کی ہوئی۔ ان کے دادا کی عمر نو سو انہتر برس مذکور ہے۔ اسی طرح ان کے

دوسرے اجداد میں سے کسی کی عمر نو سو باسٹھ برس مذکور ہے اور کسی کی آٹھ سو پچانوے برس۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نوحؑ کی یہ عمر اس دور کی اوسط عمر کے بالکل مطابق ہے۔ اس عہد کی کوئی مدوّن تاریخ موجود نہیں ہے۔ صرف تورات ہی کے ذریعہ سے کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ تورات کے ان بیانات کی تکذیب کی جائے ـــــ یہ امر بھی یہاں ملحوظ رہے کہ اس عہد میں جب کہ ہماری یہ زمین الٰہی آباد ہو رہی تھی اور تمدن و معیشت کے وہ مفاسد ظہور میں نہیں آئے تھے جو آب زندگی کے ہر شعبے پر چھا گئے ہیں، اگر عمروں کا اوسط زیادہ رہا ہو تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے بلکہ یہ عین حکمتِ الٰہی اور فطرتِ انسانی کے تقاضوں کے مطابق ہے۔

'فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ' اس ٹکڑے سے تمہید میں بیان کردہ دوسری حقیقت کی تائید ہوئی کہ ہر چند اللہ تعالیٰ اعدائے حق کو ڈھیل تو دیتا ہے لیکن اس ڈھیل کی ایک حد ہوتی ہے جس کے بعد وہ ان کو ضرور پکڑتا ہے اور یہ پکڑنا ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ظلم نہیں ہوتا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنتے ہیں اس لیے کہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو چکی ہوتی ہے۔ سنتِ الٰہی کے مطابق جس طرح اہلِ حق کا کامیابی کی منزل پر پہنچنے سے پہلے امتحان ضروری ہے اسی طرح اہلِ باطل پر عذاب سے پہلے ان پر اتمامِ حجت لازمی ہے۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۱۵)

امتحان کے بعد حضرت نوحؑ اور ان

لیعنی اتنی طویل کشمکش اور آزمائش کے بعد وہ مرحلہ آیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کو نجات دی اور اس واقعہ کو دنیا والوں کے لیے ایک عظیم نشانی بنایا جس کے آئینہ میں اہلِ حق اور اہلِ باطل دونوں اپنے اپنے انجام دیکھ سکتے ہیں۔

ضمیر کا مرجع پورا واقعہ ہے

'وَجَعَلْنٰهَآ' میں ضمیر کا مرجع کوئی معین لفظ نہیں ہے بلکہ وہ پورا واقعہ ہے جو اوپر بیان ہوا۔ عربی میں ضمیروں کے استعمال کا یہ طریقہ معروف ہے، اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

حضرت نوحؑ کے اس واقعہ میں اس بات کی دلیل بھی موجود ہے جو اوپر بیان ہوئی کہ دین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کی طرف سے کوئی دوسرا جواب دہی نہ کر سکے گا۔ اگر اس کی کوئی گنجائش ہوتی تو حضرت نوحؑ اپنے بیٹے کو خدا کی پکڑ سے ضرور بچا لیتے لیکن جب حضرت نوحؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر اپنے بیٹے کے کچھ کام نہ آسکے تو تا بہ دیگراں چہ رسد۔

وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۶)

حضرت ابراہیمؑ کی دعوت اور ان کا امتحان

یعنی جس طرح ہم نے نوحؑ کو رسول بنا کر بھیجا تھا اسی طرح ابراہیمؑ کو بھی اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ اس نے بھی اپنی قوم کو دعوت دی کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس کے غضب سے ڈرو۔ اس کے غضب

سے ڈرو، یعنی اس کی بندگی میں دوسروں کو شریک کرکے اس کے غضب کو دعوت نہ دو۔ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ تنبیہ کا کلمہ ہے۔ یعنی یہ بہترین نصیحت اور بہترین موعظت ہے جو میں بالکل وقت پر تمہیں پہنچا رہا ہوں بشرطیکہ تم اس کو سمجھو اور اس کی قدر کرو۔

اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۱۷)

یعنی اپنے جن معبودوں کو تم شریکِ خدا سمجھ کر پوج رہے ہو ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے، یہ محض بت اور تھان اور استھان ہیں۔ وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا یعنی تمہارا یہ دعویٰ کہ خدا نے ان کو اپنی خدائی میں شریک بنایا ہے محض ایک بہتان ہے جو تم خدا پر لگا رہے ہو۔ نہ خدا نے کہیں یہ فرمایا ہے کہ اس نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے اور نہ تمہارے پاس اس کے حق میں کوئی دلیل ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ، یعنی اگر تمہارا یہ گمان ہے کہ رزق و فضل پر تمہارے ان دیوتاؤں کا کوئی اختیار ہے تو یہ محض تمہارا وہم ہے ان کو تمہارے رزق پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ ہر چیز خدا ہی کے اختیار میں ہے تو اگر تم رزق و فضل کے طالب ہو تو خدا ہی کی طرف رجوع کرو اور اسی سے مانگو۔

وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ یعنی تمہاری عبادت و شکر گزاری کا اصل حقدار وہی ہے جس کے اختیار میں سب کچھ ہے اور جو تمہیں سب کچھ دیتا ہے تو اس کے حق میں دوسروں کو شریک کرکے اس کی ناشکری نہ کرو۔

وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ یعنی مرنے کے بعد تم اٹھائے جاؤ گے اور تمہاری پیشی اسی کے سامنے ہونے والی ہے۔ اس دن تمہارے یہ اصنام و اوثان تمہارے کچھ کام آنے والے نہیں بنیں گے۔

وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (۱۸)

یہ نہایت سخت الفاظ میں تنبیہ ہے کہ اگر تم نے میری بات نہ مانی اور میری تکذیب پر اڑے رہے تو یاد رکھو کہ تم سے پہلے بھی بہت سی قوموں نے اپنے اپنے رسولوں کو جھٹلایا تو جو انجام ان کا ہوا اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہو!

وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ یعنی رسول کے اوپر ذمہ داری صرف واضح طور پر اللہ کی بات پہنچا دینے کی ہوتی ہے۔ وہ فرض میں نے ادا کر دیا۔ اب ذمہ داری تمہاری ہے۔ اب جو پرسش ہوگی وہ تم سے ہوگی۔ اب مجھ سے یہ پرسش نہیں ہوگی، کہ تم نے ہدایت کی راہ کیوں نہیں اختیار کی!

اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (۱۹)

یہ اور اس کے بعد کی آیات، آیت ۲۳ تک، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے بیچ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی طرح کی تضمین ہے جس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات جب قیامت کے ذکر تک پہنچی تو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے قیامت کے دلائل کا حوالہ دے کر حضرت ابراہیمؑ کی بات کو مکمل اور کلام کو بالکل مطابق حال بنا دیا۔ چند آیات بطور تضمین

اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ۔ یعنی اگر انھیں مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے میں کوئی شک ہے تو کیا انھوں نے اس کائنات میں اس حقیقت کا مشاہدہ نہیں کیا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ چیزوں کو پیدا کرتا ہے، پھر ان کو فنا کرتا ہے اور پھر دوبارہ ان کا اعادہ کر دیتا ہے؟ یہ اسی دلیل کی طرف اشارہ ہے جو مختلف اسلوبوں سے، متعدد مقامات میں پیچھے گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب زمین کو بالکل خشک و بے آب و گیاہ کر دینے کے بعد اس کو از سرِ نو سرسبز و شاداب کر دینے میں خدا کو کوئی مشکل نہیں پیش آرہی تو لوگوں کے مرکھپ جانے کے بعد ان کو دوبارہ زندہ کر دینے میں اس کو کیوں مشکل پیش آئے گی۔

اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ۔ یعنی اس کو مستبعد اور بعید از امکان نہ خیال کرو۔ جس خدا نے ہر چیز کو عدم سے وجود بخشا اور جو برابر اپنی اس قدرت کا اس کائنات میں مشاہدہ کرا رہا ہے اس کے لیے تمھیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا نہایت سہل ہے۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲۰)

یہ اس دنیا کے مظاہر پر صحیح نقطۂ نگاہ سے غور کرنے کی دعوت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا کے نظام کو اس طرح چلا رہا ہے کہ یہ تمام حقائق کی تعلیم کے لیے خود اپنے وجود کے اندر ایک مکمل تربیت گاہ ہے ــــ توحید، قیامت اور جزا و سزا کے لیے باہر سے دلیل ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس دنیا کے شب و روز کے مشاہدات میں ان میں سے ہر چیز کی شہادت موجود ہے۔ فرمایا کہ اس زمین میں چلو پھرو اور غور کی نگاہ سے دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کس طرح خلق کا آغاز فرماتا ہے اور پھر اس کو فنا کر کے اس کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرتا ہے۔ ایک قوم کو وہ وجود بخشتا ہے اور پھر اس کو مٹا کر اس کی جگہ دوسری قوم کو لاتا ہے۔ رات کے بعد دن نمودار کرتا ہے، خزاں کے بعد بہار آجاتی ہے۔ یہ سارے مشاہدات وہ اسی لیے کرا رہا ہے کہ انسان مرنے کے بعد کی زندگی کو بعید از امکان نہ تصور کرے بلکہ اپنے روز مرہ کے مشاہدات کی روشنی میں یقین رکھے کہ جس خالق کی قدرت کے یہ کرشمے وہ ہر روز اور ہر آن مشاہدہ کر رہا ہے اس کے لیے کوئی کام بھی مشکل نہیں ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ دنیا کے مظاہر پر صحیح نقطۂ نظر سے غور کرنے کی دعوت

يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ (۲۱)

یعنی اس دنیا کے واقعات و حوادث اور اس کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے رحم فرماتا ہے۔ اس کے اپنے قانونِ عدل و حکمت کے سوا اور کوئی چیز بھی اس کی مشیت و قدرت پر اثر انداز نہیں ہوتی ہے۔ قرآن میں قوموں کی جو تاریخ بیان ہوئی ہے وہ اس حقیقت کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ اور یہیں سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ آخرت میں بھی عذاب و ثواب کا معاملہ تمام تر اسی کے اختیار میں ہوگا، کوئی دوسرا اس کے اس اختیار میں مداخلت نہ کر سکے گا۔ وہی اپنے عدل و حکمت کے مطابق جس کو چاہے گا سزا دے گا، جس کو چاہے گا اپنی مغفرت سے نوازے گا۔

'وَاِلَیْہِ تُقْلَبُوْنَ' اور یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ سب کی واپسی بالآخر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہوتی ہے، کسی اور کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ وہ مولیٰ و مرجع بن سکے۔ جب اس دنیا میں اس کی گرفت سے بچانے والا کوئی اور نہ بن سکا، کسی اور کی دُہائی کچھ کارگر نہ ہو سکی تو آخرت میں اس کے نافع ہونے کی توقع کس بنیاد پر کی جائے!

وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ز وَمَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ (۲۲)

اوپر کی باتیں غائب کے اسلوب میں ارشاد ہوئی ہیں۔ اب یہ قریش کو براہِ راست خطاب کر کے تنبیہ کی جا رہی ہے تاکہ کلام بالکل مطابقِ حال ہو جائے۔ فرمایا کہ جب وہ تم کو پکڑنا چاہے گا تو اس کی پکڑ سے نہ تم زمین میں کہیں اس کے قابو سے باہر نکل سکو گے اور نہ آسمانوں میں۔ نہ یہاں تمہارا کوئی ساتھی اور کارساز بن سکے گا نہ آخرت میں تمہارا کوئی حامی و شفیع ہوگا۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَلِقَآئِہٖٓ اُولٰٓئِکَ یَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِیْ وَاُولٰٓئِکَ لَہُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۲۳)

'یَئِسُوْا' یہاں 'حُرِمُوْا' اور 'بُعِدُوْا' کے معنی میں ہے۔ یعنی وہ لوگ ہمیشہ کے لیے خدا کی رحمت و عنایت سے محروم ہوئے۔ اس لفظ میں 'حُرِمُوْا' کے بالمقابل زیادہ زور ہے۔ بعض اوقات کسی چیز سے محرومی اس کے دوبارہ حصول کی امید کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ محرومی زیادہ دل شکن نہیں ہوتی۔ کفار کو آخرت میں خدا کی رحمت سے جو محرومی ہوگی وہ کامل مایوسی کے ساتھ ہوگی۔ ان کے لیے امید کے دروازے ہمیشہ کے واسطے بند ہو جائیں گے۔

فرمایا کہ جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا، جو آج ان کو سنائی جا رہی ہیں اور خدا کے حضور پیشی کا، جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے، انکار کیا وہ یاد رکھیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے میری رحمت سے مایوس و نامراد ہوئے۔ اس رحمت کا استحقاق پیدا کرنے کا موقع صرف اسی دنیا کی زندگی میں ہے۔ جو لوگ یہ فرصت

رائگاں کردیں گے ان کے لیے اس کو کھو کر پا سکنے کا کوئی امکان نہیں۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا اقْتُلُوهُ أَوْ حَرِّقُوهُ فَأَنْجَاهُ اللَّهُ مِنَ النَّارِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (۲۴)

اصل سرگزشت کا بقیہ حصہ

بیچ میں تضمین کی جو آیات آگئی تھیں وہ اوپر کی آیت پر ختم ہوئیں۔ اب اصل سرگزشت کا بقیہ حصہ پھر سامنے آگیا۔ فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ کی اس دردمندانہ دعوت کا جواب ان کی قوم نے دیا تو یہ دیا کہ اس شخص کو یا تو قتل کردو یا جلا دو۔ بالآخر اسی دوسری رائے پر اتفاق ہوا اور قرآن میں دوسری جگہ یہ تصریح ہے کہ اس کے لیے ایک خفیہ اسکیم بنائی گئی لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دشمنوں کے اس شر سے بچا لیا۔ فرمایا کہ اس واقعہ کے اندر ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو ایمان کی راہ اختیار کریں۔

اس سرگزشت کی نشانیاں

اس میں پہلی نشانی تو اس بات کی ہے کہ جو لوگ ایمان کی راہ اختیار کریں وہ اس حقیقت کو یاد رکھیں کہ اس راہ میں بہت سے سخت امتحانات پیش آتے ہیں، جن سے گزرے بغیر کوئی شخص ایمان کے تقاضوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو اس راہ میں آگ کے الاؤ کے اندر سے ہو کر گزرنا پڑا ہے۔

دوسری نشانی اس بات کی ہے کہ اس راہ میں علائق کی زنجیریں کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے باپ — آزر — نے ان پر پورا دباؤ ڈالا کہ ان کو ایمان کی راہ سے روک دے لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ دین کے معاملہ میں ان کا باپ خدا کے ہاں ان کی طرف سے جواب دہ نہیں ہوگا بلکہ انھیں اپنی جواب دہی خود کرنی ہوگی اس وجہ سے باوجود اس کے کہ وہ اپنے باپ کے لیے اپنے سینہ میں ایک نہایت دردمند دل رکھتے تھے لیکن وہ اس کے مقابل میں اپنے دین کی حفاظت کے لیے علائقِ محبت کی تمام زنجیریں توڑ کر سینہ سپر ہو گئے۔

تیسری نشانی اس میں اس بات کی ہے کہ جو لوگ حق کو پسپا کرنے کے لیے اپنا زور و زر اور اپنا اختیار و اقتدار استعمال کرتے ہیں، اگرچہ ایک حد تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو زور آزمائی کی مہلت ملتی ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ آزمائش کا یہ ایک لازمی تقاضا ہے لیکن اس مہلت کی ایک خاص حد ہے۔ اگر اہلِ حق اس کے مقابل میں ڈٹ جاتے ہیں تو بالآخر فتحمند وہی ہوتے ہیں اور اہل باطل دنیا اور آخرت دونوں میں رسوا ہوتے ہیں۔

وَقَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا مَوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِنْ نَاصِرِينَ (۲۵)

گمراہ لیڈروں اور گمراہ پیروؤں کی دوستی بس اسی دنیا کی زندگی تک ہے

'اِنَّمَا' حصر کے مفہوم میں ہے اور 'مَوَدَّۃَ بَیْنِکُمْ' بیانِ علت کے لیے نہیں بلکہ بیانِ حال کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو تم نے اللہ کے سوا دوسرے اصنام داوثان بنائے ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ محض تمہارے خیال و وہم کی ایجاد ہیں۔ ان کے ساتھ تمہاری ساری دوستی و نیاز مندی بس اسی دنیا کی زندگی تک ہے۔ قیامت کے دن جب اصل حقیقت سامنے آئے گی تو تم ایک دوسرے کا انکار کروگے اور آپس میں ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے۔ تم کہو گے کہ اے رب، ہم کو فلاں اور فلاں نے گمراہ کیا۔ اگر یہ نہ ورغلاتے تو ہم تیری سیدھی راہ پر ہوتے۔ وہ جواب دیں گے کہ ہم جیسے خود تھے ہم نے تم کو ویسے ہی بنایا۔ تم خود شامت زدہ تھے کہ تم نے ہماری پیروی کی تو ہم کو ملامت کرنے کے بجائے خود اپنے کو ملامت کرو اور اپنے کیے کی سزا بھگتو۔ اس جنگ و جدال کا ذکر قرآن مجید میں جگہ جگہ ہوا ہے اور مقصود اس کے ذکر سے یہ ہے کہ جو لوگ دعوت کے اس دور میں اپنے زیردستوں کو یہ اطمینان دلا رہے تھے کہ وہ ان کے طریقے پر چلتے رہیں، قیامت کے دن وہ ان کی طرف سے جواب دہی کرلیں گے، ان کو یہ آگاہی دے دی جائے کہ اس دن اس قسم کے لیڈر اور اس قسم کے پیرو، اس قسم کے معبود اور اس قسم کے عابد سب ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے۔ دوستی و وفاداری کے سارے دعوے بس اسی وقت تک ہیں جب تک اصل حقیقت سے پردہ نہیں اٹھتا۔ پردہ اٹھتے ہی سب پر یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ اس طرح کے سارے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔ ان میں سے کوئی بھی کسی کے کام آنے والا نہیں بنے گا۔

فَاٰمَنَ لَہٗ لُوْطٌ م وَقَالَ اِنِّیْ مُھَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ط اِنَّہٗ ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (۲۶)

اول اول صرف حضرت لوطؑ نے حضرت ابراہیمؑ کا ساتھ دیا

'اٰمَنَ لَہٗ' تصدیق و تائید کے مفہوم میں ہے۔ حضرت لوطؑ، حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے اور خود منصب رسالت پر فائز اور اپنی قوم کی دعوت پر مامور تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے جو روش اختیار کی اس کا ذکر اوپر کی آیت میں ہوا۔ یہاں حضرت لوطؑ کی تصدیق و تائید کا حوالہ اس لیے دیا ہے کہ یہ حقیقت واضح ہوجائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر نبی پر بھی ایک وقت ایسا گزرا ہے کہ ان کی دعوت میں ان کی ہمنوائی کرنے والا حضرت لوطؑ کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا لیکن بالآخر وہ وقت بھی آیا کہ ان کی دعوت کی صدائے بازگشت دنیا کے کونے کونے سے اٹھی۔

حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت

'وَقَالَ اِنِّیْ مُھَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ط اِنَّہٗ ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ'۔ 'قَالَ' کا فاعل حضرت ابراہیمؑ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب انھوں نے اپنی قوم کا رویہ دیکھ لیا کہ وہ ان کے قتل کردینے اور جلا دینے کے درپے ہے تو انھوں نے سنتِ الٰہی کے مطابق، ہجرت کا عزم فرمایا کہ اب میں قوم کو چھوڑ کر اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا ہوں، میرا رب عزیز و حکیم ہے۔ یعنی اگرچہ بظاہر، حالات بالکل نامساعد ہیں لیکن میرا رب ہر چیز پر غالب ہے اور اس کے ہر کام میں حکمت ہے۔ وہ میرے لیے اپنی قدرت و حکمت سے راہ کھولے گا اور اس تاریکی کے اندر سے روشنی نمودار کرے گا۔

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۲۷)

ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ کا انعام

یہ وہ انعام بیان ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہجرت کے بعد فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ اگرچہ ابراہیمؑ نے جب ہجرت کی ہے لوط علیہ السلام کے سوا اور کوئی ان کی ہمنوائی کرنے والا نہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو تنہا نہیں چھوڑتا بلکہ وہ ان کو دنیا اور آخرت دونوں میں صالحین و ابرار کی معیّت و رفاقت نصیب کرتا ہے۔ چنانچہ ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ جیسے بیٹے اور پوتے عطا فرمائے جن سے دین کے خدمت گزاروں کا ایک عظیم گھرانا آباد ہوا اور اس گھرانے کے اندر اللہ تعالیٰ نے نبوت اور کتاب کا سلسلہ جاری فرمایا۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ کو اس دنیا میں بھی ان کی خدمات کا صلہ عطا ہوا اور آخرت میں بھی وہ صالحین کے زمرے میں سے ہوں گے۔

نبی صلعم اور آپ کے صحابہؓ کو بشارت

اس آیت میں درپردہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لیے بشارت ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ سورہ مکی زندگی کے اس دور میں نازل ہوئی ہے جب مسلمانوں پر کفار نے عرصۂ حیات بالکل تنگ کر دیا تھا اور مظلوم مسلمانوں کے لیے ہجرت کے سوا کوئی اور راہ باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ان حالات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کے اس پہلو کو نمایاں کر کے اللہ تعالیٰ نے ان کو تسلی دی کہ اگر یہ مرحلہ پیش آتا ہے تو اس سے ہراساں نہ ہونا، اپنے باپ ابراہیمؑ کی طرح اپنے ربِّ عزیز و حکیم کے بھروسہ پر دامن جھاڑ کے اٹھ کھڑے ہونا۔ اگر اپنے رب کی خاطر تم اپنی ناہنجار قوم کو چھوڑو گے تو اللہ تعالیٰ تمھارے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں اچھے ساتھی پیدا کرے گا۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۫ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (۲۸)

حضرت لوطؑ کی دعوت

حضرت لوطؑ، اوپر گزر چکا ہے، حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے، ان کی دعوت کا علاقہ اگرچہ الگ تھا لیکن زمانہ ایک ہی تھا۔ ان کی قوم میں یوں تو وہ ساری ہی برائیاں تھیں جو دوسری مشرک قوموں میں رہی ہیں لیکن امرد پرستی کی بے حیائی اس قوم میں فیشن کی حیثیت حاصل کر گئی تھی اس وجہ سے اس کی اصلاح پر ان کو خاص طور پر توجہ مرکوز کرنی پڑی۔ لفظ 'فَاحِشَۃ' سے انھوں نے اسی بے حیائی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ 'فَاحِشَۃ' کھلی ہوئی بدکاری و بے حیائی کو کہتے ہیں جس کے بدکاری و بے حیائی ہونے میں کسی اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔ 'لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَۃَ' کے الفاظ سے حضرت لوطؑ نے لوگوں کی اخلاقی حس بیدار کرنے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ ان کو غیرت دلائی کہ یہ تو وہ بے حیائی ہے جو سب سے پہلے اس روئے زمین پر تمھی نے ایک فیشن کی حیثیت سے اختیار کی ہے، تم سے پہلے کسی قوم نے بھی یہ لعنت ایک قومی تہذیب کی حیثیت سے اختیار نہیں کی۔

ہم دوسرے مقام میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ، سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ قوم لوط سے پہلے دنیا میں کسی ایک فرد نے بھی اس برائی کا ارتکاب نہ کیا ہو۔ لفظ 'اَحَد' جمع کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ اس کی مثالیں ہم پیش کر چکے ہیں اس وجہ سے اس کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ تم سے پہلے کسی قوم نے بھی اس بے حیائی کو من حیث القوم اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا۔ اس برائی کا یہی وہ پہلو ہے جس کے سبب سے پوری قوم لوط عذاب کی مستحق ٹھہری۔

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ۭ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۲۹)

برائی فیشن کی حیثیت سے

'سبیل' سے مراد یہاں فطرت کی راہ ہے۔ حضرت لوطؑ نے ان کو نہایت دردمندانہ لہجہ میں فطرت سے اس انحراف پر ملامت فرمائی کہ بدبختو! تم مردوں سے شہوت رانی کرتے اور فطرت کی راہ مارتے ہو! ظاہر ہے کہ اگر کسی قوم میں یہ بیماری عام ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ عورتوں کی طرف مردوں کی رغبت بالکل ہی ختم ہو جائے گی اور اگر کچھ رہے گی بھی تو وہ بھی صحیح نوعیت کی نہ ہوگی اور اس طرح پوری قوم اہلاکِ نسل کی اس راہ پر چل پڑے گی جو فاطرِ فطرت کے منشا کے بالکل خلاف اور تباہی کی راہ ہے۔

'وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ' سے اس فسادِ اخلاق کے عام ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کوئی ڈھکی چھپی برائی نہیں رہ گئی تھی بلکہ ان کی سوسائٹی میں اس نے تہذیب اور فیشن کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ مجلسوں میں علانیہ ناشائستہ حرکتیں ہوتیں اور فخر و لذت کے ساتھ ہر بزم و انجمن میں ان کے چرچے ہوتے۔ ہماری جس شاعری کو حالی مرحوم نے سنڈاس سے بدتر قرار دیا ہے وہ انہی خرافات کا دفتر ہے اور ہمارے قومی اخلاق و کردار پر اس کا جو اثر پڑا اس کے دردانگیز نتائج کی تفصیل تاریخ کے صفحات میں موجود ہے۔

'فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖ الآية' یعنی ان تمام دردمندانہ تنبیہات کا جواب اس قوم نے دیا تو یہ دیا کہ اگر تم سچ مچ اللہ کے رسول ہو اور تمہاری تکذیب سے ہم پر اللہ کا کوئی عذاب آنے والا ہے تو ہم اس کے لیے تیار ہیں۔ تم اس عذاب کو دکھا دو تب ہم تمہاری بات باور کریں گے۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ (۳۰)

حضرت لوطؑ کی فریاد بارگاہ الٰہی میں

جب قوم نے اپنی ضد سے حضرت لوطؑ کو بالکل مایوس کر دیا تب انھوں نے اپنے رب سے فریاد کی کہ اے رب، میری تمام سعیِ اصلاح بے سود ہو چکی ہے تو اب اس مفسد قوم کے مقابل میں میری مدد فرما۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ (۳۱)

رحمت و نقمت دونوں خدا ہی کے اختیار میں ہیں

'بُشْرٰی' سے مراد وہ بشارت ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو دی۔ اس کا ذکر اوپر آیت ۲۷ میں گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ جو فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے لیے بیٹے اور پوتے کی بشارت لے کر آئے وہی فرشتے قوم لوط کے لیے عذاب کا تازیانہ لے کر آئے۔ انھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بشارت کے ساتھ قوم لوط کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی بھی خبر دی کہ اب ہم اس بستی والوں کو (اشارہ قوم لوط کی بستی کی طرف ہے) ہلاک کر دینے والے ہیں۔ اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک ہی ہاتھ میں رحمت و نقمت دونوں ہیں۔ جس طرح ایک ہی بارش کو وہ کسی کے لیے عذاب اور کسی کے لیے رحمت بنا دیتا ہے اسی طرح اس کے جو فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے لیے بشارت لے کر آئے وہی قوم لوط کے لیے عذاب کا پیش خیمہ بن کر نمودار ہوئے۔ اس سے مشرک قوموں کے اس واہمہ کی بھی تردید ہو رہی ہے جس میں وہ اس کائنات کے اندر اضداد کے وجود کے سبب سے مبتلا ہوئیں کہ انھوں نے خیر و شر کے الگ الگ دیوتا مان کر ان کی الگ الگ عبادت شروع کر دی۔

'اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ' یہ قوم لوط کی ہلاکت کی علت بیان ہوئی ہے کہ ان کے ہلاک کیے جانے کا فیصلہ خود ان کے اس ظلم کے نتیجہ میں ہوا جو انھوں نے اپنے اوپر کیا کہ فطرت کی راہ سے کھلم کھلا انحراف اختیار کیا اور اللہ کے رسول نے جب اس کے نتائج سے ان کو آگاہ کیا تو اس کی بات پر کان دھرنے کے بجائے اس سے عذاب کا مطالبہ کیا۔ اس طرح کے لوگوں پر جو عذاب آتا ہے وہ خود ان کے ظلم کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر کوئی ظلم نہیں کرتا۔

قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ۭ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا ڭ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ڭ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۔ (۳۲)

حضرت لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کے باب میں حضرت ابراہیمؑ کی تشویش کا ازالہ

حضرت ابراہیمؑ کو جونہی فرشتوں کی اس مہم کا علم ہوا انھیں حضرت لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کی فکر پڑ گئی کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟ انھوں نے سوال فرمایا کہ اس بستی میں تو لوطؑ بھی ہیں؟ فرشتوں نے ان کو اطمینان دلایا کہ اس میں جتنے اہلِ ایمان ہیں ہم ان سب سے اچھی طرح واقف ہیں۔ آپ ان کے بارے میں بالکل مطمئن رہیں، ہم لوطؑ اور ان کے تمام متعلقین کو اس عذاب سے بچا لیں گے، صرف ان کی بیوی پیچھے رہ جائے گی اور وہ عذاب کی زد میں آئے گی۔

وَلَمَّآ اَنْ جَاۗءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْۗءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ ۣ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ (۳۳)

زبان کا ایک نکتہ

یہاں زبان کا ایک نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیے جس کی طرف علامہ ابن قیمؒ نے اشارہ فرمایا ہے کہ جب 'لَمَّا' اور اس کے بعد کے فعل کے درمیان 'اَنْ' آ جائے تو اس صورت میں شرط اور اس کے جواب کے درمیان سبب اور مسبب کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔

حضرت لوطؑ کی آزردگی کا سبب

مطلب یہ ہے کہ جب فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے پاس سے ہو کر حضرت لوطؑ کے پاس پہنچے تو وہ ان کو دیکھ کر آزردہ اور متردّد ہوئے۔ یہاں یہ سوال قابلِ غور ہے کہ حضرت لوطؑ فرشتوں کو دیکھ کر آزردہ و دل گرفتہ کیوں ہوئے؟ انھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ان کا خیر مقدم کیوں نہیں کیا؟ قرآن مجید کے دوسرے مقامات کے مطالعہ سے ان کی اس آزردگی و پریشانی کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں، جو الگ الگ دو مختلف مرحلوں میں ظاہر ہوئے ہیں۔

پہلے مرحلے میں تو وہ ان کو دیکھ کر اس وجہ سے پریشان ہوئے کہ یہ فرشتے خوبرو نوجوانوں کی شکل میں آئے تھے۔ ان کا اس شکل و صورت میں آنا قوم لوط کے لیے ایک آخری ابتلاء تھا تاکہ ان کے اندر جو خبث بھرا ہوا ہے وہ پوری طرح ظاہر ہو جائے اور جو عذاب ان کے لیے مقدّر ہو چکا ہے اس کے وہ آخری درجے میں مستحق بن جائیں۔ حضرت لوطؑ پر یہ حقیقت چونکہ ابھی واضح نہیں ہوئی تھی اس وجہ سے وہ اپنے دروازے پر چند خوبرو شریف زادوں کو دیکھ کر سخت پریشان ہوئے کہ آج کا دن تو بہت کٹھن ہے۔ بستی کے گنڈوں کو جب ان نوجوانوں کی خبر ہو گی تو وہ ٹوٹ پڑیں گے اور مجھ کو اور میرے مہمانوں کو رسوا کریں گے۔ چنانچہ ان کا یہ اندیشہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ گنڈے ان نوجوانوں کی خبر پاتے ہی حضرت لوطؑ کے گھر پر ٹوٹ پڑے اور ان کو رسوا کرنا چاہا۔ حضرت لوطؑ نے لاکھ منت سماجت کی لیکن انھوں نے ان کی ایک نہیں سنی۔ بالآخر فرشتوں نے اپنا پردہ اٹھایا اور حضرت لوطؑ کو اطمینان دلایا کہ تم اطمینان رکھو، ہم چھوکرے نہیں ہیں، جیسا کہ ان اندھوں نے گمان کیا ہے، بلکہ ہم خدا کے فرشتے ہیں اور ان کے لیے فیصلہ کن عذاب لے کر آئے ہیں۔ فرشتوں کے اس انکشافِ راز سے حضرت لوطؑ کو یہ تو اطمینان ہوا کہ گنڈوں کے شر سے وہ اور ان کے مہمان محفوظ ہیں لیکن عذاب کی خبر بھی ان کے لیے سخت تردّد کا باعث ہوئی کہ اب دیکھیے ان کے اور ان کے متعلقین کے لیے کیا حکم ہوتا ہے! فرشتوں نے اس پہلو سے بھی ان کو اطمینان دلایا کہ تم اپنے اور اپنے متعلقین کے باب میں کوئی اندیشہ نہ کرو، ہم تم کو اور تمھارے ساتھیوں کو اس آفت سے نجات دیں گے۔ البتہ تمھاری بیوی تمھارے ساتھ یہاں سے نہیں نکلے گی۔ وہ اپنی قوم کے ساتھ مبتلائے عذاب ہو گی۔

حضرت لوطؑ کی بیوی کے ذکر کی خاص وجہ

یہاں حضرت لوطؑ کی بیوی کے انجام کی طرف دو مرتبہ اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اس سے مقصود اس حقیقت کو مؤکد کرنا ہے جو اوپر بیان ہوئی کہ دین کے معاملہ میں کوئی کسی دوسرے کے بوجھ کو نہیں اٹھا سکتا۔ عورت ہو یا مرد ہر ایک کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑتا ہے۔ حضرت لوطؑ کی بیوی ایک جلیل القدر پیغمبر کی بیوی تھی لیکن چونکہ وہ خود ناہنجار تھی اس وجہ سے وہ بھی عذاب میں گرفتار ہوئی اور حضرت لوطؑ سے جو نسبت اس کو حاصل تھی وہ اس کے لیے کچھ نافع نہ بن سکی۔

إِنَّا مُنزِلُونَ عَلَىٰ أَهْلِ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ (۳۴)

قومِ لوط پر قہرِ آسمانی

حضرت لوطؑ کو نجات کی خوش خبری دینے کے بعد فرشتوں نے ان کو اس فیصلۂ الٰہی سے بھی آگاہ کر دیا کہ اس بستی والوں پر ہم قہرِ آسمانی نازل کرنے والے ہیں۔ 'رجز' سے مراد اس طرح کا عذاب ہے جو سننے اور دیکھنے والوں کے دلوں میں کپکپی پیدا کر دے۔ اس کے ساتھ مِنَ السَّمَآءِ کی قید اس کی شدت اور بے پناہی کے اظہار کے لیے ہے جس طرح ہم اپنی زبان میں قہرِ الٰہی یا عذابِ آسمانی کے الفاظ بولتے ہیں اسی طرح عربی زبان میں یہ اسلوب ہے۔ اس عذاب کی نوعیت پر ہم اس کے محل میں گفتگو کر چکے ہیں۔ 'بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ' سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قسم کا عذاب کسی قوم پر اس وقت بھیجتا ہے جب سرکشی و نافرمانی اس کی عادتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔

وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۳۵)

خاموش آثار سے صرف اہلِ عقل فائدہ اٹھاتے ہیں

قومِ لوط کی یہ بستی قریش کی تجارتی گزرگاہ پر واقع تھی اس وجہ سے وہ ان کے لیے اس سنتِ الٰہی کے ظہور کا ایک نہایت واضح نشان تھی جس سے قرآن ان کو آگاہ کر رہا تھا لیکن یہ خاموش آثار نافع ان کے لیے ہوتے ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ دیکھتے سب کچھ ہیں لیکن ان کو نظر کچھ بھی نہیں آتا۔ آخر اس زمانے میں کتنے ماہرینِ اثریات ہیں جو قدیم کھنڈروں کے ایک ایک نقش کو پڑھ لینے میں بڑے ہوشیار ہیں لیکن ان سے جو اخلاقی سبق حاصل ہوتے ہیں ان کے سمجھنے میں ان کی عقل بالکل کند ہے۔

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِىْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ (۳۶-۳۷)

بعض اقوام و افراد کی طرف اجمالی اشارات

اوپر کی سرگزشتیں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہیں لیکن آگے صرف اجمالی حوالے پر اکتفا فرمایا ہے۔ مقصود ان کے حوالہ سے اسی حقیقت کو تاریخ کی روشنی میں مبرہن کرنا ہے جس کی طرف سورہ کی تمہید میں اشارہ فرمایا ہے کہ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۴) (کیا جو لوگ برائیاں کر رہے ہیں انھوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہمارے قابو سے باہر نکل جائیں گے؟ اگر انھوں نے یہ گمان کر رکھا ہے تو بہت ہی برا فیصلہ کر رہے ہیں) آگے کے تاریخی واقعات اسی بات کے ثبوت میں پیش کیے گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شرارت کرنے والوں کو جو ڈھیل دیتا ہے اس سے ان کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اب ان کی پکڑ نہیں ہوگی یا وہ خدا کے قابو سے باہر ہیں۔ اس سلسلہ میں اقوام میں سے قومِ شعیب اور عاد و ثمود کا حوالہ دیا ہے اور جبار و سرکش افراد میں سے قارون، فرعون اور ہامان کا اور قریش کو متنبہ کیا ہے کہ جو زور و اقتدار آج تم کو اور تمہارے لیڈروں کو حاصل ہے اس سے زیادہ زور و اقتدار ماضی میں ان کو حاصل رہ چکا ہے لیکن جب انھوں نے سرکشی کی اور ہماری تنبیہات کے باوجود باز نہیں آئے تو ہم نے ان کو پکڑا اور اس طرح پکڑا کہ ان کا سارا زور و زر ہمارے مقابل میں ذرا بھی ان کے کام نہ آسکا۔

قوم شعیب اور قریش میں قدرِ مشترک

قوم شعیب کے متعلق پیچھے واضح ہو چکا ہے کہ اس قوم نے تجارت کے میدان میں بڑی ترقی کی تھی۔ یہی اصلی میدان قریش کا بھی تھا۔ اس لیے کہ یہ بھی تجارت پیشہ تھے لیکن ابھی یہ ان کے مرتبہ کو نہیں پہنچے تھے شاید اسی اشتراک کی وجہ سے انہی کے حالات اور انجام کی طرف سب سے پہلے توجہ دلائی۔ فرمایا کہ اہل مدین کے حالات سے سبق لو جن کی طرف ہم نے شعیبؑ کو رسول بنا کر بھیجا۔ انھوں نے ان کو خدا کی بندگی کی دعوت دی اور آخرت کا خوف دلا کر تنبیہ کیا کہ دنیا میں بڑھو اور پھیلو تو مفسد بن کر نہ پھیلو بلکہ مصلح اور حق و عدل کے علم بردار بن کر پھیلو لیکن انھوں نے حضرت شعیبؑ کی ایک بات بھی نہ سنی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے عین ان کے دورِ عروج میں ان کو پکڑا اور ایسا عذاب ان پر آیا کہ وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔ سورۂ ہود کی آیت ۸۵ کے تحت ان کے فساد فی الارض اور آیت ۹۴ کے تحت ان کے عذاب کی تفصیل گزر چکی ہے۔

وَعَادًا وَّثَمُوْدَا۟ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۚ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ (۳۸)

عاد اور ثمود

یہاں فعل اَخَذْنَا برنبائے قرینہ محذوف ہے یعنی ہم نے عاد و ثمود کو بھی اس سے پہلے عذاب میں پکڑا۔ ان قوموں کی تمدنی و تعمیری ترقیوں کا ذکر پچھلی سورتوں میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔ 'وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ' یہ قریش کو توجہ دلائی گئی ہے کہ قوم لوط کی طرح ان کی بستیوں کے آثار بھی تم سے مخفی نہیں ہیں، تم اپنے تجارتی سفروں میں ان کے کھنڈروں پر سے گزرتے ہو اور اندازہ کر سکتے ہو کہ ماضی میں وہ کس شان و شوکت کے مالک تھے لیکن اب ان کے کھنڈروں کے سوا ان کی کہانی سنانے والا روئے زمین پر کوئی باقی نہیں رہا۔ 'وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ' یعنی یوں تو وہ بڑے کارداں، بڑے زیرک و ہوشیار تعمیر و تمدن اور حکومت و سیاست میں بڑے ماہر و چالاک تھے لیکن ان کی یہ چالاکی و ہوشیاری ان کو شیطان کے پھندوں سے نہ بچا سکی۔ اس نے ان کے دنیوی انہماک کو اس طرح ان کی نگاہوں میں کھبا دیا کہ ان کی آنکھیں خدا اور آخرت کی طرف سے بالکل بند ہو گئیں جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ اصل شاہراہ سے وہ بالکل منحرف ہو گئے اور ہلاکت کے کھڈ میں جا گرے ـــ اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ مجرد سائنس اور تمدن و تعمیر میں کسی قوم کا عروج اس بات کی شہادت نہیں ہے کہ وہ زندگی کی صحیح شاہراہ پر گامزن ہے، جیسا کہ عام طور پر بے بصیرت لوگ سمجھتے ہیں بلکہ یہ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی ایک آنکھ کھلی ہوئی ہے جو اس دنیا کو دیکھتی ہے لیکن دوسری آنکھ جو اس دنیا کی پس پردہ حقیقتوں کو دیکھتی ہے اگر وہ کھلی ہوئی نہ ہو تو تمام علم و سائنس کے باوجود شیطان اس کو ہلاکت کے ایسے کھڈ میں گراتا ہے جس سے اس کو کبھی نکلنا نصیب نہیں ہوتا۔

وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۖ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ

وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ (۳۹)

تاریخ کے بعض نمایاں متکبرین

یہ نام بھی اسی فعل محذوف کے تحت ہیں جس کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ گزرا۔ اقوام کے ذکر کے بعد یہ تاریخ کے بعض نمایاں متکبرین — قارون، فرعون اور ہامان — کا ذکر فرمایا ہے۔ ان تینوں کا ذکر تفصیل سے پچھلی سورتوں میں گزر چکا ہے۔ سورۂ قصص میں ہم نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ حضرت موسیٰ کی قوم میں جو حیثیت قارون کی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم میں اسی سے ملتی جلتی حیثیت ابولہب کی تھی۔ اس وجہ سے یہ محض ماضی کے اشخاص کا حوالہ نہیں ہے بلکہ قریش کے سامنے یہ ایک آئینہ رکھا گیا ہے جس میں ان کے لیڈر اپنی شکلیں بڑی آسانی سے پہچان سکتے تھے۔ فرمایا کہ ان کو بھی موسیٰ نے بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں لیکن ان کی آنکھوں پر غرور کی ایسی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں کہ کوئی نشانی بھی ان کو کھولنے میں کارگر نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ خدا کے عذاب نے ان کو آدبوچا۔ 'وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ' میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جو آیت ۴ میں بیان ہوئی ہے۔ یعنی جب وہ ہمارے عذاب کی گرفت میں آگئے تو اپنے تمام طمطراق، اور اپنے تمام لاؤ لشکر اور اپنی ساری دولت و حشمت کے باوجود ہماری گرفت سے باہر نہ نکل سکے۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۴۰)

خلاصۂ کلام

اب یہ آخر میں بطور خلاصہ مذکورہ بالا تمام اقوام و افراد کا انجام یکجا بیان فرما دیا کہ ان میں سے ہر ایک کو ہم نے اس کے جرم کی پاداش میں پکڑا۔ کسی پر ہم نے حاصب (کنکر پتھر برسا دینے والی طوفانی ہوا) بھیجی، کسی پر رعد و برق کا عذاب بھیجا، کسی کو زمین سمیت دھنسا دیا اور کسی کو غرق کر دیا۔

پچھلی سورتوں میں ان تمام عذابوں کی تفصیل گزر چکی ہے۔

— قوم لوط پر حاصب کا عذاب آیا۔

— عاد، ثمود، مدین پر صیحہ کا عذاب نازل ہوا۔

— قارون زمین میں دھنسا دیا گیا۔

— فرعون اور ہامان غرق کر دیے گئے۔

'وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ' یعنی یہ جو کچھ ہوا خدا کی طرف سے ان پر کوئی ظلم نہیں ہوا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو اچھی طرح آگاہ کر دیا گیا تھا لیکن انھوں نے اللہ کے رسولوں کی کوئی پروا نہ کی۔

۴۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۴۱۔ ۶۹

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں بالترتیب مندرجہ ذیل باتیں واضح فرمائی گئی ہیں۔

مشرکین نے شرک کی اساس پر جو گھروندا بنایا ہے اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اس کی حیثیت مکڑی کے جالے کی ہے۔ اگر اس کے بل پر انھوں نے حق کا مقابلہ کرنا چاہا ہے تو انھوں نے نہایت کمزور سہارا ڈھونڈا ہے۔ یہ سہارا نہ دنیا میں ان کے کام آنے والا بنے گا نہ آخرت میں۔

اہلِ ایمان اطمینان رکھیں کہ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کا عدل ایک دن ظاہر ہو کے رہے گا۔ اہلِ ایمان صبر کے ساتھ اس عدل کے ظہور کا انتظار کریں، دعوتِ حق کے کام میں لگے رہیں اور نماز کا اہتمام رکھیں، نماز تمام برائیوں سے محفوظ رکھنے والی اور اللہ تعالیٰ کی یاد بہت بڑی طاقت ہے۔

اہلِ کتاب کے متعلق مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ اگر وہ مشرکین کے پہلو بہ پہلو ہو کر تم سے بحث و مناظرہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں تو جہاں تک ان کے اشرار کا تعلق ہے ان کو تو منہ نہ لگاؤ البتہ ان کے اندر جو معقول لوگ ہیں ان کو حسن و خوبی کے ساتھ اس قدرِ مشترک کی اساس پر دعوت دو جو ان کے اور تمھارے درمیان موجود ہے۔ اسی ضمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بعض دلائل کی طرف اشارہ اور مخالفین کے بعض مطالبات کا جواب۔

ان مسلمانوں کو ہجرت کی ترغیب جو کفار کے ہاتھوں مصائب کے ہدف بنے ہوئے تھے اور ہجرت کرنے والوں کو دنیا اور آخرت دونوں میں اللہ تعالیٰ کی جو مدد اور کفالت حاصل ہوتی ہے اس کی بشارت۔

آخر میں مشرکینِ قریش کو نہایت سخت الفاظ میں تہدید و وعید کہ قرآن کے خلاف ان کی تمام محاذ آرائی خود ان کے اپنے مسلمات کے خلاف ہے۔ یہ نہایت ناشکرے اور ناہنجار لوگ ہیں۔ ان کو جو نعمتیں حاصل ہوتی ہیں وہ ہیں تو تمام تر اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ لیکن یہ ان کو منسوب دوسروں کی طرف کرتے اور ان کو خدا کا شریک بناتے ہیں۔ یہ لوگ عنقریب اپنی اس ناشکری کا انجام دیکھیں گے اور جو لوگ آج اللہ کے کلمہ کی سربلندی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے لیے اپنی راہیں فراخ کرے گا۔

اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۱-۶۹ مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ
اتَّخَذَتْ بَيْتًا ۚ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ

كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٤١﴾ إِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مِنْ
شَيْءٍ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٤٢﴾ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا
لِلنَّاسِ ۖ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعٰلِمُونَ ﴿٤٣﴾ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَةً لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٤٤﴾ اُتْلُ مَا ع ٤ ١٤ ١٦
أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ ۖ إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ
الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ۗ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا
تَصْنَعُونَ ﴿٤٥﴾ وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتٰبِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۖ
إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ ۖ وَقُولُوا آمَنَّا بِالَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْنَا
وَأُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَإِلٰهُنَا وَإِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿٤٦﴾
وَكَذٰلِكَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتٰبَ ۚ فَالَّذِينَ آتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ
يُؤْمِنُونَ بِهِ ۖ وَمِنْ هٰؤُلَاءِ مَنْ يُؤْمِنُ بِهِ ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِآيٰتِنَا
إِلَّا الْكٰفِرُونَ ﴿٤٧﴾ وَمَا كُنْتَ تَتْلُو مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتٰبٍ وَلَا تَخُطُّهُ
بِيَمِينِكَ ۖ إِذًا لَارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ ﴿٤٨﴾ بَلْ هُوَ آيٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِي
صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِآيٰتِنَا إِلَّا
الظّٰلِمُونَ ﴿٤٩﴾ وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيٰتٌ مِنْ رَبِّهِ ۖ قُلْ
إِنَّمَا الْآيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُبِينٌ ﴿٥٠﴾ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ
أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكَ
لَرَحْمَةً وَذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٥١﴾ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ع ٥ ٧ ١

شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ
وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ
بِالْعَذَابِ ؕ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ؕ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ
بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٥٣﴾ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَاِنَّ
جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿٥٤﴾ يَوْمَ يَغْشٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ
وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٥٥﴾ يٰعِبَادِيَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿٥٦﴾ كُلُّ
نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۟ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿٥٨﴾ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ
عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿٥٩﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ
اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦٠﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ
مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ
اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٦١﴾ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ
عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٦٢﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ
مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا
لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿٦٣﴾ ع ٦ ١٢
وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ

لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٦٤﴾ فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا وقف لازم
اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ
يُشْرِكُونَ ﴿٦٥﴾ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ۙ وَلِيَتَمَتَّعُوا ۚ فَسَوْفَ
يَعْلَمُونَ ﴿٦٦﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَطَّفُ
النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۚ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَكْفُرُونَ ﴿٦٧﴾
وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا
جَاءَهُ ۚ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِلْكَافِرِينَ ﴿٦٨﴾ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا
فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٦٩﴾ ع

ترجمۂ آیات ۴۱-۶۹

ان لوگوں کی تمثیل جنھوں نے اللہ کے سوا دوسرے کارساز بنائے ہیں بالکل مکڑی کی تمثیل ہے جس نے ایک گھر بنایا۔ اور بے شک تمام گھروں سے بودا گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے۔ کاش کہ وہ اس حقیقت کو جانتے! بے شک اللہ اچھی طرح جانتا ہے ان چیزوں کو جن کو یہ اس کے سوا پکارتے ہیں اور وہ عزیز و حکیم ہے۔ اور یہ تمثیلیں ہیں جن کو ہم لوگوں کے غور کرنے کے لیے بیان کرتے ہیں لیکن ان کو صرف اہل علم ہی سمجھتے ہیں۔ ۴۱-۴۳

اللہ نے آسمانوں اور زمین کو مقصدِ حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے ایمان والوں کے لیے۔ جو کتاب تم پر وحی کی جا رہی ہے اس کو پڑھو اور نماز کا اہتمام کرو۔ بے شک نماز بے حیائی اور منکر سے روکتی ہے اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے۔ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۴۴-۴۵

اور اہل کتاب سے بحث کرو مگر اس طریقہ پر جو بہتر ہے بجز ان کے جو ان میں سے

ظالم ہیں اور کہو کہ ہم ایمان لائے اس چیز پر جو ہم پر نازل ہوئی اور اس چیز پر بھی جو تمھاری طرف اتاری گئی اور ہمارا اور تمھارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کی فرماں برداری کرنے والے ہیں۔ ۴۶

اور اسی طرح ہم نے تمھاری طرف بھی کتاب اتاری تو جن کو ہم نے کتاب عطا فرمائی ہے وہ اس پر ایمان لائیں گے اور ان میں سے بعض اس پر ایمان لا بھی رہے ہیں۔ اور ہماری آیات کا تو بس وہی انکار کرتے ہیں جو کٹر کافر ہیں۔ اور تم تو اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اس کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ ایسا ہوتا تو یہ جھٹلانے والے مین میکھ نکالتے۔ بلکہ یہ تو کھلی ہوئی آیات ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم عطا ہوا ہے۔ اور ہماری آیات کا بس وہی لوگ انکار کر رہے ہیں جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔ ۴۷-۴۹

اور وہ کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی جانب سے نشانیاں کیوں نہیں اتاری گئیں! کہہ دو، نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں اور میں تو بس ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ کیا ان کے لیے یہ چیز کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب اتاری وہ ان کو پڑھ کر سنائی جا رہی ہے۔ بے شک اس کے اندر رحمت اور یاددہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ کہہ دو کہ اللہ میرے اور تمھارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور اللہ کا جنھوں نے انکار کیا وہی لوگ اصلی نامراد ہیں۔ ۵۰-۵۲

اور یہ لوگ تم سے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں اور اگر اس کے لیے ایک مدت مقرر نہ ہوتی تو ان پر عذاب آ دھمکتا۔ اور وہ ان کے اوپر اچانک آ جائے گا اور ان کو

اس کی خبر بھی نہ ہوگی۔ اور وہ تم سے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں حالانکہ جہنم کافروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس دن کو یاد کریں جس دن عذاب، ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے ان کو ڈھانک لے گا اور ارشاد ہوگا کہ اب چکھو اس چیز کا مزا جو تم کرتے رہے ہو۔ ۵۲-۵۵

اے میرے بندو، جو ایمان لائے ہو، بے شک میری زمین بڑی کشادہ ہے تو بس میری ہی بندگی کرو۔ ہر جان کو موت کا مزا چکھنا ہے پھر تم ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ہم ان کو جنت کے بالاخانوں میں متمکن کریں گے، اس کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ کیا ہی خوب صلہ ہے کارگزاروں کا، جنھوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر ہر حال میں انھوں نے بھروسہ رکھا اور کتنے جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ ہی ان کو بھی رزق دیتا ہے اور تم کو بھی۔ اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۵۶-۶۰

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو اور کس نے مسخر کیا ہے سورج اور چاند کو؟ تو وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے۔ تو وہ کہاں اوندھے ہو جاتے ہیں! اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کا رزق چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان سے کس نے پانی اتارا، پس اس سے زمین کو زندہ کیا، اس کے مردہ ہو چکنے کے بعد، تو وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے۔ کہو، شکر کا سزاوار اللہ ہے۔ بلکہ ان کے اکثر عقل سے کام نہیں لیتے۔ ۶۱-۶۳

اور یہ دنیا کی زندگی تو بس لہو و لعب ہے۔ اور دارِ آخرت ہی ہے جو اصل زندگی کی جگہ

ہے اگر وہ اس کو جانتے! ۶۴

پس جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں اللہ کو پکارتے ہیں اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے۔ پس جب ان کو خشکی کی طرف نجات دے دیتا ہے تو پھر وہ اس کے شریک ٹھہرانے لگتے ہیں کہ ہم نے جو نعمت بخشی اس کی ناشکری کریں اور چند دن اور بہرہ مند ہو لیں۔ پس وہ عنقریب جانیں گے۔ ۶۵-۶۶

کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لیے ایک مامون حرم بنایا اور حال یہ ہے کہ لوگ ان کے گرد و پیش سے اُچک لیے جاتے ہیں! تو کیا وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں! اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا حق کو جھٹلائے جب کہ وہ اس کے پاس آچکا ہے! کیا ایسے کافروں کا ٹھکانا جہنم میں نہیں ہوگا! ۶۷-۶۸

اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں جھیل رہے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھولیں گے اور بے شک اللہ خوب کاروں کے ساتھ ہے! ۶۹

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۖ اِتَّخَذَتْ بَیْتًا ۖ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُیُوْتِ لَبَیْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (۴۱)

شرک اور اہلِ شرک کی تمثیل

اوپر کے بیان کردہ تاریخی حقائق سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی نہیں بن سکتا۔ مشرکین نے خدا کے سوا جو سہارے ڈھونڈھے تھے وہ سب جھوٹے ثابت ہوئے۔ اور یہ جس طرح اس دنیا میں جھوٹے ثابت ہوئے اسی طرح آخرت میں بھی جھوٹے ثابت ہوں گے۔ خدا کا قانون مجازات اور اس کا بے لاگ عدل لازماً ظہور میں آکے رہے گا اور جو لوگ اپنے فرضی دیوتاؤں کی سفارش پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جس سہارے کو انھوں نے قلعہ کی دیوار سمجھا اس کی حقیقت

مکڑی کے جالے سے زیادہ نہیں تھی۔ اسی حقیقت کو یہاں تمثیل کی صورت میں سمجھایا ہے کہ اللہ کے سوا دوسروں کا سہارا ڈھونڈنے والوں کی مثال مکڑی کی ہے جو اپنے بنے بونے جالے کو اپنے زعم میں بڑی چیز سمجھتی ہے لیکن سب سے زیادہ بے ثبات اور بودا گھر مکڑی ہی کا ہوتا ہے جو ہوا کے ایک جھونکے کی بھی تاب نہیں لا سکتا۔ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ یعنی اصل حقیقت تو یہ ہے جو ظاہر کر دی گئی ہے لیکن اس کا فائدہ تو جب ہے کہ یہ لوگ سمجھیں لیکن ان نادانوں میں اس حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت کہاں!

إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُونَ مِن دُونِهِ مِن شَيْءٍ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۴۲)

یعنی کوئی یہ نہ خیال کرے کہ مشرکین کے دیویوں دیوتاؤں کی یہ تمثیل ان کی مبالغہ آمیز تحقیر ہے۔ یہ تحقیر نہیں بلکہ اصل حقیقت کا اظہار ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دیویوں دیوتاؤں کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے۔ "اچھی طرح واقف ہے" کے اسلوب بیان میں جو طنز و تحقیر مضمر ہے وہ اصحاب ذوق سے مخفی نہیں ہے۔ یہ اسلوب ہماری زبان میں بھی معروف ہے۔

شرک کی نفی خدا کی صفات سے

وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ یعنی یہ دیوی دیوتا اس خدا کے مقابل میں اپنے پجاریوں کے کیا کام آ سکیں گے جو عزیز بھی ہے اور حکیم بھی۔ 'عزیز' یعنی سب پر غالب اور سب کی رسائی سے بالاتر۔ 'حکیم' یعنی جس کا ہر کام عدل و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب خدا عزیز ہے تو کوئی دوسرا، خواہ اس کا مرتبہ کتنا ہی اونچا ہو اس کو اپنے زور و اثر سے دبا نہیں سکتا اور جب وہ حکیم بھی ہے تو کوئی اس کے قانونِ مجازات و عدل کو باطل نہیں کر سکتا۔ تو جب یہ دیوی دیوتا نہ اس کو دبا سکتے اور نہ اس کے عدل پر سرِ مُو اثر انداز ہو سکتے تو آخر یہ کس مرض کی دوا ہیں کہ نادان لوگ ان کی پوجا کرتے ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین اپنے معبودوں کے متعلق یہ گمان رکھتے تھے کہ یہ خدا کے ہاں بڑا زور و اثر رکھنے والے ہیں اس وجہ سے یہ اپنی پرستش کرنے والوں کو، خواہ ان کے اعمال کچھ بھی ہوں، خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے۔ یہ عقیدہ خدا کے عزیز و حکیم ہونے کی نفی کرتا ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی ان دونوں صفتوں کی یاد دہانی کر کے اس بے ہودہ عقیدہ کی نفی کر دی۔

وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۖ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ (۴۳)

قرآن کی اصطلاح میں اصل عالم کون ہیں؟

'امثال' سے اشارہ ان تمام امثال و واقعات کی طرف ہے جو اوپر مذکور ہوئے ہیں۔ فرمایا کہ یہ مثالیں ہم جو بیان کر رہے ہیں اس سے مقصود داستان سرائی نہیں ہے۔ ہم یہ اس لیے پیش کر رہے ہیں کہ لوگ ان پر غور کریں اور خود اپنی زندگیوں کے لیے ان سے سبق حاصل کریں۔ کوئی مثال جب کسی کے سامنے رکھی جاتی ہے تو اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر اس کو خود اس کا ماضی و مستقبل دکھا دیا جائے۔ لیکن دوسروں کی مثال سے خود اپنے لیے سبق حاصل کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ یہ کام وہی لوگ کرتے ہیں جن کے اندر عقل و علم کی روشنی موجود ہو۔ یہاں 'عالمون' سے وہ لوگ مراد ہیں جن کی فطری صلاحیتیں

زندہ اور جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ ہر واقعہ سے سبق حاصل کرتے ہیں جس سے درجہ بدرجہ ان کے علم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ برعکس اس کے جن کے اندر سبق آموزی و عبرت پذیری کی صلاحیت مردہ ہو جاتی ہے وہ اول تو اس طرح کی چیزوں کی طرف دھیان ہی نہیں کرتے اس لیے کہ اس سے ان کی بے فکری میں خلل پڑتا ہے اور اگر کچھ توجہ کرتے بھی ہیں تو اس میں اپنے لیے کوئی درس تلاش نہیں کرتے بلکہ اس کو محض قصۂ ماضی سمجھتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اصطلاح میں اصلی عالم وہ لوگ نہیں ہیں جو اپنے اوپر کتابوں کا بوجھ لادے ہوئے ہیں بلکہ عالم وہ ہیں جو آفاق و انفس کی نشانیوں پر غور کرنے والے اور ان سے صحیح سبق حاصل کرنے والے ہیں۔

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۴۴)

آسمان و زمین کی شہادت

یعنی آسمانوں اور زمین کے نظام پر جو شخص بھی غور کرے گا اس پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ دنیا نہ تو کسی خالق کے بغیر وجود میں آگئی ہے اور نہ یہ مختلف دیوتاؤں کی کوئی بازی گاہ یا رزم گاہ ہے بلکہ یہ ایک علیم و حکیم اور عزیز و مقتدر خالق نے ایک مقصدِ حق کے ساتھ اس کو وجود بخشا ہے اور یہ اپنے وجود سے شہادت دے رہی ہے کہ ایک دن آئے گا جب یہ مقصدِ حق سب کے سامنے آجائے گا۔ اس دن اس کے خالق کا کامل عدل ظاہر ہوگا اور باطل بالکل نابود ہو جائے گا۔ جو لوگ اس دنیا کو ایک بازی گاہ سمجھ کر زندگی بطالت میں گزار رہے ہیں وہ اپنی اس بے فکری کے انجام سے دوچار ہوں گے اور جو لوگ آنکھیں کھول کر زندگی بسر کریں گے وہ خالق کی ابدی خوشنودی کے حق دار ٹھہریں گے۔ 'وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا' الآیۃ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

'اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ'۔ 'اٰيَةً' کی تنکیر تفخیمِ شان کے لیے ہے یعنی اس میں اہلِ ایمان کے لیے بہت بڑی نشانی ہے۔ اس نشانی کے مختلف پہلو مختلف مقامات میں واضح کیے جا چکے ہیں اس وجہ سے یہاں ہم صرف اجمالی اشارات پر اکتفا کریں گے۔

اس میں سب سے بڑی نشانی تو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ایک روزِ جزا و سزا کے ظہور کی ہے۔ یہ دنیا اپنے وجود سے شہادت دے رہی ہے کہ اس کا خالق حکیم ہے اس وجہ سے لازم ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں اس کا کامل عدل و حق ظاہر ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دنیا محض کسی کھلنڈرے کا ایک کھیل ہے اور یہ بات اس عظیم خالق کی شان کے بالکل منافی ہے جس کی قدرت، حکمت اور رحمت اس دنیا کے ہر گوشے سے نمایاں ہے۔

دوسری نشانی اس میں اس بات کی ہے کہ اس دنیا میں انجام کے اعتبار سے کامیاب زندگی وہی ہے

جو آخرت کو نصب العین بنا کر گزاری جائے اس لیے کہ ابدی کامیابی اور ابدی ناکامی کا فیصلہ وہیں ہونا ہے۔ یہ دنیا آخرت کے بغیر ناتمام ہے۔ اس کی تکمیل آخرت میں ہوگی جب کہ اس کی پیدائش کا اصلی مقصد ظہور میں آئے گا۔ یہ چیز اس بات کی متقاضی ہے کہ ہر چیز کے خیر و شر کا فیصلہ اس کے اخروی نتائج کو سامنے رکھ کر کیا جائے۔ ہو سکتا ہے بلکہ ہمیشہ ہوا ہے کہ حق کی راہ میں اہلِ حق کو نہایت زہرہ گداز مصائب سے سابقہ پیش آیا ہے لیکن ان مصائب سے گھبرا کر حق سے انحراف جائز نہیں ہے اس لیے کہ یہ مصائب اپنے نتائج کے لحاظ سے نہایت خوش آئند ہیں۔

تیسری نشانی اس میں اس بات کی ہے کہ شرک و شفاعت کا نظریہ بالکل باطل ہے اس لیے کہ یہ نظریہ اس کائنات کے 'بالحق' ہونے کی بالکل نفی کر دیتا ہے۔ اگر اس کائنات میں ایسے شرکاء و شفعاء کا وجود مان لیا جائے جو اپنے زور یا اثر سے کسی حق کو باطل یا باطل کو حق بنا سکتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ کائنات 'بالحق' نہیں ہے بلکہ ایک اندھیر نگری ہے۔

اس ٹکڑے کی مزید وضاحت آگے سورۂ روم کی آیت ۸ کے تحت آئے گی۔ یہاں ان اشارات پر اکتفا فرمائیے۔

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ (۴۵)

پیغمبر صلعم اور مسلمانوں کو تسلی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ تم یہ قرآن لوگوں کو سناؤ اور اسی کے ذریعے سے لوگوں کو دعوت دو۔ اگر مخالفین ان نشانیوں اور دلائل کی طرف توجہ نہیں کرتے جن کی طرف قرآن ان کو توجہ دلا رہا ہے بلکہ معجزے یا عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں تو ان کے ان مطالبات کی کوئی پروا نہ کرو۔ قرآن ان کے لیے ایک عظیم رحمت ہے۔ اگر وہ اس کی قدر نہیں کریں گے تو اس کا انجام خود بھگتیں گے۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ۔ یعنی اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے نماز کا اہتمام کرو۔ اس خاص مرحلے میں نماز کے اہتمام کی یہ تاکید، قرینہ دلیل ہے کہ عام نماز کے ساتھ اس خاص نماز کے لیے ہے جس کی ہدایت صبر و استقامت کے حصول کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کو فرمائی گئی تھی اور جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں جگہ جگہ گزر چکا ہے۔

دعوت اور جماعتی تربیت کے لیے دو باتوں کی ہدایت

یہاں دو باتوں کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ ایک تلاوتِ وحی کی، دوسری اہتمامِ نماز کی۔ پہلی چیز کا تعلق عام تبلیغ و دعوت سے ہے اور دوسری چیز کا تعلق مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی تربیت و اصلاح سے۔ آیت کے اسلوب سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تلقین فرمائی جا رہی ہے کہ جہاں تک دوسروں کا تعلق ہے ان کے نت نئے مطالبات کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جو وحی تم پر کی جا رہی ہے وہ لوگوں کو پہنچا دو، وہ اس کی قدر کریں یا نہ کریں۔ تمھارے اوپر اصل ذمہ داری اس وحی کو

پہنچا دینے کی ہے۔ اس سے آگے تمہارے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ رہے وہ لوگ جو تمہاری دعوت قبول کر چکے ہیں تو ان کی تربیت کے لیے نماز کا اہتمام کرو۔ یہی چیز ان کو ان مفاسد سے پاک کرے گی جو پچھلی قوموں کی تباہی کا باعث ہوئے اور اسی سے ان کے اندر وہ قوت و ہمت پیدا ہوگی جو مشکلات و مصائب کے علی الرغم ان کو ایک صالح معاشرہ کی ذمہ داریاں اٹھانے کا اہل بنائے گی۔

نماز کے دو اہم پہلو

یہاں اس نماز کے دو اثرات بیان ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ فحشاء اور منکر سے روکتی ہے۔ (اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ) اور دوسرا یہ کہ نماز اللہ کی یاد ہے اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے (وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ) نماز کے یہ دونوں پہلو کسی قدر وضاحت کے محتاج ہیں۔

'فحشاء' اور 'منکر'، کے دو لفظوں نے اخلاق مفاسد کے تمام پہلو اپنے اندر سمیٹ لیے ہیں۔ بہت سی برائیاں ایسی ہیں جو شہوانی جذبات کی بے اعتدالی یا ان کے انحراف سے وجود میں آتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ پورے معاشرے کو اس طرح بے حیا بنا دیتی ہیں کہ لوگوں کے اندر سے بے حیائی کا احساس ہی مٹ جاتا ہے۔ ماضی کی قوموں میں سے اس کی مثال کے طور پر قرآن نے قوم لوط کا ذکر کیا ہے۔ حضرت لوطؑ نے اپنی قوم کی بے حیائی کے لیے 'فاحشۃ' کا لفظ استعمال بھی فرمایا ہے۔ اس زمانے میں جدید فکر و فلسفہ اور نئی تہذیب کی برکت سے بے حیائی و فحاشی کی جو نت نئی شکلیں وجود میں آئی ہیں اور برابر آ رہی ہیں ان کے تقابل میں قوم لوط کی بے حیائی بالکل گرد ہو کے رہ گئی ہے اور جن لوگوں کی نظر حالات پر ہے وہ جانتے ہیں کہ اب ہمارا معاشرہ بھی پوری طرح ان کے لپیٹ میں آچکا ہے اور آہستہ آہستہ لوگوں کا ضمیر اس طرح مردہ ہوتا جا رہا ہے کہ ہماری قوم کا بہت بڑا طبقہ، جو ہماری بدقسمتی سے تعلیم یافتہ بھی کہلاتا ہے، ان بے حیائیوں کو بے حیائی سمجھنا تو درکنار ان کو تہذیب و ترقی کا لازمہ سمجھنے لگا ہے اور جو لوگ ان پر تنقید کرتے ہیں ان کو احمق اور دقیانوسی قرار دیتا ہے۔

دوسری برائیاں وہ ہیں جو طمع و حرص کی بے اعتدالی اور حب مال و جاہ کی زیادتی سے ظہور میں آتی ہیں۔ ان کے لیے یہاں جامع لفظ 'منکر' استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ معروف کا ضد ہے اس وجہ سے وہ تمام برائیاں اس میں شامل ہیں جو ایک صالح معاشرہ کی پاکیزہ روایات اور اس کے معروف مسلّمات کے خلاف ہوں۔ پچھلی قوموں میں سے قوم عاد و ثمود کے تمدنی مفاسد اور قوم شعیب کے معاشی فساد کا ذکر قرآن نے اس کی مثال کے طور پر کیا ہے اور اس زمانے میں معاشرت و معیشت کا یہ فساد زندگی کے ہر شعبہ پر جس طرح چھا چکا ہے اس کے متعلق یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو کہ ماضی کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے۔

یہاں معروف و منکر سے متعلق ان اشارات پر قناعت فرمائیے۔ آگے سورۂ روم کی آیات ۳۱ - ۴۰ اور سورۂ لقمان کی آیت ۱۷ کے تحت اس پر مفصل بحث ان شاء اللہ آئے گی۔

فرمایا کہ نماز ان تمام برائیوں سے روکتی ہے۔ 'روکتی ہے' یعنی نماز کی حیثیت ایک نہایت مؤثر واعظ وزاجر کی ہے۔ جو لوگ نماز اس کے آداب و شرائط کے ساتھ ادا کرتے ہیں، خواہ خلوت کی نماز ہو یا جلوت کی، ان کی نماز اپنے ظاہر و باطن دونوں سے، ان کو ان حقائق کی یاد دہانی کرتی رہتی ہے جن کی یاد دہانی زندگی کو صحیح شاہراہ پر قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ خاص طور پر خلوت کی نمازیں انسان کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا تو اس کی مثال اس ڈرائیور کی ہے جو اپنی زندگی کی گاڑی پوری رفتار سے چلا تو رہا ہے لیکن اس کی رہنمائی کے لیے داہنے بائیں جو نشانات اس کو صحیح راہ بتانے اور خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے لگے ہوئے ہیں ان سے وہ بالکل بے پروا اور بے خبر ہے۔ ایسا ڈرائیور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اپنی گاڑی کس کھڈ میں گرائے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ اثرات اس نماز کے بیان ہو رہے ہیں جو صحیح "تذکر" اور اخلاص کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ اگر کسی نماز کے اندر یہ اثرات مفقود ہوں تو لازماً وہ یا تو صحیح "تذکر" سے خالی ہے یا اخلاص سے۔ یعنی یا تو نماز پڑھنے والا اپنی نماز کے معنی مفہوم سے بالکل بے خبر ہے، اس کو کچھ معلوم نہیں کہ نماز میں اس نے کس چیز کا اقرار اور کس بات کا انکار کیا ہے یا یہ کہ اس نے محض دوسروں کو دکھانے کے لیے ریاکاری (ایکٹنگ) کی ہے۔

'وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ'۔ یہ نماز کے دوسرے پہلو کی طرف اشارہ ہے اور دو لفظوں کے اندر معانی کا ایک جہان پوشیدہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس نازک موقع پر جماعت کے اندر عزم و حوصلہ اور قوت و استقامت پیدا کرنے کے لیے نماز کے اہتمام کی جو تاکید کی جا رہی ہے اس کو کوئی معمولی بات یا محض طفل تسلی نہ تصور کرے۔ اس سوئے ظن میں نہ مبتلا ہو کہ بھلا نماز جماعت کی تنظیم و تقویت میں کیا مؤثر ہو سکتی ہے! حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے۔ اسی سے انسان کے دل کو حقیقی طمانیت و سکینت حاصل ہوتی ہے۔ 'اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ' (اچھی طرح سن لو کہ دلوں کو طمانیت اللہ کی یاد سے حاصل ہوتی ہے) اور دل ہی انسان کے اندر وہ چیز ہے جو تمام عزم و حوصلہ کا منبع ہے۔ اگر دل مضبوط ہے تو انسان سے زیادہ طاقت ور کوئی چیز نہیں اور اگر دل کمزور ہے تو انسان سے زیادہ ناتواں کوئی شے نہیں اور دل کو قوت دینے والی اصلی چیز خدا کی یاد ہے جس کی سب سے زیادہ بہتر جامع اور مؤثر شکل نماز ہے۔

شجاعت اور تہور میں فرق

یہ حقیقت ملحوظ رہے کہ یہاں زیر بحث دل کی وہ طمانیت و سکینت ہے جو انسان کے اندر وہ عزم و حوصلہ پیدا کرتی ہے کہ جو اس کو خدا کے سوا ہر خوف اور ہر طمع سے بے پروا کر دیتی ہے۔ یہی وہ اصلی قوت اور حقیقی شجاعت و بسالت ہے جو ایمان اور خدا کی یاد سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ شجاعت اس تہور سے بالکل مختلف چیز ہے جو مایوسی یا جذبۂ انتقام، یا خوف یا ناموری کی خواہش یا ناعاقبت اندیشی

سے ظہور میں آتا ہے۔ جو لوگ شجاعت اور تہوّر کے اس فرق سے واقف نہیں ہیں وہ ایک مومن کی شجاعت اور ایک کافر کے تہوّر کو ایک ہی نوعیت کی چیز سمجھتے ہیں حالانکہ دونوں کے نفسیاتی محرکات بھی الگ الگ ہوتے ہیں اور اس دنیا میں دونوں کے اثرات بھی دو بالکل مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک کا منبع ایمان اور اللہ کی یاد ہے اور دوسرے کا منبع ان نفسیاتی محرکات میں سے کوئی محرک ہوتا ہے جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔ اس وجہ سے ایک کی شجاعت سے دنیا میں اس طرح کی برکت و رحمت ظہور میں آتی ہے جس طرح کی رحمت و برکت حضرت عمرؓ اور حضرت خالدؓ کی شجاعت سے ظہور میں آئی اور دوسرے کے تہوّر سے اس قسم کا شر و فساد ظہور میں آتا ہے جس قسم کا شر و فساد ہٹلر اور مسولینی اور اس قبیل کے دوسرے متہوّرین کے ہاتھوں ظہور میں آیا۔

مسلمانوں کو تسلی

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ: یہ مسلمانوں کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ اپنی تربیت اور دوسروں کی اصلاح کے لیے جو جدوجہد بھی تم کر رہے ہو یا کرو گے اللہ اس سے اچھی طرح واقف ہے تو جب وہ واقف ہے تو اس پر پورا بھروسہ رکھو کہ وہ تمہاری کوئی محنت خواہ وہ شب کی خلوتوں میں ہو یا دن کی جلوتوں میں، ضائع نہیں جانے دے گا بلکہ تم اپنی ہر کوشش کا بھرپور صلہ پاؤ گے۔

یہاں یہ ملحوظ رہے کہ اوپر کے ٹکڑے میں خطاب بصیغۂ واحد ہے اور اس ٹکڑے میں جمع کا صیغہ آ گیا ہے۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ اوپر کا خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیت امت کے وکیل کے ہے۔ اصلاً وہ خطاب بھی تمام امت سے ہے اس لیے کہ دعوت اور تربیت کی ذمہ داری جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھی اسی طرح دوسرے مسلمانوں پر بھی تھی لیکن واحد کے خطاب سے یہ بات نکلتی ہے کہ پیغمبر کو تو یہ فرض بہرحال ادا کرنا ہے، خواہ دوسرے اس کو ادا کریں یا نہ کریں۔ وہ ادا کریں گے تو اپنی ایک ایک محنت کا اجر پائیں گے اور اگر نہیں کریں گے تو خدا اور اس کے رسول کا کچھ نہیں بگاڑیں گے بلکہ اپنی ہی محرومی کا سامان کریں گے۔

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰـهُنَا وَاِلٰـهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۴۶)

پڑھے لکھے حریفوں سے نمٹنے کے لیے مسلمانوں کو ہدایت

دعوت کے اس دور میں، جو اس سورہ میں زیر بحث ہے، اہل کتاب بھی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اس وجہ سے جس طرح اوپر والی آیت میں ان لوگوں کے باب میں دعوت کا طریقہ واضح کر دیا گیا جو قرآن کی صداقت تسلیم کرنے کے لیے معجزات کے طالب تھے اسی طرح یہاں چند آیات میں اس طریقہ کی وضاحت فرما دی گئی جو اہل کتاب کے ساتھ بحث و استدلال میں مسلمانوں کو اختیار کرنا چاہیے۔ اہل کتاب کی اس خصوصیت کی وجہ آگے کی آیات سے خود واضح ہو جائے گی کہ ان کی دینی حیثیت بھی مشرکین عرب سے بالکل مختلف تھی اور ان کے شبہات و اعتراضات بھی ذرا مختلف نوعیت کے تھے۔ یہ پڑھے لکھے

جنّات تھے اس وجہ سے ضروری ہوا کہ ان سے نمٹنے کے لیے مسلمانوں کو ضروری ہدایات پہلے سے دے دی جائیں۔

فرمایا کہ اہل کتاب سے بحث و استدلال کی نوبت آئے تو ان سے صرف احسن طریقہ سے بحث و استدلال کرو۔ 'مجادلۃ' یہاں اچھے معنوں یعنی بحث و استدلال اور حجت کے مفہوم میں ہے۔ اور 'طریقہ احسن' کی وضاحت اسی آیت کے آگے والے ٹکڑے میں آگئی ہے کہ تمہارے اور ان کے درمیان دین کے جو مشترک اقدار ہیں ان کو بنیاد قرار دے کر ان سے مطالبہ کرو کہ وہ بھی ان مشترک اقدار اور ان کے لوازم کو تسلیم کریں اور اپنی مانی ہوئی باتوں کی خود اپنے منہ سے تردید نہ کریں۔ اس طریقۂ بحث سے ان کی انانیت کو ٹھیس نہیں لگے گی۔ ان میں جو سلیم الطبع ہوں گے وہ تمہاری باتوں پر غور کریں گے اور کیا عجب کہ ان میں سے کچھ ایسے نفوس بھی نکل آئیں جو حق کو قبول کر لیں۔

'اِلَّا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡہُمۡ'۔ عام طور پر لوگوں نے اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ اہل کتاب میں سے جو شریر اور مناظرہ باز ہیں ان کے ساتھ طریق احسن کی پابندی ضروری نہیں ہے، ان کو ترکی بہ ترکی جواب دیا جائے لیکن میرے نزدیک یہ استثنائے منقطع ہے۔ اس وجہ سے اس کا مطلب یہ ہو گا کہ رہے وہ جو ان میں سے شریر اور مناظرہ باز ہیں تو ان کو سرے سے منہ ہی نہ لگاؤ۔ قرآن کے نظائر سے اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ضدی اور کج فہم مناظرہ بازوں اور کٹ حجتی کرنے والوں سے اعراض کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ سورۂ کہف میں یہ تصریح بھی موجود ہے کہ جو ہٹ دھرم بات سمجھنی نہیں چاہتے ان سے اول تو تعرض ہی نہ کرو اور اگر کبھی بحث کی نوبت آ ہی جائے تو بات ٹالنے (مراء ظاہر) کے انداز میں گفتگو کرو۔ حضرات انبیاء علیہم السلام اور صالحین کا طریقۂ بحث و دعوت ہمیشہ یہی رہا ہے اور یہی طریقہ خیر و برکت کا طریقہ ہے۔ شریروں اور کج فہموں کے جواب میں انھیں کی سی روش اختیار کر لینا اور الزام کا جواب الزام اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینا نہ انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہے اور نہ اس میں کوئی خیر و برکت ہے۔

احسن طریقۂ بحث کی وضاحت

'وَقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا بِالَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡنَا وَ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ وَ اِلٰـہُنَا وَ اِلٰـہُکُمۡ وَاحِدٌ وَّ نَحۡنُ لَہٗ مُسۡلِمُوۡنَ'۔ یہ اس احسن طریقۂ بحث و دعوت کی وضاحت ہے کہ تمہارے اور ان کے درمیان قدر مشترک موجود ہے اس وجہ سے اس قدر مشترک کو بنیاد بنا کر ان کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دو۔ ان سے کہو کہ ہم اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اتری ہے اور اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو تم پر اتری ہے۔ ہم جس کتاب پر ایمان لائے ہیں وہ تمہاری کتابوں کی مکذب نہیں بلکہ ان کی مصدق ہے۔ تمہاری کتابوں میں آخری نبی اور کتاب کامل سے متعلق جو پیشین گوئیاں تھیں وہ اپنے مصداق کے ظہور کی منتظر تھیں اس کتاب سے وہ مصداق ظہور میں آگیا تو ہم تمام اگلے انبیاء اور صحیفوں پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ اگر تم بھی صحیح روش

اختیار کرو تو تمھیں اس رسول اور اس کتاب سے چڑنے کے بجائے ان کا خیر مقدم کرنا چاہیے جن کے ظہور سے سب سے زیادہ تمھارا سر اونچا ہوا ہے اس لیے کہ ان کی بشارت اپنے صحیفوں کے واسطے سے تمھی نے دنیا کو سنائی تھی۔ اب اگر ضد میں آکر تم نے انکار کیا تو تم خود اپنے کو اور اپنے صحیفوں کو جھٹلاؤ گے درآنحالیکہ ہم تمھارے صحیفوں کی تصدیق و تائید کر رہے ہیں۔

اسی طرح ان کو کامل توحید کی بھی دعوت دو اور ان سے کہو کہ ہمارا اور تمھارا معبود ایک ہی ہے۔ اس مسئلہ میں ہمارے اور تمھارے درمیان کوئی اصولی نزاع نہیں ہے۔ تورات و انجیل اور دوسرے تمام صحائف توحید کی تعلیم سے معمور ہیں۔ پس ہم میں اور تم میں اگر کوئی فرق ہے تو یہ ہے کہ جو باتیں اس مسلّم حقیقت کے خلاف ہیں ہم نے ان کو چھوڑ کر اپنے آپ کو اپنے ایک ہی رب کے حوالہ کر دیا ہے۔ اور تمھارا حال یہ ہے کہ تم توحید کے بھی مدعی ہو اور ساتھ ہی تم نے اپنے اندر ایسی باتیں بھی جمع کر رکھی ہیں جو اس عقیدے سے صریحاً متناقض ہیں تو ہماری دعوت تمھارے لیے یہ ہے کہ جس طرح ہم نے اپنے آپ کو کلیتہً اپنے ایک ہی رب کے حوالہ کر دیا ہے اسی طرح تم بھی اپنا یہ تناقض دور کر کے مسلم بن جاؤ۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ (۴۷)

قرآن کا دعویٰ — 'وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ' یعنی دعوت کے اسی اصول پر جس کی طرف اوپر کی آیت میں اشارہ ہے ہم نے تم پر یہ کتاب اتاری ہے۔ یہ کتاب اس بات کی مدعی نہیں ہے کہ سب سے پہلے یہ باتیں اسی کتاب میں نازل ہوئیں بلکہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام نبیوں اور رسولوں نے اسی دین کی دعوت دی ہے جس کی دعوت یہ کتاب دے رہی ہے لیکن پچھلی امتوں نے یا تو اللہ کی اتاری ہوئی تعلیمات بھلا دیں یا ان میں اپنی خواہشِ نفس کے مطابق تبدیلیاں کر دیں اس طرح اللہ کا دین بالکل مسخ و محرف ہو گیا تھا۔ اب اللہ نے اپنے دین کو بالکل صحیح اور مکمل صورت میں اس کتاب اور اس رسول کے ذریعہ سے پھر دنیا میں اتارا ہے تاکہ خلق اللہ کی ہدایت سے محروم نہ رہے۔

صالحین اہل کتاب کے ایمان کی بشارت — 'فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ' ہم پیچھے جگہ جگہ یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ قرآن نے جہاں جہاں اہل کتاب کا ذکر معروف کے صیغے سے کیا ہے، جیسا کہ یہاں ہے، بالعموم اچھے معنوں میں کیا ہے اس وجہ سے 'اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ' سے یہاں مراد عام اہل کتاب نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر کے وہ لوگ ہیں جو اپنے علم کے حد تک تورات و انجیل پر قائم تھے۔ ان لوگوں کے باب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بشارت دی کہ اگر ان کے آگے تم اس کتاب کو اس طرح پیش کرو گے جس طرح تمھیں ہدایت کی جا رہی ہے تو یہ صالحین اس کتاب پر ایمان لائیں گے۔

'وَمِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ' - یہاں 'يُّؤْمِنُ بِهٖ' حال کے مفہوم میں ہے۔ فرمایا کہ اسی گروہ

کے کچھ لوگ ہیں جن کو تم دیکھ رہے ہو کہ وہ ایمان لا بھی رہے ہیں۔ اسی طرح دوسرے لوگ بھی جن کے اندر صلاحیت باقی ہے آہستہ آہستہ حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں گے۔

'وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ'۔ یعنی ہماری آیات (قرآن) کا انکار تو ان اہل کتاب میں سے صرف وہی کریں گے جو کٹے کافر ہیں یعنی جن کا ایمان نہ اپنی کتابوں اور اپنے نبیوں اور رسولوں پر ہے اور نہ وہ آئندہ کسی چیز پر ایمان لانے کے لیے تیار ہیں۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (۴۸)

آنحضرت صلعم کی رسالت کی ایک دلیل

یہ اہل کتاب کو توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر وہ ضد اور انانیت سے کام نہ لیں تو تمھاری رسالت کی یہ دلیل ان کے لیے کافی ہے کہ ایک شخص جس نے نہ آسمانی صحیفوں میں سے کوئی صحیفہ پڑھا اور نہ جو لکھنے کے فن سے واقف ہے آخر اس کے اوپر یہ تمام علوم کہاں سے برس پڑے کہ اس نے نہ صرف تمام نبیوں کی تعلیم کو از سر نو زندہ کر دیا بلکہ جو کسر انھوں نے چھوڑی تھی وہ بھی اس نے پوری کر دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی یہ دلیل یوں تو سب پر حجت ہے لیکن اہل کتاب پر یہ خاص طور پر حجت ہے اس لیے کہ وہ انبیاء سابقین کی تمام شریعت و حکمت کے وارث تھے۔ انھیں سوچنا چاہیے تھا کہ حضرت نوحؑ و حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت موسیٰؑ و حضرت مسیحؑ تک کے سارے خزائن حکمت ایک اُمّی پر کس طرح نازل ہو گئے۔

'اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ'۔ یعنی اگر تم پڑھے لکھے ہوتے تب تو یہ جھٹلانے والے لوگ کوئی نہ کوئی لایعنی بات شک پیدا کرنے والی بنا سکتے تھے۔ بصورت موجودہ ان کے لیے کوئی بات بنانے کا موقع تو ہے نہیں لیکن اب بھی اگر وہ شکوک پیدا کرتے ہیں تو ان کی شامت ہی ہے۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ (۴۹)

سچے اہل کتاب کے لیے قرآن ان کے دل کی آواز ہے

یعنی اہل کتاب میں سے جن کے اندر دین کا صحیح علم ہے ان کے سینوں میں تو یہ قرآن نہایت واضح اور روشن آیات کی شکل میں موجود ہے۔ وہ اس کی ہر بات کو اپنے ہی دل کی بات سمجھتے ہیں۔ ان کے لیے یہ ایک جانی پہچانی ہوئی اور ایک موعود و منتظر چیز ہے۔ وہ اپنے نبیوں کی پیشین گوئیوں کی بنا پر اس کے لیے سراپا انتظار تھے۔ اور اب اس کو پا کر سمجھتے ہیں کہ گویا ان کو اپنی مطلوب و محبوب چیز مل گئی۔ قرآن مجید میں سچے اہل کتاب کے جذبات، قرآن اور آخری رسول سے متعلق نہایت واضح الفاظ میں نقل ہوئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس طرح آخری بعثت کے لیے چشم براہ تھے اور کس والہانہ جذبہ کے ساتھ انھوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس آیت میں بھی اجمال کے ساتھ اسی حقیقت کی

طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

'وَمَا یَجۡحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوۡنَ' میں وہی حقیقت دوسرے الفاظ میں واضح فرمائی گئی ہے جو اوپر آیت ۴۶ میں بیان ہو چکی ہے۔ یعنی قرآن کی ان آیات کا انکار تو وہی کرتے ہیں جنھوں نے اللہ کے عطا کردہ علم کی ناقدری کر کے اپنے سینوں اور دلوں کو تاریک کر لیا ہے اور اس طرح خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے ہیں۔ یہاں 'ظٰلِمُوۡنَ' سے وہی بدبخت لوگ مراد ہیں جن کا ذکر اوپر آیت ۴۶ میں 'اِلَّا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا' کے الفاظ سے ہوا ہے اور جن کے باب میں مسلمانوں کو یہ ہدایت فرمائی گئی کہ ان سے کوئی امید نہ رکھی جائے۔ وہ بالکل ناقابلِ علاج ہیں۔

وَقَالُوۡا لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡہِ اٰیٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ ؕ قُلۡ اِنَّمَا الۡاٰیٰتُ عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ (۵۰)

اہلِ کتاب کے سکھائے ہوئے ایک اعتراض کا جواب

یہ اہلِ کتاب کا ایک اعتراض نقل کر کے اس کا جواب دیا ہے لیکن جواب کا انداز نہایت بے پروائی کا ہے۔ یہاں تک کہ ان کو مخاطب کرنا بھی پسند نہیں فرمایا ہے بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے آپ کے واسطہ سے ان کو بات پہنچا دی ہے۔ اہلِ کتاب کا عام اعتراض نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اول اول یہی رہا ہے کہ اگر یہ اللہ کے رسول ہیں تو ان کو اس طرح کے معجزے کیوں نہیں عطا ہوئے جس طرح کے معجزے ہمارے نبیوں، خاص طور پر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو عطا ہوئے۔ یہ اعتراض وہ قریش کو اکسانے کے لیے اٹھاتے تھے۔ قریش کے لیڈر ان سے سوال کرتے کہ آپ لوگ نبوت و رسالت کے لوازم و خصوصیات سے خوب واقف ہیں تو ان نئے مدعیِ نبوت کے بارے میں آپ لوگوں کی رائے کیا ہے؟ اس کے جواب میں وہ نہایت معصومانہ انداز میں یہ کہہ دیتے کہ ہم اور کچھ تو کہہ نہیں سکتے لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر یہ اللہ کے رسول ہیں تو آخر ان پر بھی اس طرح کے معجزے کیوں نہیں اتارے گئے جس طرح کے معجزے سابق نبیوں پر اتارے گئے! اہلِ کتاب کے اس اعتراض سے چونکہ قریش کو ایک بہت بڑی تائید حاصل ہو جاتی اس وجہ سے وہ اس کو خوب پھیلاتے اور عوام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بدگمان کرتے۔ قرآن نے یہاں اہلِ کتاب کے القا کردہ اس اعتراض کا جواب دیا ہے اور جواب میں اہلِ کتاب سے زیادہ قریش کو سامنے رکھا ہے اس لیے کہ اس قسم کے اعتراضات سے سب سے زیادہ نقصان انہی کو پہنچتا کہ وہ اپنے حاسدوں کے حسد کے شکار ہو کر اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی رحمت سے محروم ہو جاتے۔

'قُلۡ اِنَّمَا الۡاٰیٰتُ عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ'۔ یہ اس اعتراض کا پہلا جواب ہے کہ نشانیوں اور معجزات کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔ میں اس معاملے میں کوئی دخل نہیں رکھتا۔ وہ اگر چاہے گا تو کوئی نشانی دکھا دے گا اور نہیں چاہے گا تو نہیں دکھائے گا۔ میں تو صرف ایک نذیرِ مبین ہوں، مجھے حکم ہے کہ تمھیں آنے والے خطرات سے اچھی طرح آگاہ کر دوں سو یہ فرض میں ادا کر رہا ہوں۔ باقی تمام

امور اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ میں نے رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے، خدائی کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ تمہاری طلب کے مطابق معجزے دکھا دوں۔

أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَىٰ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (۵۱)

یہ دوسرا جواب ہے اور نہایت جامع ہے۔ فرمایا کہ کیا ان کے لیے تمہاری نبوت و رسالت کی یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ ہم نے تمہارے اوپر ایک کتاب اتاری ہے جو ان کو پڑھ کر سنائی جا رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ایک پوری کتاب ان کو سنائی جا رہی ہے جو اپنے دعوے پر خود حجت ہے اور اس کا سنانے والا بھی سامنے موجود ہے تو اس عظیم نشانی کے ہوتے کسی اور نشانی کی ضرورت کہاں باقی رہی۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَىٰ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ۔ یعنی یہ تو اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہوا ہے کہ کسی حسّی معجزے یا کسی نشانی عذاب کے بجائے اس نے ان پر اپنی کتاب نازل فرمائی۔ اگر وہ کوئی حسّی معجزہ دکھاتا تو وہ بہر حال ایک وقتی چیز ہوتا اور اگر کوئی نشانی عذاب دکھاتا تو وہ ایک آفت ہوتی اور معلوم نہیں وہ کس شکل میں نمودار ہوتی۔ یہ تو اللہ کا بہت بڑا فضل ہوا ہے کہ اس نے ان پر کتاب اتاری جو ان کے واسطے ایک دائمی رحمت اور یاددہانی ہے بشرطیکہ وہ اس کی قدر کریں اور اس پر ایمان لائیں۔ لفظ 'ذِکْرٰی' پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں کہ قرآن درحقیقت انسان کو انہی حقائق کی یاددہانی کرتا ہے جو خود اس کی عقل و فطرت کے اندر موجود ہیں لیکن وہ ان کو بھولا ہوا ہے۔ قرآن کی صداقت ثابت کرنے کے لیے کسی خارجی نشانی یا معجزے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ انسان قرآن کی رہنمائی میں اپنی فطرت کے خزانوں کا جائزہ لے۔ وہ خود پکار اٹھے گا کہ قرآن جو کچھ بتا رہا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔

قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ شَهِيدًا ۖ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوا بِاللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ (۵۲)

مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے یہ شبہات و اعتراضات جو اٹھائے جا رہے ہیں یہ تو محض اوپری باتیں ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کے دل گواہی دے رہے ہیں کہ تم اللہ کے رسول ہو اور جو کچھ تم ان کو بتا رہے ہو حرف حرف ٹھیک ہے تو ایسے لوگوں سے زیادہ بحث و حجت کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو اور ان سے کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہی کے لیے کافی ہے کہ فی الحقیقت تم پر میری صداقت واضح نہیں ہوئی اس وجہ سے تم نے انکار کیا یا سب کچھ جان بوجھ کر محض اپنی شیخت کی پاسداری میں تم نے میری تکذیب کی۔ اللہ آسمانوں اور زمین کے ہر بھید سے اچھی واقف ہے، وہ قیامت کے دن سارا راز کھول دے گا۔ البتہ یہ یاد رکھو کہ جو لوگ جان بوجھ کر باطل پر ایمان لائیں گے اور خدا کا انکار کریں گے وہی لوگ آخرت میں اصلی نامراد ہونے والے ہیں۔

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ ۚ وَلَوْلَآ أَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ۚ وَلَيَأْتِيَنَّهُم بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ (۵۳)

اوپر جن نشانیوں کے مطالبے کا ذکر ہے ان میں خاص طور پر عذاب کی نشانی کے لیے قریش بہت مستعجل تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب قرآن کی تکذیب کی صورت میں ان کو عذاب سے ڈراتے تو اس سے ان کے پندار کو بڑی چوٹ لگتی اور وہ جھنجھلا کر آپ کو زچ کرنے کے لیے یہ مطالبہ کرتے کہ اگر تم اس بات میں سچے ہو تو جس عذاب کی دھمکی سنا رہے ہو وہ لاؤ، ہم اس کو دیکھنے کے لیے بے چین ہیں۔ فرمایا کہ عذاب کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک مدت مقرر ہے، اس مدت سے پہلے عذاب نہیں آتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی یہ مقررہ سنت نہ ہوتی تو ان پر عذاب آ دھمکتا۔ مطلب یہ ہے کہ اس معاملے میں اگر ان لوگوں کی اس جلد بازی کے باوجود دیر ہو رہی ہے تو اس دیر کا سبب نہ کسی کا پاس و لحاظ ہے، نہ کسی کی قوت و صولت اور نہ کسی تیاری کی ضرورت، بلکہ خود خدا کا اپنا ٹھہرایا ہوا قانون ہے۔ اس قانون کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قوموں کی تباہی کی مدت ان کے اخلاقی زوال کے پیمانے سے ناپ کر مقرر کی ہے۔ صرف وہی جانتا ہے کہ کب کسی قوم کا پیمانہ لبریز ہوا، کوئی دوسرا اس چیز کو نہیں جانتا۔ فرمایا کہ جب عذاب کا وقت آ جائے گا تو وہ اچانک ان پر آ دھمکے گا، وہ اس کے مقابل میں کوئی پیش بندی نہ کر سکیں گے۔

يَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ ۝ يَوْمَ يَغْشَاهُمُ الْعَذَابُ مِن فَوْقِهِمْ وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ وَيَقُولُ ذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (۵۴-۵۵)

جس عذاب کے لیے وہ جلدی کر رہے ہیں وہ ان کے ساتھ ہے

یہاں ان کے استعجال بالعذاب کو پھر دُہرایا ہے۔ بظاہر اس تکرار کی ضرورت نہیں تھی لیکن یہ اعادہ اظہارِ تعجب کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ بڑے طنطنہ سے بار بار عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں گویا عذاب ان سے بہت دور ہے، حالانکہ عذاب ان کے اوپر اور ان کے نیچے سے ان کو گھیرے ہوئے ہے۔ یہ خدا کی جہنم کے احاطے میں ہیں۔ یہ جن اعمال کے اندر گھرے ہوئے ہیں یہی اعمال ان کے لیے جہنم کا ایندھن ہوں گے تو جس عذاب کے لیے وہ جلدی مچائے ہوئے ہیں اس کا پورا سامان تو انھوں نے خود فراہم کر رکھا ہے ان کے یہی اعمال ایک دن عذاب بن کر ان کے اوپر اور نیچے سے ان کو ڈھانک لیں گے اور اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ اب لو، اس عذاب کا مزہ چکھو جس کے لیے جلدی مچائے ہوئے تھے ـــــ مطلب یہ ہوا کہ جس عذاب کا لبادہ انھوں نے خود اوڑھ رکھا ہے اس کے لیے جلدی مچانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ کوئی باہر سے منگانے کی چیز تو نہیں ہے، اس کو تو انھوں نے اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ یہ محض خرد باختگی ہے کہ وہ اس کو دور سمجھ کر اس کے لیے جلد بازی کر رہے ہیں۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوٓا إِنَّ أَرْضِي وَاسِعَةٌ فَإِيَّايَ فَاعْبُدُونِ (۵۶)

مظلوم مسلمانوں سے خطاب

یہ ان مظلوم مسلمانوں کو خطاب فرمایا جن کا مسئلہ ابتدائے سورہ سے اس میں زیرِ بحث ہے۔ — انداز خطاب میں بڑی دلنوازی ہے۔ فرمایا کہ اے میرے بندو، جو مجھ پر ایمان لائے ہو، اگر تم پر مکہ کی سرزمین تنگ کر دی گئی ہے تو تم مایوس اور دل شکستہ ہو کر میری بندگی کے عہد سے دست بردار نہ ہونا بلکہ اپنے اس عہد پر جمے رہو۔ اگر یہ سرزمین تمھیں چھوڑنی پڑی تو اطمینان رکھو کہ میری زمین بہت کشادہ ہے، کوئی اور سرزمین تمھارا خیر مقدم کرے گی۔ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ بہر حال تم جمے رہو کہ میرے سوا کسی اور کی بندگی کی ذلت گوارا نہ کرو گے۔ اگر میری خاطر تم اپنے گھروں کو چھوڑ دو گے تو تمھاری ذمہ داری میرے اوپر ہے اور میرے پاس کسی چیز کی بھی کمی نہیں ہے۔

ہجرت سے متعلق ہدایات

اس آیت سے چند باتیں نہایت واضح طور پر سامنے آگئیں۔

— ایک یہ کہ کسی سرزمین سے ہجرت صرف اس وقت ضروری ہوتی ہے جب اس میں آدمی کے دین و ایمان کے لیے فتنہ پیش آجائے۔

— اگر فتنہ پیش آجائے تو وہ ہر قیمت پر اللہ کی بندگی کے عہد پر قائم رہے، کسی صورت میں بھی غیر اللہ کی بندگی کی ذلت گوارا نہ کرے۔

— اگر اپنے ایمان کو بچانے کے لیے اپنا گھر در سب کچھ چھوڑنا پڑ جائے تو سب کچھ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہو۔ اللہ تعالیٰ رزّاق و کفیل ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ قف ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ (۵۷)

تسلی کا ایک اہم پہلو

یہ آیت اگرچہ تہدید و تسلی دونوں کی متحمل ہے لیکن یہاں پیش و عقب کی آیات تسلی کے مفہوم کی تائید میں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ زندگی تو چند روزہ ہے۔ بالآخر ایک دن سب کو مرنا اور خدا ہی کی طرف لوٹنا ہے تو اس حیاتِ چند روزہ کی خاطر آدمی اپنے رب سے کیوں شرمسار ہو! اپنے رب کی خاطر اس دنیا ہی پر کیوں نہ لات مارے!

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ (۵۸)

یعنی خدا کے ہاں کسی کی کوئی سعی رائگاں نہیں جائے گی۔ جو لوگ ایمان و عملِ صالح کی زندگی بسر کریں گے اللہ تعالیٰ ان کو جنت کے بالاخانوں میں فروکش کرے گا اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس حیاتِ چند روزہ کے ایمان و عملِ صالح کے بدلے جب یہ اجرِ دائمی و ابدی حاصل ہونے والا ہے تو یہ بہت بڑی چیز ہے۔ ہر عاقل کو اسی کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے، اس دنیا کے بڑے سے بڑے عیش کی خاطر بھی اس کو قربان نہیں کرنا چاہیے۔

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (۵۹)

یہ 'عاملین' کی صفت ہے اور اس سے کلام بالکل مطابق حال ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا یہ صلہ ہمارے ان کارگزار بندوں کے لیے ہے جو ہر طرح کے حالات میں ہماری بندگی پر ثابت قدم اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے رہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اپنے رب پر یہ بھروسہ ہی ہے جو ہر طرح کے حالات میں بندے کو خدا کی بندگی پر استوار رکھتا ہے۔ اگر یہ بھروسہ نہ ہو تو ہجرت اور جہاد تو درکنار کوئی معمولی آزمائش بھی آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔

وَكَأَيِّنْ مِّن دَابَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۶۰)

خدا کا خوانِ کرم بہت کشادہ ہے

یعنی جس طرح خدا کی زمین بہت کشادہ ہے اسی طرح خدا کا خوانِ کرم بھی بہت کشادہ ہے۔ اگر اللہ کی راہ میں اموال و جائداد سے دست بردار ہونا پڑ جائے تو بے درنگ ہاتھ جھاڑ کے اٹھ کھڑے ہونا، یہ نہ سوچنا کہ آگے کیا کھائیں گے اور کہاں سے پہنیں گے؟ دیکھتے ہو کہ اس زمین میں کتنے جاندار ہیں جو اپنے ساتھ اپنی روزی باندھے نہیں پھرتے تاہم ان کا رب ان کو ان کا رزق بہم پہنچاتا ہے۔ وہی رب ان کو بھی رزق دیتا ہے وہی تم کو بھی رزق دیتا ہے۔ وہ سمیع و علیم ہے۔ اس وجہ سے ہر ایک کی فریاد سنتا اور ہر ایک کی ضرورت کو جانتا ہے۔ اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ تم اس کو پکارو گے اور وہ بے خبر رہے گا یا تم حاجت مند ہو گے اور وہ تمھاری پریشانی سے ناواقف ہو گا۔

یہی حکمت سیدنا مسیحؑ نے اپنے انداز میں یوں واضح فرمائی ہے:

"تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی جان کی فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے؟ اور نہ اپنے بدن کی کہ کیا پہنیں گے؟ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے۔ نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں تو بھی تمھارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو غور سے دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے نہ کاتتے ہیں تو بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی ساری شان و شوکت کے ان میں سے کسی مانند ملبّس نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے کل تنور میں جھونکی جائے گی ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو، تم کو کیوں نہ پہنائے گا! اس لیے فکر مند ہو کر یہ نہ کہو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے یا کیا پہنیں گے؟ کیونکہ ان سب چیزوں کی تلاش میں غیر قومیں[1] رہتی ہیں اور تمھارا آسمانی باپ جانتا ہے کہ تم ان سب چیزوں کے محتاج ہو۔ بلکہ تم پہلے اس کی بادشاہی اور اس کی راستبازی

---

[1] غیر قوموں سے حضرت مسیح علیہ السلام کافر قوموں کو مراد لیتے ہیں۔ یہ قدیم صحیفوں کی ایک معروف اصطلاح ہے۔

کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تم کو مل جائیں گی۔ پس کل کے لیے فکر نہ کرو کیونکہ کل کا دن اپنے لیے آپ فکر کر لے گا۔ آج کے لیے آج ہی کا دکھ کافی ہے۔" متی باب ۶: ۲۵-۳۴

یہ قرآن کی بلاغت کا اعجاز ہے کہ سیدنا مسیحؑ نے جو حکمت اتنے فقروں میں واضح فرمائی ہے وہ اس نے ایک ہی آیت میں سمیٹ دی ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۶۱)

خدا ہی پر بھروسہ کرنے کے دلائل

اوپر کی آیات میں خدا ہی پر بھروسہ کرنے اور اسی کی راہ میں جینے اور مرنے کی جو تعلیم دی گئی ہے، اس آیت میں اور آگے کی آیات میں اسی کے دلائل بیان ہو رہے ہیں کہ خدا کے سوا کوئی اور حقدار نہیں ہے کہ اس کی بندگی کی جائے اور اس پر بھروسہ کیا جائے۔ یہ حقیقت ایسی مسلّم ہے کہ اس سے ان لوگوں کو بھی مجالِ انکار نہیں ہے جو خدا کے بہت سے شریک و سہیم بنائے بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کی پوجا کر رہے ہیں۔ اگر ان سے بھی پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کا خالق، سورج اور چاند کا مسخر کرنے والا کون ہے تو وہ بھی اس کا یہی جواب دیں گے کہ اللہ۔ اس واضح حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد پھر وہ معلوم نہیں کہاں بھٹک جاتے ہیں کہ دوسروں کو بھی ماویٰ و مرجع مان کر ان کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ حقیقت اس کتاب میں ہم جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ مشرکین عرب اپنی دیویوں دیوتاؤں میں سے کسی کو آسمان و زمین یا سورج اور چاند کا خالق نہیں مانتے تھے۔ ان تمام چیزوں کا خالق و مالک وہ اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے لیکن ساتھ ہی وہ اس وہم میں بھی مبتلا تھے کہ جن ہستیوں کی وہ پوجا کرتے ہیں وہ خدا کی بڑی مقرب ہیں۔ وہ ان کے لیے جو چاہیں خدا سے منوا سکتی اور کرا سکتی ہیں۔ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ کے الفاظ سے ان کے اسی تضادِ فکر پر اظہارِ تعجب فرمایا ہے کہ جب ہر چیز کا خالق و مالک خدا ہے تو آخر دوسروں کو ماویٰ و مرجع بنانے، ان کی پوجا کرنے اور ان سے استغاثہ و استمداد کا کیا تُک ہے! یہ تو خود اپنے منہ سے خود اپنے مسلّمہ کی تردید ہے!

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۶۲)

رزق کی کمی بیشی اللہ ہی کے اختیار میں ہے

یعنی جب آسمانوں اور زمین کا خالق خدا ہے اور سورج اور چاند کو ہماری خدمت میں اسی نے سرگرم کیا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ رزق کے خزانوں کا مالک کوئی اور بن بیٹھے۔ پھر تو وہی ہے جو اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور اپنے علم و حکمت کے مطابق رزق کی تقسیم فرماتا ہے۔ نہ کوئی دوسرا اس سے زیادہ علم رکھنے والا ہے کہ اس کو بتائے کہ فلاں کا رزق پہنچا ہے، فلاں کا نہیں پہنچا اور نہ کوئی اس کے بندوں کے احوال و مصالح سے اس سے زیادہ باخبر ہے کہ اس کو ٹوک دے سکے کہ فلاں کا رزق زیادہ ہونا چاہیے، فلاں کا کم۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۶۳)

مشرکین کا تضادِ فکر

اسی طرح اگر ان سے سوال کرو کہ وہ کون ہے جو آسمان سے پانی اتارتا ہے اور اس سے زمین کو، اس کے خشک اور بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد از سرِ نو زندہ و شاداب کر دیتا ہے تو اس سوال کا جواب بھی وہ یہی دیں گے کہ اللہ! ان سے کہو، اگر اس بات کا تم کو اقرار ہے تو پھر تو شکر کا سزاوار بھی اللہ تعالیٰ ہی ہوا تو آخر تم اس کے سوا دوسروں کی عبادت کس حق کی بنا پر کرتے ہو!

مشرکینِ عرب ابر و ہوا پر بھی حقیقی تصرف اللہ تعالیٰ ہی کا مانتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ رزق و فضل کو دوسروں کی طرف منسوب اور ان کی عبادت کرتے۔ اس طرح وہ ایک شدید قسم کے تضادِ فکر میں مبتلا تھے حالانکہ جب یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ ہی کی بخشی ہوئی ہیں تو شکر کا حقدار بھی وہی ہوا اور یہی شکر تمام عبادت و اطاعت کا محرکِ اوّل ہے۔ اس کی وضاحت ہم سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ یعنی یہ تضادِ فکر ہے تو نہایت بھونڈے قسم کا لیکن ان کی اکثریت اس پر غور نہیں کرتی۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۚ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۶۴)

گمراہی کا اصل سبب

یہ ان کی ساری گمراہی کے اصل سبب کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اس دنیائے فانی کی دلفریبیوں نے ان کو اس طرح گرویدہ کر لیا ہے کہ وہ اس کے مفادات سے بالاتر ہو کر کسی چیز کو سوچ ہی نہیں سکتے۔ حالانکہ یہ دنیا جس پر یہ ریجھے ہوئے ہیں اور جس کے عشق نے ان کی عقل اور ان کے دل کی ہر چیز کو ماؤف کر دیا ہے اس کی حقیقت چند روزہ لہو و لعب سے زیادہ کچھ بھی نہیں، اصلی زندگی دارِ آخرت کی زندگی ہے لیکن اس کی طرف سے ان کی آنکھیں بند ہیں۔ دنیا کی زندگی قدر و قیمت رکھنے والی چیز اس صورت میں بنتی ہے جب آخرت کو نصب العین بنا کر گزاری جائے۔ اس صورت میں بے شک انسان اس چند روزہ زندگی کے بدلے میں ابدی بادشاہی حاصل کرتا ہے۔ یہ نصب العین اگر نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو پھر یہ محض چند دن کا کھیل تماشا ہے اور اس کے بدلے میں انسان ابدی خسران کا وارث بنتا ہے۔ فرمایا کہ اصل حقیقت یہ ہے بشرطیکہ یہ دنیا کے متوالے لوگ اس حقیقت کو جانیں اور سمجھیں۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ۙ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۚ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (۶۵-۶۶)

دنیا کے سرمستوں کی تمثیل

یعنی دنیا کے ان سرمستوں کی مثال کشتی کے مسافروں کی ہے۔ جب کشتی سازگار ہوا کے ساتھ رواں دواں ہوتی ہے تو یہ اس میں اس طرح مگن ہوتے ہیں گویا ابر و ہوا سب انہی کے تابع فرمان ہیں لیکن جونہی کشتی کسی طوفانی

گرداب میں پھنسی ان کو خدا یاد آتا ہے اور اس وقت وہ اس سے مخلصانہ اطاعت کا عہد کرتے ہوئے دعا کرتے ہیں لیکن جب کشتی گرداب میں سے نکل جاتی ہے تو وہ اپنی انہی سرمستیوں اور گمراہیوں میں پھر کھو جاتے ہیں جن میں پہلے کھوئے ہوتے تھے اور خدا سے کیا ہوا عہد ان کو بالکل بھول جاتا ہے۔ فرمایا کہ اس طرح خدا کی بخشی ہوئی نجات ان کے لیے خدا ہی کی ناشکری کی راہ کھولتی ہے اور ہم بھی ان کو ڈھیل دے دیتے ہیں کہ وہ چند دن ہماری نعمتوں سے متمتع ہو لیں، بالآخر تو ان کو اس کا خمیازہ بھگتنا ہی ہے۔

اس آیت میں بعض اجزاء محذوف ہیں، ہم نے نظائر قرآن کی روشنی میں وہ کھول دیے ہیں۔ یہ مضمون مختلف اسالیب سے زیر بحث آچکا ہے اس وجہ سے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ سورۂ روم میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔

وَإِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيبِينَ إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا أَذَاقَهُم مِّنْهُ رَحْمَةً إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ۝ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ فَتَمَتَّعُوا فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝ (الروم: ۳۳-۳۴)	اور جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں اس کی طرف متوجہ ہو کر پھر جب وہ ان کو اپنی رحمت کا مزہ چکھا دیتا ہے تو ان میں سے ایک گروہ اپنے رب کے شریک ٹھہرانے لگتا ہے کہ اس نعمت کی ناشکری کریں جو ہم نے ان کو بخشی۔ تو چند دن فائدہ اٹھا لو، عنقریب تم کو پتہ چل جائے گا!

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۚ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَكْفُرُونَ (۶۷)

اوپر کی تمثیل کا انطباق قریش کے حال پر

فرمایا کہ بالکل یہی حال قریش کے ان ناشکروں کا ہے۔ یہ اپنی تاریخ کی اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ ہم نے ان کے لیے ایک مامون حرم بنایا جس میں یہ چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں درآنحالیکہ ان کے گرد و پیش کا حال یہ ہے کہ لوگ دن دہاڑے اچک لیے جاتے ہیں، نہ کسی کی جان کے لیے امان ہے نہ کسی کا مال محفوظ ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کی قدر انھوں نے یہ کی ہے کہ اس کے بنائے ہوئے حرم کے کونے کونے میں انھوں نے بتوں کو لا بٹھایا ہے اور ان کی پوجا کر رہے ہیں۔ ان بدبختوں سے پوچھو کہ کیا وہ باطل پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں!

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اوپر کشتی کی جو مثال دی ہے اس میں اور اس صورت واقعہ میں بڑی گہری مناسبت ہے۔ یہ مامون حرم قریش کے لیے ایک سفینۂ نجات کے مانند تھا جس میں ہر خطرے سے بالکل نچنت وہ چین کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس چین کی زندگی نے ان کو خدا سے بالکل غافل کر دیا۔ حالانکہ اگر خدا چاہتا تو ان کو بھی وہ اسی بے اطمینانی میں مبتلا کر سکتا تھا جس میں ان کے گرد و پیش کے لوگ مبتلا تھے لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ جب تک کشتی سازگار ہوا سے رواں دواں رہے اس وقت تک وہ چین کی بانسری

بجاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ بازی اس کی ہے لیکن جب کسی گرفت میں آجاتا ہے تو واویلا شروع کر دیتا ہے۔

اس حرم کی تولیت کی بدولت قریش کو جو زعامت اور سارے عرب پر جو قیادت و سیادت حاصل ہوئی اس پر مفصل بحث کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ سورۂ قصص کی آیت ۵۷ کے تحت بھی اس پر بحث گزر چکی ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُ ۚ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكَافِرِينَ (۶۸)

فردِ قرارداد جرم سنانے کے بعد ایک سوال

تمام فردِ قراردادِ جرم سنانے کے بعد سوال فرمایا کہ ان لوگوں سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ گھڑ کر لگائیں یا حق کو جھٹلائیں جب کہ وہ ان کے پاس آچکا ہے۔ 'افتراء علی اللہ' سے مراد دینِ شرک ہے اور 'حق' سے مراد یہاں قرآن اور رسول ہیں۔ 'لَمَّا جَاءَهُ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ رسول کی بعثت سے پہلے تو ان کے لیے اللہ کے ہاں کچھ عذر ہو سکتا تھا لیکن اب جب کہ رسول بھی آچکا اور قرآن بھی نازل ہو چکا تو ان کے لیے کیا عذر باقی رہا! 'أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكَافِرِينَ' کیا ایسے کٹے کافروں کا ٹھکانا بھی دوزخ میں نہ ہوگا! مطلب یہ ہے کہ ایسوں کے دوزخی ہونے میں بھلا کسے کلام ہو سکتا ہے۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ (۶۹)

اہلِ ایمان کو بشارت

کفار کو ان کے ٹھکانے تک پہنچا کر ان مظلوم مسلمانوں کی طرف پھر توجہ فرمائی جن کا مسئلہ اس سورہ میں ابتدا سے زیرِ بحث ہے۔ فرمایا کہ ہمارے جو بندے ہماری راہ میں آج طرح طرح کی مشقتیں جھیل رہے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھولیں گے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہ وعدہ ان کے لیے دین، دنیا اور آخرت تینوں سے متعلق ہے۔ یعنی ان کے لیے دین کی راہیں بھی کھلیں گی، ان کی دنیا کی مشکلات بھی حل ہوں گی اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ ان کی رہنمائی صراطِ حمید کی طرف فرمائے گا۔

'وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ' یہ ان لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی معیت کی بشارت ہے اور یہ بہت بڑی بشارت ہے اس لیے کہ جن کو اللہ کی معیت حاصل ہو شمس و قمر سب ان کی راہ میں گرد ہیں لیکن یہ بشارت 'احسان' کی قید کے ساتھ مقید ہے۔ یعنی یہ معیت ان لوگوں کو حاصل ہوگی جو نہایت خوبی کے ساتھ راہِ حق کی مصیبتوں کا مقابلہ کریں گے اور ہر مرحلے میں اپنے رب پر پورا پورا بھروسہ کرنے والے ثابت ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کی مدد سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔

اللہ تعالیٰ لغزشوں کو معاف فرمائے اور صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کر دے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

بروز پیر۔ دس بجے دن
۲۷ رمئی ۱۹۷۴ء
رحمان آباد

تدبّرِ قرآن

٣٠

الرّوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ، سابق سورہ — عنکبوت — کا مثنیٰ ہے اور دونوں کا قرآنی نام بھی ایک ہی یعنی الٓمّٓ ہے۔ اس وجہ سے دونوں کے عمود میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ پچھلی سورہ میں ظاہری حالات کے علی الرغم مسلمانوں کو نصرتِ الٰہی اور غلبہ کی بشارت دی گئی ہے اور اس بشارت کی بنیاد اس حقیقت پر رکھی گئی ہے کہ اس کارخانۂ کائنات کو اللہ تعالیٰ نے بالحق پیدا کیا ہے، وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ تمام امرونہی اسی کے اختیار میں ہے۔ وہ اس دنیا میں بھی اپنے رسول اور اپنے ساتھیوں کو غلبہ بخشے گا اور اس دنیا کے بعد آخرت بھی ہے جس میں اس کے کامل حق و عدل کا ظہور ہوگا۔ اس وقت باطل یکسر نابود ہو جائے گا اور حق و اہل حق کو ابدی بادشاہی حاصل ہوگی۔

یہ مسائل مشرکین مکہ اور مسلمانوں کے درمیان زیر بحث ہی تھے کہ اسی اثناء یعنی ۶۱۴ء میں پڑوس کے ملک یعنی شام اور فلسطین میں یہ انقلاب پیش آیا کہ مجوسیوں نے حملہ کر کے رومیوں کو وہاں سے بے دخل کر دیا۔ رومی چونکہ نصرانیت کے پیرو تھے اس وجہ سے دین و عقیدہ کے اعتبار سے وہ مسلمانوں سے قریب تھے اور اس قربت کے سبب سے قدرتی طور پر مسلمانوں کو ان سے ہمدردی تھی۔ اس کے برعکس مجوسی دین شرک کے پیرو تھے اس وجہ سے مشرکین کی تمام ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں۔ مجوسیوں کے ہاتھوں رومیوں کی اس شکست سے مشرکین مکہ کو بڑی شہ ملی۔ اس کی آڑ میں انھوں نے قرآن کی ان تمام باتوں کا مذاق اڑانا شروع کر دیا جو ان کی خواہشوں کے خلاف تھیں۔ مثلاً یہ کہ مسلمان جو یہ کہتے ہیں کہ دینِ توحید ہی حق ہے یا مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوگا یا قیامت آنے والی ہے جس میں حق کا بول بالا ہوگا، یہ سب باتیں ان کی محض لایعنی ہیں۔ اگر ان کی یہ باتیں سچی ہوتیں تو بھلا مجوسیوں کو رومیوں پر کس طرح غلبہ حاصل ہوتا! یہ واقعہ تو اس بات کی صاف شہادت ہے کہ ہمارا ہی دین و عقیدہ اور ہمارا ہی نظریۂ زندگی صحیح ہے اور ہم ہی غالب و حاکم رہیں گے۔

قرآن نے اس سورہ میں اسی واقعہ کو بنیاد بنا کر ان تمام حقائق کو از سر نو مبرہن کیا ہے جن کو مشرکین نے مشتبہ بنانے کی کوشش کی۔

اس سورہ کا نظام سمجھنے کے لیے اگرچہ یہ تمہید بھی کافی ہے لیکن ہم سہولت کے لیے مطالب کا تجزیہ بھی کیے دیتے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۷) رومیوں اور مجوسیوں کے واقعہ کی طرف ایک اجمالی اشارہ اور اس حقیقت کا اظہار کہ اس دنیا میں قوموں

کے ردّوبدل کے جو واقعات پیش آتے ہیں وہ اتفاق واقعات کے طور پر نہیں پیش آتے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ایک مبنی بر عدل سنت کے تحت ظہور میں آتے ہیں لیکن اس سنت تک ان لوگوں کی نگاہیں نہیں پہنچ سکتیں جو صرف اس دنیا کے ظواہر کو دیکھنے کے عادی ہیں۔

(۸-۱۰) اس دنیا کے نظام اور اس کی تاریخ پر جو شخص بھی غور کرے گا وہ اس حقیقت کا اعتراف کرے گا کہ اس کے خالق نے اس کو کھیل تماشہ نہیں بنایا ہے اس وجہ سے یہ لازماً جزا و سزا پر منتہی ہوگی۔ قوموں کی تاریخ سے بھی یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ ان کے کردار کے مطابق معاملہ کیا ہے اس وجہ سے قیامت ناگزیر ہے جو لوگ اس کا انکار کر رہے ہیں وہ ایک بدیہی حقیقت کا انکار کر رہے ہیں۔ جب قیامت آئے گی تو اس دن اہلِ ایمان کو فلاح حاصل ہوگی اور اہلِ کفر نامراد ہوں گے۔ جن لوگوں نے شرکاء و شفعاء بنا رکھے ہیں وہ نہایت ہی غلط سہارے پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ قیامت کے دن یہ شفعاء بالکل بے حقیقت ثابت ہوں گے۔ عبادت و اطاعت کا اصلی حقدار اللہ ہے۔ اسی کی حمد و تسبیح اس کائنات کی ہر چیز کر رہی ہے۔ اس وجہ سے انسانوں کا بھی فرض ہے کہ وہ صبح و شام اسی کی تسبیح کریں۔

(۱۹-۲۹) قیامت اور توحید کے آفاقی و انفسی دلائل۔

(۳۰-۴۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو اصل دینِ فطرت پر قائم رہنے اور اسی کی دعوت دینے کی تاکید۔ اس دین کی بنیاد نماز اور زکوٰۃ پر ہے۔ جن لوگوں نے اس دینِ فطرت کو بگاڑا ہے ان کو زجر و تنبیہ کہ اب ان کے محاسبہ کا وقت آگیا ہے، وہ پچھلی قوموں کی تاریخ سے سبق لیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ تم صبر کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہو اور فیصلہ کے دن کا انتظار کرو۔

(۴۶-۶۰) اللہ تعالیٰ کے وعدۂ نصرت کے ظہور کے جو دلائل و آثار تاریخ و آفاق میں موجود ہیں ان کی طرف اشارہ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ تم اپنی دعوت انہی لوگوں کے دلوں میں اتار سکتے ہو جو سننے سمجھنے والے ہیں۔ اس وجہ سے ان لوگوں کے رویہ سے بددل نہ ہو جو اندھے بہرے بن چکے ہیں۔ سوچنے سمجھنے والوں کے لیے یہ قرآن کافی ہے باقی رہے ضدی اور ہٹ دھرم تو ان کو کوئی معجزہ بھی قائل نہیں کر سکتا۔ تم صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ۔ اللہ کا وعدۂ نصرت پورا ہو کر رہے گا۔

سُوْرَةُ الرُّوْمِ (٣٠)

مَكِّيَّةٌ —— اٰيَاتُهَا ٦٠

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ (١) غُلِبَتِ الرُّوْمُ (٢) فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ (٣) فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۬ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ
مِنْۢ بَعْدُ ؕ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ (٤) بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ يَنْصُرُ مَنْ
يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (٥) وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (٦) يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ۚۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ (٧) اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ
اَنْفُسِهِمْ ۫ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ
وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ (٨)
اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ
اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ فَمَا كَانَ اللّٰهُ
لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (٩) ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ
اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ (١٠) ع ١٠

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿١١﴾ وَيَوْمَ تَقُوْمُ
السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿١٢﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ
شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴿١٣﴾ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ
يَّتَفَرَّقُوْنَ ﴿١٤﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ
رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ﴿١٥﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ
لِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿١٦﴾ فَسُبْحٰنَ
اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿١٧﴾ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿١٨﴾

یہ الٓمّٓ ہے۔ رومی پاس کے علاقے میں مغلوب ہو گئے اور وہ اپنی مغلوبیت کے ترجمہ آیات
بعد عنقریب ـــ چند سالوں میں ـــ غالب آجائیں گے۔ اللہ ہی کے حکم سے ہوا جو پہلے ۱ - ۱۸
ہوا اور اللہ ہی کے حکم سے ہوگا جو بعد میں ہوگا اور اس وقت اہلِ ایمان مسرور ہوں گے۔
اللہ کی مدد سے۔ وہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے اور عزیز و رحیم تو وہی ہے۔ یہ اللہ کا
حتمی وعدہ ہے اور اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ لیکن اکثر لوگ نہیں
جانتے۔ وہ اس دنیا کی زندگی کے صرف ظاہر کو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ بالکل
ہی بے خبر ہیں۔ ۱-۷

کیا انھوں نے اپنے دلوں میں غور نہیں کیا! اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے
درمیان ہے نہیں پیدا کیا ہے مگر غایت و حکمت اور ایک مدتِ مقرر کے ساتھ۔ اور لوگوں
میں سے بہت سے ایسے ہیں جو اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔ ۸

کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ وہ دیکھتے کہ کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے۔ وہ ان سے قوت میں زیادہ اور زمین کو زرخیز بنانے اور آباد کرنے میں ان سے بڑھ چڑھ کر تھے اور ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیاں لے کر آئے۔ پس اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہیں تھا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ پھر ان لوگوں کا انجام، جنھوں نے بری روش اختیار کی، بُرا ہوا۔ بوجہ اس کے کہ انھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور ان کا مذاق اڑاتے رہے۔ ۹-۱۰

اللہ ہی خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہ اس کا اعادہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور جس دن قیامت واقع ہوگی تو مجرم اس دن مایوس ہو جائیں گے اور ان کے شریکوں میں سے کوئی ان کے لیے سفارش کرنے والا نہیں بنے گا اور وہ اپنے شریکوں کا انکار کریں گے۔ ۱۱-۱۳

اور جس دن قیامت واقع ہوگی مومن و کافر دونوں الگ الگ ہو جائیں گے۔ پس جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہوں گے وہ تو ایک شاندار باغ میں مسرور ہوں گے۔ رہے وہ جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات اور آخرت کی ملاقات کی تکذیب کی تو وہ عذاب میں پکڑے ہوئے ہوں گے۔ پس اللہ ہی کی تسبیح کرو جس وقت تم شام کرتے اور جس وقت صبح کرتے ہو اور آسمانوں اور زمین میں اسی کی حمد ہو رہی ہے اور عشاء کے وقت بھی اور اس وقت بھی جب تم ظہر کرتے ہو۔ ۱۴-۱۸

نبی صلعم کی رسالت کا اثبات آپ کے پیش کردہ اصولوں کی صداقت کے پہلو سے

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

(الٓمّٓ ۱) یہ ہمارے نزدیک، جیسا کہ ہم جگہ جگہ وضاحت کرتے آرہے ہیں، مستقل جملہ ہے۔ یعنی یہ

سورہ الٓـمّٓ ہے۔ یہ اس سورہ کا اصل قرآنی نام ہے۔ یہی نام سابق سورہ کا بھی ہے۔ یہ قرینہ ہے اس بات کا کہ عمود کے اعتبار سے دونوں سورتوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ پچھلی سورہ میں اس کائنات کا جو فلسفہ بیان ہوا تھا اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر رسول اور اس کے ساتھیوں کے لیے دنیا اور آخرت میں جس نصرتِ الٰہی اور غلبہ کی بشارت دی گئی تھی، ایک خاص واقعہ کو جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے، دلیل بنا کر کفار نے اس کا خوب مذاق اڑایا اور اس طرح ان کے زعم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تکذیب کے لیے ان کو ایک ایسی شہادت مل گئی جس پر وہ بہت مسرور ہوئے اور قدرتی طور پر ان کی یہ شادمانی مسلمانوں کے لیے باعثِ رنج ہوئی۔ قرآن نے اس سورہ میں اسی واقعہ کو تمہید بنا کر ان تمام پہلوؤں کی وضاحت فرمائی جن سے بے خبری کی بنا پر کفار مغالطہ میں مبتلا ہوئے اور جن کے اچھی طرح ذہن نشین نہ ہونے کے سبب سے مسلمانوں کی ایک جماعت کو بھی خلجان لاحق ہوا۔ اس طرح یہ سورہ گویا سابق سورہ کے مطالب کو از سرِ نو مدلّل و مبرہن اور ان تمام شبہات کا ازالہ کر رہی ہے جو اس سلسلہ میں پیدا ہوئے یا پیدا ہو سکتے تھے۔ گویا دونوں سورتوں میں زیرِ بحث موضوع ایک ہی ہے۔ فرق صرف پہلو اور نہجِ استدلال کا ہے۔ ان دونوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت آپ کے پیش کردہ اصولوں کی صداقت کے پہلو سے واضح کی گئی ہے۔

غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۙ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۬ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ (۲-۴)

قرآن کی ایک پیشین گوئی کی صداقت

'اَدْنَى الْاَرْضِ' سے مراد یہاں شام و فلسطین کی سرزمین ہے جو عرب کی سرزمین سے بالکل متصل تھی۔ اس علاقے پر اس زمانے میں رومیوں کی حکومت تھی لیکن وہ اس وقت سخت اندرونی خلفشار میں مبتلا تھے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر ایرانیوں نے ان پر حملہ کر دیا اور ان علاقوں سے ان کو بے دخل کر دیا۔ یہ واقعہ ۶۱۴ء یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے چھٹے یا ساتویں سال پیش آیا۔

'وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ'۔ 'غَلَبٌ' اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے۔ یہ قرآن نے پیشین گوئی فرمائی کہ اگرچہ رومی اس وقت مغلوب ہو گئے ہیں لیکن یہ مغلوبیت ان کی عارضی ہے، بہت جلد وہ پھر ایرانیوں پر غالب ہو جائیں گے۔

'فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ' یعنی اس انقلاب میں، جس کی قرآن خبر دے رہا ہے، زیادہ دن نہیں لگیں گے، صرف چند سالوں کے اندر اندر یہ واقع ہو جائے گا۔ اگرچہ 'سَيَغْلِبُوْنَ' کے اندر بھی مستقبل قریب کا مفہوم موجود تھا لیکن اس میں ایک قسم کا ابہام تھا۔ اس ابہام کو رفع کرنے کے لیے اس کے ساتھ 'فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ' کی قید لگا دی جس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ انقلاب زیادہ سے زیادہ اگلی دہائی کے اندر واقع ہو جائے گا۔ لفظ 'بِضْع' کا اطلاق دس سے زیادہ کی تعداد کے لیے نہیں ہوتا۔ اس تعیین و تصریح کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ اس واقعہ کو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، مشرکین نے اپنے فکر و فلسفہ کی صحت

کی دلیل بنالیا تھا جس سے قدرتی طور پر مسلمانوں کو صدمہ پہنچا۔ قرآن نے اس مؤکد پیشین گوئی کے ذریعے سے ایک طرف تو مسلمانوں کو اطمینان دلایا کہ تمہارے مخالفوں نے اس واقعہ کو اپنے حق میں جو دلیل بنایا ہے اور جس سے وہ بہت خوش ہیں، ان کی یہ خوشی چند روزہ ہے، بہت جلد یہ غم سے بدل جائے گی۔ دوسری طرف مشرکین کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے جانچنے کے لیے ایک کسوٹی رکھ دی کہ یہ پیشین گوئی آپ کی نبوت کی ایک دلیل ہوگی۔ تاریخوں سے ثابت ہے کہ اس واقعہ کے تقریباً نو سال بعد ہرقل نے رومیوں کو از سرِ نو منظم کر کے ایرانیوں کو سخت شکست دی اور ان سے صرف اپنے علاقے واپس لے لیے بلکہ ان کے بھی بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا اور اس طرح قرآن کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوگئی۔

قوموں کے بناؤ اور بگاڑ میں اصلی عامل کردار ہے

لِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ۔ یعنی جو کچھ ہوا وہ بھی اللہ ہی کے حکم سے ہوا ہے اور آگے جو کچھ ہوگا وہ بھی اللہ ہی کے حکم سے ہوگا۔ قوموں کی زندگی میں اتنے بڑے بڑے انقلابات محض اتفاقاتِ زمانہ اور گردشِ روزگار سے نہیں پیش آتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پیش آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ہر حکم حق و عدل پر مبنی ہوتا ہے۔ رومیوں نے جب اپنے اندر وہ خرابیاں پیدا کر لیں جو کسی قوم کو خدا کے تازیانۂ تنبیہ کا مستحق بناتی ہیں تو وہ اس سے مجرد اس بنیاد پر نہیں بچ سکتے تھے کہ وہ بعض اچھے عقائد و رسوم کا اظہار کرتے ہیں۔ صرف رسوم و عقائد اجتماعی زندگی کے بنانے بگاڑنے میں اصلی دخل نہیں رکھتے بلکہ اصل شے وہ انفرادی و اجتماعی کردار ہے جو ان عقائد و رسوم سے پیدا ہوتا ہے یا پیدا ہونا چاہیے۔ اگر وہ کردار نہ پیدا ہو تو محض کھوکھلے رسوم کچھ بھی کارآمد نہیں ہوتے۔ چنانچہ رومیوں کا یہی کھوکھلا پن مجوسیوں کے آگے ان کی شکست کا سبب ہوا اور اب مستقبل قریب میں ان کے لیے جس غلبہ کی بشارت دی جا رہی ہے تو وہ بھی اللہ ہی کے حکم سے ہوگا اور اللہ کا ہر حکم عدل و حق پر مبنی ہوتا ہے اس وجہ سے لازماً یہ غلبہ اس وجہ سے ان کو حاصل ہوگا کہ وہ اپنے حالات کی اصلاح کر کے ایرانیوں کے مقابل میں اپنے کو اللہ کی مدد کا مستحق بنائیں گے۔

مسلمانوں کا رویہ دوسری قوموں کے ساتھ

وَیَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ اس دن مسلمان خوش ہوں گے، اس وجہ سے بھی کہ جو لوگ مذہب اور فکر و فلسفہ میں ان سے قریب تر ہیں ان کو فتح ہوگی اور اس وجہ سے بھی کہ قرآن کی ایک عظیم پیشین گوئی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی ایک بہت بڑی دلیل ہے، پوری ہوگی۔

یہ امر یہاں قابلِ توجہ ہے کہ باوجودیکہ رومی صحیح نصرانیت کے پیرو نہیں تھے بلکہ ان کے عقائد و اعمال میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کو مجوسیوں کے مقابل میں ان سے ہمدردی ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی اس ہمدردی کی تحسین فرمائی۔ اسلام نے دوسری غیر مسلم قوموں کے ساتھ اسی اصول پر اپنے قانون اور معاملات کی بنیاد رکھی ہے۔ یعنی جو قوم اپنے نظریات و عقائد اور فکر و فلسفہ

میں اسلام سے جتنی ہی قریب ہوگی بین الاقوامی میدان میں مسلمانوں کی ہمدردیاں دوسروں کے مقابل میں ان کے ساتھ اتنی ہی زیادہ ہوں گی۔

بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (۵)

قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ

'بِنَصْرِ اللّٰهِ' کا تعلق 'سَيَغْلِبُوْنَ' سے بھی ہو سکتا ہے اور 'يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ' سے بھی۔ پہلی صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ غلبہ جو ان کو حاصل ہوگا اللہ تعالیٰ کی مدد سے حاصل ہوگا، اس لیے کہ اللہ ہی جس کی چاہتا ہے مدد فرماتا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور کسی کی مدد نہیں کر سکتا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت تمام تر حق و عدل پر مبنی ہے اس وجہ سے وہ انھیں کی مدد فرماتا ہے جو اس کے عدل و حکمت کی رو سے اس کی مدد کے سزاوار ہوتے ہیں۔ 'عزیز رحیم' کی صفات کا حوالہ یہاں اس کی مشیت کی نوعیت کے اظہار کے لیے ہے کہ وہ غالب و مقتدر ہے اس وجہ سے اس کی مشیت میں کوئی مزاحم تو نہیں ہو سکتا لیکن ساتھ ہی وہ رحیم بھی ہے اس وجہ سے اس کا ہر ارادہ عدل و رحمت پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ اپنی مشیت کے زور میں یہ نہیں کرتا کہ قوموں کو قوموں سے ٹکرا کر ان کے فساد فی الارض کا تماشا دیکھے۔

وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۶)

مسلمانوں کے غلبہ کا وعدہ

'وَعْدَ اللّٰهِ' یہاں مصدر مؤکد ہے اس وجہ سے اس کے اندر تاکید کا مفہوم پیدا ہو جائے گا یعنی اہل ایمان کی مدد کا یہ وعدہ بالکل قطعی اور اٹل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا لیکن جن لوگوں کی نظر صرف ظاہری اسباب و حالات تک محدود ہے وہ اس مخفی ہاتھ کو نہیں دیکھ رہے ہیں جو ان ظواہر کے اندر کارفرما ہے۔ اس وجہ سے وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھ رہے ہیں۔

یہاں جس وعدے کے پورے ہونے کی طرف اشارہ ہے وہ صرف رومیوں کے غلبہ کا وعدہ نہیں ہے بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے غلبہ کا وہ وعدہ بھی ہے جس کی تکذیب کے لیے قریش نے مجوسیوں کی فتح کو دلیل بنایا تھا۔ اس واقعہ پر تبصرہ کرنے کے بعد یہ قرآن نے نہایت تاکید کے ساتھ اس وعدے کے پورے ہونے کا اظہار فرمایا جو اصلاً اس سورہ میں زیر بحث ہے۔ آگے اسی سورہ کی آیات ۴۷، ۶۰ میں اس کی پوری وضاحت ہو جائے گی۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ښ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ (۷)

ظاہر پرستوں کا اصل مغالطہ

اوپر والی آیت میں ان ظاہر پرستوں کے جس اندھے پن کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہ اس کی توجیہ ہے کہ اول تو یہ لوگ اس دنیا کے صرف ظاہر حالات کو دیکھتے ہیں، ان کے باطن تک ان کی نگاہ نہیں پہنچتی کہ اصل متصرف اس کے اندر کون ہے اور اس کی صفات کیا ہیں اس وجہ سے یہ ان کے لیے ایک کھیل تماشا بن کر رہ گئی ہے، دوسرے یہ آخرت سے بالکل غافل ہیں اور جب یہ آخرت سے غافل ہیں تو آخرت کے بغیر اس کارخانۂ کائنات کو مبنی بر عدل و حکمت تصور کرنا ناممکن ہے۔ 'وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ

هُمْ غٰفِلُوْنَ، میں مبتدا کا اعادہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن اس حقیقت کو زور و تاکید کے ساتھ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ آخرت سے اصلی غافل یہی لوگ ہیں۔ اس تاکید کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین عرب اگرچہ آخرت کا صاف الفاظ میں انکار نہیں کرتے تھے لیکن انھوں نے شرک و شفاعت کا ایک ایسا نظام کھڑا کر رکھا تھا کہ آخرت ان کے لیے ایک بالکل بے حقیقت چیز بن کر رہ گئی تھی۔ قرآن یہاں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ کوئی یہ نہ گمان کرے کہ یہ لوگ آخرت کو کسی درجے میں بھی مانتے ہیں۔ اصلی حقیقت یہ ہے کہ آخرت سے یہ لوگ بالکل ہی بے خبر ہیں۔

اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ ۟ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَکٰفِرُوْنَ (۸)

کائنات کی مقصدیت سے استدلال

اس آیت میں اور آگے کی چند آیات میں اسی حقیقت کی تائید میں، جو اوپر بیان ہوئی، آفاق کے دلائل کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر وہ خود اپنے باطن میں اتر کر غور کرتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، ان میں سے کسی چیز کو بھی بے غایت و مقصد، محض کھیل تماشے کے طور پر، نہیں بنایا ہے بلکہ ہر چیز ایک غایت و مقصد اور ایک مقررہ مدت کے ساتھ بندھی ہوئی پیدا ہوئی ہے۔ تو جب اس کائنات کی ہر چیز اپنے اندر ایک غایت و حکمت رکھتی ہے اور اس کے لیے ایک مدت بھی مقرر ہے تو یہ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ انسان جو اس کے اندر، واضح طور پر، ایک برتر مخلوق کی حیثیت رکھتا ہے، بالکل بے مقصد اور عبث پیدا کیا گیا ہو۔ اس چیز کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک روز جزا و سزا آئے جس میں وہ اپنے اعمال کی بابت مسئول ہو، اپنی نیکیوں کا صلہ پائے اگر اس نے نیکیاں کی ہوں اور اپنی بدیوں کی سزا بھگتے اگر اس نے بدیاں کمائی ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ کارخانۂ کائنات ایک کھلنڈرے کا کھیل اور انسان ایک شتر بے مہار اور بے غایت و مقصد وجود بن کے رہ جاتا ہے اور یہ بات اس کائنات کی اس مقصدیت اور حکمت کے بالکل منافی ہے جس کی شہادت اس کے ہر گوشہ سے مل رہی ہے۔ یہی مضمون دوسری جگہ اس طرح بیان ہوا ہے: وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (اور وہ آسمانوں اور زمین کی خلقت میں غور کرتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تو نے یہ کارخانہ عبث نہیں پیدا کیا۔ تیری ذات پاک ہے تو ہمیں عذاب نار سے بچا)۔ اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ، کے الفاظ سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ آسمان و زمین کی خلقت کی یہ حکمت ان لوگوں پر کھلتی ہے جو بالکل غیر جانبدار ہو کر اپنے باطن میں غوطہ لگاتے اور اصل حقیقت کو پانا چاہتے ہیں۔ رہے وہ جو محض دوسروں کے اندھے مقلد یا حقیقت کو جھٹلانے کے لیے معجزات اور نشانیوں کے طالب اور مناظرہ و مجادلہ کے لیے آستینیں چڑھائے رہتے ہیں وہ اس سے محروم ہی رہتے ہیں۔

وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ۔ یعنی ہے تو یہ حقیقت بالکل واضح لیکن اس کے باوجود بہت سے نادان یہ سمجھتے ہیں کہ وہ صرف کھانے پینے اور عیش کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور اسی طرح ایک دن ختم ہو جائیں گے۔ ان کے لیے خدا کے آگے پیشی کا کوئی دن آنا نہیں ہے۔

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوا السُّوْۗآٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ (۹-۱۰)

تاریخ کے دلائل کی طرف اشارہ

یہ اسی حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے تاریخ کے دلائل کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر وہ اپنے ہی ملک کے آثار اور اس کی تاریخ پر نظر ڈالتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ جو قومیں اپنی عسکری قوت میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر اور تمدنی و تعمیری صلاحیتوں میں ان سے کہیں آگے تھیں، ان کا انجام کیا ہو چکا ہے! اشارہ قوم عاد، ثمود، قوم مدین وغیرہ کی طرف ہے جن کی سرگزشتیں تفصیل کے ساتھ پچھلی سورتوں میں بیان ہو چکی ہیں۔ فرمایا کہ ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے لیکن انھوں نے اپنی آنکھیں اس طرح بند رکھیں کہ وہ کسی نشانی سے بھی نہ کھلیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کو عذاب میں پکڑا اور ان کا عذاب میں پکڑا جانا ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ظلم نہیں ہوا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے اس لیے کہ انھوں نے اس انذار کی کوئی قدر نہیں کی جس کا اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اہتمام فرمایا بلکہ انھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور نہایت جسارت کے ساتھ ان کا مذاق اڑاتے رہے ـــــ مطلب یہ ہے کہ قریش قوموں کی اس تاریخ پر غور کریں کہ اس سے کیا بات ثابت ہوتی ہے؛ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دنیا ایک اندھیر نگری ہے، جس میں ہر شخص اپنے زور میں جو چاہے کرتا پھرے، کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہے، یا یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ قوموں کے ساتھ اپنے قانون عدل و حکمت کے مطابق معاملہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہی دوسری بات ثابت ہوتی ہے اور پھر اسی سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس کے بعد ایک ایسا دن بھی آئے گا جس میں اللہ تعالیٰ ایک ایک فرد کا محاسبہ کرے گا اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا یا سزا دے گا۔

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۱۱)

اصل حقیقت

اوپر کی آیات میں اس کائنات کے 'بالحق' ہونے سے قانونِ مجازات کی صحت و صداقت پر استدلال فرمایا ہے۔ اب اس آیت اور بعد کی چند آیات میں نہایت آشکارا الفاظ میں وہ اصل حقیقت سامنے رکھ دی ہے جس سے ہر ایک کو سابقہ پیش آنا ہے۔ فرمایا کہ اللہ ہی خلق کا آغاز فرماتا ہے اور وہی اس کا اعادہ فرمائے گا۔ ان دو لفظوں میں دعویٰ اور دلیل دونوں جمع ہیں۔ دعویٰ یہ ہے کہ اللہ اس خلق کا

اعادہ فرمائے گا، دلیل اس کی یہ ہے کہ اسی نے اس کا آغاز کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس نے اس کا آغاز کیا اور اس کام میں اس کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی اس کو اس کے اعادے میں بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ بلکہ اعادہ ابدار کے مقابل میں زیادہ آسان ہے۔ یہ جواب ہے منکرینِ قیامت کے شبہ کا کہ وہ قیامت کو نہایت مستبعد چیز سمجھتے ہیں۔ حالانکہ جب خلق کا ابدا مستبعد نہیں ہے تو اس کے اعادے میں کیا استبعاد ہے!

'ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ'۔ یہ منکرین کے ایک دوسرے مغالطے کو رفع فرمایا۔ منکرین، اول تو قیامت کے وقوع ہی کو نہایت مستبعد خیال کرتے تھے اور اگر ایک مفروضہ کے درجے میں مانتے بھی تھے تو ان کا گمان یہ تھا کہ ہمارا لوٹنا تو ہمارے معبودوں کی طرف ہوگا اور ان کو خدا کے ہاں اتنا تقرب حاصل ہے کہ اول تو وہ اللہ تعالیٰ کو ہمارے اوپر ہاتھ ڈالنے ہی نہیں دیں گے اور اگر اس نے ہاتھ ڈالا تو وہ اپنی سفارش سے ہم کو بچالیں گے۔ فرمایا کہ یہ خبط اپنے ذہن سے نکالو۔ ہر ایک کی پیشی اللہ ہی کے حضور ہونی ہے۔ اس دن کوئی اور مرجع و ماویٰ نہیں بنے گا۔

وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ وَلَمْ یَکُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَکَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَکَانُوْا بِشُرَکَآئِهِمْ کٰفِرِیْنَ (۱۲-۱۳)

'ابلاس' کے معنی بالکل مایوس اور بھونچکا ہو کر رہ جانا ہے۔ فرمایا کہ آج یہ مخالفین جن کی شفاعت پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں جب قیامت کے دن ان کے سامنے اصل صورتِ حال آئے گی تو وہ مایوس اور بھونچکے ہو کر رہ جائیں گے ـــــ وہ دیکھیں گے کہ جن کو انھوں نے شریکِ خدا بنایا اور جن کی زندگی بھر لوجا کی ان میں سے کوئی بھی ان کی شفاعت کرنے والا نہیں ہے۔

'وَکَانُوْا بِشُرَکَآئِهِمْ کٰفِرِیْنَ'۔ اور خود ان کا حال یہ ہوگا کہ جن کی حمایت میں آج آستینیں چڑھائے ہوئے ہر ایک سے لڑنے کو تیار ہیں، ان کے منکرین جائیں گے۔ سورۂ قصص کی تفسیر میں ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ قیامت کے مختلف مراحل میں مشرکین اپنے شرکاء کے معاملے میں مختلف رویے اختیار کریں گے ـــــ کبھی تو وہ ان کو اپنی مدد کے لیے پکاریں گے اور کبھی وہ مرحلہ بھی آئے گا کہ صاف صاف، ان کا انکار کریں گے۔ حیرانی و پریشانی کے عالم میں جہاں جو بات بنتی نظر آئے گی وہ کریں گے لیکن قیامت بات بنانے کی جگہ نہیں ہوگی بلکہ حقائق سے دوچار ہونے کی جگہ ہوگی۔

یہاں زبان کے اس اسلوب پر بھی نگاہ رہے کہ مستقبل کے احوال ماضی کے صیغوں ـــــ 'وَلَمْ یَکُنْ لَّهُمْ' اور 'وَکَانُوْا بِشُرَکَآئِهِمْ' ـــــ میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ اسلوب تقریبِ فہم کے لیے اختیار کیا جاتا ہے گویا مخاطب جس چیز کو نہایت بعید سمجھتے ہیں متکلم اس کو ماضی کے اسلوب میں ایک واقع شدہ واقعہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ احوالِ قیامت کے بیان میں قرآن نے یہ اسلوب اکثر جگہ استعمال کیا ہے۔

وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یَوْمَئِذٍ یَّتَفَرَّقُوْنَ ۝ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِیْ رَوْضَةٍ

يُحْبَرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ (۱۴-۱۶)

کفار کا ایک مغالطہ

یعنی اس دنیا کا کارخانہ ابتلاء کے قانون کے تحت چل رہا ہے اس وجہ سے اس میں نیک و بد اور مومن و فاسق دونوں ملے ہوئے ہیں اور اکثر حالات میں اہلِ حق مظلوم و مقہور اور اہلِ باطل غالب و فتحمند ہیں اس وجہ سے اس دنیا کا بالحق ہونا ان لوگوں کو نظر نہیں آتا جن کے اندر بصیرت نہیں ہے لیکن جب آخرت، کا یوم الفرقان نمایاں ہوگا اور اس دن نیک و بد اور مومن و کافر دونوں ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ ہو جائیں گے۔ جو ایمان و عمل صالح والے لوگ ہوں گے وہ ایک شاندار باغ میں مسرور و شادماں ہوں گے اور جنھوں نے کفر کیا اور اللہ کی آیات و ملاقات کو جھٹلایا ہوگا وہ عذاب میں پکڑے ہوئے ہوں گے۔ یہاں 'رَوْضَةٌ' کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔ یعنی جنت کے باغوں میں سے شاندار باغ میں۔ 'حَبْرٌ' کے معنی خوش اور مسرور کرنے کے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے لیے وہ تمام اسباب مہیا فرما دے گا جو ان کی خوشی کے لیے ضروری ہوں گے۔ مجرمین کے باب میں لفظ 'مُحْضَرُوْنَ' ان کی ذلت و بے بسی کی تصویر کے لیے ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عذاب میں اس طرح باندھ کر اور گھسیٹ کر لائے جائیں گے جس طرح سزا یافتہ قیدی لائے جاتے ہیں۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ (۱۷-۱۸)

توحید اور قانونِ مجازات کا تقاضا

اب یہ تقاضا بیان ہوا ہے اللہ تعالیٰ کی اس یکتائی اور اس کے قانونِ مجازات کا جس کا بیان اوپر کی آیات میں ہوا ہے۔ فرمایا کہ جب اصل حقیقت یہ ہے جو بیان ہوئی تو ہر ایک کا فرض ہے کہ صرف اللہ ہی کی تسبیح کرے شام و صبح اور عشا کے وقت اور ظہر کے وقت۔

'وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'۔ یہ اوقاتِ تسبیح کے بیچ میں ایک جملہ معترضہ بطور تنبیہ و تذکیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ خدا ہی کی تسبیح کی جو دعوت دی جا رہی ہے یہ کوئی بیگانہ دعوت نہیں ہے بلکہ آسمانوں اور زمین کے ہر گوشے سے خدا ہی کی حمد کا ترانہ گونج رہا ہے۔ تو جو لوگ خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کر رہے ہیں اُن کا سُر اس کائنات کے مجموعی سُر سے بالکل بے جوڑ ہے البتہ جو لوگ خدا کی حمد و تسبیح کر رہے ہیں وہ اس کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ اس میں دعوت کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی بے نیازی کا اظہار بھی ہے، کہ اگر کچھ بدقسمت خدا کی حمد و تسبیح سے گریز کریں گے تو وہ یہ نہ سمجھیں کہ اس کائنات میں اس کی حمد و تسبیح کرنے والوں کی کمی ہے، آسمانوں اور زمین کا ہر گوشہ اس کی حمد کرنے والوں سے معمور ہے۔

اوقاتِ عبادت کے تعیین میں حکمت

یہاں جو اوقات، مذکور ہوئے ہیں ان پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حمد و تسبیح کے لیے

وہ اوقات خاص طور پر پسند فرمائے ہیں جن کی اس کی کسی بڑی نشانی کا ظہور ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ رات دن میں داخل ہوتی ہے یا دن رات میں داخل ہوتا ہے۔ یا سورج سمتِ راس سے جھکتا ہے یا رات تاریک ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو انسان غور کرنے والا ہے یہ اوقات اس کے ذہن و دماغ پر خاص طور پر اثرانداز ہوتے اور اس کو جھنجھوڑتے ہیں کہ وہ اس ذات کو اس وقت یاد کرے جس کے حکم سے یہ عظیم تغیر اس دنیا میں واقع ہوا ہے۔ اگر ان اوقات میں بھی کوئی شخص اللہ کی نشانیوں اور اس کی شانوں سے متاثر نہیں ہوتا تو وہ نہایت بلید جانور ہے۔

اوقاتِ نماز میں سے فجر اور ظہر کا ذکر تو اس آیت میں نہایت واضح طور پر موجود ہی ہے۔ تُمْسُوْنَ میں اگر عصر اور مغرب دونوں کو شامل کر لیجیے اور 'عَشِیًّا' سے 'عشاء' کو مراد لیجیے تو تمام اوقاتِ نماز آجاتے ہیں۔ لفظ 'عشی' کا اطلاق زوال کے وقت پر بھی ہوتا ہے اور مغرب سے لے کر عشاء کے وقت پر بھی' اس وجہ سے اس سے عشاء کا وقت مراد لینے میں لفظ سے کوئی تجاوز نہیں ہوگا۔

۲۔ آگے کا مضمون ـــ آیات ۱۹ - ۲۹

آگے ایک مناسب ترتیب کے ساتھ بعث و قیامت اور توحید کے دلائل آرہے ہیں۔ قیامت کا بیان اس پہلو سے ہوا ہے کہ اس دنیا کی اصلی غایت و حکمت قیامت ہی سے واضح ہوگی اور توحید کا مضمون اس پہلو سے اس کے ساتھ آیا ہے کہ توحید کے بغیر قیامت ایک بالکل بے معنی چیز ہو کے رہ جاتی ہے۔ جب نظریہ یہ ہو کہ آدمی کے اعمال خواہ کچھ ہی ہوں شرکاء و شفعاء اس کو بخشوا لیں گے تو قیامت کا آنا نہ آنا دونوں یکساں ہوا۔ قیامت کی ساری اہمیت اس عقیدے میں ہے کہ اس دن خدا کے کامل حق و عدل کا ظہور ہوگا اور کسی کا زور و اثر بھی اس کے بے لاگ عدل کے ظہور میں مزاحم نہ ہو سکے گا ـــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْأَرْضَ آیات ۱۹-۲۹ ع ۹ ۲
بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ وَكَذَٰلِكَ تُخْرَجُونَ ﴿١٩﴾ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ
خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ إِذَا أَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُونَ ﴿٢٠﴾ وَمِنْ
آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ
بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٢١﴾

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ﴿٢٢﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ
وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يَّسْمَعُوْنَ ﴿٢٣﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا
وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿٢٤﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ
السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖ مِّنَ الْاَرْضِ ۖ
اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴿٢٥﴾ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ
لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ
اَهْوَنُ عَلَيْهِ ؕ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَ
هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٢٧﴾ ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ ع ٣ ٨ ٦
لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ
فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ
نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿٢٨﴾ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا
اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَا
لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٢٩﴾

ترجمہ آیات ١٩-٢٩

وہ زندہ کو مردہ سے پیدا کرتا ہے اور مردہ کو زندہ سے پیدا کرتا ہے اور زمین کو
اس کے خشک ہو جانے کے بعد از سر نو شاداب کر دیتا ہے اور اسی طرح تم بھی

نکالے جاؤ گے۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر تم دیکھتے دیکھتے بشر بن کر روئے زمین پر پھیل جاتے ہو اور یہ بھی اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھاری ہی جنس سے تمھارے لیے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمھارے درمیان محبت اور ہمدردی ودیعت کی۔ بے شک اس کے اندر گوناگوں نشانیاں ہیں ان کے لیے جو غور کرنے والے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی خلقت اور تمھاری بولیوں اور تمھارے رنگوں کا تنوع بھی ہے۔ بے شک اس کے اندر گوناگوں نشانیاں ہیں اصحاب علم کے لیے۔ اور اس کی نشانیوں میں سے رات اور دن میں تمھارا سونا اور اس کے فضل کا طالب بننا ہے ۔ بے شک اس کے اندر گوناگوں نشانیاں ہیں ان کے لیے جو سننے سمجھنے والے ہیں اور وہ اپنی نشانیوں میں سے تم کو دکھاتا ہے بجلی کو جو خوف بھی پیدا کرتی ہے اور امید بھی اور اتارتا ہے آسمان سے بارش پس زندہ کر دیتا ہے اس سے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد۔ بے شک اس کے اندر گوناگوں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ چیز بھی ہے کہ آسمان و زمین اس کے حکم سے قائم ہیں پھر جب وہ تم کو زمین سے نکلنے کے لیے ایک ہی بار پکارے گا تو تم دفعتہً نکل پڑو گے۔ اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں اسی کے مملوک ہیں، سب اسی کے فرمانبردار ہیں اور وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہ اس کا عادہ کرے گا اور یہ اس کے لیے زیادہ آسان ہے۔ اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے ب سے برتر صفت ہے اور عزیز و حکیم وہی ہے۔ ۲۰-۲۷

وہ تمھارے لیے خود تمھارے اندر سے ایک تمثیل بیان کرتا ہے۔ کیا ہم نے تم کو جو

رزق و فضل بخشا ہے اس میں تمہارے مملوکوں میں سے بھی کچھ شریک ہیں کہ تم اور وہ اس میں برابر کے حقوق رکھنے والے بن گئے ہو اور جس طرح تم اپنوں کا لحاظ کرتے ہو اسی طرح ان کا بھی لحاظ کرتے ہو؟ اسی طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں بلکہ اپنی جانوں پر ان ظلم کرنے والوں نے بے دلیل اپنی بدعات کی پیروی کر رکھی ہے تو ان کو کون ہدایت دے سکتا ہے جن کو اللہ نے گمراہ کر دیا ہے! اور ان کا کوئی بھی مدد کرنے والا نہیں بنے گا۔ ۲۸-۲۹

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ وَكَذَٰلِكَ تُخْرَجُونَ (۱۹)

قیامت کا شاہد روزمرہ کے واقعات میں

'اخراج' کے معنی جس طرح کسی چیز سے کسی چیز کے نکالنے کے آتے ہیں اسی طرح کسی چیز کے ظاہر کرنے کے بھی آتے ہیں۔ یہ منکرین قیامت کے استبعاد کو رفع فرمایا ہے کہ تم مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کو بہت مستبعد سمجھتے ہو حالانکہ اس دنیا کے ہر گوشہ میں زندہ کو مردہ سے ظہور میں آتے اور زندہ پر موت کو طاری ہوتے دیکھتے ہو۔ اس کی مثال کے طور پر فرمایا کہ تم زمین کو دیکھتے ہو کہ وہ بالکل خشک اور مردہ ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ بارش کے ایک ہی چھینٹے سے اس کے ہر گوشے میں زندگی نمودار کر دیتا ہے! اسی طرح تم بھی ایک دن مرکھپ جانے کے بعد نکال کھڑے کیے جاؤ گے۔ زندگی اور موت سب خدا کے اختیار میں ہے۔ نہ اس کے لیے زندہ کو مردہ کرنا مشکل ہے نہ مردہ کو زندہ کرنا قیامت کا یہ عمل برابر تمہاری نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ اگرچہ یہاں مثال در اصل حیات بعد الموت کی پیش کرنی مقصود ہے لیکن اپنی کامل قدرت کو سامنے لانے کے لیے موت بعد الحیات کا بھی حوالہ دے دیا ہے۔ انعام کی آیات ۹۵-۹۶ کے تحت اس پر مفصل بحث گزر چکی ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ إِذَا أَنتُم بَشَرٌ تَنتَشِرُونَ (۲۰)

قدرت الٰہی کا شاہد خود اپنے وجود میں

یعنی تم کو جن حقائق کے ماننے کی دعوت دی جا رہی ہے وہ تمام تر تمہارے خالق کی قدرت و حکمت پر مبنی ہیں تو اس کی قدرت و حکمت کے ثبوت کے لیے تم کسی خارجی دلیل کا مطالبہ کیوں کرتے ہو؟ اس کی سب سے بڑی دلیل تو خود تمہاری خلقت ہی کے اندر موجود ہے۔ اس نے تم کو جامد مٹی سے پیدا کیا اور پھر تم زندہ

اور عقل و شعور رکھنے والی ہستی بن کر تمام روئے زمین پر پھیل گئے۔ 'اِذَا' یہاں اس عظیم قدرت و شان کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہے۔ یعنی غور کرو، کہاں خشک مٹی اور کہاں جیتا جاگتا انسان، دیکھتے دیکھتے خدا کی قدرت نے اسی مٹی سے ایک پورا جہان آباد کر دیا! مطلب یہ ہے کہ اگر یہ انسان اس بات پر جھگڑے کہ خدا اس کو دوبارہ کس طرح پیدا کر سکتا ہے تو یہ بلادت و حماقت کی انتہا ہے۔ اسی بات کو قرآن میں دوسرے مقام میں یوں فرمایا ہے کہ ہم نے انسان کو پیدا تو کیا مٹی سے لیکن اب وہ ہمارا حریف بن کر اٹھ کھڑا ہوا ہے اور علانیہ ہماری قدرت کو چیلنج کر رہا ہے!

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۲۱)

ہر چیز کے جوڑے جوڑے ہونے کی حکمتیں

اب ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے وجود سے خارج کی ایک عظیم نشانی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ہم نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے تمہارا جوڑا پیدا کیا تاکہ تم اس سے تسکین و راحت حاصل کرو اور اس تسکین و راحت کے حصول کے لیے تمہارے درمیان محبت و ہمدردی ودیعت فرمائی —— فرمایا کہ جو لوگ غور کرنے والے ہیں ان کے لیے اس کے اندر گوناگوں نشانیاں ہیں۔

اس کے اندر ایک واضح نشانی تو اس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں ہر چیز جوڑا جوڑا پیدا کی ہے اور ہر چیز اپنے مقصدِ وجود کی تکمیل اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر کرتی ہے۔ اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اس دنیا کا بھی ایک جوڑا ہے جس کو آخرت کہتے ہیں۔ اسی آخرت سے اس دنیا کی غایت کی تکمیل ہوتی ہے۔

دوسری نشانی اس کے اندر یہ ہے کہ ہمارا خالق نہایت مہربان اور محبت کرنے والا ہے۔ اس نے ہمارے اندر جوڑے کی طلب دی تو ہماری ہی جنس سے ہمارا جوڑا بھی اس نے پیدا کیا اور پھر دونوں کے اندر محبت و ہمدردی کے جذبات بھی ودیعت فرمائے تاکہ دونوں دو قالب یک جان ہو کر زندگی بسر کریں۔

تیسری نشانی اس کے اندر یہ ہے کہ اس کائنات کے اضداد کے اندر نہایت گہرا اتفاق اور ایک بالاتر مقصد کے لیے نہایت عمیق سازگاری پائی جاتی ہے جو اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اس کا خالق و مالک ایک ہی ہے جو اپنی حکمت کے تحت اس کائنات کے اضداد میں توفیق پیدا کرتا ہے۔

چوتھی نشانی اس کے اندر یہ ہے کہ ان لوگوں کا خیال بالکل احمقانہ ہے جو سمجھتے ہیں کہ اس کائنات کا ارتقاء آپ سے آپ ہوا ہے۔ اگر اس کا ارتقا آپ سے آپ ہوا ہے تو اس کے اضداد میں یہ حیرت انگیز توافق کہاں سے پیدا ہوا؟ یہ تو اس بات کی صاف شہادت ہے کہ ایک قادر و حکیم ہستی ہے جو اس پورے نظام کو اپنی حکمت کے تحت چلا رہی ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ (۲۲)

کثرت کے اندر وحدت

اُسی حقیقت کی طرف جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوئی ہے ایک دوسرے زاویے سے توجہ دلائی کہ اگر لوگ غور کریں تو ان کو یہ چیز صاف نظر آئے گی کہ اس کائنات میں کثرت کے اندر وحدت مضمر ہے۔ ایک طرف آسمانوں کی ایک وسیع اور ناپیدا کنار کائنات ہے اور دوسری طرف یہ کرۂ زمین ہے۔ بظاہر دونوں میں کتنی دوری ہے لیکن اس دوری کے باوجود دونوں میں اتنا گہرا اتصال ہے کہ کوئی عاقل یہ تصور نہیں کرسکتا کہ دونوں الگ الگ خالقوں کی قدرت سے وجود میں آتے اور الگ الگ ارادوں کے تحت گردش کر رہے ہیں بلکہ ان کی باہمی سازگاری پکار پکار کر شہادت دے رہی ہے کہ ایک ہی قدیر و حکیم دونوں پر متصرف ہے اور دونوں کو ایک مشترک مقصد کے لیے مسخر کیے ہوئے ہے۔ اسی طرح انسانوں کے عالم پر غور کیجیے تو نظر آئے گا کہ قوموں قوموں کی زبانیں الگ اور فرد فرد کا لہجہ مختلف ہے، اسی طرح ان کے رنگ بھی الگ الگ ہیں لیکن اس اختلاف و تنوع کے باوجود کوئی عاقل یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں رنگ اور فلاں زبان و لہجہ کے لوگ الگ خدا کی مخلوق ہیں اور فلاں رنگ و روغن کے لوگ کسی الگ خالق کی مخلوق ہیں بلکہ ہر دانشمند یہ جانتا ہے کہ ایک ہی خالق نے تمام انسانوں کو وجود بخشا ہے یہ محض اس کی حیرت انگیز کاریگری کا کرشمہ ہے کہ اس نے ہر انسان کا لب و لہجہ اور اس کا ناک نقشہ ایسا بنایا ہے کہ لاکھوں کروڑوں آدمیوں کا بھی جائزہ لیجیے تو ناممکن ہے کہ کوئی دو فرد بھی آپ کو بالکل ایک ہی رنگ و روغن، ایک ہی قد و قامت اور ایک ہی ناک نقشہ کے مل سکیں۔

حقیقی عالم کون ہیں!

'اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ' فرمایا کہ علم والوں کے لیے اس کے اندر بہت سی نشانیاں ہیں۔ اوپر والی آیت میں 'يَّتَفَكَّرُوْنَ' فرمایا تھا یہاں 'لِلْعٰلِمِيْنَ' فرمایا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اصل عالم درحقیقت وہی لوگ ہیں جو اس کائنات پر تفکر کرتے اور اس تفکر سے اس کی کثرت کے اندر وحدت اور اس کے اضداد کے اندر توافق و سازگاری کا مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر اس کے خالق کی صفات قدرت و حکمت سے اس نتیجہ تک پہنچ جاتے ہیں کہ یہ عظیم کائنات بے غایت و مقصد نہیں ہوسکتی اس وجہ سے لازم ہے کہ ایک روز جزا آئے جس میں نیکوکار اپنی نیکیوں کا صلہ پائیں اور بدکار اپنی بدیوں کی سزا بھگتیں۔

انسانوں کے درمیان وصل و فصل کی بنیاد

اس آیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ قوموں کے درمیان زبان اور رنگ کے اختلاف کو فارق نہیں ہونا چاہیے۔ انسانوں کے درمیان یہ چیزیں وصل و فصل کی بنیاد نہیں ہیں۔ جس طرح رنگوں اور زبانوں کے اختلاف کے باوجود تمام انسان خدا کی مخلوق ہیں اسی طرح اس قسم کے تمام ظاہری اختلافات کے علی الرغم تمام انسانوں کو ایک ہی خدائی نظام کے تحت زندگی بسر کرنی چاہیے۔ جو لوگ رنگ، نسل یا زبان یا اس نوع کی کسی اور چیز کو انسانوں کے درمیان وصل و فصل کی بنیاد بناتے ہیں

وہ اس کائنات کی وحدت پر ضرب لگاتے ہیں اور یہ چیز قرآن کی اصطلاح میں شرک اور فساد فی الارض ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ (۲۳)

'وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ' کا عطف 'مَنَامُكُمْ' پر ہے اس وجہ سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کی نشانیوں میں سے یہ چیز بھی ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات بنائی جس میں تم سوتے ہو اور دن بنایا جس میں تم اس کے رزق و فضل کے حصول کے لیے جد و جہد کرتے ہو۔ اس مفہوم کی نظیریں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔

دلائل ان کے لیے نافع ہوتے ہیں جو بات کو سنیں

'اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ' فرمایا کہ اس میں بھی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو بات کو سنیں۔ رات اور دن کے توافق کے اندر توحید کی جو دلیل ہے اور شب میں سونے کے بعد صبح کو اٹھنے میں قیامت کا جو اشارہ ہے اس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے لیکن یہ نشانیاں اور دلیلیں ان لوگوں کی سمجھ میں آسکتی ہیں جو پیغمبر اور قرآن کی بات کو توجہ سے سنیں۔ اس فقرے میں مخالفین کے رویہ پر تعریض ہے کہ جو لوگ بات سننے اور سمجھنے کے بجائے مخالفت کے لیے آستینیں چڑھائے ہوئے ہیں ان کے لیے یہ سارے دلائل بے سود ہیں۔

اوپر کی آیات میں 'تفکر' اور 'علم' کا ذکر ہوا ہے اور ہم ان کے باہمی تعلق کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں 'سمع' کا ذکر ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا درجہ اوپر کی دونوں چیزوں کے نیچے ہے لیکن حصولِ علم کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے۔ اگر ایک شخص کے اندر اتنی معقولیت موجود ہو کہ وہ معقول لوگوں کی باتیں توجہ سے سنے تو اس راہ سے بھی اس کو ہدایت حاصل ہو سکتی ہے اگرچہ وہ کائنات کے نظام اور اس کے اسرار میں زیادہ تفکر کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۲۴)

امید و بیم دونوں کا مرکز خدا ہے

اور اس کی نشانیوں میں سے بجلی بھی ہے جو اپنے اندر امید و بیم اور طمع و خوف دونوں کے پہلو رکھتی ہے۔ یہ ابرِ رحمت کی بشارت اور اس کا مقدمۃ الجیش بن کر بھی نمودار ہوتی ہے اور کسی قوم کے لیے عذاب کا تازیانہ بن کر بھی۔ پہلی صورت تو عامۃ الورود ہے جس کا تجربہ ہم ہمیشہ کرتے ہیں۔ دوسری صورت کی مثالیں بھی قوموں کی تاریخ میں موجود ہیں۔ قرآن نے عاد و ثمود کی تباہی کے سلسلے میں 'صاعقہ' کا ذکر کیا ہے اور ہم اس کے محل میں اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔ فرمایا کہ اس میں بھی ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیں۔ اس میں پہلی نشانی تو اس بات کی ہے کہ نعمت و نقمت دونوں خدا ہی کے ہاتھ میں ہے اس وجہ سے امید و بیم اور خوف و طمع دونوں حالتوں میں بندے کو اللہ ہی کی طرف

رجوع کرنا چاہیے۔ مشرکین کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ وہ کسی کو رحمت لانے والا اور کسی کو عذاب نازل کرنے والا بنائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ دوسری نشانی اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کے معاملات سے بالکل بے تعلق ہو کر کسی گوشے میں نہیں بیٹھا ہوا ہے بلکہ وہ براہِ راست تمام امور کی تدبیر فرماتا ہے اور اپنے قانونِ حق و عدل کے مطابق قوموں کو جزا اور سزا دیتا ہے۔ تیسری نشانی اس کے اندر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر کسی قوم پر عذاب نازل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے اسے علیحدہ کوئی ایٹم بم نہیں بنانا پڑتا بلکہ وہ اپنی جس نعمت کو جب چاہے نقمت کی صورت میں تبدیل کر دیتا ہے۔

'وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيِ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا' کے استدلالی پہلو کی طرف آیت ۱۹ کے تحت ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖ مِّنَ الْاَرْضِ ۖ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ۝ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (۲۵-۲۶)

آسمان اور زمین خدا کے حکم سے قائم ہیں۔ یعنی کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ آسمان و زمین کا یہ ٹھوس نظام کس طرح متزلزل ہو سکتا ہے کہ قیامت آجائے گی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اہلِ عرب پہاڑوں کی نسبت جو سوال اٹھاتے تھے اور جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہ اسی پہلو سے اٹھاتے تھے کہ بھلا ان کو کون ان کی جگہ سے ہلا سکتا ہے! اس وجہ سے قیامت کے ڈراوے ان کے خیال میں بالکل وہمی ڈراوے تھے۔ ان کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر فرمایا ہے کہ آسمان و زمین جو قائم ہیں تو اللہ کے حکم سے قائم ہیں اور اسی وقت تک قائم رہیں گے جب تک اللہ تعالیٰ ان کو قائم رکھنا چاہے گا۔ پھر جب وہ اس نظام کو درہم برہم اور دوسرا نظام قائم کرنا چاہے گا تو اس کو اس میں ذرا بھی مشکل پیش نہیں آئے گی، وہ زمین کی طرف سے تمہیں بلانے کے لیے ایک ہی پکار پکارے گا اور تم سب دفعۃً زمین سے نکل پڑو گے۔ یعنی اس کو پکارنے کی زحمت بھی بار بار نہیں اٹھانی پڑے گی۔ ایک ہی پکارنا بالکل کافی ہوگا۔ اسی مضمون کو دوسرے مقام میں یوں فرمایا ہے 'وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ' (اور زمین اپنے رب کی فرمانبرداری کرے گی اور اس کے لیے یہی زیبا ہے)۔

'وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ'۔ یہ اوپر والی بات کی دلیل ارشاد ہوئی ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب اسی کی مخلوق، اسی کے مملوک اور اسی کے فرمانبردار ہیں تو کس کی مجال ہے کہ اس کے حکم سے سرتابی اور اس کی پکار سے سرِ مُو انحراف کر سکے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ؕ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۲۷)

یہ اوپر والے ٹکڑے 'اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ' کی دلیل بھی ہے اور اس میں اس توحید کے مضمون کی تمہید بھی ہے جو آگے آ رہا ہے۔ قیامت کے دن اٹھائے جانے کی یہ دلیل اوپر آیت ۱۱ میں بھی گزر چکی ہے۔

یہاں بعینہٖ اسی کا اعادہ نہیں ہے بلکہ اس پر وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ کا اضافہ بھی ہے۔ فرمایا کہ وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اعادہ تم سوچو تو اس کے لیے زیادہ آسان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہو کہ اسی نے خلق کو وجود بخشا ہے تو اس کے دوبارہ پیدا کیے جانے کو کیوں مستبعد خیال کرتے ہو؟ پہلا کام زیادہ مشکل ہے یا یہ دوسرا؟

تمام اعلیٰ صفتیں اللہ ہی کے لیے ہیں

وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ 'مثل' یہاں صفت کے مفہوم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کے لیے یہ لفظ اس وجہ سے قرآن میں استعمال ہوا ہے کہ اس کی صفتیں انہی الفاظ میں بیان ہوئی ہیں جو ہماری زبان کے ہیں اور جن کو ہم اپنے لیے بھی بولتے ہیں۔ ایسا اس لیے کیا گیا کہ یہ تمثیلی صورت اختیار کیے بغیر یہ صفتیں ہماری فہم سے قریب نہیں آسکتی تھیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ اس اعلیٰ مفہوم میں استعمال ہوئی ہیں جو اللہ جل شانہٗ کے شایانِ شان ہے۔

فرمایا کہ آسمانوں اور زمین میں تمام اعلیٰ صفتوں کا اصلی حقدار وہی ہے، کوئی دوسرا ان صفات میں اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ اس کے بعد خاص طور پر اپنی دو صفتوں —— عزیز و حکیم —— کا حوالہ دیا کہ وہ ہر چیز پر غالب، سب سے بالاتر، اور اس کے ہر کام میں حکمت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے لیے کوئی کام بھی مشکل نہیں، اس کے ارادے میں اس کی حکمت کے سوا اور کوئی چیز بھی دخیل نہیں، اور اس ساری کائنات میں کوئی نہیں جو اس کی صفات میں برابری کر سکے۔ اس سے یہ بات لازمی نتیجہ کے طور پر آپ سے آپ نکل آئی کہ جب صفات میں کوئی اس کی برابری کا نہیں تو اس کے حقوق میں بھی کوئی اس کی برابری کا نہیں قرار دیا جا سکتا۔

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ۚ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۲۸)

خدا کے حقوق میں حصہ داری کے خلاف ایک دلیل

یہ خدا کی صفات اور اس کے حقوق میں دوسروں کی حصہ داری کے خلاف ایک ایسی دلیل کی طرف توجہ دلائی ہے جس پر خود مخاطب کا طرزِ عمل شاہد ہے۔ فرمایا کہ تمہارے شرک کے خلاف دلیل ڈھونڈھنے کے لیے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے تمہارے باہمی طرزِ عمل ہی کو اللہ تعالیٰ تمہارے آگے بطور مثال پیش کرتا ہے۔ تم بتاؤ کہ جو رزق و فضل ہم نے تم کو دے رکھا ہے اپنے غلاموں کے لیے بھی تم اس میں اس طرح کی حصہ داری تسلیم کرتے ہو کہ وہ اور تم اس میں برابر کے شریک ہو جائیں اور تم ان کا بھی اسی طرح لحاظ کرو جس طرح اپنا اور اپنے حق داروں کا لحاظ کرتے ہو! لفظ 'خوف' یہاں لحاظ کرنے کے مفہوم میں ہے۔ یہ لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس پر ہم کہیں بحث کر آئے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جب تم اپنے حقوق میں اپنے مملوکوں کے لیے مساوی درجے کی حصہ داری تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہو درآنحالیکہ جو کچھ تمہارے پاس ہے ہمارا عطا کردہ ہے تو خدا کے حقوق میں تم اس

کی مخلوقات کو کس طرح شریک بنائے دے رہے ہو! یہ تو نہایت بھونڈی بات ہوئی کہ جس چیز کو تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے اس کو خدا کے لیے پسند کرتے ہو، حالانکہ تمام اعلیٰ صفات اور برتر حقوق کا اصل حقدار آسمانوں اور زمین میں وہی ہے۔ شرک کی تردید میں یہ اسی طرح کی نفسیاتی دلیل ہے جس طرح کی دلیل دوسرے مقام میں یوں بیان ہوئی ہے کہ یہ مشرکین خود تو لڑکیوں کو ناپسند کرتے اور اپنی طرف ان کی نسبت سے بھی شرماتے ہیں، لیکن اللہ کے لیے انھوں نے بہت سی بیٹیاں فرض کر رکھی ہیں۔ اس میں دلیل کا اصلی پہلو یہ ہے کہ شرک کے خلاف انفس و آفاق اور عقل و فطرت میں جو شواہد و دلائل موجود ہیں وہ تو ہیں ہی، ان سے قطع نظر یہ دلیل بھی اس کے خلاف موجود ہے کہ مشرکین جس چیز کو اپنے لیے پسند نہیں کرتے اس کو خدا کے ساتھ جوڑتے ہیں، حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ جس بات کو اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں اس کو خدا کے لیے بدرجۂ اولیٰ ناپسند کرتے۔

'کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ'۔ اس دلیل نے وضاحت مقصد کی گویا تکمیل کر دی، اس وجہ سے فرمایا کہ ہم اس طرح اپنے دلائل کی تفصیل بیان کر رہے ہیں لیکن یہ دلائل کار آمد ان کے لیے ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں، جنھوں نے اپنی عقلوں پر تالے چڑھا رکھے ہوں ان کے لیے یہ دلیلیں کیا کار آمد ہو سکتی ہیں!

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَھْوَآءَھُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ یَّھْدِیْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰہُ ؕ وَمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ (۲۹)

عقل کی جگہ خواہشوں کی پیروی کرنے والوں کا انجام

'اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا' سے مراد یہی مشرکین ہیں جنھوں نے شرک جیسے 'ظلم عظیم' کا ارتکاب کیا ہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ عقل سے رہنمائی حاصل کرنے والی مخلوق نہیں بلکہ اپنی خواہشوں اور بدعات کے پیچھے چلنے والے ہیں۔ 'بِغَیْرِ عِلْمٍ' میں 'علم' سے مراد دلیل و حجت ہے۔ یعنی اس پیروی میں انھوں نے علم اور دلیل کو رہنما نہیں بنایا ہے بلکہ آنکھ بند کر کے خواہشوں کے پیچھے چل پڑے ہیں۔

'فَمَنْ یَّھْدِیْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰہُ' یعنی جو اللہ کے قانون کی زد میں آ کر گمراہ ہو چکے ہوں بھلا ان کو کون راہ یاب کر سکتا ہے! اللہ نے رہنمائی کے لیے انسان کو عقل عطا فرمائی ہے لیکن بہت سے شامت زدہ عقل کے بجائے اپنی باگ اپنی خواہشوں کے ہاتھ میں پکڑا دیتے ہیں۔ ایسے کج عقلوں کو خدا ان کی خواہشوں کے پیچھے آوارہ گردی کے لیے چھوڑ دیا کرتا ہے۔ 'وَمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ'۔ پھر وہ اسی آوارہ گردی میں زندگی گزار دیتے ہیں۔ نہ اس دنیا میں ان کو اس ضلالت سے نکالنے میں کوئی مددگار بنتا اور نہ آخرت میں ان کو ان کے مہلک انجام سے بچانے میں کوئی ان کا مددگار بن سکے گا۔

۴۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۳۰-۳۹

اوپر کی آیات میں مشرکین کے ان تمام اعتراضات کا، جو انھوں نے رومیوں کی شکست اور مجوسیوں

کی فتح کو دلیل بنا کر اسلام کی دعوت کے خلاف اٹھائے، جواب دیا گیا۔ آگے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو پوری دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ دینِ فطرت ——— اسلام ——— پر قائم رہنے اور اس کے دونوں بنیادی ستون ——— نماز اور انفاق ——— قائم کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے اور آخر میں قریش کو تنبیہ کیا گیا ہے کہ ان کے عقیدہ و عمل کے فساد نے ان کا ہر طرف سے احاطہ کر لیا ہے اس وجہ سے اب ان کے محاسبہ کا وقت قریب آلگا ہے۔ وہ جلد اپنے انجام سے دوچار ہوں گے اور جو لوگ دینِ قیم ملتِ ابراہیم پر پوری مضبوطی سے قائم رہیں گے اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے نوازے گا ——— اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ
لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ
لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٠﴾ مُنِيبِينَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا
مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٣١﴾ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ
كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ﴿٣٢﴾ وَإِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا
رَبَّهُمْ مُنِيبِينَ إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا أَذَاقَهُمْ مِنْهُ رَحْمَةً إِذَا فَرِيقٌ
مِنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ﴿٣٣﴾ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ۚ فَتَمَتَّعُوا
فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿٣٤﴾ أَمْ أَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوا
بِهِ يُشْرِكُونَ ﴿٣٥﴾ وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوا بِهَا ۖ وَإِنْ
تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ إِذَا هُمْ يَقْنَطُونَ ﴿٣٦﴾ أَوَلَمْ
يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ
لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٣٧﴾ فَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ
وَابْنَ السَّبِيلِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ لِلَّذِينَ يُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ ۖ وَأُولَٰئِكَ

هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٣٨﴾ وَمَا آتَيْتُم مِّن رِّبًا لِّيَرْبُوَ فِي أَمْوَالِ النَّاسِ
فَلَا يَرْبُو عِندَ اللَّهِ ۖ وَمَا آتَيْتُم مِّن زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ
اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ ﴿٣٩﴾

ترجمہ آیات ۳۰-۳۹

پس تم اپنا رخ یکسو ہو کر دینِ حنیفی کی طرف کرو۔ اس دینِ فطرت کی پیروی کرو جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کو تبدیل کرنا جائز نہیں ہے۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اسی کی طرف متوجہ ہو کر اور اسی سے ڈرو اور نماز کا اہتمام رکھو۔ اور تم لوگ مشرکین میں سے نہ ہو۔ ان مشرکین میں سے جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور گروہ گروہ بن گئے۔ ہر پارٹی بس اسی پر مگن ہے جو اس کے اپنے پاس ہے۔ ۳۰-۳۲

جب لوگوں کو کوئی تکلیف لاحق ہوتی ہے تو اپنے رب کو پکارتے ہیں اسی کی طرف متوجہ ہو کر۔ پھر جب اللہ ان کو اپنی رحمت سے شاد کام کر دیتا ہے تو ان میں سے ایک گروہ اپنے رب کے شریک ٹھہرانے لگتا ہے کہ جو کچھ ہم نے ان کو عطا کیا اس کی ناشکری کریں تو چند روز حظ اٹھا لو، عنقریب تم کو پتہ چل جائے گا۔ کیا ہم نے ان پر کوئی ایسی دلیل اتاری ہے جو ان چیزوں کی شہادت دے رہی ہو جن کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں! ۳۳-۳۵

اور جب ہم لوگوں کو رحمت سے شاد کام کرتے ہیں تو وہ اس پر اترانے لگتے ہیں اور اگر ان کے اعمال کے سبب سے ان کو کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے تو وہ فوراً مایوس ہو جاتے ہیں۔ کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ اللہ ہی کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لیے

چاہتا ہے فراخ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان والے ہیں۔ ۳۶-۳۷

پس قرابتدار کو اور مسکین و مسافر کو اس کا حق دو۔ یہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور جو سودی قرض تم اس لیے دیتے ہو کہ وہ دوسروں کے مال کے اندر پروان چڑھے تو وہ اللہ کے ہاں پروان نہیں چڑھتا اور جو تم زکوٰۃ دو گے اللہ کی رضا جوئی کے لیے تو یہی لوگ ہیں جو اللہ کے ہاں اپنے مال کو بڑھانے والے ہیں۔ ۳۸-۳۹

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰)

دین فطرت کی پیروی کی ہدایت

یہاں خطاب واحد کے صیغہ سے ہے جس کا ظاہر قرینہ یہی ہے کہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیت امت کے وکیل کے خطاب ہے۔ چنانچہ بعد کی آیت میں آپ دیکھیں گے کہ حال اور خطاب کے تمام صیغے جمع استعمال ہوئے ہیں۔ اب یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطہ سے امت کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ اوپر جو دلائل بیان ہوئے ہیں ان سے یہ بات بالکل مبرہن ہو گئی کہ تمہاری دعوت اور تمہارے پیش کردہ دین کے برخلاف تمہارے مخالفوں کے سارے اعتراضات بالکل لایعنی ہیں تو تم بالکل یکسو ہو کر اپنا رُخ اللہ کے حقیقی دین کی طرف رکھو اور ان مخالفوں کی یاوہ گوئی کی مطلق پروا نہ کرو۔ 'الدِّیْن' سے مراد اللہ کا حقیقی دین — اسلام — ہے جس کی دعوت اس کے تمام نبیوں اور رسولوں نے دی اور جس کی تکمیل نبی امی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہوئی۔ یہی دین اللہ تعالیٰ کا اصلی دین ہے چنانچہ فرمایا ہے اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (اصلی دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہے) 'حَنِیْفًا' کے معنی یکسو ہو کر یعنی شرک کے تمام علائق سے کٹ کر اس طرح اپنا رُخ اس دینِ توحید کی طرف کرو جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا رُخ اس دین کی طرف کیا — یہ لفظ قرآن میں خاص طور پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے لیے استعمال

ہوا ہے اس وجہ سے اس لفظ کے استعمال میں اس حنیفیت اور یکسوئی کے لیے ایک یاددہانی ہے جس کی تمثال حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قائم فرمائی۔

'فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا'۔ یہاں ایک فعل محذوف ہے جو سابق فعل سے مستفاد ہوتا ہے یعنی ہر طرف سے کٹ کر اس دینِ فطرت کی پیروی کرو جس پر فاطرِ فطرت نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اس حذفِ فعل کے فائدے کی طرف ہم دوسری جگہ اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سے مقصود مخاطب کی ساری توجہ مفعول پر مرتکز کرنا ہوتا ہے۔ یہ اس 'الدّین' کی صحت و صداقت کی دلیل بیان ہوئی ہے جس کی طرف یکسو ہونے کی اوپر والے ٹکڑے میں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ یہ دین کوئی خارج کی چیز نہیں ہے جو تم پر اوپر سے لادی جا رہی ہو بلکہ یہ عین تمھاری فطرت کا بروز اور تمھارے اپنے باطن کا خزانہ ہے جو تمھارے دامن میں ڈالا جا رہا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ جو فلسفی یہ کہتے ہیں کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک صفحۂ سادہ اور تمام تر اپنے ماحول کی پیداوار اور الف و عادت کی مخلوق ہے، ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بہترین ساخت اور بہترین فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اس کو خیر و شر اور حق و باطل کی معرفت عطا فرمائی ہے اور نیکی کو اختیار کرنے اور بدی سے بچنے کا جذبہ بھی اس کے اندر ودیعت فرمایا ہے۔ لیکن اس کی یہ فطرت حیوانات کی جبلت کی طرح نہیں ہے کہ وہ اس سے انحراف نہ اختیار کر سکے بلکہ وہ اپنے اندر اختیار بھی رکھتا ہے۔ اس وجہ سے بسا اوقات وہ اس دنیا کی محبت اور اپنی خواہشوں کی پیروی میں اس طرح اندھا ہو جاتا ہے کہ حق و باطل کا شعور رکھتے ہوئے نہ صرف باطل کی پیروی کرتا ہے بلکہ باطل کی حمایت میں فلسفے بھی ایجاد کر ڈالتا ہے۔

انبیاء فطرت کو جگانے کے لیے آئے

انسان انبیائے کرام کی رہنمائی کا محتاج اس وجہ سے نہیں ہوا کہ وہ حق و باطل میں امتیاز یا ان کے شعور سے عاری تھا بلکہ اس وجہ سے ہوا کہ اس راہ میں اس کو اس کی بعض کمزوریوں کے سبب سے، جن کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں، بہت سے مغالطے پیش آ سکتے تھے نیز مبادیٔ فطرت کے تمام لوازم اور ان کے سارے مقتضیات کو سمجھنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی رہنمائی کے لیے نبی و رسول بھیجے۔ ان نبیوں اور رسولوں کی تعلیمات چونکہ انھی مبادی پر مبنی ہیں جو انسان کے اندر ودیعت ہیں اس وجہ سے جو سلیم الطبع تھے انھوں نے نبیوں کی ہر بات کو اپنے ہی دل کی آواز سمجھا، صرف ان لوگوں نے ان کی مخالفت کی جنھوں نے اپنی فطرت مسخ کر ڈالی تھی، اگرچہ اپنے دلوں کے اندر وہ بھی رسولوں کی صداقت و حقانیت کے معترف رہے۔ اس مسئلہ پر ہم سورۂ ہود اور سورۂ نور کی تفسیر میں مفصل بحث کر چکے ہیں۔ وضاحت مطلوب ہو تو ان پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ قرآن کو 'ذکر' اور 'ذکریٰ' جو کہا گیا ہے اس میں بھی یہی پہلو ہے کہ وہ درحقیقت انھی حقائق کی یاددہانی کرتا ہے جو انسان کے اندر موجود ہیں لیکن اس نے خود فراموشی میں ان پر نسیان کا پردہ

ڈال رکھا ہے۔

'لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ'۔ یہ لائے نفی، نفی امکان یا نفی وقوع کے مفہوم میں نہیں ہے بلکہ نفی جواز کے مفہوم میں ہے۔ 'خلق' سے مراد وہی فطرت ہے جو اللہ کی پیدا کی ہوئی ہے۔

فطرت سے انحراف تباہی ہے

مطلب یہ ہے کہ جو چیز اللہ کی پیدا کی ہوئی ہے اس کو بدلنا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جو ہر چیز کا خالق ہے وہ اپنی مخلوقات کے مقاصد و مقتضیات کو جتنے بہتر طریقے پر جانتا یا جان سکتا ہے کوئی دوسرا نہیں جان سکتا کہ وہ کسی چیز میں ترمیم و تغیر کرنے کا حقدار بن سکے۔ اگر کوئی شخص اس کی جسارت کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کی بنائی ہوئی چیز کی اصلاح کا مدعی ہے جو بالبداہت ایک حماقت ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ خدا نے آنکھیں پیشانی کے ساتھ لگائی ہیں، کوئی ان کو گدی یا پاؤں کے ساتھ لگانے کی کوشش کرے یا اللہ تعالیٰ نے عورت کو عورت اور مرد کو مرد بنایا لیکن عورت مرد بننے کے لیے زور لگائے یا مرد عورت بننے کی خواہش مند ہو جائے۔ اس قسم کی سعی نامراد کا نتیجہ بگاڑ اور فساد کے سوا کچھ اور نہیں نکل سکتا۔ بالکل یہی حال دین فطرت کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جو مبادی فطرت کے اندر ودیعت فرمائے ہیں انہی پر انسان کی دنیا میں صلاح اور آخرت میں فلاح منحصر ہے۔ اگر انسان اس سے ذرا سا انحراف اختیار کرے تو وہ خدا کی صراط مستقیم سے ہٹ جائے گا جس کا لازمی نتیجہ اس کے دین اور اس کی دنیا دونوں کی تباہی ہے اگرچہ وہ یہ انحراف علم اور سائنس کے کتنے ہی بلند بانگ دعاوی کے ساتھ کرے۔

'ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ'۔ فرمایا کہ یہی دین سیدھا دین ہے یعنی اس کو انسان کی عقل اور اس کی فطرت کے ساتھ براہِ راست تعلق ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا نہایت سیدھا اور قریبی راستہ ہے، اس میں کہیں کوئی کج پیچ نہیں ہے۔

'وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ'۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے اس وجہ سے انھوں نے اس میں بگاڑ پیدا کیا اور اب اس بگاڑ ہی پر قائم رہنے یا لوگوں کو اس پر قائم رکھنے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں۔

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۳۱)

حنیفیت کی تاکید

'مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ' حال پڑا ہوا ہے 'فَاَقِمْ وَجْهَكَ' کی ضمیر خطاب سے۔ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ لفظاً یہ خطاب اگرچہ واحد ہے لیکن معناً یہ جمع کے حکم میں ہے۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو خطاب ہے وہ امت کے وکیل کی حیثیت سے ہے۔ اس حال کے جمع لانے سے خطاب کی یہ نوعیت بالکل منقح ہو گئی۔ اوپر والی آیت میں حنیفیت کی تاکید فرمائی ہے، اس آیت میں 'انابت' اور 'تقویٰ' کی تاکید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے لیے مجرد عقلی یکسوئی کافی نہیں ہے بلکہ دل کی انابت و خشیت بھی مطلوب ہے، اور حدودِ الٰہی کی پوری پوری پاسداری بھی۔

"وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" نماز اس دین قیم کے بنیادی احکام میں سے ہے اور یہی اس حنیفیت اور انابت و تقویٰ کی محافظ اور اس کا مظہر ہے جس کی یہاں ہدایت فرمائی گئی ہے۔

"وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ" یہ تنبیہ ہے کہ مشرکین سے دور رہو اس لیے کہ انھوں نے یہ ساری چیزیں برباد کر دی ہیں جو دین قیم کے لوازم میں سے ہیں۔

مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا ط کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ (۳۲)

مشرکین سے بیزاری کا اظہار

یہ انہی مشرکین کی تفصیل ہے جن کے طریقہ سے بچنے کی اوپر والی آیت میں ہدایت فرمائی گئی ہے۔ اس وضاحت سے کلام بالکل مطابق حال ہو گیا ہے۔ اس کے اول مصداق قریش ہیں جنھوں نے اس دین کو، جو ان کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے ذریعہ سے ملا، شرک میں مبتلا ہو کر، بالکل ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تھا۔ حضرت ابراہیم نے ان کو ایک خدا کی تعلیم دی تھی لیکن انھوں نے سینکڑوں خدا بنا ڈالے اور ہر گروہ اپنے معبود پر اس طرح فدا تھا کہ اس کے خلاف کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مسلمانوں کو یہ ہدایت اس لیے نہیں فرمائی گئی کہ ان میں سے کسی کے مشرکین کے ساتھ جا ملنے کا اندیشہ تھا بلکہ یہ شرک اور مشرکین سے بیزاری کا اظہار ہے جو مشرکین کے بجائے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے — گویا مشرکین اپنی ہٹ دھرمی کے سبب سے لائق خطاب نہیں رہے اس وجہ سے بات اپنوں کو مخاطب کر کے کہہ دی گئی۔

وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّھُمْ مُّنِیْبِیْنَ اِلَیْہِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَھُمْ مِّنْہُ رَحْمَۃً اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ بِرَبِّھِمْ یُشْرِکُوْنَ ۝ لِیَکْفُرُوْا بِمَآ اٰتَیْنٰھُمْ ط فَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۳۳-۳۴)

یہ مشرکین کو براہ راست دھمکی ہے کہ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب کسی گرداب میں پھنستے ہیں تب تو نہایت نیازمندی سے اور تذلل کے ساتھ خدا کو پکارتے ہیں لیکن جب خدا ان کو اپنی رحمت سے نواز دیتا ہے تو پھر یہ خدا کو بھول کر اپنے انہی معبودوں کی طرف لوٹ جاتے ہیں جن کو انھوں نے شریک بنا رکھا ہے۔ یہ مضمون پیچھے مختلف اسلوبوں سے گزر چکا ہے اور آگے سورۂ لقمان کی آیت ۳۲ میں ایک نئے اسلوب سے آئے گا۔

"لِیَکْفُرُوْا بِمَآ اٰتَیْنٰھُمْ فَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ" یہ مضمون بعینہٖ عنکبوت کی آیت ۶۶ میں بھی گزر چکا ہے۔ یعنی وہ نعمت تو پاتے ہیں خدا سے لیکن گن گاتے ہیں دوسروں کے اور اس طرح خدا کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں۔ اس کے بعد نہایت تند لہجہ میں مخاطب کر کے فرمایا کہ اچھا کچھ دن ہماری نعمتوں سے اپنی اس ناسپاسی و ناشکری کے باوجود، فائدہ اٹھا لو، عنقریب تمھاری اس حرکت کا خمیازہ تمھارے سامنے آنے والا ہے۔

اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَیْھِمْ سُلْطٰنًا فَھُوَ یَتَکَلَّمُ بِمَا کَانُوْا بِہٖ یُشْرِکُوْنَ (۳۵)

ہم پیچھے اس اسلوب کی وضاحت کر چکے ہیں کہ اس قسم کے سوالیہ جملوں میں کلام کا ایک ٹکڑا حذف ہو جاتا ہے جس کی خانہ پری متکلم کا لب و لہجہ کر دیتا ہے۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو مطلب یہ ہوگا کہ ان نادانوں نے جو یہ خدا کے شریک بنا رکھے ہیں یا ہم نے کوئی دلیل اتاری ہے جو ان کے شریکوں کے شریک خدا ہونے کی شہادت دے

رہی ہو!! اس اسلوب کلام میں طنز و تحقیر اور غیظ و غضب سب جمع ہو جاتا ہے۔ آخری گروپ کی سورتوں میں اس کی نہایت بلیغ مثالیں آئیں گی۔

توحید کی ایک نفسیاتی دلیل

ان آیات میں توحید کی ایک نہایت اہم نفسیاتی دلیل کی طرف توجہ دلائی گئی۔ وہ یہ کہ جب انسان پر حقیقی افتقار اور بے بسی کی حالت طاری ہوتی ہے تو وہ تمام دوسرے اسباب و وسائل اور خود تراشیدہ معبودوں کو چھوڑ کر پوری انابت کے ساتھ اپنے ربِ حقیقی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی اصل فطرت کے اندر ایک خدا کے سوا کسی اور کے لیے کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ لیکن جب افتقار کی حالت ختم ہو جاتی ہے تو پھر وہ انہی گمراہیوں میں کھو جاتا ہے جن میں وہ اس سے پہلے کھویا ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ شرک کا اصلی سبب انسان کی غفلت ہے۔ یہ غفلت جب قدرت کی کسی تنبیہ سے دور ہو جاتی ہے تو اس کو اصل حقیقت نظر آ جاتی ہے لیکن جب حالات بدل جاتے ہیں تو اس کی سابق غفلت پھر عود کر آتی ہے۔

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ (۳۶)

تکلیف اور راحت دونوں آزمائش ہیں

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تو جب لوگوں کو اپنی نعمت سے نوازتا ہے تو یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے رب کے شکر گزار ہوں اور اگر ان کو ان کے اعمال کے نتیجے میں کسی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے تو یہ چاہتا ہے کہ وہ اس آزمائش پر صبر کریں لیکن بہت تھوڑے لوگ ایسے نکلتے ہیں جو نعمت پر شکر اور مصیبت پر صبر کریں۔ زیادہ لوگ ایسے ہی نکلتے ہیں جو نعمت پاتے ہیں تو فخر کرتے ہیں اور اکڑتے ہیں اور اگر کسی آزمائش میں پڑتے ہیں تو دل شکستہ اور مایوس ہو کے رہ جاتے ہیں۔ یہ باتیں سب عام الفاظ میں ارشاد ہوئی ہیں اس لیے کہ عام حالت درحقیقت یہی ہے لیکن ان آیات کے نزول کے وقت ظاہر ہے کہ ان کا اشارہ قریش کی طرف تھا اور اس طرح درپردہ ان کو تنبیہ فرمایا گیا کہ آج تو خدا کی بخشی ہوئی نعمت پر اسی کے آگے اکڑتے ہو لیکن کل کو اگر کسی پکڑ میں آ گئے تو روؤ گے اور چلاؤ گے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اس آیت کے الفاظ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ سے یہ بات نکلتی ہے کہ لوگوں کو اگر کوئی بری افتاد اس دنیا میں پیش آتی ہے تو ان کے برے اعمال کے نتیجے میں پیش آتی ہے۔ جہاں تک بروں کا تعلق ہے سنتِ الٰہی یہی ہے جو اس آیت میں بیان ہوئی ہے لیکن اس دنیا میں نیکوں یہاں تک کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو بھی بڑی بڑی آزمائشیں پیش آئی ہیں۔ اس قسم کی آزمائشیں اللہ تعالیٰ کی اس سنتِ ابتلاء کے تحت پیش آتی ہیں جو اس کے تمام بندوں کے لیے عام ہیں، خواہ وہ نیک ہوں یا بد۔ اُن کا تعلق ضروری نہیں کہ آدمی کے اعمال ہی سے ہو بلکہ اکثر حالات میں مجرد اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تربیت ان کی مقتضی ہوتی ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۳۷)

نعمت اور آزمائش دونوں میں صحیح رویہ

یعنی کیا ان لوگوں نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ رزق کی فراخی ہو یا تنگی دونوں اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

وہی جس کے لیے چاہتا ہے رزق کو تنگ کر دیتا ہے، جس کے لیے چاہتا ہے کشادہ کر دیتا ہے۔ اس کا یہ چاہنا تمام تر اس کی حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے نہ تو کسی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ مایوس ہو اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ اترانے اور اکڑنے والا بنے۔ اترانے کا حق اس کو ہے جس کا رزق اس کے اپنے اختیار میں ہو اور خدا سے مایوس وہ ہو جو اپنے لیے کوئی اور دروازہ تلاش کر سکے۔ جب ان دونوں میں سے کوئی بات بھی ممکن نہیں ہے تو صحیح رویّہ صرف یہی ہے کہ بندہ نعمت پر شکر کرے اور آزمائش پر صبر۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں ہی چیزوں سے بندے کا امتحان کرتا ہے اور یہ آخرت میں کھلے گا کہ کون اس کے امتحان میں کامیاب ہوا اور کون ناکام!

فرمایا کہ اگر لوگ اس حقیقت پر غور کریں تو اس میں ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو ایمان لانے والے ہیں۔

اس میں سب سے بڑی نشانی تو اس بات کی ہے کہ اس کائنات کے تمام امور اللہ وحدہٗ لاشریک ہی کے اختیار میں ہیں۔ جس طرح موت اور زندگی پر کسی کو اختیار نہیں ہے اسی طرح رزق کی تنگی و کشادگی پر بھی کسی کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

دوسری نشانی اس بات کی ہے کہ اس دنیا میں رزق کی کشادگی نہ کسی کی کامیابی کی دلیل ہے نہ اس کی تنگی کسی کی ناکامی کی بلکہ یہ دونوں ہی چیزیں بندے کے امتحان کے لیے ہیں۔ کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ آخرت میں ہوگا۔

تیسری نشانی اس میں یہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں ہر وقت بندے کے شکر اور صبر کا امتحان ہوتا رہتا ہے اور انسان کے تمام اعلیٰ اوصاف کا سرچشمہ یہی دو صفتیں ہیں۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۡ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۳۸)

اوپر آیت ۳۱ میں دینِ فطرت کے اولین رکن نماز کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس کے بعد بعض مناسب مقام تنبیہات آگئی تھیں جن میں آخری تنبیہ یہ تھی کہ جس کو رزق کی فراخی حاصل ہو تو اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کو اب وجد کی وراثت یا اپنے فضل و کمال کا ثمرہ سمجھ کر اس پر اترائے بلکہ اس کو اپنے رب کا شکر گزار رہنا چاہیے۔

شکر گزاری کا طریقہ

اس آیت میں اس شکر گزاری کا طریقہ بتا دیا کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے مال میں سے قرابت داروں، مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق دے۔ 'حَقَّهٗ' کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ رزق کی کشادگی عطا فرماتا ہے اس کے مال میں درحقیقت دوسروں کے حقوق بھی ہوتے ہیں جو اس کی امانت میں ہوتے ہیں، اس وجہ سے یہ اس کا فرض ہے کہ وہ ان حقوق کو ادا کرے۔ اگر اس نے اس میں کوتاہی کی تو وہ حقوق کا غصب کرنے والا ٹھہرے گا۔ فرمایا کہ جو لوگ خدا کی رضا کے طالب ہیں ان کے لیے یہی طریقہ بہتر ہے اور آخرت میں

وہی فلاح حاصل کرنے والے بنیں گے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو لوگ اپنے مال کو فخر و غرور یا عیش و تنعم یا مال پروری کا ذریعہ بنائیں گے ان کا مال خدا کے ہاں موجبِ وبال و خسران ہوگا۔

وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا۟ فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (۳۹)

'ربا' اس مال کو بھی کہتے ہیں جو کسی کو سودی قرض کے طور پر دیا جائے اور اس سود کو بھی کہتے ہیں جو کسی قرض پر حاصل کیا جائے۔ اس لفظ کو جن لوگوں نے ہدیہ یا عطیہ کے معنی میں لیا ہے انھوں نے بالکل غلط لیا ہے۔ یہ لفظ یہاں اس اسلوب پر استعمال ہوا ہے جس کو تسمیۃ الشئ بما یئول الیہ کہتے ہیں جس طرح اِنِّیْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ہے۔ ہم نے اس آیت پر ایک مستقل مضمون لکھ دیا ہے جو ہمارے مجموعۂ مضامین میں ملے گا۔

لفظ 'زکوٰۃ' یہاں اصطلاحی زکوٰۃ کے مفہوم میں نہیں بلکہ صدقات کے عام مفہوم میں ہے۔ اس مفہوم میں اس کا استعمال قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی ہوا ہے۔

انفاق کا ضد کردار

اوپر کی آیت میں انفاق کا جو حکم دیا ہے یہ اس کے ضد کردار کا بیان ہے کہ جو لوگ مال کو پا کر اس کو اللہ کی رضا جوئی میں خرچ کرنے کے بجائے مال پروری کی فکر میں لگ جاتے ہیں اور اس کو سودی قرض کے طور پر دیتے ہیں کہ ان کا مال دوسروں کے مال کا خون چوس کر فربہ ہو جائے تو وہ یاد رکھیں کہ اس قسم کا مال اس دنیا میں موٹا ہو تو ہو لیکن خدا کے ہاں اس میں کوئی بڑھوتری نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ اس مال کو، جیسا کہ دوسرے مقام میں وضاحت ہے، مٹا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف اس مال میں بڑھوتری ہوتی ہے جو خدا کی رضا جوئی کے لیے خدا کی راہ میں خرچ کیا جاتا ہے۔

اس آیت کے الفاظ پر تدبّر کی نگاہ ڈالیے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ سود خوار کے مال کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے سانڈے سے تشبیہ دی ہے جو دوسرے کی چراگاہ میں چر کر موٹا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کی فربہی میں کوئی خیر و برکت نہیں ہے۔ خیر و برکت صرف اس مال میں ہے جو اپنی چراگاہ میں چر کر پروان چڑھتا ہے پھر خدا کی رضا جوئی اور ادائے حقوق کی راہ میں قربان ہوتا ہے۔ فرمایا کہ بے شک یہ لوگ اپنے سرمائے کو بڑھانے والے بنیں گے۔ اس بڑھانے کی شرح قرآن کے دوسرے مقامات میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکی ہے۔

مال جمع کرنے کی خواہش بالعموم مستقبل کے اندیشوں کو پیش نظر رکھ کر ہوتی ہے لیکن انسان مستقبل کو بہت تنگ نگاہ سے دیکھتا ہے اس وجہ سے اس کی نظر اسی زندگی تک محدود رہ جاتی ہے۔ اصل مستقبل یعنی آخرت کو وہ نہیں دیکھتا حالانکہ اس کے مال کا اصلی فائدہ صرف اس صورت میں اس کو حاصل ہو سکتا ہے جب وہ اس دنیا کے بنکوں میں جمع کرنے کے بجائے خدا کے بنک میں اس کو جمع کرے تاکہ وہ اس کی ابدی زندگی میں اس کے کام آئے۔

یہاں اس بات کو بھی یاد رکھیے جس کی طرف ہم دوسرے مقام میں اشارہ کر چکے ہیں کہ ایک تاجر یا کاروباری کے سرمایہ میں جو اپنے سرمایہ کو کسی جائز تجارت یا کاروبار میں لگا کر اس کو بڑھاتا ہے اور ایک سُود خور کے سرمایہ میں جو سود پر قرض دے کر اس میں اضافہ کرتا ہے یہ بنیادی فرق ہے کہ تاجر کا سرمایہ ہر قسم کے حالات و خطرات کا مقابلہ کر کے خود اپنی چراگاہ میں فربہی و توانائی حاصل کرتا ہے اور سود خور کا سرمایہ ایک کمین گاہ میں چھپ کر، بغیر کوئی خطرہ مول لیے، حاجتمندوں سے غنیمت حاصل کرتا اور موٹا ہوتا ہے۔ ان دونوں کے اس بنیادی فرق کے سبب سے اسلام نے تجارت اور کاروبار کی بڑھوتری کو مبارک قرار دیا ہے اور سود کی بڑھوتری کو فاسد اور حرام۔

۶۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۴۰ - ۶۰

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کو دھمکی دی گئی ہے کہ انھوں نے دینِ فطرت کی دونوں بنیادیں ـــــ توحید اور ہمدردی خلق ـــــ ڈھا دی ہیں اور اس طرح پورے نظامِ معاشرت و تمدن کو بگاڑ کر خدا کی زمین کو فساد سے بھر دیا ہے۔ اس چیز نے ان کو مستحق بنا دیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کسی گرفت میں آئیں تاکہ وہ اپنے اس فساد فی الارض کا کچھ مزا چکھیں۔

پھر مسلمانوں کو غلبہ و نصرت کی بشارت دی گئی ہے اور اس کائنات کے شواہد سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کسی پر نازل کرنا چاہتا ہے تو اپنے تصرفِ غیبی سے ناسازگار حالات کو بھی سازگار بنا دیتا ہے۔

اسی کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو دینِ فطرت پر جمے رہنے کی تاکید اور ان لوگوں سے بے پروا ہونے کی ہدایت فرمائی گئی جو بالکل اندھے بہرے بن چکے ہیں۔

اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۰-۶۰

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ؕ هَلْ
مِنْ شُرَكَآىِٕكُمْ مَّنْ یَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَیْءٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰی
عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۠﴿۴۰﴾ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَیْدِی ع ۴
النَّاسِ لِیُذِیْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِیْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۴۱﴾ قُلْ
سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ

كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ ﴿٤٢﴾ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ
اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ ﴿٤٣﴾ مَنْ كَفَرَ
فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ﴿٤٤﴾ لِيَجْزِيَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٤٥﴾
وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ
وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٤٦﴾
وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ
فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٤٧﴾
اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ
كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ
فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿٤٨﴾
وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ﴿٤٩﴾
فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ
ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٥٠﴾ وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا
رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ ﴿٥١﴾ فَاِنَّكَ
لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿٥٢﴾
وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا
فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿٥٣﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ

بَعۡدِ ضُعۡفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنۡۢ بَعۡدِ قُوَّةٍ ضُعۡفًا وَّشَيۡبَةً ؕ يَخۡلُقُ
مَا يَشَآءُ ۚ وَهُوَ الۡعَلِيۡمُ الۡقَدِيۡرُ ﴿۵۴﴾ وَيَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَةُ يُقۡسِمُ
الۡمُجۡرِمُوۡنَ ۙ مَا لَبِثُوۡا غَيۡرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوۡا يُؤۡفَكُوۡنَ ﴿۵۵﴾ وَ
قَالَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ وَالۡاِيۡمَانَ لَقَدۡ لَبِثۡتُمۡ فِىۡ كِتٰبِ اللّٰهِ
اِلٰى يَوۡمِ الۡبَعۡثِ ؗ فَهٰذَا يَوۡمُ الۡبَعۡثِ وَلٰكِنَّكُمۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۵۶﴾
فَيَوۡمَئِذٍ لَّا يَنۡفَعُ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مَعۡذِرَتُهُمۡ وَلَا هُمۡ يُسۡتَعۡتَبُوۡنَ ﴿۵۷﴾
وَلَقَدۡ ضَرَبۡنَا لِلنَّاسِ فِىۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ مِنۡ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَلَئِنۡ جِئۡتَهُمۡ
بِاٰيَةٍ لَّيَقُوۡلَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا مُبۡطِلُوۡنَ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ
يَطۡبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۵۹﴾ فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ
حَقٌّ وَّلَا يَسۡتَخِفَّنَّكَ الَّذِيۡنَ لَا يُوۡقِنُوۡنَ ﴿۶۰﴾ ع ۶

اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا، پھر تم کو روزی دی، پھر تم کو موت دیتا ہے، ترجمہ آیات ۴۰-۶۰
پھر تم کو زندہ کرے گا۔ کیا تمھارے شریکوں میں سے بھی کوئی ایسا ہے جو ان کاموں میں
سے کوئی کام کرتا ہو؟ وہ پاک ہے اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو وہ شریک ٹھہراتے
ہیں! خشکی اور تری ہر جگہ لوگوں کے اعمال کے نتیجے میں فساد چھا گیا ہے تاکہ اللہ ان کی
بعض کرتوتوں کا مزہ چکھائے تاکہ یہ رجوع کریں۔ ۴۰-۴۱

ان سے کہو کہ ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جو پہلے ہو
گزرے ہیں! ان میں سے اکثر مشرک ہی تھے۔ ۴۲

پس اپنا رخ دینِ قیّم کی طرف سیدھا رکھو، قبل اس کے کہ اللہ کی طرف سے ایک

ایسا دن آجائے جس کے لیے پھر واپسی نہیں ہے۔ اس دن وہ جدا جدا ہو جائیں گے۔ جس نے کفر کیا اس کا وبال اس پر ہو گا اور جنھوں نے نیک اعمال کیے وہ بے شک اپنے لیے زمین ہموار کر رہے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے بدلہ دے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے۔ اللہ کافروں کو ہرگز دوست نہیں رکھتا۔ ۴۳-۴۵

اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ بھیجتا ہے ہواؤں کو اپنے ابرِ رحمت کی خوش خبری دینے والی بنا کر اور تاکہ وہ تم کو اپنی رحمت سے نوازے اور تاکہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں اور تاکہ تم اس کے فضل کے طالب بنو اور تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو۔ ۴۶

اور ہم نے تم سے پہلے بھی رسول بھیجے ان کی قوموں کی طرف۔ پس وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جنھوں نے جرم کیا۔ اور اہلِ ایمان کی نصرت ہم پر لازم تھی۔ اللہ ہی ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو پس وہ بادلوں کو ابھارتی ہیں پھر اللہ ان کو پھیلا دیتا ہے آسمان میں جس طرح چاہتا ہے اور ان کو تہ بہ تہ کرتا ہے پھر تم دیکھتے ہو مینہ کو ان کے بیچ سے نکلتے ہوئے پس جب وہ اس کو نازل کرتا ہے اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے تو وہ یکایک خوش ہو جاتے ہیں حالانکہ وہ اس کے نازل کیے جانے سے قبل، اس خوشی سے پہلے، بالکل مایوس تھے۔ پس رحمتِ الٰہی کے آثار کو دیکھو، وہ کس طرح زمین کو زندہ کر دیتا ہے اس کے مُردہ ہو جانے کے بعد!

بے شک وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۴۷-۵۰

اور اگر ہم دوسری ہوا بھیج دیں پس وہ کھیتوں کو زرد ہوتی دیکھیں تو اس کے بعد وہ کفر کرنے والے بن کر رہ جائیں گے تو تم نہ مردوں کو اپنی پکار سنا سکتے اور نہ بہروں کو سنا سکتے جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر چلے جا رہے ہوں۔ اور نہ اندھوں کو تم ان کی ضلالت سے موڑ کر

راہ پر لا سکتے۔ تم تو بس ان کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لانے والے ہوں، پس وہی اطاعت کرنے والے ہیں۔ ۵۱-۵۳

اللہ ہی ہے جس نے تم کو ناتوانی سے پیدا کیا، پھر ناتوانی کے بعد قوت بخشی، پھر قوت کے بعد ضعف اور بڑھاپا طاری کر دیا۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے اور وہی علیم قدیر ہے۔ ۵۴

اور جس دن قیامت واقع ہوگی، مجرم قسم کھا کر کہیں گے کہ وہ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔ اسی طرح ان کی عقلیں اوندھی ہو جاتی رہی ہیں۔ اور جن کو علم و ایمان عطا ہوا ہوگا وہ کہیں گے کہ اللہ کے رجسٹر کی رُو سے تو تم قیامت تک رہے ہو۔ سو یہ حشر کا دن ہے لیکن تم جانتے نہیں تھے۔ پس اس دن ان لوگوں کو ان کی معذرت کچھ نفع نہ دے گی جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہوگا اور نہ ان سے یہ چاہا جائے گا کہ وہ خدا کو راضی کریں۔ ۵۵-۵۷

اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی تمثیلیں بیان کر دی ہیں اور اگر تم ان کے پاس کوئی سی نشانی بھی لاؤ گے تو جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ یہی کہیں گے تم لوگ بالکل جھوٹے ہو۔ اسی طرح اللہ مہر کر دیا کرتا ہے ان لوگوں کے دلوں پر جو جاننا نہیں چاہتے۔ تو تم صبر کرو، بے شک اللہ کا وعدہ شدنی ہے اور یہ یقین نہ رکھنے والے تم کو بے وزن نہ پائیں۔ ۵۸-۶۰

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ ثُمَّ رَزَقَکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ط ھَلْ مِنْ شُرَکَآئِکُمْ مَّنْ یَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِکُمْ مِّنْ شَیْءٍ ط سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ (۴۰)

قریش کو دھمکی

مجوسیوں کے وقتی غلبہ کو دلیل بنا کر قریش نے مسلمانوں کے غلبہ اور توحید و قیامت ہر چیز کو مشکوک بنانے کی جو مہم چلائی اس کی تردید پیچھے کی آیات میں تفصیل سے ہو چکی ہے۔ اب یہ قریش کو براہ راست دھمکی دی جا رہی ہے کہ اس قسم کی طفل تسلیوں سے اپنے کو بہلانے کی کوشش نہ کرو بلکہ حقائق کا مواجہہ کرو۔ تم نے اپنے اعمال سے جو فساد اپنے چاروں طرف جمع کر لیا ہے اس کے نتائج کے ظہور کا وقت اب سر پر آگیا ہے اور تمہارے یہ فرضی دیوی دیوتا اس سے تمہیں بچا نہ سکیں گے۔ یہ آیت اسی دھمکی کی تمہید ہے۔ فرمایا کہ تم کو پیدا تو خدا نے کیا، روزی وہ دیتا ہے، موت اس کے اختیار میں ہے پھر تم کو زندہ وہ کرے گا۔ تم ان کاموں میں سے کسی ایک کام کے متعلق بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ وہ تمہارے ان دیوتاؤں کے ہاتھوں انجام پاتا ہے یا وہ اس میں اللہ کا ہاتھ بٹاتے ہیں تو آخر ان کے بل پر تم کب تک جیو گے اور اگر تم خدا کی پکڑ میں آگئے تو یہ تمہارے کیا کام آئیں گے؟

'سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ': اوپر کی بات تو ان کو خطاب کر کے فرمائی ہے اور یہ بات ان سے منہ پھیر کر فرمائی ہے۔ ان دونوں اسلوبوں کی بلاغت پر ہم مختلف مقامات میں گفتگو کر چکے ہیں۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۴۱)

جس طرح روز و شب اور صبح و شام وغیرہ کے الفاظ احاطہ پر دلیل ہوتے ہیں اسی طرح بر و بحر کے الفاظ بھی اس طرح کے سیاق میں صرف احاطہ پر دلیل ہوتے ہیں۔ مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے پر خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، اعتقادی ہو یا عملی فساد طاری ہو چکا ہے۔ فکر و نظر کی صحت کا انحصار تمام تر اللہ تعالیٰ کے ایمان پر ہے اور عمل کی ساری استقامت اسلام پر مبنی ہے اور یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا بھی انہدام دوسرے کے انہدام کو مستلزم ہے اور جب یہ دونوں منہدم ہو جائیں تو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر فساد لازماً مستولی ہو کے رہے گا۔ اگر ان دونوں کے انہدام کے باوجود کہیں زندگی کی چمک دمک نظر آتی ہے تو وہ بالکل عارضی چیز ہے اور جو لوگ اس کو کچھ اہمیت دیتے ہیں وہ فریب نظر میں مبتلا ہیں۔

'لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ': یہ نتیجہ بیان ہوا ہے اس صورت حال کا۔ یعنی جب لوگ اپنے اعمال سے اس طرح زندگی کے ہر شعبہ کو فساد سے بھر دیتے ہیں تو وہ گویا زبانِ حال سے اللہ تعالیٰ کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ ان کی کرتوتوں کا کچھ مزہ ان کو چکھائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے اعمال کا کچھ مزا چکھاتا ہے اور مقصود اس سے ان کو متنبہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف رجوع کریں اور غلط روی سے باز آ کر زندگی کی صحیح شاہراہ کی طرف مڑیں۔

یہاں یہ حقیقت ملحوظ رہے کہ رسولوں کی قوموں پر دو قسم کے عذاب آتے ہیں۔ اوّل تنبیہی پھر فیصلہ کن۔

تہ

یہاں قریش کو پہلے قسم کے عذاب سے ڈرایا ہے کہ تم نے اپنے اعمال سے اپنے آپ کو ایک تنبیہی عذاب کا مستحق بنا لیا ہے لیکن یاد رکھو کہ اگر وہ عذاب آگیا اور تم نے اپنی روش نہ بدلی تو پھر وہ عذاب بھی آ جائے گا جو تمھاری کمر توڑ کے رکھ دے گا۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ (۴۲)

یعنی ان لوگوں سے کہو کہ اپنے آپ کو طفل تسلیوں سے نہ بہلاؤ بلکہ خود اپنی آنکھوں سے اپنے ملک کی پچھلی قوموں کے آثار پر نگاہ ڈالو کہ ان کا انجام کیا ہو چکا ہے۔ ان کی اکثریت بھی تمھاری ہی طرح مشرک تھی۔ جس طرح تمھارے اندر سے موحد بہت تھوڑے نکلے ہیں اسی طرح ان کے اندر سے بھی خالص خدا پرست بہت تھوڑے نکلے۔ بالآخر اللہ نے ان تھوڑے سے خدا پرستوں کو علیحدہ کر لیا اور اکثریت کو اپنے عذاب سے تباہ کر دیا۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ يَوْمَىِٕذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ (۴۳)

آنحضرت صلعم کی طرف التفات

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی طرف اس قسم کا التفات ہے جس قسم کا التفات اوپر آیت ۳۱ میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ ہٹ دھرم اور شامت زدہ لوگ نہیں سنتے تو ان کی پروا نہ کرو بلکہ تم خدا کے سیدھے اور فطری دین کی طرف یکسو ہو جاؤ اور اس دن کی مسئولیت سے بچنے کی فکر کرو جس کا آنا قطعی ہے اور جب وہ دن خدا کی طرف سے ظہور میں آئے گا تو کسی کی طاقت نہیں ہوگی کہ اس کو لوٹا سکے۔ 'يَوْمَىِٕذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ' یعنی آج تو ان لوگوں کو اپنے شرکاء و شفعاء پر بھی اعتماد ہے اور اپنی جمعیت پر بھی ناز ہے لیکن اس دن سب متفرق ہو جائیں گے، کوئی کسی کے کام آنے والا نہیں بنے گا۔ آیت ۱۴ میں لفظ 'يَتَفَرَّقُوْنَ' آیا ہے، یہاں 'يَصَّدَّعُوْنَ' ہے۔

مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ (۴۴)

اس دن ہر ایک اپنے عمل کے مطابق جزا یا سزا پائے گا۔ جس نے کفر کیا ہوگا اس کے کفر کا وبال اسی پر آئے گا، کوئی دوسرا اس کا بوجھ اٹھانے والا نہیں بنے گا اسی طرح جو لوگ عمل صالح کر رہے ہیں وہ درحقیقت اپنے ہی مستقبل کو سنوار رہے ہیں اور اس کا صلہ انہی کو ملنے والا ہے۔

لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (۴۵)

قیامت کا اصل مقصد

اس کا تعلق اوپر والی آیت 'مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ' سے ہے یعنی اس دن کے آنے کا اصلی مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان و عمل صالح والوں کو اپنے فضل سے صلہ دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کا اصل مقصود اہل ایمان کو جزا دینا ہے۔ کفار کو سزا دینا اس کی اصل غایت نہیں بلکہ اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ 'مِنْ فَضْلِهٖ'

کے لفظ سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اہلِ ایمان کو جو صلہ ملے گا وہ محض ان کے اعمال کے پیمانے سے تول کر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل کے مطابق ملے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کا فضل ایسی چیز ہے کہ اس کا اندازہ ہم اپنے پیمانوں اور قیاسوں سے نہیں کر سکتے۔

اہلِ کفر سے نفرت

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ: اس ٹکڑے میں کفر و اہلِ کفر کے لیے جو نفرت و کراہت چھپی ہوئی ہے قلم اس کی تعبیر سے قاصر ہے۔ اہلِ ایمان کے درجے و مرتبے کا اندازہ کرنے کے لیے تو تنہا یہی بات کافی ہے کہ آخرت کا ظہور ہی تمام تر ان کی داد اور ان کے انعام کے لیے ہے۔ رہے اہلِ کفر تو یہاں اللہ تعالیٰ نے صرف یہ فرما کر ان کا ذکر ختم کر دیا کہ اللہ ان کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ جب اللہ ان کو پسند نہیں کرتا تو وہ جس جہنم میں بھی جا کر گریں خدا کو ان کی کوئی پروا نہیں ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۴۶)

اس آیت اور اس کے بعد کی آیات میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ جس طرح دیکھتے ہو کہ گھٹی ہوئی فضا کے اندر سے اللہ تعالیٰ سازگار ہوا چلا دیتا ہے جو تمہارے لیے اس کے باران رحمت کی بشارت بن کر ظاہر ہوتی ہے تاکہ تم کو اپنے رزق و فضل سے نوازے اسی طرح موجودہ ناموافق حالات کے اندر سے بھی تمہارے لیے سازگار حالات پیدا کر دے گا۔ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ یعنی یہی سازگار ہوائیں ہیں جن کے ذریعہ سے تمہاری کشتیاں بحکم خدا چلتی ہیں تاکہ تم ایک مقام سے دوسرے مقام کا سفر کر سکو۔ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ اور تاکہ تم تجارت وغیرہ کے ذریعہ سے اس کے رزق و فضل کے طالب بن سکو۔ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ یعنی ربوبیت کا یہ سارا نظام اس نے اس لیے قائم فرمایا ہے تاکہ تم اس کی نعمتوں سے بہرہ مند ہو اور اس کے شکر گزار رہو۔ اس میں مسلمانوں کے لیے نہایت لطیف انداز میں یہ تنبیہ بھی ہے کہ خدا کی نصرت و برکت تمہارے لیے ظاہر تو ہو گی لیکن اس کو پا کر اپنے رب سے غافل نہ ہو جانا بلکہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ خدا کے برابر شکر گزار رہنا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ۭ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۴۷)

یہ اسی اوپر والی حقیقت کو تاریخ کی روشنی میں واضح فرمایا ہے کہ تم دنیا میں پہلے رسول نہیں ہو بلکہ تم سے پہلے بھی ہم رسول بھیج چکے ہیں تو ہماری جو سنت ان کے معاملے میں ظاہر ہو چکی ہے وہی تمہارے معاملے میں بھی ظاہر ہو گی۔ تم سے پہلے جو رسول آئے وہ بھی تمہاری طرح اپنی قوموں کے پاس کھلی کھلی نشانیاں اور دلیلیں لے کر آئے لیکن ان کی قوموں نے ان نشانیوں اور حجتوں کی قدر کرنے کے بجائے مجرمانہ روش اختیار کی اور اپنے رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کی دشمن بن گئیں۔ بالآخر ان کی اس مجرمانہ روش کا نتیجہ یہ نکلا

کہ ہم نے ان سے ان جرائم کا انتقام لیا جن کی وہ اہلِ حق کے باب میں مجرم ہوئیں۔ اس لیے کہ اہلِ ایمان کی نصرت ہم پر حق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہی معاملہ تمہارے دشمنوں کے ساتھ بھی ہوگا تم مطمئن رہو۔

اللَّهُ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهُ فِي السَّمَاءِ كَيْفَ يَشَاءُ وَيَجْعَلُهُ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ ۖ فَإِذَا أَصَابَ بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ۝ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمُبْلِسِينَ (۴۸-۴۹)

اوپر کی آیت میں نصرت کی جو بشارت اس قطعیت کے ساتھ دی گئی ہے وقت کے ظاہری حالات اس کے بالکل خلاف تھے اس وجہ سے مسلمانوں، بالخصوص عام مسلمانوں کو، اطمینان دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و رحمت کے ظہور کی ایک ایسی نشانی کی طرف توجہ دلائی جس کا تجربہ و مشاہدہ ہر شخص کو ہوتا رہتا ہے۔ فرمایا کہ یہ اللہ ہی کی قدرت اور شان ہے کہ وہ ہواؤں کو بھیجتا ہے جو بادلوں کو ابھارتی ہیں، پھر وہ ان بادلوں کو اپنی حکمت کے مطابق جس طرح چاہتا ہے فضا میں پھیلاتا اور ان کو تہ بہ تہ کرتا ہے۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ ان کے درمیان سے مینہ نکلتا ہے تو پھر جو خدا کی اس رحمت سے فیضیاب ہوتے ہیں وہ یکایک خوشیاں منانے لگتے ہیں حالانکہ اس سے ذرا پہلے وہ اس سے بالکل مایوس ہوتے ہیں ــــ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہی شانِ رحمت تمہارے لیے بھی ظاہر ہوگی۔ آج تمہیں یہ چیز بہت بعید نظر آتی ہے لیکن جب ظاہر ہوگی تو تمہیں یہ بہت قریب کی چیز معلوم ہوگی اور تم اس وقت خوش ہو جاؤ گے۔

'مِنْ قَبْلِ أَنْ يُنَزَّلَ' کے بعد پھر 'مِنْ قَبْلِهِ' میں بظاہر کچھ تکرار سی محسوس ہوتی ہے لیکن غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ تکرار نہیں ہے۔ بلکہ یہاں دو الگ الگ باتیں فرمائی گئی ہیں۔ یعنی بارش سے پہلے وہ بارش سے مایوس تھے اور بشارت کے ظہور سے پہلے خوشی سے۔

فَانْظُرْ إِلَىٰ آثَارِ رَحْمَتِ اللَّهِ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۵۰)

قیامت کا یہ ذکر مسلمانوں کی تسلی ہی کے ضمن میں ہے۔ اہلِ ایمان کی تمام امیدوں کا مرجع چونکہ آخرت ہی ہے اس وجہ سے اوپر کی آیات میں اس دنیا کے اندر ان کی کامیابی کے آثار کی طرف اشارہ کرنے کے بعد آخرت کی رحمت کے ظہور کی طرف بھی اشارہ فرما دیا کہ جس طرح زمین میں اس کی رحمت کے آثار دیکھتے ہو کہ وہ اس کے خشک ہو جانے کے بعد اس کو دوبارہ باغ و بہار کر دیتا ہے اسی طرح وہ دوبارہ مردوں کو بھی زندہ کر دے گا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کفار آخرت کو جو جھٹلاتے اور اس کو محض تمہارا خواب و خیال قرار دیتے ہیں۔ تم ان کی ان بوالفضولیوں کی پروا نہ کرو۔ خدا کی یہ عظیم رحمت ظاہر ہو کے رہے گی اور تمہارے یہ حریف اس دن اپنی بدبختی و محرومی پر اپنے سر پیٹیں گے۔ یہ حقیقت قرآن سے واضح ہے کہ قیامت دراصل اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کا مقتضیٰ ہے اور اس کا اصل مقصد اہلِ ایمان کو ان کی جانبازیوں کا

صلہ دینا ہے۔ سورۂ انعام کی آیت ۱۲ 'کَتَبَ عَلٰی نَفۡسِہِ الرَّحۡمَۃَ ؕ لَیَجۡمَعَنَّکُمۡ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ' کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں، اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَلَئِنۡ اَرۡسَلۡنَا رِیۡحًا فَرَاَوۡہُ مُصۡفَرًّا لَّظَلُّوۡا مِنۡۢ بَعۡدِہٖ یَکۡفُرُوۡنَ (۵۱)

ایک استدراک

یہ اوپر کی آیات ۴۸-۴۹ پر استدراک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کا عام حال یہ ہے کہ ذرا دیر میں مایوس ذرا دیر میں مگن ہو جاتے ہیں۔ بارش میں ذرا توقف ہو جائے تو سب کے حوصلے ٹوٹ جاتے ہیں، بارش ہو جائے تو ناچنے کودنے لگتے ہیں اور اگر بارش کے بعد ہم کوئی ناسازگار ہوا بھیج دیں اور وہ اپنی اُگی ہوئی فصلوں کا رنگ زرد پڑتے دیکھیں تو وہی ناشکری و مایوسی ان پر پھر چھا جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کے متلوّن مزاج ہیں ان سے کسی خیر کی امید نہ رکھو تمھاری باتیں صرف ان کے دلوں میں اتریں گی جو نعمت پر شکر اور مصیبت پر صبر کا مزاج رکھتے ہوں۔

لفظ 'ریاح' اور 'ریح' کے فرق پر ہم اس کے محل میں بحث کر چکے ہیں۔ مقدم الذکر کا غالب استعمال سازگار اور موسمی ہواؤں کے لیے اور مؤخر الذکر کا عام استعمال آفت لانے والی ہوا کے لیے ہوتا ہے۔ 'فَرَاَوۡہُ' میں ضمیر کا مرجع 'زَرۡع' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ ہوگا جس کا قرینہ اوپر والی آیت میں موجود ہے اس لیے کہ 'یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا' کا مفہوم زمین کا سبزہ اور نباتات سے معمور ہو جانا ہے۔

فَاِنَّکَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰی وَلَا تُسۡمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوۡا مُدۡبِرِیۡنَ ﴿﴾ وَمَاۤ اَنۡتَ بِہٰدِ الۡعُمۡیِ عَنۡ ضَلٰلَتِہِمۡ ؕ اِنۡ تُسۡمِعُ اِلَّا مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَہُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ (۵۲-۵۳)

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایسے متلوّن مزاج اور بے ثبات ہیں کہ آن میں کچھ اور آن میں کچھ ہیں — ذرا میں مایوس اور ذرا میں مغرور ہوتے ہیں۔ خدا کی بے شمار نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی ان کے دل خدا پر نہیں جمتے، وہ روحانی و عقلی اعتبار سے زندہ نہیں بلکہ مردہ ہیں، سننے والے نہیں بلکہ بہرے ہیں، دیکھنے والے نہیں بلکہ اندھے ہیں۔ ایسے مردوں، بہروں اور اندھوں کو سنانا، سمجھانا نہ تمھارے بس میں ہے اور نہ اس کی تمھارے اوپر کوئی ذمہ داری ہے۔ 'وَلَا تُسۡمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوۡا مُدۡبِرِیۡنَ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بہروں سے بھی کچھ سننے سمجھنے کی توقع کی جا سکتی ہے بشرطیکہ وہ پکارنے والے کی طرف متوجہ ہوں لیکن ان بہروں سے کس خیر کی امید ہو سکتی ہے جو پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں! 'وَمَاۤ اَنۡتَ بِہٰدِ الۡعُمۡیِ عَنۡ ضَلٰلَتِہِمۡ' میں 'عَنۡ' اس بات پر دلیل ہے کہ لفظ ہدایت یہاں 'صَرۡف' یا اس کے ہم معنی کسی لفظ پر متضمن ہے۔ یعنی تم اندھوں کو ان کی غلط روی سے موڑ کر راہِ راست پر نہیں لا سکتے۔ 'اِنۡ تُسۡمِعُ اِلَّا مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاٰیٰتِنَا' یہاں آیات سے مراد آفاق و انفس کی وہ نشانیاں ہیں جن کی طرف پوری تفصیل کے ساتھ پیچھے توجہ دلائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھاری باتیں اگر کارگر ہو سکتی ہیں تو ان لوگوں پر کارگر ہو سکتی ہیں جو خدا کی قدرت، رحمت اور اس کے عدل کی ان نشانیوں کو مانتے ہوں جو آفاق میں پھیلی

ہوئی ہیں، جو ان کو نہ مانتے ہوں ان کے آگے سارا وعظ بھینس کے آگے بین بجانے کے حکم میں داخل ہے۔

فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ یعنی جو لوگ آفاق و انفس کی نشانیوں کو دیکھتے، سمجھتے اور مانتے ہیں وہ بے شک تمھاری بات سنیں سمجھیں گے اور تمھاری دعوت پر اپنے آپ کو اپنے رب کے حوالہ کر دیں گے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ
قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَیْبَةً ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ وَ هُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ (۵۴)

ایک تنبیہ

اب یہ آخر میں تنبیہ ہے کہ کسی کو اپنی قوت و صلاحیت اور اپنے اسباب و وسائل پر ناز نہیں ہونا چاہیے۔ جو کچھ بھی انسان کو ملتا ہے سب خدا ہی کا دیا ہوا ملتا ہے اور پھر اسی کی طرف سب لوٹ جاتا ہے۔ تم اپنے وجود ہی پر غور کر دیکھو۔ اللہ تعالیٰ نہایت ہی کمزور و ناتواں حالت میں تم کو وجود بخشتا ہے۔ پھر اس ناتوانی کے بعد جوانی کی توانائیاں اور صلاحیتیں عطا فرماتا ہے۔ اس کے بعد پھر بڑھاپے کی صورت میں اسی سابق ناتوانی کا دور عود کر آتا ہے۔ کسی کے امکان میں نہیں ہے کہ اپنی پائی ہوئی جوانی اور طاقت کو برابر قائم رکھ سکے۔ یہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے کہ وہ جو چاہے پیدا کرتا اور پیدا کر سکتا ہے۔ وہی ہر چیز کا علم اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ۬ مَا لَبِثُوْا غَیْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا یُؤْفَكُوْنَ (۵۵)

یہ دوسری تنبیہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی کو بہت طویل نہیں خیال کرنا چاہیے۔ قیامت کے دن جب مجرم لوگ اٹھیں گے تو قسم کھا کے آپس میں کہیں گے کہ ہمارا یہ سارا زمانہ جو گزرا ہے ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو یہ نچنت ہیں کہ اگر قیامت ہے بھی تو اس کے ظہور میں زندگی، موت، برزخ اور حشر و نشر کے بہت سے طول طویل مراحل حائل ہیں، ابھی سے اس کے لیے فکر مند ہونے اور اپنا عیش مکدر کرنے کی کیا ضرورت ہے! لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس دن یہ اٹھیں گے تو اس دن ان کا احساس یہ ہو گا کہ یہ سارے مراحل پلک جھپکتے گزر گئے۔

كَذٰلِكَ كَانُوْا یُؤْفَكُوْنَ: یعنی ان نادانوں کو اصل حقائق کا اندازہ کرنے کی توفیق کبھی نہیں ہوتی۔ قیامت کے دن انھیں اپنا سارا ماضی پلک جھپکتے ختم ہوتا نظر آئے گا لیکن جب تک دنیا میں رہے ان کو زندگی، موت اور حشر و نشر کے مراحل اتنے طویل نظر آتے تھے کہ اس کے لیے انھوں نے فکر مند ہونے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔

وَ قَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ الْاِیْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰی یَوْمِ الْبَعْثِ ؗ
فَهٰذَا یَوْمُ الْبَعْثِ وَ لٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۵۶)

قیامت کے دن اہل علم کی طمانیت

اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ الْاِیْمَانَ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی عقل اس دنیا میں سیدھی رہی اور ان کو اللہ کی آیات کا علم اور خدا اور آخرت کا ایمان نصیب ہوا۔ وہ ان لوگوں کی اس بدحواسی پر ٹوکیں گے کہ تمھارا یہ

اندازہ بالکل غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی رُو سے تو تم قیامت تک رہے ہو اور آج یہ قیامت کا دن تمہارے سامنے ہے لیکن تم اس کو جانتے نہیں رہے ہو۔ 'کِتٰبُ اللّٰہِ' سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ دفتر ہے جس میں ساری باتیں مندرج ہیں۔ 'وَلٰکِنَّکُمْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ' سے مقصود یہ ہے کہ تم اس کو محض ایک خیالی چیز سمجھتے رہے تو اس کو تم نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اپنی زندگی کی قدر و قیمت پہچانتے اور اس کو آخرت کے نصب العین کے تحت گزارتے ہیں ان پر روزِ حشر میں کوئی بدحواسی نہیں طاری ہوگی بلکہ وہ یہ محسوس کریں گے کہ زندگی کا جو سفر انھوں نے شروع کیا تھا اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے پروگرام کے مطابق اس سفر کی آخری منزل پر وہ پہنچ گئے۔

فَیَوْمَئِذٍ لَّا یَنْفَعُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ یُسْتَعْتَبُوْنَ (۵۷)

لفظِ 'اِسْتِعْتَاب' پر دوسرے مقام میں بحث ہو چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دن کسی کو اس کی کوئی معذرت نفع نہیں دے گی اور نہ کسی کو یہ موقع دیا جائے گا کہ وہ اپنے رب کو راضی کرنے کی کوشش کرے۔ ان چیزوں کے لیے جو موقع مطلوب ہے وہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں دے دیا ہے۔ جس نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا اس کو یہ موقع پھر کبھی حاصل نہ ہو سکے گا جس کو تیاری کرنی ہو آج تیاری کر لے۔ پھر کسی کو یہ کہنے کا موقع ملنے والا نہیں ہے کہ اس کو تیاری کے لیے وقت نہیں ملا۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰیَةٍ لَّیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ (۵۸)

'ضربِ مثل' اصل میں تو کسی موعظت و حکمت کی بات کو تمثیل کی صورت میں پیش کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن یہ اپنے وسیع مفہوم میں مجرد موعظت و حکمت کی بات بیان کرنے کے لیے بھی آتا ہے۔ اس محاورے پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر چکے ہیں۔

اب یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ جو باتیں بتانے اور سمجھانے کی ہیں وہ سب ہم نے اس قرآن میں بیان کر دی ہیں تو تم اس چیز کو ان کے آگے پیش کر دو۔ اور اس بات کو یاد رکھو کہ اگر وہ اس کتاب سے نہ سمجھے تو خواہ تم ان کو کتنا ہی بڑا معجزہ دکھا دو یہ کفر کرنے والے یہی کہیں گے کہ یہ بھی جھوٹ اور محض تمہاری شعبدہ بازی اور ساحری ہے۔

كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (۵۹)

یعنی جو لوگ اپنے آپ کو سمع و بصر اور دل کی صلاحیتوں سے محروم کر لیتے ہیں اور کوئی معقول بات سننا سمجھنا نہیں چاہتے اللہ تعالیٰ اسی طرح ان کے دلوں پر مہر کر دیا کرتا ہے۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا یَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ (۶۰)

'استخفاف' کے معنی کسی کو ہلکا پھلکا اور معمولی سمجھ کر باتوں میں اڑا دینا اور اس کو بے وزن بنا دینا ہے۔

اب یہ آخر میں نہایت قطعی الفاظ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلایا کہ تم اپنے موقف پر جمے رہو۔ اللہ نے دنیا اور آخرت میں تمھاری نصرت اور فلاح کا جو وعدہ کیا ہے وہ پورا ہو کے رہے گا تو یہ لوگ جو اللہ کے وعدوں پر یقین نہیں رکھتے ہیں تمھارا مذاق اڑا کر تمہیں بے وزن بنانے کا موقع نہ پائیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنی دعوت اور اپنے موقف پر جمے رہے تو یہ خود رسوا اور بے وزن ہوں گے۔ تمھارے قدم اکھاڑنے کی جو کوششیں یہ کر رہے ہیں یہ سب ناکام ہو جائیں گی۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

رحمان آباد
ہفتہ } ۲۲ر جون ۱۹۷۴ء

تدبّرِ قرآن

۳۱

لقمٰن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

دونوں سابق سورتوں —— العنکبوت اور الروم —— کی طرح اس سورہ کا قرآنی نام بھی 'الٓمّٓ' ہی ہے۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ ان کے عمود و مضمون میں فی الجملہ اشتراک ہے۔ اس سورہ کی تمہید سورۂ بقرہ کی تمہید سے ملتی جلتی ہوئی ہے اور بقرہ کا قرآنی نام بھی یہی ہے۔ بقرہ کی تمہید میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس قسم کے لوگ اس کتاب پر ایمان لائیں گے اور کس قسم کے لوگ اس سے اعراض کریں گے۔ اسی طرح اس سورہ کی تمہید میں بھی یہ بتایا گیا ہے کہ کس قسم کے لوگ اس برکت و رحمت سے فائدہ اٹھائیں گے اور کون لوگ اس سے محروم رہیں گے۔

سابق سورہ میں یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ یہ قرآن اس دینِ فطرت کی دعوت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اور اس دعوے پر آفاق و انفس کے دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ اس سورہ میں آفاق و انفس کے دلائل کے ساتھ ساتھ عرب کے مشہور حکیم —— لقمان —— کے نصائح کا حوالہ دیا گیا ہے جس کا مقصود اہلِ عرب پر یہ واضح کرنا ہے کہ ان کے اندر جو صحیح فکر و دانش رکھنے والے لوگ گزرے ہیں انھوں نے بھی انھی باتوں کی تعلیم دی ہے جن باتوں کی تعلیم یہ پیغمبر دے رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عقلِ سلیم (COMMON SENSE) انھی باتوں کے حق میں ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں، نہ کہ ان باتوں کے حق میں جن کی وکالت قرآن کے مخالفین کر رہے ہیں۔ یہ اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی اصل فطرت یہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ سوچنے سمجھنے والے لوگ ان حقائق تک کس طرح پہنچے؟

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مغربی فلاسفہ جب اخلاقیات پر بحث کرتے ہیں تو اس کی بنیاد وہ عقلِ عام کے معروف اخلاقی مسلّمات (COMMON SENSE ETHICS) ہی پر رکھتے ہیں، لیکن وہ یہ نہیں بتا سکے کہ یہ اخلاقی مسلّمات کہاں سے پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک حکیم فاطر اور فطرۃ اللہ کو تسلیم کرنے سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔ اس حقیقت سے گریز کی سزا ان کو اللہ تعالیٰ نے یہ دی کہ ان کا سارا فلسفۂ اخلاق بالکل بے بنیاد اور بے معنی ہو کے رہ گیا ہے۔ ان کی تمام فلسفیانہ کاوشیں نہ تو نیکی اور بدی کے امتیاز کے لیے کوئی کسوٹی معین کر سکیں اور نہ وہ یہ بتا سکے کہ کیوں انسان کو نیکی کرنی چاہیے اور کیوں بدی سے بچنا چاہیے۔ سود مندی، لذت، خوشی اور فرض برائے فرض وغیرہ کی قسم کے جتنے نظریات بھی انھوں نے ایجاد کیے سب باد در ہوا ثابت ہوئے اور خود انھی نے ان کے بخیے

ادھیڑ کے رکھ دیے۔ قرآن نے نہ صرف اخلاقیات کی بلکہ پورے دین کی بنیاد فطرت پر رکھی ہے اور یہ فطرت چونکہ ایک حکیم فاطر کی بنائی ہوئی ہے اس وجہ سے کسی کے لیے اس سے انحراف جائز نہیں ہے۔ جو شخص اپنی فطرت سے انحراف اختیار کرے گا وہ اپنے آپ کو تباہ اور اپنے فاطر کو ناراض کرے گا۔ انسان کی رہنمائی کے لیے اس کی فطرت اپنے اندر حقائق و معارف کا خزانہ رکھتی ہے لیکن انسان اپنے ماحول سے متاثر ہو کر بگڑ بھی سکتا ہے اور اپنے اختیار سے غلط فائدہ اٹھا کر اپنی فطرت کی خلاف ورزی بھی کر سکتا ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور اپنی کتابوں کے ذریعے سے فطرت کے تمام مضمرات واضح کر دیے تاکہ کسی کے لیے کسی التباس و اشتباہ کی گنجائش باقی نہ رہ جائے بلکہ ہر شخص فطرت کی سیدھی راہ پر چل کر دنیا کی فوز و فلاح اور آخرت میں اپنے رب کی خوشنودی حاصل کر سکے۔

اس سورہ میں لقمان کی حکمت کے حوالے سے مقصود، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، قرآن کی تائید میں ایک ایسے حکیم کی شہادت پیش کرنا ہے جس نے زندگی کے حقائق پر غور کیا تھا اور جو قرآن کے مخالفین کے نزدیک بھی نہایت ہی بلند پایہ اور واجب الاحترام حکیم سمجھا جاتا رہا ہے۔ ساتھ ہی اس میں قرآن کی دعوت کی تائید میں آفاق و انفس کے دلائل ایک نئے اسلوب سے پیش کیے گئے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱ — ۱۱) یہ کتاب ایک پُر حکمت کتاب ہے جو لوگوں کے لیے ہدایت و رحمت بن کر نازل ہوئی ہے لیکن اس کا فیض انہی لوگوں کو پہنچے گا جو اپنی فطرت کی صلاحیتیں زندہ رکھنے اور ان سے کام لینے والے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اس حکیمانہ کلام پر مخالفین کی مزخرف باتوں کو ترجیح دیتے اور اس سے متکبرانہ اعراض کر رہے ہیں تو وہ اپنے اس استکبار کی پاداش میں ذلت کے عذاب سے دوچار ہوں گے، عزت و سرفرازی صرف اس پر ایمان لانے والوں ہی کو حاصل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ شدنی ہے اس لیے کہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب خدا ہی کی مخلوق ہے، کسی اور کی اس میں کوئی حصہ داری نہیں ہے۔ جو لوگ مدعی ہیں کہ اس میں کسی اور کی بھی حصہ داری ہے وہ دکھائیں کہ ان کے معبودوں نے کیا پیدا کیا ہے۔

(۱۲ — ۱۹) لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصیحت کی ہے اس کا حوالہ جس سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ اہل عرب جس کی حکمت پر فخر کرتے اور جس کی روایات ان کے لٹریچر میں موجود ہیں، اس نے بھی اپنے بیٹے کو انہی باتوں کی نصیحت کی تھی جن کی دعوت یہ حکیمانہ کتاب دے رہی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ عقل سلیم اسی دعوت کے حق میں ہے۔ جو لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں وہ درحقیقت عقل سلیم اور فطرت سلیم سے جنگ کر رہے ہیں۔ اس میں ان لوگوں کے لیے خاص طور پر تنبیہ ہے جو اس دور میں، جیسا کہ سورۂ عنکبوت میں گزر چکا ہے، اپنے بیٹوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے ان پر ظلم کر رہے تھے۔ گویا قرآن نے یہ دکھایا ہے کہ لقمان اپنے بیٹے کو جن باتوں پر کاربند ہونے کے لیے اس دل سوزی سے نصیحت کرتے تھے آج انہی باتوں سے روکنے کے لیے باپوں کی طرف سے

بیٹوں پر ستم ڈھانے جا رہے ہیں۔

(۲۰-۲۴) تمہید کے مضمون کی تائید کہ جتنی ظاہری و باطنی نعمتیں انسان کو ملی ہوئی ہیں وہ ہیں تو سب اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ، اور اس حقیقت سے کسی کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود بہت سے نادان لوگ اللہ کی توحید کے باب میں جھگڑ رہے ہیں حالانکہ نہ ان کے پاس کوئی دلیل ہے، نہ کسی حکیم یا کسی پیغمبر کی رہنمائی اور نہ کسی کتاب الٰہی کی روشنی، اور جب ان کو اللہ کی کتاب کی پیروی کی دعوت دی جاتی ہے تو بڑے پندار کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم اپنے باپ دادا کے طریقے کی پیروی کرتے رہیں گے اگرچہ ان کے باپ دادا شیطان کی پیروی کرتے رہے ہوں۔ خدا کے ساتھ تعلق کی مضبوط رسی صرف ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو خدا کی اتاری ہوئی کتاب کی پیروی کریں اس لیے کہ بالآخر تمام امور کا فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ ایسے سرپھرے لوگوں کا غم کھانے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ایک دن ان لوگوں کا انجام ان کے سامنے رکھ دے گا۔

(۲۵ - ۳۰) مخالفین کی تردید میں خود ان کے اعتراضات کا حوالہ کہ یہ لوگ خود اپنے مسلّمات کے لوازم کو تسلیم کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ ان کو اعتراف ہے کہ تمام آسمان و زمین کا خالق اللہ ہی ہے تو جب وہی خالق ہے تو شکر اور عبادت کا حقدار اس کے سوا کوئی اور کس طرح ہو سکتا ہے؟ ہر چیز اسی کے قبضہ و تصرف میں ہے۔ وہ ہر ایک سے بے نیاز ہے۔ وہ کسی کے ہاتھ بٹانے کا محتاج نہیں اور وہ خود ستودہ صفات ہے اس وجہ سے اس کی نظرِ عنایت کو متوجہ کرنے کے لیے کسی کی سفارش کی حاجت نہیں۔ اس کی قدرت و حکمت کی اتنی نشانیاں اس کائنات میں موجود ہیں کہ اگر زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور تمام سمندر، مزید سات سمندروں کے اضافے کے ساتھ، روشنائی بن جائیں جب بھی اس کی تمام نشانیوں کو قلم بند کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے تمام خلق کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا ویسا ہی ہے جیسا ایک جان کو پیدا کر دینا۔ رات اور دن سب اسی کے حکم سے گردش کرتے ہیں اور وہ ہر چیز سے پوری طرح باخبر ہے۔ اگر اس کائنات کے نظام میں کسی اور کا بھی دخل ہوتا تو یہ درہم برہم ہو کے رہ جاتا۔

(۳۱ - ۳۴) کشتی کی تمثیل سے مخالفین کو تنبیہ کہ ذرا میں اترانے والے اور ذرا میں مایوس ہو جانے والے نہ بنو بلکہ نعمت میں شکر کرنے والے اور مصیبت میں صبر کرنے والے بنو۔ آج جو کچھ تمہیں حاصل ہے اس کا حق یہ ہے کہ اپنے رب کے شکر گزار بنو اور اس دن کو یاد رکھو جس دن نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے کام آ سکے گا اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ کے۔ اس دن کا آنا ایک امرِ قطعی ہے۔ محض اس بنیاد پر اس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ آج تمہیں اس کے ظہور کا وقت نہیں معلوم ہے۔ زندگی کی کتنی حقیقتیں ہیں جن کے ظہور کا وقت کسی کو معلوم نہیں لیکن کوئی عاقل ان کا انکار نہیں کرتا۔ حقیقی علیم و خبیر صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

سُوْرَةُ لُقْمٰنَ (۳۱)

مَكِّيَّةٌ — اٰيَاتُهَا ۳۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ﴿۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ هُدًى وَّرَحْمَةً آیات ۱-۱۱
لِّلْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳﴾ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ
وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ
رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ
لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا
هُزُوًا ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۶﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا
وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ
جَنّٰتُ النَّعِيْمِ ﴿۸﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ ﴿۹﴾ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِي
الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَاۗبَّةٍ ۭ وَاَنْزَلْنَا
مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۰﴾ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ
فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۱﴾ ع ۱ ۱۰

ترجمۂ آیات ۱-۱۱

یہ الٓمّٓ ہے۔ یہ پُرحکمت کتاب کی آیات ہیں۔ ہدایت و رحمت بن کر نازل ہوئی ہیں خوب کاروں کے لیے۔ ان کے لیے جو نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یہی لوگ یقین رکھتے ہیں۔ یہی اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہوں گے۔ ۱-۵

اور لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو فضولیات کو ترجیح دیتے ہیں تاکہ اللہ کی راہ سے گمراہ کریں بغیر کسی علم کے۔ اور ان آیات کا مذاق اڑائیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ اور جب ان کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو اس طرح متکبرانہ اعراض کرتے ہیں گویا ان کو سنا ہی نہیں، گویا ان کے کانوں میں بہرا پن ہے تو ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو! البتہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے نعمت کے باغ ہوں گے جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا وعدہ پورا ہو کے رہے گا۔ اور وہ غالب و حکیم ہے۔ ۶-۹

اس نے بنایا آسمانوں کو بغیر ایسے ستونوں کے جو تمھیں نظر آئیں اور زمین میں پہاڑ گاڑ دیے کہ وہ تمھارے سمیت لڑھک نہ جائے اور اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلائے۔ اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا پس اس میں نوع بنوع فیض بخش چیزیں پیدا کیں۔ ۱۰

یہ ساری چیزیں تو اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ تو اب مجھے دکھاؤ کہ انھوں نے کیا چیزیں پیدا کی ہیں جو اس کے سوا ہیں! بلکہ یہ ظالم لوگ ایک صریح گمراہی میں مبتلا ہیں!! ۱۱

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓمّٓ (۱)

حروفِ مقطعات پر ایک جامع بحث سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۙ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ (۲-۳)

اس کتاب سے فائدہ وہی اٹھائیں گے جن کی صلاحیتیں زندہ ہیں

تِلْكَ کا اشارہ الٓمّٓ کی طرف ہے۔ اس سورہ کا قرآنی نام یہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ سورہ ایک پُرحکمت کتاب کی آیات پر مشتمل ہے لیکن حکمت کے جواہر ریزوں کا قدردان ہر شخص نہیں ہوتا۔ ان کی قدر کرنے والے وہی لوگ ہوں گے جو 'محسن' ہوں گے۔ 'مُحْسِن' سے مراد وہ خوب کار لوگ ہیں جنھوں نے اپنے سوچنے سمجھنے کی قوتوں سے صحیح کام لیا، اپنی فطرت کی صلاحیتوں کو زندہ رکھا اور اپنی بصیرت کے حد تک جو قدم بھی اٹھایا صحیح سمت میں اٹھایا۔ فرمایا کہ ایسے لوگوں کے لیے یہ آیات ہدایت اور رحمت ہیں۔ وہ دنیا میں ان سے ہدایت حاصل کریں گے اور آخرت میں ان کے لیے یہ باعثِ فضل و رحمت ہوں گی۔ لفظ 'مُحْسِن' پر ہم پیچھے بھی اس کتاب میں بحث کر چکے ہیں اور آگے آیت ۲۲ میں بھی یہ آ رہا ہے۔ وہاں ان شاء اللہ اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔ اس تمہید ہی سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جو لوگ اس کتاب کی ناقدری کر رہے ہیں ان کی یہ ناقدری اس کتاب کے بے قیمت ہونے کی دلیل نہیں ہے بلکہ یہ ان ناقدروں کی فطرت کے مسخ ہونے کی دلیل ہے۔ اس وجہ سے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان لوگوں کے رویے سے بددل نہیں ہونا چاہیے۔

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (۴)

محسنین کی صفات

یہ 'مُحْسِنِيْن' کی صفات بیان ہوئی ہیں اور ان کے پردے میں وہ لوگ نگاہوں کے سامنے کر دیے گئے ہیں جو اس وقت اس لفظ کے صحیح مصداق تھے۔ فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھنے والے ہیں۔

'وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ' میں ان اہل ایمان کی غایت درجہ تحسین ہے۔ یعنی درحقیقت یہی لوگ ہیں جو آخرت پر پکا یقین رکھنے والے ہیں۔ اسی یقین کا یہ ثمرہ ہے کہ ان کو نماز اور زکوٰۃ کے اہتمام کی توفیق حاصل ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ نماز اور زکوٰۃ سے غافل ہیں وہ درحقیقت آخرت کے یقین سے محروم ہیں اور اگر وہ اس کے مدعی ہیں تو وہ اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵)

فرمایا کہ یہی لوگ اس دنیا میں اپنے رب کی صراطِ مستقیم پر ہیں اور یہی لوگ آخرت میں فلاح پانے والے بنیں گے۔ باقی سارے لوگ گمراہی پر ہیں اور وہ آخرت میں جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا

هُزُوًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۔(۶)

لَهْوَ الْحَدِيْثِ کا مفہوم 'اِشْتِرَاء' کے معنی، جیسا کہ اس کے محل میں ہم وضاحت کر چکے ہیں، ترجیح دینے کے بھی آتے ہیں۔ 'لَهْوَ الْحَدِيْثِ' اسی طرح کی ترکیب ہے جس طرح دوسرے مقام میں 'زخرف القول' کی ترکیب استعمال ہوئی ہے۔ یہاں یہ لفظ کتاب حکیم کی آیات کے مقابل میں استعمال ہوا ہے۔ اس وجہ سے اس سے مراد وہ گمراہ کن باتیں ہیں جو وقت کے مفسدین لوگوں کو آیات الٰہی سے برگشتہ کرنے کے لیے پھیلاتے تھے۔ قرآن لوگوں کو زندگی کے اصل حقائق کے سامنے کھڑا کرنا چاہتا تھا لیکن مخالفین کی کوشش یہ تھی کہ لوگ انہی مزخرفات میں پھنسے رہیں جن میں پھنسے ہوئے ہیں۔ یہاں اسی صورت حال کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور اسلوب بیان اظہار تعجب کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تو لوگوں کی ہدایت کے لیے ایک پرحکمت کتاب اتاری ہے لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان میں بہتیرے اس کے مقابل میں انہی فضول باتوں کو ترجیح دیتے ہیں جو ان کی خواہشوں اور بدعتوں کے لیے سند تصدیق فراہم کرتی ہیں۔

'لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ڰ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا' 'عِلْم' سے مراد دلیل و برہان ہے۔ آگے آیت ۲۰ میں بھی یہ لفظ آرہا ہے، وہاں اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ مفسدین کی یہ تمام سعی نامراد اس لیے ہے کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکیں حالانکہ اللہ کی راہ چھوڑ کر جس راہ پر وہ چل رہے ہیں اور جس پر لوگوں کو بھی چلانا چاہتے ہیں اس کے حق میں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے لیکن اس کے باوجود جسارت کا یہ عالم ہے کہ اللہ کی آیات کا مذاق اڑاتے اور اپنی بے سروپا باتوں کی تائید میں آسمان و زمین کے قلابے ملاتے ہیں۔

'اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ' اوپر اہل ایمان کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہی لوگ ہدایت پر ہیں اور وہی لوگ فلاح پانے والے بنیں گے؛ اس کے مقابل میں یہ ان لوگوں کا انجام بیان فرمایا جو قرآن کی آیات حکمت کے مقابل میں اپنی خرافات بدعت و ضلالت کو پھیلانے میں سرگرم تھے۔ فرمایا کہ ان کے لیے ایک نہایت سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔ "ذلیل کرنے والا عذاب" اس وجہ سے ہوگا کہ حق کے مقابل میں اپنی بات کی پچ استکبار ہے اور استکبار کی سزا اللہ تعالیٰ کے ہاں ذلت و رسوائی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ عذاب اور عذاب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ یوں تو ہر عذاب عذاب ہے، اللہ تعالیٰ اس سے امان میں رکھے، لیکن سب سے زیادہ سخت وہ عذاب ہے جو رسوا کر دینے والا ہو۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۷)

استکبار کی سزا یہ ان لوگوں کے اس استکبار کی تصویر ہے جس کے سبب سے یہ ذلت کے عذاب کے مستحق ہوں گے۔ فرمایا کہ ان کا حال یہ ہے کہ جب ان کو ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو یہ نہایت غرور کے ساتھ اس طرح پیٹھ پھیر

کر چل دیتے ہیں گویا انھوں نے ان کو سرے سے سنا ہی نہیں، گویا ان کے دونوں کان بہرے ہیں - یعنی یہ ہماری آیات کو یک قلم ناقابلِ التفات سمجھتے ہیں۔ فرمایا کہ اگر ان کا پندار اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ ہماری باتیں ان کے لیے لائقِ توجہ ہی نہیں رہ گئی ہیں تو پھر ہماری طرف سے ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ مطلب یہ ہے کہ اگر معاملہ مجرد غفلت کا ہو تو اس کی اصلاح تذکیر و تنبیہ سے ہو سکتی ہے لیکن جب تذکیر و تنبیہ کے جواب میں رعونت، واستکبار کا مظاہرہ ہونے لگے تو یہ مرض لا علاج ہے - اس طرح کے لوگ دوزخ ہی کا ایندھن بننے والے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ جَنّٰتُ النَّعِیۡمِ ۙ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ؕ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَهُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ (۸-۹)

قرآن کا مذاق اڑانے والوں کو جواب

یہ ان کے مقابل میں ان لوگوں کا صلہ بیان ہوا ہے جو اللہ کی آیات پر ایمان لانے والے اور ان کے مطابق اپنی زندگیوں کو بنانے اور سنوارنے والے ہیں۔ فرمایا کہ ان کے لیے نعمت کے باغ ہوں گے جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ 'وَعۡدَ اللّٰهِ حَقًّا' یعنی یہ اللہ تعالیٰ کا حتمی وعدہ ہے جو پورا ہو کے رہے گا۔ اس جملے میں تاکید در تاکید کا جو مضمون مضمر ہے اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے - اس تاکید کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ اوپر آیت ۶ میں ذکر ہو چکا ہے کہ متکبرین اللہ کی آیات کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے استہزا کا خاص ہدف وہ آیتیں تھیں جن میں اس دور کے بے بس اور غریب مسلمانوں کو ایک ابدی بادشاہی کی خوش خبری سنائی جاتی تھی۔ معاملے کا یہ پہلو مقتضی ہوا کہ یہ بات یہاں پورے زور اور تاکید سے کہی جائے کہ مذاق اڑانے والے اگر اس کا مذاق اڑاتے ہیں تو اڑائیں لیکن اہلِ ایمان اطمینان رکھیں کہ اللہ کا یہ وعدہ پورا ہو کے رہے گا۔

وعدۂ قیامت کی قطعیت پر صفاتِ الٰہی سے استدلال

'وَهُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ' یہ اسی وعدے کے حتمی ہونے پر اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات سے دلیل پیش کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر مستکبروں اور ظالموں کو سزا اور ایمان و عمل صالح والوں کو جزا نہ دے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ نہ وہ عزیز ہے نہ حکیم ہے بلکہ العیاذ باللہ وہ ایک بالکل عاجز و بے بس ہستی ہے جس نے بالکل بے غایت و بے حکمت یہ دنیا بنا ڈالی۔ حالانکہ یہ بات، بالبداہت غلط ہے۔ خدا نہ صرف عزیز و حکیم ہے بلکہ حقیقی عزیز و حکیم وہی ہے۔ اس طرز استدلال کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ یہاں اشارے پر اکتفا فرمایئے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَهَا وَاَلۡقٰی فِی الۡاَرۡضِ رَوَاسِیَ اَنۡ تَمِیۡدَ بِکُمۡ وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَاَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنۡۢبَتۡنَا فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍ کَرِیۡمٍ (۱۰)

یہ اس کائنات کے ان دلائل و شواہد کی طرف توجہ دلائی ہے جن پر ایک، نظر ڈال کر ایک متوسط درجہ کی عقل کا آدمی بھی، یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ اس کائنات کا خالق عزیز یعنی ہر چیز پر غالب و مقتدر

بھی ہے اور اس کے ہر کام میں اس کی قدرت کے ساتھ اس کی بے پایاں حکمت بھی نمایاں ہے۔ فرمایا کہ یہ اسی کی قدرت و حکمت ہے کہ اس نے آسمانوں کی یہ عظیم چھت ایسے ستونوں کے بغیر ہی کھڑی کر دی جو تمھیں نظر آئیں اور ساتھ ہی زمین میں پہاڑ لنگر انداز کر دیے کہ یہ کہیں تمھارے ساتھ لڑھک نہ جائے۔ پھر اس چھت کے نیچے اور اس زمین کے اوپر بے شمار قسم کے جاندار پھیلا دیے اور ان کی پرورش کے لیے آسمان سے پانی برسایا اور اس پانی سے ہر قسم کی فیض بخش چیزیں اگائیں۔

'بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا' میں 'تَرَوْنَهَا' 'عَمَدٍ' کی صفت ہے۔ یعنی یہ عظیم چھت اس کے عظیم خالق نے کھڑی تو کی ہے ستونوں پر لیکن یہ اس کی قدرت، حکمت اور کاریگری کا اعجاز ہے کہ یہ ستون کسی کو نظر نہیں آتے۔ اس نے اس کائنات کے اجزائے مختلفہ کو جذب و کشش کے ایسے قوانین کے ساتھ باندھ رکھا ہے جو صرف اسی کو نظر آتے ہیں۔

'زَوْجٍ كَرِيمٍ' میں لفظ 'كَرِيمٍ' کا صحیح لغوی مفہوم فیض بخش ہے۔ یہ خدا کی قدرت کے ساتھ ساتھ اس کی رحمت و ربوبیت کی طرف اشارہ ہے کہ اس نے یہ عظیم محل اور یہ قصر بے ستون تعمیر کر کے اس کے مکینوں کی پرورش کے لیے اپنی گوناگوں نعمتوں کے انبار بھی لگا دیے۔

هَٰذَا خَلْقُ اللَّهِ فَأَرُونِي مَاذَا خَلَقَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ ۚ بَلِ الظَّالِمُونَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (۱۱)

خدا کے شریک ٹھہرانے والوں سے ایک سوال

مطلب یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں تو اللہ کی بنائی ہوئی ہیں اور تم کو بھی یہ اعتراف ہے کہ یہ اللہ کی بنائی ہوئی ہیں تو اب بتاؤ کہ تم اس کے سوا دوسری چیزوں کو جو پوجتے ہو تو انھوں نے کیا پیدا کیا ہے اور ان کا کیا کارنامہ ہے کہ تم نے خدا کی خدائی اور اس کے حقوق میں ان کو بھی شریک بنا دیا ہے!!

'بَلِ الظَّالِمُونَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ' یہ ان سے منہ پھیر کر ان کے حال پر اظہار افسوس فرمایا ہے کہ ان ظالموں کے پاس اس حرکت کے جواز کی کوئی دلیل تو ہے نہیں جسے وہ پیش کر سکیں بلکہ ایک کھلی ہوئی گمراہی ہے جس میں وہ پڑے ہوئے ہیں۔

۲۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۱۲-۱۹

آگے لقمان کی حکمت اور ان کی ان حکیمانہ نصیحتوں کا حوالہ ہے جو انھوں نے اپنے سعادت مند فرزند کو فرمائی ہیں اور ان کے حوالہ سے مقصود، جیسا کہ ہم نے پیچھے اشارہ کیا، اہل عرب کے سامنے خود ان کے حکماء اور ان کی حکمت کو پیش کر کے یہ دکھانا ہے کہ تمھارے اندر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی حکمت و معرفت میں سے کچھ حصہ ملا انھوں نے بھی اپنے متعلقین کو انہی باتوں کی تعلیم دی جن کی تعلیم تم کو یہ پر حکمت کتاب دے رہی ہے لیکن یہ تمھاری بدبختی و محرومی ہے کہ تم اپنے آباؤ اجداد کی اندھی تقلید پر تو بہت نازاں ہو جنھوں نے بے سوچے سمجھے شیطان کی پیروی کی لیکن اپنے ان اسلاف کی حکمت سے تم نے کوئی فائدہ

نہیں اٹھایا جنھوں نے زندگی کے حقائق پر سنجیدگی سے غور کیا اور اپنے قول وعمل سے اپنے بعد والوں کے
لیے نہایت پاکیزہ روایات چھوڑیں۔ اس بے خبری کا نتیجہ تمھارے سامنے یہ آیا کہ جن باتوں کی لقمان اپنے
فرزند کو نہایت دردمندی کے ساتھ تعلیم دیتے تھے انہی باتوں سے آج تم اپنی اولاد کو روکنے کے لیے
نہایت ظالمانہ سزائیں دیتے ہو۔

لقمان کی شخصیت

یہ لقمان کون تھے؟ بعض لوگوں نے ان کو حبشی النسل قرار دیا ہے لیکن یہ بات ہمارے نزدیک
صحیح نہیں ہے۔ محمد بن اسحاق نے ان کا نسب سیدنا ابراہیمؑ سے ملایا ہے۔ لیکن یہ بات بھی صحیح نہیں
معلوم ہوتی۔ شعرائے جاہلیت میں سے طرفہ بن عبد اور سلمیٰ بن ربیعہ نے اپنے شعروں میں ان کا اور ان کے
قبیلہ کا ذکر کیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یمن میں ان کو اور ان کی قوم کو بڑی شان وشوکت حاصل
تھی اور یہ قوم عاد کے بقایا میں سے تھے۔

بعض لوگوں نے ان کو نبی قرار دیا ہے لیکن مذہب جمہور یہ ہے کہ یہ نبی نہیں بلکہ ایک حکیم تھے۔
عرب کے لٹریچر سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے اور قرآن نے بھی ان کا ذکر ایک حکیم ہی کی حیثیت
سے کیا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ بعض شعراء نے اپنے شعروں میں ان کی اس نصیحت کی طرف بھی اشارہ
کیا ہے جس کا حوالہ قرآن نے دیا ہے لیکن وقتِ تحریر میرے پاس حوالہ کی کتابیں نہیں ہیں اس وجہ سے
میں اس باب میں کوئی بات وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔

بعض مورخین نے ان کو بادشاہ مانا ہے۔ بادشاہ نہ سہی لیکن ان کو سرداری کا منصب ضرور حاصل
تھا۔ شعرائے جاہلیت نے جس انداز سے ان کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یمن میں
اپنے قبیلہ پر ایک پدرسرانہ قسم کی سرداری حاصل تھی۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں فرمائی ہیں
ان سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ نصیحتیں اس کو سرداری کی ذمہ داریاں سونپتے وقت
کی ہیں۔ آگے اس کی وضاحت آئے گی ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۲-۱۹

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا
يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۱۲﴾ وَاِذْ قَالَ
لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ
لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ
اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

وَلِوَالِدَيْكَ ۗ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ﴿١٤﴾ وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَن تُشْرِكَ بِي
مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۖ وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا
مَعْرُوفًا ۖ وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ۚ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُم
بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٥﴾ يَا بُنَيَّ إِنَّهَا إِن تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ
فَتَكُن فِي صَخْرَةٍ أَوْ فِي السَّمَاوَاتِ أَوْ فِي الْأَرْضِ يَأْتِ بِهَا اللَّهُ ۚ
إِنَّ اللَّهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ ﴿١٦﴾ يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ
وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ ۖ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ
الْأُمُورِ ﴿١٧﴾ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ
إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ﴿١٨﴾ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ
وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ ۚ إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ﴿١٩﴾ ع ۲ ۱۱

ترجمہ آیات ۱۲-۱۹

اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی کہ اللہ کے شکر گزار رہو اور جو شکر گزار رہے گا
تو اپنے ہی لیے رہے گا۔ اور جو ناشکری کرے گا تو اللہ بے نیاز ستودہ صفات ہے ۱۲۔
اور یاد کرو جب کہ لقمان نے اپنے بیٹے سے اس کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ
اے میرے بیٹے! اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیو۔ بے شک شرک ایک بہت بڑا ظلم ہے۔" ۱۳
اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے معاملے میں ہدایت کی۔ اس کی ماں نے دُکھ پر
دُکھ جھیل کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑانا ہوا۔ کہ میرے شکر گزار
رہو اور اپنے والدین کے۔ میری ہی طرف بالآخر لوٹنا ہے۔ اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو
کسی چیز کو میرا شریک ٹھہرا جس کے باب میں تیرے پاس کوئی دلیل نہیں تو ان کی بات نہ

مانیو اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک سلوک رکھیو۔ اور پیروی ان کے طریقہ کی کیجیو جو میری طرف متوجہ ہیں۔ پھر میری ہی طرف تمہارا لوٹنا ہے اور میں جو کچھ تم کرتے رہے ہو اس سے تم کو آگاہ کروں گا۔ ۱۴-۱۵

اے میرے بیٹے! کوئی عمل اگر رائی کے دانے کے برابر بھی ہو گا تو خواہ وہ کسی گھاٹی میں ہو یا آسمانوں یا زمین میں ہو اللہ اس کو حاضر کر دے گا۔ بے شک اللہ نہایت ہی باریک بین اور باخبر ہے۔ ۱۶

اے میرے بیٹے! نماز کا اہتمام رکھو، نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو اور جو مصیبت تمہیں پہنچے اس پر صبر کرو۔ بے شک یہ باتیں عزیمت کے کاموں میں سے ہیں۔ ۱۷

اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، اللہ کسی اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز کو پست رکھ بے شک سب سے زیادہ مکروہ آواز گدھے کی آواز ہے۔ ۱۸-۱۹

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنِ اشْكُرْ لِلَّهِ ۚ وَمَن يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ (۱۲)

حکمت کا اولین ثمر

حکمت کا اولین ثمر اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری ہے۔ اللہ اپنے جس بندے کو اس دولت سے بہرہ مند کرتا ہے اس کا اولین اثر جو اس پر مترتب ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بن جاتا ہے اور یہی شکر تمام حقوق اللہ اور تمام حقوق العباد کی معرفت کی بنیاد ہے۔ سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں ہم اس پر مفصل گفتگو کر چکے ہیں۔ حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور ذوالقرنین کے واقعات کے سلسلہ میں بھی اس حقیقت کی طرف مفید اشارات گزر چکے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کے صاحب حکمت اور حکیم ہونے کی اولین شناخت یہ ہے کہ اس کے اندر اپنے رب کی شکر گزاری ہو۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو وہ بالکل کھوکھلا ہے اگرچہ وہ علم و فلسفہ کا کتنا ہی بڑا ماہر اور امام کیوں نہ سمجھا جاتا ہو۔

ایک شبہ کا ازالہ

وَمَنۡ يَّشۡكُرۡ فَاِنَّمَا يَشۡكُرُ لِنَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيۡدٌ ۔ یہ برسرِ موقع ایک دفع دخل مقدر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی یہ نہ گمان کرے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں سے اپنی شکر گزاری کا جو مطالبہ کیا ہے یا اس کو جو اس نے پسند فرمایا ہے تو اس میں اس کا کوئی نفع ہے بلکہ اس کو اس نے بندوں ہی کے نفع کے لیے پسند فرمایا ہے۔ جو شخص خدا کا شکر گزار رہتا ہے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں اپنے لیے اللہ کی نعمتوں کو بڑھاتا ہے۔ رہا اللہ کا معاملہ تو وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ نہ کسی کی شکر گزاری سے اس کو کوئی نفع پہنچتا اور نہ کسی کی ناشکری سے کوئی نقصان۔ ساتھ ہی وہ حمید بھی ہے یعنی تمام اعلیٰ صفات سے متصف اور یہ تمام صفات اس کی ذاتی ہیں۔ نہ ان میں کوئی اضافہ کر سکتا، نہ کمی۔ اس کی اس صفت ہی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ خواہ کوئی اس کے احسانات کی قدر کرے یا ناقدری لیکن اس دنیا میں اپنے رزق و فضل سے وہ کسی کو بھی محروم نہیں کرتا۔ آگے آیت ۲۶ میں بھی انہی صفات کا حوالہ آرہا ہے وہاں مزید وضاحت ہو جائے گی۔

وَاِذۡ قَالَ لُقۡمٰنُ لِابۡنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَىَّ لَا تُشۡرِكۡ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ (۱۳)

شکر کی اصل روح

جس طرح حکمت کا اولین ثمر اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری ہے اسی طرح شکر کی اصل روح شرک سے اجتناب ہے۔ بندے کو تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ ہی سے ملتی ہیں اس وجہ سے جس طرح اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر واجب ہے اسی طرح یہ بھی واجب ہے کہ وہ اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو دوسروں کی طرف نہ منسوب کرے۔ دوسروں سے اگر بندے کو کوئی نفع پہنچتا ہے تو وہ اللہ ہی کے حکم سے پہنچتا ہے اس وجہ سے شکر کا اصل سزاوار اللہ ہی ہے۔ دوسروں کا حق اللہ تعالیٰ کے حق کے تحت ہے۔ اللہ کا حق سب سے بڑا ہے اگر کوئی شخص خدا کے حق میں دوسروں کو شریک کرتا ہے تو وہ سب سے بڑے حق کو تلف کرنے والا بنتا ہے جو ایک ظلمِ عظیم ہے۔

موقع اور بات دونوں کی اہمیت کی طرف اشارہ

یہاں یہ امر بھی توجہ کے لائق ہے کہ لقمان نے یہ باتیں اس وقت کہی ہیں جب وہ بیٹے کو نصیحت کر رہے تھے۔ اس سے موقع اور بات دونوں کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی سرسری بات نہیں ہے جو راہ چلتے کہہ دی گئی ہو بلکہ لقمان نے خاص اپنے بیٹے کو، ایک اہم موقع پر، خاص اہتمام کے ساتھ، بطور ایک موعظت کے بتائیں اور ان پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے کی تاکید کی۔ اس سے مقصود قرآن کے مخاطبوں کو توجہ دلانا ہے کہ ایک دانش مند باپ اپنے بیٹے کو کیا تعلیم دیتا تھا اور آج اس کے احمق نام لیوا اپنی اولاد کے ساتھ کیا معاملہ کر رہے ہیں!

وَوَصَّيۡنَا الۡاِنۡسٰنَ بِوَالِدَيۡهِ ۚ حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ وَهۡنًا عَلٰى وَهۡنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِىۡ عَامَيۡنِ
اَنِ اشۡكُرۡ لِىۡ وَلِوَالِدَيۡكَ ؕ اِلَىَّ الۡمَصِيۡرُ ﴿۱۴﴾ وَاِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنۡ تُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ
فَلَا تُطِعۡهُمَا وَصَاحِبۡهُمَا فِى الدُّنۡيَا مَعۡرُوۡفًا ۖ وَّاتَّبِعۡ سَبِيۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَىَّ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرۡجِعُكُمۡ

فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۴-۱۵)

دو آیتیں بطور تضمین

یہ دو آیتیں لقمان کی موعظت کے بیچ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور تضمین ہیں۔ لقمان نے بیٹے کو خدا کی شکر گزاری کا حق ادا کرنے کی تاکید تو فرمائی لیکن اللہ تعالیٰ جل شانہ کے حق کے پہلو بہ پہلو اپنے حق کا ذکر انھوں نے ادب کے خلاف تصور فرمایا اس وجہ سے اس کو نظر انداز کر کے قیامت کے ذکر کی طرف بڑھ گئے۔ یہ بات انھوں نے ادباً کی اور ان کی تواضع کے شایانِ شان بات یہی تھی، لیکن خدا کے حق کے بعد فطرت کی تربیت میں سب سے بڑا حق والدین کا ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے لقمان کے اس چھوڑے ہوئے خلا کو اپنی طرف سے بھر دیا۔ فرمایا کہ ہم نے انسان کو اس کے والدین کے باب میں ہدایت کی۔ اس ہدایت کا ذکر عنکبوت آیت ۸ میں بھی گزر چکا ہے اور سورۂ بنی اسرائیل میں بھی۔ وہاں ہم نے واضح کیا ہے کہ خدا کے حق کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم تمام انبیائے کرام اور تمام آسمانی صحیفوں نے بالاتفاق دی ہے۔ یہاں اس ہدایت کی تفصیل آگے والے ٹکڑے سے ہو گئی ہے کہ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ (کہ میرا شکر گزار رہ اور اپنے ماں باپ کا) یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی شکر گزاری کے ساتھ انسان کو اس کے والدین کی شکر گزاری کی ہدایت فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے اوپر خدا کے بعد سب سے بڑا حق اس کے والدین کا ہے اس لیے کہ وہی اس کے وجود میں آنے اور پرورش پانے کا ذریعہ بنتے ہیں، والدین سے بڑا کسی کا حق بھی نہیں ہے لیکن یہ حق شکر گزاری اور خدمت کا ہے نہ کہ عبادت کا۔ شکر کا مفہوم اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ اس کی اصل حقیقت ایفائے حق ہے۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو مجرد زبان سے شکر ایک بالکل بے حقیقت چیز ہے۔

خدا کے خلاف والدین کی اطاعت جائز نہیں ہے

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا۔ یعنی اگر والدین اس بات کے لیے اولاد پر دباؤ ڈالیں کہ وہ کسی چیز کو بے دلیل خدا کا شریک بنائے تو یہ حق ان کو حاصل نہیں ہے، اولاد کا فرض ہے کہ اس معاملے میں ان کی اطاعت سے صاف انکار کر دے۔ شرک کے بے دلیل ہونے پر اس کتاب میں ہم جگہ جگہ بحث کر چکے ہیں۔ یہ اس کی مستقل صفت ہے اس لیے کہ اب تک شرک کی تائید میں اس کے حامی کوئی دلیل پیش نہیں کر سکے، جب کہ خدا کا حال یہ ہے کہ ہر مشرک اس کو لازماً تسلیم کرتا ہے۔ وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا یعنی اگر والدین شرک اختیار کرنے کے لیے زور لگائیں تو اس معاملے میں تو ان کی اطاعت نہ کی جائے لیکن جہاں تک دنیا کا معاملہ ہے اس کے اندر ان کے ساتھ حسن سلوک دستور کے مطابق باقی رکھا جائے۔ ان کی ضروریات حتی الامکان پوری کرنے کی کوشش کی جائے۔ ان کی ہدایت کے لیے برابر دعا بھی کی جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت تک اپنے باپ کے لیے دعا جاری رکھی جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو اس سے روک نہیں دیا گیا۔ کافر والدین سے بیٹے کے لیے کلی انقطاع صرف اس شکل میں صحیح ہے جب

مسلم معاشرہ جماعتی حیثیت سے ان سے اور ان کی قوم سے برارت کا اعلان کر دے۔ اس کی وضاحت سورۂ برارت میں ہو چکی ہے۔

ماں کا حق باپ کے حق سے زیادہ ہے

یہاں ایک چیز یہ بھی قابلِ غور ہے کہ جہاں تک شکرگزاری اور خدمت کا تعلق ہے اس کی ہدایت تو باپ اور ماں دونوں کے لیے فرمائی ہے لیکن قربانیاں اور جانفشانیاں صرف ماں کی گنائی ہیں، باپ کی کسی قربانی کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ فرمایا ہے 'حملته امه وهنا على وهن وفصاله فى عامين' (اس کی ماں نے اس کو اٹھایا دکھ کے بعد دکھ جھیل کر اور پھر اس کا دودھ چھڑانا ہوا دو سالوں کے اندر)۔ یہاں حمل، ولادت اور رضاعت تینوں مراحل کی طرف اشارہ ہے (اگرچہ ولادت کا ذکر غایت وضاحت کے سبب سے محذوف ہے) اور ان تینوں ہی کا تعلق ماں سے ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ماں کا حق باپ کے مقابل میں زیادہ ہے۔ اسی پر وہ حدیث مبنی ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کا حق باپ کے مقابل میں تین درجہ زیادہ قرار دیا ہے۔

'الى المصير' میں تنبیہ ہے کہ یہ بات ہر شخص کو یاد رکھنی چاہیے کہ بالآخر سب کو میری ہی طرف پلٹنا ہے۔ اگر کسی نے میری شکرگزاری اور والدین کے حق میں کوتاہی کی تو وہ میری باز پرس سے نہیں چھوٹ سکتا۔

'واتبع سبيل من اناب الى ثم الى مرجعكم فانبئكم بما كنتم تعملون'۔ شرک کے معاملے میں والدین کی اطاعت نہ کرنے کی ہدایت کے ساتھ یہ اولاد کو تاکید مزید ہے کہ اسے بہر حال انہی لوگوں کے طریقے کی پیروی کرنی ہے جو خدا کی طرف متوجہ ہیں، ان لوگوں کی راہ نہیں اختیار کرنی چاہیے جو خدا سے منحرف ہیں اگرچہ وہ اس کے والدین ہی کیوں نہ ہوں۔ سورۂ عنکبوت میں والدین کا قول نقل ہو چکا ہے کہ وہ اپنی اولاد اور اپنے زیر دستوں سے کہتے ہیں کہ 'اتبعوا سبيلنا ولنحمل خطيكم'-۱۲ (تم ہمارے طریقے کی پیروی کرتے رہو، ہم تمہاری غلطیوں کا بوجھ اٹھانے کے ذمہ دار ہیں) یہاں اسی قول پر تعریض کرتے ہوئے فرمایا کہ جو بھی خدا کے خلاف کسی راستہ کی پیروی کی دعوت دے اس کی پیروی جائز نہیں ہے۔ پیروی صرف ان لوگوں کی کرنی ہے جو خدا کی راہ پر ہیں۔

'ثم الى مرجعكم فانبئكم بما كنتم تعملون'۔ یہ خطاب والدین اور اولاد دونوں سے یکساں ہے اور اس میں تنبیہ بھی ہے اور اطمینان دہانی بھی۔ مطلب یہ ہے کہ ایک دن سب کی واپسی میری ہی طرف ہونی ہے اور اس دن جو کچھ جس نے کیا ہو گا میں اس کے سامنے رکھ دوں گا۔ اگر کسی کے والدین نے میرے بخشے ہوئے حق سے غلط فائدہ اٹھا کر اولاد کو مجھ سے منحرف کرنے کی کوشش کی تو وہ اس کی سزا بھگتیں گے اور اگر اولاد نے والدین کے حق کے ساتھ ساتھ میرے حق کو بھی کما حقہٗ پہچانا اور اس حق پر قائم رہنے میں استقامت دکھائی تو وہ اپنی اس عزیمت کا بھرپور صلہ پائے گی۔

يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ (۱۶)

لقمان کی موعظت قیامت کے باب میں

تضمین کی آیات کے بعد لقمان کی موعظت پھر شروع ہو گئی۔ اوپر لقمان نے بیٹے کو شرک سے اجتناب اور توحید کی تعلیم دی ہے اور یہ بات اپنے محل میں واضح ہو چکی ہے کہ اسی عقیدے پر تمام عقائد کی بنیاد ہے۔ توحید کے بعد دوسرا بنیادی عقیدہ آخرت کا عقیدہ ہے۔ اس آیت میں آخرت سے متعلق ان کی موعظت کا حوالہ ہے۔ فرمایا کہ اے بیٹے! اگر رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی نیک یا بد عمل کسی کا ہوگا تو خواہ وہ کسی پہاڑی یا گھاٹی کے اندر ہو یا لامتناہی بانا پیداکنار فضاؤں اور آسمانوں میں ہو یا زمین کی تہوں میں ہو، جہاں کہیں بھی ہوگا، خدا قیامت کے دن اس کو حاضر کر دے گا، اس لیے کہ اللہ نہایت باریک بین اور نہایت باخبر ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ کے احاطۂ علم سے ناآشنائی ہی ہے جس کے سبب سے قوموں کو توحید کے معاملے میں مغالطہ پیش آیا اور وہ شرک میں مبتلا ہوئیں اور یہی چیز آخرت کے باب میں بھی بہت سی گمراہیوں کا سبب ہوئی۔ اس وجہ سے لقمان نے اس حکمت کی یاددہانی کی جو توحید اور قیامت دونوں کے باب میں ان کے فرزند کے ذہن کو بالکل صاف کر دے۔

'اِنَّهَا' میں ضمیر قصہ یا ضمیر شان ہے۔ اس صورت میں متکلم، ضمیر اپنے معہودِ ذہنی کو پیش نظر رکھ کر استعمال کرتا ہے۔ یہاں معہودِ ذہنی 'حبۃ خردل' کے برابر عمل ہے اس وجہ سے 'حبۃ' کی رعایت سے ضمیر مؤنث استعمال ہوئی۔

'صَخْرَةٌ' سے پتھر مراد لینا ضروری نہیں ہے اس سے پہاڑی اور گھاٹی بھی مراد لے سکتے ہیں۔ یہ بات عربیت کے بالکل مطابق ہوگی۔ میں نے ترجمہ میں اسی مفہوم کو پیش نظر رکھا ہے۔ ابن جریر نے بھی ایک گروہ کا یہی قول نقل کیا ہے۔

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰي مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۱۷)

شکر کا اثر زندگی پر نماز کا اہتمام

اللہ تعالیٰ کے شکر کی تعلیم دینے کے بعد اس شکر کا زندگی میں جو اثر نمایاں ہونا چاہیے اس کی ہدایت فرمائی۔ اس سلسلہ میں سب سے اول، نماز کو لیا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے شکر کا سب سے اوّل اور سب سے بڑا مظہر نماز ہی ہے۔ یہی تمام انبیاء اور تمام مذاہب کی متفق علیہ تعلیم ہے۔ فرمایا کہ اے میرے بیٹے! نماز قائم کرو۔ دوسرے مقام میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ 'نماز قائم کرو' کا مفہوم یہ ہے کہ نماز کا اہتمام کرو۔ یعنی خود بھی نماز کی پابندی کرو اور دوسروں کے لیے بھی اس کا انتظام کرو اور ان کو اس کے لیے ابھارو۔

امر بالمعروف

'وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ' یہ خدا کی شکر گزاری ہی کا دوسرا پہلو ہے جو بندے کو خلق سے مربوط کرتا ہے۔ نماز بندے کو اس کے رب سے جوڑتی ہے اور امر بالمعروف کے ذریعے سے وہ اللہ کے بندوں سے جڑتا ہے۔

معروف میں وہ تمام کام شامل ہیں جو اداۓ حقوق سے متعلق ہیں۔ مثلاً اللہ کی راہ میں انفاق، یتیموں، مسکینوں، پڑوسیوں اور دوسرے مستحقین کی مدد اور اس نوع کے دوسرے کام جو ہر اچھی سوسائٹی میں معلوم و معروف ہیں اور جن کا یہ اہتمام ہر وہ شخص کرتا ہے اور اس کو کرنا چاہیے جو اپنے رب کا شکر گزار بندہ ہے۔

نہی عن المنکر

'وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ' یہ ان چیزوں سے باز رکھنے کی ہدایت ہے جو معروف کی ضد ہیں۔ بخالت، غصب حقوق، تعدّی، عہد شکنی، فخر و غرور اور اس قبیل کی ساری چیزیں اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔

صبر

'وَاصْبِرْ عَلٰى مَا اَصَابَكَ' یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی یہ راہ کوئی آسان راہ نہیں ہے۔ جب اس فرض کو ادا کرنے کے لیے اٹھو گے تو ہر قدم پر تمہیں راہ مشکلات و مصائب سے رندھی ہوئی نظر آئے گی، اگر تم میں صبر نہیں ہوگا تو ایک قدم بھی تم آگے نہیں بڑھا سکو گے۔ اگر اس راہ کی بازیاں جیتنی ہیں تو ضروری ہے کہ جو کچھ پیش آئے اس کا پوری عزیمت سے مقابلہ کرو۔

'اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ' یہ اسی مضمون کی مزید تاکید اور وضاحت ہے کہ یہ کام نیم دلی کے ساتھ اور ڈھیلے ڈھالے ہاتھوں سے نہیں انجام پاتے۔ ان سے وہی لوگ عہدہ برآ ہوتے اور ہو سکتے ہیں جو پوری عزیمت کے ساتھ ان کے انجام دینے کے لیے اٹھتے اور سر دھڑ کی بازی لگا کر ان کو انجام دیتے ہیں۔ سورۂ عصر میں حق کے ساتھ صبر کا جو ذکر آیا ہے وہ بھی اسی تعلق سے آیا ہے۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (۱۸)

'تصعیر خد' کے معنی ہیں بربنائے غرور و تکبر لوگوں سے بے رخی و بے پروائی اختیار کرنا۔

'لِلنَّاس' سے مراد عوام الناس خصوصاً غربا و فقرا ہیں جن کو امرا و اغنیا حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

شکر کے منافی باتیں

اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کے موجبات بیان ہوئے ہیں۔ اب یہ ان باتوں کا ذکر آ رہا ہے جو اس شکر گزاری کے منافی ہیں۔ شکر کا مظہر، جیسا کہ اس کے محل میں وضاحت ہو چکی ہے، اخبات و تواضع ہے اور اس کا ضد غرور و تکبر ہے۔ جو لوگ سفلہ اور کم ظرف ہوتے ہیں وہ نعمت پا کر اکڑنے اور اترانے والے بن جاتے ہیں اور ان لوگوں کو نہایت حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جو ان کے ہم سر نہیں ہوتے۔ لقمان نے اس روش کے اختیار کرنے سے اپنے فرزند کو روکا۔

'وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا' یہ آیت بعینہٖ سورۂ بنی اسرائیل میں بھی گزر چکی ہے۔ وہاں اس کے ساتھ یہ تنبیہ بھی ہے کہ 'لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۔ ۳۷' یعنی کوئی کتنا ہی اکڑ کے اور سر اونچا کر کے چلے لیکن اسے یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ نہ وہ زمین کو پھاڑ سکتا اور نہ وہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتا تو جس خدا کی قدرت و عظمت کے یہ آثار ہر شخص دیکھ رہا ہے اس کی خدائی میں اکڑنے اور اترانے کے کیا معنی! آدمی کا غرور اس کے چہرے اور اس کی گردن سے بھی نمایاں ہوتا ہے اور اس کی چال

سے بھی، لقمان نے ان دونوں ہی چیزوں میں غرور کی روش اختیار کرنے سے اپنے بیٹے کو روکا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ۔ یہ تنبیہ ہے اور بڑی ہی سخت تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی اکڑنے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ جن کو مال و جاہ حاصل ہو اور وہ اس کو اللہ تعالیٰ کے انعام کے بجائے اپنی قابلیت واستحقاق کا کرشمہ سمجھ بیٹھیں ان کے اندر شکر کے بجائے لازماً فخر و غرور کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لقمان نے اسی خطرے سے اپنے بیٹے کو آگاہ فرمایا ہے کہ نعمت کو اللہ کا انعام اور اس کا امتحان سمجھنا، اس کے سبب سے مغرور ہو کر اپنے کو خدا کے غضب کا مستحق نہ بنا لینا۔

وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ (۱۹)

تواضع اور فروتنی کی تعلیم

اوپر کی باتیں نہی کے اسلوب میں ہیں۔ اب یہ اسی تواضع و فروتنی کی تعلیم مثبت انداز میں دی ہے کہ اپنی چال میں اکڑ کے بجائے فروتنی و تواضع اور اپنی آواز میں کرختگی اور خشونت کی جگہ نرمی اور لینت پیدا کرو۔ مِنْ اس بات پر دلیل ہے کہ جب خالق نے انسان کو ایک ہی قسم کی آواز پر نہیں پیدا کیا ہے بلکہ اس کے اندر یہ صلاحیت رکھی ہے کہ اس کو وہ پست بھی کر سکتا ہے اور بلند بھی تو موقع و محل کے مطابق وہ اس صلاحیت کو استعمال کرے، گدھے کی طرح ہمیشہ اپنا حلق اور لوگوں کے کان پھاڑنے ہی کی کوشش نہ کرے۔ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ کا ٹکڑا یہاں کرخت اور سخت لب ولہجہ سے نفرت دلانے کے لیے ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اس کو حسنِ بیان اور حسنِ کلام کی نعمت سے نوازا ہے تو وہ اس مقام کو چھوڑ کر گدھوں کی صف میں شامل ہونے کی کوشش کیوں کرے! یہ بلبل کی بدقسمتی ہے کہ وہ زاغ و زغن کی ہمنوائی کرے!!

لقمان کی نصیحتیں بڑوں کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہیں

لقمان کی یہ نصیحتیں اگرچہ ہر شخص کے لیے اپنے اندر یکساں خیر و برکت رکھتی ہیں لیکن ان لوگوں کے لیے یہ خاص اہمیت رکھنے والی ہیں جن کو قیادت و سربراہی اور امارت و حکومت کا مقام حاصل ہو۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، لقمان صرف ایک حکیم نہیں بلکہ ایک حکمران حکیم تھے۔ ان کو اپنی قوم کی سربراہی حاصل تھی اور یہ نصیحتیں اپنے بیٹے کو انھوں نے سرداری و قیادت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے کی ہیں۔ یہ اگرچہ نبی نہیں تھے لیکن ان کو حضرت داؤد سے فی الجملہ مشابہت ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۲۰ - ۳۴

لقمان کی نصیحت میں سرفہرست اللہ واحد کی شکر گزاری کی تلقین ہے۔ اب آگے یہ بتایا جا رہا ہے کہ کیوں اللہ ہی شکر کا سزاوار ہے۔ آفاق و انفس میں اس کے دلائل کیا ہیں؟ ساتھ ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین فرمائی گئی ہے کہ اپنے مخالفین کے معاملے کو اب ہمارے اوپر چھوڑو، ہم ہی ان کا فیصلہ کریں گے۔ یہ لوگ نشانیوں کا جو مطالبہ کر رہے ہیں اس کی پروا نہ کرو۔ اللہ کی اتنی نشانیاں موجود

ہیں کہ اگر زمین کے سارے درخت قلم اور سمندر، مزید سات سمندروں کے اضافہ کے ساتھ، روشنائی بن جائیں جب بھی اس کی نشانیوں کو قلم بند نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عہد شکن اور غدار لوگ ہیں۔ جب یہ کسی پکڑ میں آتے ہیں تو اللہ کی اطاعت و وفاداری کا عہد کرتے ہیں لیکن جب ذرا ڈھیل ملتی ہے تو وہی سرکشی ان پر پھر عود کر آتی ہے اور اپنے قول و قرار کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ اس قسم کے عہد شکن ناشکروں پر کوئی نشانی کارگر نہیں ہو سکتی۔ آخر میں آخرت کی یاد دہانی ہے کہ لوگو! اس دن سے ڈرو جس دن نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے کچھ کام آنے گا اور نہ بیٹا باپ کے بلکہ ہر ایک کو اپنی جواب دہی خود کرنی ہے۔ اگر آج یہ نہیں معلوم ہے کہ قیامت کا ظہور کب ہوگا تو اس سے کسی کو یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس کا ڈراوا محض ڈراوا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ کتنے حقائق ہیں جن کے ظہور کا وقت کسی کو معلوم نہیں لیکن کوئی عاقل بھی ان کا انکار نہیں کر سکتا ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۰-۳۴

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ
وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ
يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ﴿۲۰﴾ وَاِذَا
قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا
عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ
السَّعِيْرِ ﴿۲۱﴾ وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ
اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ؕ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۲۲﴾ وَ
مَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ؕ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا
عَمِلُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۲۳﴾ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ
نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۲۴﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ

الْغَنِىُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۶﴾ وَلَوْ اَنَّ مَا فِى الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ
الْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۷﴾ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۲۸﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ
وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؗ كُلٌّ يَّجْرِىْٓ اِلٰٓى
اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۹﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ
هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِىُّ
ع ۳ ۱۱ ۱۲ الْكَبِيْرُ ﴿۳۰﴾ ع اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ
لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۳۱﴾ وَ
اِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ
فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ
اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۲﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا
لَّا يَجْزِىْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۫ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ؕ
اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ٙ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ
بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۳۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ
وَيَعْلَمُ مَا فِى الْاَرْحَامِ ؕ وَمَا تَدْرِىْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ
ع ۴ ۱۳ وَمَا تَدْرِىْ نَفْسٌۢ بِاَىِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۳۴﴾

تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کی چیزوں کو تمہاری خدمت — ترجمہ آیات ۲۰-۳۴

میں لگا رکھا ہے اور تمہارے اوپر ہر قسم کی ظاہری و باطنی نعمتیں پوری کی ہیں! پھر بھی لوگوں میں ایسے لوگ ہیں جو اللہ کے باب میں بغیر کسی دلیل، بغیر کسی ہدایت اور بغیر کسی روشن کتاب کے جھگڑتے ہیں! اور جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ اس چیز کی پیروی کرو جو اللہ نے اتاری ہے تو جواب دیتے ہیں کہ ہم یہ نہیں کریں گے، بلکہ اسی طریقہ کی پیروی کرتے رہیں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی جب کہ شیطان ان کو عذابِ دوزخ کی طرف بلا رہا ہو! ۲۰-۲۱

اور جو اپنا رخ فرمانبردارانہ اللہ کی طرف کرے گا اور وہ خوب کار بھی ہے تو اس نے بے شک مضبوط رسی تھامی۔ اور انجام کار تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اور جس نے کفر کیا اس کا کفر تمہارے لیے باعثِ غم نہ ہو۔ ہماری ہی طرف ان سب کی واپسی ہے تو جو کچھ انھوں نے کیا ہوگا ہم اس سے ان کو آگاہ کریں گے۔ اللہ دلوں کے بھیدوں سے بھی واقف ہے۔ ہم ان کو کچھ دن برومند کریں گے پھر ان کو ایک سخت عذاب کی طرف دھکیلیں گے۔ ۲۲-۲۴

اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو جواب دیں گے اللہ نے! کہو، شکر کا سزاوار بھی اللہ ہے۔ بلکہ ان کے اکثر اس بات کو نہیں جانتے۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ ہی کا ہے۔ بے شک اللہ ہی بے نیاز و ستودہ صفات ہے۔ ۲۵-۲۶

اور اگر زمین میں جو درخت ہیں وہ قلم بن جائیں اور سمندر، سات مزید سمندروں کے ساتھ، روشنائی بن جائیں جب بھی اللہ کی نشانیاں قلم بند نہیں ہو سکتیں۔ بے شک اللہ غالب و حکیم ہے۔ ۲۷

اور تم کو پیدا کر دینا اور تم کو زندہ کر دینا بس ایسا ہی ہے جیسا ایک شخص کا پیدا کر دینا اور زندہ کر دینا، بے شک اللہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ ہی ہے جو داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور دن کو رات میں اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ ہر ایک گردش کرتا ہے ایک مقررہ وقت تک اور یہ کہ اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی معبودِ حقیقی ہے اور جن چیزوں کو یہ اس کے سوا پکارتے ہیں وہ باطل ہیں۔ اور بے شک برتر اور عظیم اللہ ہی ہے۔ ۲۸-۳۰

کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ ہی کے فضل سے کشتی دریا میں چلتی ہے تاکہ وہ تم کو اپنی نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔ بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ہر صبر و شکر کرنے والے کے لیے اور جب موجیں سائبانوں کی طرح ان کو ڈھانک لیتی ہیں وہ اللہ کو پکارتے ہیں خالص اسی کی اطاعت کا عہد کرتے ہوئے، پس جب وہ ان کو نجات دے کر خشکی کی طرف کر دیتا ہے تو ان میں کچھ راہ پر رہتے ہیں اور باقی بے راہ ہو جاتے ہیں اور ہماری آیات کا انکار بس وہی لوگ کرتے ہیں جو بالکل بدعہد اور ناشکرے ہوتے ہیں۔ ۳۱-۳۲

اے لوگو، اپنے رب کی پکڑ سے بچو اور اس دن سے ڈرو جس دن نہ کوئی باپ اپنی اولاد کے کام آئے گا اور نہ کوئی اولاد اپنے باپ کے کچھ کام آنے والی بن سکے گی۔ بیشک اللہ کا وعدہ شدنی ہے تو دنیا کی زندگی تمھیں دھوکے میں نہ ڈالنے پاوے اور نہ اللہ کے باب میں فریب کار تمھیں دھوکے میں رکھے! قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے اور وہی بارش اتارتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ رحموں میں ہوتا ہے، اور کسی کو بھی پتہ نہیں کہ کل وہ کیا کمائی کرے گا، اور نہ کسی کو یہ علم ہے کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا۔ بے شک اللہ

علیم و خبیر ہے۔ ۳۳-۳۴

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ۭ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ (۲۰)

خدا ہی کی شکرگزاری کے دلائل

اس سورہ کی تمہید آیت ۱۱ پر بدیں الفاظ ختم ہوئی تھی 'هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ' (یہ ساری چیزیں تو اللہ کی مخلوق ہیں تو تم مجھے دکھاؤ کہ انھوں نے کیا چیزیں پیدا کی ہیں جن کو تم اس کے سوا معبود بنائے بیٹھے ہو! بلکہ یہ ظالم نہایت کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں!) اس کے بعد اسی حقیقت کی تائید میں لقمان کی حکمت کا حوالہ آگیا تھا کہ انھوں نے بھی اپنے فرزند کو خدا ہی کا شکرگزار رہنے کی تلقین کی تھی۔ اب اسی مضمون کو آفاق کے دلائل کی روشنی میں مزید واضح فرمایا اور انداز کلام اظہار تعجب اور زجر کا ہے کہ خدا کے بندو، تم نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ آسمانوں اور زمین کی جتنی چیزیں بھی تمھارے کام آرہی ہیں ان سب کو تمھاری مقصد برآری میں خدا نے لگایا ہے، ان میں سے کسی چیز کے متعلق بھی تم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ خدا کے سوا کسی اور نے ان کو پیدا کیا ہے تو آخر کس دلیل سے تم نے دوسروں کو شریک بنایا اور ان کی عبادت کر رہے ہو!

تمام ظاہری و باطنی نعمتیں اللہ ہی کی عطا کردہ ہیں

'وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً'۔ 'اسباغ' کے اصل معنی وسیع اور کشادہ کرنے کے ہیں پھر یہیں سے یہ اتمام و تکمیل کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا۔ 'وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ' یعنی اس نے ہر پہلو سے اپنی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں۔ یہ نعمتیں ظاہری و مادی بھی ہیں اور عقلی و روحانی بھی۔ شکل و صورت، قد و قامت، ہاتھ پاؤں، غذا، لباس اور اس قبیل کی دوسری تمام چیزیں بھی اس کی بخشی ہوئی ہیں اور سمع و بصر، عقل و ادراک اور بصیرت و ہدایت کی نعمتیں بھی اسی کی عطا کردہ ہیں، ان میں سے کسی چیز کے متعلق کوئی متنفس یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ خدا کے سوا کسی اور سے اس کو ملی ہیں یا کوئی دوسرا ان کے ملنے کا ذریعہ بن سکتا ہے تو جب تمام نعمتوں کو بخشنے والا اللہ ہی ہے تو بندے کی تمام شکرگزاری و نیازمندی کا حق دار بھی وہی ہوا پھر بلا کسی دلیل کے کوئی دوسرا اس کے اس حق میں کس طرح ساجھی بن سکتا ہے!

مشرکین کا بے دلیل مجادلہ

'وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ' یعنی جہاں تک خدا اور اس کی شکرگزاری کے حق کا تعلق ہے وہ تو ایک ثابت شدہ حقیقت ہے جس سے کسی کے لیے مجال انکار نہیں ہے لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ لوگوں میں ایسے شامت زدہ لوگ بھی ہیں جو اللہ کی توحید کے بارے میں جھگڑتے ہیں حالانکہ ان کے پاس نہ کوئی دلیل ہے، نہ کوئی رہنمائی ہے اور نہ کسی روشن کتاب کی سند ہے۔ 'يُجَادِلُ فِي اللّٰهِ'

میں مضاف محذوف ہے یعنی 'فِیْ تَوْحِیْدِ اللّٰہِ' مشرکین عرب خدا کے منکر نہیں تھے، ان کا سارا جھگڑا توحید کے باب میں تھا۔ 'بِغَیْرِ عِلْمٍ' میں علم سے مراد کوئی دلیل ہے خواہ وہ عقلی ہو یا نقلی۔ ۔ پ آیت ۲ میں بھی یہ لفظ گزر چکا ہے۔ یہ لفظ جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں 'ظن' کے مقابل میں بھی آتا ہے' اس وجہ سے اس سے ہر وہ چیز مراد ہو سکتی ہے جو یقین و اعتماد پیدا کرنے والی ہو۔ لفظ 'ھُدًی' یہاں 'کِتٰبٍ مُّنِیْرٍ' کے ساتھ آیا ہے جو اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ خاص سے پہلے عام کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہدایت خلق کو انبیاء علیہم السلام کی زبانی تعلیم کے ذریعہ سے بھی پہنچی ہے اور روشن صحیفوں کے ذریعہ سے بھی مثلاً تورات، زبور، انجیل، اور قرآن مجید کے ذریعے سے۔ میرا خیال ہے کہ 'ھُدًی' سے یہاں پہلی قسم کی دلیل مراد ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ دلیل کی یہ نفی اصل حقیقت کے اعتبار سے ہے۔ مشرکین اپنے موقف کی تائید میں جو کچھ کہتے تھے اس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ اس کی نوعیت مجرد تقلید کی ہے اور مجرد تقلید کوئی دلیل نہیں ہے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا ط اَوَلَوْ کَانَ الشَّیْطٰنُ یَدْعُوْھُمْ اِلٰی عَذَابِ السَّعِیْرِ (۲۱)

یہ ان کے مجادلہ بلا علم کی تفصیل ہے کہ جب ان کو اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کی پیروی کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ہم نے باپ دادا سے جو طریقہ پایا ہے ہم اسی پر چلتے رہیں گے' اس سے ہٹ کر کوئی نئی راہ اختیار کرنے کے لیے ہم تیار نہیں ہیں۔ فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ کیا اس شکل میں بھی یہ اسی روش پر جامد رہیں گے جب کہ شیطان ان کو تقلید آباد کے اس تعصب میں مبتلا کر کے ان کو جہنم کی طرف بلا رہا ہو! مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کی صحت و صداقت کی مجرد یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ وہ آباد و اجداد سے چلی آ رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جس طرح بے سوچے سمجھے تم باپ دادا کے طریقہ کو دین بنائے بیٹھے ہو اسی طرح تمھارے باپ دادا نے بھی بے سوچے سمجھے اگلوں سے جو پایا ہو اس کو دین بنا لیا ہو' اس وجہ سے دانش مندی اور حق پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی جس کتاب کی تم کو دعوت دی جا رہی ہے اس کو سنو، اس پر غور کرو اور اس کے دلائل کی روشنی میں اپنے عقائد و اعمال کا جائزہ لو۔ ایسا نہ ہو کہ اسی اندھے بہرے تعصب میں مبتلا ہو کر شیطان کی پیروی میں جہنم میں جا گرو۔ یہاں یہ حقیقت ملحوظ رہے کہ قومی دین، قومی تہذیب اور قومی روایات کے نعروں میں بڑی کشش ہوتی ہے' جو لوگ یہ نعرے بلند کرتے ہیں وہ قومی تہذیب و روایات کے محافظ سمجھے جاتے ہیں اور عوام ان کے نعروں سے اس طرح مسحور ہو جاتے ہیں کہ اس کے خلاف وہ کوئی بات بھی سننے کے روادار نہیں ہوتے، خواہ وہ کتنی ہی بڑی حقیقت ہو۔ میرے نزدیک 'یَدْعُوْھُمْ' میں ضمیر مفعول کا مرجع 'اٰبَآءَ' نہیں بلکہ خود اس قول کے قائلین ہیں۔

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۭ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۲۲)

اسلام کی اصل روح احسان ہے

'اَسْلَمَ' کا صلہ 'ل' کے ساتھ بھی قرآن میں آیا ہے اور 'اِلیٰ' کے ساتھ بھی۔ دونوں کے مواقع استعمال پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صورت میں تو یہ کامل تفویض و سپردگی کے مفہوم میں آیا ہے جو اسلام کی اصل حقیقت ہے۔ دوسری صورت میں جیسا کہ یہاں ہے یہ نیاز مندانہ متوجہ ہونے کے مفہوم میں آیا ہے۔ یہ متوجہ ہونا حقیقی بھی ہو سکتا ہے اور غیر حقیقی بھی اس وجہ سے اس کے ساتھ 'محسن' کی قید لگی ہوتی ہے۔ 'احسان' کے معنی، جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، کسی کام کو کمال درجہ خوبی و اخلاص کے ساتھ کرنے کے آتے ہیں۔ اس قید کے لگ جانے سے لفظ 'اسلام' کا مفہوم یہاں متعین ہو گیا کہ آدمی خدا کی طرف متوجہ ہو اور کمال درجہ خوبی و یکسوئی اور پوری وفاداری و جاں نثاری کے ساتھ متوجہ ہو۔ مشرکین و منافقین کی طرح نہیں کہ نام تو خدا کا لیتے ہیں لیکن اس کی خدائی اور اس کے حقوق میں دوسروں کو بھی شریک کیے بیٹھے ہیں اور ان کے نزدیک اصلی اہمیت خدا اور اس کے احکام کی نہیں بلکہ اس کے شریکوں اور ان سے متعلق رسوم و اوہام کی ہے۔

خدا کے ساتھ تعلق کا اصل ذریعہ

یہ آیت تقلیدِ آباء کے علم برداروں اور شرک کی حمایت میں لڑنے والوں کے جواب میں ارشاد ہوئی ہے کہ نہ باپ دادا کے طریقہ کی اندھی تقلید کوئی کام آنے والی چیز ہے اور نہ دیویوں دیوتاؤں کا سہارا کچھ کام آنے والا بنے گا۔ البتہ جو لوگ پورے اخلاص اور حسنِ عمل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہیں انھوں نے اپنے رب کے ساتھ وابستہ کرنے والی ایک مضبوط رسی تھام لی ہے جو ان کے لیے خدا کے ساتھ تعلق و توسل کا ایک محکم ذریعہ ہوگی اور یہ کبھی ٹوٹنے والی نہیں ہے۔

ایک تنبیہ

'وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ'۔ یہ تنبیہ ہے اور بڑی ہی سخت تنبیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اس رسی کے سوا دوسری رسیاں جو لوگوں نے تھام رکھی ہیں، وہ بھی ان کے لیے کچھ کام آنے والی بن سکیں گی۔ ان جھوٹے سہاروں میں سے کوئی بھی کام آنے والا نہیں ہے اس لیے کہ تمام امور بالآخر اللہ ہی کے آگے پیش ہوں گے، کوئی دوسرا مولیٰ و مرجع بننے والا نہیں ہے کہ اس کا سہارا کچھ کام آ سکے۔

وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ۭ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۲۳)

نبی صلعم کو تسلی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے اور ساتھ ہی اوپر والی آیت میں مخالفین کے لیے جو دھمکی ہے وہ مزید مؤکد کی گئی ہے۔ فرمایا کہ آج جو لوگ تمھاری دعوت کی مخالفت کر رہے ہیں ان کی مخالفت تمھارے لیے ذرا بھی باعثِ غم نہ ہو۔ بالآخر ان سب کی پیشی ہمارے ہی سامنے ہونی ہے۔

اس دن ہم ان کے آگے ان کا سارا کچا چٹھا رکھ دیں گے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ یعنی کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ ساری دنیا کے اعمال و اقوال سے واقف ہونا اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احاطۂ علم کا حال یہ ہے کہ لوگوں کے سینوں میں جو راز چھپے ہوئے ہیں وہ ان سے بھی باخبر ہے۔

نُمَتِّعُهُمۡ قَلِیۡلًا ثُمَّ نَضۡطَرُّهُمۡ اِلٰی عَذَابٍ غَلِیۡظٍ (۲۴)

سب خدا کی زنجیر میں بندھے ہوئے ہیں

'اِضطرار' کے بعد 'الیٰ' کا صلہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہ لفظ مجبور کر کے کشاں کشاں لے جانے کے مفہوم پر متضمن ہے۔ اس تضمین کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی اس مغالطہ میں نہ رہے کہ آخرت کا معاملہ بہت دور کا معاملہ ہے۔ اس دنیا کی مہلت ایک بالکل محدود مہلت ہے۔ فرمایا کہ ہم نے ان کو جو مہلت دی ہے یہ چند روزہ ہے۔ یہاں ہم کچھ دن ان کو اپنی نعمتوں سے بہرہ مند کریں گے پھر ہم ان کو کشاں کشاں ایک شدید عذاب کی طرف گھسیٹ کر لے جائیں گے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ انسان اس دنیا میں قدرت کے ایسے نوامیس و قوانین میں جکڑا ہوا ہے جن سے کسی کے لیے کسی حال میں بھی مفر نہیں ہے۔ شاہ و گدا سب ان کے آگے یکساں بے بس ہیں اور ہر ایک کو بہر حال وہیں جانا ہے جہاں ان قوانین کی زنجیر ان کو گھسیٹ کر لے جائے۔

وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ ؕ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ (۲۵)

مخالفین پر خود ان کے مسلمات سے اتمام حجت

یہ خدا کی شکر گزاری کی وہ دلیل بیان ہوئی ہے جس کے بنیادی مقدمہ کا اعتراف خود مخالفوں کو بھی ہے۔ فرمایا کہ اگر ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کس نے کیا ہے تو اس کا جواب وہ یہی دیں گے کہ اللہ نے۔ ان سے کہو کہ جب تم تمام چیزوں کا خالق خدا ہی کو مانتے ہو تو پھر تو شکر کا حق دار بھی وہی ہوا، آخر یہ بات کس قاعدے سے جائز ہو سکتی ہے کہ خالق تو تنہا وہ ہو لیکن شکر کے سزاوار دوسرے بھی بن جائیں جن کا نہ اس کائنات کے خلق میں کوئی حصہ اور نہ اس کی تدبیر میں!

'بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ' یعنی یہ بات نہیں ہے کہ یہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کی بنیاد کسی دلیل پر ہے۔ بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کو خود اپنے تسلیم کردہ مقدمات کے بدیہی نتائج و لوازم کا بھی علم نہیں ہے۔ اس جہل کا نتیجہ یہ ہے کہ خود اپنے مانے ہوئے مسلمات کو خود اپنے ہی دوسرے اعمال و عقائد سے جھٹلا دیتے ہیں۔

لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡغَنِىُّ الۡحَمِيۡدُ (۲۶)

اصل حقیقت کا اظہار

یہ اصل حقیقت کا اظہار ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب اسی کی مخلوق و مملوک اور سب اسی کے دروازے کے سائل و محتاج ہیں۔ بے نیاز اور ستودہ صفات صرف اسی کی ذات ہے۔ اس وجہ سے شکر کا سزاوار حقیقی تنہا وہی ہے، اس کے سوا کسی کا بھی یہ درجہ و مرتبہ نہیں ہے کہ اس کے اس حق میں وہ

شریک قرار دیا جا سکے ۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ (۲۷)

نشانیوں کی تعبیر کلمات سے

سورۂ کہف میں یہی مضمون بدیں الفاظ گزرا ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (۱۰۹)

ان سے کہہ دو کہ اگر میرے رب کی نشانیوں کو قلم بند کرنے کے لیے سمندر بھی روشنائی بن جائے تو میرے رب کی نشانیوں کے قلم بند ہونے سے پہلے سمندر خشک ہو جائے گا اگرچہ اسی کے برابر ہم اور روشنائی فراہم کریں۔

'کَلِمٰت' سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ نشانیاں ہیں جو اس کی ذات و صفات اور اس کی قدرت و حکمت پر گواہی دیتی ہیں۔ چونکہ ہر نشانی اللہ کے کلمۂ 'کُن' کا مظہر ہے اور ہر نشانی اپنی زبان حال سے ناطق بھی ہے اس وجہ سے یہاں نشانیوں کو کلمات سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ تعبیر نہایت ہی معنی خیز تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کوئی ایسی مبہم و مجہول چیز نہیں ہے کہ اس کے باب میں لوگوں کو ایسا التباس پیش آئے کہ لوگ جس اینٹ پتھر کو چاہیں خدا سمجھ کر اس کو ڈنڈوت شروع کر دیں۔ اس کائنات میں خدا کی اتنی نشانیاں ہیں کہ اگر زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور تمام سمندر، مزید سات سمندروں کے اضافے کے ساتھ، روشنائی بن جائیں جب بھی ان کا قلم بند کیا جانا ممکن نہیں ہے۔ اور یہ تمام نشانیاں اس بات پر شاہد ہیں کہ اس کا خالق عزیز و حکیم ہے۔ ان دونوں صفتوں کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بنیادی صفات میں سے ہیں اور قرآن میں ان سے جگہ جگہ توحید، قیامت اور رسالت تینوں پر استدلال کیا گیا ہے اور یہی مسائل قرآن کے اصولی مسائل ہیں۔ گویا اس کائنات کی ہر چیز اس کے خالق کے عزیز و حکیم ہونے کی گواہی دے رہی ہے اور انہی کے مقتضیات ہیں جن کو تسلیم کرنے کی قرآن دعوت دے رہا ہے۔

ہر چیز شاہد ہے کہ خدا عزیز و حکیم ہے

اس آیت میں 'اقلام' کا متقابل لفظ 'مداد' حذف ہے۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری عبارت یوں ہوگی۔ 'مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ مِدَادٌ' حذف کے اس اسلوب کی مثالیں ہم جگہ جگہ پیش کرتے آ رہے ہیں۔

سورۂ کہف کی مذکورہ بالا آیت کے تحت ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ کوئی مبالغہ کا اسلوب نہیں ہے بلکہ یہ بیان حقیقت ہے۔ وہاں ہم نے لکھا ہے کہ اگر سمندر روشنائی بن جائے تو یہ روشنائی خود سمندر ہی کے عجائب کو قلم بند کرنے کے لیے کافی نہیں ہوگی چہ جائیکہ اس پوری کائنات کے عجائب۔ یہ زمین جو ہمارے قدموں کے نیچے ہے خدا کی لا متناہی کائنات کا ایک نہایت ہی حقیر حصہ ہے لیکن سائنس کی تمام ترقیوں کے باوجود اب تک انسان اس کے جو عجائب دریافت کر سکا ہے اس کی حیثیت سمندر کے ایک قطرے سے زیادہ نہیں ہے۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ (۲۸)

خدا کے عزیز و حکیم ہونے کا لازمی تقاضا

یہ اوپر کے تمام مقدمات کا نتیجہ اور خلاصہ سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ جب اس کائنات کی ہر چیز شاہد ہے کہ اس کا خالق عزیز بھی ہے اور حکیم بھی تو اس امر میں کسی شک کی گنجائش کہاں باقی رہی کہ ایک دن اللہ تعالیٰ سب کو از سرِ نو پیدا کر کے قبروں سے اٹھائے گا۔ وہ عزیز ہے اس وجہ سے اس کے لیے یہ کام ذرا بھی مشکل نہیں ہے اور حکیم ہے اس وجہ سے یہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو وہ عزیز نہیں رہتا اور اگر کر سکنے کے باوجود نہ کرے تو یہ اس کی حکمت کے منافی ہے اس لیے کہ قیامت کے بغیر یہ دنیا ایک بازیچۂ اطفال بن کے رہ جاتی ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔

'اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ' میں مضاف محذوف ہے یعنی كَخَلْقِ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ یا كَبَعْثِ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ یعنی کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ اتنی ساری مخلوق کو از سرِ نو پیدا کرنا اور ان کو اکٹھا کرنا کس کے امکان میں ہے! فرمایا کہ اللہ کے لیے ایک نفس کو پیدا کر دینا اور تمام جہان کو پیدا کر دینا اور اس کو اٹھا کھڑا کرنا یکساں ہے۔ اس کے ایک ہی کلمۂ 'کُن' یا ایک ہی نفخ صُور سے ساری دنیا از سرِ نو زندہ ہو کر اٹھ کھڑی ہوگی۔ وہ ہر چیز پر قادر اور عزیز ہے۔

'اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ' یہ قیامت کے اصل مقصد، حساب کتاب، کی یاد دہانی ہے کہ کسی کو یہ غلط فہمی بھی نہ ہو کہ اتنی وسیع خلقت کے احوال و معاملات کا علم کسے ہے کہ وہ ان کا حساب کرنے بیٹھے گا۔ فرمایا کہ اللہ سب کچھ سن اور دیکھ رہا ہے، کوئی چیز اس کے علم و مشاہدہ سے باہر نہیں ہے اس وجہ سے اس کو لوگوں کا حساب کرنے اور ان کو جزا یا سزا دینے میں کوئی زحمت نہیں پیش آئے گی۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۡ كُلٌّ يَّجْرِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۲۹)

آفاق کی بعض نشانیوں کی طرف اشارہ

اوپر آیت ۲۰ میں 'اَلَمْ تَرَوْا' جمع کے صیغہ سے اپنی آیات کی طرف توجہ دلائی تھی یہاں 'اَلَمْ تَرَ' واحد کے صیغہ سے توجہ دلائی ہے۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ 'اَلَمْ تَرَ' کا خطاب جمع کے لیے بھی آتا ہے۔ اس صورت میں گویا مخاطب گروہ کے ایک ایک شخص کو فرداً فرداً توجہ دلائی جاتی ہے اور اس میں جمع کے مقابل میں زیادہ زور ہوتا ہے۔

فرمایا کہ یہ خدا ہی کی قدرت و حکمت ہے کہ وہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ 'رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرنا' تعبیر ہے یکے بعد دیگرے، پوری سرگرمی کے ساتھ، ایک دوسرے کے تعاقب اور پوری پابندیٔ اوقات کے ساتھ، ان کی آمد و شد کی۔

'وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۡ كُلٌّ يَّجْرِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى' اور یہ اسی کی قدرت و حکمت ہے کہ اس نے سورج اور چاند کو اپنی خلق کی خدمت گزاری کے لیے مسخر کر رکھا ہے اور یہ دونوں پوری پابندیٔ اوقات کے ساتھ

اپنے مدار میں گردش کرتے ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ مدار سے سرمو انحراف ہو یا نظام اوقات کی پابندی میں منٹ یا سیکنڈ کا بھی فرق واقع ہونے پائے۔

ان نشانیوں کی طرف توجہ دلانے سے مقصود انہی حقائق کو مبرہن کرنا ہے جو اوپر زیر بحث آئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس خدا کی قدرت کی یہ نشانیاں دیکھتے ہو اس کی نسبت تم یہ گمان کرتے ہو کہ وہ تم کو دوبارہ پیدا نہیں کر سکتا؟ جو رات اور دن اور سورج اور چاند کو اس طرح گردش دے رہا ہے کیا اس کی مخلوقات میں سے کوئی چیز اس کا شریک ہونے کا درجہ رکھتی ہے! اور کیا جس نے اپنی ربوبیت کی یہ شانیں دکھائی ہیں اس کی نسبت اس سوئے ظن کی کوئی گنجائش ہے کہ اس نے یہ سارا کارخانہ بالکل عبث بنایا ہے، اس کے پیچھے کوئی روزِ جزا نہیں ہے۔

وَاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ۔ یعنی اگر تم اس نظام ربوبیت و قدرت پر غور کرو تو اس امر میں ذرا شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہے گی کہ جو اس سارے نظام کو چلا رہا ہے وہ تم سے اور تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ بے خبر ہو تو وہ تمہاری پرورش کس طرح کرے گا؟ اور اگر باخبر ہے تو آخر وہ تم سے پرسش کیوں نہیں کرے گا کہ تم نے اس کی پروردگاری کا حق ادا کیا یا نہیں!

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (۳۰)

نظام کائنات کی باقاعدگی خدا کی توحید کی دلیل ہے

یعنی اس نظام کائنات کے اندر یہ باقاعدگی، یہ پابندی اور یہ افادیت و ربوبیت جو پائی جاتی ہے یہ اس وجہ سے پائی جاتی ہے کہ معبودِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے اور اس تمام کائنات کی باگ تنہا اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر اس کے سوا کچھ دوسرے الٰہ بھی اس کے خلق و تدبیر میں دخیل ہوتے تو یہ سارا نظام جیسا کہ فرمایا ہے لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا درہم برہم ہو جاتا۔ اس وجہ سے وہ سارے معبود بالکل بے حقیقت اور باطل ہیں جن کی یہ لوگ پرستش کر رہے ہیں۔ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ یعنی یہ نظام کائنات جس طرح خدا کی یکتائی پر شاہد ہے اسی طرح اس بات پر بھی شاہد ہے کہ خدا کی ذات بڑی ہی برتر اور بڑی ہی عظیم ہے۔ اس کی قدرت و حکمت کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہے کہ وہ رات کے بعد دن کو نمودار کر دیتا ہے اور دن پر رات کو ڈھانک دیتا ہے اور سورج اور چاند سب کی نکیل اس کے ہاتھ میں ہے۔ جو ذات اتنی عظیم و بلند ہے وہ اس سے ارفع ہے کہ کسی چیز کو اس کا شریک ٹھہرایا جائے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۳۱)

مغروروں کو تنبیہ

اب یہ کشتی کی مثال سے مخاطبوں کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ذرا میں مغرور اور مایوس ہو جانے والے نہ بنو بلکہ امتحان و آزمائش میں صبر کرنے والے اور نعمت میں شکر کرنے والے بنو۔ یہی راستہ سلامتی

کا ہے اور اسی پر چل کر فلاح حاصل کرنے والے بن سکو گے مگر تمہارا حال یہ ہے کہ اس وقت خدا کی عنایت سے جو تمہارے حالات سازگار ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر تمہارے پاؤں ہی نہیں پڑ رہے ہیں حالانکہ یہ سارا نشہ بالکل عارضی ہے۔ اگر ابھی خدا کی کسی پکڑ میں آ گئے تو سارا نشہ ہرن ہو جائے گا اور توبہ توبہ پکار اٹھو گے۔ لیکن یہ توبہ بھی بالکل وقتی ہوگی، جونہی حالات سازگار ہوں گے وہی سرمستی پھر عود کر آئے گی۔ ایک کشتی کے مسافروں کو جس طرح کے حالات پیش آتے ہیں ان سے سبق لو۔ اگر کوئی آزمائش میں صابر اور نعمت میں شاکر رہنا چاہے تو اس کے لیے ان کے حالات میں بڑا درس ہے۔

وَإِذَا غَشِيَهُم مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ (۳۲)

یہ اوپر کے اجمال کی تفصیل ہے کہ کشتی کے مسافروں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب تک کشتی رواں دواں رہتی ہے اس وقت تک ان کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ یہ خدا کی چلائی ہوئی سازگار ہوا کا کرشمہ ہے کہ وہ سمندر کے سینہ پر سوار اس سکون و راحت کے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔ بلکہ وہ اس کو اپنی ذہانت و قابلیت کا کرشمہ سمجھتے ہیں اور خدا اور اس کی قدرت کو بھولے رہتے ہیں۔ لیکن جب دفعتہً کسی گوشے سے طوفانی ہوائیں نمودار ہوتی ہیں اور سائبانوں کی مانند اٹھنے والی موجیں ان کو ڈھانک لیتی ہیں تب ان کو خدا یاد آتا ہے اور وہ سو سو طرح اس سے فریاد کرتے اور آئندہ کے لیے اطاعت و وفاداری کا عہد کرتے ہیں لیکن جب کشتی ساحل پر پہنچ جاتی ہے تو ان میں سے تھوڑے اپنے عہد پر قائم رہنے اور اعتدال کی راہ اختیار کرنے والے نکلتے ہیں، باقی غدار و ناشکرے نکلتے ہیں اور وہ سب خدا کی نشانیوں کو فراموش کر کے اپنی پچھلی سرمستیوں میں کھو جاتے ہیں۔

یہ قریش کے متمردین کو تنبیہ اور ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ اس وقت ان کے حالات سازگار ہیں اس وجہ سے خدا سے بے نیاز ہیں اور جب ان کو خدا کی پکڑ سے ڈرایا جاتا ہے تو اس کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن جب کسی پکڑ میں آ جائیں گے تو توبہ توبہ پکاریں گے۔ پھر جب ڈھیل مل جائے گی تو ان کو اپنا یہ عہد یاد بھی نہیں رہے گا۔ ایسے عہد شکن اور ناشکرے لوگ کسی نشانی سے بھی فائدہ نہیں اٹھاتے۔

'فَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ' کے بعد 'وَأَكْثَرُهُمْ كَفِرُونَ' یا اس کے ہم معنی الفاظ محذوف ہیں۔ اس محذوف کو بعد کے ٹکڑے 'وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ' نے کھول دیا ہے۔ 'مُقْتَصِدٌ' کے معنی راہِ حق و عدل پر چلنے والے کے ہیں۔

خَتَّار و کفور — 'وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ'۔ 'خَتَّار'، 'خَتْر' سے مبالغہ ہے۔ اس کے معنی ہیں بدترین قسم کی بے وفائی و عہد شکنی کرنے والا۔ یہ الفاظ یہاں اوپر کے الفاظ 'صَبَّارٍ شَكُورٍ' کے مقابل میں استعمال

ہوئے ہیں۔ 'صَبّار' سے وہ لوگ مراد ہیں جو ہر طرح کے حالات میں اپنے رب کے عہد پر استوار رہتے ہیں۔ اور 'خَتّار' سے وہ لوگ مراد ہیں جو نعمت میں تو خدا سے بے پروا رہتے ہیں البتہ جب کسی مصیبت میں پھنستے ہیں تو خدا سے عہد و پیمان باندھتے ہیں لیکن یہ عہد و پیمان ان کو صرف اسی وقت تک یاد رہتا ہے جب تک خدا کی پکڑ میں رہتے ہیں، اس سے چھوٹتے ہی وہ اپنے سارے عہد و پیمان کو طاقِ نسیاں پر رکھ دیتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدترین قسم کی غداری ہے۔ اس طرح کے لوگوں کے لیے نہ اللہ کی نعمت کی نشانیاں کارگر ہوتی ہیں نہ کوئی تنبیہ ان پر اثر انداز ہوتی۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُوا۟ رَبَّكُمْ وَٱخْشَوْا۟ يَوْمًا لَّا يَجْزِى وَالِدٌ عَن وَلَدِهِۦ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَن وَالِدِهِۦ شَيْـًٔا ۚ إِنَّ وَعْدَ ٱللَّهِ حَقٌّ ۖ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ ٱلْحَيَوٰةُ ٱلدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِٱللَّهِ ٱلْغَرُورُ (۳۳)

آخری تنبیہ

یہ آخری تنبیہ ہے کہ لوگو! اپنے رب کی پکڑ اور اس کے قہر و غضب سے بچو اور اس دن سے ڈرتے رہو جس دن نہ کوئی باپ اپنی اولاد کے کچھ کام آئے گا اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ کے کچھ کام آنے والا بن سکے گا بلکہ ہر ایک کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑے گا۔ باپ اور بیٹے کا رشتہ سب سے زیادہ قریبی رشتہ ہے۔ جب یہ ایک دوسرے کے کام آنے والے نہ بن سکیں گے تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

زبان کے ایک اسلوب کی بلاغت

یہاں اسلوبِ بیان کی یہ ندرت ملحوظ رہے کہ بیٹے کے کام نہ آ سکنے کی نفی میں شدت پائی جاتی ہے۔ فرمایا ہے 'وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَن وَالِدِهِۦ شَيْـًٔا' زبان کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ مبتدا کے اعادے اور فعل کی جگہ اسم کے استعمال نے اس جملہ میں بڑا زور پیدا کر دیا ہے۔ اس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اوّل تو ہر باپ کو فطری طور پر اپنے بیٹے سے یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ پیری میں اس کا سہارا بنے گا، دوسری یہ کہ بیٹا اپنی عمر اور صلاحیت کے اعتبار سے باپ کے مقابل میں زیادہ اس بات کا اہل ہوتا ہے کہ اپنے ناتواں باپ کی مدد کر سکے۔ تیسری یہ کہ بیٹے کے اندر جوانی کے سبب سے فتوت و حمیت کا جذبہ بھی زیادہ قوی ہوتا ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس دن نفسی نفسی کا یہ عالم ہوگا کہ بیٹا بھی اپنے باپ کے کام آنے والا نہ بن سکے گا۔

اس دنیا کا فریب نظر

یہاں اس دور کے حالات پر نظر رہے جس دور میں یہ آیات اتری ہیں۔ سورۂ عنکبوت کی تفسیر میں بھی ہم اشارہ کر چکے ہیں اور اس سورہ کی آیت ۱۵ کے تحت بھی یہ بات گزر چکی ہے کہ اس دور میں باپوں کی طرف سے بیٹوں پر ان کو اسلام سے روکنے کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا تھا اور اس کے حق میں بزرگانہ دلیل یہ پیش کی جاتی تھی کہ تم ہمارے طریقہ کی پیروی کرتے رہو۔ قیامت کے دن تمہارے نیک و بد کے ذمہ دار ہم ہیں۔ یہ آیت اس بات کی تردید کر رہی ہے۔

'إِنَّ وَعْدَ ٱللَّهِ حَقٌّ ۖ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ ٱلْحَيَوٰةُ ٱلدُّنْيَا' یعنی اللہ کا یہ وعدہ شدنی ہے۔ قیامت آ کے

ہے گی تو یہ دنیا کی زندگی تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے۔ یعنی اس دنیا کا نظام چونکہ مجازات کے اصول پر نہیں چل رہا ہے بلکہ اس میں حق کے ساتھ باطل کو بھی مہلت ملی ہوئی ہے اور اہلِ باطل اس میں زیادہ سربلند ہیں اس وجہ سے نادانوں کو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ قیامت کا ڈراوا محض ڈراوا ہے۔ فرمایا کہ یہ چیز کسی کو غلط فہمی میں نہ ڈالے —— یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ اس امتحان کے نتائج کے ظہور کا دن بعد میں آنے والا ہے۔

وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ۔ یعنی یہ فریبِ نظر اور یہ دھوکا خدا کے بارے میں کسی کو غلط فہمی میں نہ ڈالے کہ خدا نے یہ دنیا بے مقصد بنا ڈالی ہے اور وہ اس کے خیر و شر سے بالکل بے تعلق ہو کر الگ بیٹھا ہوا ہے۔ اگر کسی نے ایسا سمجھا ہے تو وہ خدا کو بہت غلط سمجھا ہے۔ بالآخر ایک دن آئے گا جس دن خدا کا کامل عدل ظاہر ہو گا اس دن اس قسم کی غلط فہمیوں میں پڑے ہوئے لوگ اپنی اس حماقت پر لیے سر پیٹیں گے۔ یہی مضمون 'مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ' والی آیت میں بھی بیان ہوا ہے۔ لفظ 'غرور' اس دنیا کے فریبِ نظر کے لیے بھی استعمال ہوا ہے اور اس فریبِ نظر میں مبتلا کرنے والے شیطان کے لیے بھی اور یہاں دونوں ہی معنی بنتے ہیں۔ البتہ اتنی بات یاد رکھیے کہ 'فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا' میں اس فریبِ نظر پر تنبیہ ہے جو آدمی کو اس دنیا کے باب میں لاحق ہوتا ہے اور 'وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ' میں اس مغالطہ سے آگاہ کیا گیا ہے جو نادانوں کو اللہ تعالیٰ کے باب میں لاحق ہوتا ہے۔ اور فلسفۂ دین کے اعتبار سے یہی دو مغالطے ہیں جو تمام گمراہیوں کی جڑ ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (۳۴)

ایک شبہ کا ازالہ

یہ ایک دفعِ دخلِ مقدر یعنی ایک شبہ یا اعتراض کا برسرِ موقع جواب ہے۔ مخالفین کو جب قیامت سے ڈرایا جاتا تو وہ جھٹ یہ سوال کرتے کہ 'مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ' آخر یہ دھمکی کب پوری ہو گی! اگر اس کو آنا ہے تو آ کیوں نہیں جاتی! اس کے جواب میں فرمایا کہ اس کے آنے کا وقت صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ اگر اس کا وقت معلوم نہیں ہے تو اس سے اس حقیقت کی نفی نہیں ہو جاتی۔ زندگی کی کتنی حقیقتیں ہیں جن کے وقت اور ان کی نوعیت کا کسی کو علم نہیں ہوتا لیکن کوئی عاقل ان کا انکار نہیں کرتا —— بارش ہوتی ہے اور اس کے ہونے سے کوئی انکار نہیں کرتا لیکن اس کے ٹھیک ٹھیک وقت، اس کی مقدار اور اس کے مقامات کو کون بتا سکتا ہے! اس زمانے میں انسان نے سائنس میں بڑی ترقی کر لی ہے اور حکومتیں لاکھوں کروڑوں روپے محکمۂ موسمیات پر خرچ کرتی ہیں لیکن ان محکموں کی پیشین گوئیوں کی حقیقت ظن و تخمین سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اسی طرح ایک عورت حاملہ ہوتی ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ یہ عورت جنے گی، لیکن کیا جنے گی اور کب جنے گی اس کو خدا کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا۔ علیٰ ہذا القیاس کسی کو یہ پتہ نہیں کہ کل وہ کیا کمائی کرے گا، کیا فرائض انجام دے گا اور کن حالات و مشاغل میں اس کی زندگی گزرے گی۔ بڑے بڑے

ضابطہ پسندوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑی احتیاط سے اپنے پروگرام بناتے ہیں اور بڑی وضع داری سے ان کو نباہتے ہیں لیکن عین وقت پر کوئی ایسی افتاد پیش آجاتی ہے کہ ان کا سارا پروگرام درہم برہم ہو جاتا ہے! افراد تو درکنار حکومتوں تک کا حال یہ ہے کہ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ منصوبہ بندی کرتی ہیں کہ اس سال ہم اپنے ملک میں اتنی گندم یا اتنا چاول پیدا کریں گے لیکن ذرا سا موسم کا تغیر و تبدل اور بارش کا اتار چڑھاؤ ساری منصوبہ بندی پر پانی پھیر دیتا ہے۔ اور زیادہ دُور کیوں جائیے، آدمی کے لیے خود اپنی زندگی اور موت کا مسئلہ کتنی اہمیت رکھنے والا ہے لیکن کون جانتا ہے کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا اور کہاں دفن ہو گا! آدمی گھر سے ہنسی خوشی کسی تقریب کے لیے نکلتا ہے اور وہاں سے اس کی لاش آتی ہے۔ پیدا کہاں ہوتا ہے، رہتا بستا کہیں ہے اور دفن کہیں ہوتا ہے۔ تو جب اتنی قریب کی ایسی واضح حقیقتوں کا علم بھی انسان کو نہیں ہے حالانکہ یہ زندگی کے وہ حقائق ہیں جن کا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا تو قیامت کا اگر وقت نہیں معلوم ہے تو وہ کیوں مشتبہ ہو جائے!!

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ: اصلی علیم و خبیر اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ وہی جانتا ہے کہ قیامت کب آئے گی، لیکن وہ آئے گی ضرور۔ اس کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے وقوع کی شہادت دے رہا ہے۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وللہ الحمد والمنۃ۔

اتوار۔ ۸ بجے دن

۲۸ / جولائی ۱۹۷۴ء

رحمان آباد

تدبّرِ قرآن

۳۲

السّجدة

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلّق

یہ سورہ سابق سورہ ——— لقمان ——— کا مثنیٰ ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ قرآنی نام بھی دونوں کا ایک ہی یعنی الٓمّٓ ہے۔ تمہید بھی دونوں کی ایک ہی نوع کی ہے۔ اس کا آغاز اس مضمون سے ہوتا ہے کہ یہ کتاب خداوندِ عالم کی اتاری ہوئی کتاب ہے۔ اس کو اتار کر اللہ تعالیٰ نے ان امّی عربوں پر عظیم احسان فرمایا ہے جن کے اندر اب تک کوئی منذر نہیں آیا تھا۔ وہ انتہائی ناشکرے ہوں گے اگر انھوں نے اس کی قدر کرنے کے بجائے اس کے کتابِ الٰہی ہونے کے دعوے کو افترا قرار دیا۔ اس کے کتابِ الٰہی ہونے میں ذرا شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے بعد کلام کا رُخ قرآن کے ان دعاوی کے اثبات کی طرف مڑ گیا ہے جو خاص طور پر مخالفین کی وحشت کا باعث تھے اور جن کے سبب سے وہ اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ آخر میں تورات کا حوالہ ہے کہ اسی طرح کی کتاب، اللہ نے حضرت موسیٰؑ پر بھی اتاری تھی جس کی فرعون اور اس کی قوم نے مخالفت کی اور اس کا نہایت برا انجام ان کے سامنے آیا۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ جس طرح تورات کے حاملین کو صبر کے امتحانوں سے گزرنے کے بعد کامیابی حاصل ہوئی اسی طرح تم کو اور تمھارے ساتھیوں کو بھی صبر کے امتحان سے گزرنا پڑے گا۔ اگر تم ان مراحل سے کامیابی سے گزر گئے تو فتح تمہی کو حاصل ہوگی، تمھارے یہ مخالفین بالآخر پامال ہو کر رہیں گے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۳) یہ قرآن اللہ کی اتاری ہوئی کتاب ہے۔ اس کے کتابِ الٰہی ہونے میں ذرا شبہ کی گنجائش نہیں ہے جو لوگ سمجھتے ہیں کہ خدا کی طرف اس کی نسبت ایک افترا ہے وہ آگاہ رہیں کہ یہ افترا نہیں بلکہ یہ بالکل حق ہے اور اس کا مقصد ان لوگوں کو انذار کرنا ہے جن کے اندر کوئی منذر اب تک نہیں آیا تھا۔ اگر انھوں نے اس کی قدر نہ کی تو ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو ان قوموں کا ہو چکا ہے جنھوں نے خدا کے منذروں کی تکذیب کی۔

(۴-۹) یہ دنیا کوئی بازیچۂ اطفال نہیں بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ نے نہایت اہتمام سے پیدا کیا ہے اور پیدا کر کے اس نے اس کو چھوڑ نہیں دیا ہے بلکہ براہِ راست وہ اس کا انتظام فرما رہا ہے۔ تمام احکام اسی کی طرف سے صادر ہوتے اور پھر اسی کے حضور میں پیش ہوتے ہیں۔ اس کا کوئی دوسرا شریک و شفیع نہیں ہے۔ وہ خود تمام غائب و حاضر کا جاننے والا ہے۔ اس نے انسان کو بہترین صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے لیکن بہت تھوڑے لوگ ہیں جو ان صلاحیتوں

سے فائدہ اٹھاتے اور خدا کے شکر گزار بنتے ہیں۔

(۱۰-۱۴) منکرین قیامت کے شبہات کا جواب اور ان کے اصل محرکِ انکار کی طرف اشارہ۔ قیامت کے دن ان کا جو حال ہوگا اس کی تصویر اور اس امر کا بیان کہ اس دن کسی کا اقرار و اعتراف کسی کے لیے کچھ نافع نہ ہوگا۔ حقائق کو آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد ان کا ماننا معتبر ہوتا تو اللہ تعالیٰ سب کو ایمان ہی پر پیدا کرتا، پھر یہ عقل و تمیز کی صلاحیتیں دینے اور ان کے امتحان کی کیا ضرورت تھی!

(۱۵-۲۲) قرآن پر ایمان لانے والوں کی بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کہ جو لوگ استکبار سے پاک ہیں اور جن کی نگاہوں میں حق کی عزت ہے وہ اس پر ایمان لائیں گے۔ یہ لوگ اس کی آیات سن کر اپنے سر جھکا دیتے ہیں، راتوں میں اٹھ اٹھ کر اپنے رب کو یاد کرتے اور اس کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کی جو ٹھنڈک چھپا رکھی ہے آج ان کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فرمانبردار بندوں اور نافرمانوں کے ساتھ ایک ہی معاملہ نہیں کرے گا۔ ان نافرمانوں کو آخرت میں جو سزا ہونی ہے وہ تو ہوگی ہی، اس دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ ان کو سزا دے گا تاکہ وہ متنبہ ہونا چاہیں تو متنبہ ہو جائیں۔

(۲۳-۲۶) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ تم سے پہلے اللہ نے موسیٰ کو بھی کتاب دی تھی تو جن لوگوں نے اس کو جھٹلایا خدا نے ان سے انتقام لیا۔ اسی طرح اس کتاب کے جھٹلانے والوں سے بھی وہ لازماً انتقام لے گا اور جس طرح بنی اسرائیل کے اندر سے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو امامت کا منصب بخشا جو حق پر ثابت قدم رہے اسی طرح وہ تمہارے ساتھیوں کو بھی خلق کی رہنمائی کے منصب پر سرفراز فرمائے گا اگر وہ حق پر مضبوطی سے جمے رہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کی تاریخ کی طرف اجمالی اشارہ کہ تاریخ کی شہادت اسی حقیقت کو ثابت کر رہی ہے بشرطیکہ لوگوں کے پاس سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھیں ہوں۔

(۲۷-۳۰) کفار کو وعید کہ وہ اہلِ حق کے غلبہ کی اس بشارت کو بہت بعید از امکان چیز سمجھتے ہیں اور مذاق سے پوچھتے ہیں کہ یہ فتح کب ظاہر ہوگی! ان کو جواب کہ جب یہ چیز ظاہر ہوگی تو اس وقت اس کو ماننا ان لوگوں کے لیے ذرا بھی نافع نہ ہوگا جو آج اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کے کج فہموں سے اعراض کی ہدایت کہ اگر یہ لوگ فیصلہ کے دن ہی کے منتظر ہیں تو تم بھی ان کا پیچھا چھوڑو اور اسی کا انتظار کرو۔

سُوْرَةُ السَّجْدَةِ (۳۲)

مَكِّيَّةٌ ———— اٰيَاتُهَا ۳۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ﴿١﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢﴾ آیات ۱-۱۴
اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا
مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿٣﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ
خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى
عَلَى الْعَرْشِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ۭ اَفَلَا
تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٤﴾ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاۗءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ
اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿٥﴾ ذٰلِكَ
عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿٦﴾ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ
شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ﴿٧﴾ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ
مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّاۗءٍ مَّهِيْنٍ ﴿٨﴾ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ
وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿٩﴾
وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۭ بَلْ هُمْ
بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ﴿١٠﴾ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ

ع ۱۱ ۴ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ﴿۱۱﴾ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الْمُجْرِمُونَ
نَاكِسُوا رُءُوسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا
نَعْمَلْ صَالِحًا إِنَّا مُوقِنُونَ ﴿۱۲﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ
هُدَاهَا وَلَٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ
النَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿۱۳﴾ فَذُوقُوا بِمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا
إِنَّا نَسِينَاكُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۱۴﴾

ترجمۂ آیات ۱-۱۴

یہ الٓمٓ ہے۔ اس کتاب کی تنزیل، اس میں ذرا شبہ نہیں، خداوند عالم کی طرف سے ہے۔ کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے خود اپنے جی سے گھڑ کر اس کو خدا کی طرف منسوب کر دیا ہے! بلکہ یہی تیرے رب کی جانب سے حق ہے تاکہ تم ان لوگوں کو ہوشیار کر دو جن کے پاس تم سے پہلے کوئی ہوشیار کرنے والا نہیں آیا تاکہ وہ راہ یاب ہوں۔ ۱-۳

اللہ ہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو چھ دن میں پھر وہ عرش پر متمکن ہوا۔ اس کے سوا نہ تمہارے لیے کوئی کارساز ہے اور نہ اس کے مقابل میں کوئی سفارشی۔ کیا تم لوگ چیتتے نہیں! ۴

وہی آسمان سے زمین تک سارے امور کا انتظام فرماتا ہے۔ پھر یہ تمام امور اسی کی طرف لوٹتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ہزار سال کے برابر ہے۔ وہ غائب و حاضر کا جاننے والا، عزیز و رحیم ہے۔ ۵-۶

جس نے جو چیز بھی بنائی ہے خوب ہی بنائی ہے! اس نے انسان کی خلقت کا آغاز مٹی سے کیا۔ پھر اس کی نسل حقیر پانی کے خلاصہ سے چلائی۔ پھر اس کے نوک پلک سنوارے

اور اس میں اپنی روح پھونکی اور تمھارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے ـــــ تم بہت ہی کم شکرگزار ہوتے ہو!! ۷-۹

اور کہتے ہیں کہ کیا جب ہم زمین میں رل مل جائیں گے تو ہم پھر نئی خلقت میں آئیں گے! بلکہ یہ لوگ اپنے رب کے آگے پیشی کے منکر ہیں۔ کہہ دو کہ تمھاری جان وہ فرشتہ ہی قبض کرتا ہے جو تم پر مامور ہے پھر تم اپنے رب ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور اگر تم دیکھ پاتے اس وقت کو جب کہ یہ مجرمین اپنے رب کے حضور اپنے سر جھکائے ہوئے اعتراف کریں گے کہ اے ہمارے رب ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا تو ہمیں لوٹا کہ ہم نیک کام کریں، ہم یقین کرنے والے بن گئے۔ اگر ہم چاہتے تو ہر ایک کو اس کی ہدایت خود ہی دے دیتے لیکن میری طرف سے یہ بات متحقق ہو چکی ہے کہ میں جنوں اور انسانوں سب سے جہنم کو بھر کے چھوڑوں گا تو اب چکھو مزا اس بات کا کہ تم نے اس دن کی پیشی کو بھلائے رکھا۔ ہم نے بھی تم کو نظرانداز کیا اور تم اپنے کیے کی پاداش میں اب ہمیشگی کا عذاب چکھو۔ ۱۰-۱۴

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓمّٓ ۝ تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ مِنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (۱-۲)

'الٓمّٓ' کی تحقیق سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ سابق سورہ کی طرح اس سورہ کی تمہید بھی بقرہ کی تمہید سے ملتی جلتی ہوئی ہے۔

قرآن پر قریش اور یہود کا اصل اعتراض

'تَنۡزِیۡلُ' کے معنی ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ صرف اتارنے کے نہیں بلکہ اہتمام خاص کے ساتھ درجہ بدرجہ اتارنے کے ہیں۔ 'الۡکِتٰبِ' سے مراد قرآن مجید ہے۔ یعنی اس کتاب کی تنزیل اللہ ربّ العٰلمین کی طرف سے ہے۔ اس کے اللہ ربّ العٰلمین کی طرف سے ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ 'لَا رَیۡبَ فِیۡہِ' کا یہی مفہوم ہم نے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بیان کیا ہے۔ اس آیت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ قریش اور یہود دونوں کو سب سے زیادہ اختلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس

دعوے سے تھا کہ یہ کتاب آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی جاتی ہے۔ اس دعوے کو وہ، جیسا کہ آگے کی آیت سے واضح ہوگا، 'افترا' قرار دیتے یعنی آنحضرت صلعم پر یہ الزام لگاتے کہ نعوذ باللہ اس کتاب کو یہ تصنیف تو خود کرتے ہیں لیکن ہمارے اوپر دھونس جمانے کے لیے اس کو جھوٹ موٹ منسوب اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِیْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ یَهْتَدُوْنَ (۳)

یہ سوال حیرت و تعجب کی نوعیت کا ہے کہ کیا یہ لوگ حق کی مخالفت میں ایسے اندھے بہرے ہوگئے ہیں کہ اس کتاب کے کتاب الٰہی ہونے کے دعوے کو افترا قرار دیتے ہیں! مطلب یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کے اندر انصاف اور سچائی کی کوئی رمق ہوتی تو یہ بات، وہ زبان سے نہ نکالتے لیکن یہ لوگ مخالفت کے جوش میں بالکل اندھے بہرے بن چکے ہیں۔

جواب میں دھمکی

'بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ'۔ اس الزام کا جواب قرآن مجید نے مختلف پہلوؤں سے دیا ہے جن کی وضاحت پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔ یہاں کوئی تفصیلی جواب دینے کے بجائے نہایت سخت دھمکی کے انداز میں دعوے کو مزید مؤکد کر دیا ہے۔ اور یہ تاکید یہاں دو پہلوؤں سے نمایاں ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ یہی حق ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جس دین آبائی کے علمبردار ہیں وہ بالکل باطل ہے، صحیح دین یہی ہے جس کی دعوت یہ کتاب دے رہی ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کتاب کے متعلق اس وہم میں نہ رہیں کہ اس کو خدا کی طرف جھوٹ موٹ نسبت دی جا رہی ہے۔ یہ فی الحقیقت خدا ہی کی طرف سے ہے، اگر یہ لوگ اسی طرح اس کو جھٹلاتے رہے تو اس کا انجام خود بھگتیں گے۔

اُمّی عربوں پر اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان

'لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِیْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ یَهْتَدُوْنَ'۔ یہ اس کتاب کے اس اہتمام کے ساتھ اتارنے کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اس لیے اتاری ہے کہ تم اس کے ذریعہ سے ان لوگوں کو اس زندگی کے انجام اور آخرت کے احوال سے آگاہ کر دو جن کے اندر تم سے پہلے کوئی منذر نہیں آیا۔ یہاں 'قوم' سے مراد اہل عرب ہیں جن کے اندر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد کوئی نبی نہیں آیا تھا۔ یہ اس کتاب کے احسان کا پہلو نمایاں فرمایا گیا ہے کہ اُمّی عربوں پر اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب نازل کر کے بہت بڑا فضل فرمایا ہے۔ انھیں چاہیے کہ وہ اس عظیم نعمت کی قدر کریں۔

ساتھ ہی اس کے اندر انذار کا یہ پہلو بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کے اندر اپنا منذر بھیج دیتا ہے تو اس قوم کی قسمت میزان میں آجاتی ہے۔ اگر اس کے بعد بھی وہ اپنے رویہ کی اصلاح نہیں کرتی تو ایک خاص حد تک مہلت دینے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو لازماً تباہ کر دیتا ہے۔ اس سنت الٰہی کی وضاحت جگہ جگہ اس کتاب میں ہو چکی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا شَفِیْعٍ ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ (۴)

انذار کا خاص موضوع

اوپر کی آیت میں اس کتاب کی تنزیل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا خاص مقصد انذار بتایا گیا ہے۔ اب یہ اسی کی تفصیل آرہی ہے۔ انذار کا خاص موضوع دو چیزیں ہیں۔ ایک توحید دوسری قیامت۔ قرآن مجید اول تو اس بات سے ڈراتا ہے کہ لوگ غلط سہاروں اور فرضی معبودوں کی شفاعت کی امید پر زندگی نہ گزاریں۔ اس کائنات کا خالق و مدبر تنہا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے۔ سب کو بالآخر اسی کی طرف لوٹنا اور اسی کے آگے جواب دہ ہونا ہے۔ اس وجہ سے اسی کی شکر گزاری اور اسی کی عبادت و اطاعت سب پر واجب ہے۔

دوسرے وہ قیامت سے ڈراتا ہے کہ قیامت شدنی ہے۔ بالآخر سب کی پیشی خدا ہی کے آگے ہوگی۔ اس وقت مجرم اپنے جرم کا اعتراف اور اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں گے کہ اگر ایک مرتبہ پھر انھیں دنیا میں جانے کی مہلت نصیب ہو تو وہ ایمان و عمل صالح کی زندگی گزاریں گے لیکن وہاں اس قسم کی درخواستوں اور التجاؤں کا موقع باقی نہیں رہے گا۔

آیت زیر بحث اور بعد کی چند آیتوں میں توحید کا بیان ہوا ہے اس کے بعد قیامت اور احوالِ قیامت کا ذکر آئے گا۔

یہ کائنات کسی اتفاقی حادثہ کے طور پر ظہور میں نہیں آئی ہے

'اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ'۔ چھ دنوں سے مراد، جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، خدائی ایام ہیں اور آگے وضاحت آرہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کا ایک دن ہمارے ہزار سالوں کے برابر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے چھ دنوں سے مراد چھ ادوار ہوں گے۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کی خلقت کسی اتفاقی واقعہ کی طرح ظہور میں نہیں آئی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نہایت تدریج و اہتمام کے ساتھ وجود بخشا ہے۔ یہ تدریج و اہتمام اس کی غایت و حکمت پر دلیل ہے اور اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ کوئی کھیل تماشا نہیں ہے بلکہ ایک بامقصد و باغایت کارخانہ ہے۔

اس کا انتظام اللہ تعالیٰ براہ راست خود کر رہا ہے

'ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ' یعنی اس اہتمام و انتظام سے اس دنیا کو پیدا کر کے اللہ تعالیٰ اس سے بے تعلق نہیں ہو بیٹھا ہے بلکہ وہ اپنے عرشِ حکومت پر متمکن ہو کر براہ راست اور بالفعل اس کا انتظام بھی فرما رہا ہے۔ یہ مشرکین کے اس خیال کی تردید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو پیدا کر کے اس کا انتظام اپنی دوسری مقرب ہستیوں کے سپرد کر دیا ہے اور خود اس سے بالکل الگ ہو بیٹھا ہے۔ اس تصور کی بنیاد جس وہم پر تھی اس کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں۔

براہ راست انتظام کا لازمی نتیجہ

'مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا شَفِیْعٍ' یہ اس کے لازمی نتیجہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ جب

براہِ راست تمام امور کی باگ اسی کے ہاتھ میں ہے تو سب کی پیشی بھی اسی کے آگے ہوتی ہے اور وہی سارے معاملات کا فیصلہ فرمائے گا۔ اس وقت اس کے سوا نہ کوئی کسی کا کارساز و مددگار بن سکے گا اور نہ اس کے مقابل میں کوئی کسی کی سفارش کر سکے گا۔ لفظ 'دُوْنَ' میں سوا اور مقابل دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے اس وجہ سے یہاں 'وَلِیّ' کے ساتھ 'شَفِیْعٍ' کی بھی نفی فرما دی۔

'اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ'۔ یہ تمام نتائج چونکہ مخاطب کے مسلمات پر مبنی ہیں اس وجہ سے ان کو سامنے رکھ دینے کے بعد تنبیہ کیا کہ آخر ایسی واضح باتیں تم لوگ کیوں نہیں چیتتے!!

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (۵-۶)

مشرکین کے ایک خاص گروہ کی تردید

یعنی آسمان سے لے کر زمین تک تمام امور کی تدبیر وہی فرماتا ہے۔ یہ مشرکین کے اس گروہ کی تردید ہے جو اس وہم میں مبتلا تھا کہ زمین چونکہ اللہ تعالیٰ کی کائنات کا ایک دور دراز علاقہ ہے اس وجہ سے اس نے اپنی حکومت صرف آسمان تک محدود رکھی ہے، زمین کا انتظام اس نے اپنے دوسرے کارندوں کے حوالہ کر دیا ہے۔ اسی گروہ کو مخاطب کر کے قرآن میں بعض جگہ یہ سوال آیا ہے کہ کیا زمین میں الگ خدا اور آسمان میں الگ خدا ہیں! کیسی بے عقلی کی باتیں کرتے ہو!

'ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ' یعنی تمام امور صادر بھی اسی کی طرف سے ہوتے ہیں اور پھر رجوع بھی اسی کی طرف ہوتے ہیں۔ 'يَعْرُجُ اِلَيْهِ' یہاں (REFER) ہونے کے مفہوم میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ احکام صادر کر کے پھر بے تعلق نہیں ہو بیٹھتا بلکہ ہر چیز اس کے سامنے پیش ہوتی رہتی ہے اور وہ پوری طرح باخبر رہتا ہے کہ کارکنانِ قضا و قدر نے کیا فرائض انجام دیے اور کس طرح انجام دیے۔

خدائی ایام کی نوعیت

'فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ' عام طور پر لوگوں نے اس سے مراد قیامت کا دن لیا ہے اور اس دن لوگوں کے اعمال کی جو پیشی خدا کے سامنے ہوتی ہے ان کے نزدیک یہ اس کی طرف اشارہ ہے۔ قیامت کا دن چونکہ بہت سخت ہوگا اس کی اس سختی کو بطریق استعارہ یوں تعبیر فرمایا کہ وہ ہزار سال کے برابر بن جائے گا۔ ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ بعینہٖ یہی مضمون سورۂ حج میں اس طرح آیا ہے:

وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۴۷)	اور تمہارے رب کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار سے ہزار سالوں کے برابر کا ہوتا ہے۔

وہاں یہ آیت عذاب کے لیے لوگوں کی جلد بازی کے جواب میں وارد ہوئی ہے کہ جب ان کو عذاب سے ڈرایا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس عذاب کی دھمکی ہم ایک مدت سے سن رہے ہیں لیکن وہ آیا نہیں، اگر اس کو آنا ہے تو آ کیوں نہیں جاتا! ان کے جواب میں فرمایا ہے کہ خدا کے کاموں کو اپنے محدود پیمانوں

سے نہ ناپو۔ تمھارے دن چوبیس گھنٹوں کے ہوتے ہیں اس وجہ سے تمھیں چند سالوں کی مدت بھی بہت طویل محسوس ہوتی ہے لیکن خدا کے ہاں کا ایک دن تمھارے شمار سے ایک ہزار سال کے برابر کا ہوتا ہے اور اسی کے حساب سے اس کے سارے پروگرام اور منصوبے بنتے ہیں۔ تم اپنے دنوں کو پیش نظر رکھ کر گھبرانے لگتے ہو کہ فلاں بات پر اتنی مدت گزر گئی لیکن اب تک وہ واقع نہیں ہوئی اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکال لیتے ہو کہ یہ دھمکی تمھیں جھوٹ موٹ سنائی گئی حالانکہ خدائی دنوں کے اعتبار سے ابھی اس پر ایک گھڑی بھی نہیں گزری ہوتی ہے۔

بعینہٖ اسی سیاق میں آیت زیر بحث بھی وارد ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمام امر و تدبیر خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ اسی کی طرف سے احکام صادر بھی ہوتے ہیں اور پھر اسی کی طرف لوٹتے بھی ہیں لیکن یہ صادر ہونا اور لوٹنا سب خدائی دنوں کے حساب سے ہوتا ہے۔ اس وجہ سے نہ ہر شخص ان کے نتائج سے آگاہ ہو سکتا اور نہ ہر شخص ان کی حکمتوں کو سمجھ سکتا ہے۔ بندوں کے لیے صحیح روش یہ ہے کہ وہ خدا کے معاملات میں جلدبازی نہ کریں بلکہ صبر کے ساتھ انتظار کریں۔

'ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ'۔ غیب اور حاضر کا جاننے والا اور عزیز و رحیم وہی ہے۔ دوسرے کسی کا بھی یہ درجہ نہیں ہے کہ وہ کائنات کے تمام اسرار سے واقف ہو سکے۔ وہ تمام غائب و حاضر سے واقف بھی ہے اور عزیز و رحیم بھی ہے۔ اس وجہ سے بندوں کو چاہیے کہ وہ کامل حسن ظن کے ساتھ اس پر بھروسہ کریں۔

ایک شبہ کا ازالہ

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ یہی مضمون سورۂ معارج میں یوں وارد ہوا ہے:

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (۴)

فرشتے اور جبریل اس کی طرف صعود کرتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مدت پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔

بظاہر اس آیت اور اوپر کی آیت میں تضاد معلوم ہوتا ہے لیکن یہ تضاد نہیں ہے۔ دنوں کا یہ تفاوت مداروں کے اختلاف پر مبنی ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے مختلف سیاروں کے دن الگ الگ ہیں۔ پھر یہ بات بھی توجہ کے قابل ہے کہ آیت زیر بحث میں امور کے پیش کیے جانے کا ذکر ہے اور سورۂ معارج میں ملائکہ اور جبریل کی پیشی کا ذکر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ امور کی پیشی ہزار سال کے دن میں ہوتی ہو اور ملائکہ اور جبریل کی براہِ راست پیشی کا دن پچاس ہزار سال کے برابر ہو۔ یہ امورِ غیب ہیں۔ ان کے باب میں کوئی بات جزم کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی تاہم اتنی بات بالکل واضح ہے کہ دونوں آیتوں میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ سورۂ حج کی تفسیر میں اس مسئلہ پر ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ سورۂ معارج کی تفسیر میں ان شاء اللہ ہم اس کے بعض دوسرے گوشوں پر بھی نظر ڈالیں گے۔

الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۚ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ‎(۷-۹)

انذارِ قیامت کے لیے تمہید صفاتِ الٰہی سے

اللہ تعالیٰ کی صفات عالم الغیب والشہادۃ اور عزیز و رحیم کو بنیاد قرار دے کر آگے قیامت کے انذار کے لیے تمہید استوار فرمائی کہ یہ اللہ ہی ہے جس نے جو چیز بھی بنائی خوب بنائی۔ یعنی اس نے جو چیز بھی بنائی ہے اس کی قدرت، حکمت، ربوبیت اور اس کے بے نہایت علم کی شاہد ہے۔ کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی لے کر انسان اگر اس پر غور کرے تو اس کی عقل صانع کی صنعت و کاریگری پر دنگ رہ جاتی ہے اور وہ بے خود ہو کر پکار اٹھتا ہے کہ تَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ (بڑی ہی بابرکت ذات ہے اللہ، بہترین پیدا کرنے والا!!) یہیں سے انسان پر اس حقیقت کا دروازہ کھلتا ہے کہ جو ذات اتنی قدرت رکھنے والی، اتنی حکیم، اتنی باریک بیں اور ایسی رحمان و رحیم ہے اس کی نسبت یہ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اتنا بڑا عالم بالکل بے مقصد کھڑا کر دے۔ پس ضرور ہے کہ اس کے بعد ایک ایسا دن آئے جس میں وہ حق و باطل میں امتیاز کرے۔ ان لوگوں کو جزا دے جنھوں نے اس کی نعمتوں کا حق پہچانا اور ان لوگوں کو سزا دے جنھوں نے اس دنیا میں اندھوں بہروں کی زندگی گزاری، نہ انھوں نے خود اس کی حکمتوں پر غور کیا اور نہ دوسرے غور کرنے والوں کی باتوں کو لائق اعتنا سمجھا۔

خدا کی قدرت کا کرشمہ انسان

وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ۔ اوپر والے ٹکڑے میں یہ بات جو فرمائی ہے کہ اس نے جو چیز بھی بنائی خوب بنائی، اس کے ثبوت میں خارج کی مثالیں پیش کرنے کے بجائے خود انسان ہی کی خلقت کو بطور مثال پیش کیا ہے کہ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ خود اپنی ہی خلقت کے مراحل و مدارج پر غور کرو اور دیکھو کہ خدا کی قدرت و حکمت اور اس کی ربوبیت کی کیا کیا شانیں تمھارے اندر ظاہر ہوئی ہیں! فرمایا کہ یہ انسان جو آج اپنی قابلیتوں پر اتنا نازاں ہے، اس کا آغاز خدائے حکیم و قدیر نے کسی بڑے قیمتی جوہر سے نہیں کیا بلکہ مٹی سے کیا، اسی سے اس کا قالب بنا اور اسی مٹی کے اندر سے اس کے اندر زندگی کی حرکت نمودار ہوئی لیکن دیکھو خالق کی قدرت و حکمت کہ اس نے مٹی کے لوندے کو کیا سے کیا بنا دیا!!

انسان کی خلقت کا دوسرا مرحلہ

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ۔ یہ انسان کی خلقت کے دوسرے مرحلہ کی طرف اشارہ ہے کہ دوسرے مرحلے میں اس کی حیثیت یہ ہوئی کہ مٹی کے بجائے اس کی نسل کے چلنے کا ذریعہ حقیر و ناپاک پانی کا خلاصہ بنا۔

تیسرا مرحلہ

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ۔ 'تسویۃ' کے معنی جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، کسی چیز کو سنوارنے اور اس کی نوک پلک درست کرنے

کے ہیں۔ آرٹ کی اصطلاح میں جس چیز کو تکمیل، یا اتمامی عمل (FINISHING TOUCH) کہتے ہیں ٹھیک وہی مفہوم 'تَسْوِیَۃ' کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تیسرے مرحلے میں آکر اس نے مٹی سے بنے ہوئے اس انسان کے نوک پلک سنوارے اور اس کے اندر اپنی روح پھونکی تب اس کے اندر سمع و بصر اور دل کی وہ صلاحیتیں نمودار ہوئیں جو دوسری حیوانی مخلوقات کے مقابل میں اس کے لیے وجہِ امتیاز ہیں۔

انسان کا اصلی شرف

'نَفَخَ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِهٖ' میں روح سے مراد وہ روح ہے جس کو ہم روحِ ملکوتی سے تعبیر کرتے ہیں۔ انسان کے اندر حیوانی روح کے ساتھ ایک نورِ یزدانی (DIVINE SPARK) بھی ہے اور اسی نور کے فیض سے انسان کے سمع و بصر اور فواد میں وہ روشنی پیدا ہوتی ہے جس سے اس کو اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہوا ہے۔ اگر اس روشنی سے وہ محروم ہو جائے تو پھر اس کا باطن بھی اسی طرح تیرہ و تار ہے جس طرح حیوانات کا ہے۔ کان، آنکھ اور دل حیوانات کے پاس بھی ہیں لیکن وہ نورِ یزدانی سے محروم ہیں اس وجہ سے ان کے کانوں، آنکھوں اور دلوں میں وہ صلاحیت نہیں ہے جو انسان کے سمع و بصر اور دل میں ہے۔ اگر انسان اپنے کو اس نور سے محروم کر لے تو پھر وہ بھی ایک حیوان ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس نور کو باقی رکھنا اور اس کو بڑھانا یا گھٹانا انسان کے اپنے اختیار پر منحصر ہے۔ جو لوگ اس کی قدر کرتے اور اس کے حقوق ادا کرتے ہیں وہ اس میں اضافہ کرتے ہیں اور ان کے اندر یہ قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے اور جو لوگ اس کی قدر نہیں کرتے ان کے اندر یہ ضعیف ہوتے ہوتے بالکل ہی بجھ جاتا ہے۔

'مِنۡ رُّوۡحِهٖ' میں اضافت اسے مقصود فی الجملہ اس روح کے اختصاص کا اظہار ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے خاص فیوض و برکات میں سے ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حصہ ہے۔ اس غلط فہمی پر تنبیہ اس لیے ہم نے ضروری سمجھی ہے کہ وحدت الوجود کی گمراہیوں میں بڑا دخل اسی غلط فہمی کا ہے۔

تسویہ اور نفخ روح سے پہلے انسان حیوانیت کے دور میں تھا

اس آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تسویہ اور نفخ روح سے پہلے انسان پر ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جب انسان حیوانات کی طرح ناتراشیدہ اور بصیرت و ادراک سے محروم تھا۔ اس دور کے بعد تسویہ نے اس کے ظاہر کو سنوارا اور نفخ روح نے اس کے باطن کو منور کیا۔

خلاصۂ بحث

'قَلِیۡلًا مَّا تَشۡکُرُوۡنَ': یعنی اپنی خلقت کے ان تمام مراحل پر غور کرو کہ کس طرح خدا نے تمہارا آغاز کیا اور پھر کس درجے تک تم کو پہنچایا! حق تھا کہ تمہارا بال بال اپنے رب کی اس عنایت و ربوبیت کا شکرگزار ہوتا اور جو نعمتیں و صلاحیتیں اس نے تم کو بخشیں ان کو تم اس کی رضا کے کاموں میں استعمال کرتے لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ تم بہت ہی کم اس کے شکرگزار ہوتے ہو۔

وَقَالُوۡۤا ءَاِذَا ضَلَلۡنَا فِی الۡاَرۡضِ ءَاِنَّا لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ۬ؕ بَلۡ هُمۡ بِلِقَآئِ رَبِّهِمۡ کٰفِرُوۡنَ (۱۰)

سب کچھ دیکھنے کے بعد انسان کی بے بصیرتی

یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو سمع و بصر اور ادراک و تعقل کی جو صلاحیتیں بخشی تھیں وہ اس لیے بخشی تھیں کہ ان سے وہ کام لیں اور خدا کی قدرت و حکمت اور رحمت و ربوبیت کے آثار کے مشاہدہ سے اس نتیجے تک پہنچیں کہ یہ دنیا عبث نہیں پیدا ہوئی ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کے بعد ایک ایسا دن آئے جس دن ہر شخص اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے اپنے رب کے حضور حاضر کیا جائے اور وہ جزا یا سزا پائے لیکن اس انسان کی کج فہمی کا یہ حال ہے کہ جب اس کو قیامت سے ڈرایا جاتا ہے تو خدا کی قدرت کی اتنی شانیں دیکھنے کے باوجود، وہ طنز و استہزا کے ساتھ یہ سوال کرتا ہے کہ کیا جب ہم گل سڑ کر زمین میں رل مل جائیں گے تو اس کے بعد از سر نو زندہ کیے جائیں گے!!

قیامت کے انکار کے لیے ایک بہانہ

'بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ'۔ یعنی یہ باتیں سب اوپر کے بہانے ہیں۔ آخر خدا کی اتنی شانیں اپنے وجود کے اندر اور باہر دیکھتے ہوئے یہ اتنے غبی کس طرح ہو سکتے ہیں کہ اپنے دوبارہ پیدا کیے جانے کو اس کی قدرت سے بعید سمجھیں! اصل چیز یہ ہے کہ یہ لوگ خدا کے آگے پیشی اور اعمال کی جواب دہی کے منکر ہیں، اس چیز کو تسلیم کرنا ان کے دلوں پر بہت شاق ہے اس وجہ سے اس سے گریز کے لیے یہ تمام عقلی استبعادات اور شبہات گھڑے اور اٹھائے جا رہے ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ بسا اوقات انسان انکار تو کسی اور چیز کا کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے انکار کے لیے بہانہ کسی اور چیز کو بناتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ براہِ راست اس حقیقت کے انکار کی کچھ زیادہ گنجائش وہ نہیں پاتا۔ مشرکینِ عرب کا حال بھی یہی تھا۔ وہ خدا کے قائل تھے اس وجہ سے خدا کے آگے پیشی کا صریح انکار ان کے لیے مشکل تھا لیکن اس کو ماننے سے جو بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں وہ ان کے لیے بھی تیار نہیں تھے اس وجہ سے اس سے گریز کے لیے اول تو وہ قیامت پر اس قسم کے شبہات وارد کرتے تھے جس کی ایک مثال اوپر گزری اور بدرجۂ آخر اس کو مانتے بھی تھے تو اس کے نتائج سے بچاؤ کے لیے انھوں نے شرکاء و شفعاء ایجاد کر لیے تھے۔

دونوں شبہات کا الگ الگ جواب

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ (۱۱)

یہ اوپر کی دونوں باتوں کا جواب ہے کہ جو مرتا ہے اس کو خدا کا وہ فرشتہ ہی وفات دیتا ہے جو خدا کی طرف سے ہر شخص پر مامور ہے۔ اس وجہ سے کوئی شخص مرنے کے بعد بھی خدا اور اس کے مامور ملائکہ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ جب اللہ تعالیٰ چاہے گا وہ ہر شخص کو اٹھا کھڑا کرے گا اور وہ اس کے مامور ملائکہ کی نگرانی میں ان کے سامنے حاضر کیا جائے گا۔

'ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ'۔ یعنی کوئی اس طمع خام میں بھی مبتلا نہ رہے کہ اس کی واپسی اس کے مزعومہ شرکاء و شفعاء کی طرف ہوتی ہے۔ اس دن ان شرکاء و شفعاء کا کوئی وجود نہیں ہوگا، سب کی پیشی اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے سامنے ہی ہوگی اور وہی سب کا فیصلہ فرمائے گا۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا

نَعْمَلْ صَالِحًا إِنَّا مُوقِنُونَ (۱۲)

خطاب کی نوعیت اور تمنی کے جواب کے حذف کی بلاغت

'وَلَوْ تَرٰی' میں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہو سکتا ہے اور عام مخاطبوں سے بھی۔ پہلی شکل میں یہ آیت تسلی کے سیاق میں ہوگی اور دوسری صورت میں تہدید کے سیاق میں۔ اگر پہلی صورت اختیار کیجیے تو مطلب یہ ہوگا کہ آج تو یہ لوگ تمھارے آگے بہت اکڑ رہے اور بڑے تبختر و رعونت کے ساتھ قیامت اور خدا کے آگے پیشی کا انکار کر رہے ہیں لیکن اگر تم اس وقت کو دیکھ پاتے جب یہ تمام مجرمین سر نہوڑائے اپنے رب کے سامنے حاضر ہوں گے تو ——— یہاں تمنی کا جواب محذوف ہے اور اس حذف میں بڑی بلاغت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اس وقت ان کی بے بسی کا وہ منظر دیکھتے جس کا آج تصور بھی نہیں کر سکتے!

'رَبَّنَآ أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا إِنَّا مُوقِنُونَ'۔ یعنی اس وقت ان میں سے ہر ایک کی زبان پر یہ اعتراف ہوگا کہ اے ہمارے رب! ہم نے اچھی طرح دیکھ اور سن لیا۔ اب ہمیں ایک بار دنیا میں پھر لوٹا تاکہ ہم کچھ نیکی کمائیں۔ ہمیں ہر بات کا پورا یقین ہو گیا۔

وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ (۱۳)

مشاہدہ کے بعد کا ایمان بے سود ہے

یہ ان کے اعتراف اور ان کی درخواست کا جواب ہے جو برسر موقع ان کو دیا جائے گا کہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد تمھارا یہ اقرار و ایمان بالکل بے سود ہے۔ اگر اللہ کو اس طرح کا مجبورانہ ایمان پسند ہوتا تو وہ ہر شخص کو ایمان و ہدایت پر ہی پیدا کرتا۔ یہ اس کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ ہدایت کے معاملے میں اس نے لوگوں کو اختیار دیا کہ وہ امتحان کرے کہ کون اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر ایمان کی راہ اختیار کرتا ہے اور کون اپنی خواہشوں کی پیروی میں شیطان کی راہ پسند کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حتمی فیصلہ کا حوالہ

'وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ' یہ اس فیصلہ کی طرف اشارہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو اس کے چیلنج کے جواب میں آگاہ فرما دیا تھا۔ قرآن میں اس کا ذکر جگہ جگہ آیا ہے۔ سورۂ ص میں اس کا حوالہ یوں ہے:

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۙ	ابلیس نے کہا تیرے عزت و جلال کی قسم! میں
إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ۝	ان سب کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ بس ان میں سے تیرے
قَالَ فَالْحَقُّ ۡ وَالْحَقَّ أَقُولُ ۚ	خاص بندے ہی بچ رہیں گے۔ اللہ نے فرمایا کہ پھر یہ
لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ	بات بھی حق ہے اور میں حق ہی کہتا ہوں کہ میں بھی
وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ	تجھ سے اور تیری ذریت سے اور ان انسانوں میں

أَجْمَعِيْنَ ‎(ص: ۸۲-۸۵) سے جو تیری پیروی کریں گے، سب کو جہنم میں بھر کے رہوں گا۔

یہاں اس قول کا حوالہ دینے سے مقصود مجرموں کو اس بات سے آگاہ کرنا ہوگا کہ اب عذر و معذرت کا وقت گزر گیا۔ اللہ نے شیطان کے جواب میں پہلے ہی اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ وہ بنی آدم میں سے جن کو گمراہ کر سکتا ہے گمراہ کرلے۔ انسان کو خدا نے یہ آزادی دی ہے کہ وہ چاہے تو رحمان کی راہ اختیار کرے اور چاہے تو شیطان کی راہ اختیار کرے۔ دنیا کی زندگی میں یہ امتحان تھا۔ اب امتحان کا مرحلہ گزر چکا اور نتائج بھگتنے کی باری ہے چنانچہ آج وہ انجام تمھارے سامنے آگیا اور میری بات تم پر پوری ہوئی۔

فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ‎(۱۴)

'نسی' کے معنی ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، نظر انداز کرنے اور ٹالنے کے بھی آتے ہیں۔ یہاں یہ نظر انداز کرنے ہی کے معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب کسی سوال و درخواست کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ جس طرح تم نے اس دن کو نظر انداز کیے رکھا آج ہم نے تم کو نظر انداز کیا۔ اب تمھاری کوئی درخواست و التجا ہمارے نزدیک درخورِ اعتنا نہیں رہی۔ اب اپنے اعمال کی پاداش میں ہمیشگی کا عذاب چکھو۔ یعنی یہ تمھارے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ظلم نہیں ہے بلکہ عمر بھر جس فصل کی تم نے کاشت کی ہے یہ اسی کا حاصل تمھارے سامنے آیا ہے۔

۲۔ آگے کا مضمون ۔ آیات ۱۵-۲۲

اوپر کی آیات سے واضح ہوا کہ جو لوگ قرآن پر ایمان لانے سے گریز کر رہے تھے ان کے گریز کے اسباب کیا تھے۔ اب آگے کی آیات میں یہ بتایا ہے کہ کس قسم کے لوگ ہیں جو اس کتاب پر ایمان لا رہے ہیں یا لائیں گے اور ان کے لیے خدا کے ہاں کیا اجر و ثواب اور کیا مرتبہ و مقام ہے اور جو لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں وہ دنیا اور آخرت دونوں میں کس انجام سے دوچار ہونے والے ہیں ـــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۵-۲۲

اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ
سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۩ ‎(۱۵) تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ
عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۡ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ
يُنْفِقُوْنَ ‎(۱۶) فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٧﴾ اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ
فَاسِقًا ؕ لَا يَسْتَوٗنَ ﴿١٨﴾ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وقف غفران
فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى ۫ نُزُلًاۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٩﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ
فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَاۤ اُعِيْدُوْا
فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ
تُكَذِّبُوْنَ ﴿٢٠﴾ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ
الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٢١﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ
ع ٢/١١ ١٥ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ؕ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ﴿٢٢﴾

ترجمۂ آیات ١٥-٢٢

ہماری آیات پر تو بس وہی لوگ ایمان لاتے ہیں جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے ذریعے سے ان کو یاددہانی کی جاتی ہے تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔ ان کے پہلو بستروں سے کنارہ کش رہتے ہیں۔ وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں خوف اور طمع سے اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں تو کسی کو پتہ نہیں کہ ان لوگوں کے واسطے ان کے اعمال کے صلہ میں آنکھوں کی کیا ٹھنڈک پوشیدہ ہے!! ١٥-١٧

تو کیا وہ جو مومن ہے اس شخص کے مانند ہو جائے گا جو نافرمان ہے! دونوں یکساں نہیں ہو سکتے!! جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے راحت کے باغ ہیں جو ان کو ان کے اعمال کے صلہ میں، اولین سامانِ ضیافت کے طور پر، حاصل ہوں گے۔ رہے وہ جنھوں نے نافرمانی کی تو ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ جب جب وہ اس

ہیں سے نکلنے کی کوشش کریں گے اسی میں دھکیلے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ اب اس دوزخ کے عذاب کا مزہ چکھو جس کی تم تکذیب کرتے رہے تھے۔ ۱۸-۲۰

اور ہم ان کو بڑے عذاب کے سوا قریب کا عذاب بھی چکھائیں گے تاکہ یہ رجوع کریں۔

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جن کو ان کے رب کی آیات کے ذریعہ سے یاددہانی کی جائے پھر وہ ان سے اعراض کریں! ہم ایسے مجرموں سے ضرور انتقام لیں گے۔ ۲۱-۲۲

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِہَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّہِمْ وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ (۱۵)

قرآن پر ایمان لانے والوں کی صفات

یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی کے سیاق میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنی دنیوی برتری کے زعم میں اپنے کو حق سے بھی بڑا سمجھنے لگے ہیں ان سے کسی خیر کی امید نہ رکھو، ہماری ان آیات پر صرف وہ لوگ ایمان لائیں گے جن کے دلوں کے اندر خشیت و انابت ہے۔ ان کو جب ان کے ذریعہ سے خدا اور آخرت کی یاددہانی کی جاتی ہے تو وہ جھگڑنے کے بجائے بے تحاشا سجدوں میں گر پڑتے اور اپنے رب کی تسبیح کرتے ہیں اس کی حمد کے ساتھ۔ یعنی ان آیات سے اثر پذیر وہ لوگ ہوں گے جن کے دلوں کے اندر قساوت نہیں پیدا ہوئی ہے۔ اس طرح کے لوگوں کے دلوں پر اگر غفلت کا کچھ غبار ہوتا ہے تو وہ تذکیر و تنبیہ سے فوراً صاف ہو جاتا ہے اور پھر وہ حق کو ایسے جوش و جذبہ کے ساتھ اختیار کرتے ہیں کہ سالوں کی منزل، دنوں میں طے کرتے ہیں۔

'سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّہِمْ'۔ 'تسبیح' اور 'حمد' دونوں کے ایک ساتھ ذکر کرنے کے فائدے پر ہم دوسری جگہ روشنی ڈال چکے ہیں۔ 'تسبیح' کے اندر تنزیہہ کا پہلو غالب ہے اور 'حمد' کے اندر اثبات کا — خدا کی صحیح معرفت ان دونوں ہی پہلوؤں کو ملحوظ رکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر ان میں سے کوئی پہلو بھی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو انسان خدا کے باب میں ایسی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ خدا کا وجود اور عدم دونوں اس کے لیے یکساں ہو کے رہ جاتا ہے۔

گُر کی بات

'وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ'۔ یہ اصل گُر کی بات ارشاد ہوئی ہے کہ ان لوگوں کے اندر یہ صلاحیت اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ ان میں استکبار نہیں ہے۔ استکبار کی حقیقت پر ہم دوسری جگہ روشنی ڈال چکے ہیں۔

اس کا صحیح مفہوم حق کے مقابل میں اکڑنا ہے۔ یہ بیماری اُمّ الامراض ہے۔ جو لوگ اس مہلک مرض میں مبتلا ہوتے ہیں وہ اپنی خواہشوں اور اپنی رائے کے مقابل میں کسی واضح سے واضح حق کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو قبولِ حق کی صلاحیت سے بالکل ہی محروم کر دیتا ہے۔ قبولِ حق کی توفیق صرف وہی لوگ پاتے ہیں جو حق کو، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، ہر چیز سے بالا سمجھتے ہیں اور جب وہ ان کے سامنے آتا ہے تو خواہ کسی گوشے سے آئے، یہاں تک کہ اگر ان کا دشمن بھی اس کو پیش کرے، تو وہ فوراً اس کے آگے گردن جھکا دیتے ہیں۔

تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ز وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ (۱۶)

یعنی ان لوگوں پر خدا کے حضور پیشی اور آخرت کی باز پرس کا خوف چونکہ ہر وقت طاری رہتا ہے اس وجہ سے وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اور بستروں کی لذت و راحت سے اپنے کو محروم رکھ کر اپنے رب کو پکارتے اور اس کی نمازیں پڑھتے ہیں۔ یہ ڈرتے بھی اسی سے ہیں اور امید بھی اسی سے رکھتے ہیں۔ اور جو کچھ خدا نے ان کو بخشا ہے اس میں سے خدا کی راہ میں وہ خرچ کرتے ہیں۔

اس آیت میں دو چیزوں کا ذکر آیا ہے۔ ایک نماز، دوسری انفاق۔ ایمان کے بعد یہی دو چیزیں اس کے اولین مظاہر کی حیثیت رکھتی ہیں اور پھر انہی دو پر پورے دین کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اس مسئلہ پر ہم اس کتاب میں جگہ جگہ بحث کر چکے ہیں۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ ج جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۱۷)

شب بیداریوں اور قربانیوں کا صلہ تصور سے بالاتر

یہ ان لوگوں کی شب بیداری اور انفاق کا صلہ بیان ہوا ہے کہ ان کے لیے اللہ نے آنکھوں کی جو ٹھنڈک چھپا رکھی ہے اس دنیا میں اس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ ایک نادیدہ عالم کی زندگی کی خاطر ان لوگوں کی ان جانفشانیوں پر آج جو لوگ ہنس رہے ہیں وہ بھی اس کو دیکھ کر دنگ رہ جائیں گے اور اہلِ ایمان بھی نہال ہو جائیں گے کہ ان کی قربانیوں کا صلہ ان کے اندازوں اور قیاسوں سے کہیں بڑھ کر ملا۔

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ: یعنی یہ جو کچھ ان کو ملے گا ان کے اپنے ہی اعمال کا صلہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان کی چند روزہ مساعی کا صلہ ایک ابدی بادشاہی کی صورت میں دے گا اور فرمائے گا کہ یہ تمہارے اپنے ہی اعمال کا صلہ ہے۔ ہر چند یہ جو کچھ ملے گا یہ ہوگا اللہ تعالیٰ کا فضل لیکن اس کو اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا ثمرہ قرار دے گا اس لیے کہ آدمی کو اپنے کارناموں کے ثمرات و نتائج سے جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ کسی دوسری چیز سے نہیں حاصل ہوتی۔

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ؕ لَا یَسْتَوٗنَ (۱۸)

اوپر کی بات کی دلیل

یہ اوپر والی بات کی دلیل ارشاد ہوئی ہے کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش

نہیں ہے۔ ایسا ہی ہوگا اور ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس دنیا کے خالق کے نزدیک مومن اور فاسق دونوں یکساں ہیں اور وہ اپنے وفادار بندوں اور اپنے باغیوں اور غداروں میں کوئی فرق نہیں کرے گا۔ ایسا سمجھنا اس کارخانۂ کائنات کے مبنی برحکمت ہونے کی نفی اور اس کے خالق کے عادل، رحیم اور حکیم ہونے کا انکار ہے اس وجہ سے یہ بات صریحاً باطل ہے۔ دونوں خدا کے نزدیک یکساں نہیں ہو سکتے پس ضروری ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں خدا کے وفادار بندے اپنی وفاداریوں کا صلہ پائیں اور اس کے نافرمان اپنی نافرمانیوں کی سزا بھگتیں۔

وَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰی نُزُلًا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۹)

جنات الماویٰ

یہ اس جزا اور سزا کی تفصیل بیان فرمائی کہ جو لوگ ایمان و عمل صالح کی زندگی بسر کریں گے ان کے لیے راحت کے باغ ہوں گے جو ان کو ان کے اعمال کے صلہ میں اولین سامانِ میزبانی کی حیثیت سے ملیں گے۔ 'نُزُل' اس سامانِ ضیافت کو کہتے ہیں جو مہمان کے سامنے اس کے رکاب سے اترتے ہی پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ 'جنّات الماویٰ' سے مراد وہ جنتیں ہیں جن میں یہ اہلِ ایمان اوّل اوّل اتارے جائیں گے۔ وہاں ان کی ابتدائی ضیافت ہوگی اور پھر وہ اصل جنت میں بھیجے جائیں گے۔ گویا ان باغوں کی حیثیت اہلِ جنت کے لیے (REST HOUSE) کی ہوگی اور اس کے جمع لانے سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ باغ تمام اہلِ جنت کے لیے الگ الگ ہوں گے۔ سورۂ نجم کی آیت ۱۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ 'جَنّٰتُ الْمَاْوٰی'، 'سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى' کے پاس ہے اور 'سدرة المنتہیٰ' عالمِ ناسوت اور عالمِ لاہوت کے درمیان آخری نقطۂ اتصال ہے اس وجہ سے اگر اس کے پاس 'جنّات الماویٰ' ہوں تو یہ ان کے لیے موزوں ترین مقام ہے۔ یہ امورِ غیب کی باتیں ہیں، ان کے باب میں کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے لفظ 'نُزُل' کے مقتضیات کی وضاحت کے لیے لکھا ہے۔ ان شاء اللہ سورۂ نجم کی تفسیر میں 'جنت الماویٰ' پر مزید بحث آئے گی۔

وَاَمَّا الَّذِیْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَاۤ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (۲۰)

فساق کا انجام

اہلِ ایمان کی جزا بیان کرنے کے بعد یہ فساق و فجار کی سزا کا بیان ہے۔ فرمایا کہ ان کا ٹھکانا دوزخ ہوگی۔ یہ اس میں سیدھے دھکیل دیے جائیں گے۔ دوزخ میں ان کے لیے اولین سامانِ ضیافت، قرآن کے دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ کھولتا ہوا پانی اور زقوم ہوگا۔ یہ وہاں سے نکلنے کے لیے زور لگائیں گے لیکن جب جب نکلنے کی کوشش کریں گے اسی میں دھکیل دیے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ اب یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ وہی دوزخ اور اس کا عذاب ہے جس کا تم مذاق اڑاتے رہے تھے۔ اب اس کا مزا چکھو!

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (۲۱)

قریش کے لیے تنبیہی عذاب

'عَذَابِ اَدْنیٰ' سے مراد اس دنیا کا عذاب ہے جو تذکیر و تنبیہ کے لیے آتا ہے۔ اوپر کی آیت میں 'عذاب اکبر' کا ذکر تھا جس سے کفار کو آخرت میں سابقہ پیش آئے گا۔ فرمایا اس 'عذاب اکبر' سے پہلے اس دنیا میں بھی ہم ان لوگوں کو اپنے عذاب کا مزا چکھائیں گے۔ 'ان لوگوں' سے مراد ظاہر ہے کہ قریش ہیں۔ یہاں جو باتیں فرمائی گئی ہیں اگرچہ عام الفاظ میں فرمائی گئی ہیں لیکن ان کے اوّل مخاطب قریش ہی ہیں۔ ان کو دھمکی دی ہے کہ وہ متنبہ رہیں کہ اس دنیا میں بھی ان کو سزا ملے گی اور مقصود اس سے یہ ہوگا کہ وہ اپنی غلط روش سے باز آئیں اور صحیح زندگی کی طرف پلٹیں ـــ اس 'عَذَابِ ادنیٰ' کا سلسلہ قریش کے لیے غزوۂ بدر سے شروع ہوا جس میں ان کو پہلا چرکا لگا اور ان کے بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ پھر یکے بعد دیگرے اسی طرح کے حالات سے ان کو سابقہ پیش آتا رہا۔ یہاں تک کہ فتح مکہ کے موقع پر ان کی قوت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ ان کے اندر جو اچھے لوگ تھے وہ آہستہ آہستہ حلقہ بگوش اسلام ہوگئے اور جو اشرار و مفسدین تھے وہ بالتدریج ختم ہوگئے۔ چونکہ ان کی اکثریت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائی اس وجہ سے ان پر کوئی اس قسم کا فیصلہ کن عذاب نہیں آیا جس قسم کے عذاب پچھلی قوموں پر آئے بلکہ یہ صرف تنبیہ کرکے چھوڑ دیے گئے، جیسا کہ 'لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ' کے الفاظ سے واضح ہوتا ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ ثُمَّ أَعْرَضَ عَنْهَا ۚ إِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ مُنتَقِمُونَ (۲۲)

رسول کی تذکیر کے بعد عذاب لازمی ہے

اوپر کی آیت میں عذاب کی جو دھمکی دی ہے یہ اس کی وجہ بیان فرمائی ہے کہ آخر ہم ان کو عذاب کیوں نہ دیں گے! ان سے بڑھ کر ظالم و مجرم کون ہو سکتا ہے جن کو ہماری آیات کے ذریعہ سے تذکیر و تنبیہ کی جائے اور وہ ان سے رُوگردانی کریں! تذکیر و تنبیہ کا سب سے بڑا ذریعہ خدا کی کتاب اور اس کا رسول ہی ہو سکتا ہے۔ جو لوگ اس آخری ذریعۂ تذکیر و تنبیہ سے بھی نہ جاگے اب سنتِ الٰہی کے تحت ان کے جگانے کے لیے کوئی دوسری چیز باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اب لاریب وہ مجرم ہیں اور ہم ایسے مجرموں سے لازماً انتقام لے کے رہیں گے۔ کسی قوم میں رسول کی بعثت کے بعد اللہ تعالیٰ اس قوم کے ساتھ جو معاملہ کرتا ہے اس کی وضاحت ہم اس کتاب میں جگہ جگہ کرتے آئے ہیں۔ اس آیت کو اس کی روشنی میں سمجھیے۔

۴۔ آگے کا مضمون ۔ آیات ۲۳-۳۰

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ اوپر کے پیرے میں قریش کو یہ دھمکی جو دی ہے کہ ہدایت کے آجانے کے بعد اگر وہ اس پر ایمان نہ لائے تو لازماً وہ اس دنیا میں بھی خدا کے عذاب سے دوچار ہوں گے

اور آخرت میں بھی ان کو عذاب سے سابقہ پیش آئے گا۔ آگے کی آیات میں اسی حقیقت کو تاریخ کی روشنی میں مبرہن کیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو بشارت دی ہے کہ اگر وہ ثابت قدم رہے تو بالآخر کامیابی انہی کو حاصل ہوگی —— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۳-۳۰

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَلَا تَكُن فِي مِرْيَةٍ مِّن لِّقَائِهِ وَ
جَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿٢٣﴾ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ
بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا ۖ وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ ﴿٢٤﴾ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ
بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿٢٥﴾ أَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ
كَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَبْلِهِم مِّنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسَاكِنِهِمْ ۚ
إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ ۚ أَفَلَا يَسْمَعُونَ ﴿٢٦﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ
الْمَاءَ إِلَى الْأَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا تَأْكُلُ مِنْهُ أَنْعَامُهُمْ
وَأَنفُسُهُمْ ۚ أَفَلَا يُبْصِرُونَ ﴿٢٧﴾ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْفَتْحُ
إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٨﴾ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنفَعُ الَّذِينَ
كَفَرُوا إِيمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿٢٩﴾ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانتَظِرْ
إِنَّهُم مُّنتَظِرُونَ ﴿٣٠﴾ ع ۳ ۸ ۱۶

ترجمہ آیات ۲۳-۳۰

اور ہم نے موسیٰ کو بھی کتاب عطا کی تھی تو تم اس یوم موعود کے ظہور کے باب میں کسی شک میں نہ رہو۔ اور ہم نے اس کو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا اور ہم نے ان میں پیشوا اٹھائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے جب کہ انھوں نے ثابت قدمی دکھائی۔ اور وہ ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے۔ بے شک تیرا رب ہی قیامت کے دن ان کے درمیان ان چیزوں کے باب میں فیصلہ کرے گا جن میں یہ اختلاف

کرتے رہے ہیں۔ ۲۳-۲۵

کیا ان کے لیے یہ چیز ہدایت دینے والی نہ بنی کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چھوڑا جن کی بستیوں میں یہ چلتے پھرتے ہیں۔ بے شک ان کے اندر بہت سی نشانیاں ہیں۔ تو کیا یہ لوگ سنتے سمجھتے نہیں! ۲۶

کیا انھوں نے دھیان نہیں کیا کہ ہم پانی کے بادلوں کو چٹیل زمین کی طرف ہانک کرلے جاتے ہیں پس اس سے کھیتی اگاتے ہیں جس سے ان کے چوپائے بھی کھاتے ہیں اور وہ خود بھی تو کیا انھیں سجھائی نہیں دے رہا ہے! ۲۷

اور وہ پوچھتے ہیں کہ یہ فیصلہ کا دن کب ظہور میں آئے گا اگر تم سچے ہو! کہہ دو کہ فیصلہ کے دن ان لوگوں کا ایمان نفع نہیں دے گا جنھوں نے کفر کیا ہوگا اور نہ ان کو اس کے بعد مہلت ہی دی جائے گی۔ تو ان سے اعراض کرو اور منتظر رہو یہ بھی منتظر ہی ہیں۔ ۲۸-۳۰

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاۗىِٕهٖ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۚ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ڜ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ (۲۳-۲۴)

'الکتاب' سے مراد تورات ہے

'اَلْكِتٰب' سے مراد تورات ہے۔ جن لوگوں نے اس کو جنس کتاب کے مفہوم میں لیا ہے ان کی رائے قرآن کی تصریح کے خلاف ہے۔ 'وَجَعَلْنٰهُ' میں ضمیر کا مرجع بہرحال یہی کتاب ہے اور اس کی تعریف یہ بیان ہوئی ہے کہ اس کو ہم نے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا۔ اس تعریف نے خود متعین کر دیا کہ یہ لفظ جنس کتاب کے مفہوم میں نہیں بلکہ تورات کے لیے استعمال ہوا ہے۔

'من لقاءہ' میں ضمیر کا مرجع یوم عذاب ہے

'مِنْ لِّقَاۗىِٕهٖ' میں ضمیر کا مرجع سیاق و سباق دلیل ہے کہ 'اَلْكِتٰب' نہیں بلکہ وہ یوم انتقام یا یوم عذاب ہے جس کی دھمکی اوپر کی آیات ۲۱-۲۲ میں دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی اور اس کی تکذیب کرنے والوں کو ہم نے اس دنیا میں بھی عذاب دیا اور آخرت میں بھی ان کو عذاب دیں گے۔ اسی طرح ہم نے تمھارے ذریعے سے جو کتاب اتاری ہے اس کی تکذیب کرنے والوں

کو بھی ہم دنیا اور آخرت دونوں میں سزا دیں گے۔

'فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ' یعنی اس یوم انتقام اور یوم عذاب کے ظہور کے باب میں تم کسی شک میں نہ رہو۔ یہ فیصلہ کی گھڑی آکے رہے گی۔ اس جملہ کا خطاب اگرچہ ظاہر الفاظ کے اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس میں جو وعید ہے اس کا رُخ مخالفین و مکذبین کی طرف ہے، گویا بات ان سے منہ پھیر کر کہی گئی ہے۔

رسول کی بعثت کا ایک لازمی تقاضا

یہ بات ہم جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ رسول کی بعثت اور کتاب کے نزول کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ جو لوگ اس کی تکذیب کریں وہ دنیا و آخرت دونوں میں اس کی سزا پائیں۔ اسی حقیقت کو اسی اختصار و جامعیت کے ساتھ دوسرے مقام میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ
وَجَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ۚ
فَقُلْنَا اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَا ۭ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ۝
(الفرقان: ۳۵ - ۳۶)

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور اس کے ساتھ اس کے بھائی ہارون کو اس کا وزیر بنایا اور ان کو حکم دیا کہ تم دونوں ان لوگوں کے پاس جاؤ جنھوں نے ہماری نشانیوں کی تکذیب کی ہے۔ پس ہم نے ان کو پامال کر کے رکھ دیا۔

یہی مضمون سورۂ مومنون میں یوں آیا ہے:

فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ۝
وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ
لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝
(المؤمنون: ۴۸ - ۴۹)

پس ان دونوں کی (موسیٰ اور ہارون کی) انھوں نے تکذیب کر دی اور ہلاک ہونے والوں میں سے بنے اور ہم نے موسیٰ کو کتاب سے نوازا کہ وہ ہدایت پانے والے بنیں۔

یہی بات، ایک کلیہ کے طور پر تمام رسولوں سے متعلق بھی ارشاد ہوئی ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا
اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ
فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ۭ وَكَانَ حَقًّا
عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (الروم: ۴۷)

اور ہم نے تم سے پہلے بھی رسول بھیجے ان کی قوموں کی طرف تو وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے۔ بالآخر ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جو جرم کے مرتکب ہوئے اور اہل ایمان کی مدد ہم پر واجب ہے۔

ان نظائر کی روشنی میں آیت زیر بحث پر غور کیجیے تو اس کا ہر جزو پوری طرح واضح ہو جائے گا۔ ہمارے مفسرین نے اس کو چونکہ اس کے سیاق و سباق اور اس کے شواہد کی روشنی میں نہیں دیکھا اس وجہ سے اس کی تاویل میں ان کو بڑی الجھن پیش آئی ہے۔

کتاب سے فائدہ اٹھانے والے

'وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ' یعنی تورات کے مکذبین تو اس انجام سے دوچار ہوئے جو کتاب الٰہی

کے مکذبین کے لیے ازل سے مقدر ہے البتہ بنی اسرائیل کے لیے۔ جنھوں نے اس کو قبول کیا، اللہ تعالیٰ نے اس کو صحیفۂ ہدایت بنایا۔ بدقسمتوں نے اس سے ٹھوکر کھائی اور جنھوں نے اس کی قدر کی انھوں نے اسی سے ہدایت حاصل کی۔ اوپر سورۂ مومنون کی جس آیت کا حوالہ گزرا ہے اس پر بھی، ایک نظر ڈال لیجیے۔

کتاب کا ثمرہ

'وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا' یہ اس کتاب کا ثمرہ بیان ہوا ہے کہ اس کی بدولت اللہ تعالیٰ نے ان کو قوموں کی پیشوائی اور قیادت کے منصب پر سرفراز فرمایا اور ان کے اندر ایسے رہنما اٹھائے جو لوگوں کی رہنمائی اللہ تعالیٰ کے حکم سے کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قیادت و امامت، کتاب الٰہی کے لازمی ثمرات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ جس قوم کو اپنی کتاب سے سرفراز فرماتا ہے وہ جب تک اس کتاب پر قائم رہتی ہے اس کو قوموں کی امامت حاصل رہتی ہے اور اس کے دشمن اس کے آگے ذلیل و پامال ہوتے ہیں۔

امامت و قیادت کے اوصاف

'يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا' یہ اس امامت کے شرائط و اوصاف بیان ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی کتاب عطا کی تھی اس وجہ سے وہ اللہ کے حکم کے مطابق ہی لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ بغل میں تو اللہ کی کتاب ہو اور آگے پیروی کے لیے سنتِ ابلیس ہو۔

'لَمَّا صَبَرُوا' یہ اس بنیاد کا ذکر ہے جس پر ساری شریعت قائم ہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی شریعت کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کی توفیق انھوں نے اس وقت تک پائی جب تک وہ شریعت پر خوف و طمع سے بے نیاز ہو کر، جمے رہے۔

'وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ' یہ ان کے صبر کی اساس و بنیاد کی طرف اشارہ ہے کہ ان کو اللہ کی آیات پر پختہ یقین تھا اور وہ جزا و سزا پر مضبوط عقیدہ رکھتے تھے۔ اس وجہ سے وہ صبر کے اس امتحان میں پورے اترے۔

ان آیات پر تدبر کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ان میں مسلمانوں کے لیے بشارت اور مستقبل کی عظیم ذمہ داریوں کی یاد دہانی بھی ہے اور وقت کے یہود پر تعریض بھی کہ وہ کیا بنائے گئے تھے اور اب کیا بن کے رہ گئے ہیں!

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ (٢٥)

یعنی اس دنیا کے بعد ان کا معاملہ خدا کی اخروی عدالت میں بھی پیش ہو گا اور وہ ان تمام چیزوں کے باب میں آخری فیصلہ فرمائے گا جن میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔ 'فیصلہ فرمائے گا' سے مقصود اس کا نتیجہ ہے کہ اس دن یہ اپنے اس اختلاف و نزاع کی سزا بھگتیں گے۔

أَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسَاكِنِهِمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ ۚ أَفَلَا يَسْمَعُونَ (٢٦)

پچھلی قوموں کی طرف اجمالی اشارہ

حضرت موسیٰؑ کے مخالفین کے انجام کی طرف خاص طور پر اشارہ کرنے کے بعد یہ پچھلی قوموں کی طرف بھی اجمالاً اشارہ کر دیا کہ کیا ان کی رہنمائی کے لیے یہ چیز کافی نہیں ہوئی کہ ان سے پہلے ہم کتنی قوموں کو رسولوں کی تکذیب کے جرم میں ہلاک کر چکے ہیں جن کی بستیوں میں یہ چلتے پھرتے ہیں۔ یہ اشارہ عاد و ثمود اور قوم لوط وغیرہ کی طرف ہے جن کی سرگزشتیں پچھلی سورتوں میں بیان ہو چکی ہیں۔ قریش اپنے تجارتی سفروں میں ان قوموں کی برباد بستیوں پر سے برابر گزرتے تھے۔ 'اَوَلَمۡ یَھۡدِ لَھُمۡ' کے اسلوب کلام سے یہ بات نکلتی ہے کہ آخر یہ اپنے ہی ملک کی تاریخ سے سبق کیوں نہیں لیتے! کیوں یہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ ان پر گزرا وہی کچھ ان پر بھی گزر جائے!

'اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ'۔ یعنی ان سرگزشتوں کے اندر نشانیاں ہیں۔ اگر یہ لوگ کچھ عقل رکھتے ہیں تو انھیں ان نشانیوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

—— پہلی نشانی اس کے اندر اس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو اپنی کتاب اور اپنے رسول کے ذریعے سے یاددہانی کرتا ہے اگر وہ اس سے اعراض کرتے ہیں تو وہ مجرم قرار پاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے ضرور انتقام لیتا ہے۔

—— دوسری نشانی اس کے اندر یہ ہے کہ اس قسم کے مجرموں کو اللہ تعالیٰ اس دنیا میں بھی عذاب دیتا ہے اور اس کے بعد آخرت میں بھی ان کو عذاب دے گا۔

—— تیسری نشانی یہ ہے کہ مجرموں کو سزا دینے کے بعد اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو قیادت و امامت کے منصب پر سرفراز فرماتا ہے جو پورے استقلال کے ساتھ حق کا ساتھ دیتے ہیں۔

'اَفَلَا یَسۡمَعُوۡنَ'۔ یعنی کیا یہ لوگ ان قوموں کی سرگزشتیں سنتے نہیں! مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی تذکیر و تعلیم ہی کی خاطر قرآن نے ان قوموں کی سرگزشتیں نہایت تفصیل کے ساتھ، ان کے نتائج و عبر کی وضاحت کرتے ہوئے سنائی ہیں۔ اگر اب بھی یہ اپنے کان بند کیے ہوئے ہیں تو ان کی بدقسمتی پر افسوس ہے! 'سننا' یہاں سمجھنے اور عبرت حاصل کرنے کے مفہوم میں ہے اس لیے کہ اصل سننا درحقیقت وہی ہے۔ گویا فعل یہاں اپنے حقیقی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا نَسُوۡقُ الۡمَآءَ اِلَی الۡاَرۡضِ الۡجُرُزِ فَنُخۡرِجُ بِہٖ زَرۡعًا تَاۡکُلُ مِنۡہُ اَنۡعَامُھُمۡ وَاَنۡفُسُھُمۡ ؕ اَفَلَا یُبۡصِرُوۡنَ (۲۷)

'الماء' سے یہاں مراد چونکہ پانی والے بادل ہیں اس وجہ سے اس کے لیے لفظ 'نسوق' کا استعمال موزوں ہوا۔ 'ارض جرز' چٹیل اور بنجر زمین کو کہتے ہیں۔

ؔ حضرت موسیٰؑ کے ذکر کی خصوصیت کے وجوہ پر ہم دوسرے مقام میں مفصل گفتگو کر چکے ہیں۔

آخرت کے دلائل کی طرف اشارہ

اوپر کی آیات میں ان تاریخی آثار و واقعات کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس دنیا میں خدا کے قانون مجازات کے شاہد ہیں۔ اب یہ آخرت کی طرف توجہ دلائی کہ اس کے وقوع کو بھی بعید از امکان نہ سمجھو، وہ بھی واقع ہو کے رہے گی اور اس دن اللہ تعالیٰ اپنا آخری فیصلہ صادر فرمائے گا۔ فرمایا کہ کیا یہ لوگ خدا کی اس قدرت و ربوبیت کو نہیں دیکھتے کہ ہم پانی سے بوجھل بادلوں کو ہانک کر چٹیل زمینوں کی طرف لے جاتے ہیں اور پھر اس پانی سے مختلف قسم کی فصلیں اُگاتے ہیں جو ان کے مویشیوں کے کام بھی آتی ہیں اور خود ان کے کام بھی!

'اَفَلَا یُبْصِرُوْنَ'۔ اوپر کی آیت میں ان کو عدم سماعت پر ملامت کی ہے۔ یہ ان کی عدم بصارت پر ملامت ہے کہ جس طرح ان کے کان بہرے ہو چکے ہیں اسی طرح ان کی آنکھوں کی بصارت بھی سلب ہو چکی ہے۔ یہ اس زمین کو مردہ اور زندہ ہوتے آئے دن دیکھتے ہیں لیکن پھر بھی یہ اس شک میں مبتلا ہیں کہ خدا ان کو اس سے دوبارہ اٹھا سکنے پر قادر نہیں ہے۔

اس آیت پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور ربوبیت کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔ اور یہ دونوں صفتیں قیامت کے وقوع اور اس کی ضرورت کی نہایت واضح دلیلوں میں سے ہیں۔ ان کی وضاحت پچھلی سورتوں کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔

وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی ھٰذَا الْفَتْحُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۲۸)

یعنی ان لوگوں کی بے بصیرتی اور بلادت کا حال یہ ہے کہ تاریخ اور آفاق کے ان سارے شواہد و آثار کی طرف جب ان کو توجہ دلائی جاتی ہے تو طنز و استہزاء کے انداز میں یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر سچ مچ اسی طرح کے فیصلہ کا کوئی دن آنا ہے اور تم لوگ اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو وہ آخر آ کیوں نہیں جاتا! مطلب یہ ہوا کہ وہ کسی چیز کو دلائل و شواہد کی روشنی میں ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں بلکہ اس وقت مانیں گے جب آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

قُلْ یَوْمَ الْفَتْحِ لَا یَنْفَعُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِیْمَانُھُمْ وَلَا ھُمْ یُنْظَرُوْنَ (۲۹)

یہ ان کے مطالبے کا جواب ہے کہ اگر وہ فیصلے کے دن کو دیکھ کر ایمان لانا چاہتے ہیں تو ان کو بتا دو کہ اس کے ظہور کے بعد ایمان لانا کسی کے لیے کچھ نافع نہیں ہو گا اور اس کے بعد کسی کو اس بات کی مہلت بھی نہیں دی جائے گی کہ وہ توبہ و اصلاح کر کے تلافیٔ مافات کر سکے۔ 'یوم الفتح' سے مراد فیصلہ کا دن ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے اپنی قوموں کو دو عذابوں سے آگاہ کیا ہے۔ ایک قیامت کے عذاب سے، دوسرے اس عذاب سے جو رسول کی تکذیب کی صورت میں قوم پر فیصلہ کن عذاب کی شکل میں آتا ہے۔ اوپر جو سنتِ الٰہی بیان ہوئی ہے وہ ان دونوں ہی صورتوں سے متعلق ہے۔ جس طرح قیامت کے ظہور کے بعد کسی کا ایمان نافع نہیں ہو گا اسی طرح فیصلہ کن عذاب کے ظہور کے بعد بھی کسی کا ایمان نافع نہیں ہو گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول صرف وہ ایمان ہے جو عقل و بصیرت کی رہنمائی میں، اختیار و ارادہ کی آزادی کے ساتھ، لایا گیا ہو۔ مجبورانہ ایمان کی اس کے ہاں کوئی وقعت نہیں ہے۔ اگر مجبورانہ ایمان اس کو پسند ہوتا تو، جیسا کہ دوسرے مقام میں فرمایا ہے، وہ سب کو ایمان ہی پر پیدا کرتا۔ اس کے لیے ایسا کرنا ذرا بھی مشکل نہیں تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔

فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانتَظِرْ إِنَّهُم مُّنتَظِرُونَ (۳۰)

یہ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہے کہ اگر یہ لوگ فیصلہ کا دن دیکھنے ہی کے لیے مچلے ہوئے ہیں تو اب ان سے کوئی مزید بحث و گفتگو بالکل بے سود ہے۔ اب ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ اور تم بھی اسی فیصلہ کے دن کا انتظار کرو جس کے یہ منتظر ہیں۔ اللہ نے جتنی مہلت ان کے لیے مقدر کی ہے اس کے پورے ہو جانے کے بعد یہ گھڑی آ جائے گی۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ۔

ہفتہ۔ ۹ بجے دن
۱۷ / اگست ۱۹۷۴ء
رحمان آباد

تدبّرِ قرآن

۳۳

الاحزاب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود، گروپ کے ساتھ اس کا تعلق اور زمانۂ نزول

جس طرح سورۂ نور اپنے گروپ کے آخر میں پورے گروپ کے تکملہ و تتمہ کی حیثیت رکھتی ہے اسی طرح سورۂ احزاب اپنے پورے گروپ کا جو فرقان سے شروع ہوا ہے، تکملہ و تتمہ ہے۔ یہ گروپ جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، قرآن و رسالت کے اثبات میں ہے۔ اس تعلق سے اس سورہ میں چند باتیں خاص طور پر نمایاں ہوئی ہیں۔

— آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بحیثیت رسول جو ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی گئی تھی اس کی وضاحت اور بے خوف لومۃ لائم اس کو ادا کرنے کی تاکید۔

— انبیاء و رسل کے طبقہ کے اندر آپ کو جو امتیاز خاص اور جو مرتبہ و مقام حاصل ہے اس کا بیان۔

— امت کے ساتھ آپ کے تعلق کی نوعیت اور امت پر آپ کے حقوق اور ان کے مقتضیات کی وضاحت۔

— حضورؐ کی ازواج مطہراتؓ کا درجہ امت کے اندر اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے تعلق کی مخصوص نوعیت۔

— اس عظیم امانت کا حوالہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان پر ڈالی گئی ہے اور جس کی وضاحت کے لیے اللہ نے اپنی کتاب نازل فرمائی ہے۔ اس عظیم ذمہ داری کے حقوق و فرائض کی یاددہانی۔

یہ سورہ اس دور میں نازل ہوئی ہے جب منافقین و منافقات نے قرآن کی بعض اصلاحات کو بہانہ بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پراپیگنڈے کی ایک نہایت مکروہ مہم چلا رکھی تھی۔ یہاں تک کہ ازواج مطہراتؓ کے ذہن کو بھی انھوں نے مسموم کرنے کی کوشش کی۔ اس میں ان فتنوں کی طرف بھی اشارات ہیں جو منافقین نے غزوہ احزاب کے دوران، جو ۵ھ میں واقع ہوا، مسلمانوں کو بددل کرنے کے لیے اٹھائے تھے۔ اسی سلسلہ میں حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے واقعہ کی اصل نوعیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس لیے کہ اس واقعہ کو بھی واقعۂ افک کی طرح جس کا ذکر سورۂ نور میں گزر چکا ہے، منافقین نے فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنا لیا تھا۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کی تاکید کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر جو کچھ نازل کیا جاتا ہے بے خوف لومۃ لائم اس کی تبلیغ کریں اور کفار و منافقین کے مخالفانہ غوغا کی مطلق پروا نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا مددگار و کارساز ہے، اسی پر بھروسہ رکھیں۔

(۴-۶) ظہار اور منہ بولے بیٹے کے معاملے میں رسومِ جاہلیت کی اصلاح کہ ان رسوم کو عقل و فطرت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مخالفین اس اصلاح کے خلاف کتنا ہی ہنگامہ اٹھائیں، ان کے شور و غوغا کی کوئی پروا نہ کی جائے۔ یہ لوگوں کی من گھڑت، بدعات ہیں۔ اللہ تعالیٰ معاشرتی زندگی کو ان تضادات سے پاک کر کے اس کو فطرت کی صحیح راہ پر لانا چاہتا ہے۔ مسلمانوں کو اس بات کی ہدایت کہ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں سے منسوب کرو۔ اگر ان کے باپوں کا علم نہ ہو تو ان کو اپنے موالی کے درجہ میں رکھو، اپنے صلبی بیٹوں کا درجہ دینے کی کوشش نہ کرو۔ اب تک رسومِ جاہلیت کے زیرِ اثر جو کچھ ہوا ہے اس سے اللہ تعالیٰ نے درگزر فرمایا لیکن اب، اس وضاحت کے بعد، اس کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ اسلامی معاشرے میں سب سے اونچا درجہ اور سب سے بڑا حق نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہے۔ اور ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) کا درجہ امہات المومنین کا ہے۔ باقی اولوالارحام کا باہمی ترتیب و لحاظ اس قانون کے مطابق ہے جو اللہ نے اپنی کتاب میں بیان کر دیا ہے۔

(۷-۸) اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر نبی سے اس بات کا مضبوط عہد کر لیا ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ کے دین کی دعوت دیں۔ اس معاملہ میں نہ کسی کا پاس و لحاظ کریں نہ کسی کی مخالفت کی پروا تاکہ یہ چیز کھرے اور کھوٹے، مخلص اور منافق کے درمیان امتیاز کی کسوٹی بنے اور ہر شخص اپنے عمل کے مطابق جزا یا سزا پائے۔

(۹-۲۷) غزوۂ احزاب کے واقعات پر اجمالی تبصرہ جس سے مقصود مسلمانوں کے اندر اس اعتماد علی اللہ اور توکل کو راسخ کرنا ہے جس کی تعلیم پہلی آیت میں دی گئی ہے۔ باوجودیکہ کفار اپنی تمام پارٹیوں کی مجتمع قوت کے ساتھ، مدینہ پر پل پڑے تھے اور منافقین نے بھی اپنی ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے مسلمانوں کے قدم اکھاڑ دینے کے لیے پورا زور لگایا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی غیبی فوجوں سے مسلمانوں کی مدد کی اور دشمنوں کو ذلیل و خوار ہو کر پسپا ہونا پڑا۔ اسی طرح اگر مسلمان مخالفوں کی مخالفت کے علی الرغم اللہ کے دین پر قائم اور اس کے رسول کے وفادار و جاں نثار رہے تو اللہ تعالیٰ ہر محاذ پر ان کی مدد فرمائے گا۔

(۲۸-۳۵) مسلمانوں کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر مجتمع کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو خطاب کر کے ان پر ان کی منصبی ذمہ داریاں واضح فرمائی گئی ہیں کہ رسول کے ساتھ نسبت رکھنے کے سبب سے ان کے درجے بھی بہت اونچے ہیں۔ اگر وہ اپنی ذمہ داریاں ادا کریں گی اور ان کے لیے سزا بھی بڑی ہی سخت ہے اگر ان سے کوئی حکم عدولی صادر ہوئی۔ ان کا اصلی فریضہ پیغمبر کی اطاعت و وفاداری اور اس کتاب و حکمت کی روشنی کو پھیلانا ہے جس کی تعلیم ان کو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مل رہی ہے۔ اس وجہ سے ان کے شایانِ شان بات یہ ہے کہ وہ وقار کے ساتھ اپنے گھروں میں بیٹھیں اور ان منافقین و منافقات کے اثر سے اپنے کو بچائیں جو ان کی کریم النفسی سے فائدہ اٹھا کر ان کے دلوں میں محبتِ دنیا کی تخم ریزی کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اہلِ بیتِ نبوت کو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک اور صرف کتاب و حکمت کی تعلیم و دعوت کے لیے خاص رکھے۔

(۳۶-۴۰) حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے واقعہ کی طرف ایک اجمالی اشارہ جس میں سب سے پہلے یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ جب کسی معاملہ میں اللہ و رسول کوئی فیصلہ صادر فرما دیں تو کسی مومن یا مومنہ کے لیے اس میں کسی چون و چرا کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ اللہ و رسول کا حق سب سے بڑا ہے۔ اس کے بعد حضرت زیدؓ کے واقعہ کا حوالہ ہے کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت زینبؓ کے ساتھ ان کا نکاح کر کے ان کی عزت افزائی چاہی لیکن وہ نباہ نہ کر سکے اور آپ کی طرف سے بامرار روکے جانے کے باوجود انھوں نے طلاق دے چھوڑی۔ یہ نکاح حضورؐ ہی نے کرایا تھا جس کے بعد منافقین اور منافقات برابر حضرت زینبؓ کو یہ طعنہ دیتے رہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ سخت ظلم کیا ہے کہ ایک معزز گھرانے کی خاتون کا عقد ایک آزاد کردہ غلام سے کر دیا ہے۔ ان طعنوں کے باوجود حضرت زینبؓ نہایت صبر و شکر کے ساتھ حضرت زیدؓ کے ساتھ نباہ کرتی رہیں۔ لیکن حضرت زیدؓ نے محض اپنے ذاتی احساس کی بنا پر، جس کی تفصیل تفسیر میں آئے گی، ان کو طلاق دے دی۔ اس سے فطری طور پر حضرت زینبؓ کو مزید صدمہ پہنچا۔ ان کے اس زخم کے اندمال کی واحد شکل آپ کو یہ نظر آئی کہ آپؐ خود ان کو اپنے حبالۂ عقد میں لے لیں لیکن اس سے ایک اور فتنہ کے اٹھ کھڑے ہونے کا اندیشہ تھا۔ حضرت زیدؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنیٰ کی حیثیت سے متعارف تھے اور متبنیٰ عرب جاہلیت میں حقیقی بیٹوں کی منزلت میں سمجھا جاتا تھا۔ حضرت زینبؓ کے ساتھ آپ کے نکاح کو مخالفین فتنہ انگیزی کا ذریعہ بناتے کہ اس شخص نے اول تو ایک شریف زادی کا نکاح اپنے ایک آزاد کردہ غلام سے کیا جس کو اپنا متبنیٰ بنا رکھا تھا اور اب اپنے متبنیٰ کی بیوی سے خود نکاح رچا لیا۔ علاوہ ازیں ازواج کے باب میں چار تک کی تحدید کا حکم نازل ہو چکا تھا اس وجہ سے بھی آپ اس معاملے میں متردد رہے لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی ہوا کہ آپ ان تمام اندیشوں سے بے پروا ہو کر یہ نکاح کر لیں تاکہ آپ کے عمل سے جاہلیت کی اس رسم بد کی اصلاح ہو۔

(۴۱-۴۸) مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رکھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی شکل میں اللہ تعالیٰ کی عظیم رحمت ان پر نازل ہوئی تاکہ انھیں کفر و شرک کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان و اسلام کی روشنی میں آنا نصیب ہو۔ اگر اس روشنی کی انھوں نے قدر کی تو ان کو دنیا اور آخرت دونوں کی سعادت حاصل ہوگی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے آپؐ کے فریضۂ منصبی کی یاد دہانی کہ آپ خلق کے لیے اللہ کے دین کی شہادت دینے والے ہیں، جو اس کو قبول کریں ان کو جنت کی بشارت دیں، جو اس کو رد کریں ان کو دوزخ سے آگاہ کر دیں۔ آپؐ اللہ کے داعی اور خلق کو کفر و شرک کی تاریکیوں سے نکالنے کے لیے چراغ ہدایت ہیں۔ اس فرض کی ادائیگی میں آپ برابر سرگرم رہیں۔ کفار و منافقین کی مخالفتوں اور ان کی ایذا رسانیوں کو خاطر میں نہ لائیں۔

(۴۹-۵۲) اس امر کا اعلان کہ آپ کی تمام ازواج آپ کے لیے جائز ہیں۔ آپ پر چار کی قید اور دو

پابندیاں نہیں ہیں جو عام امت کے لیے قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔ البتہ بعض دوسری پابندیاں ہیں جو عام امت پر نہیں ہیں۔ اس خصوصیت کے بعض مصالح کی طرف اشارہ۔ ازواج نبی صلعم کو اس فیصلۂ الٰہی کی تعمیل کی ہدایت۔ منافقین کو تنبیہ کہ وہ ازواج نبی (رضی اللہ عنہم) کے معاملے میں ریشہ دوانیاں کر کے پیغمبر صلعم کے لیے اذیت کا سبب نہ بنیں۔

(۵۳-۶۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں بدون اجازت داخل ہونے کی ممانعت۔ گھروں سے باہر نکلنے کی صورت میں آپ کی ازواج اور عام مسلمان خواتین کے لیے پردے کی ہدایت تاکہ منافقین کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی اور مسلمان خواتین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کا کوئی موقع نہ ملے۔ اس سلسلہ میں منافقین کو یہ آخری دھمکی کہ اگر وہ اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے تو بہت جلد ان کے قلع قمع کے لیے آخری ہدایات نازل ہو جائیں گی اور پھر ان کو کہیں پناہ نہیں ملے گی۔

(۶۳-۷۳) خاتمۂ سورہ جس میں پہلے قیامت کی یاد دہانی ہے کہ اس کو بہت دور نہ سمجھو۔ وہ سر پر آئی کھڑی ہے۔ اس دن کوئی کسی کے کام آنے والا نہ بنے گا۔ گمراہ لیڈر اور گمراہ پیرو سب ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے۔

منافقین کو تنبیہ کہ ان یہود کی روش کی تقلید نہ کرو جنھوں نے موسیٰ کو قدم قدم پر ایذا دی۔ بالآخر اللہ نے موسیٰ کو عزت و وقار سے اٹھایا اور ان لوگوں پر لعنت کر دی جنھوں نے ان کو ایذا دی۔ صحیح روش یہ ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور رسول کی ہر بات، پر 'سمعنا واطعنا' کہو۔ اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال کو سدھارے گا، تمھارے گناہوں کو بخشے گا۔ یہی راہ فوز عظیم کی راہ ہے۔

آخر میں اس عظیم عہد و امانت کی یاد دہانی جس کا اہل تمام مخلوقات میں سے صرف انسان بنایا گیا ہے۔ اسی عہد و امانت پر انسان کے تمام شرف کا انحصار ہے۔ اگر وہ اس کے حقوق ادا کر سکے تو اس سے زیادہ اونچا کوئی نہیں اور اگر وہ اس میں ناکام ہو جائے تو پھر اس سے بڑا بدقسمت بھی کوئی نہیں۔

سُوْرَةُ الْاَحْزَابِ (۳۳)

مَدَنِيَّةٌ ———— اٰيَاتُهَا ۷۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ؕ آيات
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱﴾ وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ ۱ - ۸
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۲﴾ وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ
كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۳﴾ مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ
جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ
وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ؕ
وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ ﴿۴﴾ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ
هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِى
الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ؕ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ
وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵﴾
اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ
وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

وَالْمُهٰجِرِيْنَ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا ۭ كَانَ ذٰلِكَ
فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝ وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّـبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَ
مِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا
مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝ لِّيَسْــَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ
وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ ع ۱

ترجمہ آیات ۱-۸

اے نبی، اللہ سے ڈرو اور کافروں اور منافقوں کی باتوں پر کان نہ دھرو بے شک اللہ علیم و حکیم ہے۔ اور پیروی کرو اس چیز کی جو تم پر تمہارے رب کی جانب سے وحی کی جا رہی ہے بے شک اللہ ان تمام چیزوں سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔ اور اللہ پر بھروسہ رکھو اور بھروسے کے لیے اللہ کافی ہے۔ ۱-۳

اللہ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں رکھے اور نہ تمہاری ان بیویوں کو جن سے تم ظہار کر بیٹھتے ہو تمہاری مائیں بنایا اور نہ تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے بیٹے بنا دیا۔ یہ سب تمہارے اپنے منہ کی باتیں ہیں اور اللہ حق کہتا ہے اور وہ صحیح راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت کے ساتھ پکارو۔ یہی اللہ کے نزدیک قرین عدل ہے اور اگر تم کو ان کے باپوں کا پتہ نہ ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی اور تمہارے شریک قبیلہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس باب میں تم سے جو غلطی ہوئی اس پر تم سے کوئی مواخذہ نہیں، البتہ تمہارے دلوں نے جس بات کا عزم کر لیا اس پر مواخذہ ہے۔ اور اللہ غفور رحیم ہے۔ ۴-۵

اور نبی کا حق مومنوں پر خود ان کے اپنے مقابل میں اولیٰ ہے اور ازواجِ نبی کی حیثیت

مومنین کی ماؤں کی ہے اور رحمی رشتے رکھنے والے آپس میں، دوسرے مومنین و مہاجرین کے مقابل، اَولیٰ ہیں، اللہ کے قانون میں۔ یہ اور بات ہے کہ تم اپنے اولیاء و اقرباء کے ساتھ کوئی حسنِ سلوک کرنا چاہو۔ یہ چیز کتاب میں نوشتہ ہے۔ ۶

اور یاد کرو، جب ہم نے نبیوں سے ان کے عہد لیے اور تم سے بھی اور نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی، اور ہم نے ان سے نہایت محکم عہد لیا تاکہ اللہ راست بازوں سے ان کی راست بازی کی بابت سوال کرے (اور کافروں اور منافقوں سے ان کے کفر و نفاق کی نسبت)، اور کافروں کے لیے اللہ نے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۷-۸

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰہَ وَلَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ ط اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا (۱)

خطاب کی نوعیت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہاں 'یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ' سے جو خطاب فرمایا ہے یہ محض تعظیم و تکریم کے لیے نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے۔ بلکہ یہ لفظ آپ کے فریضۂ منصبی کی یاددہانی کے لیے یہاں استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ اللہ کے نبی و رسول ہیں اس وجہ سے آپ کو صرف اپنے رب کی پروا ہونی چاہیے۔ آپ صرف اللہ سے ڈریں، کافروں اور منافقوں کی مخالفتوں سے بالکل بے پروا ہو کر لوگوں کو اللہ کی بات پہنچائیں۔ اسی طرح کا خطاب سورۂ مائدہ میں گزر چکا ہے: 'یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ' (المآئدۃ: ۶۷) (اے رسول، تم اچھی طرح لوگوں کو وہ چیز پہنچا دو جو تم پر تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے)۔

'وَلَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ': آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تنبیہ و تاکید اس لیے نہیں فرمائی گئی کہ خدانخواستہ اس بات کا کوئی اندیشہ تھا کہ آپ کفار و منافقین کی باتوں سے متاثر یا مرعوب ہو جائیں گے بلکہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے مخالفین کو تنبیہ کی گئی ہے کہ یہ اشرار کتنا ہی زور لگائیں اور کتنے ہی فتنے اٹھائیں لیکن تم ان کی باتوں پر ذرا کان نہ دھرنا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ آگے بعض ایسی باتوں کا ذکر آ رہا ہے جن کو کفار و منافقین نے آپ کے خلاف فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنا لیا تھا۔

کفار اور منافقین کا باہمی رشتہ

یہاں کفار و منافقین کا ایک ساتھ ذکر اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ یہ دونوں اصلاً ایک ہی

چھپے بیٹھے ہیں۔ اسلام دشمنی میں دونوں متحد ہیں۔ فرق ہے تو یہ ہے کہ ایک کھلم کھلا مخالفت کرتا ہے دوسرا اسلام کا کلمہ پڑھتے ہوئے، مسلمانوں کے اندر گھس کر، اسلام کی بیخ کنی کی کوشش کرتا ہے۔ اس وجہ سے انجام کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے۔

توکل علی اللہ کی دلیل

'اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا': یہ اس بات کی دلیل ارشاد ہوئی ہے کہ کیوں پیغمبر کو اپنے رب کے سوا سب سے بے خوف و بے پروا ہو کر صرف اس بات کی تبلیغ و تعمیل کرنی چاہیے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ فرمایا کہ اللہ علیم و حکیم ہے۔ اس وجہ سے اس نے جس بات کا حکم دیا ہے وہی بات صحیح علم و حکمت پر مبنی ہے۔ اس کے خلاف لوگ جو بکواسیں کر رہے ہیں ان کی خرافات لائقِ اعتنا نہیں ہیں۔ آگے آیت ۳۹ اور آیت ۴۸ سے اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔

وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝ وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (۲-۳)

اوپر جو بات منفی اسلوب سے فرمائی گئی ہے وہی بات مثبت پہلو سے ارشاد ہوئی ہے کہ اشرار کی تمام شرانگیزیوں سے بالکل بے پروا ہو کر تم اس وحی کی پیروی کرو جو تمھارے رب کی جانب سے آتی ہے اور یہ اطمینان رکھو کہ تمھارے ہر اقدام و عمل سے اللہ اچھی طرح باخبر رہتا ہے۔ اس آیت میں پہلا خطاب واحد سے ہے اور دوسرا 'بِمَا تَعْمَلُوْنَ' جمع سے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو خطاب ہے یہ امت کے وکیل کی حیثیت سے ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ دین کے معاملے میں یہی روش مسلمانوں کو بھی اختیار کرنی چاہیے۔

'وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا': یعنی جب اللہ تعالیٰ کی ہر بات علم و حکمت پر بھی مبنی ہے اور وہ ہر چیز سے باخبر بھی ہے تو اسی پر بھروسہ رکھو اور اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ اعتماد اور بھروسہ کے لیے اللہ کافی ہے۔ اس کے ہوتے تمھیں کسی دوسرے سہارے کی احتیاج نہیں ہے۔ لفظ 'وکیل' کی وضاحت ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں کہ اس سے مراد وہ ذات ہے جس پر پورا اعتماد کر کے اپنے معاملات اس کے حوالہ کر دیے جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا مطالبہ بندوں سے یہی ہے کہ وہ خدا کے دیے ہوئے احکام کی ہر حال میں تعمیل کریں اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیں کہ اس راہ میں جو مشکلیں پیش آئیں گی ان سے عہدہ برآ ہونے کی وہ توفیق بخشے گا۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَاۗءَكُمْ اَبْنَاۗءَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ (۴)

اوپر کی تمہید کے بعد یہ بعض ایسے امور کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن میں قرآن کی اصلاحات کو کفار و منافقین

نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنا لیا تھا۔

فکر و ارادہ کا تضاد خلافِ فطرت ہے

'مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ'۔ یہ ٹکڑا بعد کی باتوں کے ذکر کے لیے بطور تمہید ہے۔ چونکہ یہ باتیں فکر و ارادہ کے تضاد کا مظہر ہیں اس وجہ سے ان کے ذکر سے پہلے نفس تضادِ ارادہ پر روشنی ڈالی کہ اللہ تعالیٰ کو اگر منظور ہوتا کہ انسان ہمیشہ متضاد و متناقض ارادوں کی کشمکش ہی میں گرفتار رہے تو اس کو دل بھی ایک سے زیادہ دیتا لیکن اس نے کسی شخص کے پہلو میں دو دل نہیں بنائے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس نے انسان کے لیے یہ پسند نہیں فرمایا کہ وہ دو بالکل متناقض ارادے اپنے اندر جمع کر رکھے۔ لیکن یہ انسان کی عجیب کج فہمی ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی ساخت کے بالکل خلاف وہ اپنے اندر متناقض ارادے جمع کر لیتا ہے۔ وہ خدا پر ایمان کا دعویٰ بھی رکھتا ہے اور ساتھ ہی دوسرے شریکوں کی بندگی بھی کرتا ہے۔ رسول سے اطاعت و وفاداری کا عہد بھی باندھتا ہے اور اس کے خلاف اس کے دشمنوں سے ساز باز اور اس کی تعلیمات کے خلاف سرگوشیاں اور سازشیں بھی کرتا ہے۔ حالانکہ اگر دل ایک ہے تو اس کے ارادوں میں تضاد و تناقض نہیں ہونا چاہیے بلکہ تمام ارادے بالکل ہم آہنگ و ہم رنگ ہونے چاہئیں۔ اگر معاملہ اس کے خلاف ہو تو یہ دل کی خرابی و بیماری کی دلیل ہے اور ہر عاقل کا فرض ہے کہ وہ اس خرابی کی اصلاح کر کے اپنے ارادوں میں ہم آہنگی پیدا کرے۔

تناقضِ فکر کی ایک مثال

'وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ'۔ اب یہ اس تضادِ فکر و ارادہ کی مثال کے طور پر ظہار کے معاملہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے ظہار کر بیٹھتا ہے تو اس کی بیوی اس کی ماں نہیں بن جاتی لیکن لوگوں نے زمانۂ جاہلیت میں اس طرح کی عورتوں کو ماؤں کی طرح محرمات میں شامل کر رکھا تھا۔ اب قرآن نے اس جاہلیت کی جو اصلاح کی تو منافقین و کفار جھاڑ کے کانٹوں کی طرح پیغمبر کے پیچھے پڑ گئے ہیں کہ جو عورتیں ماؤں کی طرح حرام ہیں اس شخص نے اپنے پیرووں کے لیے ان کو بھی جائز کر دیا۔

ظہار

'ظہار' عرب جاہلیت کی ایک اصطلاح ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے یہ کہہ بیٹھتا کہ اَنْتِ عَلَیَّ کَظَهْرِ اُمِّیْ (اب تو میرے اوپر میری ماں کی پیٹھ کی طرح حرام ہے) تو اس کی بیوی اس کے اوپر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی۔ اسی لفظ 'ظهر' سے جس کے معنی پیٹھ کے ہیں 'ظهار' کی اصطلاح پیدا ہو گئی لیکن اس کا اطلاق انہی الفاظ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ کوئی شخص اپنی بیوی کے کسی اور حصۂ جسم کو بھی بارادۂ تحریم اپنی محرمات میں سے کسی سے تشابہ قرار دے دے تو اس کا حکم بھی ظہار ہی کا ہوگا۔ عرب جاہلیت میں یہ صورت ایک طلاق مغلظہ کی تھی جس کے بعد کسی شخص کے لیے اپنی بیوی سے مراجعت کی کوئی شکل باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ قرآن نے جیسا کہ سورۂ مجادلہ کی آیات ۲-۴ میں تفصیل آئے گی، اس طرح کی بات کو منکر اور جھوٹ قرار دیا اور یہ اجازت دے دی کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو اس طرح کی بات کہہ بیٹھے اور وہ پھر اس کے ساتھ زن و شو کے تعلقات قائم کرنا چاہے تو ایسا کر سکتا ہے اس لیے کہ اس طرح کی بیہودہ بات کہہ دینے سے کسی کی بیوی

اس کی ماں نہیں بن جاتی لیکن اس نے چونکہ ایک منکر اور باطل بات کہی ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ ملاقات سے پہلے وہ ایک غلام آزاد کرے، اگر غلام میسر نہ ہو تو لگاتار دو ماہ روزے رکھے اور اگر اس کی قدرت نہ رکھتا ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ اس اصلاح سے قرآن نے ان لوگوں کی گھریلو زندگی کو درہم برہم ہونے سے بچانے کی راہ بھی کھول دی جو غصہ اور جھنجھلاہٹ میں آ کر، نتائج پر نگاہ کیے بغیر فضول باتیں زبان سے نکال دیا کرتے ہیں اور ساتھ ہی آئندہ کے لیے ان کو اور دوسروں کو محتاط رہنے کا سبق بھی دے دیا لیکن کفار و منافقین نے، جو ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے لیے کسی شوشے کی تلاش میں رہتے تھے، اس چیز کو بھی فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنا کر لوگوں میں یہ پھیلانا شروع کر دیا کہ اس شخص کو دیکھو، اس نے ماں اور بیوی کے درمیان کوئی فرق ہی باقی نہیں رکھا! اسی چیز کی طرف یہاں آیت میں اشارہ ہے کہ یہ لوگ دودلی اور تضادِ فکر و ارادہ کی بیماری میں مبتلا ہیں ورنہ انھیں سوچنا چاہیے کہ مجرد ایک بدتمیزی و جہالت کی بات کہہ دینے سے کسی کی بیوی اس کی ماں کس طرح بن جائے گی! اس غلطی پر وہ تادیب و اصلاح کا مستحق تو ضرور ہے تاکہ اس کو بھی اور معاشرہ کے دوسرے لوگوں کو بھی سبق حاصل ہو لیکن اس سزا کا مستحق تو وہ نہیں ہے کہ اس کی عائلی زندگی کا شیرازہ بالکل درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ یہاں ہم صرف اشارہ پر کفایت کرتے ہیں اس لیے کہ قرآن نے بھی اشارہ ہی کیا ہے۔ ان شاء اللہ سورۂ مجادلہ کی تفسیر میں ہم اس پر مفصل بحث کریں گے اور بتائیں گے کہ اس طریقۂ طلاق میں شریعت کے قرار دادہ طریقہ کے مقابل میں کیا کیا مفاسد موجود ہیں جن کی قرآن نے اصلاح کی ہے۔

تضادِ فکر کی دوسری مثال

'وَمَا جَعَلَ اَدْعِیَآءَکُمْ اَبْنَآءَکُمْ' اسی طرح کے تضادِ فکر میں لوگ منہ بولے بیٹوں کے معاملے میں بھی مبتلا تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں منہ بولے بیٹوں کو بالکل صلبی بیٹوں کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ کسی شخص کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے متبنّیٰ کی منکوحہ سے اس کی وفات یا طلاق کے بعد نکاح کر سکے۔ یہ چیز اس فطری نظامِ عائلی کے بالکل خلاف تھی جس کو اسلام نے 'اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُھُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ' کے اصول پر قائم فرمایا ہے۔ اس وجہ سے جب اس کی اصلاح کا وقت آ گیا تو اللہ تعالیٰ نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ حضرت زیدؓ کی مطلقہ بیوی حضرت زینبؓ سے نکاح کر لیں تاکہ اس غلط رسم کا خاتمہ ہو جائے۔ حضرت زیدؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنّیٰ کی حیثیت حاصل تھی اس وجہ سے اس رسمِ جاہلی کی اصلاح کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ یہی ہو سکتا تھا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے اقدام فرمائیں لیکن کفار و منافقین نے اس کو بھی آنحضرت صلعم کے خلاف فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنایا کہ اس شخص نے اپنے منہ بولے بیٹے کی منکوحہ سے نکاح کر لیا۔ اسی فتنہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ بھی ان لوگوں کی دودلی کا کرشمہ ہے کہ یہ صلبی بیٹے اور منہ بولے بیٹے میں فرق نہیں کر رہے ہیں، دونوں کو ایک ہی درجے میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اس واقعہ پر مفصل بحث فصل ۹ میں آگے آ رہی ہے اس وجہ سے ہم یہاں

اشارے پر کفایت کرتے ہیں۔

قرآن فطرت کی راہ کی طرف رہنمائی کر رہا ہے

ذٰلِکُمْ قَوْلُکُمْ بِاَفْوَاهِکُمْ ؕ وَاللّٰهُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ یَهْدِی السَّبِیْلَ ۔ یعنی اس قسم کی تمام باتیں تمھاری اپنی زبانوں کی گھڑی ہوئی ہیں۔ ان کو عقل و فطرت اور اللہ کی شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے اس وجہ سے یہ باطل ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی اور اپنی کتاب کے ذریعے سے تمھیں حق بتا رہا ہے اور تمھاری رہنمائی فطرت کی صراطِ مستقیم کی طرف کر رہا ہے تو اس صراطِ مستقیم کو اختیار کرو اور جاہلیت کے رسوم و بدعات سے باہر نکلو۔

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ وَمَوَالِیْکُمْ ؕ وَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ فِیْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰکِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُکُمْ ؕ وَکَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا (۵)

اسلام کے نظام میں کوئی خلافِ فطرت چیز داخل نہیں ہو سکتی

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۔ یعنی منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت کے ساتھ پکارو تاکہ ان کے نسب کا امتیاز باقی رہے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ کے قانون میں حق و عدل سے اقرب و اوفق ہے۔ اگر اس کی خلاف ورزی کر کے منہ بولے بیٹوں کو بالکل بیٹوں کے درجے میں کر دیا گیا تو وہ سارا نظامِ وراثت و قرابت و معاشرت بالکل تلپٹ ہو جائے گا جس کی بنیاد اللہ تعالیٰ نے رحمی رشتوں اور انسانی فطرت کے جذبات و داعیات پر رکھی ہے۔ اسلام کے تمام احکام و قوانین خواہ وہ کسی شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے ہوں، اللہ تعالیٰ نے عدل و قسط پر قائم کیے ہیں اس وجہ سے اس میں کوئی بات اس عدل و قسط کے خلاف داخل نہیں ہو سکتی۔

اہلِ عرب کا ایک معاشرتی اصول

فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ وَمَوَالِیْکُمْ ۔ یعنی اگر ان کے باپوں کا پتہ نہ ہو تو ان کی حیثیت دینی بھائیوں اور "موالی" کی ہوگی۔ دینی اخوت کے رشتہ سے تو عربوں کو اول اول اسلام نے آشنا کیا، جاہلیت میں عرب اس سے بالکل ناآشنا تھے لیکن خاندانوں اور قبیلوں کے ساتھ وابستہ ہونے کا ایک طریقہ حلف اور وِلا کا ان کے ہاں موجود تھا۔ خاندان یا قبیلہ سے باہر کا کوئی شخص اگر کسی خاندان یا قبیلہ میں شامل ہونا چاہتا اور اس خاندان والے اس کو شامل کر لیتے تو وہ اس خاندان کا 'مولیٰ' سمجھا جاتا اور جملہ حقوق اور ذمہ داریوں میں شریک خاندان و قبیلہ بن جاتا۔ اگر وہ قتل ہو جاتا تو جس خاندان یا قبیلہ کا وہ مولیٰ ہوتا اس کو یہ حق حاصل ہوتا کہ وہ اس کے قصاص کا مطالبہ کرے۔ اسی طرح اگر وہ کوئی اقدام کر بیٹھتا جس کی بنا پر کوئی ذمہ داری عائد ہونے والی ہوتی تو اس ذمہ داری میں بھی پورے خاندان و قبیلہ کو حصہ لینا پڑتا۔ 'مولی القوم منهم' (قوم کا مولیٰ انھی کے اندر کا ایک فرد شمار ہوگا) عربوں میں ایک مسلّم سماجی اصول تھا اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے بھی اس کو برقرار رکھا۔ کسی خاندان کے آزاد کردہ غلام کا وِلا بھی آزاد کرنے والے خاندان کو حاصل ہوتا۔ مثلاً اگر وہ آزاد کردہ غلام مرتا، اس کا کوئی وارث نہ ہوتا تو وِلا کے تعلق کی بنا پر اس کی وراثت اس کے آزاد کرنے والوں کو پہنچتی۔

آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر کسی کے متبنّٰی کے باپ کا علم نہ ہو تو اس کی حیثیت دینی بھائی اور مولیٰ کی قرار پائے گی لیکن کسی صورت میں اس کو صلبی بیٹے کی حیثیت حاصل نہ ہوگی۔

غلطی اور جرم میں فرق

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَآ أَخْطَأْتُم بِهِۦ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا یعنی اس معاملے میں جو غلطی بربنائے جہالت اب تک ہوئی ہے اس پر تو کوئی مواخذہ نہیں ہے، اللہ غفور رحیم ہے، لیکن اب اس تنبیہ و تعلیم کے بعد بھی اگر اسی غلط بات پر اصرار قائم رہا تو اس کی نوعیت غلطی کی نہیں بلکہ جرم کی ہوگی اس لیے کہ یہ چیز تمہارے دلوں کے قصد و ارادہ اور دیدہ و دانستہ تعمد کا نتیجہ ہوگی جس پر اللہ تعالیٰ ضرور مواخذہ فرمائے گا۔

ٱلنَّبِىُّ أَوْلَىٰ بِٱلْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ ۖ وَأَزْوَٰجُهُۥٓ أُمَّهَٰتُهُمْ ۗ وَأُو۟لُوا۟ ٱلْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِى كِتَٰبِ ٱللَّهِ مِنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ وَٱلْمُهَٰجِرِينَ إِلَّآ أَن تَفْعَلُوٓا۟ إِلَىٰٓ أَوْلِيَآئِكُم مَّعْرُوفًا ۚ كَانَ ذَٰلِكَ فِى ٱلْكِتَٰبِ مَسْطُورًا (۶)

اسلامی معاشرے میں فرق مراتب

یہ اس فرق مراتب کو واضح فرمایا ہے جو اسلامی معاشرے میں مسلمانوں کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت ہوئی۔ اس وضاحت سے مقصود مسلمانوں کو اس خلط مبحث سے بچانا ہے جس کی بعض مثالیں اوپر گزر چکی ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ۔ 'اَوْلٰی' کے معنی احق کے ہیں۔ مثلاً اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرٰھِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْہُ (آل عمران: ۶۸) یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ہر مسلمان پر دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ ہے۔ یہاں تک کہ خود اس کی اپنی جان سے بھی زیادہ ہے۔ اس مضمون کی وضاحت آگے اسی سورہ میں ان الفاظ میں ہوگئی ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ	جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا
إِذَا قَضَى ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥٓ أَمْرًا أَن	فیصلہ کر دیں تو کسی مومن اور مومنہ کے لیے ان
يَكُونَ لَهُمُ ٱلْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ	کے معاملے میں کوئی اختیار باقی نہیں رہ جاتا اور
وَمَن يَعْصِ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ فَقَدْ ضَلَّ	جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو
ضَلَٰلًا مُّبِينًا (الاحزاب: ۳۶)	وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس معاملے میں اللہ اور اس کے رسول کا کوئی فیصلہ صادر ہو جائے اس میں کسی مومن یا مومنہ کے لیے کسی چون و چرا کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ رسول جو کچھ فرماتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے نمائندے کی حیثیت سے فرماتا ہے اس وجہ سے ایمان کا لازمی تقاضا ہر مرد اور عورت کے لیے یہی ہے کہ وہ رسول کے احکام و ہدایات کی اللہ تعالیٰ کے احکام کی طرح بے چون و چرا تعمیل کرے۔ نہ دوسروں کی مخالفت و مزاحمت کی کوئی پروا کرے نہ اپنے مصالح و مفادات کی اور نہ اپنے جان و مال کی۔

ازواج مطہرات کا درجہ

وَاَزْوَاجُہٗٓ اُمَّھٰتُھُمْ۔ یہ اس تعلق خاص کا قدرتی نتیجہ بیان ہوا ہے جو ہر امتی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے ساتھ ہوتا ہے یا ہونا چاہیے۔ اگر اس تعلق میں نفاق کی کوئی آلائش نہ ہو تو فطری طور پر ہر مسلمان کے جذبات ازواج مطہراتؓ کے معاملے میں وہی ہوں گے جو شریف بیٹوں کے اندر اپنی ماؤں کے لیے ہوتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت کی بنا پر ان کے لیے دلوں میں ایسا احترام اور ان کی عظمت کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص ان کے ساتھ نکاح کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس سے الگ ہو کر اگر سوچ سکتے تھے تو صرف منافقین سوچ سکتے تھے اور وہ اپنے مفسدانہ اغراض کے لیے، تفصیل آگے آئے گی، ریشہ دوانیاں بھی کرتے رہتے تھے۔ اس آیت نے ان کی ریشہ دوانیوں کا سدِ باب کر دیا اور آگے اسی بنیاد پر صاف الفاظ میں یہ ممانعت آ گئی:
'وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَنْ تَنْكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا (۵۳)'
(اور تمہارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو ایذا پہنچاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ اس کے بعد کبھی اس کی بیویوں سے نکاح کرو) یہاں اس اشارے پر قناعت کیجیے۔ آگے ان شاء اللہ ہم ان دینی مصالح پر روشنی ڈالیں گے جو اس ممانعت کے اندر مضمر تھے۔

مومنین کے باہمی حقوق کی بنیاد رحمی رشتوں پر

'وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ'۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواج مطہراتؓ کو امت میں جو امتیازی مقام حاصل ہے اور جس پہلو سے حاصل ہے اس کو بیان کرنے کے بعد بقیہ سب کے تعلقات کے لیے اساس اس اصول کو قرار دیا ہے جو سورۂ نساء میں بیان ہو چکا ہے۔ یعنی رحمی رشتے رکھنے والے الاقرب فالاقرب کے اصول پر ایک دوسرے کے حقدار ٹھہریں گے۔ 'فِي كِتَابِ اللَّهِ' سے مراد یہاں قرآن کی سورۂ نساء کی آیات ۷-۱۲ ہیں جن میں اسی فطری اصول کے مطابق تقسیم وراثت کا ضابطہ بیان ہوا ہے۔

مہاجرین و انصار کے درمیان حقوق کا جو عارضی نظم قائم کیا گیا تھا وہ ختم کر دیا گیا

'مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ' یعنی دوسرے مومنین و مہاجرین کے مقابل میں اولوالارحام ہی اولیٰ و اقرب ٹھہریں گے۔ اسلامی اخوت کی بنا پر مہاجرین و انصار کے درمیان حقوق میں شرکت کا جو عارضی نظم ابتدا میں قائم کیا گیا تھا اس ٹکڑے نے اس کو بھی ختم کر دیا۔

حسنِ سلوک کی گنجائش

'إِلَّا أَنْ تَفْعَلُوا إِلَىٰ أَوْلِيَائِكُمْ مَعْرُوفًا ۚ كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا'۔ اس کے بعد صرف اتنی گنجائش باقی رہ گئی کہ آدمی کے جو اعزہ و احباب اس کی وراثت کے حقدار نہیں ہیں اگر ان کے ساتھ وہ کوئی حسنِ سلوک کرنا چاہے تو ان حدود کے اندر کر سکتا ہے جو شریعت نے مقرر کر دیے ہیں۔ ان حدود کی تفصیل بھی سورۂ نساء میں بیان ہو چکی ہے۔ 'كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا' میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۖ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا (۷)

حضرات انبیاء کا مشترکہ مشن

آیات ۱-۲ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر خوف و اندیشہ سے بے پروا ہو کر صرف وحی الٰہی کی پیروی اور اسی کی دعوت کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے، پیرے کے آخر میں اسی بات کو حضرات انبیاء علیہم السلام کی

تاریخ سے مزید موثق کر دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو ہدایت ہم تمھیں کر رہے ہیں اسی کی ہدایت ہم نے اپنے تمام نبیوں کو کی اور ان سے یہ عہد لیا کہ اللہ کی طرف سے ان کو جو وحی کی جا رہی ہے خود بھی اس کی پیروی کریں اور بے کم و کاست اس کو لوگوں کو بھی پہنچائیں۔ فرمایا کہ یہ میثاق ہم نے تم سے بھی لیا، نوحؑ سے بھی لیا، ابراہیمؑ سے بھی لیا، موسیٰؑ سے بھی لیا اور عیسیٰ ابن مریمؑ سے بھی لیا۔ عام کے بعد یہ خاص خاص جلیل القدر انبیاء کا حوالہ دے کر انبیاء کی پوری تاریخ سامنے رکھ دی گئی ہے تاکہ یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے کہ اس ذمہ داری کا بارِ گراں ہر نبی اور اس کے ساتھیوں کو اٹھانا پڑا ہے۔ اس خاص فہرست میں سب سے پہلے آنحضرت صلعم کا ذکر اس وجہ سے ہے کہ اصل مقصود آپؐ ہی کو یاد دہانی ہے۔

اس میثاق کا حوالہ قرآن مجید میں جگہ جگہ مذکور ہے۔ خاص طور پر سورۂ مائدہ میں اس کی پوری تاریخ بیان ہو گئی ہے۔ یہاں ہر میثاق کا حوالہ دینے میں طوالت ہوگی۔ ہم بطور مثال صرف ایک میثاق کا حوالہ دیتے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لیا گیا۔ حضرت موسیٰؑ کو خطاب کر کے ارشاد ہوا ہے: فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا (الاعراف ۱۴۵) (تم خود بھی اس کو مضبوطی سے پکڑو اور اپنی قوم کو بھی حکم دو کہ اس بہترین چیز کو پوری مضبوطی سے اختیار کرے)۔

وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا یعنی اس میثاق کے معاملہ میں ہم نے ذرہ برابر بھی نرمی اور مداہنت نہیں برتی۔ بلکہ ہر ایک سے مضبوط عہد لیا۔ اور اس کو پوری مضبوطی کے ساتھ اس پر قائم و استوار رہنے کی تاکید در تاکید فرمائی۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ اول تو اس عہد کو میثاق سے تعبیر فرمایا ہے جو خود مضبوط و مستحکم عہد کے لیے آتا ہے پھر اس کے ساتھ 'غلیظ' کی قید بھی لگائی ہے جس سے اس کے اندر مزید استحکام پیدا ہو گیا ہے۔

لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا (۸)

میثاق لینے کی حکمت

یہ میثاق لینے کی حکمت و مصلحت بیان فرمائی کہ انبیاء علیہم السلام کی اس تبلیغ کے بعد ہی لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ اتمامِ حجت ہوا جس کے بعد وہ مستحق ہوئے کہ اللہ تعالیٰ راستبازوں سے ان کی راستبازی سے متعلق اور کافروں اور منافقوں سے ان کے کفر و نفاق کے متعلق پوچھ گچھ کرے اور پھر ہر ایک کو ان کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دے۔ اس اتمامِ حجت کے بغیر اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کی گمراہی پر سزا دیتا تو یہ چیز اس کے عدل و رحمت کے خلاف ہوتی اور لوگ قیامت کے دن عذر کر سکتے۔ آگے آیات ۲۴ اور ۳۷-۴۰ کے تحت اس کی مزید وضاحت آئے گی۔ سورۂ نساء کی آیت لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ (۱۶۵) میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے اور وہاں ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

۲۔ آگے کا مضمون ۔ آیات ۹ ۔ ۲۷

آگے غزوۂ احزاب کے واقعات کا حوالہ ہے اور مقصود اس سے اسی مضمون کو واقعات کی روشنی میں مزید واضح کرنا ہے جو تمہید میں بیان ہوا ہے کہ پیغمبرؐ اور ان کے ساتھیوں کو اللہ کے دین کی راہ میں مخالفوں کی مخالفت اور ان کی سازشوں کی کوئی پروا نہیں کرنی چاہیے بلکہ اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے، اللہ بھروسہ کے لیے کافی ہے۔ وہ اپنی آنکھوں نصرتِ الٰہی کا یہ کرشمہ دیکھ چکے ہیں کہ ان کے تمام مخالفین اپنی پوری مجتمع قوت کے ساتھ ان پر پل پڑے تھے اور اندر سے منافقین نے بھی اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے ان کے قدم اکھاڑ دینے کی پوری کوشش کی لیکن اللہ کی تدبیر سب پر غالب رہی۔ دشمنوں کو بے نیل مرام پسپا ہونا پڑا۔

غزوۂ احزاب شوال ۵ھ میں واقع ہوا۔ یہود بنی نضیر کے کچھ لیڈروں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے خیبر کی طرف جلا وطن کر دیا تھا۔ انھوں نے مکہ جا کر قریش کے لیڈروں سے فریاد کی اور ان کو آمادہ کیا کہ وہ مدینہ پر حملہ کریں۔ قریش حملہ کے لیے پہلے سے پر تول رہے تھے، جب ان کو یہود کی شہ بھی حاصل ہو گئی تو گویا مانگی مراد مل گئی۔ اس کے بعد غطفان اور ہوازن کے لیڈروں کو بھی انھوں نے ہموار کر لیا۔ اس طرح تقریباً دس ہزار کا ایک لشکر جرار مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ قریش کا لشکر ابوسفیان کی سرکردگی میں تھا اور غطفان و ہوازن عیینہ بن حصن اور عامر بن طفیل کی قیادت میں نکلے۔ مزید برآں حیی بن اخطب نضری نے یہود بنی قریظہ کو بھی اس متحدہ محاذ میں شامل ہونے پر آمادہ کر لیا۔ اگرچہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدۂ امن و صلح کر رکھا تھا لیکن اس موقع کو انھوں نے غنیمت جانا اور معاہدے کی پروا نہ کی۔ ان کی تعداد کم و بیش آٹھ سو تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب دشمنوں کی ان تیاریوں کی خبر ہوئی تو آپؐ نے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے سے مسلمانوں کو مدینہ کی ان سمتوں میں خندق کھودنے کا حکم دیا جن سے حملہ کا خطرہ تھا چنانچہ شہر کی شمالی اور مغربی سمت میں ساڑھے تین میل لمبی ایک خندق کھودی گئی اور یہ کام نہایت سرگرمی کے ساتھ ان تین ہزار مجاہدوں نے انجام دیا جو حضورؐ کے ساتھ تھے اور خود سرورِ عالمؐ نے بھی بہ نفس نفیس اس کام میں حصہ لیا۔

دشمنوں نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا اور یہ محاصرہ تقریباً ایک ماہ رہا لیکن اس دوران میں سنگ باری اور تیر اندازی کے اکا دکا واقعات کے سوا دُو بدُو جنگ کی کوئی نوبت نہیں آئی۔ دشمن نے یہ اندازہ کر لیا کہ مسلمانوں نے مدافعت کی پوری تیاری کر رکھی ہے۔ پھر محاذ میں پھوٹ بھی پڑ گئی اور مزید برآں ایک طوفانی ہوا نے ان کے خیمے و شامیانے سب اکھاڑ کے پھینک دیے جس کے بعد ان کے حوصلے پست

ہو گئے اور ابو سفیان نے واپسی کا اعلان کر دیا —— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹-۲۷ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ
فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ﴿۹﴾ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ
مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ
بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ﴿۱۰﴾ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا
شَدِيْدًا ﴿۱۱﴾ وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ
مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲﴾ وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ
مِّنْهُمْ يٰۤاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ
مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛؕ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚۛ مع
اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ﴿۱۳﴾ وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا
ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا ﴿۱۴﴾ وَ
لَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ؕ وَكَانَ
عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُوْلًا ﴿۱۵﴾ قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ
الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۶﴾ قُلْ مَنْ ذَا
الَّذِيْ يَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ؕ
وَلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷﴾ قَدْ يَعْلَمُ
اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَالْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا ۚ

وَلَا يَأْتُونَ الْبَأْسَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿١٨﴾ أَشِحَّةً عَلَيْكُمْ فَإِذَا جَاءَ
الْخَوْفُ رَأَيْتَهُمْ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ تَدُورُ أَعْيُنُهُمْ كَالَّذِي يُغْشَىٰ
عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَإِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوكُمْ بِأَلْسِنَةٍ حِدَادٍ
أَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ أُولَٰئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوا فَأَحْبَطَ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ
وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ﴿١٩﴾ يَحْسَبُونَ الْأَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوا
وَإِنْ يَأْتِ الْأَحْزَابُ يَوَدُّوا لَوْ أَنَّهُمْ بَادُونَ فِي الْأَعْرَابِ يَسْأَلُونَ
عَنْ أَنْبَائِكُمْ وَلَوْ كَانُوا فِيكُمْ مَا قَاتَلُوا إِلَّا قَلِيلًا ﴿٢٠﴾ لَقَدْ كَانَ ع ٢ ١٢ ١٨
لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ
الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ﴿٢١﴾ وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ
قَالُوا هَٰذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ
وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا ﴿٢٢﴾ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ
صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ وَ
مِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا ﴿٢٣﴾ لِيَجْزِيَ اللَّهُ
الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِينَ إِنْ شَاءَ أَوْ يَتُوبَ
عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿٢٤﴾ وَرَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا
بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوا خَيْرًا وَكَفَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ وَكَانَ
اللَّهُ قَوِيًّا عَزِيزًا ﴿٢٥﴾ وَأَنْزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوهُمْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ
مِنْ صَيَاصِيهِمْ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ

وَتَأْسِرُونَ فَرِيقًا ﴿٢٦﴾ وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ
ع ۳ / ۱۹ وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ﴿٢٧﴾

ترجمۂ آیات ۹ - ۲۷

اے ایمان والو! تم اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد رکھو کہ جب تم پر فوجیں چڑھ آئیں تو ہم نے ان پر ایک باد تند بھیجی اور ایسی فوجیں بھی بھیجیں جو تم کو نظر نہیں آئیں۔ اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کو برابر دیکھتے رہنے والا ہے۔ یاد کرو جب کہ وہ تم پر آ چڑھے، تمہارے اوپر کی طرف سے بھی اور تمہارے نیچے کی طرف سے بھی، اور جب کہ نگاہیں کج ہو گئیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے اور تم اللہ کے باب میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت اہلِ ایمان امتحان میں ڈالے گئے اور بالکل ہلا دیے گئے۔ ۹-۱۱

اور جب کہ منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے یہ کہتے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے کیے وہ محض فریب نکلے اور جب کہ ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ اے یثرب والو، تمہارے لیے ٹکنے کا کوئی مقام نہیں ہے تو تم لوٹ جاؤ اور ان میں سے ایک گروہ نبی سے اجازت کا طلبگار تھا اور کہتا تھا کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں، حالانکہ وہ غیر محفوظ نہیں تھے، بس یہ لوگ بھاگنا چاہتے تھے۔ اور اگر ان کے اطراف سے ان پر حملہ ہو جاتا، پھر ان سے ارتداد کا مطالبہ کیا جاتا تو وہ اس پر راضی ہو جاتے اور اس میں بہت ہی کم توقف کرتے۔ حالانکہ اس سے پہلے انھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ وہ پیٹھ نہیں دکھائیں گے اور اللہ سے کیے ہوئے عہد کی پرسش ہونی ہے۔ کہہ دو اگر تم موت یا قتل سے بھاگو گے تو یہ بھاگنا تمہارے لیے کچھ نافع نہیں ہو گا، تم کو کھانے پینے کا تھوڑا ہی موقع ملے گا۔ پوچھو، کون ہے جو تم کو خدا سے بچا سکے گا اگر وہ تم کو کوئی گزند پہنچانا

چاہے یا اس کی رحمت کو روک سکے اگر وہ تم پر رحمت کرنا چاہے ؟ اور وہ اپنے لیے خدا کے مقابل میں نہ کوئی کارساز پائیں گے نہ کوئی مددگار۔ ۱۲ - ۱۷

اللہ تم میں سے ان لوگوں کو جانتا رہا ہے جو روکنے والے اور اپنے بھائیوں سے یہ کہنے والے رہے ہیں کہ ہمارے پاس آجاؤ۔ اور وہ جنگ میں بہت کم حصہ لیتے رہے ہیں تم سے جان چراتے ہوئے۔ پس جب خطرہ پیش آجاتا تو تم ان کو دیکھتے کہ وہ تمھاری طرف اس طرح تاک رہے ہیں کہ ان کی آنکھیں اس شخص کی آنکھوں کی طرح گردش کر رہی ہیں جس پر سکراتِ موت کی حالت طاری ہو۔ پھر جب خطرہ دور ہو جاتا تو وہ مال کی طمع میں تم سے بڑی تیز زبانی سے باتیں کرتے۔ یہ لوگ ایمان نہیں لائے تو اللہ نے ان کے اعمال ڈھا دیے اور یہ اللہ کے لیے نہایت آسان ہے۔ یہ لوگ گمان کر رہے ہیں کہ دشمن کی جماعتیں ابھی گئی نہیں ہیں اور اگر جماعتیں پھر آجائیں تو ان کی تمنا یہ ہوگی کہ وہ اہلِ بدو کے ساتھ دیہات میں ہوں اور وہاں سے تمھاری خبریں معلوم کرتے رہیں۔ اور اگر تمھارے ساتھ رہتے بھی تو جنگ میں برائے نام ہی حصہ لیتے۔ ۱۸ - ۲۰

اور تمھارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ ان کے لیے جو اللہ کی ملاقات اور روزِ آخرت کی توقع رکھتے ہیں اور اللہ کو زیادہ سے زیادہ یاد کرتے ہیں۔ اور جب اہلِ ایمان نے جماعتوں کو دیکھا تو وہ بولے کہ یہ تو وہی چیز پیش آئی جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کر رکھا تھا۔ اور اللہ اور اس کے رسول نے بالکل سچ کہا۔ اور اس چیز نے ان کے ایمان و اطاعت ہی میں اضافہ کیا۔ ۲۱ - ۲۲

اہلِ ایمان میں وہ جانباز بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کر دکھایا۔

سو ان میں سے بعض تو اپنا عہد پورا کر چکے اور بعض منتظر ہیں۔ اور انھوں نے ذرا بھی تبدیلی نہیں کی ہے تاکہ اللہ راستبازوں کو ان کی راست بازی کا صلہ دے اور منافقوں کو عذاب دے اگر چاہے یا ان کی توبہ قبول کرے (اگر وہ توبہ کریں) بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔ ۲۳-۲۴

اور اللہ نے کافروں کو ان کے غصہ کے ساتھ، بالکل بے نیل مرام، پسپا کر دیا اور جنگ کے لیے اللہ مسلمانوں کی طرف سے خود کافی ہو گیا اور اللہ قوی و غالب ہے اور اللہ نے ان اہل کتاب کو جنھوں نے کافروں کی مدد کی ان کے قلعوں سے اتارا اور ان کے دلوں کو مرعوب کر دیا۔ کچھ کو تم قتل کرتے ہو اور کچھ کو قید۔ اور ان کی زمین، ان کے گھروں اور ان کے مال کا وارث تم کو بنایا۔ علاوہ ازیں اور بھی زمین ہے جس پر تمھارے پاؤں ابھی نہیں پہنچے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۲۵-۲۷

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا (۹)

تائید الٰہی کے کرشموں کی یاد دہانی

آیت ۳ میں اللہ ہی پر بھروسہ کرنے کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے اسی مضمون کو موکد کرنے کے لیے یہ تائید الٰہی کے ان کرشموں کی یاد دہانی کرائی جا رہی ہے جو ماضی قریب میں مسلمانوں کی نصرت کے لیے ظاہر ہوئے تھے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر تمام عرب مسلمانوں پر امڈ آیا تھا لیکن مسلمانوں کی نکسیر بھی نہیں پھوٹی۔ دشمنوں کی دل بادل فوجیں اللہ تعالیٰ ہی نے اپنی پھونک سے اڑا دیں اور یہ حقیقت سب کے سامنے آگئی کہ اللہ تعالیٰ اعتماد کے لیے تنہا کافی ہے۔ اگر اس کی مدد حاصل ہو تو ساری دنیا کی مخالفت بھی کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتی۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ محاصرہ کے آخری دنوں میں ایسی طوفانی آندھی آئی کہ خیموں کی چوبیں اور طنابیں اکھڑ گئیں، دیگیں الٹ گئیں، سواری کے جانور تتر بتر ہو گئے، سردی کی شدت کے باوجود آگ جلانا ناممکن ہو گیا، تاریکی کا یہ عالم کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔

اس صورتِ حال نے دشمنوں پر مرعوبیت طاری کر دی اور ابوسفیان نے سلامتی اسی میں دیکھی کہ کسی طرح اس آفت سے جان بچا کر گھر کو واپس ہو جائے۔

'وَجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا' یعنی بادِ تند کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان پر ایسی فوجیں بھی بھیجیں جو مسلمانوں کو نظر نہیں آئیں۔ یہ اشارہ ملائکہ کی افواج کی طرف ہے جو ہمیشہ اہلِ ایمان کے ہم رکاب رہتی ہیں۔ اگرچہ وہ خود نظر نہیں آتیں لیکن ان کے شاندار غیبی کارنامے ظہور میں آتے ہیں جن سے اہلِ ایمان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور ان کے دشمن مرعوب ہوتے ہیں۔ سورۂ انفال میں بسلسلہ غزوۂ بدر، اس مسئلہ پر ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ 'لَّمْ تَرَوْهَا' سے یہ بات تو معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو یہ فوجیں نظر نہیں آئیں لیکن اس سے یہ بات نہیں نکلتی کہ کفار نے بھی ان کو نہیں دیکھا۔ قرینِ قیاس یہی ہے کہ ان کو یہ فوجیں دکھائی دی ہوں جس سے ان کو یہ اندازہ ہوا ہو کہ مسلمانوں کی جمعیت بہت بڑی ہے اور یہ چیز ان کی مرعوبیت کا باعث ہوئی ہو۔

'وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا' یہ وہی مضمون ہے جو اوپر آیت ۲ میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے: 'اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا'۔ اللہ تعالیٰ پر پورا بھروسہ کرنے کا اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اس کو یہ یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ 'خبیر' و 'بصیر' ہے۔ اس کے بندے اس کی راہ میں جو بازیاں کھیلتے اور جو مشقتیں جھیلتے ہیں وہ ان کو دیکھتا اور ان سے اچھی طرح باخبر رہتا ہے۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا (۱۰)

مغرب اور مشرق دونوں سمتوں سے حملہ

'اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ' مدینہ کی مشرقی سمت بلند، مغربی سمت نشیبی ہے۔ چونکہ دشمن کا حملہ دونوں طرف سے تھا اس وجہ سے فوق اور اسفل دونوں کا حوالہ دیا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ غطفان وغیرہ کا حملہ مشرق کی طرف سے ہوا تھا اور قریش اور ان کے حلیفوں کی فوجیں مغرب کی سمت سے آئی تھیں۔

صورتِ حال کا اثر ضعفائے قلوب پر

'وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ' کوئی منظر ہولناک و دہشت ناک ہو تو نگاہ اس پر نہیں ٹکتی۔ عربی میں اس کو 'زَاغَ الْبَصَرُ' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی طرح خوف و دہشت اور پریشانی کی تعبیر کے لیے 'بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ' کا محاورہ بھی ہے۔ 'کلیجہ منہ کو آنا' ہماری اپنی زبان میں بھی خوف و دہشت اور گھبراہٹ کی تعبیر کے لیے معروف ہے۔

'وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا' یہ بات اگرچہ عام صیغہ سے فرمائی گئی ہے لیکن اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ضعفِ ایمان اور نفاق کی بیماری میں مبتلا تھے۔ یہ منظر دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ خدا کی قدرت و نصرت، اس کے وعدوں اور اس کی شانوں کے متعلق اب تک ان کو جو کچھ بتایا اور سکھایا گیا تھا وہ

سب ان کے نزدیک مشکوک ہو گیا۔ کلام کے تدریجی ارتقاء سے یہ بات خود واضح ہو جائے گی کہ یہ اشارہ ضعفائے قلوب اور منافقین ہی کی طرف ہے۔ آگے سچے اہلِ ایمان کی عزیمت و استقامت کی تعریف قرآن نے ان الفاظ میں فرمائی ہے: "وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ لا قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ز وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا" (اور جب مومنوں نے دشمن کی پارٹیوں کو دیکھا تو وہ پکار اٹھے کہ یہ تو وہی صورتِ حال ہمیں پیش آئی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کر رکھا تھا اور اللہ اور اس کے رسول کی بات سچی ہوئی، اور اس چیز نے ان کے ایمان اور ان کی اطاعت ہی میں اضافہ کیا) جب سچے مسلمانوں کا یہ حال بیان ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت ایسے ہی سرفروشوں پر مشتمل تھی تو آیت زیرِ بحث کا اشارہ انہی لوگوں کی طرف ہو سکتا ہے جو ضعیف الایمان تھے۔ اس بنا پر ہم ان تفسیری روایات کو بالکل بے سروپا سمجھتے ہیں جن میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ العیاذ باللہ غزوۂ احزاب کے موقع پر ایک آدھ آدمیوں کے سوا اور کوئی شخص مسلمانوں میں عزم و ہمت رکھنے والا نہیں نکلا۔

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا (۱۱)

یعنی ان حالات نے اہلِ ایمان کو بڑی ہی سخت آزمائش میں ڈال دیا اور وہ نہایت ہی بری طرح جھنجھوڑ دیے گئے۔ ایک طرف ہر جانب سے دشمنوں کی یورش اور دوسری طرف اپنی صفوں کے اندر ایسے لوگوں کا وجود جو ان حالات کو دیکھ کر بالکل ہی ہمت ہار بیٹھے اور طرح طرح کے شبہات ظاہر کرنے لگے۔ لیکن کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کے لیے اہلِ ایمان کو اس قسم کے امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ امتحان اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔

وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا (۱۲)

اب اس اجمال کی تفصیل آ رہی ہے جو "تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا" کے اندر مضمر ہے۔ یعنی جو منافق اور اسلام کے خلاف بغض و عناد رکھنے والے تھے انھوں نے مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کے لیے، ان کے اندر یہ پھیلانا شروع کر دیا کہ اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے جو وعدے کیے وہ سب محض فریب ثابت ہوئے۔ روایات میں اس گروہ کے بعض اشرار کی یہ پھبتی بھی نقل ہوئی ہے کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ہمیں یہ اطمینان دلا رہے تھے کہ ہم کسریٰ و قیصر کے خزانوں پر قبضہ کریں گے اور یہاں حال یہ ہے کہ گھر سے قضائے حاجت کے لیے نکلنا ناممکن ہو رہا ہے۔" غور کیجیے کہ ایک طرف دشمنوں کا ہر سمت سے شہر کا محاصرہ اور دوسری طرف منافقین کا مسلمانوں کے اندر یہ زہریلا پروپیگنڈا! اسی صورتِ حال کو قرآن نے "ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا" کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

اس آیت میں ایک علمی نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ فرمایا ہے: "وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ایک نکتہ

مَّرَضٌ :- یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دو گروہوں کا الگ الگ ذکر ہے یا یہ دونوں صفتیں منافقین کے ایک ہی گروہ کی بیان ہوئی ہیں؟ نظائر قرآن کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ 'مرض' قرآن میں جہاں اخلاقی مرض کے لیے استعمال ہوا ہے، دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک نفاق کے مفہوم میں، دوسرے کینہ و حسد کے مفہوم میں۔ جہاں یہ لفظ 'نفاق' کے ساتھ استعمال ہوا ہے، جس طرح یہاں ہے، تو یہ اپنے دوسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور اگر تنہا استعمال ہوا ہے تو اس کے مفہوم کا تعین قرینہ سے ہوتا ہے، بعض جگہ تو یہ نفاق کے عام مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور بعض جگہ کینہ و حسد اور بغض و عناد کے مفہوم میں۔ اس دوسرے مفہوم کے لیے نظیر اسی سورہ کی آیت ۳۲ میں موجود ہے اور اس سے زیادہ واضح نظیر سورۂ محمد کی آیت ۲۹ میں ملے گی۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ منافقین میں دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو محض ضعفِ عزم و ارادہ کے مریض تھے۔ دوسرے وہ جو اسلام کے خلاف اپنے دلوں میں بغض و عناد رکھتے تھے لیکن دشمنوں کی طرح کھلم کھلا مخالفت کرنے کے بجائے مارِ آستین بن کر اسلام کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ اسی گروہ کو عام منافقین سے ممیز کرنے کے لیے بعض جگہ 'وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ' کی صفت سے ذکر فرمایا ہے۔ جو لوگ ان دونوں گروہوں کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے وہ بعض مقامات میں قرآن کے الفاظ کا صحیح زور نہیں سمجھ سکتے۔

وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ یٰٓاَهْلَ یَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَیَسْتَاْذِنُ فَرِیْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِیَّ یَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُیُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِیَ بِعَوْرَةٍ ۚۛ اِنْ یُّرِیْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا (۱۳)

منافقینِ اعراب — یہ منافقین کے ایک دوسرے گروہ کا ذکر ہے اور قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اشارہ منافقینِ اعراب کی طرف ہے۔ مدینہ کے قرب و جوار کے دیہاتوں کے جو لوگ اسلام لائے تھے ان میں ایک گروہ نہایت کٹر منافقین کا تھا۔ ان کا ذکر تفصیل سے سورۂ توبہ کی تفسیر میں ہو چکا ہے۔ ان کے لیے خود قرآن میں 'اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اسلام کی بڑھتی ہوئی سیاسی طاقت سے مرعوب ہو کر مسلمان ہونے کے مدعی تو بن بیٹھے تھے لیکن ان کی ساری دلچسپی اپنے مفادات سے تھی۔ کسی غزوہ میں شریک ہونے کا وقت آتا تو اول تو مختلف بہانوں سے کترا جاتے اور اگر محض نمائش کے لیے کسی جنگ میں شریک ہوتے بھی تو اسلام سے زیادہ اسلام کے دشمنوں کی مقصد برآری کا ذریعہ بنتے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر بھی ان میں سے کچھ لوگ اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے آ گئے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنا سارا زور مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کے لیے صرف کیا۔ یہاں چند آیتوں میں اسی گروہ کے کردار پر تبصرہ ہے۔

'یااھل یثرب' کے خطاب کے مضمرات — یٰٓاَهْلَ یَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا۔ ان لوگوں کا مدینہ کے مسلمانوں کو یٰٓاَهْلَ یَثْرِبَ کہہ

کے خطاب کرنا اس بات کا نہایت واضح قرینہ ہے کہ ان کا تعلق حوالی مدینہ کے بدوؤں سے تھا۔ اگر یہ خاص مدینہ ہی کے باشندے ہوتے تو اپنے ہی شہر کے بھائیوں کو اس خطاب سے مخاطب کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

'یثرب' مدینہ منورہ کا سابق نام ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد اس کا نام مدینۃ النبی اور پھر مدینہ ہوگیا لیکن دیہاتوں کے لوگ 'بالخصوص منافقین' عرصہ تک اس کو یثرب ہی کہتے رہے۔ یہ لوگ دیہاتی بھی تھے اور منافق بھی اس وجہ سے انھوں نے نئے نام کو قبول نہیں کیا تھا۔ ان کو گمان یہ ہو رہا ہوگا کہ اسلام اور مسلمانوں کا قبضہ اس شہر پر عارضی ہے، سابق حالات پھر لوٹ آئیں گے۔ ان کے اس خطاب کا حوالہ دے کر قرآن نے ان کے اس باطن سے پردہ اٹھا دیا ہے۔

منافقین کی مفسدانہ مساعی کی ایک مثال

'لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا' یعنی انھوں نے مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کے لیے نہایت خیرخواہانہ انداز میں یہ کہنا شروع کیا کہ دشمنوں کی اس دل بادل فوج کے مقابل میں تمہارے لیے ٹک سکنا ناممکن ہے اس وجہ سے جنگ کے لیے محاذ آرائی بے سود ہوگی۔ اب بہتری اسی میں ہے کہ جنگ کا خیال چھوڑ کر گھروں کو واپس ہو جاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ اس صورت میں تو اس بات کا امکان ہے کہ شاید یہ تمہارے دشمن تمہارے ساتھ کچھ نرم معاملہ کریں لیکن نوبت اگر جنگ و قتال کی آگئی تو پھر تمہاری خیر نہیں ہے۔

منافقین کا ایک عذر لنگ

'وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ' الآیۃ۔ 'عورۃ' کے معنی غیر محفوظ کے ہیں۔ انہی منافقین اعراب کے ایک دوسرے گروہ کا یہ کردار بیان ہو رہا ہے کہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ عذر پیش کیے کہ چونکہ ان کے گھر تنہا اور غیر محفوظ ہیں اس وجہ سے انھیں اپنے گھروں کو واپس جانے کی اجازت دی جائے۔ پہلے گروہ نے مدینہ والوں کو پست ہمت کر کے ان کو محاذ سے ہٹانے کی کوشش کی اور اس گروہ نے خود اپنے لیے راہِ فرار تلاش کرنے کی تدبیر کی تاکہ دشمن کے لیے میدان بالکل صاف ہو جائے۔ اس گروہ کا یہ عذر بھی کہ 'ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں' اس بات کا قرینہ ہے کہ ان کا تعلق اطراف مدینہ کے دیہاتوں سے تھا۔ جہاں تک اہلِ مدینہ کا تعلق ہے ان کے لیے اس قسم کے کسی بہانے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس جنگ سے متعلق جو تفصیلات کتابوں میں مذکور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں اور بچوں کی حفاظت کا انتظام پہلے سے کر لیا گیا تھا۔

'وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا' فرمایا کہ ان کا یہ عذر بالکل جھوٹا عذر تھا۔ ان کے مکانات غیر محفوظ یا کسی خطرے میں نہیں تھے۔ بلکہ یہ لوگ اس بہانے محاذِ جنگ سے فرار اختیار کرنا چاہتے تھے۔

'وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا' (۱۴)

'اَقْطَارِهَا' کی ضمیر کا مرجع 'یثرب' بھی ہو سکتا ہے لیکن قرائن کی روشنی میں میرے نزدیک اس کا مرجع 'بُیُوت' ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گھروں کی حفاظت کا بہانہ تو محض بہانہ ہے۔ اصل مقصد ان کا دین کی حفاظت

مدافعت سے فرار ہے۔ ان کے نزدیک سب سے زیادہ کم وقعت اور ارزاں چیز دین ہے۔ اگر اطراف سے دشمن کے اطراف سے ان پر اسلام کے مخالفوں کی چڑھائی ہو جائے اور وہ ان سے ارتداد یا مسلمانوں سے جنگ کرنے کا مطالبہ کریں تو یہ ان کے مطالبہ کو بے درنگ مان لیں گے۔ لفظ 'فتنہ' پر ہم جگہ جگہ بحث کر چکے ہیں۔ یہاں اس سے رجعت اور ارتداد یا مسلمانوں کے خلاف جنگ کا مطالبہ مراد ہے۔ صاحب کشاف نے یہی تاویل اختیار کی ہے اور ہمارے نزدیک یہ صحیح ہے۔ سورۂ نساء آیت ۹۱ میں اسی قسم کے منافقین کی طرف اشارہ ہے۔ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ۔ یہاں 'فتنہ' سے مراد، جیسا کہ اس کے محل میں ہم وضاحت کر چکے ہیں، یہ ہے کہ اگر کوئی اسلام دشمن طاقت دباؤ ڈال کر ان سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کوئی کام لینا چاہتی ہے تو بڑی آسانی سے لے لیتی ہے۔ بعینہٖ یہی مضمون آیت زیر بحث میں بیان ہوا ہے۔

وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ۭ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْــــُٔوْلًا (۱۵)

منافقین کی بدعہدی

یوں تو اسلام میں داخل ہونے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کرنے ہی کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے مال اور اپنی جان کو اللہ کے دین سے دریغ نہیں رکھ سکتا بلکہ خدا کی راہ میں سب کچھ قربان کر دینے کے عہد کا پابند ہو جاتا ہے لیکن یہ منافقین اس عام عہد کے علاوہ ایک خاص عہد کی پابندی کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے چکے تھے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ان میں سے اکثر کا حال یہ تھا کہ پچھلے غزوات میں انھوں نے لاطائل عذرات کی آڑ لے کر شرکت سے گریز کیا تھا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو قسمیں کھا کھا کر اطمینان دلایا تھا کہ آئندہ کسی جہاد کی نوبت آئی تو وہ اس میں پورے جوش سے حصہ لیں گے۔ ان لوگوں کی ان اطمینان دہانیوں کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کو ملامت کی ہے کہ پہلے تو انھوں نے بہت بڑھ چڑھ کے وعدے کیے تھے کہ آئندہ جنگ کی نوبت آئی تو وہ پیٹھ نہیں دکھائیں گے تو اب جب اس کی نوبت آئی تو رخصت کی عرضیاں اور گھروں کے غیر محفوظ ہونے کے بہانے لے کر کیوں اٹھ کھڑے ہوئے! 'وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْــــُٔوْلًا' یہ ان کو دھمکی ہے کہ انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ سے کیے ہوئے ہر عہد کی پرسش ہونی ہے۔ پرسش تو ہر جرم کی ہوگی لیکن خاص طور پر اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ سورۂ صف میں ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (الصف ۶۱: ۲-۳) (اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں! اللہ کے نزدیک یہ بات زیادہ غضب کی ہے کہ تم وہ بات کہو جو کرتے نہیں)۔

قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۶)

موت سے ڈر کر ادائے فرض سے فرار حماقت ہے

مطلب یہ ہے کہ موت یا قتل سے ڈر کر ادائے فرض سے فرار کوئی دانشمندانہ پالیسی نہیں ہے بلکہ یہ نہایت احمقانہ روش ہے۔ زندگی اور موت تمام تر خدا کے اختیار میں ہے۔ اگر کوئی شخص خدا کے کسی مقرر کیے ہوئے فرض سے اس لیے گریز اختیار کرتا ہے کہ اس میں اس کو موت یا قتل کا اندیشہ ہے تو دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ خدا سے فرار اختیار کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا سے بھاگ سکنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اگر اس طرح بھاگ کر کسی نے اپنی زندگی، اپنی دانست میں، بچالی تو کب تک بچائے رکھے گا، بالآخر اس کو ایک دن مرنا اور اپنے اس رب کو منہ دکھانا ہے جس سے اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ اس آیت کے الفاظ 'وَإِذًا لَا تُمَتَّعُونَ إِلَّا قَلِيلًا' پر غور کیجیے تو ان سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس طرح کے فراریوں کی عمر برکت سے بالکل محروم ہو جاتی ہے۔ وہ اس حیاتِ چند روزہ میں جتنے دن گزارتے ہیں بے برکت زندگی گزارتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ فرار نہ اختیار کرتے جب بھی وہ اپنی مدتِ حیات پوری کرتے اور اس چند روزہ زندگی کے بدلے حیاتِ جاوداں کی بادشاہی حاصل کرتے۔

قُلْ مَنْ ذَا الَّذِي يَعْصِمُكُمْ مِنَ اللَّهِ إِنْ أَرَادَ بِكُمْ سُوءًا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ۚ وَلَا يَجِدُونَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا (۱۷)

حذف کا ایک اسلوب

اس آیت میں عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق 'أَوْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً' سے پہلے جملہ کا ایک حصہ محذوف ہے۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی: 'أَوْ يُمْسِكُ رَحْمَتَهُ إِنْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً' (یا اس کی رحمت کو روک سکے اگر وہ تم پر رحمت کرنا چاہے) عربی میں حذف کے اس اسلوب کی مثالیں بہت ہیں۔ 'متقلدا سیفا ورمحا' میں بھی یہی اسلوب ملحوظ ہے۔ قرآن میں اس کی جو بلیغ مثالیں ہیں ان کی طرف اس کتاب میں ہم اشارہ کرتے آئے ہیں۔ اردو میں یہ اسلوب موجود نہیں ہے اس وجہ سے ترجمہ میں اس حذف کو ہم نے کھول دیا ہے۔

رحمت اور نقمت دونوں صرف خدا کے اختیار میں ہے

'مِنْ دُونِ' مقابل کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ اس کے محل میں اس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم خدا سے جان چراتے ہو تو بتاؤ کہ اگر خدا تم کو کوئی گزند پہنچانا چاہے تو کون ہے جو اس کی پکڑ سے تمہیں بچا سکے، اسی طرح اگر وہ تمہارے دشمنوں کے علی الرغم تم پر اپنی رحمت نازل کرنا چاہے تو کس کی طاقت ہے کہ اس کی رحمت کو روک سکے؟ رحمت ہو یا نقمت دونوں خدا ہی کے اختیار میں ہے تو خدا سے بھاگنے اور جی چرانے کے کیا معنی!

'وَلَا يَجِدُونَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا' یہاں سیاقِ کلام چونکہ تنبیہ کا ہے اس وجہ سے تنبیہ کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں فرمایا کہ یاد رکھیں کہ اگر خدا کی پکڑ میں آ گئے تو اس کے مقابل میں نہ ان کا کوئی کارساز ان کا سفارشی بن سکے گا نہ کوئی حامی و مددگار ان کی حمایت کر سکے گا۔ کسی کی مدد سعی و سفارش کے ذریعہ سے بھی ہو سکتی ہے جس طرح کی مدد کی توقع مشرکین اپنے معبودوں اور نشر کا و اولیاء سے رکھتے تھے'

اور جمعیت و عصبیت کے بل پر بھی ہو سکتی ہے جس کا غرہ ہر صاحب جمعیت کو ہوتا ہے۔ یہاں ان دونوں ہی کی نفی فرما دی۔

قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَالْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا ۚ وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۸)

منافقین کی ایک سازش کی طرف اشارہ

'قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ' میں مضارع سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے۔ اس اسلوب کی وضاحت ہم جگہ جگہ کر چکے ہیں۔ اس میں نہایت سخت قسم کی تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ اللہ تمہارے اندر سے ان لوگوں کو برابر جانتا رہا ہے جو اپنے بھائیوں کو جنگ سے روکتے اور ان سے یہ کہتے رہے ہیں کہ ہمارے پاس آ جاؤ اور یہ لوگ جنگ میں عملاً بہت کم حصہ لیتے رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی ان سازشوں سے کوئی آگاہ نہیں ہے لیکن اللہ ان سے برابر آگاہ رہا ہے اور جب وہ ان سے برابر آگاہ رہا ہے تو ان کو سزا دیے بغیر بھی نہیں چھوڑے گا۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ اشارہ ان منافقین کی طرف ہے جو نہ صرف یہ کہ خود دفاع میں کوئی حصہ نہیں لیتے تھے بلکہ اپنے اعتماد و تعلق کے دوسرے لوگوں کو بھی اس سے روکتے اور ان سے کہتے تھے کہ جس جگہ ہم ہیں تم بھی اسی جگہ آ جاؤ تاکہ تم پر کوئی گرفت نہ ہو سکے۔ یہ امر یہاں پیش نظر رہے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر دفاعی لائن بہت طویل تھی اس وجہ سے منافقین کے لیے دفاع کی ذمہ داریوں سے گریز و فرار کے مواقع بہت تھے۔ وہ خود بھی اس سے گریز کرتے اور اپنے دوسرے ہم خیالوں کو بھی اپنا ساتھی بنانے کی کوشش کرتے۔

'وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا' یہاں بھی مضارع سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے اور 'بَاْس' سے مراد دفاع ہے۔ یعنی یہ خود تو دفاع میں برائے نام محض نمائش کے لیے حصہ لیتے اور جو لوگ حصہ لیتے ان کے دل بٹھانے کی کوشش کرتے اور ان کو اپنے مورچوں پر بلاتے کہ ان کو بھی اپنا ساتھی بنا لیں۔

اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۚ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ۭ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا (۱۹)

'اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ' کا تعلق اوپر والے جملہ 'وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا' سے ہے۔ یعنی اول تو وہ دفاع میں حصہ لیتے نہیں تھے اور اگر کبھی حصہ لیتے بھی تو تمہارے لیے جان یا مال کی کوئی قربانی کرنے کے معاملے میں نہایت بخیل تھے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ ایک قطرہ خون بہائے بغیر وہ غازی و مجاہد سمجھے جائیں۔

زبان کے سورماؤں کا حال

'فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ

مِنَ الْمَوْتِ' چونکہ یہ کوئی قربانی دینے کے لیے نہیں بلکہ کوئی خطرہ مول لیے بغیر غازیوں کے رجسٹر میں اپنے نام درج کرانے گئے تھے اس وجہ سے جب کبھی محاذ پر کوئی خطرے کی حالت پیش آجاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ ان کی آنکھیں اس طرح گردش کر رہی ہیں گویا ان پر موت کی غشی طاری ہونے لگی ہے۔ موت کا مقابلہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ کرتا ہے جو شہادت کے عزم کے ساتھ گھر سے نکلتا ہے۔ محض نمائش کے لیے نکلنے والوں کا بھرم کوئی معمولی سے معمولی خطرہ بھی کھول دیتا ہے۔

'فَإِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوكُم بِأَلْسِنَةٍ حِدَادٍ أَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ' 'سلق' کے معنی تیز زبانی اور چرب زبانی سے بات کرنے کے ہیں۔ اسی سے 'خطیب سلاق' اس خطیب کو کہتے ہیں جو نہایت تیز زبان ہو۔

یعنی جب کوئی خطرے کی حالت پیش آجاتی تب تو ایسا معلوم ہوتا کہ ان کے دم خشک ہو رہے ہیں اور ان پر موت کی جان کنی طاری ہے لیکن جب خطرے کی حالت گزر جاتی تو بڑی تیز زبانی سے باتیں کرتے گویا انہی کی شہامت و شجاعت کا یہ کرشمہ ہے کہ دشمن کو آگے قدم بڑھانے کی جرأت نہیں ہوئی ورنہ خطرہ بالکل سر پر آگیا تھا۔

'أَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ' یعنی اس ساری تیز زبانی و طلاقت لسانی کا مظاہرہ وہ محض مال کی طمع میں کرتے ہیں کہ اگر تقسیم غنیمت کا موقع آئے تو اس میں زیادہ سے زیادہ حصہ ہتھیا سکیں۔

یہ 'أَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ' اوپر والے 'أَشِحَّةً عَلَيْكُمْ' کے بالکل ٹھیک ٹھیک مقابل میں ہے، یہ 'شحیح' کی جمع ہے۔ اس کے معنی بخیل کے بھی آتے ہیں اور حریص کے بھی اور یہ دونوں ہی مفہوم ایک ہی کردار کے دو پہلو ہیں۔ پہلے ٹکڑے میں یہ بخیل کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے دوسرے میں حریص کے مفہوم میں۔ مطلب یہ ہوا کہ تمہارے معاملے میں ان کی بخالت و تنگ دلی کا تو یہ حال ہے کہ تمہاری خاطر نہ وہ ایک قطرہ خون بہانے کو تیار ہیں نہ اپنا کوئی دھیلا خرچ کرنے پر راضی ہیں لیکن اگر مال غنیمت ہاتھ آئے تو اس کی طمع میں یہ زبان کے غازی سب کو ہدف مطاعن بنا ڈالیں گے۔

'سَلَقُوكُم بِأَلْسِنَةٍ حِدَادٍ' کے الفاظ کے اندر چرب زبانی کے ساتھ تند زبانی کا مفہوم بھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ منافقین چونکہ مال ہی کی طمع میں غزوات میں شریک ہوتے اس وجہ سے ان کے حاصل کرنے کے لیے وہ دوسروں کو ہمز و لمز اور طعن و تشنیع کا نشانہ بھی بنانے سے گریز نہ کرتے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات، جیسا کہ سورۂ نساء، سورۂ توبہ اور سورۂ انفال وغیرہ میں گزر چکا ہے، خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تقسیم غنیمت کے معاملے میں یہ جانبداری کا الزام دیتے کہ لڑائی تو ہم جیتتے ہیں لیکن مال غنیمت میں سے حصہ دوسروں کو زیادہ دیا جاتا اور ہم کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

'أُولَٰئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوا فَأَحْبَطَ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا' یعنی یہ لوگ چونکہ محض

منافقین کے اعمال اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہوں گے

زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے رہے ہیں حقیقی ایمان ان کو نصیب نہیں ہوا اس وجہ سے اس نمائشی ایمان کے ساتھ انھوں نے جو کام بظاہر دین کے بھی کیے وہ سب اللہ نے حبط کر دیے۔ ان کا کوئی صلہ آخرت میں ان کو ملنے والا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں عمل صرف وہی مقبول ہے جو ایمان کے ساتھ ہو۔

'وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا'۔ یہ لوگوں کی بعض نہایت شدید قسم کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہے۔ بہت سے لوگ ادائے اور نیت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ کسی کا کوئی عمل ان کی نگاہوں میں اچھا ہے تو وہ لازماً آخرت میں بھی اس کے صلہ میں، ان کے نزدیک، مراتب عالیہ کا سزاوار ٹھہرے گا حالانکہ یہ بات حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کے بڑے سے بڑے عمل کی بھی کوئی وقعت نہیں ہے اگر وہ اس کی رضا کے لیے نہ کیا جائے۔ خدا کسی کے عمل کا محتاج نہیں ہے۔ اپنے عمل کے محتاج خود عمل کرنے والے ہیں۔ ان کا نفع سرتاسر انہی کو پہنچتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ ہر اس عمل کو قبول فرمائے گا جو اس کے احکام کے مطابق اور خالص اس کی رضا جوئی کے لیے کیا جائے گا، خواہ عمل چھوٹا ہو یا بڑا۔ اگر کوئی عمل اس کی رضا جوئی کے سوا کسی اور کی رضا جوئی یا کسی اور غرض کے لیے کیا جائے گا تو ایسے عمل کو اللہ تعالیٰ عمل کرنے والے کے منہ پر پھینک مارے گا کہ اس کا صلہ وہ ان سے لے جن کی خوشنودی کے لیے اس نے کیا ہے، اگرچہ یہ حج اور جہاد کے درجہ ہی کا عمل کیوں نہ ہو۔ فرمایا کہ کوئی اس مغالطہ میں نہ رہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایسا کرنا ذرا بھی شاق گزرے گا۔ یہ ذرا بھی اس پر شاق نہیں گزرے گا بلکہ یہ اس کے لیے نہایت سہل ہے۔ وہ کسی کے عمل کا محتاج نہیں ہے کہ ہر قسم کا عمل اپنے کھاتے میں جمع کرتا جائے کہ چلو، یہ بھی غنیمت ہے!

بعض لوگوں کو یہ مغالطہ بھی ہو جاتا ہے کہ خدا بڑا مہربان و کریم ہے اس وجہ سے جو کچھ بھی اور جس طرح بھی کوئی نیکی کا کام کر دے گا وہ اس کو قبول فرمالے گا۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ خدا بڑا ہی مہربان و کریم ہے لیکن ساتھ ہی وہ نہایت غیور و غنی بھی ہے اس وجہ سے لوگوں کے ایسے اعمال کو پامال کر دینا اس پر ذرا بھی گراں نہیں ہوگا جن کا قبول کرنا اس کی غیرت کے منافی ہو۔ یہود کو خدا کی صفت کریمی سے جو مغلطے پیش آئے ان کی تفصیل سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا ۚ وَاِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآئِكُمْ ۖ وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا (۲۰)

منافقین کی بزدلی کی مزید وضاحت

ان لوگوں کی بزدلی کا ذکر اوپر کی آیات میں گزر چکا ہے۔ یہ اسی کی مزید وضاحت ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ جماعتوں کے چلے جانے سے ان کے دلوں کا خوف بھی چلا گیا ہے۔ جماعتیں پسپا ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ گئیں لیکن ان کی ہیبت اس طرح ان کے دلوں پر مسلط ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ ابھی وہ یہیں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔

وَاِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ ... الآیۃ، یعنی اب کے تو یہ کسی نہ کسی طرح، مارے باندھے، یہاں مدینہ میں رہ گئے لیکن اب اگر دوبارہ حملے کا کوئی اندیشہ ہوا تو ان کی خواہش یہ ہوگی کہ مدینہ میں ٹکنے کے بجائے اہلِ بدو کے ساتھ دیہاتوں میں جا رہیں اور وہیں سے بیٹھے بیٹھے تمہاری خبریں دریافت کرتے رہیں کہ کیسی گزر رہی ہے!

وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا: یہ مسلمانوں کو تسلی ہے کہ اگر یہ ایسا کریں تو اس میں تمہارا کوئی نقصان نہیں ہے۔ اگر یہ تمہارے پاس ہوں گے بھی تو یہ جنگ میں حصہ لینے والے اسامی نہیں ہیں۔ بہتر ہے کہ دور ہی رہیں کہ ان کی چھوت سے دوسرے متاثر نہ ہوں۔ اوپر آیت ۱۸ کے تحت جو کچھ گزر چکا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا (۲۱)

عزیمت کے لیے نمونہ اور اس کے حصول کی تدبیر

یہ ان بزدلوں کو غیرت دلائی ہے کہ تمہارے اندر ہی محاذ پر خدا کا رسول بھی موجود تھا اور تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس نے کس عزم و ہمت کے ساتھ تمام خطرات کا مقابلہ کیا تو آخر تم نے اس بہترین نمونے کی پیروی کیوں نہ کی، اس قدر بزدل اور ڈرپوک کیوں بنے رہے!

لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا: یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ رسول کے اسوہ کی پیروی ہر مدعی کا کام نہیں ہے۔ اس راہ کی آزمائشوں سے وہی لوگ عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جو اللہ کی ملاقات اور روزِ آخرت کے منتظر و متوقع اور اللہ کی یاد سے ہر وقت اپنے دل کو آباد و شاداب رکھنے والے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ راہِ حق میں عزیمت و استقامت انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جن کے اندر خدا اور آخرت پر مضبوط ایمان ہو اور وہ برابر اپنے اس ایمان کو خدا کی یاد سے تازہ رکھیں۔ نیز اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ ان منافقین کے اندر نہ خدا اور آخرت پر ایمان تھا اور نہ یہ خدا کو یاد رکھنے والے تھے اس وجہ سے ان کے خوف کا یہ حال ہے کہ دشمنوں کے پسپا ہو جانے کے بعد بھی ان کے دلوں پر سے ان کی ہیبت نہیں گئی۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا (۲۲)

منافقین کے بالمقابل مخلصین کا رویہ

اوپر آیت ۱۲ میں منافقوں اور حاسدوں کا قول گزر چکا ہے کہ انھوں نے دشمنوں کے اس ہجوم کو دیکھ کر علانیہ مسلمانوں میں یہ پھیلانا شروع کر دیا کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جو وعدے ہم سے کیے گئے وہ سب فریب ثابت ہوئے۔ اب ان کے مقابل میں یہ سچے مسلمانوں کا تاثر بیان ہو رہا ہے کہ انھوں نے جب

دشمنوں کے اس نرغہ کو دیکھا تو اپنے ساتھیوں کو تسلی دی کہ یہ تو وہی امتحان ہمیں پیش آیا ہے جس کی اللہ اور اس کے رسول نے پہلے سے ہمیں خبر دے دی تھی۔ یہ اشارہ قرآن کی ان آیات کی طرف ہے جن میں مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ کامیابی کی منزل کو پہنچنے سے پہلے ان کو نہایت صبر آزما امتحانوں سے گزرنا پڑے گا۔ مثلاً سورہ بقرہ میں فرمایا ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ
وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ
خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ
الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا
حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ
اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ
(البقرة : ۲۱۴)

کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہیں اس طرح کے حالات سے سابقہ پیش آیا ہی نہیں جس طرح کے حالات سے ان لوگوں کو سابقہ پیش آیا جو تم سے پہلے گزرے۔ ان کو فقر و بیماری کے مصائب پہنچے۔ اور وہ اس قدر جھنجھوڑے گئے کہ رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب نمودار ہو گی! آگاہ، کہ اللہ کی مدد قریب ہے۔

اسی سنت کی طرف سورہ عنکبوت میں یوں اشارہ فرمایا ہے۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا
اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝
وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ
الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ
الْكٰذِبِيْنَ (۲-۳)

کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ مجرد یہ کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کی جانچ نہ ہو گی اور ہم نے ان لوگوں کو جانچا جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ پس اللہ لازماً ممیز کر کے رہے گا ان لوگوں کو جو اپنے دعوائے ایمان میں راستباز ہیں اور ان لوگوں کو جو جھوٹے ہیں۔

'صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ' یعنی اللہ و رسول کا وعدہ جھوٹا نہیں ثابت ہوا بلکہ بالکل سچا ثابت ہوا۔ جو لوگ اس مرحلے میں ثابت قدم رہیں گے وہ آئندہ ظہور میں آنے والے وعدوں کی صداقت بھی دیکھ لیں گے کہ مسلمان قیصر و کسریٰ کے خزانوں کے مالک ہوں گے۔

'وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا' یعنی اس امتحان نے ان کے اندر کوئی کمزوری پیدا کرنے کے بجائے ان کے ایمان و اطاعت کے جذبے میں مزید قوت پیدا کی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ راہِ حق میں جو آزمائش بھی پیش آتی ہے وہ جس طرح کمزوری کے کھوٹ کو نمایاں کرتی ہے اسی طرح صادقوں کے صدق کو بھی جلا بخشتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ٹھہرائی ہوئی سنت ہے۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ

مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا (۲۳)

سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ لفظ 'رجال' جب اس طرح استعمال ہوتا ہے تو وہ تفخیم شان پر دلیل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اگر اس کا ترجمہ 'مردانِ حق' یا 'مردانِ کار' کیا جائے تو یہ ترجمہ لفظ کی روح کے مطابق ہوگا۔

لفظ 'نحب' وسیع معنوں میں آتا ہے۔ عزم و ہمت، عہد و پیمان، نذر، سب اس کے مفہوم میں داخل ہے۔ امام بخاریؒ نے اس کی تفسیر 'عہد' سے کی ہے اور یہ تفسیر لفظ کی روح اور موقع و محل کے مقتضیات کے بالکل مطابق ہے۔

اوپر آیت ۱۵ میں منافقین کا حال بیان ہو چکا ہے کہ انھوں نے اللہ اور رسول سے یہ عہد کیا تھا کہ اب کسی جنگ کا موقع آیا تو وہ پیٹھ نہیں دکھائیں گے لیکن جب موقع آیا تو محاذ سے فرار کے بہانے ڈھونڈنے لگے۔ یہ ان کے مقابل میں اللہ کے وفادار بندوں کا ذکر ہے کہ مسلمانوں کے اندر وہ مردانِ حق بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے باندھے ہوئے عہد کو اس کی راہ میں جانیں دے کر پورا کر دکھایا اور جو ابھی یہ عہد پورا نہیں کر سکے ہیں وہ سر ہتھیلی پر لیے کھڑے ہیں کہ کب موقع آئے کہ وہ اس فرض سے سبکدوش ہوں۔ 'وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا' اور انھوں نے اللہ سے باندھے ہوئے عہد میں سرِمو تبدیلی نہیں کی۔

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۲۴)

یہاں قرینہ دلیل ہے کہ فعل محذوف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے احزاب کا یہ طوفان اس لیے اٹھایا کہ یہ راستبازوں اور منافقوں کے درمیان امتیاز کے لیے ایک کسوٹی بنے۔ اس پر پرکھ کر اللہ تعالیٰ اپنے راستباز بندوں کو راستبازی کا صلہ دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے اور ان کی توبہ قبول کرے اگر وہ توبہ کریں۔

منافقین کو … کی دعوت

'اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ' میں قرآن کے اس معروف اسلوب کے مطابق جس کی مثالیں گزر چکی ہیں 'يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ' کے بعد بھی 'اِنْ شَآءَ' کے الفاظ ہیں اگرچہ تکرار سے بچنے کے لیے وہ حذف کر دیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت اس کی حکمت اور اس کی سنت کے مطابق ہے، اس وجہ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر وہ توبہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ وہ چاہے گا تو ان کو بخش دے گا۔ اس ٹکڑے میں منافقین کے لیے دعوتِ استغفار ہے کہ ان کے لیے اب بھی گنجائش باقی ہے۔ اگر وہ چاہیں تو استغفار و توبہ کے ذریعہ سے پھر خدا کی رحمت کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ یاددہانی بھی ہے کہ تمام امور کا انحصار اللہ واحد کی مشیت ہی پر ہے اس وجہ سے جھوٹے سہاروں پر تکیہ کرنے کے بجائے وہ اپنے آپ کو اللہ ہی کے حوالہ کریں۔ اس ٹکڑے سے جن لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اللہ تعالیٰ جن کو چاہے گا توبہ و استغفار کے بغیر ہی بخش دے گا،

انھوں نے توبہ کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی سنت کو نہیں سمجھا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کی مشیت کو کوئی دوسرا روک یا بدل نہیں سکتا لیکن اس نے اپنے عدل و حکمت کے تحت جو قاعدے ٹھہرائے ہیں اس کی مشیت ان قاعدوں کو باطل نہیں کرتی۔

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۚ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا (۲۵)

دشمنوں کی پسپائی اور اہل ایمان کی حوصلہ افزائی

'الَّذِيْنَ كَفَرُوْا' سے مراد احزاب کے شرکاء ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ غصہ اور بغض و عناد سے بھرے ہوئے آئے تھے کہ مسلمانوں کو کچا ہی کھا جائیں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے غصہ کے ساتھ ہی ان کو پسپا کر دیا، وہ اس کا کوئی حصہ بھی نکال نہ سکے۔ 'لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا' یعنی ان کے منصوبے تو بڑے بڑے تھے لیکن ان کے کسی منصوبے میں ان کو ذرا بھی کامیابی نہیں ہوئی۔

'وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ' یعنی دشمنوں کے اس خطرناک حملہ کے دفاع کے لیے مسلمانوں کو خود کوئی لڑائی نہیں لڑنی پڑی بلکہ ان کی طرف سے لڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کافی ہو گیا۔ اس نے اپنی باد تند اور اپنے ملائکہ کی افواج قاہرہ کے ذریعہ سے دشمنوں کے قدم اکھاڑ دیے اور وہ مایوس و نامراد پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔

'وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا' یہ تمہید کے مضمون 'وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا' کی یاد دہانی ہے کہ اللہ تعالیٰ قوی اور غالب و مقتدر ہے، اس وجہ سے اس کے بندوں کو چاہیے کہ اس پر پورا بھروسہ رکھیں۔ اگر وہ اس کے بھروسہ پر اس کی راہ میں اٹھیں گے تو وہ ان کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا بلکہ عناصر کائنات اور اپنے ملائکہ کو وہ ان کی مدد کے لیے بھیج دے گا۔

وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ۚ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا (۲۶-۲۷)

بنو قریظہ کی عہد شکنی اور ان کا انجام

یہ بنو قریظہ کی طرف اشارہ ہے۔ ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدۂ امن و صلح کر رکھا تھا لیکن جب احزاب نے اپنی مجتمع قوت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کیا کہ ان کو ہمیشہ کے لیے جڑ پیڑ سے اکھاڑ کے رکھ دیں تو انھوں نے بھی معاہدہ کو بالائے طاق رکھ کر احزاب کا ساتھ دیا۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مشہور یہودی لیڈر حیی بن اخطب نضری بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد سے ملا اور اس کو ساتھ دینے کے لیے اس نے ابھارا۔ پہلے تو اس نے معاہدہ کے سبب سے کچھ تذبذب کا اظہار کیا لیکن جب حیی بن اخطب نے یہ پٹی پڑھائی کہ میں تمھی لوگوں کی خاطر تو سارے عرب کو اکٹھا کر کے مدینہ پر چڑھا لایا ہوں۔ اگر تمھی نے اس مہم میں ساتھ نہ دیا تو پھر میری اس تمام دوڑ دھوپ کا حاصل کیا! مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دینے کا

یہ آخری موقع ہے، اگر یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پچھتاؤ گے اور اس پچھتانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ حیی بن اخطب کا یہ جادو کارگر ہوگیا اور بنو قریظہ بھی معاہدہ توڑ کر حملہ آوروں میں شامل ہوگئے۔ مسلمانوں کے لیے یہ چیز مزید پریشانی کا باعث ہوئی۔ مدینہ کے بالکل قریب ان کے قلعے اور گڑھیاں تھیں اور لڑنے والے افراد کی بھی ان کے پاس کافی تعداد تھی۔ ان کی شرکت سے دشمنوں کا حوصلہ دو چند ہوگیا اور مسلمانوں کے لیے آزمائش بہت ہی صبر آزما بن گئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی تائید غیبی سے جس طرح تمام پارٹیوں کو پسپا ہونا پڑا اسی طرح انھیں بھی پسپا ہونا پڑا۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ محاذ سے واپسی کے معاً بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ آپ بنو قریظہ پر حملہ کریں۔ آپ نے مسلمانوں کو فوراً حملہ کر دینے کا حکم دے دیا اور بنو قریظہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ یہ محاصرہ تقریباً ۲۵ دن جاری رہا۔ بالآخر انھوں نے مرعوب ہو کر حضرت سعد بن معاذؓ کو حکم مان لیا کہ وہ جو فیصلہ کردیں ان کو منظور ہوگا۔ حضرت سعدؓ نے فیصلہ کیا۔ ان کے تمام قابل جنگ افراد قتل کر دیے جائیں اور بقیہ کو لونڈی غلام بنا لیا جائے۔ اس فیصلہ کی فوراً تعمیل کی گئی۔ اسی واقعہ کی طرف آیت میں اشارہ ہے۔

'مِنْ صَيَاصِيهِمْ'۔ 'صِيصَة' مرغ کے پنجے کو کہتے ہیں۔ اسی سے جمع 'صَيَاصِي' ہے جو بیل کے سینگوں کے لیے بھی آتا ہے اور پھر ترقی کر کے دفاعی حصارات، قلعوں اور گڑھیوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ بنو قریظہ پہلے تو اپنے قلعوں میں محصور ہوگئے لیکن محاصرے سے تنگ آکر بالآخر ان کو مجبوراً ان سے نکلنا پڑا اور اپنے آپ کو اپنے اہل و عیال سمیت مسلمانوں کے حوالہ کرنا پڑا۔ 'وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ' اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اس طرح مسلمانوں کا رعب ڈال دیا کہ حضرت سعدؓ کے فیصلہ کے خلاف ان کو چوں کرنے کی بھی جرأت نہ ہوسکی۔ مسلمانوں نے بغیر کسی ادنیٰ مزاحمت کے، ان کے قابل جنگ افراد کو قتل کر کے بقیہ کو لونڈی غلام بنا لیا۔

'وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ' اور ان کا پورا علاقہ، ان کے تمام مکانات و حصارات اور ان کے ہر قسم کے اموال و اثاثات کے ساتھ، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے قبضے میں دے دیا۔

مسلمانوں کو بشارت

'وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا'۔ یہ بشارت ہے مستقبل کی فتوحات کی۔ فرمایا کہ یہ نقد عاجل تو جو کچھ تمھیں ہم نے بخشا وہ تم نے دیکھ لیا لیکن ابھی اور بھی علاقے تمھارے قبضہ میں آئیں گے جن تک تمھارے قدم ابھی نہیں پہنچے ہیں لیکن ان کی وراثت ہم نے تمھارے لیے مقدر کر رکھی ہے۔ یہ اشارہ خیبر، مکہ اور روم و شام وغیرہ کی فتوحات کی طرف ہے۔ 'وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا'۔ یعنی یہ جو کچھ تم نے اپنی آنکھوں دیکھا کافی ہے یہ اطمینان پیدا کرنے کے لیے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، کوئی اس کے ارادے میں مزاحم نہیں ہوسکتا اس وجہ سے اہل ایمان کو چاہیے کہ اس پر پورا پورا بھروسہ رکھیں۔

۴۔ آگے کا مضمون ۔ آیات ۲۸ - ۳۵

اوپر کے پیرے میں عام مسلمانوں کو اللہ اور رسول کی اطاعت پر مجتمع کرنے کے بعد آگے ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ان کو منافقین اور منافقات کے فتنوں سے ہوشیار رہنے کی تلقین فرمائی ہے کہ ان کی کوشش یہ ہے کہ ازواج نبی (رضی اللہ عنہم) کے دلوں میں بھی طلب دنیا کی بیماری پیدا کریں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے رسول کی رفاقت کے لیے اس لیے چنا ہے کہ وہ اس کتاب و حکمت کی تعلیم کا ذریعہ بنیں جو اللہ کے رسول سے انھیں حاصل ہو رہی ہے۔ اللہ کے ہاں ان کا مرتبہ بہت اونچا ہے اگر انھوں نے اپنے فریضۂ منصبی کی ذمہ داریاں ادا کیں۔ اسی طرح ان کے لیے سزا بھی بہت ہی سخت ہے اگر ان سے کوئی جرم صادر ہوا ——— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۸-۳۵ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا
وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿۲۸﴾
وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ
اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ
مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۭ وَ
كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾ وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ الجزء ۲۲
وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا
كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ
فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ
قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۳۲﴾ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ
الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ

تَطْهِيرًا ﴿۳۳﴾ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ ۚ
ع ۱ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا ﴿۳۴﴾ إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ
وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَ
الصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ
وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ
وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ
مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ﴿۳۵﴾

ترجمہ آیات ۲۸-۳۵

اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینتوں کی طالب ہو تو آؤ، میں تمہیں دے دلا کر خوبصورتی کے ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دارِ آخرت کی طالب ہو تو اطمینان رکھو کہ اللہ نے تم سے خوبی کے ساتھ نباہ کرنے والیوں کے لیے ایک اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔ ۲۸-۲۹

اے نبی کی بیویو، تم میں سے جو کسی کھلی بے حیائی کی مرتکب ہوگی تو اس کے لیے دوچند عذاب ہے۔ اور یہ بات اللہ کے لیے آسان ہے۔ اور جو تم میں سے اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبردار رہیں گی اور عملِ صالح کریں گی ہم ان کو دُہرا اجر دیں گے اور ہم نے ان کے لیے باعزت رزق تیار کر رکھا ہے۔ ۳۰-۳۱

اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی مانند نہیں ہو اگر تم تقویٰ اختیار کرو۔ تو تم لہجہ میں نرمی نہ اختیار کرو کہ جس کے دل میں بیماری ہے وہ کسی طمعِ خام میں مبتلا ہو جائے اور بات معروف کے مطابق کہو۔ ۳۲

اور اپنے گھروں میں ٹک کے رہو اور سابقہ جاہلیت کے سے انداز اختیار نہ کرو۔ اور نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ دیتی رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ اے اہلِ بیتِ نبی! کہ تم سے آلودگی کو دور کرے اور تمھیں اچھی طرح پاک کرے اور تمھارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت کی جو تعلیم ہوتی ہے اس کا چرچا کرو۔ بے شک اللہ نہایت ہی باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے۔ ۳۲-۳۴

اطاعت کرنے والے مرد اور اطاعت کرنے والی عورتیں، ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں، فرماں برداری کرنے والے مرد اور فرماں برداری کرنے والی عورتیں، راستباز مرد اور راستباز عورتیں، ثابت قدمی دکھانے والے مرد اور ثابت قدمی دکھانے والی عورتیں، فروتنی اختیار کرنے والے مرد اور فروتنی اختیار کرنے والی عورتیں۔ خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو کثرت سے یاد رکھنے والے مرد اور اللہ کو کثرت سے یاد رکھنے والی عورتیں —— ان کے لیے اللہ نے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔ ۳۵

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا (۲۸-۲۹)

آیات کا پس منظر قرآن کی روشنی میں

ہمارے مفسرین نے ان آیات کا پس منظر یہ بتایا ہے کہ فتح خیبر کے بعد جب مسلمانوں کو فی الجملہ معاشی کشادگی حاصل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج نے بھی آپ سے مطالبہ کیا کہ ان کو بھی زندگی کی راحتوں

اور زینتوں سے تمتع ہونے کا موقع دیا جائے۔ ان کے اس مطالبہ پر بطورِ عتاب یہ آیات نازل ہوئیں۔ ہمارے نزدیک کئی پہلوؤں سے یہ بات نہایت کمزور ہے۔

اول تو قرینہ دلیل ہے کہ یہاں جن حالات پر تبصرہ ہو رہا ہے وہ ہجرت کے چوتھے یا پانچویں سال سے تعلق رکھنے والے ہیں، اور غزوۂ خندق اور بنو قریظہ کے حالات زیرِ بحث آئے ہیں، آگے حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ ان تمام واقعات کا تعلق ۵ھ سے ہے۔ خیبر ابھی فتح نہیں ہوا تھا۔ اور آیت ۲۷ کے الفاظ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا کے تحت خود مفسرین ہی نے یہ تصریح کی ہے کہ یہ فتح خیبر کی پیشگی بشارت ہے۔

دوسرا یہ کہ یہ مطالبہ اگر محض نفقہ میں فی الجملہ توسیع کے لیے تھا تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جس پر ان کو یہ نوٹس دے دیا جائے کہ ان کو دے دلا کر ہمیشہ کے لیے رخصت کر دیا جائے۔ اس طرح کی بات پر اول تو کسی تنبیہ کی سزاوار ہی نہیں تھیں اور اگر تھیں بھی تو زیادہ سے زیادہ اس نصیحت کی مستحق تھیں کہ نبی کی معیت مطلوب ہے تو انھیں صبر و قناعت کی زندگی اختیار کرنی پڑے گی۔

تیسرا یہ کہ امہات المومنینؓ کے متعلق یہ سوءِ ظن نہیں کیا جا سکتا کہ ان پر دنیا کی راحتوں اور زینتوں کا شوق کسی دور میں بھی اتنا غالب آ گیا ہو کہ وہ اس کا مطالبہ لے کر اٹھ کھڑی ہوئی ہوں اور معاملہ اتنا سنگین ہو گیا ہو کہ خود اللہ تعالیٰ کو اس میں مداخلت کرنی پڑی ہو اور نوبت اس نوٹس تک پہنچ گئی ہو جو ان آیات میں ان کو دیا گیا۔

بہر حال یہ شانِ نزول ہمارے نزدیک قابلِ توجہ نہیں ہے نہ آیت کے الفاظ سے اس کی تائید ہوتی ہے نہ وقت کے حالات سے۔ ہم یہاں اس سورہ کی روشنی میں وقت کے بعض خاص حالات کی طرف اشارہ کریں گے جن سے ان آیات کا صحیح موقع و محل سمجھنے میں مدد ملے گی۔

اس پوری سورہ پر تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں منافقین کی ریشہ دوانیاں جس طرح عام مسلمانوں کو اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بدگمان و برگشتہ کرنے کے لیے بہت بڑھ گئی تھیں اسی طرح منافقات کے ذریعے سے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کے سکون کو درہم برہم کرنے کے لیے بھی بڑی خطرناک مہم چلا رکھی تھی۔ منافق عورتیں امہات المومنینؓ کے گھروں میں جاتیں اور نہایت ہمدردانہ انداز میں ان سے کہتیں کہ آپ لوگ شریف اور معزز گھرانوں کی بیٹیاں ہیں لیکن آپ لوگوں کی زندگی ہر راحت و لذت سے محروم، بالکل قیدیوں کی طرح گزر رہی ہے۔ اگر آپ دوسرے گھروں میں ہوتیں تو آپ کی زندگی بیگمات کی طرح نہایت عیش و آرام اور ٹھاٹ باٹ کے ساتھ گزرتی۔ ساتھ ہی وہ یہ وسوسہ اندازی بھی کرتیں کہ اگر یہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کو طلاق دے دیں تو بڑے بڑے رئیس اور سردار آپ لوگوں سے نکاح کر لیں گے اور آپ لوگوں کی زندگیاں قابلِ رشک ہو جائیں گی۔ آگے کی آیات سے یہ بات بھی سامنے آئے گی کہ منافقین

کو بھی جب کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں جانے اور آپ کی ازواج مطہراتؓ سے بات کرنے کا موقع ملتا تو وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ان کے اندر کچھ نہ کچھ وسوسہ اندازی کی ضرور کوشش کرتے۔ ان کوششوں سے ان کا اصل مقصد تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کے اندر کوئی اس طرح کا فتنہ کھڑا کرنا تھا جس طرح کا فتنہ انھوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے متعلق کھڑا کر دیا تھا، جس کی تفصیلات سورۂ نور میں آپ پڑھ چکے ہیں، ورنہ ادنیٰ درجے میں یہ فائدہ تو ان کو یقینی طور پر نظر آتا تھا کہ اس سے ازواج نبی (رضی اللہ عنہم) کے اندر بے اطمینانی پیدا ہوگی اور کیا عجب کہ اس طرح کوئی ایسی شکل نکل آئے کہ وہ آپ کی ازواج کے ساتھ نکاح کرنے کا جو مذموم ارادہ رکھتے ہیں وہ پورا ہو جائے۔

منافقین و منافقات کی ان چالوں سے اگرچہ امہات المومنینؓ بالکل بے خبر نہیں تھیں، بعض تلخ تجربے ان کو ہو چکے تھے، لیکن شریف، کریم النفس اور باحیا لوگوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص ان کے سامنے اگر ہمدردی و خیرخواہی کے انداز میں بات کرتا ہے تو وہ اس کے کھوٹ سے واقف ہوتے ہوئے بھی، اس کو جواب نرمی ہی سے دیتے ہیں۔ امہات المومنینؓ بھی اپنی کریم النفسی کے سبب سے ان لوگوں کو نرمی ہی سے جواب دیتیں جس سے یہ کمینے لوگ اس طمع خام میں مبتلا ہو جاتے کہ ان کا پروپیگنڈا کامیاب ہو رہا ہے اور وہ بہت جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔

یہ حالات تھے جن میں یہ آیات اتری ہیں۔ ان میں جو باتیں فرمائی گئی ہیں ان کو سنانا تو مقصود ہے دراصل ان منافقین اور منافقات کو جن کی ریشہ دوانیوں کے تار و پود ان میں بکھیرے گئے ہیں، لیکن وہ پسِ پردہ تھے اس وجہ سے قرآن نے ان کو مخاطب کرنے کے بجائے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ازواج نبی (رضی اللہ عنہم) کو مخاطب کر کے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا۔

یہاں بلاغتِ کلام کے اس اسلوب کو یاد رکھیے کہ بسا اوقات ظاہر الفاظ کے اعتبار سے کلام میں خطاب کسی سے ہوتا ہے، لیکن اس میں کوئی عتاب مضمر ہوتا ہے تو اس کا رخ کسی اور طرف ہوتا ہے۔

آیات کا مفہوم

اس پس منظر کو سامنے رکھ کر اب آیات کے مفہوم پر غور کیجیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ اے نبی! تم اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کے عیش اور اس کی زینتوں کی طالب ہو تو آؤ، میں تمھیں دے دلا کر خوبصورتی کے ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ، اس کے رسول اور دارِ آخرت کی کامرانیوں کی طالب ہو تو یاد رکھو کہ تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسول کے حقوق کو اچھی طرح ادا کرنے والی اور آخرت کی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر پہچاننے والی ہوں گی، اللہ نے ان کے لیے اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آزادی کا یہ اختیار نامہ ازواجِ مطہراتؓ کے سامنے رکھ دیا اور سب سے پہلے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے سامنے رکھا جو آپ کو سب سے زیادہ محبوب تھیں۔ آپ نے ان کو یہ ہدایت بھی فرمائی کہ وہ اس کے جواب میں جلدی نہ کریں بلکہ اپنے والدین سے بھی مشورہ کر لیں۔

اس کے بعد جواب دیں۔ لیکن حضرت صدیقہؓ نے بغیر کسی توقف کے جواب دیا کہ مجھے اس معاملے میں کسی کے مشورے کی کیا ضرورت ہے، میں اللہ اور اس کے رسول کو اختیار کرتی ہوں! منافقین نے سب سے زیادہ جادو تو انہی پر چلانے کی کوشش کی ہوگی، جب ان کا جواب ان کی تمام توقعات پر پانی پھیر دینے والا ثابت ہوا تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

اس طرح قرآن نے ایک طرف تو منافقین کی ان ریشہ دوانیوں کا ہمیشہ کے لیے سدباب کر دیا جو وہ ازواج مطہرات کے درمیان کر رہے تھے دوسری طرف اس امتحان کے ذریعے سے یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ ازواج مطہراتؓ سب بلا استثناء اللہ و رسول اور آخرت کی طالب تھیں۔ اسی چیز نے ان کو اللہ کے رسول کے ساتھ وابستہ کیا تھا اور یہ وابستگی اتنی مستحکم تھی کہ اس دنیا کی کوئی طمع اس کو توڑ نہیں سکتی تھی۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ ان آیات میں ازواج مطہراتؓ پر دنیا طلبی کے جرم میں کوئی عتاب نہیں ہوا ہے جیسا کہ لوگوں نے سمجھا ہے بلکہ یہ اللہ و رسول کی طرف سے ان کو آزادی کا پروانہ دے کر ان کے اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کرایا گیا تاکہ ان منافقین کے حوصلے ہمیشہ کے لیے پست ہو جائیں جو اس طمع خام میں مبتلا تھے کہ ازواج نبی (رضی اللہ عنہم) کو دنیا کی کسی طمع کے پھندے میں پھنسا کر اپنی طرف مائل کیا جا سکتا ہے۔ اس اعلانِ تخییر کے بعد گویا ہر ایک کو حوصلہ آزمائی کا موقع دے دیا گیا لیکن سب پر ثابت ہو گیا کہ اہلِ بیتِ رسالت کا انتخاب خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور اس حرم کے اندر کسی کے لیے کسی دراندازی کی گنجائش نہیں ہے۔

وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا۔ لفظ 'احسان' یہاں حسن و خوبی اور اخلاص و راستبازی کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے حقوق اور طلبِ آخرت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے مفہوم میں ہے۔ اس آیت میں کچھ مضمون محذوف ہے جس پر اس کا اسلوب بیان دلیل ہے۔ اس اسلوب کا پورا حق ادا کیجیے تو مطلب یہ ہوگا کہ اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی طالب اور دارِ آخرت کی کامرانیاں چاہنے والی ہو تو نہایت خوبی اور مستعدی کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور طلبِ آخرت کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں سرگرم رہو اور یہ اطمینان رکھو کہ تم میں سے جو ان حقوق و فرائض کو 'احسان' کے ساتھ ادا کرنے والی ہوں گی اللہ نے ان کے لیے بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔ اس سے ضمناً یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) کے لیے بھی مجرد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت کوئی کام آنے والی چیز نہیں ہے بلکہ اصل چیز عمل و اطاعت ہے اور عمل و اطاعت بھی 'احسان' کے ساتھ۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۔ (۳۰)

مسئولیت باعتبار مرتبہ

اوپر کی بات تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے کہلائی گئی اس لیے کہ اس کا آپ کی زبان ہی سے کہلایا جانا موزوں تھا۔ اب آگے براہِ راست ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) کو مخاطب کر کے ان پر واضح کیا گیا ہے کہ نبی کی بیویاں ہونے کے سبب سے اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا درجہ و مرتبہ بھی بہت اونچا ہے اس مرتبہ ہی کے اعتبار سے ان کی ذمہ داریاں بھی بہت بھاری ہیں۔ پہلے ان کی ذمہ داری بتائی کہ وہ اس امر کو یاد رکھیں کہ اگر ان سے کوئی جرم صادر ہوا تو وہ اسی ترازو سے نہیں تولا جائے گا جس سے دوسروں کے جرم تولے جائیں گے بلکہ ان کے اعمال الگ باٹ اور الگ ترازو سے تولے جائیں گے اور دوسروں کی نسبت سے ان کو دُونی سزا ملے گی۔

'وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا' یعنی تم میں سے کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ رسول کی زوجیت میں ہونے کے سبب سے تم میں سے کسی کو سزا دینا اللہ پر ذرا بھی شاق گزرے گا۔ اللہ کا قانون بالکل بے لاگ ہے۔ وہ کسی کے ساتھ کسی نسبت و تعلق کی بنا پر کوئی رعایت نہیں کرے گا۔

اس تنبیہ سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ العیاذ باللہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے کسی سنگین نوعیت کے جرم کا اندیشہ تھا۔ یہ محض ان کی ذمہ داری اور ان کے مرتبہ و مقام کی یاد دہانی کر کے ان کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ وہ منافقین کی وسوسہ اندازیوں سے اچھی طرح ہوشیار رہیں۔ یہاں 'فَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ' (کھلی بے حیائی) کے الفاظ جو استعمال ہوئے ہیں وہ منافقین و مفسدین کے مخفی ارادوں کو پیش نظر رکھ کر استعمال ہوئے ہیں۔ یہ لوگ رات دن اسی تگ و دو میں تھے کہ اہلِ بیتِ رسالت سے متعلق کوئی سکینڈل (SCANDAL) پیدا کریں، تاکہ ان کا کلیجہ ٹھنڈا ہو اور مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ برباد ہو۔ قرآن نے یہ لفظ استعمال کر کے ازواجِ مطہرات کو آگاہ کر دیا کہ منافقین ہمدردی و خیر خواہی کے بھیس میں درحقیقت اپنے بہت بڑے شیطانی منصوبے کی فکر میں ہیں۔

'وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا (۳۱)'

یعنی جس طرح تمہارے کسی جرم کی سزا دگنی ہے اسی طرح تمہاری نیکیوں کی جزا بھی دگنی ہے۔ اس وجہ سے تم میں سے جو اللہ و رسول کی صدقِ دل سے فرمانبرداری اور عمل صالح کرتی رہیں گی اللہ ان کو دوہرا اجر دے گا اور ان کے لیے باعزت رزق اس نے تیار کر رکھا ہے۔ ہم دوسرے محل میں واضح کر چکے ہیں کہ رزق اللہ تعالیٰ کے فضل و انعام کی تعبیر ہے اور اس کے ساتھ کریم کی صفت اس حقیقت کی تعبیر کے لیے ہے کہ یہ رزق و فضل ان کو بطور صدقہ نہیں ملے گا بلکہ ان کے حق کے طور پر ملے گا اور ہمیشہ کے لیے بلا کسی قید و شرط اور بغیر کسی اندیشۂ احتساب و مواخذہ کے ملے گا۔

ان آیات سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ خدا کے ہاں مواخذہ اتمامِ حجت کے اعتبار سے ہوگا اور

اعمال کا صلہ ان حالات کے اعتبار سے ملے گا جن میں وہ انجام دیے گئے ہیں۔ ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) کو چونکہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی معیت حاصل ہوئی اور رسول اتمامِ حجت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اس وجہ سے ان سے مواخذہ سخت ہوگا۔ اسی طرح رسول کی رفاقت پوری وفاداری کے ساتھ چونکہ بڑا کٹھن کام ہے اس وجہ سے اس کا صلہ بھی دُگنا ہے۔ جرموں کے مواخذہ اور اعمال کے صلہ کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے اور یہ بالکل مبنی بر عدل و حکمت ہے۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (۳۲)

خاص حالات کی بنا پر ایک خاص ہدایت

'خضوع' کے معنی تواضع و خاکساری کے اظہار کے ہیں۔ 'فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ' کے معنی ہوں گے 'بات کہنے میں نرمی و تواضع نہ اختیار کرو'۔ عام حالات میں تو پسندیدہ طریقۂ کلام یہی ہے کہ آدمی تواضع کا انداز اختیار کرے لیکن بعض اوقات حالات و مصالح کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس سے مختلف روش اختیار کی جائے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اس دور میں منافقین و منافقات رات دن اس تگ و دو میں تھے کہ ازواجِ مطہراتؓ کے دلوں میں وسوسہ اندازی کر کے کوئی ایسی بات نکالیں جس کو ایک فتنہ بنا سکیں۔ ان لوگوں کی باتیں ہمدردانہ رنگ میں ہوتی تھیں اس وجہ سے امہات المومنینؓ بھی ان کا جواب اپنی شرافتِ نفس کے سبب سے نرم انداز ہی میں دیتی تھیں جس سے یہ مفسدین دلیر ہوتے جا رہے تھے اور ان کو یہ توقع ہو چلی تھی کہ وہ بہت جلد اپنی سازش میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان خاص حالات کی بنا پر امہات المومنینؓ کو اپنا رویہ بدل دینے کی ہدایت ہوئی۔ فرمایا کہ اے نبی کی بیویو، تم عام عورتوں کی مانند نہیں ہو۔ نبی کے ساتھ نسبت کے باعث تمھاری نیکی اور بدی دونوں کی ایک خاص اہمیت ہے۔ تمھاری نیکی دوسروں کے لیے مثال اور نمونہ بنے گی اور تم سے کوئی غلطی صادر ہوگی تو اس کو بھی اصحاب الاغراض حجت بنائیں گے اس وجہ سے تمھارے لیے احتیاط کی روش اولیٰ ہے۔ اگر منافقین تمھارے دلوں میں وسوسہ اندازی کرنے کی کوشش کریں تو بربنائے مروت و شرافت ان کی بات کا جواب نرمی و تواضع سے نہ دو کہ جس کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کے خلاف بغض و حسد ہے وہ کوئی غلط توقع کر بیٹھے، بلکہ صاف انداز میں اس سے اس طرح بات کہو کہ اگر وہ اپنے دل میں کوئی برا ارادہ لے کر آیا ہے تو اس کو اچھی طرح اندازہ ہو جائے کہ یہاں اس کی دال گلنے والی نہیں ہے۔

ازواجِ نبیؐ کا مرتبہ

'لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ' یہ ازواجِ مطہراتؓ کے مرتبہ کی طرف اشارہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت کی بنا پر ان کو دنیا کی تمام عورتوں کے مقابل میں حاصل تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد ان کے ہر قول و فعل کو امت کے لیے نمونہ و مثال کی حیثیت حاصل ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کا درجہ 'امہات المومنین' کا قرار دے دیا۔ 'اِنِ اتَّقَيْتُنَّ' کے الفاظ سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ مرتبۂ عالی

جو ان کو حاصل ہے یہ تقویٰ کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر وہ تقویٰ پر قائم رہیں گی تو یہ سرفرازی ان کو حاصل رہے گی، اور اگر یہ عہد وہ پوری نہ کر سکیں گی تو، جیسا کہ اوپر گزرا، ان کی مسئولیت دوسروں کے بالمقابل دگنی ہے۔

'فِیْ قَلْبِہٖ مَرَضٌ' میں 'مرض' سے وہ کینہ و حسد مراد ہے جو اشرار منافقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنے دلوں میں رکھتے تھے اور جس کے سبب سے رات دن ان کی کوشش یہ تھی کہ آپؐ کی ازواج مطہراتؓ کو کسی طرح بدنام کریں۔ اسی گروہ کے سرغنہ نے 'افک' کا فتنہ کھڑا کیا تھا۔

'وَقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا' میں 'قول معروف' سے یہ مراد ہے کہ ایسے لوگوں سے اگر بات کرنے کی نوبت آئے تو بات بالکل صاف و سادہ انداز میں کی جائے جس طرح ایک عام آدمی سے کی جاتی ہے جس میں لگاوٹ کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ یعنی اُن کے ہمدردانہ لب و لہجہ سے متاثر ہو کر ان کے ساتھ کوئی نرم انداز نہ اختیار کیا جائے۔ یہ کمینہ لوگ ہیں اس وجہ سے یہ شرافت سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاہِلِیَّۃِ الْاُوْلٰی وَاَقِمْنَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتِیْنَ الزَّکٰوۃَ وَاَطِعْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ ۭ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْہِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَہْلَ الْبَیْتِ وَیُطَہِّرَکُمْ تَطْہِیْرًا (۳۳)

ازواج نبیؐ کو خطاب کرکے وقت کی [illegible] پر تعریض

اسی سلسلہ میں یہ مزید ہدایات دی گئی ہیں جن سے مقصود ازواج مطہراتؓ کو منافقین و منافقات کے فتنوں سے بچا کر ان کاموں میں لگانا تھا جو ان کے شایانِ شان تھے اور جن کے لیے ہی اللہ تعالیٰ نے ان کا انتخاب فرمایا تھا۔ ان ہدایات کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لیے اس بات کو ذہن میں تازہ کر لیجیے جس کی طرف ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں کہ منافق عورتیں ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہن) کے دلوں میں بھی اسی طرح کے ارمان پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں جس طرح کے ارمان ان کے اپنے دلوں میں تھے۔ مثلاً وہ کہتیں کہ اگر آپ لوگوں کو ان (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی قید سے رہائی حاصل ہو جائے تو وقت کے بڑے بڑے سردار آپ لوگوں کو نکاح کے پیغام دیں گے اور آپ لوگ بھی اسی طرح بن ٹھن کر زیب و زینت کے ساتھ شاپنگ اور سیر سپاٹے کے لیے نکلا کریں گی جس طرح امراء کی بیگمات نکلا کرتی ہیں۔ قرآن نے منافقات کی انہی پس پردہ وسوسہ اندازیوں اور بدآموزیوں کی طرف تلمیح کرتے ہوئے، ازواج مطہراتؓ کو یہ تلقین فرمائی کہ تم اپنے گھروں میں ٹِک کے بیٹھو، زمانۂ جاہلیت کی عورتوں کی طرح اپنی زینتوں کی نمائش کرتی نہ پھرو۔

یہ ہدایت بالکل اسی طرح کی ہدایت ہے جس طرح کی ہدایت کوئی نیک دل باپ اپنی سعادت مند اولاد کو اس وقت کرتا ہے جب اس کے علم میں یہ بات آتی ہے کہ کچھ برے لوگ اپنی بدآموزیوں سے اس کی اولاد کو غلط راہ پر ڈال رہے ہیں۔ اس وقت اگر وہ اپنے نیک بخت بیٹے سے یہ کہتا ہے کہ تم اپنی ساری توجہ اپنی تعلیم پر مرکوز کرو، آواروں کی طرح سڑکوں پر نعرے لگاتے نہ پھرو تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ [illegible] لڑکا آواروں کی طرح سڑکوں پر پھر رہا تھا یا اس کے آوارہ ہونے کا اندیشہ تھا بلکہ یہ

محض وقت کے آواروں پر ایک تعریض اور ان کے طریقہ سے بچانے کے لیے ایک تنبیہ ہوتی ہے۔ اسی طرح کی ہدایت ازواجِ مطہراتؓ کو دی گئی ہے۔ اس میں درحقیقت وقت کی بیگمات کے رویہ پر تعریض اور ان کی تحقیر ہے۔ لیکن بات ان کو خطاب کر کے کہنے کے بجائے ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) کو خطاب کر کے کہی گئی ہے، ورنہ امہات المومنینؓ میں بھلا ایسا کون تھا جس کی نسبت یہ شبہ بھی کیا جا سکے کہ ان کے دل میں گھر سے باہر پھرنے یا جاہلیت کی عورتوں کی طرح اپنے بناؤ سنگار کی نمائش کا ارمان ہوگا!

جاہلی تہذیب کے ختم ہونے کی پیشین گوئی

'جاہلیت' کے ساتھ یہاں 'اولیٰ' کی صفت کی بنا پر ہمارے مفسرین نے اس سے حضرت نوحؑ یا حضرت ادریسؑ کے زمانہ کی جاہلیت مراد لی ہے۔ لیکن اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ نہایت بلیغ طریقہ سے اس جاہلی تہذیب کے ختم ہونے کی طرف اشارہ ہے جس کو منافقین و منافقات اب تک اپنے سینوں سے لگائے یہ امید لیے بیٹھے تھے کہ اسلام کے ظہور سے اس کو جو دھکا لگا ہے یا لگنے کا اندیشہ ہے اس کے باوجود یہ باقی رہے گی۔ قرآن نے ان کی اسی امید پر ضرب لگانے کے لیے اس کو 'جاہلیتِ اولیٰ' سے تعبیر فرمایا کہ اب اس کو قصۂ ماضی سمجھو، اس کا دور اب ختم ہو چکا ہے، جو لوگ اس کے ازسرِ نو فروغ پانے کے خواب دیکھ رہے ہیں وہ جنت الحمقاء میں بس رہے ہیں۔ اسلام اور اسلامی تہذیب نے اس کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں اور اگر اس کے کچھ آثار باقی ہیں تو وہ بہت جلد مٹ کے رہیں گے۔ اب جو لوگ اس گھر کی دربانی کر رہے ہیں وہ ایک اجڑے گھر کی دربانی کر رہے ہیں۔ اگر انھوں نے اپنے رویہ میں تبدیلی نہ کی تو جس دن یہ گھر گرے گا یہ بھی اس کے نیچے دفن ہو کے رہ جائیں گے۔

کرنے کے کام

'وَاَقِمۡنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيۡنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ'۔ یعنی کرنے کا کام وہ نہیں ہے جو جاہلی تہذیب کی علمبردار بیگمات کر رہی ہیں بلکہ یہ ہے کہ نماز کا اہتمام کرو اور زکوٰۃ ادا کرتی رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں پوری وفاداری کے ساتھ سرگرم رہو۔ یہاں نماز اور زکوٰۃ اور اطاعت اللہ و رسول کا حوالہ دین کی جامع باتوں کی حیثیت سے آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے دائرۂ کار یعنی گھروں کے اندر اسی نور کو تم پھیلاؤ جس نور کو باہر کی زندگی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ پھیلا رہے ہیں۔

بیگمات جاہلیت کے سامانِ زینت پر طنز

'اِنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيُذۡهِبَ عَنۡكُمُ الرِّجۡسَ اَهۡلَ الۡبَيۡتِ وَيُطَهِّرَكُمۡ تَطۡهِيۡرًا'۔ یہ اہل بیت کو خاص اہتمام کے ساتھ مخاطب کر کے، نہایت شفقت و محبت کے انداز میں تسلی دی گئی ہے کہ یہ ہدایات جو تمھیں دی جا رہی ہیں ان سے مقصود تمھاری زندگی کو قید و بند میں جکڑنا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اہل بیتِ نبوت سے ہر آلائش کو دور رکھے اور ان کی نہایت اعلیٰ تربیت کر کے ان کو دنیا اور آخرت دونوں میں اپنے رسول کی رفاقت کے لائق بنائے۔ لفظ 'رجس' میں یہاں 'بیگمات' کے سامانِ زینت پر تعریض ہے کہ یہ زینت نہیں بلکہ گندگی کا بوجھ ہے جس کو یہ لادے پھر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کے

اہلِ بیت کو اس گندگی سے پاک رکھنا چاہتا ہے۔

چند قابلِ توجہ باتیں

اس آیت کی اصل تعلیم کی وضاحت تو اوپر کی سطروں میں ہو چکی ہے لیکن چند اور باتیں بھی اس میں قابلِ توجہ ہیں۔

عورت کا اصلی دائرہ کار

ایک یہ کہ عورت کا اصل دائرۂ کار اس کا گھر ہے۔ اس کو اپنی تمام سرگرمیاں اس کے اندر ہی محدود رکھنی چاہئیں اور اگر کبھی اس کو گھر کے حدود سے باہر قدم نکالنے کی ضرورت پیش آئے تو اسے ان حدود کی پابندی کرنی ہوگی جن کی تفصیل اسی سورہ میں آگے آرہی ہے۔

دوسری یہ کہ عورتوں کا بناؤ سنگار کر کے گھروں سے باہر نکلنا تہذیب کی ترقی کی نشانی نہیں ہے بلکہ یہ جاہلیتِ اولیٰ کی طرف رجعت ہے۔

اصل اہلِ بیت ازواجِ نبیؐ ہیں

تیسری یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت ہونے کا شرف اصلاً آپ کی ازواجِ مطہراتؓ کو حاصل ہے۔ یہ آیت اس باب میں نصِ قطعی کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن میں اس کی نظیریں بھی موجود ہیں۔ یہاں اہلِ بیت سے ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہن) کے سوا کسی اور کو مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دوسروں کی شمولیت اس میں ہو سکتی ہے تو اصلاً نہیں بلکہ تبعاً و ضمناً ہو سکتی ہے۔ اس وجہ سے ان غالی فرقوں کی منطق ہماری سمجھ میں نہیں آتی جو اصل کے تو منکر ہیں لیکن فروع پر بڑا طوفان کھڑا کرتے ہیں۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا (۳۴)

ازواجِ نبیؐ کا اصل مقصدِ زندگی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو ان کا اصل مقصدِ زندگی بتایا گیا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے ان کاموں کے لیے نہیں منتخب فرمایا ہے جن کی دعوت منافقات دے رہی ہیں بلکہ قرآن اور حکمت کی جو تعلیم ان کے گھروں میں دی جا رہی ہے وہ اس کا چرچا کریں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جس طرح مردوں کی رہنمائی کے لیے ہوئی تھی اسی طرح عورتوں کے لیے بھی ہوئی تھی۔ آپ جس طرح باہر لوگوں کو تعلیم دیتے رہتے تھے اسی طرح اپنے گھروں کے اندر بھی تعلیم دیتے رہتے تھے۔ وحی جس طرح باہر آپ پر نازل ہوتی تھی اسی طرح گھر کے اندر بھی نازل ہوتی تھی۔ نیز جس طرح آپ کا ہر قول لوگوں کے لیے تعلیم و ہدایت تھا اسی طرح آپ کا ہر فعل بھی لوگوں کے لیے اسوہ و نمونہ تھا۔ آپ کی زندگی 'پرائیویٹ' اور 'پبلک' کے الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں تھی بلکہ آپ کی حیاتِ مبارک کا ہر لمحہ امت کی تعلیم و تربیت کے لیے وقف تھا۔ اس وجہ سے ضروری ہوا کہ جس طرح آپ کی باہر کی زندگی کی ایک ایک ادا کو محفوظ کرنے کے لیے آپ کے جاں نثار سایہ کی طرح آپ کے ساتھ ساتھ رہیں، اسی طرح آپ کے گھر کے اندر کی زندگی کا بھی ایک ایک پہلو محفوظ رکھنے کا انتظام ہو۔ یہ کام ظاہر ہے کہ آپ کی ازواجِ مطہراتؓ ہی کے ذریعہ سے ممکن تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا علم و عمل جتنا آپ کی ازواجِ مطہراتؓ کے ذریعے سے پھیلا ہے اس کی مقدار صحابہؓ کے ذریعے پھیلے ہوئے علم سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اور اس آیت سے

یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اس مشن پر آپ کی ازواج مطہراتؓ کو اللہ تعالیٰ نے خود مامور فرمایا تھا کہ ان کا کام دنیا کے خزف ریزے جمع کرنا نہیں بلکہ علم و حکمت کے ان خزانوں کو خلق کے اندر لٹانا ہے جن کی بارش ان کے گھروں کے اندر ہو رہی ہے ـــــ ہمارے نزدیک یہ مصلحت بھی من جملہ ان مصالح کے ہے جن کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تعدد ازواج کی خاص اجازت دی گئی۔ اس مسئلہ پر آگے بحث آئے گی۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا یعنی یہ اطمینان رکھو کہ اگر تمہاری ڈیوٹی گھروں کے اندر سے متعلق ہے تو تمہاری کوئی خدمت تمہارے رب سے مخفی نہیں رہے گی۔ خدا بڑا ہی باریک بین اور بڑا ہی خبر رکھنے والا ہے۔ وہ تمہارے ہر عمل اور تمہاری ہر ضرورت سے اچھی طرح باخبر ہے۔ تم اس کے بھروسہ پر اپنا فرض انجام دو، اللہ تعالیٰ تمہاری ضروریات کا خود کفیل ہے۔

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (۳۵)

مسلمان مردوں اور عورتوں کے سامنے ایک آئینہ

اوپر جو باتیں متفرق طور پر، بعض منفی اور بعض مثبت پیرایہ میں، فرمائی گئی ہیں، آخر میں ان سب کو ایک جامع اسلوب میں سامنے رکھ دیا گیا ہے اور مقصود اس سے یہ بتانا ہے کہ اللہ اور رسول کو جو معاشرہ مطلوب و محبوب ہے اس کی صفات کیا ہونی چاہئیں۔ یہ گویا مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کے سامنے ایک آئینہ رکھ دیا گیا ہے کہ وہ اس کو سامنے رکھ کر اپنے آپ کو سنواریں اور ان منافقین و منافقات کے چکمے میں نہ آئیں جو ان کے چہروں پر جاہلیت کی وہی سیاہی پھر ملنے کی فکر میں ہیں جس کو اللہ کے رسول نے دھونے کی کوشش کی ہے۔ یہ ساری باتیں تعداد میں دس ہیں اور اوپر اس پیرے میں جو ہدایات متفرق طور پر دی گئی ہیں وہ بھی الگ الگ گنیے تو دس نکلیں گی۔ یہاں چونکہ خطاب خاص طور پر ازواج مطہراتؓ سے ہے نیز مقصود اسلامی معاشرہ کے اجزائے ترکیبی کو بتانا ہے اس وجہ سے عورتوں کا ذکر ضمناً نہیں بلکہ مردوں کے پہلو بہ پہلو مستقلاً آیا ہے اس لیے کہ عورتیں معاشرے کا بالکل نصف اور مساوی حصہ ہیں اور معاشرے کے بناؤ اور بگاڑ میں ان کا دخل مردوں سے شاید کسر ے زائد ہے:

یہاں جو صفات گنائی گئی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اسلام	۲۔ ایمان	۳۔ قنوت
۴۔ صدق	۵۔ صبر	۶۔ خشوع
۷۔ صدقہ	۸۔ روزہ	۹۔ عفت وحیا
۱۰۔ ذکر اللہ		

یہ تعداد میں دس ہیں۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی اخلاق و کردار کے تمام پہلو ان کے اندر سمٹ آئے ہیں اور چونکہ ان کا ذکر صفت کے صیغوں سے ہوا ہے اس وجہ سے یہ بحیثیت عادت و صفت کے مطلوب ہیں۔ یعنی معاشرہ کے ہر فرد پر، عورت ہو یا مرد، ان کا رنگ چھایا ہوا ہو۔

ان صفات میں سے کچھ کا تعلق حقوق اللہ سے ہے، کچھ کا تعلق حقوق العباد سے ہے؛ اور کچھ اصلاً اصلاح نفس سے تعلق رکھنے والی ہیں۔

اسلام اور ایمان پورے دین کی جامع تعبیر ہے۔ ایمان دین کا باطن ہے، اسلام اس کا ظاہر ہے اور یہ دونوں بیک وقت مطلوب ہیں۔

لفظ 'قنوت' اوپر آیت ۳۱ میں گزر چکا ہے۔ یہ خدا اور رسول کی اس فرمانبرداری کی تعبیر ہے جو دل کی پوری یکسوئی، پوری نیازمندی اور کامل اخلاص کے ساتھ دائماً ہو۔

'صدق' قول، فعل، ارادہ تینوں کی مطابقت اور استواری کی تعبیر کے لیے آتا ہے۔ اوپر آیت ۲۳ میں صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (اور انھوں نے اللہ سے جو عہد باندھا اس کو پورا کر دکھایا) کے الفاظ گزر چکے ہیں۔ اس پہلو سے یہ نفاق کے بالکل ضد کردار کی تعبیر ہے۔ ہمارے ہاں 'قول مرداں جاں دارد' اسی کے اسی پہلو کی تعبیر ہے۔

'صبر' استقامت، استقلال، پامردی کے مفہوم میں آتا ہے۔ جو آدمی ہر خوف و طمع کے مقابل میں، خواہ وہ اس کے اندر سے سر اٹھائے یا باہر سے، موقف حق پر ڈٹا اور اپنے رب سے راضی و مطمئن رہے وہ صابر ہے اور اسی کردار پر درحقیقت تمام دین قائم ہے۔

'خشوع' کا مفہوم فروتنی اور خاکساری ہے۔ یہ چیز خدا کی ہیبت اور اس کی عظمت و جلال کے صحیح تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ صفت آدمی کو اس کے رب کے آگے بھی جھکاتی ہے اور خلق کے لیے بھی اس کو مہربان و حلیم بناتی ہے۔ یہ 'استکبار' کا ضد ہے جو تمام انفرادی و اجتماعی برائیوں کی، خواہ ان کا تعلق حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے، جڑ ہے۔

'تصدق' کے معنی صدقہ کرنے کے ہیں۔ اس کا تعلق خاص طور پر حقوق العباد سے ہے۔ آدمی جب اپنی خواہشوں کو دبا کر اور اپنی ضروریات میں ایثار کر کے اپنا مال دوسروں کی ضروریات پوری کرنے پر خرچ کرتا ہے تو اس سے اس کے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کی تصدیق ہوتی ہے اور یہ چیز درجہ بدرجہ اس کے ایمان کو پختہ اور استوار کرتی جاتی ہے۔

'صوم' ضبطِ نفس اور تربیتِ صبر کی خاص ریاضت ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیات ۱۸۳-۱۸۷ کے تحت ہم اس کے اثرات پر بحث کر چکے ہیں۔ انسان کے تمام کردار کی بنیاد صبر پر ہے اور روزہ صبر کی تربیت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

'حفظ فروج' عفت کی تعبیر ہے جو ضبطِ نفس کا ثمرہ ہے۔ معاشرے میں خرابی پیدا کرنے کا سب سے زیادہ زود اثر نسخہ شیطان کے ہاتھ میں یہی ہے کہ وہ اپنے پروپیگنڈے کے ذریعے سے عورتوں اور مردوں کے اندر عفت کے احساس کو مردہ کر دیتا ہے۔ یہاں بھی اوپر کی آیات میں گزر چکا ہے کہ منافقین و منافقات کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہراتؓ کے اندر زیب و زینت کی نمائش کا شوق ابھاریں تاکہ اس طرح مسلمانوں کا پورا معاشرہ بے حیائی کی راہ پر چل پڑے۔

'ذکر اللہ' تمام مذکورہ بالا صفات کا منبع اور ان کا محافظ ہے۔ بندہ جتنا ہی زیادہ اپنے رب کو یاد رکھتا ہے اتنی ہی یہ صفات اس کے اندر راسخ و پختہ ہوتی ہیں۔ سارے دین کی محافظ درحقیقت اللہ کی یاد ہی ہے۔ اور نماز اللہ کے ذکر ہی کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ نماز کا ذکر تمام دین و اخلاق کے محافظ کی حیثیت سے آیا ہے اور ہم اس پر بحث کر چکے ہیں۔

۶۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۳۶-۴۸

آگے حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے اور یہ بھی درحقیقت اوپر کے سلسلۂ بیان ہی کی ایک کڑی ہے۔ اس واقعہ کو بھی منافقین اور منافقات نے ایک فتنہ بنا لیا تھا جس سے طرح طرح کے سوالات اٹھ کھڑے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب سوالوں کے جواب دیے جن سے دین کے بعض نہایت اہم پہلو واضح ہوئے۔

مثلاً یہ کہ ....

- ——— اللہ اور رسول کا حق سب سے بڑا ہے اس وجہ سے جب کسی معاملے میں اللہ و رسول کی مرضی واضح ہو جائے تو اس میں آدمی کی اپنی مرضی کالعدم ہو جاتی ہے۔
- ——— رسول کا فریضۂ منصبی اللہ کے احکام کی دعوت اور ان کا اجراء و نفاذ ہے اس وجہ سے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم صادر ہو جائے تو اس کا فرض ہے کہ اس حکم کی تعمیل کرے اور اس معاملے میں کسی کی مخالفت یا ملامت کی مطلق پروا نہ کرے۔
- ——— متبنّٰی کی بیوی سے متعلق جو تصور زمانۂ جاہلیت سے چلا آ رہا تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے عمل سے اس کی اصلاح کی ہدایت اور اس معاملے میں اشرار کے غوغا کی پروا نہ کرنے کی نہایت شدت سے تاکید۔
- ——— نبی صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم النبیین ہیں اس وجہ سے ضروری ہوا کہ آپ کے ہاتھوں دین کے ہر شعبہ کی تکمیل ہو جائے۔ اس کے کسی پہلو میں کوئی خلا نہ رہ جائے۔
- ——— نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اللہ تعالیٰ نے خلق پر جو عظیم فضل و احسان فرمایا اس کا

بیان اور امت پر آپ کے حقوق کی طرف اشارہ۔

یہ اشارات اگرچہ اس پیرے کے ربط و نظام کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں لیکن ہم بالاجمال حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کا واقعہ بھی ذکر کیے دیتے ہیں تاکہ آیات کے تحت جزئیات سے تعرض کی ضرورت پیش نہ آئے۔

حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے واقعہ کی صحیح نوعیت

حضرت زید بن حارثہؓ کا تعلق قبیلۂ کلب سے تھا۔ یہ بچپن میں دشمن کی کسی غارت گری میں گرفتار ہوئے اور غلام بنا لیے گئے۔ حکیم بن حزام نے ان کو اپنی پھوپھی حضرت خدیجہؓ کے لیے خریدا۔ حضرت خدیجہؓ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقدِ نکاح میں آئیں تو انھوں نے ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کر دیا۔ اس طرح ان کو حضورؐ کی غلامی کا شرف حاصل ہوا۔ حضورؐ کی غلامی کی جو قدر و عزت ان کی نگاہوں میں تھی اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جب ان کے والد اور چچا نے آنحضرت صلعم سے ان کی آزادی کا مطالبہ کیا تو حضورؐ نے ان کو اختیار دے دیا کہ وہ چاہیں تو اپنے باپ کے پاس چلے جائیں، چاہیں تو حضورؐ کی خدمت میں رہیں۔ اس موقع پر حضرت زیدؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی محبت کی جو مثال پیش کی وہ تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ انھوں نے آزادی کا اختیار نامہ پا جانے کے باوجود اس آزادی پر حضورؐ کی غلامی کو ترجیح دی۔ خواجہ حافظ نے شاید اسی واقعہ کو سامنے رکھ کر اپنا یہ لاجواب شعر کہا ہو۔

بولائے تو کہ گر بندۂ خویشم خوانی
از سر خواجگیٔ کون و مکاں برخیزم

اس کے بعد حضورؐ نے ان کو آزاد کر دیا۔ ان سے محبت تو ان کی خوبیوں کے سبب سے حضورؐ کو شروع ہی سے تھی، اس واقعہ کے بعد وہ دوچند ہو گئی۔ یہاں تک کہ حضورؐ کے غیر معمولی التفات و اعتماد کو دیکھ کر لوگوں نے یہ گمان کر لیا کہ آپ نے ان کو منہ بولا بیٹا بنا لیا ہے۔

واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں انتظامی اور فوجی صلاحیتیں بھی تھیں۔ متعدد مواقع پر آپ نے ان کو فوجی دستوں کی سرکردگی سپرد کی اور بعض مواقع پر، حضورؐ کی غیبت میں، وہ مدینہ پر امیر بھی رہے۔

حضورؐ نے ان کی عزت افزائی کے لیے ان کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن، حضرت زینب بنت جحشؓ کے ساتھ کر دیا۔ ان کا تعلق خاندان بنی اسد سے تھا۔ ان کی والدہ امیمہ بنت عبدالمطلب تھیں۔ جب حضورؐ نے حضرت زیدؓ کے لیے حضرت زینبؓ کو پیغام دیا تو ان کے عزیزوں کو اس رشتہ پر اعتراض ہوا کہ حضرت زیدؓ ایک آزاد کردہ غلام اور غیر کفو ہیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ غلاموں سے متعلق، لوگوں کے تصورات میں تبدیلی پیدا ہو اس وجہ سے آپ نے اس نکاح پر اصرار فرمایا۔ بالآخر حضرت زینبؓ راضی ہو گئیں اور نکاح ہو گیا۔

نکاح کے بعد منافقین اور منافقات نے فتنہ اٹھایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک معزز گھرانے

کی ایک شریف خاتون کا دامن اپنے ایک آزاد کردہ غلام کے ساتھ باندھ دیا ہے۔ اس قسم کی معاشرتی اصلاح کو عوام کا ذہن آسانی سے قبول نہیں کرتا اس وجہ سے اس نکاح کے خلاف ایک مخالفانہ فضا پیدا ہوگئی۔ خاص طور پر منافقات نے حضرت زینبؓ کو ورغلانے کی پوری کوشش کی۔ ان کو غیرت دلائی کہ یہ تحکم اور ظلم ہے کہ ان کو ایک ایسے شخص کے حبالۂ عقد میں دے دیا گیا ہے جو ابھی کل تک ایک زرخرید غلام تھا۔ آخر حضرت زینبؓ بشر ہی تھیں، کوئی فرشتہ نہیں تھیں، اس وجہ سے ان کے دل پر بھی ان باتوں کا اثر پڑا ہوگا۔

حضرت زیدؓ ایک حساس، خوددار، منکسر المزاج آدمی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام دلداریوں کے باوجود اپنی غلامی کے دور کو بھولے نہیں تھے۔ دوسری طرف سیدہ زینبؓ کے مزاج میں فی الجملہ تمکنت اور تیزی تھی۔ عام حالات میں تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو خوش گوار معاشرت میں خلل انداز ہو لیکن منافقین نے چونکہ فضا بدگمانی کی بنا دی تھی اس وجہ سے حضرت زیدؓ کو یہ احساس ہونے لگا کہ حضرت زینبؓ اپنے اندر ایک تفوق کا احساس رکھتی اور اس تعلق کو ناپسند کرتی ہیں۔ بالآخر انھوں نے ارادہ کیا کہ حضرت زینبؓ کو طلاق دے دیں کہ ان کی کبیدگی بھی رفع ہوجائے اور خود ان کے سر کا بوجھ بھی اتر جائے۔ لیکن کوئی اقدام کرنے سے پہلے انھوں نے چاہا کہ حضورؐ کا ایما بھی معلوم کرلیں اس لیے کہ حضورؐ ہی نے یہ رشتہ کرایا تھا۔ جب حضورؐ سے انھوں نے اپنے ارادہ کا ذکر کیا تو آپ نے پوچھا کہ کیا ان کی طرف سے کوئی ایسی بات ظاہر ہوئی ہے جو تمھیں شک میں ڈالنے والی ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ ایسی کوئی بات ہرگز نہیں ہے لیکن وہ اپنے خاندانی شرف کا احساس رکھتی اور اس کا اظہار بھی کرتی ہیں اور یہ چیز میرے لیے باعثِ اذیت ہے۔ حضورؐ نے اس پر سختی سے ان کو ارادۂ طلاق سے روکا اور خوفِ خدا یاد دلایا۔ اس لیے کہ مجرد اپنا ایک ذاتی احساس اس بات کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ بیوی کو طلاق دے دی جائے۔

حضرت زیدؓ کا یہ ارادہ مختلف وجوہ سے حضورؐ کے لیے پریشانی کا باعث ہوا۔

اول تو اس وجہ سے کہ حضورؐ ہی نے، جیسا کہ اوپر گزرا، ایک نہایت اعلیٰ مقصد سے یہ رشتہ کرایا تھا۔ قدرتی طور پر آپ کی آرزو یہی تھی کہ منافقین و منافقات کی ریشہ دوانیوں کے علی الرغم فریقین خوشگواری کے ساتھ نباہ کرتے رہیں اور یہ رشتہ کامیاب ہو۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ اس طلاق سے حضرت زینبؓ کی حیثیت عرفی کو بڑا نقصان پہنچتا اور ان کا غم دُہرا ہوجاتا۔ پہلے تو انھوں نے منافقین و منافقات کے یہ طعنے سنے کہ ایک آزاد کردہ غلام کی بیوی ہیں اور اس طلاق کے بعد لوگ یہ طعنہ دیتے کہ ایک آزاد کردہ غلام کی مطلقہ ہیں۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ حضورؐ اس سارے واقعہ کی ذمہ داری اپنے اوپر سمجھتے تھے اس وجہ سے حضرت زینبؓ کی دلداری ضروری خیال فرماتے تھے۔ آپ کے دل میں یہ خیال تھا کہ اگر زیدؓ نے طلاق دے دی تو زینبؓ کی دلداری کی واحد شکل یہ باقی رہ جائے گی کہ حضورؐ ان کو خود اپنے نکاح میں لے لیں لیکن اس صورت میں اس

سے بھی بڑے ایک دوسرے فتنے کے اٹھ کھڑے ہونے کا اندیشہ تھا کہ لوگ کہیں گے کہ آپ نے اپنے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کر لیا۔ علاوہ ازیں اس میں یہ مشکل بھی تھی کہ عام مسلمانوں کے لیے ازواج کے باب میں چار تک کی تحدید کا حکم نازل ہو چکا تھا اور اس وقت حضورؐ کے نکاح میں چار بیویاں تھیں۔

ان مختلف وجوہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دلی خواہش یہی تھی کہ حضرت زیدؓ طلاق نہ دیں۔ چنانچہ آپ باصرار ان کو اس ارادہ سے روکتے رہے لیکن حضرت زیدؓ حالات کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ یہ سارا ہنگامہ ان کے اس نکاح کے سبب سے اٹھا ہے اور اس کا علاج یہی ہے کہ وہ طلاق دے دیں تاکہ حضرت زینبؓ کی جان بھی ضیق سے چھوٹے اور ان کو بھی اطمینان کا سانس لینے کا موقع ملے۔ چنانچہ انھوں نے طلاق دے دی۔ حضرت زینبؓ کو اس طلاق سے صدمہ ہوا۔ روایات میں آتا ہے کہ ان کو جب اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا۔

جب بات یہاں تک پہنچ گئی تو، جیسا کہ اوپر گزرا، حضورؐ نے حضرت زینبؓ سے نکاح کر لینا چاہا لیکن منہ بولے بیٹے کے معاملے میں جاہلیت کی جو رسم تھی اس کے سبب سے اور تحدید نکاح کے سبب سے بھی آپ متردد رہے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ہدایت ہوئی کہ لوگوں کی مخالفت سے بے پروا ہو کر آپ یہ نکاح کر لیں تاکہ آپ کے عمل سے ایک غلط رسم کی اصلاح ہو جائے اور دینِ فطرت کے اندر ایک خلافِ فطرت چیز جو گھسی ہوئی ہے اس کا خاتمہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت کے بموجب آپؐ نے حضرت زینبؓ سے نکاح کر لیا۔

یہ اصل واقعہ ہے جو میں نے تمام روایات کی تحقیق کے بعد، آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس طولِ بیان کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ مستشرقین نے اس واقعہ کو اپنی رنگ آمیزیوں سے نہایت مکروہ بنا دیا ہے اور صدمہ کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اس رنگ آمیزی کے لیے سارا مواد ہماری تفسیر و سیرت کی کتابوں ہی سے لیا ہے ـــــ اب اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۳۶-۴۸
وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴿۳۶﴾ وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ؕ

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ
حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَكَانَ اَمْرُ
اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۳۷﴾ مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ؕ
سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا
مَّقْدُوْرَا ۟ۙ ﴿۳۸﴾ الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ
اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴿۳۹﴾ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ
مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ
ع ۶ ۲ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۴۰﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿۴۱﴾
وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۴۲﴾ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ
لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ﴿۴۳﴾
تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۚۖ وَاَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا ﴿۴۴﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ
اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۴۵﴾ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ
وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا
كَبِيْرًا ﴿۴۷﴾ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ
عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۴۸﴾

ترجمۂ آیات ۳۶-۴۸

کسی مومن یا مومنہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی
معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لیے اس میں کوئی اختیار باقی رہ جائے۔ ۱۔، جو اللہ اور
اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑا۔ ۳۶

اور جب کہ تم اس سے، جس پر اللہ نے بھی انعام کیا اور تم نے بھی انعام کیا، یہ کہہ رہے تھے کہ اپنی بیوی کو روکے رکھو اور اللہ سے ڈرو، اور تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا، اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے، حالانکہ اللہ زیادہ حق دار ہے اس بات کا کہ تم اس سے ڈرو۔ پس جب زید نے اس سے اپنا رشتہ کاٹ لیا تو ہم نے اس کو تم سے بیاہ دیا کہ مومنوں کے لیے ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملے میں، جب کہ وہ ان سے اپنا تعلق بالکل کاٹ لیں، کوئی تنگی باقی نہ رہے۔ اور خدا کا فیصلہ شدنی تھا۔ ۳۷

اور نبی کے لیے اللہ نے جو کچھ فرض کیا اس میں کوئی تنگی نہیں ہے۔ یہی اللہ کی سنت رہی ہے ان لوگوں کے معاملے میں بھی جو پہلے گزرے ہیں۔ اور اللہ کے فیصلہ کے لیے ایک وقت مقرر تھا۔ وہ اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے تھے اور اسی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ اور اللہ حساب کے لیے کافی ہے۔ ۳۸-۳۹

محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ ۴۰

اے ایمان والو! تم اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو اور اس کی تسبیح کرو صبح اور شام۔ وہی ہے جو تم پر اپنی رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تاکہ تم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے اور وہ مومنوں پر نہایت مہربان ہے۔ ان کی تحیّت، جس دن وہ اس سے ملیں گے، سلام ہوگی اور اس نے ان کے لیے باعزت صلہ تیار کر رکھا ہے۔ ۴۱-۴۴

اے نبی! ہم نے تم کو گواہی دینے والا اور خوش خبری پہنچانے والا اور آگاہ کرنے والا

بنا کر بھیجا ہے۔ اور اللہ کی طرف، اس کے اذن سے، دعوت دینے والا اور ایک روشن چراغ بنا کر۔ اور مومنوں کو بشارت دو کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے ایک بہت بڑا فضل ہے اور کافروں اور منافقوں کی بات کا دھیان نہ کرو اور ان کی ایذا رسانیوں کو نظر انداز کرو، اور اللہ پر بھروسہ رکھو اور اللہ اعتماد کے لیے کافی ہے۔ ۴۵-۴۸

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا (۳۶)

ایک تمہید بطور ایک کلیہ

یہ آگے آنے والے واقعہ کی تمہید ہے اور اس میں جو بات فرمائی گئی ہے اس کا تعلق خاص حضرت زیدؓ و حضرت زینبؓ سے نہیں ہے بلکہ اس کی نوعیت ایک کلیہ کی ہے۔ اوپر آیت ۶ میں فرمایا ہے کہ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (نبی کا حق مومنوں پر خود ان کے اپنے مقابل میں زیادہ ہے) اسی کی روشنی میں یہ قطعی اصول بیان فرما دیا کہ جب اللہ اور رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو اس میں کسی مومن یا مومنہ کے لیے کسی چون و چرا کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اللہ کا رسول جو فیصلہ بھی کرتا ہے وہ اللہ کے اذن سے کرتا ہے اس وجہ سے اس کی حیثیت مطاع مطلق کی ہوتی ہے، پھر کسی کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ اس پر معترض ہو یا اس کی خلاف ورزی کرے۔ جو اس کی خلاف ورزی کرے گا وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑا۔

یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ یہ حکم اس صورت سے متعلق ہے جب یہ واضح طور پر معلوم ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات فرمائی ہے اس کی نوعیت ایک قطعی فیصلہ کی ہے ورنہ بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ آپ نے کوئی بات بطور تجویز یا مشورہ کے پیش کی ہے اور صحابہؓ کو معلوم ہوا ہے کہ یہ بات وحی پر مبنی نہیں ہے بلکہ حضورؐ کی رائے یا تجویز ہے تو صحابہؓ نے اس کے مقابل میں اپنی تجویزیں بھی پیش کی ہیں اور حضورؐ نے بعض اوقات ان کی تجویز مان بھی لی ہے۔

حضرت زیدؓ یا حضرت زینبؓ نے حضورؐ کے کسی فیصلہ کی مخالفت نہیں کی

حضرت زیدؓ و حضرت زینبؓ کے واقعہ کی جو تفصیل ہم نے اوپر پیش کی ہے اس سے یہ امر واضح ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی حضورؐ کے کسی فیصلہ کی مخالفت نہیں کی۔ حضرت زینبؓ کو جب حضورؐ نے حضرت زیدؓ کے لیے پیغام دیا تو ان کو معلوم تھا کہ یہ کوئی حکم نہیں بلکہ ایک پیغام ہے جس میں وہ اپنی پسند یا ناپسند کے اظہار کے لیے آزاد ہیں۔ بعد میں جب ان کو معلوم ہوا کہ حضورؐ کی خواہش یہی ہے کہ یہ رشتہ ہو جائے تو انھوں

نے اس کو منظور فرما لیا۔ اسی سے ملتی جلتی صورت اس وقت پیش آئی جب حضرت زیدؓ کے طلاق کے بعد خود حضورؐ نے اپنے لیے حضرت زینبؓ کو پیغام دیا۔ انھوں نے اس کو بھی کوئی حکم یا فیصلہ نہیں سمجھا بلکہ ایک پیغام ہی تصور کیا اور فرمایا کہ میں اس معاملے میں اپنے رب سے استخارہ کیے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کروں گی۔ چنانچہ استخارہ کے بعد ہی اس کو انھوں نے منظور کیا۔

اسی طرح حضرت زیدؓ نے بھی حضورؐ کے کسی حکم یا فیصلہ کی خلاف ورزی نہیں کی۔ طلاق نہ دینے کے باب میں حضورؐ کے ارشاد کو انھوں نے محض ناصحانہ مشورہ پر محمول کیا اس کو کوئی فیصلہ نہیں سمجھا۔ انھوں نے خیال فرمایا کہ اگرچہ حضورؐ کی خواہش یہی ہے کہ طلاق کی نوبت نہ آئے لیکن یہ فیصلہ بہرحال انہی کو کرنا ہے کہ وہ نباہ کر سکتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ جب ان کو محسوس ہوا کہ اب ان کے لیے اس رشتہ کو زیادہ دیر تک نباہنا ممکن نہیں رہا، انھوں نے طلاق دے دی۔

رسول کے کسی فیصلہ کی خلاف ورزی جائز نہیں

ہمارے نزدیک اس حکم کی نوعیت یہاں ایک عام کلیہ کی ہے جس کے بیان کے لیے وقت کے حالات و واقعات نے مناسب فضا پیدا کر دی تھی۔ اس سے یہ بات بالکل واضح طور پر سامنے آگئی کہ رسولؐ کے کسی حکم اور فیصلہ کی خلاف ورزی کسی مومن یا مومنہ کے لیے جائز نہیں ہے۔ یہ بات ایمان کے مقتضیات کے بالکل خلاف ہے اور جو اس کا مرتکب ہوتا ہے وہ صریح ضلالت کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایمان کا یہ مقتضیٰ ان منافقین و منافقات پر واضح کرنا ضروری تھا جن کا رویہ شروع سے اس سورہ میں زیر بحث ہے تاکہ وہ اللہ اور رسول کی کامل اطاعت پر مجتمع ہوں اور اگر وہ اس کے لیے تیار نہیں ہیں تو اس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہیں۔

وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ ۖ فَلَمَّا قَضَى زَيْدٌ مِنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا (۳۷)

حضرت زیدؓ کی عزت افزائی

یہ اصل واقعہ کی طرف اجمالی اشارہ ہے۔ حضرت زیدؓ کا ذکر یہاں أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ کی صفت کے ساتھ ہوا ہے یعنی اللہ اور رسول دونوں کے انعام یافتہ اور منظور نظر۔ اس صفت کے ساتھ ذکر کرنے کی یہاں خاص وجہ ہے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ منافقین و منافقات نے حضرت زیدؓ کو غلامی کا طعنہ دے کر لوگوں کی نگاہوں میں ان کو گرانے کی پوری کوشش کی تاکہ پیش نظر مہم میں ان کو کامیابی حاصل ہو جائے۔ حضرت زیدؓ کو اس سے جو تکلیف پہنچی ہوگی وہ ظاہر ہے لیکن انھوں نے پورے صبر کے ساتھ یہ توہین برداشت کی۔ اس صبر کا صلہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دیا کہ ان کا ذکر اس صفت کے ساتھ کیا تاکہ جن لوگوں نے ان کی توہین کرنے کی کوشش کی ان پر واضح ہو جائے کہ جس کو انھوں نے حقیر ٹھہرایا اس پر

اللہ نے بھی انعام فرمایا ہے اور اس کے رسولؐ نے بھی۔ ظاہر ہے کہ جو اللہ و رسول کا انعام یافتہ ہے وہ کسی دوسرے کی عزت بخشی کا محتاج نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا انعام یوں تو ہر فرد پر ہے۔ بندہ جو کچھ بھی پاتا ہے خدا ہی سے پاتا ہے لیکن حضرت زیدؓ کے حالات پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے ساتھ بالکل اس طرح کا معاملہ ہوا جس طرح کا معاملہ حضرت یوسفؑ کے ساتھ ہوا۔ یہ ایک غارت گری میں گرفتار ہوئے (غالباً ایک نصرانی کے غلام رہے) پھر غلام ہو کر بکے، بالآخر درجہ بدرجہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کارسازی سے ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دیا جس کے بعد ان کے لیے دین و دنیا کی سعادتوں کے دروازے کھل گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انعام ان پر یہ ہوا کہ آپ کے فیضِ خدمت سے ان کو اسلام کی نعمت حاصل ہوئی۔ آپ نے ان کو محبت و اعتماد کا وہ مقام بخشا کہ لوگ ان کو حضورؐ کا منہ بولا بیٹا سمجھنے لگے۔ آپ نے ان کو غلامی سے آزادی بخشی۔ اپنی حقیقی پھوپھی زاد بہن سے شادی کر دی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ حضورؐ نے ان کو اپنے اہلِ بیت میں شامل کر لیا جس سے بڑا خاندانی شرف کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

حضورؐ نے حضرت زیدؓ کو طلاق سے باربار روکا

'أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ' سے پہلے 'وَإِذْ تَقُولُ' کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضورؐ نے یہ بات حضرت زیدؓ سے باربار فرمائی کہ اپنی بیوی کو اپنے نکاح میں باقی رکھو اور اللہ سے ڈرو، اگر یہ بات ایک ہی مرتبہ کہنے کی نوبت آئی ہوتی تو 'قُلْتَ' کافی تھا۔ 'تَقُوْلُ' کی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت زیدؓ نے اپنے ارادے کا اظہار حضورؐ کے سامنے کئی بار کیا اور حضورؐ نے ہر بار ان کو اس سے روکا اور خدا کا خوف یاد دلایا۔

'وَاتَّقِ اللَّهَ' کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضورؐ نے حضرت زیدؓ کے ارادۂ طلاق کو محض ان کے شدتِ احساس پر محمول فرمایا، کوئی معقول وجہ اس اقدام کے لیے آپ نے نہیں پائی۔ اوپر گزر چکا ہے کہ جب آپؐ نے ان سے یہ سوال فرمایا کہ کیا زینبؓ کی طرف سے کوئی ایسی بات تمھارے سامنے آئی ہے جو شک پیدا کرنے کا موجب ہوئی ہے؟ تو انھوں نے صاف کہا کہ اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے۔ ان کو اگر کوئی شکایت تھی تو خود ان کے الفاظ میں بس یہ تھی کہ 'تتعظم علی بشرفها' (وہ میرے مقابل میں اپنے شرفِ خاندانی کے باعث تفوق کا احساس رکھتی ہیں) ظاہر ہے کہ مجرد یہ بات بیوی کو طلاق دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس میں حضرت زینبؓ کے رویہ سے زیادہ خود حضرت زیدؓ کے شدتِ احساس کو دخل ہو سکتا ہے بالخصوص اس فضا میں جو اس وقت منافقین و منافقات نے پیدا کر دی تھی۔ اس وجہ سے حضورؐ نے ان کو خوفِ خدا یاد دلایا کہ وہ اس معاملہ میں جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی قدم نہ اٹھائیں بلکہ اللہ سے ڈریں لیکن حضرت زیدؓ مخالفین کے اٹھائے ہوئے طوفان سے متاثر ہو گئے اور اس تاثر میں زیادہ دخل ان کی شرافت اور حضرت زینبؓ کے جذبات کے لحاظ کو تھا۔ انھوں

نے محسوس فرمایا کہ میرے سبب سے حضرت زینبؓ ہدفِ مطاعن بنی ہوئی ہیں، اس کا علاج یہی ہے کہ طلاق دے کر ان کو نکتہ چینوں کی زبان درازیوں سے نجات دلائی جائے۔

آنحضرت صلعم کے دل میں کیا خیال تھا؟

وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ۔ یہ جملہ حال کے محل میں ہے یعنی زیدؓ سے جب تم یہ کہہ رہے تھے کہ اپنی بیوی کو طلاق نہ دو، اللہ سے ڈرو، تو اس وقت تم اپنے دل میں ایک بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ بہرحال ظاہر کرنے والا تھا۔

اس ٹکڑے کے تحت ہمارے غیر محتاط مفسرین نے فضول قسم کی جو روایات نقل کر دی ہیں ان سے تعرض کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بالکل بے اصل ہیں۔ ابنِ کثیرؒ کا تبصرہ ان پر بالکل صحیح ہے کہ احببنا ان نضرب عنہا صفحا لعدم صحتہا فلا نوردہا (یہ روایات بے اصل ہیں اس وجہ سے ہم نے ان سے صرفِ نظر ہی پسند کیا اور ان کو نقل نہیں کر رہے ہیں) ہمارا قول بھی ان کے باب میں یہی ہے۔ تردید کے لیے بھی ان کو نقل کرنا ہم معصیت سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ابن جریرؒ کو معاف کرے، وہ روایات نقل کرنے کے معاملے میں نہایت ہی غیر محتاط ہیں۔

اصل واقعہ وہی ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ نکاح چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی ایک دینی مصلحت کے تحت کرایا تھا اس وجہ سے آپ کی دلی آرزو یہی تھی کہ یہ کامیاب ہو چنانچہ آپؐ نے حضرت زیدؓ کو ارادۂ طلاق سے بتاکید روکنے کی کوشش کی۔ آپ کے دل میں یہ خیال تھا کہ اگر زیدؓ نے طلاق دے دی تو زینبؓ کو دہرا غم ہوگا کہ انھوں نے اس نکاح کی بدولت دشمنوں کے طعنے بھی سنے اور بالآخر ایک آزاد کردہ غلام کی مطلقہ بن کر اپنی حیثیت عرفی بھی ہمیشہ کے لیے گنوا بیٹھیں۔ ان کی دلداری اور اس نقصان کی تلافی کی واحد شکل پھر صرف یہ رہ جاتی تھی کہ حضورؐ خود ان کو اپنے نکاح میں لے لیں لیکن ایسا کرنے میں یہ اندیشہ تھا کہ منافقین اس کو ایک اور اس سے بھی بڑے فتنہ کا ذریعہ بنا لیتے اور لوگوں میں یہ پھیلاتے کہ آپؐ نے اپنے متبنّیٰ کی بیوی سے نکاح کر لیا ہے۔ آپ اس فتنہ سے بچنا چاہتے تھے اس وجہ سے آپ کی دلی آرزو یہی تھی کہ طلاق کی نوبت نہ آئے لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی تھا کہ یہ نوبت آئے تاکہ آپ کے ہاتھوں جاہلیت کی ایک غلط رسم کی اصلاح ہو اور انبیاء علیہم السلام پر اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری جو ڈالی ہے کہ وہ دین کے معاملے میں کسی کی ملامت و مخالفت کی کوئی پروا نہ کریں، آپ اپنے عمل سے اس کا مظاہرہ کریں۔

اقامتِ دین کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ

'وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ' میں اسی اصولی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جو پیچھے آیات ۱-۳ اور آیت ۷ میں بیان ہوئی ہے اور آگے آیات ۳۸-۳۹ میں مزید وضاحت آ رہی ہے۔ اقامتِ دین کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ لوگوں کا خوف یا مصالح کا لحاظ ہے اس وجہ سے حضرات انبیاء علیہم السلام پر اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ دین کے معاملے میں اپنے رب کے سوا ہر خوف

مصلحت سے بے پروا ہوں، چنانچہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے خود اپنے ہاتھوں اس راہ کے ہر پتھر کو توڑا اور اس مقصد کی خاطر بڑے سے بڑے خطرے کا مقابلہ کیا اور یہی نمونہ اپنے بعد آنے والے ان لوگوں کے لیے انھوں نے چھوڑا جو ان کے طریقہ پر دین کی خدمت کے لیے اٹھیں۔

حضورؐ نے حضرت زینبؓ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے نکاح کیا

'فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا الاٰیۃ' یعنی جو راز تم اپنے دل میں رکھتے تھے لیکن لوگوں کی ملامت کے اندیشہ سے اس سے گریز کرنا چاہتے تھے بالآخر اللہ نے اس کے اظہار کا سامان کر دیا کہ جب زیدؓ نے اپنا تعلق زینبؓ سے بالکل منقطع کر لیا تو ہم نے اس کو تمھارے ساتھ بیاہ دیا تاکہ منہ بولے بیٹوں کے معاملے میں ایک خلافِ فطرت رسم جو قائم ہو گئی ہے اس کی اصلاح ہو اور کوئی ناروا قسم کی پابندی لوگوں پر اس معاملے میں باقی نہ رہے۔

'وطر' کے معنی ضرورت و حاجت کے ہیں۔ یہیں سے اس کے اندر تعلق اور وابستگی کا مفہوم بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ انسان کو جس چیز کی ضرورت ہو اس کے ساتھ لازماً وابستگی بھی ہوتی ہے 'قَضٰی زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا' کے معنی ہوں گے 'زیدؓ نے اس سے اپنا تعلق بالکل منقطع کر لیا'۔ لفظ طلاق سے اس مضمون کو ادا کرنے کے بجائے اس اسلوب سے ادا کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ اس سے زمانۂ عدت کے گزرنے کی طرف بھی اشارہ ہو گیا جس کے گزر جانے کے بعد طلاق دینے والے کا ہر تعلق عورت سے منقطع ہو جاتا ہے۔

'زَوَّجْنٰكَهَا' کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگوں کے اندیشہ سے اس نکاح کی ذمہ داری سے گریز کرنا چاہتے تھے لیکن ہم نے اپنے حکم سے یہ نکاح تمھارے ساتھ کرا دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضورؐ نے یہ نکاح اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت کیا۔ روایات میں آتا ہے کہ عدت گزرنے کے بعد حضورؐ نے حضرت زیدؓ ہی کے واسطے سے حضرت زینبؓ کو پیغام دیا۔ انھوں نے استخارہ کے بعد اس کو منظور کیا۔ حضرت زینبؓ کے بھائی ابو احمد بن جحشؓ نے حضورؐ کے ساتھ ان کا نکاح پڑھایا اور حضورؐ نے چار سو درہم مہر مقرر فرمایا اور نہایت اہتمام کے ساتھ ولیمہ کیا ـــــ بعض لوگوں نے لفظ 'زَوَّجْنٰكَهَا' سے یہ سمجھا ہے کہ یہ نکاح آسمان ہی پر ہو گیا تھا، زمین پر اس کی رسم ادا کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی لیکن ابن ہشام میں وہ ساری تفصیل موجود ہے جو اوپر ہم نے نقل کی ہے اس وجہ سے صحیح بات یہ ہے کہ یہ نکاح اللہ تعالیٰ کے حکم سے بالکل اسی معروف طریقہ کے مطابق ہوا جو اللہ اور رسول نے نکاح کے لیے پسند فرمایا ہے۔

'وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا' یعنی اللہ تعالیٰ نے اس رسمِ جاہلی کی اصلاح کے لیے جو وقت اور جو طریقہ مقرر کر رکھا تھا جب وہ وقت آگیا تو اسی طریقہ کے مطابق اس کی اصلاح ہو گئی اور دشمنوں نے اس راہ میں جو اڑنگے ڈالے اور اس کے خلاف جو فتنے اٹھائے وہ اس خدائی اسکیم میں ذرا بھی خلل انداز نہ ہو سکے۔

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ۭ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ

قَبْلُ ط وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ۨ ۙ الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ط وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا (۳۸-۳۹)

حضرات … کے لیے … الٰہی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ آپ کی زندگی کے پروگرام میں اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے مراحل جو رکھے ہیں یہ کسی زحمت کے لیے نہیں رکھے ہیں اور نہ یہ تنہا آپ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں بلکہ سابق انبیاء کو بھی اس طرح کے مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے جو اس نے اپنی حکمت کے تحت مقرر فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضرات انبیاء کو اس طرح کی مشکلات جو پیش آتی ہیں یہ ان کی تربیت اور امتحان کے لیے پیش آتی ہیں اور ٹھیک خدا کے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق پیش آتی ہیں۔ انہی امتحانوں سے ان کے اوصاف اجاگر ہوتے ہیں اور انہی سے ان کے پیروؤں کا اخلاص یا کھوٹ بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔

'فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ' کا مفہوم 'فَرَضَ اللّٰهُ عَلَيْهِ' سے مختلف ہے۔ 'فَرَضَ اللّٰهُ عَلَيْهِ' کا مفہوم تو یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے اس پر فرض کیا ہے اور 'فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ' کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے اس کے لیے مقسوم کیا ہے کہ اس کی زندگی میں یہ یہ احوال و مراحل پیش آئیں گے۔

'سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا' میں زبان کا جو اسلوب ہے اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اس اسلوب کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی 'سَنَّ اللّٰهُ ذٰلِكَ سُنَّةً فِي الْاَنْبِيَآءِ' (یہ اللہ نے اپنے نبیوں کے لیے ایک سنت مقرر کر رکھی ہے)۔

زندگی میں کوئی چیز اتفاق سے نہیں پیش آتی

'وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا' یعنی اللہ نے اپنے فیصلہ کے ظہور کے لیے ایک وقت پہلے سے مقرر فرما دیا تھا، جب وہ وقت آ گیا تو اس کا حکم صادر ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ زندگی میں کوئی چیز بھی اتفاق سے پیش نہیں آ جاتی بلکہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے پروگرام کے مطابق پیش آتی ہے اس وجہ سے کسی امر کو اتفاق پر محمول کر کے نہ اس سے پریشان ہونا چاہیے نہ اس کو نظر انداز کرنا چاہیے بلکہ اس کو خدا کی طرف سے سمجھنا اور اس طرح اس کا مواجہہ کرنا چاہیے جو ایمان کا تقاضا ہے۔

حضرات انبیاء کا فرض منصبی

'اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ' یہ 'اَلَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ' یعنی انبیائے سابقین کی صفت ہے کہ وہ اللہ کے پیغاموں کی تبلیغ کرتے رہے ہیں، اس معاملے میں اس کے سوا کسی اور کی پروا انھوں نے نہیں کی۔ مطلب یہ ہے کہ جو ذمہ داری اللہ نے اپنے سابق نبیوں پر ڈالی اور انھوں نے وہ بے خوف لومۃ لائم ادا کی وہی اس نے آپ پر بھی ڈالی ہے اور آپ کا بھی یہ فرض ہے کہ اپنے پیش رووں کی طرح بے خوف لومۃ لائم اس کو ادا کریں۔

لفظ حسیب کی تفسیر

'وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا' میں 'حَسِيْبٌ' کی تفسیر ابن کثیر اور کشاف نے 'ناصر' اور 'معین' کی ہے یعنی اللہ تمام خطرات سے حفاظت کے لیے کافی ہے۔ اگر یہ تاویل قبول کر لی جائے تو نظم کلام بالکل واضح

ہے اور اگر 'حسیب' کے معنی حساب کرنے والے کے لیے جائیں، جیسا کہ معروف ہے، تو یہ ٹکڑا تنبیہ کے مفہوم میں ہوگا کہ اگر اللہ کے پیغام کی تبلیغ میں دوسروں کے خوف یا لحاظ کے سبب سے ادنیٰ کوتاہی بھی ہوئی تو یاد رہے کہ اللہ محاسبہ کے لیے کافی ہے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا (۴۰)

نبی صلعم کا اصل مقام اور اس کے تقاضے

یہ خطاب ان لوگوں سے ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت زیدؓ کا باپ قرار دے کر آپ کے خلاف فتنے کے اٹھانے والے بنے تھے۔ فرمایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔ نبی و رسول کی حیثیت سے ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ انھوں نے ادا کی اور چونکہ یہ خاتم النبیین ہیں اس وجہ سے ضروری تھا کہ انہی کے ذریعے سے اس رسم بد کی اصلاح ہو جائے۔ اگر ان کے بعد کوئی اور نبی آنے والا ہوتا تو ہو سکتا تھا کہ اس معاملے کو اللہ تعالیٰ آئندہ پر اٹھا رکھتا لیکن اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، انہی کے ہاتھوں دین کی تکمیل ہونی ہے۔ اس وجہ سے ہر وہ چیز درست کی جائے گی جو بگڑی ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ان کے معاملات کو اپنے مفروضات کی روشنی میں نہ دیکھو بلکہ ان کے اصل منصب اور اس کی ذمہ داریوں کی روشنی میں دیکھو۔ اگر ان کے اصل منصب کو تم نے نہ پہچانا تو اسی طرح دوسری اور بہت سی باتوں پر بھی تمھیں اعتراض ہوں گے حالانکہ انھیں وہ سارے کام بے خوف لومۃ لائم کرنے ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ہدایت ہوگی۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ یہ تمہاری طرف اللہ کے رسول ہیں۔ اگر تم نے ان کی تکذیب کر دی تو اس سنت الٰہی کی زد میں آنے سے نہیں بچ سکو گے جو اللہ نے اپنے رسولوں کے مکذبین کے لیے مقرر کر رکھی ہے اور جو ہمیشہ ظہور میں آئی ہے۔

'مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ' میں دراصل نفی تو اسی غلط فہمی کی ہے جس میں وہ لوگ مبتلا تھے جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت زیدؓ کا باپ بنا رکھا تھا لیکن صرف اتنا ہی نہیں فرمایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) زیدؓ کے باپ نہیں ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ فرمایا کہ تمہارے مردوں میں سے کسی کے بھی وہ باپ نہیں ہیں۔ اس سے بات زوردار بھی ہوگئی اور یہ بیانِ واقعہ بھی ہے اس لیے کہ حضورؐ کی اولادِ ذکور میں سب کی وفات نابالغی میں ہوئی، 'رجال' کی عمر کو ان میں سے کوئی نہیں پہنچا۔

نبی اور رسول کے درمیان نسبت

'وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ': نبی اور رسول کے فرق پر وضاحت سے ہم اس کتاب میں جگہ جگہ بحث کر چکے ہیں۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ نبی اور رسول کے درمیان نسبت عام اور خاص کی ہے۔ ہر رسول نبی لازماً ہوتا ہے لیکن ہر نبی کا رسول ہونا لازمی نہیں۔ اس وجہ سے اگر حضورؐ خاتم الانبیاء ہیں تو 'خاتم الرسل' بدرجۂ اولیٰ ہوئے۔ بعض گمراہ فرقوں نے یہ شوشہ جو نکالا ہے کہ

قرآن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء بتایا گیا ہے، 'خاتم الرسل' نہیں کہا گیا ہے اس وجہ سے سلسلۂ رسالت کے اجراء کی نفی نہیں ہوئی، یہ محض ان کی جہالت ہے۔

'خاتَم' اور 'خاتِم' دونوں لفظ اہلِ لغت کے نزدیک بالکل ہم معنی ہیں۔ قوم کا آخری فرد، کسی شے کا انجام، خط کے آخر کی مہر، یہ سب چیزیں اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔

'وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا'۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے سارا غوغا برپا کیا ہے ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ ساری چیزوں سے ان سے زیادہ باخبر ہے۔ وہ زیدؓ کو بھی جانتا ہے، زینبؓ کو بھی جانتا ہے، اپنے پیغمبر سے بھی واقف ہے اور زیدؓ و زینبؓ کے ساتھ ان کے رشتہ کی نوعیت سے بھی باخبر ہے۔ ان باتوں میں سے کسی سے بھی وہ بے علم نہیں ہے۔ جو کچھ ہوا ہے سب اس کے اذن و ایماء سے ہوا ہے اس وجہ سے اس کے خلاف ہنگامہ برپا کرنا جہالت و حماقت ہے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت پر بھروسہ کیا جائے اور جو اصلاح عمل میں آئی ہے اس کی قدر کی جائے۔ خدا کا محیطِ کل علم ہی ہر چیز کی باریکیوں اور حکمتوں کو سمجھ سکتا ہے، دوسرے اس کی ساری حکمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۝ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (۴۱-۴۲)

مسلمانوں کو ثابت قدمی کی تاکید

یہ مسلمانوں کو منافقین و مفسدین کی اس محاذ آرائی کے مقابل میں ثابت قدم رہنے کی تاکید فرمائی گئی ہے اور اس کی تدبیر یہ بتائی ہے کہ ان اشرار کے غوغا سے بے پروا ہو کر تم زیادہ سے زیادہ اللہ کا ذکر اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔ یہ امر واضح رہے کہ شیطان اور اس کی ذریات کے مقابل میں مومن کی اصلی سپر اللہ تعالیٰ کی یاد ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں معاندین کے مقابل میں ثابت قدمی کی تلقین کی گئی ہے وہاں نماز کی خاص طور پر تاکید کی گئی ہے۔ صبر اور نماز کے باہمی تعلق پر اس کتاب میں جگہ جگہ ہم بحث کرتے آ رہے ہیں۔ (مثلاً دیکھیے سورۂ بقرہ۔ آیت ۴۵ کی تفسیر)۔

'وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا' میں 'تسبیح' نماز کی تعبیر ہے۔ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ ذکر تو سانس کی طرح ہر وقت مطلوب ہے لیکن نمازوں کے لیے اللہ اور رسول نے اوقات مقرر فرما دیے ہیں جن کی جامع تعبیر صبح اور شام ہے۔ اس صبح و شام کے نقشہ کے اندر تمام نمازوں کے اوقات منضبط کر دیے گئے ہیں جس کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ (دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل آیت ۷۸، سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۱۳۰)۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا (۴۳)

ذکرِ الٰہی کی برکت

یہ اللہ تعالیٰ کو زیادہ سے زیادہ یاد کرنے کی برکت بیان ہوئی ہے کہ وہ اپنے باایمان بندوں پر

اپنی رحمت نازل فرماتا ہے اور اس کے ملائکہ بھی برابر اہلِ ایمان پر رحمت کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں۔ 'یُخْرِجُکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ' یہ اس رحمت کی برکت بیان ہوئی ہے کہ یہ اسی کا فیض ہے کہ وہ تم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ یہاں تاریکی سے مراد ظاہر ہے کہ عقائد و اعمال کی تاریکی اور روشنی سے مراد ہدایت و شریعت کی روشنی ہے۔ 'وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا' یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کہ وہ اپنے با ایمان بندوں پر نہایت مہربان ہے۔

'یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلٰٓئِکَتُہٗ' میں لفظ 'یُصَلِّیْ' اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت سے رحمت کرنے کے مفہوم میں ہوگا اور ملائکہ کی طرف نسبت سے رحمت کی دعا کے مفہوم میں۔ نسبت کے بدل جانے سے الفاظ کے معانی میں تبدیلی کی مثالیں قرآن اور کلامِ عرب میں بہت ہیں۔ یہی لفظ اسی سورہ میں دو مختلف مفہوموں میں استعمال ہوا ہے۔ 'اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ' (بے شک اللہ اپنے نبی پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی اس کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں تو اے اہلِ ایمان تم بھی اس پر درود بھیجو) آیت کے آخر میں 'وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا' بھی اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ یہاں یہ لفظ 'یُصَلِّیْ' اللہ تعالیٰ کے لیے رحمت نازل کرنے ہی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

اہلِ ایمان کے لیے فرشتوں کا استغفار

اہلِ ایمان کے لیے فرشتوں کے استغفار کا ذکر قرآن میں دوسری جگہ بھی آیا ہے۔ مثلاً

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَہٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّھِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِہٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ کُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَۃً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِیْلَکَ وَقِھِمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ (المؤمن: ۷)

وہ جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے ارد گرد ہیں اپنے رب کی اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اہلِ ایمان کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز کو وسیع ہے، تو ان لوگوں کی مغفرت فرما جنھوں نے توبہ اور تیرے راستے کی پیروی کی اور ان کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔

اسی طرح سورۂ شوریٰ میں بھی ہے۔

وَالْمَلٰٓئِکَۃُ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّھِمْ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِی الْاَرْضِ (الشوریٰ: ۵)

اور فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور جو زمین میں ہیں ان کے لیے وہ استغفار کرتے ہیں۔

تَحِیَّتُھُمْ یَوْمَ یَلْقَوْنَہٗ سَلٰمٌ ۚ وَاَعَدَّ لَھُمْ اَجْرًا کَرِیْمًا (۴۴)

اہلِ ایمان کے لیے آخرت میں اللہ تعالیٰ کا سلام و پیغام

اوپر کی آیت میں اس رحمت و برکت کا ذکر ہے جو اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے با ایمان بندوں پر نازل ہوتی ہے۔ اس آیت میں اس سلام و پیغام کا ذکر ہے جو آخرت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کی طرف سے با ایمان بندوں کے پاس آئے گا

فرمایا کہ ان کا خیر مقدم، جس دن وہ اس سے (اپنے رب سے) ملیں گے، سلام سے ہوگا اور اللہ نے ان کے لیے نہایت باعزت صلہ تیار کر رکھا ہے۔

لفظ 'تَحِیَّة' یہاں اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے اور اس کا صحیح مفہوم خیر مقدم ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی اس بات کا ذکر ہے کہ اہلِ جنت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی سلام آئے گا اور فرشتے بھی ان کا خیر مقدم سلام کے ساتھ کریں گے۔

سورۂ فرقان میں ہے:

وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا (۷۵) — اور اس میں ان کا استقبال تحیت اور سلام کے ساتھ ہوگا۔

سورۂ یٰسٓ آیت ۵۸ میں اس بات کی بھی تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان لوگوں کو سلام کہلایا جائے گا:

سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيمٍ ۝ — اور ان کے لیے سلام ہوگا جو ربِ رحیم کی طرف سے ان کو کہلایا جائے گا۔

سورۂ زمر آیت ۷۳ میں یہ تصریح ہے کہ جنت کے دربان ملائکہ اہلِ جنت کا استقبال سلام سے کریں گے:

وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خٰلِدِينَ — اور ان سے جنت کے پاسبان کہیں گے، آپ لوگوں پر سلامتی ہو، خوش ہوں، اس جنت میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جائیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا (۴۵-۴۶)

نبی صلعم کا فریضۂ منصبی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے آپ کا منصب بتایا گیا ہے اور اس منصب کے ساتھ جو ذمہ داریاں وابستہ ہیں ان کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے تاکہ حضورؐ پر بھی یہ واضح ہو جائے کہ آپ کو کیا کام کرنے ہیں اور کس طرح کرنے ہیں اور دوسروں پر بھی آپ کی شخصیت کی اصلی نوعیت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ منافقین و مخالفین دونوں اس روشنی میں اپنے اپنے رویے کا جائزہ لے سکیں۔ فرمایا کہ اے نبی! ہم نے تم کو شاہد، مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ 'شاھد' سے مراد ہے اللہ کے دین اور اس کے احکام و مرضیات کی گواہی دینے والا۔ رسول کی بعثت کا اصلی مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے لوگوں کو یہ بتائے کہ اللہ نے کن باتوں کا حکم دیا ہے، کن باتوں سے روکا ہے۔

'مُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا' سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ آپ کے پیغام کو قبول کر لیں ان کو آپ ابدی فوز و فلاح کی خوش خبری دیں اور جو لوگ اس سے اعراض یا اس کی تکذیب کریں ان کو اس کے نتائج سے آگاہ

کردیں ۔ اس انذار و تبشیر کے بعد اس شہادت سے متعلق آپ کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے ۔ اس امر کی آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگوں نے آپ کی دعوت قبول کی یا رد کی اور اگر قبول کی تو یکسوئی کے ساتھ قبول کی یا تذبذب کے ساتھ قبول کی ۔ ان تمام امور کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے ۔

'وَدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ' یہ اسی مضمون کی مزید وضاحت ہے کہ تم کو اللہ نے اپنے حکم سے اپنی طرف لوگوں کو بلانے کے لیے مامور فرمایا ہے کہ لوگ شیطان اور اس کی ذریات کی پیروی چھوڑ کر اپنے رب کی طرف آئیں ۔ اس کے ساتھ 'بِإِذْنِهٖ' کی قید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی اور اطمینان دہانی کے لیے ہے کہ دعوت الی اللہ کی اس مہم پر خود اللہ تعالیٰ نے آپ کو مامور فرمایا ہے اس وجہ سے وہ آپ کو تنہا نہیں چھوڑے گا بلکہ ہر قدم پر آپ کی مدد و رہنمائی فرمائے گا ۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کوئی خود ساختہ نبی تو نہیں ہیں کہ اللہ آپ کو بھٹکنے کے لیے چھوڑ دے بلکہ یہ ذمہ داری آپ پر اللہ نے ڈالی ہے تو وہ اس کے اٹھانے میں بھی آپ کی مدد فرمائے گا اور آپ مخالفوں کی تمام مخالفانہ سرگرمیوں کے علی الرغم اپنے مشن میں کامیاب ہوں گے ۔

'وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا' یعنی اللہ نے آپ کو ایک روشن چراغ بنایا جو خود بھی علم و حکمت کے نور سے منور ہے اور لوگوں کو بھی تاریکیوں سے نکال کر اللہ کی صراط مستقیم کی طرف لانے کے لیے رہنمائی کر رہا ہے ۔ اگر لوگ اس سراجِ منیر کی قدر نہیں کریں گے تو آپ کا کچھ نہیں بگاڑیں گے بلکہ خود اپنی ہی تباہی کا سامان کریں گے اس دنیا میں گمراہیوں میں بھٹکتے رہیں گے اور آخرت میں جہنم کے ایندھن بنیں گے ۔

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِأَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا (۴۷)

یہ آپ کے 'بشیر' ہونے کا پہلو واضح فرمایا کہ جو لوگ آپ کی دعوت پر ایمان لائیں ان کو خوش خبری دیجیے کہ وہ مخالفوں کی مخالفت اور حالات کی نامساعدت سے ہراساں نہ ہوں ، ان پر اللہ کی طرف سے ایک عظیم فضل ہونے والا ہے اگر وہ اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے ۔

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (۴۸)

یہ آپ کے 'نذیر' ہونے کے پہلو کی وضاحت ہے لیکن مخالفوں کو مخاطب کر کے ان کو کچھ کہنے یا کہلانے کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مخاطب کر کے بتا دیا کہ اس کو ان مخالفوں کے ساتھ آئندہ کے لیے کیا رویہ اختیار کرنا ہے ۔ اس رویہ ہی کے اندر وہ انذار مضمر ہے جو پتہ دے رہا ہے کہ مستقبل قریب میں آپ کے یہ مخالفین کس انجام سے دوچار ہونے والے ہیں ۔ فرمایا کہ ان کافروں اور منافقوں کی باتوں کا ذرا دھیان نہ کرو ، ان کی ایذا رسانیوں کو نظر انداز کرو ، اللہ پر بھروسہ رکھو ، اللہ اعتماد کے لیے کافی ہے ۔ اس آیت کے اندر حضورؐ کے لیے جو تسلی ہے وہ بھی لفظ لفظ سے نمایاں ہے اور مخالفوں کے لیے جو قہر و غضب ہے وہ بھی حرف حرف سے ابلا پڑ رہا ہے ۔

'وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ' میں لفظ 'اِطَاعَة' کسی کی بات کا دھیان کرنے ، اس کو اہمیت دینے اور اس

کی پروا کرنے کے مفہوم میں یہاں استعمال ہوا ہے۔ اس معنی میں اس لفظ کا استعمال معروف ہے۔ ہم اس کے محل میں اس مفہوم کی تائید میں شواہد نقل کر آئے ہیں۔

'وَدَعْ اَذٰىهُمْ' میں 'اَذٰی' سے اشارہ منافقین کی اس طرح کی ایذا رسانیوں کی طرف ہے جس کا مظاہرہ انھوں نے حضرت زینبؓ کے معاملہ میں کیا اور اس سے پہلے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے معاملے میں کر چکے تھے۔ آگے اسی سورہ میں ان کی مزید ایذا رسانیوں کا ذکر آ رہا ہے۔ لفظ 'دَعْ' یہاں تحقیر کے مفہوم پر دلیل ہے یعنی ان کی ان خرافات کو چند ے نظر انداز کرو۔

'وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا' کے اندر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جتنی بڑی تسلی ہے اس سے بڑی کفار و منافقین کے لیے دھمکی ہے کہ اب تم ان کا معاملہ اللہ پہ چھوڑ دو، اللہ ان سے نمٹنے کے لیے کافی ہے!

۸- مسئلہ ختم نبوت

اس مجموعۂ آیات کی تمام ضروری تعلیمات کی وضاحت آیات کے تحت ہو چکی ہے البتہ آیت ۴۰ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کا جو ذکر آیا ہے اس کے بعض پہلو مزید وضاحت کے طالب ہیں۔ ہم یہاں بالاختصار ان کی طرف بھی اشارہ کریں گے۔

۱- اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ چیز یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی تاریخ اور ان کی تعلیمات و ارشادات کا جو ریکارڈ قدیم صحیفوں اور قرآن مجید میں یا تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے، اس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سیدنا مسیحؑ تک کسی نبی کے متعلق نہ تو اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ وہ خاتم الانبیاء ہے نہ کسی نبی نے خود اپنے خاتم الانبیاء ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس ہر نبی نے اپنے بعد آنے والے نبی یا نبیوں کی بشارت دی ہے۔ حضرت آدمؑ اور ان کی ذریت کی خلافت پر فرشتوں کو جو اعتراض تھا، بقرہ کی تفسیر میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ ان کے اعتراض کے جواب میں حضرت آدمؑ نے اپنی ذریت میں پیدا ہونے والے انبیاء کے نام ہی گنا کر ان کو قائل کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے انبیاء کے حالات زیادہ تفصیل سے تو کہیں مذکور نہیں ہیں لیکن آپ کے اور آپ کے بعد آنے والے انبیاء کے حالات تورات میں بھی موجود ہیں اور قرآن میں بھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی ذریت کے دونوں سلسلوں ـــــ بنی اسحاق اور بنی اسماعیل ـــــ میں انبیاء کی بعثت کے لیے جو دعا کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اس دعا کی قبولیت کی جو بشارت دی ہے وہ قرآن میں بھی مذکور ہے اور تورات و تالمود میں بھی۔ ان کے حوالے ہم اس کتاب میں، ان کے محل میں، نقل کر آئے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے بعد بنی اسرائیل میں نبوت کا جو سلسلہ جاری ہوا اس کی تفصیلات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں یہ روایت رہی

ہے کہ ہر نبی نے اپنے بعد آنے والے نبی کی نہ صرف بشارت دی ہے بلکہ اکثر حالات میں خود اس کو، اسرائیلی روایت کے مطابق مسح کر کے نبی کی حیثیت سے روشناس کرایا ہے۔ اسرائیلی سلسلہ کے سب سے زیادہ جلیل القدر نبی سیدنا موسیٰؑ ہیں۔ ان کی پیشین گوئیاں تورات میں بھی موجود ہیں اور قرآن نے بھی ان کی طرف اشارے کیے ہیں۔ انھوں نے حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بھی پیشین گوئی کی ہے جس کا حوالہ ہم سورۂ اعراف آیت ۱۵۷ کی تفسیر میں دے چکے ہیں۔ بنی اسرائیل کے دورِ آخر کے انبیاء میں سے حضرت یحییٰؑ ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کا مشن ہی یہ بتایا کہ "میں اپنے بعد آنے والے کی راہ صاف کرنے آیا ہوں"۔ اُن کا یہ اشارہ سیدنا مسیحؑ کی طرف تھا۔ ان کی زندگی ہی میں جب حضرت مسیحؑ نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو حضرت یحییٰ علیہ السلام اس وقت جیل میں تھے۔ انھوں نے وہیں سے حضرت مسیح علیہ السلام سے پچھوایا کہ "وہ جس کا انتظار تھا تو ہی ہے یا ہم کسی اور کا انتظار کریں؟" حضرت مسیحؑ نے جواب دلوایا کہ "جا کے بتا دو کہ لنگڑے چل رہے ہیں اور اندھے دیکھ رہے ہیں، اب اور کیا چاہیے!" اس جواب کے بعد حضرت یحییٰؑ کو اطمینان ہو گیا کہ ان کا مشن پورا ہو گیا، وہ جس کی راہ صاف کرنے آئے تھے وہ آ گیا۔ حضرت یحییٰؑ کے بعد اسرائیلی سلسلے کے آخری نبی و رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، انھوں نے اپنے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بشارت دی اور آپ کے نام نامی کی تصریح کے ساتھ بشارت دی۔ سورۂ صف میں اس کا حوالہ یوں آیا ہے:

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (الصف: ۶)

اور جب کہ عیسیٰ بن مریم نے دعوت دی کہ اے بنی اسرائیل! میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں ان پیشین گوئیوں کے مطابق جو مجھ سے پہلے سے تورات میں موجود ہیں اور ایک رسول کی خوشخبری دیتا ہوا آیا ہوں جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہوگا۔

انجیلوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جو پیشین گوئیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق موجود ہیں ان کے حوالے سورۂ اعراف آیت ۱۵۷ کی تفسیر میں گزر چکے ہیں۔ استاذ امام مولانا فراہیؒ کا خیال تو یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ نے انجیلوں میں آسمانی بادشاہت کی جو بشارت دی ہے اور اس سے متعلق جو تمثیلیں بیان فرمائی ہیں وہ بھی تمام تر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور اس کی خصوصیات ہی پر منطبق ہوتی ہیں۔

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کی روایت یہی رہی ہے کہ ہر نبی نے اپنے بعد آنے والے نبی کی بشارت دی ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آ کر یہ روایت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ نہایت واضح الفاظ میں خود اللہ تعالیٰ نے بھی آپ کو خاتم النبیین قرار دیا اور حضورؐ نے بھی نہ صرف یہ کہ

اپنے بعد کسی آنے والے کی بشارت نہیں دی بلکہ نہایت واضح اور قطعی الفاظ میں بار بار اس حقیقت کا اظہار واعلان فرمایا کہ آپ آخری نبی ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ ہر معقول آدمی سمجھ سکتا ہے کہ حضورؐ کے بعد اگر کسی نبی کے آنے کی ادنیٰ گنجائش بھی ہوتی تو سابق انبیاء کی روایت کے مطابق حضورؐ اس کی پیشین گوئی فرماتے اور اگر پیشین گوئی نہ فرماتے تو کم از کم اس شدت کے ساتھ اس دروازے کو بند تو نہ کر دیتے کہ جو اس کو کھولنے کی جسارت کرے وہ نقب زن کہلائے۔

۲۔ اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات منقول ہیں ان سب کے نقل کرنے میں طوالت ہوگی۔ ہم صرف بعض حدیثوں کا حوالہ دیں گے جن کی شہرت حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہے۔ بخاری میں روایت ہے:

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان مثلی ومثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنٰی بیتا فاحسنہ واجملہ الا موضع لبنۃ من زاویۃ فجعل الناس یطوفون بہ ویعجبون لہ ویقولون ھلا وضعت ھذہ اللبنۃ فانا تلک اللبنۃ وانا خاتم النبیین (بخاری)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اور مجھ سے پہلے گزرے ہوئے انبیاء کی تمثیل یوں ہے کہ ایک شخص نے ایک عمارت بنائی، نہایت حسین وجمیل، لیکن اس کے ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ خالی رہ گئی۔ لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے اور اس کی تحسین کرتے اور کہتے کہ یہ اینٹ بھی کیوں نہ رکھ دی گئی! سو میں وہی اینٹ ہوں اور میں خاتم النبیینؐ ہوں۔

اس حدیث کے متعلق یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ کم وبیش انہی الفاظ میں حضرت مسیحؑ نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی فرمائی تھی۔ ان کا ارشاد ہے کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا بالآخر وہی کونے کا آخری پتھر بنا۔ علمائے یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق پیشین گوئیوں پر جن جن طریقوں سے پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے ان کی تفصیلات سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہیں لیکن ان کی ان تمام کوششوں کے علی الرغم اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے لیے جو مقام مقدر فرمایا تھا وہ آپ کو حاصل ہو کے رہا۔ آپ قصرِ نبوت کے کونے کی آخری اینٹ بھی بنے اور انبیاء ورسل کے مبارک سلسلے کے خاتم بھی۔

یہ ختم نبوت اس تکمیل دین کا لازمی اور بدیہی تقاضا ہے جس کا ذکر اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ والی آیت میں ہوا ہے۔ اگر دین کوئی ایسی چیز ہوتا جس کی تکمیل کبھی ہونے والی ہی نہ ہوتی تب تو بے شک نبوت ورسالت کا سلسلہ بھی جاری رہتا لیکن جب دین کی تکمیل ہو چکی ہے، اور اس بدیہی حقیقت کے انکار کی جرأت کوئی بھی نہیں کر سکتا تو پھر اس کے اس لازمی نتیجہ کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ نبوت ورسالت کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اسی حقیقت کو حضورؐ نے اس حدیث میں واضح فرمایا ہے اور اتنے مختلف طریقوں سے واضح فرمایا ہے کہ کسی معقول آدمی کے لیے اس میں کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے۔

ترمذی میں روایت ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الرسالۃ والنبوۃ قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رسالت اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا۔ اب میرے بعد نہ کوئی رسول ہوگا اور نہ کوئی نبی۔

جس مشہور حدیث میں آپ نے تمام انبیاء کے مقابل میں اپنے چھ فضائل گنائے ہیں آخری فضیلت ان میں یہ مذکور ہوئی ہے کہ ختم بی النبیون (میرے اوپر انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا گیا)۔

اسی طرح ایک روایت میں آپ نے اپنے مختلف اسماء کا ذکر فرمایا ہے جن میں آخری نام آپ نے 'عاقب' بتایا ہے اور اس کی خود ہی یہ شرح فرمائی کہ 'الذی لیس بعدہ نبی' (جس کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا)۔

۲- یہ امر بھی واضح رہے کہ نبوت کی بہت سی قسمیں نہیں ہیں۔ نبوت کی صرف ایک ہی قسم ہے جو اپنے تمام شرائط و خصوصیات کے ساتھ قرآن و حدیث میں بیان ہوئی ہے۔ البتہ نبی اور رسول میں ایک فرق ہے جس کی طرف ہم اوپر بھی اشارہ کر چکے ہیں اور اس کتاب کے دوسرے مقامات میں بھی پوری تفصیل سے اس کی وضاحت ہوئی ہے۔ بعض گمراہ فرقوں نے نبوت کے حرم میں نقب لگانے کے لیے اپنے جی سے نبوت کی متعدد قسمیں بیان کی ہیں اور ان کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں جس نبوت کے ختم ہونے کا ذکر ہے وہ الگ چیز ہے اور جس نبوت کے مدعی وہ ہیں وہ دوسری چیز ہے۔ نبوت کی یہ تقسیم ان کی طبع زاد ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کا کوئی ذکر تو درکنار اس کا کوئی ادنیٰ اشارہ بھی موجود نہیں ہے۔ اس تقسیم سے انھوں نے بظاہر اپنے کفر کو ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ درحقیقت 'زیادۃ فی الکفر' ہے یعنی اپنے کفر کو انھوں نے اور زیادہ غلیظ بنا دیا ہے۔ اس لیے کہ اس تقسیم نے نبوت کے اس نظام ہی کو بالکل تلپٹ کر کے رکھ دیا ہے جس پر سارے دین کی عمارت قائم ہے لیکن ہمارے لیے یہاں اس مسئلہ سے تعرض کرنے کی گنجائش نہیں ہے بس اتنی بات یاد رکھیے کہ حضورؐ نے جس صراحت کے ساتھ اپنے بعد نبوت کے ختم ہونے کا اعلان فرمایا ہے اسی وضاحت کے ساتھ اس سوال کو بھی صاف کر دیا ہے کہ آپ کے بعد نبوت کا کوئی جزو باقی رہے گا یا نہیں، اور اگر باقی رہے گا تو اس کی نوعیت کیا ہوگی اور اس میں حصہ پانے والے کون لوگ ہوں گے۔

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الرسالۃ والنبوۃ قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی قال فشق ذلک علی الناس فقال ولکن

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد رسالت و نبوت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اب نہ کوئی رسول آئے گا اور نہ کوئی نبی۔ راوی کہتے ہیں کہ یہ بات لوگوں کے دلوں پر شاق گزری تو حضورؐ نے فرمایا کہ 'مبشرات' باقی

المبشرات قالوا یارسول اللہ وما المبشرات؟ قال رویا الرجل المسلم وھی جزء من اجزاء النبوۃ۔

رہیں گی۔ لوگوں نے سوال کیا کہ یہ مبشرات کیا ہیں یارسول اللہ؟ آپ نے فرمایا کہ کسی مسلم مرد کے خواب۔ اور یہ چیز نبوت کے اجزا میں سے ایک جزو ہے۔

بعض روایات میں 'مبشرات' کی وضاحت 'الرویا الحسنۃ' اچھے خواب یا 'الرویا الصالحۃ' نیک خواب سے بھی وارد ہوئی ہے۔

اس حدیث سے چند باتیں بالکل صاف ہوجاتی ہیں۔

ایک یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وحی کا سلسلہ بالکل بند ہوگیا۔ اب نبوت کے اجزا میں سے صرف ایک جزو رویائے صالحہ کا باقی رہ گیا ہے۔ جو لوگ الہام اور کشف و مخاطبہ وغیرہ کے مدعی ہیں ان کی بھی اس حدیث سے تردید ہوجاتی ہے۔

دوسری یہ کہ یہ رویائے صالحہ کسی بھی مومن و مسلم کو نظر آسکتے ہیں۔ یہ کسی کے لیے خاص نہیں ہیں۔ اس قسم کی رویائے صالحہ دیکھنے والے کو نبوت کا کوئی مقام حاصل نہیں ہوجاتا اور نہ اس قسم کے خواب کسی پر کوئی حجت ہوتے۔ ان کی حیثیت بس یہ ہوتی ہے کہ اگر خواب دیکھنے والے نے اچھے خواب دیکھے ہیں تو ان سے ایک قسم کی خوش خبری اور فال نیک حاصل کرے۔ اس سے زیادہ ان کی کوئی اہمیت نہیں۔

تیسری یہ کہ ظلی اور بروزی نبوت کی اصطلاحات بالکل شیطانی ہیں۔ اگر ان کی کوئی حقیقت ہوتی تو اس موقع پر لوگوں کو اطمینان دلانے کے لیے حضور ضرور یہ فرماتے کہ لوگ نبوت کے ختم ہونے سے زیادہ ہراساں نہ ہوں، میرے بعد ظلی اور بروزی انبیاء آتے رہیں گے۔

۴۔ قرآن مجید کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو انتظام فرمایا وہ بھی درحقیقت ختم نبوت ہی کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام آئے ان کی تعلیمات کی حفاظت کے لیے وہ انتظام نہیں کیا گیا جو قرآن کی حفاظت کے لیے کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاء کی بعثت کا سلسلہ جاری تھا۔ اگر سابق نبی کی تعلیم کو اس کی قوم فراموش کردیتی یا اس میں تحریف کردیتی تو بعد میں آنے والا نبی اس کی بھی تجدید کردیتا اور اس میں اللہ تعالیٰ جو اضافہ فرماتا اس سے بھی لوگوں کو آگاہ کردیتا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا اور دین بھی کامل ہوگیا اس وجہ سے ضروری ہوا کہ قرآن مجید کو اس طرح محفوظ کردیا جائے کہ قیامت تک شیاطین جن و انس اس میں کوئی دراندازی نہ کرسکیں۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو اس طرح محفوظ کردیا ہے کہ اس میں کسی زیر زبر کے فرق ہونے کا بھی کوئی امکان نہیں رہا۔ حق و باطل کے امتیاز کے لیے اصل خدائی کسوٹی قرآن ہے۔ اگر وہ محفوظ ہے تو اب کسی وحی و الہام اور کسی مخاطبہ و مکاشفہ کی حاجت باقی نہیں رہی اور نبی کی اصل چونکہ اسی پہلو سے ہوتی ہے اس وجہ سے اب نبی کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی۔ رہا 'شہادت علی الناس'

کا فریضہ اور لوگوں میں پیدا ہونے والی خرابیوں کی اصلاح تو یہ ذمہ داری اصلاً اس امت پر بحیثیت مجموعی عائد ہوتی ہے اور اس کے لیے عنداللہ مسئول علما رہیں گے۔ اور احادیث میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ اس امت میں ایسے علماء و مصلحین برابر پیدا ہوتے رہیں گے جو مفسدین کی پیدا کی ہوئی خرابیوں کی اصلاح کرتے رہیں گے اگرچہ ان کی تعداد کتنی ہی کم ہو۔

۵۔ اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اب قیامت تک کسی نبی کے آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ بات قرآن و حدیث کے نصوص سے بھی ثابت ہے اور عقل و فطرت کی شہادت بھی یہی ہے۔ اگر روایات و آثار میں کوئی ایسی چیز آپ کے سامنے آئے جو ان قطعی نصوص کے خلاف نظر آئے تو اس پر غور کیجیے۔ اگر تاویل کی راہ سے باہم توفیق و تطبیق ہو جائے تو فبہا، اگر توفیق و تطبیق نہ ہو سکے تو ترجیح بہرحال قرآن کے نصوص اور دین کے مسلمات کو حاصل ہوگی۔ میں نے اس پہلو سے تمام روایات و آثار کو جانچا ہے۔ میرے نزدیک ان کی تطبیق اس بنیادی اصول کے ساتھ نہایت عمدہ طریقے پر ہو جاتی ہے لیکن یہاں اس بحث کی تفصیلات میں جانے کا محل نہیں ہے۔

۹۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۴۹-۵۲

آیات ۴۹-۵۲ کا پس منظر

اس مجموعۂ آیات کے پس منظر کو بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے اس لیے کہ اس میں بھی بڑا ایجاز ہے جس کے سبب سے مفسرین کو بڑی الجھنیں پیش آئی ہیں۔

یہ آیات درحقیقت سورۂ نساء کی آیت ۳ پر، جس میں عام مسلمانوں کے لیے تحدیدِ ازواج کا حکم بیان ہوا ہے، استدراک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ نساء کی مذکورہ آیت کے نزول کے بعد جن مسلمانوں کے نکاح میں چار سے زیادہ بیویاں تھیں انھوں نے زائد بیویوں کو طلاق دے دی لیکن حضورؐ سے متعلق کسی بیوی کو طلاق دینا ثابت نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت حضورؐ کے نکاح میں چار ہی بیویاں تھیں۔ بعد میں جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ نے حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کیا تو منافقین نے اس پہلو سے بھی اس پر اعتراض کیا کہ انھوں نے اپنے لیے اور دوسروں کے لیے اور شریعت بنا رکھی ہے۔ ان منافقین کا منہ بند کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس خاص اجازت کی وضاحت فرمائی جو ازواج کے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی۔

اس اجازتِ خاص کے نمایاں پہلو یہ ہیں:

آپ کی وہ ازواج جن کے مہر آپ ادا کر چکے ہیں، بلا استثنا آپ کے لیے جائز کی گئیں۔

ملکِ یمین جو بطورِ فے آپ کو حاصل ہوں، اگر آپ ان میں سے کسی کو آزاد کر کے ان سے نکاح کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔

آپ کے قریبی رشتہ کی خواتین میں سے اگر کسی نے دین کی خاطر اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کو چھوڑ کر آپ

کے ساتھ ہجرت کی ہے، آپ ان میں سے بھی کسی سے نکاح کر سکتے ہیں۔

- اگر کوئی مومنہ اپنے آپ کو ہبہ کر دے اور آپ اس کو اپنے نکاح میں لینا چاہیں تو اس کی بھی آپ کو اجازت ہے۔
- یہ نکاح چونکہ تمام تر مصلحتِ دین وملت کی خاطر ہیں اس وجہ سے حقوقِ زوجیت کے معاملے میں آپ پر سے وہ پابندیاں اٹھالی گئیں جو دوسروں پر تھیں۔

ان آزادیوں کے ساتھ حضورؐ پر دو پابندیاں بھی عائد کی گئیں جو دوسروں پر نہیں تھیں:

- ایک یہ کہ اس دائرہ سے باہر آپ کوئی نکاح نہیں کر سکتے۔
- دوسری یہ کہ ان ازواج کو دوسری ازواج سے بدل نہیں سکتے۔

یہ آزادی اور پابندی جن مصالح پر مبنی ہے چند اصولی باتیں ان سے متعلق بھی سمجھ لیجیے۔

حضورؐ نے جتنے نکاح بھی کیے حظِ نفس کے لیے نہیں بلکہ دعوتِ دین، تالیفِ قلب، دلداری اور مصالحِ ملت کی خاطر کیے۔ آیت ۳۴ کے تحت آپ پڑھ آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس مشن کی ذمہ داری آپ پر ڈالی تھی اس میں ازواجِ مطہراتؓ بھی شریک کی گئی ہیں گویا یہی وہ اصل مقصد تھا جس کی خاطر اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی کی معیت کے لیے منتخب فرمایا۔ اس فرض کو ازواجِ مطہراتؓ نے جس اہتمام اور جس خوبی کے ساتھ انجام دیا اس پر ہماری حدیث وسیرت کی کتابیں شاہد ہیں۔ خاص طور پر حضرت عائشہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت حفصہؓ اور حضرت میمونہؓ کا حصہ اس خدمت میں اگر مردوں سے زیادہ نہیں تو ان سے کم بھی نہیں ہے۔ عورتوں سے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات زیادہ تر انہی سیدات کے ذریعے سے پھیلی ہیں اور انہی کے ذریعے سے پھیل سکتی تھیں۔

حضرت زینبؓ سے آپؐ نے جن حالات میں اور جن مصالح کے تحت نکاح کیا ان کی تفصیلات آپ پڑھ آئے ہیں۔ انھوں نے ایک اہم معاشرتی اصلاح کی خاطر اپنے بھائی اور دوسرے عزیزوں کی رائے کے خلاف اپنے آپ کو ہدفِ مطاعن بنانا گوارا کیا لیکن حضورؐ کی بات نہیں ٹالی۔ ان کی اس قربانی کا اگر کوئی صلہ ہو سکتا تھا تو یہی ہو سکتا تھا کہ حضرت زیدؓ کے طلاق دینے کے بعد حضورؐ خود ان کو اپنے رشتۂ زوجیت کا شرف بخشیں۔ پھر حضرت زیدؓ کی طرح حضورؐ کے ساتھ بھی ان کا نکاح ایک عظیم معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بنا اور اس میں بھی ان کو منافقین و منافقات کی یاوہ گوئیوں کا ہدف بننا پڑا لیکن انھوں نے اللہ اور رسول کی خاطر یہ تمام باتیں برداشت کیں۔

ازواجِ مطہراتؓ میں سے حضرت ام حبیبہؓ کے نکاح کا واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے قریش کے ظلم وستم سے تنگ آ کر اپنے شوہر عبید اللہ کے ساتھ حبش کو ہجرت کی۔ وہاں ان کو یہ افتاد پیش آئی کہ کچھ عرصہ بعد ان کے شوہر نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ اس عالمِ غربت میں انھوں نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر کے

تنہائی و بے کسی کی زندگی بسر کرنا گوارا کی لیکن اپنے ایمان پر ثابت قدم رہیں۔ ان کی اس عزیمت و استقامت کے صلہ میں حضورؐ نے ان کو نکاح کا پیغام دیا۔ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ اس استقامت کا کوئی صلہ اس دنیا میں اگر ہو سکتا تھا تو یہی ہو سکتا تھا کہ حضور ان کو یہ عزت بخشیں۔

حضرت جویریہؓ اور حضرت صفیہؓ کے ساتھ آپؐ کے نکاح کی نوعیت یہ ہے کہ غزوۂ بنی مصطلق اور غزوۂ خیبر میں یہ بطور فَے حضورؐ کے حصہ میں آئیں۔ یہ سرداروں کی بیٹیاں تھیں۔ ان کی خاندانی وجاہت کو ملحوظ رکھ کر حضورؐ نے ان کو لونڈیوں کی حیثیت سے رکھنا پسند نہیں فرمایا بلکہ ان کو آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔ ان نکاحوں کی دینی و سیاسی مصلحت بالکل واضح ہے۔

بعض صحابیاتؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف شرفِ نسبت کی خواہشمند تھیں اور وہ اپنے تئیں حضورؐ کو ہبہ کر دینا چاہتی تھیں۔ اس قسم کی خواتین میں سے حضرت میمونہؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ حضورؐ نے ان کی درخواست منظور فرمائی اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس درخواست کی منظوری میں زیادہ دخل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ کی سفارش کو تھا۔

اس سے ملتا جلتا حال حضرت سودہؓ کا بھی ہے۔ ان کے حالات شاہد ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت کے سوا اور کوئی خواہش ان کے اندر نہیں تھی۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ حضورؐ کے معاملہ کی نوعیت ایسی نہیں تھی کہ در بابِ نکاح و طلاق آپ کو اس تحدید کا پابند کر دیا جائے جو عام مسلمانوں کے لیے تھی۔ ایسا کرنے میں بہت سے مصالح کے فوت ہونے کا اندیشہ تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے ایک ایسا ضابطہ نازل فرمایا جس میں فی الجملہ وسعت بھی ہے تاکہ وہ دینی مصالح ملحوظ رکھے جا سکیں جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا اور ساتھ ہی اس میں حضورؐ پر بعض پابندیاں بھی ہیں جو دوسرے مسلمانوں پر نہیں ہیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ حضورؐ کو جو آزادی بخشی گئی وہ تمام تر مصالح پر مبنی تھی۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۹-۵۲

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِذَا نَكَحْتُمُ ٱلْمُؤْمِنَٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن
قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا
فَمَتِّعُوهُنَّ وَسَرِّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ﴿۴۹﴾ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِىُّ إِنَّآ
أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَٰجَكَ ٱلَّٰتِىٓ ءَاتَيْتَ أُجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ
يَمِينُكَ مِمَّآ أَفَآءَ ٱللَّهُ عَلَيْكَ وَبَنَاتِ عَمِّكَ وَبَنَاتِ عَمَّٰتِكَ وَ

بَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِیْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ؗ وَ امْرَاَةً
مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِیِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنْ یَّسْتَنْكِحَهَا ۗ
خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَیْهِمْ
فِیْۤ اَزْوَاجِهِمْ وَ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ لِكَیْلَا یَكُوْنَ عَلَیْكَ حَرَجٌ ؕ
وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۵۰﴾ تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَ تُـْٔوِیْۤ
اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ ؕ وَ مَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ ؕ
ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ وَ لَا یَحْزَنَّ وَ یَرْضَیْنَ بِمَاۤ اٰتَیْتَهُنَّ
كُلُّهُنَّ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا ﴿۵۱﴾
لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَ لَاۤ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ
وَّ لَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ یَمِیْنُكَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰی
ع ۶ ۱۲ ۳ كُلِّ شَیْءٍ رَّقِیْبًا ﴿۵۲﴾

ترجمۂ آیات ۴۹-۵۲

اے ایمان والو، جب تم مومنہ عورتوں سے نکاح کرو پھر ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دے دو تو ان کے بارے میں تم پر کوئی عدّت واجب نہیں ہے جس کا تمھیں لحاظ کرنا ہو۔ پس ان کو کچھ دے دلا دو اور خوبصورتی کے ساتھ رخصت کردو۔ ۴۹

اے نبی، ہم نے تمھاری ان بیویوں کو تمھارے لیے جائز کیا جن کے مہر تم دے چکے ہو اور تمھاری ان مملوکات کو بھی تمھارے لیے حلال کیا جو اللہ نے تم کو بطورِ غنیمت عطا فرمائیں اور تمھارے چچا کی بیٹیوں اور تمھاری پھوپھیوں کی بیٹیوں اور تمھارے ماموں کی بیٹیوں اور تمھاری خالاؤں کی بیٹیوں میں سے بھی ان کو حلال ٹھہرایا جنھوں نے تمھارے

ساتھ ہجرت کی ہے اور اس مومنہ کو بھی جو اپنے تئیں نبی کو ہبہ کر دے بشرطیکہ پیغمبر اس کو اپنے نکاح میں لانا چاہیں۔ یہ خاص تمہارے لیے ہے، مسلمانوں سے الگ۔ ہم کو اچھی طرح معلوم ہے جو کچھ ہم نے ان پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے باب میں فرض کیا ہے تاکہ تم پر کوئی تنگی نہ رہے اور اللہ غفور رحیم ہے۔ تم ان میں سے جن کو چاہو دور رکھو اور ان میں سے جن کو چاہو اپنے پاس رکھو اور اگر تم ان میں سے کسی کے طالب بنو جن کو تم نے دور کیا تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ یہ اس بات کے قرین ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ غمگین نہ ہوں اور وہ اس پر قناعت کریں جو تم ان سب کو دو۔ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اور اللہ علم رکھنے والا اور بُردبار ہے۔ ان کے علاوہ جو عورتیں ہیں وہ تمہارے لیے جائز نہیں ہیں اور نہ یہ جائز ہے کہ تم ان کی جگہ دوسری بیویاں کرلو اگرچہ ان کا حُسن تمہارے لیے دل پسند ہو۔ بجز ان کے جو تمہاری مملوکہ ہوں اور اللہ ہر چیز پر نگاہ رکھنے والا ہے۔ ۵۰-۵۲

۱۰۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَیْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا (۴۹)

ایک ضمنی سوال کا جواب

آگے آیت ۵۰ سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہاں جو وضاحت فرمائی گئی ہے اس کی نوعیت درحقیقت اس حکم پر استدراک کی ہے جو سورۂ نساء میں عام مسلمانوں کو تحدید ازواج سے متعلق دیا گیا ہے اصل استدراک سے پہلے یہ آیت بطور تمہید ہے جس میں ایک ضمنی سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ اگر کسی نے ایک عورت سے نکاح کیا لیکن رخصتی اور ملاقات کی نوبت آنے سے پہلے ہی اس کو طلاق دے دی تو اس کے معاملے میں عدّت کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہ سوال خاص طور پر اس زمانے میں اس وجہ سے پیدا ہوا ہوگا کہ تحدید ازواج کے حکم کی تعمیل میں طلاق کے واقعات بکثرت پیش آئے ہوں گے اور طلاق

دینے والوں نے زیادہ اولیٰ یہی سمجھا ہو گا کہ اپنی ان منکوحات کو طلاق دیں جن سے ازدواجی تعلقات ابھی قائم نہیں ہوئے ہیں۔ اس آیت نے ان کے لیے نہایت مبنی بر عدل سہولت مہیا کر دی۔ ایسے لوگوں کو یہ ہدایت فرمائی گئی کہ اس قسم کی عورتوں کے معاملے میں عدت کے لحاظ کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ان کو حسب استطاعت دے دلا کر باعزت طریقہ سے رخصت کر دیا جائے۔ اس دینے دلانے کی تفصیل بقرہ کی آیات ۲۳۶-۲۳۷ میں گزر چکی ہے۔ وہاں ہم نے 'سراح جمیل' کی اہمیت بھی واضح کی ہے کہ اسلام میں مطلوب یہ ہے کہ میاں بیوی میں جدائی کی نوبت بھی آئے تو حتی الامکان بہ خوبصورتی کے ساتھ ہو۔ فریقین کے لیے کسی فضیحتے کا موجب نہ ہو۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَاۗءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۡ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۤ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۵۰)

حضرت زینبؓ کے نکاح پر منافقین کا ایک اعتراض

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ جس وقت تحدید ازواج کا حکم نازل ہوا ہے قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کے نکاح میں چار ہی بیویاں —— حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت سودہؓ اور حضرت ام سلمہؓ —— تھیں[۱]۔ اس وجہ سے نہ حضورؐ کے لیے کسی بیوی کو طلاق دینے کا سوال پیدا ہوتا تھا اور نہ اس باب میں منافقین یا معترضین کے لیے کسی نکتہ چینی کی گنجائش تھی۔ لیکن ۵ھ میں حضورؐ نے جب حضرت زینب بنت جحشؓ سے نکاح کیا تب معلوم ہوتا ہے کہ منافقین نے جس طرح یہ فتنہ اٹھایا کہ آپ نے اپنے متبنّیٰ کی منکوحہ سے نکاح کر لیا اسی طرح یہ اعتراض بھی اٹھایا کہ آپ نے اپنے لیے الگ شریعت بنا رکھی ہے، دوسرے مسلمانوں کو تو بیویوں کے معاملے میں چار تک کی قید سے پابند کر دیا گیا ہے لیکن آپ نے اپنے آپ کو اس پابندی سے بالا رکھا۔

نکاح کے باب میں نبی صلعم کے امتیازات

حضرت زینبؓ کے واقعہ کی تفصیلات اوپر گزر چکی ہیں جس سے آپ کو یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ حضورؐ نے یہ نکاح اپنی خواہش سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا[۲]۔ لیکن معترضین اس بات کو کب ماننے والے تھے اس وجہ سے انھوں نے اعتراض اٹھایا ہو گا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے پوری تفصیل کے ساتھ بتایا کہ نکاح کے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے مسلمانوں کے مقابل میں کیا امتیازات حاصل ہیں۔

'يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ'۔ سب سے پہلے ان ازواج کے متعلق

---

[۱] یہ واضح رہے کہ حضرت زینب بنت خزیمہؓ کی وفات ۴ھ میں ہو چکی تھی۔ [۲] ملاحظہ ہوں آیات ۳۷-۳۸: الاحزاب

جو آیت کے نزول کے وقت آپ کے نکاح میں تھیں، فرمایا کہ ہم نے تمہاری ان بیویوں کو جن کے مہر تم ادا کر چکے ہو، تمہارے لیے جائز ٹھہرایا۔ 'جائز ٹھہرایا' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی پہلو سے ان کو حرمت لاحق ہوگئی تھی، وہ دور کر دی گئی بلکہ یہ بات منافقین و معترضین کا منہ بند کرنے کے لیے فرمائی گئی ہے کہ وہ جو ژاژ خائی چاہیں کرتے رہیں تم ان کی پروا نہ کرو۔ قرائن دلیل ہیں کہ یہ آیات ۵ھ میں نازل ہوئی ہیں۔ مکی زندگی سے لے کر ۵ھ تک، جو سیدات حضورؐ کے عقدِ نکاح میں آئیں ان میں سے حضرت خدیجہؓ اور حضرت زینب بنت خزیمہؓ کا تو جیسا کہ اوپر اشارہ گزرا، انتقال ہو چکا تھا البتہ حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت سودہؓ اور حضرت ام سلمہؓ حیات تھیں۔ اور ان میں نیا اضافہ حضرت زینب بنت جحشؓ کا ہوا تھا۔ گویا ان سب کے باب میں ارشاد ہوا کہ اللہ نے ان کو تمہارے لیے جائز کیا۔ 'اٰتَیْتَ اُجُوْرَهُنَّ' کے الفاظ سے ان کا تعارف اس لیے فرمایا ہے کہ اس کے بعد ان خواتین کا ذکر آ رہا ہے جو بطریق فے آپ کو حاصل ہوں۔ ان الفاظ نے آپ کی ان ازواج مطہراتؓ کو ان سے فی الجملہ ممتاز کر دیا اس لیے کہ مملوکات کے معاملے میں مہر کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔

بطریق فے حاصل شدہ خواتین کا حکم

'وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ' یعنی غنیمت کی راہ سے آپ کو جو ملکِ یمین حاصل ہوں ان کو بھی اللہ نے آپ کے لیے جائز کیا۔ یہاں 'وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ' کے بعد 'مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ' کے الفاظ خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عام لونڈیاں مراد نہیں ہیں بلکہ جنگ و جہاد میں جو عورتیں قید ہو کر آئیں وہ مراد ہیں۔ ان اسیرات میں لبا اوقات شریف خاندانوں اور سرداروں کی بہوئیں اور بیٹیاں بھی ہوتی تھیں۔ ان کے ساتھ فی الجملہ امتیازی سلوک کی روایت زمانۂ جاہلیت میں بھی تھی اور اسلام نے بھی اس کو باقی رکھا چنانچہ اس طرح کی عورتیں تقسیم کے وقت عموماً سرداروں ہی کو دی جاتی تھیں۔ حضرت جویریہؓ اور حضرت صفیہؓ اسی طریقہ سے علی الترتیب غزوۂ بنی مصطلق اور غزوۂ خیبر کے موقع پر حضورؐ کے حصہ میں آئیں۔ آپؐ ان کو لونڈیوں کی حیثیت سے بھی رکھ سکتے تھے لیکن آپؐ نے ان کی خاندانی وجاہت کا لحاظ فرمایا اور آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔ یہ نکاح آپؐ نے اسی اجازتِ خاص کے تحت کیے جو اس آیت میں آپ کو دی گئی۔ اگر یہ اجازت آپ کو حاصل نہ ہوتی تو آپ ان دونوں سیدات کو لونڈیوں کی حیثیت سے تو رکھ سکتے تھے لیکن بیویوں کی حیثیت سے نہیں رکھ سکتے تھے اس لیے کہ اس صورت میں ازواج کی تعداد اسلام کے عام ضابطہ سے متجاوز ہو جاتی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک قسم کی تنگی ہوتی جو آپ کے منصب کے اعتبار سے بعض اخلاقی و سیاسی مصالح میں مخل ہوتی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس طرح کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دے دی۔ یہ دونوں نکاح بالترتیب ۵ھ اور ۷ھ میں ہوئے۔ اس طرح ۷ھ تک آپ کی ازواج کی تعداد سات ہوگئی۔

[illegible]

'وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ' یہ حضورؐ کے

نہایت قریبی رشتہ کی خواتین کی تفصیل ہے کہ تمھارے چچا اور پھوپھیوں، ماموؤں اور خالاؤں کی بیٹیوں میں سے اگر کسی نے دین کی خاطر اپنے خویش و اقارب اور خاندان و قبیلہ کو چھوڑا اور تمھارے ساتھ ہجرت کی ہو اور تم اس قربانی کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کے طور پر ان میں سے کسی کو اپنے عقدِ نکاح میں لینا چاہو تو لے سکتے ہو۔ حضرت زینبؓ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو نکاح کا حکم دیا اس میں جہاں جاہلیت کی ایک رسمِ بد کی اصلاح مدنظر تھی وہیں یہ بات بھی مدنظر تھی کہ وہ آپ کی پھوپھی کی لڑکی اور دین کی راہ میں اپنی قربانیوں کے اعتبار سے آنحضرت صلعم کی دلداری کی مستحق تھیں۔

ام المومنین حضرت ام حبیبہ بنت ابی سفیانؓ کے ساتھ بھی آپ نے اسی اجازت کے تحت نکاح کیا۔ وہ آپ کے رشتہ کے چچا کی صاحبزادی تھیں اور دین کی راہ میں ان کی قربانیوں اور جانبازیوں کا جو حال تھا اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

ننھیالی رشتوں میں اگرچہ حضورؐ کا کوئی نکاح ثابت نہیں لیکن ان کے اندر بھی اگر حضرت زینبؓ اور حضرت ام حبیبہؓ جیسی کوئی مثال موجود ہوتی تو اس آیت کے تحت آپ اس رشتہ کے اندر بھی نکاح کر سکتے تھے۔

ایثارِ نفس کی حوصلہ افزائی

'وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا'۔ کسی خاتون کا اپنے آپ کو کسی کے لیے ہبہ کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ہر حق سے دست بردار ہو کر اپنے تئیں اس کے حوالہ کر دے اور حقوقِ زوجیت میں سے جو کچھ وہ بخش دے وہ اس پر قانع و راضی رہے۔ یہ ایک انتہائی ایثارِ نفس کی صورت ہے جس کا جذبہ، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محض شرفِ نسبت حاصل کرنے کے لیے متعدد صحابیاتؓ کے اندر موجود تھا اور انھوں نے حضورؐ سے اس کا اظہار بھی کیا۔ حضورؐ کی گھریلو زندگی ہر شخص کو معلوم ہے کہ فقر و فاقہ کی زندگی تھی۔ اوپر آپ پڑھ آئے ہیں کہ امہات المومنینؓ کی غریبانہ زندگی ہی کی بنا پر منافقات ان کے اندر وسوسہ اندازی کرتی رہتی تھیں کہ اگر وہ طلاق حاصل کر لیں تو وقت کے بڑے بڑے سرداران کو نکاح کے پیغام دیں گے اور ان کی یہ فقر و فاقہ کی زندگی عیش و عشرت کی زندگی سے بدل جائے گی۔ اس طرح کی غریبانہ زندگی کے لیے ظاہر ہے کہ کوئی عورت دنیا کی کوئی طمع پیشِ نظر رکھ کر یہ بازی نہیں کھیل سکتی تھی کہ وہ اپنے آپ کو ہبہ کر دے! یہ قربانی تو وہی خواتین کر سکتی تھیں جن کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عقیدت و فدویت کا ایسا جذبہ ہو کہ وہ حضورؐ کی خدمت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے اپنی زندگی کا ہر ارمان قربان کر دینے کے لیے تیار ہوں۔ یہ جذبہ ایک نہایت پاکیزہ جذبہ تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کا لحاظ فرمایا اور حضورؐ کو یہ اجازت دی کہ اگر کوئی مومنہ اپنے آپ کو اس طرح ہبہ کر دے اور حضورؐ اس کو اپنے عقدِ نکاح میں لینا چاہیں تو لے سکتے ہیں۔ 'اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا' کی قید سے یہ بات نکلتی ہے کہ ہر چند یہ جذبہ نہایت محمود اور پاکیزہ ہے لیکن اس کی حوصلہ افزائی

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے زیادہ ممکن نہیں ہے اس وجہ سے یہ معاملہ کلیتہً آپ کی صوابدید پر منحصر ہے کہ کسی کی اس طرح کی پیش کش کو آپ قبول کریں یا نہ کریں۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اس طرح کی صرف ایک پیش کش، حضرت میمونہؓ کی آپؐ نے قبول فرمائی۔ یہ نکاح عمرۃ القضاء کے موقع پر ۷ھ میں ہوا۔ اس کے بعد آپ نے کوئی نکاح نہیں کیا۔

'خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ' یعنی یہ چار سے زیادہ بیویوں کی اجازت خاص تمھارے لیے ہے، دوسرے مسلمانوں کے لیے اس کی اجازت نہیں ہے۔

نبی صلعم کے لیے خاص اجازت کی حکمت

'قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي أَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُونَ عَلَيْكَ حَرَجٌ' یہ سورۂ نساء کی آیت ۳ کی طرف اشارہ ہے جس میں مسلمانوں کو اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتے۔ فرمایا کہ ہم نے عام مسلمانوں پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے باب میں جو کچھ فرض کیا ہے وہ ہمارے پیش نظر ہے۔ اس کے باوجود ہم تم کو یہ خاص اجازت اس لیے دے رہے ہیں کہ تم پر اس باب میں کوئی تنگی باقی نہ رہے یعنی اللہ نے جن دینی و ملی مصالح کی خاطر یہ اجازت آپ کو عطا فرمائی ہے ان مصالح کو آپ بغیر کسی زحمت کے پورا کر سکیں۔ ان مصالح کی طرف ہم اوپر اشارہ کرتے آئے ہیں۔

'وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا' یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اگرچہ اس اجازت نے آپ کے اوپر حقوق و فرائض سے متعلق بہت بھاری ذمہ داریاں عائد کر دی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، وہ ان تقصیرات سے درگزر فرماتا ہے جو بلا قصد و ارادہ صادر ہو جایا کرتی ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس آیت کے متعلق، بعض روایات کی بنا پر لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ حضورؐ کے تمام نکاحوں کے بعد نازل ہوئی اور اس کے ذریعہ سے گویا آپ کو یہ اطمینان دلا دیا گیا کہ آپؐ نے جتنے نکاح کیے سب جائز ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ بات صحیح نہیں ہے۔

پہلی قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ تحدیدِ ازواج کا صریح حکم نازل ہو جانے کے بعد حضورؐ کے لیے یہ ممکن کس طرح تھا کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر آپ کوئی نکاح اس ضابطہ کے خلاف کرتے۔ آپ کے شایانِ شان بات تو یہی تھی کہ آپ اس حکم پر سب سے بڑھ کر عمل کرنے والے بنتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر اتنی ہی بات کہنی تھی کہ آپ کے سب نکاح جائز ہیں تو یہ رشتوں اور عورتوں کی اقسام کی تفصیل کی کیا ضرورت تھی۔ پھر تو یہ مختصر سا فقرہ بالکل کافی ہوتا کہ اب تک آپ نے جتنے نکاح کیے سب اللہ نے جائز کر دیے۔ اس پر کسی کو اعتراض کا کوئی حق نہیں ہے۔

بہرحال یہ رائے نہایت کمزور ہے۔ ہمارے نزدیک اصل صورتِ واقعہ وہی ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ جس وقت تحدیدِ ازواج والی آیت نازل ہوئی ہے اس وقت تو آپ کے نکاح میں چار ہی بیویاں تھیں، اس وجہ سے کسی کو طلاق دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ البتہ بعد میں جب آپ نے

حضرت زینبؓ سے نکاح کیا تو یہ چیز معترضین کے لیے وجہ اعتراض بنی ہوگی اور اس اعتراض سے دوسرے نیک نیت لوگوں کے اندر بھی شبہات پیدا ہونے کا امکان تھا۔ اس امکان کے سدباب کے لیے اللہ تعالیٰ نے نہایت تفصیل سے واضح فرما دیا کہ حضرت زینبؓ سے نکاح اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم سے کرایا ہے اور اس معاملے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عام مسلمانوں سے الگ ضابطہ ہے۔ وہ فلاں فلاں اقسام کی خواتین سے آئندہ بھی نکاح کر سکتے ہیں۔ اس طرح حضرت زینبؓ کے نکاح کو بھی جائز فرما دیا اور آئندہ کے لیے ایک ضابطہ بھی مقرر کر دیا۔ خلاصہ یہ کہ ہمارے نزدیک یہ آیت ۵ھ میں حضرت زینبؓ کے نکاح کے بعد نازل ہوئی ہے۔

تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِیْٓ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ ؕ وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ وَلَا یَحْزَنَّ وَیَرْضَیْنَ بِمَاۤ اٰتَیْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا (۵۱)

حقوق زوجیت کے معاملے میں آزادی

اوپر تفصیل سے یہ بات گزر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ سارے نکاح اصلاً مصلحتِ دین کے لیے تھے اس وجہ سے جس طرح ازواج کی تعداد کے معاملے میں آپ کو عام ضابطہ سے مستثنیٰ رکھا اسی طرح حقوقِ زوجیت کے معاملے میں بھی آپ کو آزادی دے دی کہ یہ چیز تمام تر آپ کی صوابدید پر ہے۔ آپ جس کو چاہیں اپنے پاس بلائیں، جس کو چاہیں نہ بلائیں۔ اگرچہ بیویوں کے درمیان عدل کا معاملہ بڑی اہمیت رکھنے والا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس پابندی سے بھی آزاد کر دیا اور اس کی دو وجہیں تھیں۔

اول تو وہی جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ آنحضرت صلعم کے نکاحوں میں نکاح کے عام مقصد کی حیثیت بالکل ضمنی اور ثانوی تھی۔ اصل مقصد دین تھا اور اس مقصد کے لیے ان حدود و قیود کی پابندی کی ضرورت نہیں ہے جو عام میاں بیوی کے لیے مقرر ہیں۔

دوسری یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ اندیشہ نہیں تھا کہ آپ اس آزادی سے کوئی غلط فائدہ اٹھائیں گے۔ چنانچہ آپ کے تمام سیرت نگار اس بات پر متفق ہیں کہ اس آزادی کے باوجود آپ نے اپنے اوپر عدل کی پوری پابندی قائم رکھی اور آخر عمر تک کبھی اس کی خلاف ورزی نہیں کی۔

'وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ' یعنی آپ کو اس کی بھی اجازت ہے کہ آپ اپنی ازواج میں سے کسی کو چاہیں تو ازدواجی تعلق سے بالکل معزول رکھنے کے بعد پھر ان سے تعلق کو بحال کر لیں۔ اس معاملے میں بھی نہ آپ پر کوئی پابندی ہے اور نہ آپ کی ازواج میں سے کسی کو اس پر اعتراض کا حق ہوگا۔

ازواجِ نبی کو تشویق

'ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ وَلَا یَحْزَنَّ وَیَرْضَیْنَ بِمَاۤ اٰتَیْتَهُنَّ' یہ ازواجِ مطہراتؓ کو تشویق و ترغیب ہے کہ وہ اپنے اوپر پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تعلق کو عام میاں بیوی کے تعلق کی کسوٹی پر نہ پرکھیں

بلکہ پیغمبرؐ کی اصل ذمہ داری اور اپنی اصل حیثیت کو سامنے رکھ کر جانچیں۔ اصل چیز زاویۂ نگاہ ہے۔ اگر اس میں تبدیلی ہو جائے گی اور وہ یہ سمجھ جائیں گی کہ پیغمبرؐ کے ساتھ ان کا اصل تعلق صرف میاں بیوی کا نہیں بلکہ خدمتِ دین کا ہے تو پھر حقوق کے معاملے میں نہ باہم ازواج میں کوئی رقابت ہوگی اور نہ پیغمبرؐ ہی سے کوئی گلہ و شکوہ رہے گا بلکہ اپنے مصروف لمحات میں سے پیغمبرؐ جو کچھ جس کو بخش دیں گے وہ اسی پر قناعت کریں گی۔ زاویۂ نگاہ کی تبدیلی کے بعد دینی خدمت کے اعتبار سے جس کا مرتبہ بلند ہوگا اس کی قدر جس طرح نبیؐ کی نظروں میں ہوگی اسی طرح آپ کی ازواج کی نگاہوں میں بھی ہوگی اور باہمی رشک و رقابت کی تمام تلخیاں کافور ہو جائیں گی۔

'وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا'۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواجؓ کو یاد دہانی ہے کہ ہر ایک کو یہ حقیقت مستحضر رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ دلوں کے بھیدوں سے بھی واقف ہے لیکن وہ واقف ہونے کے ساتھ حلیم اور بُردبار بھی ہے اس وجہ سے وہ درگزر بھی فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس علم و حلم کو مستحضر رکھنے ہی سے خدا کی خشیت اور اس کے عفو کا وہ صحیح تصور انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے جو امید و بیم دونوں کے اندر توازن پیدا کر کے انسان کی زندگی کو صحیح منہاج پر قائم رکھتا ہے۔

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا (۵۲)

درباب نکاح آنحضرت صلعم کے لیے پابندی

مذکورہ بالا اصناف کی خواتین کے سوا دوسری تمام عورتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حرام کر دی گئیں۔ ابن کثیرؒ نے ایک پورے گروہ کی، جس میں ابی بن کعب، مجاہد، عکرمہ، ضحاک، ابورزین، ابوصالح، حسن، قتادہؒ اور سدی رحمہم اللہ جیسے اکابرِ تفسیر شامل ہیں، یہ رائے نقل کی ہے کہ 'ما سوی ذلك من اصناف النساء فلا يحل لك'، (اور ان کے سوا دوسری اقسام کی جو خواتین ہیں وہ تمہارے لیے جائز نہیں ہیں) گویا آنحضرتؐ کے لیے ایک خاص دائرہ جو آیت ۵۰ میں مذکور ہے، مخصوص کر دیا گیا اس سے باہر کوئی نکاح آپ نہیں کر سکتے تھے۔

'وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ'۔ اور اس کی اجازت بھی آپ کو نہیں تھی کہ اپنی ان ازواج میں سے کسی کو الگ کر کے ان کی جگہ دوسری بیوی آپ لائیں، اگرچہ وہ آپ کی نظروں میں کتنی ہی پسندیدہ ہوں۔ اس کے بعد صرف ملکِ یمین کی اجازت باقی رہ گئی چنانچہ اسی اجازت کے تحت حضرت ماریہؓ آپ کے قبضہ میں آئیں جن کے بطن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی ولادت ہوئی۔

'وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا'۔ یہ آیت ظاہر ہے کہ بطور تذکیر و تنبیہ ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مخاطب یہاں حضورؐ ہیں۔ اوپر والی آیت میں آپ نے دیکھا کہ اسی نوع کی تذکیر ازواجِ مطہراتؓ کو کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں ہر ایک مسئول ہے اور جو جتنا ہی بڑا ہے اتنا ہی زیادہ مسئول ہے۔ اس

وجہ سے ہر ایک کے لیے ضروری ہوا کہ خدا کے مواخذہ سے پہلے اپنا محاسبہ کرتا رہے اور یہ اس یقین کے ساتھ محاسبہ کرتا رہے کہ اس کی زندگی کا کوئی گوشہ بھی خدا کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے۔

اس آزادی اور اس پابندی پر، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اوپر کی آیات میں بیان ہوئی ہے، غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ ازواج کے معاملے میں چار کی قید سے آزاد کر دیا گیا لیکن دوسری طرف آپ پر جو پابندیاں عائد کر دی گئیں وہ ایسی ہیں کہ نکاح و طلاق دونوں ہی کے معاملے میں حضورؐ دوسرے مسلمانوں کے مقابل میں کہیں زیادہ پابند تھے۔

ایک عام مسلمان کو تو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ چار کی حد کو ملحوظ رکھتے ہوئے محرمات کے دائرے سے باہر، جس عورت سے چاہے نکاح کرے اور اپنی منکوحات میں سے جس کو چاہے طلاق دے کر اس کی جگہ کوئی دوسری بیوی اپنی پسند کی بیاہ لائے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آزادی حاصل نہیں تھی۔ آپ اس حکم کے نازل ہونے کے بعد اگر نکاح کر سکتے تھے تو صرف تین قسم کی عورتوں سے۔

- اپنے نہایت قریبی رشتہ کی کسی ایسی خاتون سے جنھوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہو۔
- کسی جہاد کے نتیجہ میں بطور غنیمت حاصل شدہ کسی خاتون سے۔
- کسی ایسی خاتون سے جو اپنے آپ کو حضورؐ کو ہبہ کر دیں اور حضورؐ ان سے نکاح کرنا پسند فرمائیں۔

اس دائرے سے باہر نہ آپ کوئی نکاح کر سکتے تھے اور نہ ان ازواج میں، مجرد پسند و ناپسند کی بنا پر، کوئی ردوبدل فرما سکتے تھے۔ یہ اجازت جن دینی مصالح کی بنا پر آپ کو دی گئی ان کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔

۱۱۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۵۳-۶۲

آگے منافقین کی ریشہ دوانیوں اور ایذا رسانیوں کے سدِّ باب کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو بھی اور عام مسلمانوں کی بہوؤں بیٹیوں کو بھی پردے سے متعلق بعض ہدایات دی گئی ہیں۔ کچھ احکام سورۂ نور میں بھی پردے سے متعلق بیان ہو چکے ہیں۔ اس سورہ میں اس باب کی تکمیل کر دی گئی ہے تاکہ اشرار و مفسدین کی دراندازی کے لیے کوئی رخنہ باقی نہ رہے۔ آخر میں منافقین کو یہ دھمکی دی گئی ہے کہ اگر اب بھی وہ اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے تو ان کے بارے میں ایسے احکام دے دیے جائیں گے کہ ان کے لیے اس سرزمین میں سر چھپانا ناممکن ہو جائے گا ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے

آیات يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَدْخُلُوا۟ بُيُوتَ ٱلنَّبِىِّ إِلَّآ أَن يُؤْذَنَ
۵۳-۶۲ لَكُمْ إِلَىٰ طَعَامٍ غَيْرَ نَـٰظِرِينَ إِنَىٰهُ وَلَـٰكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَٱدْخُلُوا۟

فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا وَلَا مُسْتَأْنِسِينَ لِحَدِيثٍ ۚ إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ
يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنْكُمْ ۖ وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ ۚ وَإِذَا
سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ ۚ ذَٰلِكُمْ أَطْهَرُ
لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ ۚ وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَنْ
تَنْكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا ۚ إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللَّهِ
عَظِيمًا ﴿٥٣﴾ إِنْ تُبْدُوا شَيْئًا أَوْ تُخْفُوهُ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيمًا ﴿٥٤﴾ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِي آبَائِهِنَّ وَلَا أَبْنَائِهِنَّ وَلَا إِخْوَانِهِنَّ
وَلَا أَبْنَاءِ إِخْوَانِهِنَّ وَلَا أَبْنَاءِ أَخَوَاتِهِنَّ وَلَا نِسَائِهِنَّ وَلَا مَا
مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ ۗ وَاتَّقِينَ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ
شَهِيدًا ﴿٥٥﴾ إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ
آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿٥٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ
وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا
مُهِينًا ﴿٥٧﴾ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا
فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا ﴿٥٨﴾ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ ع
لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ
جَلَابِيبِهِنَّ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ
غَفُورًا رَحِيمًا ﴿٥٩﴾ لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ
مَرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ

فِيهَآ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٦٠﴾ مَّلْعُونِينَ ۛ أَيْنَمَا ثُقِفُوٓا أُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيلًا ﴿٦١﴾ سُنَّةَ ٱللَّهِ فِى ٱلَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ ٱللَّهِ تَبْدِيلًا ﴿٦٢﴾ معانقة ۱۲ الربع

ترجمہ آیات ۵۳-۶۲

اے ایمان والو نبی کے گھروں میں نہ داخل ہو مگر یہ کہ تم کو کسی کھانے پر آنے کی اجازت دی جائے۔ نہ انتظار کرتے ہوئے کھانے کی تیاری کا۔ ہاں جب تم کو بلایا جائے تو داخل ہو، پھر جب کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ اور باتوں میں لگے ہوئے بیٹھے نہ رہو۔ یہ باتیں نبی کے لیے باعث اذیت تھیں لیکن وہ تمہارا لحاظ کرتے تھے، اور اللہ حق کے اظہار میں کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ اور جب تم کو ازواج نبی سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کی اوٹ سے مانگو، یہ طریقہ تمہارے دلوں کے لیے بھی زیادہ پاکیزہ ہے اور ان کے دلوں کے لیے بھی۔ اور تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ تم اس کی بیویوں سے کبھی اس کے بعد نکاح کرو۔ یہ اللہ کے نزدیک بڑی سنگین باتیں ہیں۔ تم کسی چیز کو ظاہر کرو، خواہ چھپاؤ، اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ ۵۳-۵۴

ان پر ان کے باپوں کے معاملے میں کوئی گناہ نہیں ہے اور نہ ان کے بیٹوں کے بارے میں اور نہ ان کے بھائیوں کے بارے میں اور نہ ان کے بھتیجوں کے بارے میں اور نہ ان کے بھانجوں کے بارے میں اور نہ اپنے میل کی عورتوں کے بارے میں اور نہ ان کی لونڈیوں کے باب میں ہی، اور اللہ سے ڈرتی رہو۔ بے شک اللہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے۔ ۵۵

بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو، تم بھی اس پر درود و سلام بھیجو اچھی طرح۔ بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں

اللہ نے ان پر دنیا اور آخرت، دونوں میں لعنت کی اور ان کے لیے اس نے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے اور جو لوگ مومنین اور مومنات کو ان چیزوں کے باب میں ایذا دیتے ہیں جن کا انھوں نے ارتکاب نہیں کیا، انھوں نے اپنے سر صریح بہتان اور گناہ کا بار لیا۔ ۵۶-۵۸

اے نبی! اپنی بیویوں، اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو ہدایت کر دو کہ وہ اپنے اوپر اپنی بڑی چادروں کے گھونگٹ لٹکا لیا کریں۔ یہ اس بات کے قرین ہے کہ ان کا امتیاز ہو جائے، پس ان کو کوئی ایذا نہ پہنچائی جائے۔ اور اللہ غفور رحیم ہے۔ ۵۹

یہ منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے اور جو مدینہ میں سنسنی پھیلانے والے ہیں اگر باز نہ رہے تو ہم تم کو ان پر اکسا دیں گے، پھر وہ تمھارے ساتھ رہنے کا بہت ہی کم موقع پائیں گے۔ ان پر پھٹکار ہو گی، جہاں ملیں گے پکڑے جائیں گے اور بے دریغ قتل کیے جائیں گے۔ یہی اللہ کی سنت رہی ہے ان لوگوں کے بارے میں جو پہلے ہو گزرے ہیں اور تم اللہ کی سنت میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ ۶۰-۶۲

۱۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَدْخُلُوا۟ بُيُوتَ ٱلنَّبِىِّ إِلَّآ أَن يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَىٰ طَعَامٍ غَيْرَ نَٰظِرِينَ إِنَىٰهُ
وَلَٰكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَٱدْخُلُوا۟ فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَٱنتَشِرُوا۟ وَلَا مُسْتَـْٔنِسِينَ لِحَدِيثٍ ۚ إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ
يُؤْذِى ٱلنَّبِىَّ فَيَسْتَحْىِۦ مِنكُمْ ۖ وَٱللَّهُ لَا يَسْتَحْىِۦ مِنَ ٱلْحَقِّ ۚ وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَٰعًا فَسْـَٔلُوهُنَّ
مِن وَرَآءِ حِجَابٍ ۚ ذَٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ ۚ وَمَا كَانَ لَكُمْ أَن تُؤْذُوا۟ رَسُولَ ٱللَّهِ وَلَآ
أَن تَنكِحُوٓا۟ أَزْوَٰجَهُۥ مِنۢ بَعْدِهِۦٓ أَبَدًا ۚ إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ عِندَ ٱللَّهِ عَظِيمًا (۵۳)

پردے کے احکام کی وضاحت

مسلمانوں کے لیے ایک دوسرے کے گھروں میں آنے جانے سے متعلق ضروری آداب سورۂ نور میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں سے متعلق انہی آداب کی مزید وضاحت ہو رہی ہے اور اس وضاحت مزید کی ضرورت انہی منافقین کی وجہ سے پیش آئی جن کا رویہ اس سورہ میں زیر بحث ہے۔

منافقین کی بعض شرارتیں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم وقتاً فوقتاً صحابہ رضی اللہ عنہم کو کسی تقریب سے اپنے ہاں کھانے پر بلاتے رہتے۔ ایسے مواقع پر ان لوگوں کو بھی آپ، ازراہ کریم النفسی و تالیف قلب بلاتے جو مبتلائے نفاق تھے۔ اور اگر نہ بھی بلاتے تو بھی ان میں سے بعض ناخواندہ مہمان بن کر خود ہی پہنچ جاتے۔ یہ لوگ حضورؐ کی کریم النفسی سے نہایت غلط فائدہ اٹھاتے۔ اوّل تو یہ لوگ دعوت، کا بہانہ پاکر کھانے کے وقت سے بہت پہلے ہی وہاں ڈیرا جما کر بیٹھ جاتے، پھر کھانا کھا چکنے کے بعد بھی وہاں سے کھسکنے کا نام نہ لیتے بلکہ باتوں میں لگے بیٹھے رہتے اور مزید شرارت یہ کرتے کہ کسی چیز کے مانگنے کے بہانے دراتے ہوئے ازواج مطہراتؓ کے سامنے چلے جاتے۔ مقصود ان ساری حرکتوں سے ان کا وہی ہوتا جس کی طرف ہم پیچھے اشارہ کر چکے ہیں کہ کوئی موقع ان کو ازواجِ مطہراتؓ کے اندر وسوسہ اندازی و ریشہ دوانی کا ہاتھ آئے۔ حضورؐ ان لوگوں کی ان حرکتوں کو محسوس فرماتے اور اس سے آپ، کو تکلیف بھی پہنچتی لیکن آپ لحاظ و مروّت کے سبب سے نظر انداز فرماتے۔ لیکن نظر انداز کیے جانے کی ایک حد ہوتی ہے۔ جب یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ لوگ اس کریم النفسی کے سزاوار نہیں ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس باب میں نہایت واضح احکام بھی دے دیے اور یہ تنبیہ بھی فرما دی کہ اب بھی اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو اپنی قضائے مبرم کو دعوت دینے والے بنیں گے۔

بعض ضروری آداب متعلق دعوت

'یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّآ اَنْ یُّؤْذَنَ لَکُمْ اِلٰی طَعَامٍ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰىهُ' خطاب اگرچہ عام ہے تاکہ اس تعلیم کا فائدہ عام رہے لیکن اس کے پس پردہ وہی منافقین ہیں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ابھی اس مرحلہ میں ان کا پردہ اٹھانا نہیں چاہا اس وجہ سے بات، عام صیغہ ہی سے فرمائی ہے۔ ارشاد ہوا کہ اے ایمان والو، نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو مگر یہ کہ تم کو کسی کھانے میں شرکت کے لیے اجازت دی جائے 'یُّؤْذَنَ لَکُمْ اِلٰی طَعَامٍ' کے اسلوب میں دو باتیں مضمر ہیں۔ ایک یہ کہ گھروں میں بدون اجازت، نہ داخل ہو اور دوسری یہ کہ دعوت میں بن بلائے نہ جا دھمکو۔ 'غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰىهُ' یہ تیسری شرط ہے۔ 'نٰظِرِیْنَ' کے معنی 'مُنْتَظِرِیْنَ' کے اور 'اِنٰی' کے معنی کسی چیز کی تیاری اور پکنے کے وقت کے ہیں۔ یعنی یہ بھی جائز نہیں ہے کہ دعوت، کا بہانہ ہاتھ آگیا ہے تو کھانے کی تیاری کے انتظار میں وہیں دھونی رما کر بیٹھ رہو۔ اول تو یہ چیز آدمی کی طماعی اور سفلہ پن کی دلیل ہے۔ ثانیاً اس زمانے میں عام طور پر صورت یہ تھی کہ زنانہ مکانوں کے ساتھ مردانہ بیٹھکیں نہیں تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کا حال بھی یہی تھا۔ اس وجہ سے وقت سے پہلے لوگوں کا مجتمع ہو جانا اہلِ خانہ اور صاحب خانہ دونوں کے لیے موجب زحمت و اذیت تھا۔

'وَلٰکِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ' یہ صحیح طریقہ ارشاد ہوا کہ جب بلائے جاؤ تو وقت کے وقت داخل ہو اور جب کھا چکو تو وہاں سے منتشر ہو جاؤ، باتوں میں لگے ہوئے وہاں بیٹھے نہ رہو۔ 'اِذَا دُعِیْتُمْ' میں اسی مضمون کو کھول دیا ہے جو 'اِلَّآ اَنْ یُّؤْذَنَ لَکُمْ اِلٰی طَعَامٍ'

میں مضمر ہے۔ یعنی صرف اس صورت میں جانا چاہیے جب بلایا جائے، بن بلائے مہمان بننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ 'وَلَا مُسْتَأْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ' بالکل اسی طرح کی ہدایت ہے جس طرح کی ہدایت اوپر 'غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ' والے ٹکڑے میں دی گئی ہے۔ یعنی جس طرح یہ بات ناپسندیدہ ہے کہ کھانے کی تیاری کے انتظار میں پہلے سے جا بیٹھو اسی طرح یہ بات بھی ناپسندیدہ ہے کہ کھانا کھا چکنے کے بعد کسی بات میں لگ کر وہیں جمے رہو۔

'اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ' 'ذٰلِكُمْ' سے اشارہ ان ساری ہی باتوں کی طرف ہے جو اوپر مذکور ہوئیں۔ فرمایا کہ یہ باتیں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے باعثِ زحمت و اذیت تھیں لیکن وہ شرم و لحاظ کے سبب سے تم کو ٹوکتے نہیں تھے لیکن اللہ کو حق کے معاملے میں کسی کا لحاظ نہیں ہے اس وجہ سے وہ تم کو ان باتوں سے آگاہ فرما رہا ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی کمزوری کا ذکر نہیں فرمایا ہے بلکہ آپ کی ایک پسندیدہ خصلت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ آپ نہایت کریم النفس و ذی مروّت ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ان غلطیوں پر متنبہ فرما دیا ہے اور لحاظ و مروّت کو بالائے طاق رکھ کے نبی کو بھی ان کا اعلان کرنا ضروری ہوا۔

دل کی صحت کے لیے اہتمام

'وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ' ضمیر کا مرجع ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) ہیں۔ اوپر 'بُيُوْتَ النَّبِيِّ' کا ذکر ہو چکا ہے اس وجہ سے ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) کے ذکر کے لیے نہایت واضح قرینہ موجود تھا۔ فرمایا کہ اگر کسی کو ان سے کوئی چیز مانگنے کی ضرورت پیش آئے تو یہ نہ کرے کہ دندناتا ہوا ان کے سامنے چلا جائے بلکہ پردے کی اوٹ سے مانگے 'ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ' (یہی طریقہ تمہارے دلوں کو بھی زیادہ پاکیزہ رکھنے والا ہے اور ان کے دلوں کو بھی) یہ ایک دفع دخل مقدر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بظاہر یہ بات ایک غیر ضروری تکلف محسوس ہوتی ہے کہ کسی کو ان سے ایک گلاس پانی مانگنے کی بھی ضرورت پیش آئے تو اس کے لیے بھی پردہ کا اہتمام کرے لیکن یہ کوئی تکلف نہیں بلکہ دل کو آفات سے محفوظ رکھنے کی ایک نہایت ضروری تدبیر ہے۔ انسان کا دل جس نے بنایا ہے وہ اس کی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف ہے وہ جانتا ہے کہ کن کن مخفی راستوں سے یہ دل برے اثرات قبول کرتا ہے اور دل ہی وہ چیز ہے جس پر انسان کی تمام اخلاقی صحت کا انحصار ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ جن کو اپنے دل کی صحت مطلوب ہو وہ اس کو ان تمام چیزوں سے محفوظ رکھیں جو اس کو غبار آلود کر سکتی ہیں۔ اس زمانے کے مدعیانِ تہذیب اپنے کپڑوں کی صفائی کا تو بڑا اہتمام رکھتے ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ ان پر ایک شکن یا ایک دھبہ بھی پڑنے دیں لیکن ان کے دل جس گندگی سے بھی لت پت رہیں ان کی انھیں کوئی پروا نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاقی و روحانی صحت کی ان کے ہاں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ حالانکہ اصلی اہمیت رکھنے والی چیز یہی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے: 'مضغة في الجسد اذا صلحت صلح الجسد كله واذا فسدت فسد الجسد كله الا وهي القلب' (انسان کے جسم میں ایک ٹکڑا گوشت کا ہے، اگر وہ تندرست ہے تو سارا جسم تندرست

ہے اور جب اس میں فساد پیدا ہوجاتا ہے تو سارا جسم فاسد ہوجاتا ہے، آگاہ ہو کر سن لو کہ وہ دل ہے!) انسان کے جسم میں جو چیزیں جتنی ہی نازک اور قدر و قیمت رکھنے والی ہیں اتنی ہی زیادہ ان کی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ دل سب سے زیادہ قدر و قیمت رکھنے والا اور سب سے زیادہ حساس ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا سب سے زیادہ اہتمام فرمایا۔

منافقین کو ایک تنبیہ

وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَنْ تَنْكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا۔ فرمایا کہ تمہارے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اپنی اس قسم کی حرکتوں سے، جو اوپر بیان ہوئیں، اللہ کے رسول کو اذیت پہنچاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد کبھی بھی ان کی ازواج سے نکاح کرو۔

اس ٹکڑے نے تدریجی انکشاف کے اصول پر ان لوگوں کے چہروں سے نقاب اٹھا دی جن کو پیش نظر رکھ کر یہ احکام دیے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ منافقین ہی تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچانے کے لیے اس طرح کی حرکتیں کرتے تھے اور وہی تھے جو اپنے دلوں میں یہ ارمان بھی رکھتے تھے کہ آپ کی ازواج سے نکاح کریں تاکہ اس کو اللہ اور رسول کے خلاف فتنہ انگیزیوں کا ذریعہ بنائیں۔ اس آیت کا انداز، تنبیہ کا ہے اس وجہ سے اس میں حضورؐ کا ذکر 'رسول اللہ' کے لفظ سے ہوا ہے حالانکہ اوپر کی آیات میں بار بار آپ کا ذکر 'نبی' کے لفظ سے ہوا ہے۔ اس کی وجہ اس تنبیہ کی شدت کو ظاہر کرنا ہے۔ اس لیے کہ رسول، جیسا کہ ہم اس کتاب میں بار بار واضح کر چکے ہیں، اپنی قوم کے لیے خدا کی عدالت ہوتا ہے۔ وہ جب آتا ہے تو صرف وعظ سنانے کے لیے نہیں آتا، بلکہ قوم کے نیکوں اور بدوں کے درمیان فیصلہ کر دینے کے لیے آتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے ساتھ مذاق یا اس کو اذیت پہنچانا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ یہ کھیل کھیل رہے ہیں وہ آگ سے کھیل رہے ہیں۔ اس کے اس انجام کو وہ سامنے رکھیں۔

ازواج نبیؐ کا درجہ

وَلَا أَنْ تَنْكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا، یہ ان کے اس ارمان پر بھی آخری ضرب لگا دی ہے جو ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہن) سے نکاح کے لیے وہ اپنے دلوں میں رکھتے تھے۔ فرمایا کہ تمہارے لیے یہ بات بھی جائز نہیں ہے کہ تم نبیؐ کی بیویوں سے آج یا کبھی بھی نکاح کرو۔ اوپر آیت ۶ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کی حیثیت امت کی ماؤں کی ہے اور ان کے ساتھ تعلق کی یہی نوعیت فطری بھی ہے اور عقلی بھی۔ فطری اس وجہ سے کہ حضورؐ کی ازواج کے لیے ہر امتی کے دل کے اندر (اگر اس کے اندر ایمان کی رمق ہے) احترام و عقیدت کا جذبہ اپنی ماں کے مقابل میں بھی بدرجہا زیادہ ہوتا ہے۔ اس جذبے کے ہوتے کوئی امتی ان کے ساتھ نکاح کے تصور کو اپنی ماں کے ساتھ نکاح کے تصور سے بھی بدرجہا گراں اور شرم انگیز محسوس کرتا ہے۔ اگر کسی کے اندر ان کے ساتھ نکاح کا جذبہ ابھرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ایمان میں فتور اور اس کی فطرت میں بگاڑ پیدا ہو چکا ہے۔

عقلی اس وجہ سے کہ ازواج نبیؐ (رضی اللہ عنہن) کی حیثیت، جیسا کہ آیت ۳۴ میں گزر چکا ہے، اس

امت کے ذکور واناث، سب کے لیے، معلمات کی ہے اور اس منصب پر ان کو خود اللہ تعالیٰ نے مامور فرمایا ہے۔ اس منصب کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ان کو ماؤں ہی کے درجے میں رکھا جائے۔ اسی درجے پر رہتے ہوئے ہی وہ اپنے اس فریضۂ منصبی کو صحیح طور پر ادا کر سکتی ہیں۔ اگر اس درجے سے ان کو گرا دیا جائے تو نہ وہ اپنے صحیح وقار کو قائم رکھ سکتی ہیں، نہ دوسرے ان سے اس طرح کسب فیض کر سکتے ہیں جس طرح معلمات امت سے کیا جانا چاہیے۔

ایک تنبیہ

'اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ عِنْدَ اللّٰہِ عَظِیْمًا' یہ تنبیہ ہے اور بڑی ہی سخت تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ یہ باتیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی ہی سنگین ہیں۔ یہاں اس کے وبال کی وضاحت نہیں فرمائی اور اس ابہام کے اندر جو تہدید و تخویف مضمر ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

اِنْ تُبْدُوْا شَیْئًا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا (۵۴)

یہ بھی تنبیہ ہے جو اوپر والی تنبیہ کو مزید مؤکد کر رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا چونکہ دلوں کے بھید سے بھی واقف ہے اس وجہ سے اس سے کوئی بات چھپائی نہیں جا سکے گی۔ اس دنیا میں تو اپنی کسی نازیبا سے نازیبا حرکت کے لیے بھی نہایت حسین عذر تراشے جا سکتے ہیں لیکن یہ عذرات خدا کے ہاں نہیں کام آئیں گے۔ وہ دلوں کے مخفی کھوٹ بھی سب کے سامنے رکھ دے گا۔

لَا جُنَاحَ عَلَیْهِنَّ فِیْٓ اٰبَآئِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآئِهِنَّ وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا (۵۵)

ان لوگوں کا ذکر جن کے لیے پردے کے معاملے میں رعایت ہے

یہ آیت اسی محل میں ہے جس محل میں سورۂ نور کی آیت ۳۱ 'وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ الآیۃ' ہے۔ دونوں میں الفاظ بھی اکثر مشترک ہیں۔ اوپر والی آیت میں ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہن) کے گھروں میں دوسروں کے داخل ہونے پر جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں، ان پابندیوں سے جو لوگ مستثنیٰ ہیں یہ ان کی تفصیل ہے۔ خاص اہم رشتوں کا ذکر کر دیا ہے اور مقصود یہ ہے کہ جو رشتے ان کے حکم میں داخل ہیں وہ سب اس پابندی سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کے اوپر صرف وہی پابندیاں ہوں گی جو سورۂ نور میں مذکور ہوئی ہیں۔

'وَاتَّقِیْنَ اللّٰہَ ۭ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدًا' یہ آخر میں ازواج نبیؐ کو بھی اسی طرح کی تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہات دوسروں کے لیے اوپر گزر چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان احکام و ہدایات کی صرف خانہ پری مقصود نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ ان کی تعمیل پوری خدا ترسی اور تقویٰ کے ساتھ کی جائے اور یہ حقیقت ہمیشہ دل میں مستحضر رہے کہ اللہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ کوئی جگہ بھی ایسی نہیں ہے جہاں انسان خدا سے چھپ سکتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَي النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۵۶)

درود کی اہمیت و حقیقت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا و آزار پہنچانے کے بجائے اہلِ ایمان کو حضورؐ کے معاملے میں جو رویہ اختیار کرنا چاہیے، یہ اس کی ہدایت ہے۔ فرمایا کہ اللہ اپنے نبیؐ پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی اس کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں۔ اس وجہ سے اہلِ ایمان کے لیے بھی صحیح روش، خدا اور اس کے فرشتوں سے ہم آہنگ و ہم رنگ، یہی ہے کہ وہ بھی نبیؐ پر زیادہ سے زیادہ درود و سلام بھیجیں نہ کہ اس کو ایذاء پہنچانے کی تدبیریں سوچیں۔

اس آیت سے کئی حقیقتیں سامنے آتی ہیں جو نگاہ میں رکھنے کی ہیں۔

ایک یہ کہ جس نبیؐ کا مرتبہ اللہ اور اس کے فرشتوں کی نظروں میں یہ ہے کہ اللہ اس پر رحمت نازل فرماتا ہے اور فرشتے اس پر رحمت کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں، حیف ہے اگر انسانوں میں سے کچھ لوگ اس کے درپے آزار ہوں درآنحالیکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی احسان انسانوں ہی پر ہے نہ کہ خدا اور اس کے فرشتوں پر۔

دوسری یہ کہ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجتے ہیں وہ نبی صلعم پر کوئی احسان نہیں کرتے بلکہ خدا اور اس کے فرشتوں کی ہم نوائی کر کے وہ اپنے کو سزاوارِ رحمت بناتے ہیں۔ جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے جب آپ کو اللہ کی رحمت اور فرشتوں کی دعائیں حاصل ہیں تو وہ دوسروں کی دعاؤں کے محتاج نہیں ہیں۔

تیسری یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجنا مرضِ نفاق کا علاج ہے۔ اس لیے کہ یہاں جس محل میں اس کی ہدایت فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ منافقوں کی طرح نبیؐ کو ایذاء پہنچانے کے بجائے اہلِ ایمان کو نبیؐ پر درود بھیجنا چاہیے۔ اس سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ جو لوگ درود کا اہتمام رکھتے ہیں ان کے اندر نفاق راہ نہیں پاتا۔

چوتھی یہ کہ مقصود درود و سلام کی تکثیر ہے۔ موقع و محل بھی اس مفہوم کا متقاضی ہے اور آیت کے الفاظ بھی اسی کے شاہد ہیں۔ اس لیے کہ 'سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا' میں مصدر تاکید و تکثیر کے مفہوم پر دلیل ہے اس وجہ سے ہم ان فقہاء کی رائے کو صحیح نہیں سمجھتے جو کہتے ہیں کہ اگر عمر بھر میں ایک مرتبہ بھی کوئی درود پڑھ لے تو اس آیت کا حق ادا ہو جائے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا (۵۷)

رسول کو ایذاء پہنچانے والوں کا انجام

یہ ان لوگوں کا انجام بیان فرمایا جو اللہ کے رسول کی دل آزاری اور توہین کے مرتکب ہو رہے تھے۔ فرمایا کہ رسول کو ایذاء پہنچانا خود اللہ کو ایذاء پہنچانا ہے۔ رسول خدا کا محبوب اور اس کا نمائندہ ہوتا ہے اور خدا اور اس کے فرشتے اس پر رحمت بھیجتے ہیں تو جن کا رویہ اس کے خلاف ہو گا وہ لازماً

خدا اور اس کے فرشتوں کے مخالف اور خدا کو ایذاء پہنچانے والے ٹھہرے۔ ان کی اس حرکت کی پاداش میں ان پر دنیا اور آخرت دونوں میں اللہ کی لعنت ہے۔ یہ دنیا میں بھی ذلیل و خوار رہیں گے اور آخرت میں بھی ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار ہے۔ یہ امر یہاں خاص طور پر ملحوظ رہے کہ ان کو آخرت کے عذاب سے پہلے اس دنیا میں بھی عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ یہ اس سنت اللہ کی طرف اشارہ ہے جو رسولوں کے مخالفین کے لیے بیان ہو چکی ہے۔ اس کی وضاحت آگے آیات ۶۰-۶۱ میں آرہی ہے۔ یہ بعینہٖ وہی سزا ہے جو یہود کو دی گئی اور ان کا بھی اصل جرم یہی تھا کہ انھوں نے اللہ کے رسولوں کو ایذاء پہنچائی۔ اس کی مزید وضاحت ان شاء اللہ سورۂ صف کی تفسیر میں آئے گی۔

وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا (۵۸)

مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ مجروح کرنے کے لیے منافقین کی مہم

اوپر کی آیات میں منافقین کا وہ رویہ زیر بحث آیا ہے جو انھوں نے خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اختیار کر رکھا تھا۔ اب یہ عام مومنین و مومنات کو متہم کرنے کے لیے جو شرارتیں کر رہے تھے وہ ان کی طرف اشارہ ہے۔ سورۂ نور کی تفسیر میں ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ ان منافقین کے دلوں پر یہ بات بہت شاق تھی کہ مسلمانوں کو دوسرے تمام گروہوں کے مقابل میں غیر معمولی اخلاقی برتری حاصل ہے جو ان کی دعوت کی مقبولیت میں بڑے اہم عامل کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے حسد کے جنون میں اس کا توڑ یہ نکالا کہ مسلمان مردوں اور عورتوں کے خلاف بے سروپا الزامات تراشیں اور لوگوں میں ان کو پھیلائیں تاکہ مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ مجروح اور ان کا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ واقعۂ افک کی تفصیلات سورۂ نور کی تفسیر میں بیان ہو چکی ہیں۔ وہ فتنہ بھی اسی مقصد سے اٹھایا گیا تھا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کی اسی سعیِ نامراد کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جو لوگ مسلمان مردوں اور عورتوں کو جھوٹے الزامات میں ملوث کر رہے ہیں وہ صریح بہتان اور کھلے گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی اس روش سے اگر یہ باز نہ آئے تو اس کا انجام دیکھیں گے!

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَن يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا (۵۹)

گھروں سے باہر نکلنے کی صورت میں پردے کے آداب

منافقین و اشرار کی ایذا رسانیوں سے محفوظ کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کو بھی اور عام مسلمان خواتین کو بھی یہ ہدایت کر دی گئی کہ جب انھیں کسی ضرورت سے گھروں سے باہر قدم نکالنے کی ضرورت پیش آئے تو وہ اپنی بڑی چادروں کا کچھ حصہ اپنے چہروں پر لٹکا لیا کریں۔ اس طرح ان کے اور دوسری غیر مسلم عورتوں اور لونڈیوں کے درمیان امتیاز ہو جائے گا اور کسی کو ان سے تعرض کے لیے بہانہ ہاتھ نہیں آئے گا۔

سورۂ نور میں، یاد ہو گا، اعزہ و اقرباء سے متعلق یہ ہدایت دی گئی ہے کہ جب وہ اجازت کے بعد گھروں میں داخل ہوں گے تو گھر کی خواتین سمٹ سمٹا کر رہیں، اپنی زینت کی چیزوں کا اظہار نہ کریں اور اپنے

سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے بُکل مار لیا کریں[1]۔ یہاں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اپنی بڑی چادروں (جلابیب) کا کچھ حصہ اپنے اوپر لٹکا لیا کریں۔ اس کو اپنے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان بڑی چادروں سے گھونگٹ نکال لیا کریں۔ یہ واضح قرینہ اس بات کا ہے کہ یہ ہدایت اس صورت سے متعلق ہے جب عورتوں کو کسی ضرورت سے باہر نکلنے کی ضرورت پیش آئے۔ اس قرینہ کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ اس کا فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ 'ذٰلِكَ اَدۡنٰٓى اَنۡ يُّعۡرَفۡنَ فَلَا يُؤۡذَيۡنَ' یہ اس بات کے قرین ہے کہ ان کا امتیاز ہو جائے اور ان سے تعرض نہ کیا جائے) ظاہر ہے کہ یہ مقصد باہر نکلنے ہی کی صورت میں مدنظر ہو سکتا ہے۔ اس کا دوسرا واضح قرینہ یہ ہے کہ یہاں لفظ 'خمار' نہیں بلکہ 'جلباب' استعمال ہوا ہے۔ 'جلباب' کی تشریح اہل لغت نے یوں کی ہے کہ 'هو الرداء فوق الخمار'۔ 'جلباب' اس بڑی چادر کو کہتے ہیں جو اوڑھنی کے اوپر لی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بڑی چادر کے لینے کی ضرورت گھروں کے اندر نہیں پیش آتی تھی بلکہ شرفائے عرب کی خواتین اس وقت اس کو لیتی تھیں جب انھیں گھروں سے باہر نکلنے کی ضرورت پیش آتی۔ شعرائے جاہلیت کے کلام سے یہ بات ثابت ہے کہ شرفائے عرب میں 'جلباب' کا رواج تھا۔ یہاں بہت سے اشعار نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ قبیلۂ ہذیل کی ایک شاعرہ کا ایک شعر ہمارے دعوے کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ وہ اپنے کسی مقتول کے مرثیہ میں کہتی ہے:

تمشي النسور اليه وهي لاهية   مشي العذاري عليهن الجلابيب

اس شعر میں جو نادر تشبیہ ہے اس پر گفتگو کا تو یہاں محل نہیں ہے، بات دوسرے گوشوں میں نکل جائے گی۔ بس اتنی بات یاد رکھیے کہ زمانۂ جاہلیت میں سب 'متبرجات' اور 'بیگمات' ہی نہیں تھیں بلکہ شرفاء کے خاندانوں کی بہوئیں بیٹیاں بھی تھیں جو باہر نکلنے کی صورت میں اپنی اوڑھنیوں کے اوپر 'جلباب' ڈالا کرتی تھیں۔ قرآن نے اس 'جلباب' سے متعلق یہ ہدایت فرمائی کہ مسلمان خواتین گھروں سے باہر نکلیں تو اس کا کچھ حصہ اپنے اوپر لٹکا لیا کریں تاکہ چہرہ بھی فی الجملہ ڈھک جائے اور انھیں چلنے پھرنے میں بھی زحمت پیش نہ آئے۔ یہی 'جلباب' ہے جو ہمارے دیہاتوں کی شریف بڑی بوڑھیوں میں اب بھی رائج ہے اور اسی نے فیشن کی ترقی سے اب برقع کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس برقع کو اس زمانے کے دلدادگانِ تہذیب اگر تہذیب کے خلاف قرار دیتے ہیں تو دیں لیکن قرآن مجید میں اس کا حکم نہایت واضح الفاظ میں موجود ہے جس کا انکار صرف وہی برخود لوگ کر سکتے ہیں جو خدا اور رسول سے زیادہ مہذب ہونے کے مدعی ہوں۔

مسلمان خواتین کے لیے ایک علامت امتیاز

'ذٰلِكَ اَدۡنٰٓى اَنۡ يُّعۡرَفۡنَ فَلَا يُؤۡذَيۡنَ' یہ مسلمان خواتین کے لیے ایک علامت امتیاز مقرر کردی

---

[1] وَلۡيَضۡرِبۡنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوۡبِهِنَّ (النور: ۳۱) (اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیوں کے بکل مار لیا کریں)۔

گئی تاکہ جہاں کہیں بھی وہ نکلیں ہر شخص ان کو دور ہی سے پہچان لے کہ یہ مسلمان خواتین ہیں اور تعرض کی جرأت نہ کرے اور اگر کرے تو اس کے عواقب دور تک سوچ کر کرے۔ اس زمانہ میں مدینہ میں غیر مسلم عورتیں بھی تھیں جن کے ہاں پردہ کی پابندیاں نہیں تھیں نیز لونڈیاں بھی تھیں جن کا معیارِ زندگی اور معیارِ اخلاق دونوں پست تھا اس وجہ سے شریر لوگوں کے لیے عذر کے مواقع بہت تھے۔ اگر وہ کسی مسلمان خاتون پر راہ چلتے کوئی فقرہ چست کرتے یا اس سے کوئی بات کرنے کی کوشش کرتے اور ان پر گرفت ہوتی تو وہ یہ جواب دے دیتے کہ ہم نے سمجھا کہ یہ فلاں کی لونڈی ہے، اور اس سے فلاں بات ہم نے معلوم کرنی چاہی تھی۔ اس علامتِ امتیاز کے قائم ہو جانے کے بعد اس قسم کے بہانوں کی راہ مسدود ہو گئی۔

ایک غلط فہمی

اس ٹکڑے سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ یہ ایک وقتی تدبیر تھی جو اشرار کے شر سے مسلمان خواتین کو محفوظ رکھنے کے لیے اختیار کی گئی اور اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اول تو احکام جتنے بھی نازل ہوئے ہیں سب محرکات کے تحت ہی نازل ہوئے ہیں لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ محرکات نہ ہوں تو وہ احکام کالعدم ہو جائیں، دوسرے یہ کہ جن حالات میں یہ حکم دیا گیا تھا کیا کوئی ذی ہوش یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس زمانے میں حالات کل کی نسبت ہزار درجہ زیادہ خراب ہیں البتہ حیا اور عفت کے وہ تصورات معدوم ہو گئے جن کی تعلیم قرآن نے دی تھی۔

'وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا' یہ فقرہ اس حکم تسہیل کے لیے ارشاد ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خواتین اپنی حد تک یہ احتیاط ملحوظ رکھیں۔ اگر اس کے باوجود کوئی بھول چوک ہو گئی تو اللہ غفور رحیم ہے۔

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ۛ مَّلْعُوْنِيْنَ ۛ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا (۶۰ - ۶۱)

منافقین کو آخری تنبیہ

یہ ان اشرار و منافقین کو دھمکی دی ہے کہ اگر یہ اپنی ان شرارتوں سے باز نہ آئے تو ان کے باب میں چشم پوشی و مسامحت کا جو رویہ اب تک رہا ہے وہ یکسر بدل جائے گا اور ہم تم کو (خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے) ہر قدم پر ان کے محاسبہ و تعاقب کا حکم دے دیں گے۔ پھر ان کو اس شہر میں بہت کم رہنا نصیب ہوگا ـــــ اس کے بعد جتنے دن بھی یہ یہاں جئیں گے ملعون ہو کر زندگی گزاریں گے۔ ہر قدم پر ان کی دار و گیر ہوگی۔ یہ پکڑے جائیں گے اور نہایت عبرت انگیز طریقوں سے قتل ہوں گے۔

'وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ' میں 'مرض' سے، جیسا کہ دوسرے محل میں اس کی وضاحت ہو چکی ہے، حسد، کینہ اور بغض و عناد مراد ہے۔ منافقین کا یہ گروہ صرف ضعفِ عزم و ارادہ ہی کا مریض نہیں تھا بلکہ اس کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، اسلام اور مسلمانوں پر سخت حسد تھا۔ لیکن بزدلی کے سبب سے اس نے کفار کی طرح کھلم کھلا مخالفت کرنے کے بجائے مسلمانوں کے اندر گھس کر اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کیں۔

'اَلْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَۃِ' سے اشارہ منافقین کے اس گروہ کی طرف ہے جو مدینہ میں سنسنی پھیلانے اور بری افواہیں اڑانے میں نہایت شاطر تھا۔ ان افواہوں سے اس کا مقصد مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنا اور ان کی اخلاقی ساکھ کو گرانا ہوتا تھا۔ پیچھے جنگِ احزاب اور حضرت زیدؓ و حضرت زینبؓ کے معاملے میں اس گروہ کا جو کردار بیان ہوا ہے وہ اس 'ارجاف' کی نہایت واضح مثال ہے۔ لغت میں 'ارجاف' کے معنی لوگوں کے اندر اضطراب و بے چینی پھیلانے کے ارادے سے بری اور فتنہ انگیز خبروں کا پروپیگنڈا کرنا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ 'ارجاف' کے ماہرین صرف اسی دور کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ اس کے بڑے بڑے ائمہ ماضی میں بھی گزر چکے ہیں۔

'لَنُغْرِیَنَّکَ بِھِمْ' کے لغوی معنی تو یہ ہوں گے کہ ہم تم کو ان کے خلاف اکسا دیں گے، بھڑکا دیں گے، ابھار دیں گے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ اب تک تو ہم نے تم کو ان کے معاملے میں عفو و صفح کی روش اختیار کرنے کی ہدایت کر رکھی ہے لیکن یہ اس کی قدر کرنے کے بجائے دن بدن دلیر ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر یہ اپنی اس شرارت سے باز نہ آئے تو ہم تم کو ان کی داروگیر کے احکام دے دیں گے جس کے بعد مدینہ کی سرزمین ان کے لیے تنگ ہو جائے گی۔ اوّل تو ان کو تمہارے دامنِ امن میں پھٹکنا ہی بہت کم نصیب ہوگا اور اگر کچھ ہوگا بھی تو خدا کی لعنت اور پھٹکار کے ساتھ ہوگا۔ 'اَیْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِیْلًا' اسی ملعونیت کی تصویر ہے۔ چنانچہ بعد کے ادوار میں ان منافقین کو اسی حشر سے سابقہ پیش آیا۔ ان میں سے جنھوں نے اپنی روش کی اصلاح نہیں کی ان کا انجام وہی ہوا جو قریش اور یہود کے اشرار کا ہوا۔ اس کی تفصیل سورۂ انفال اور سورۂ توبہ میں گزر چکی ہے۔

سُنَّۃَ اللّٰہِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا (۶۲)

یہ بعینہٖ وہی اسلوبِ کلام ہے جو آیت ۳۸ میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انبیاء کی مخالفت کرنے والے اس سے پہلے جو منافقین و کفار گزر چکے ہیں ان کے ساتھ بھی اللہ نے یہی معاملہ کیا تو اللہ کی اس سنت کو تم پیشِ نظر رکھو، یہی معاملہ اللہ تمہارے ان دشمنوں کے ساتھ بھی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

۱۳۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۶۳-۷۳

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں پہلے قیامت کی یاددہانی فرمائی ہے کہ مجرد اس بنا پر کہ اس کا وقت پیغمبر نہیں بتا سکتے یا لوگوں کے مطالبہ پر اس کو دکھا نہیں سکتے اس کو مذاق سمجھنا نہایت ناعاقبت اندیشانہ روش ہے۔ وہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس کے ظہور کا وقت اگرچہ اللہ ہی کو معلوم ہے لیکن وہ آ کے رہے گی اور اس دن کوئی کسی کا حامی و شفیع نہ بن سکے گا بلکہ ہر شخص اپنے اعمال اور اپنی ذمہ داریوں

سے تعلق خود مسئول ہو گا۔ اس دن کسی کا یہ عذر نافع نہیں ہوگا کہ اس نے اپنے لیڈروں اور بڑوں کی پیروی کی اور انھوں نے اس کو گمراہ کیا۔

اس کے بعد مسلمانوں بالخصوص منافقین کو تنبیہ فرمائی ہے کہ اپنے رسول کے معاملے میں ایذا رسانی کی وہ روش نہ اختیار کرو جو یہود نے حضرت موسیٰؑ کو ایذا پہنچانے کے لیے اختیار کی ورنہ اس کا انجام وہی ہوگا جس سے یہود کو دوچار ہونا پڑا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو ہر الزام سے بری کیا اور ان کے مخالفین پر ہمیشہ کے لیے لعنت کر دی۔ مسلمانوں کے لیے صحیح روش، جو دنیا و آخرت، دونوں کی کامرانیوں کی ضامن ہے، یہ ہے کہ وہ رسولؐ کے ہر حکم پر 'سمعنا واطعنا' کہیں۔

آخر میں یہ تنبیہ فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے عظیم شرف سے نوازا ہے کہ اس کو اپنی اس امانت کا امین بنایا ہے جس کا اہل آسمان و زمین میں اس نے صرف اسی کو ٹھہرایا۔ اس امانت کی ذمہ داریاں ادا کرنے ہی پر اس کے تمام شرف کا انحصار ہے۔ اگر وہ اس کا حق ادا کرے تو وہ فرشتوں کا مسجود ہے اور اگر حق نہ پہچانے تو پھر وہ اسفل سافلین کا سزاوار ہے۔ اس امانت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک دن وہ اس کی بابت مسئول ہو وہ اس کی سزا بھگتیں اور جنھوں نے اس کی نگہداشت کی ہو وہ اس کا صلہ پائیں ــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۳-۷۳ يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ۖ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَا
يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ﴿۶۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ
وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ﴿۶۴﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا
وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۶۵﴾ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ
اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴿۶۶﴾ وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا
وَكُبَرَاۗءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴿۶۷﴾ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ
ع ۵ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴿۶۸﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا
كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ۭ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ
وَجِيْهًا ﴿۶۹﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿۷۰﴾

يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَ
رَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ﴿٧١﴾ إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ
وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا
الْإِنسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ﴿٧٢﴾ لِّيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنٰفِقِينَ
وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ
وَالْمُؤْمِنٰتِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿٧٣﴾ ۹ ع ۶

ترجمہ آیات ۶۳-۷۳

لوگ تم سے قیامت کے وقت کو پوچھتے ہیں۔ کہہ دو، اس کا علم تو بس اللہ ہی کے پاس ہے۔ اور تمھیں کیا پتہ، شاید قیامت قریب ہی آ لگی ہو۔ ۶۳

بے شک اللہ نے کافروں پر لعنت کر چھوڑی ہے اور ان کے لیے اس نے آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں نہ ان کا کوئی کارساز ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔ جس دن ان کے چہرے آگ میں اُلٹے پُلٹے جائیں گے۔ وہ کہیں گے، اے کاش ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی! اور کہیں گے، اے ہمارے رب! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی بات مانی تو انھوں نے ہماری راہ ماری۔ اے ہمارے رب! ان کو دونا عذاب دے اور ان پر بہت بھاری لعنت کر! ۶۴-۶۸

اے ایمان والو، ان لوگوں کے مانند نہ بنو جنھوں نے موسیٰ کو ایذا پہنچائی تو اللہ نے اس کو ان لوگوں کی تہمتوں سے بری کیا اور وہ اللہ کے نزدیک باوقار ٹھہرا۔ اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور درست بات کہو، اللہ تمھارے اعمال سدھارے گا اور تمھارے گناہوں کو بخشے گا اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہیں گے تو انھوں نے بہت بڑی

کامیابی حاصل کی۔ ۶۹-۷۱

اور ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ بے شک وہ ظلم کرنے والا اور جذبات سے مغلوب ہو جانے والا ہے۔ تاکہ اللہ منافقین و منافقات اور مشرکین و مشرکات کو سزا دے اور مومنین و مومنات کو اپنی رحمت سے نوازے، اور اللہ غفور رحیم ہے۔ ۷۲-۷۳

۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ۖ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ اللَّهِ ۚ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا (۶۳)

قیامت ایک حقیقت ہے لیکن ان اشرار و مفسدین کو جب قیامت سے ڈرایا جاتا ہے تو یہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں کہ ہم نہ جانے
کب سے اس کا ڈراوا سن رہے ہیں لیکن نہ وہ آئی، نہ کبھی آئے گی۔ اگر اس کو آنا ہے تو آخر وہ آ کیوں نہیں جاتی؛
اگرچہ اس کا وقت اس کے آنے کا وقت کب آئے گا! مطلب یہ ہے کہ یہ محض ایک دھونس ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے
معلوم نہیں اور ہم اس دھونس میں آنے والے نہیں ہیں۔

قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ اللَّهِ۔ فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ جہاں تک اس کے آنے کے وقت کا تعلق ہے اس کا علم تو بس اللہ ہی کو ہے۔ کائنات کے اس بھید کو صرف خدا ہی جانتا ہے۔ نہ اس کو میں جانتا ہوں اور نہ کسی اور کو اس کا علم ہے۔ البتہ اس کا آنا یقینی ہے، جس سے میں تمھیں آگاہ کر رہا ہوں۔ اگر میں اس کا وقت نہیں بتا سکتا تو اس سے اس کی نفی نہیں ہو سکتی۔ دوسرے مقام میں اس بات کی وضاحت اس طرح فرمادی کہ کسی چیز کے ظہور کا وقت نہ معلوم ہونے سے نفس اس شے کا انکار ایک احمقانہ منطق ہے۔ قیامت تو در کنار، ہماری روزمرہ کی زندگی کی کتنی عامۃ الورود حقیقتیں ہیں جن کا وقت اگرچہ معلوم نہیں ہوتا لیکن کوئی عاقل ان کا انکار نہیں کرتا۔ انسان کے علم کی رسائی بہت محدود ہے۔ وہ ہر چیز کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ آفاق و انفس اور عقل و فطرت کے اندر قیامت کی شہادت موجود ہے تو مجرد اس بنا پر اس کا مذاق اڑانا کہ اس کا وقت نہیں بتایا جا سکتا، محض ابلہی و خود فریبی ہے۔

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا۔ یہ اسلوب کلام کسی شے کی عظمت، اہمیت اور اس کی

ہونا کی کو ظاہر کرتا ہے۔ مخالفین کے سوال میں جو طنز و استہزا مضمر ہے یہ اس کا جواب ہے کہ مجرد اس بنا پر کہ تم قیامت کا وقت نہیں بتا سکتے لوگ تمھارا مذاق اڑا رہے ہیں، تمھیں کیا خبر، شاید وہ قریب ہی آ گئی ہو! ——— اس فقرے میں یہ بھی یہ اشارہ فرما دیا گیا کہ اب اس کے ظہور میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور قیامت کا مذاق اڑانے والوں کے لیے نہایت سخت انذار و تنبیہ ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آخری نبی ہیں اس وجہ سے آپ کی بعثت کے بعد دنیا کی عدالت کے لیے آخری مرحلہ اب قیامت ہی کا باقی رہ گیا۔ اس پر مفصل بحث اس کے محل میں ان شاء اللہ آئے گی۔

اِنَّ اللّٰہَ لَعَنَ الْکٰفِرِیْنَ وَاَعَدَّ لَھُمْ سَعِیْرًا ۙ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا ۚ لَا یَجِدُوْنَ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا (۶۴-۶۵)

منکرینِ قیامت کو انذار

اوپر کی آیت میں جو انذار مضمر تھا یہ اس کو کھول دیا کہ آج جو لوگ قیامت کا انکار کر رہے ہیں وہ کان کھول کر سن لیں کہ اللہ نے ان پر لعنت کر دی ہے اور ان کے لیے اس نے دوزخ کا عذاب تیار کر رکھا ہے جس میں ان کو ہمیشہ رہنا ہے اور اس میں کوئی ان کا کارساز و مددگار نہ بن سکے گا۔ نہ ان کے وہ شرکا و شفعاء ان کے کچھ کام آنے والے بنیں گے جن کے اعتماد پر وہ نچنت بیٹھے ہیں اور نہ ان کی یہ جماعت و جمعیت ہی ان کی کچھ مدد کر سکے گی جس پر اس دنیا میں ان کو بڑا ناز ہے۔

یَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْھُھُمْ فِی النَّارِ یَقُوْلُوْنَ یٰلَیْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰہَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ۝ وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَکُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا ۝ رَبَّنَآ اٰتِھِمْ ضِعْفَیْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْھُمْ لَعْنًا کَبِیْرًا (۶۶-۶۸)

'تَقْلِیْبُ' کے معنی الٹنے پلٹنے کے ہیں۔ گوشت کو آگ پر بھونتے ہیں تو اس کو کبھی ایک جانب سے بھونتے ہیں کبھی دوسری جانب سے۔ فرمایا کہ یہی گت ان کی بننے والی ہے۔ یہ دوزخ کی آگ میں اپنے چہروں کے بل اس طرح گھسیٹے جائیں گے کہ دونوں طرف سے ان کے چہرے بھن جائیں گے۔ چہرے کا ذکر خاص طور پر اس وجہ سے فرمایا کہ اعترافِ حق سے اعراض و استکبار کی رعونت کا سب سے زیادہ نمایاں مظہر یہی ہوتا ہے جب اس کا حشر یہ ہونا ہے تو دوسری چیزیں اسی کے توابع میں داخل ہیں۔ فرمایا کہ آج جس قیامت کا یہ مذاق اڑا رہے ہیں جب اس طرح اس کی حقیقت ان کے لیے بے نقاب ہوگی تب وہ نہایت حسرت کے ساتھ یہ تمنا کریں گے کہ اے کاش! ہم نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی اور اپنے لیڈروں اور بڑوں کے چکمے میں آ کر اپنے لیے یہ شامت نہ بلائی ہوتی! اس دن یہ کھلم کھلا اپنی گمراہی کی ساری ذمہ داری اپنے لیڈروں اور بزرگوں پر ڈالیں گے کہ ہم نے ان کی بات مانی اور انھوں نے صحیح راہ سے ہم کو بھٹکایا اور خدا سے یہ درخواست کریں گے کہ اے رب! چونکہ یہی ہماری گمراہی کے باعث ہوئے ہیں اس وجہ سے تو ان کو ہمارے مقابل میں دونا عذاب دے اور جو لعنت ان کے سبب سے ہم پر ہوئی ہے اس سے بڑی

لعنت کر ان پر کر۔ یہاں صرف ان لوگوں کی درخواست کا حوالہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس درخواست، کا جو جواب دے گا اس کا ذکر سورۂ اعراف، آیت ۳۸ میں آیا ہے کہ لِكُلٍّ ضِعْفٌ 'تم اور تمہارے لیڈر دونوں ہی دونے عذاب کے سزاوار ہو۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

کسی کی تقلید آنکھ بند کرکے جائز نہیں

یہاں 'سَادَتَنَا' اور 'كُبَرَآءَنَا' کے دو لفظ آئے ہیں۔ 'سادۃ' سے مراد تو ظاہر ہے کہ لیڈر اور سردار ہیں اور 'كُبَرَآءَ' سے مراد ان کے خاندانی و مذہبی پیشوا ہیں۔ ان میں سے کسی کی بھی آنکھ بند کرکے اطاعت کرنا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر آدمی کو حق و باطل میں امتیاز کے لیے عقل عطا فرمائی ہے۔ اسی وجہ سے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اس کسوٹی سے کام لے۔ جو اس سے کام لے گا اگر وہ کہیں ٹھوکر بھی کھائے گا تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو سہارا دے اور معاف فرمائے لیکن جو شخص آنکھیں بند کرکے اپنی باگ دوسروں کے ہاتھ میں پکڑا دے گا اس کا حشر وہی ہوگا جو اس آیت میں بیان ہوا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ آذَوْا مُوسَىٰ فَبَرَّأَهُ اللَّهُ مِمَّا قَالُوا ۚ وَكَانَ عِندَ اللَّهِ وَجِيهًا (۶۹)

انبیاء کو ایذا پہنچانا یہود کی سنت ہے

قیامت کا ذکر بیچ میں تذکیر و تنبیہ کے طور پر آگیا تھا اوپر سے ذکر ان منافقین کا چل رہا تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین و مومنات کو اپنی ریشہ دوانیوں اور تہمت تراشیوں سے روحانی و قلبی اذیتیں پہنچانے میں سرگرم تھے۔ اس تنبیہ کے بعد اسی مضمون کو از سر نو لے لیا اور مسلمانوں کو تنبیہ فرمایا کہ ان یہودیوں کی روش کی تقلید نہ کرو جنھوں نے قدم قدم پر حضرت موسیٰؑ کو اپنی تہمتوں، شکایتوں اور در پردہ سازشوں سے اذیتیں پہنچائیں لیکن اللہ نے ان کو ہر الزام و تہمت سے بری، نہایت عزت و آبرو کے ساتھ، اس دنیا سے اٹھایا البتہ وہ لوگ دنیا اور آخرت دونوں میں ذلیل و خوار ہوئے جنھوں نے ان کو ایذا پہنچانے کی کوشش کی۔ یہ خطاب اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن خاص طور پر منافقین کی طرف ہے۔

یہود کے ایذا کی بعض مثالیں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل نے جو اذیتیں پہنچائی ہیں اس کا شکوہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی بھی قرآن مجید میں مذکور ہے۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ لِمَ تُؤْذُونَنِي وَقَد تَّعْلَمُونَ أَنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ (الصف ۶۱ : ۵)	اور یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اے میری قوم کے لوگو! تم مجھے کیوں دکھ پہنچاتے ہو درآنحالیکہ تمھیں اچھی طرح علم ہے کہ میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں۔

تورات کی کتاب تثنیہ باب ۹ میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے جب بنی اسرائیل کو فلسطین پر چڑھائی کے لیے ابھارا اور انھوں نے اپنی روایت کے مطابق بزدلی دکھائی تو حضرت موسیٰؑ نے ان کو ان الفاظ میں ملامت کی:

"تو (خطاب بنی اسرائیل سے ہے) اس بات کو یاد رکھ اور کبھی نہ بھول کہ تو نے خداوند اپنے خدا کو بیابان میں کس کس طرح غصہ دلایا بلکہ جب سے تم ملک مصر سے نکلے ہو تب سے اس جگہ پہنچنے تک تم برابر خداوند سے

بغاوت ہی کرتے رہے ہو۔"

تورات میں بار بار اس بات کا ذکر آتا ہے کہ بنی اسرائیل کو جب کوئی آزمائش پیش آتی تو وہ اس کا الزام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ڈال کر ان کو ہدفِ ملامت بناتے۔ مثال کے طور پر ہم یہاں بعض واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

مصر میں حضرت موسیٰ کی دعوت کے بعد جب بنی اسرائیل کو آزمائشوں سے سابقہ پیش آیا تو انھوں نے ان سب کا سبب حضرت موسیٰ کو ٹھہرایا اور کہا کہ اس شخص کی بدولت ہم اس کی پیدائش سے پہلے بھی آفتوں میں مبتلا رہے اور اس کی پیدائش کے بعد بھی ہدفِ مصائب رہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب ان کو ملکِ مصر سے لے کر نکلے اور مصریوں نے ان کا تعاقب کیا تو ساری قوم نے بڑبڑانا شروع کیا کہ یہ دیکھو، اس شخص نے ہمیں کہاں لا کر ہمارے مروانے کا سامان کیا ہے۔

دریا پار کرنے کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر تورات لینے گئے تو قوم کے ایک بہت بڑے حصہ نے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ شخص تو ہمیں یہاں چھوڑ کر معلوم نہیں کہاں غائب ہو گیا اور اب وہ آنے والا نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے سامری سے ایک بچھڑا بنوایا اور اس کی پرستش شروع کر دی۔

قارون نے اپنی ایک پارٹی بنائی اور لوگوں میں یہ فتنہ پھیلایا کہ یہ شخص (حضرت موسیٰ) تنہا سارے دین کے جاننے اور لوگوں کی پیشوائی کا اجارہ دار بن بیٹھا ہے حالانکہ خداوند کی نظر میں سب برابر ہیں۔ اس شخص کو ہم پر کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے۔

بیابان کی زندگی کے دور میں جب کھانے پینے کی تکلیف ہوئی تو انھوں نے علانیہ حضرت موسیٰ کو ملامت کی کہ کیا مصر میں ہمارے لیے قبروں کی جگہ نہیں تھی کہ تو نے ہمیں بھوک پیاس سے مرنے کے لیے یہاں بیابان میں لا کر ڈال دیا ہے۔

بیابان میں جب کھانے کے لیے منّ و سلویٰ اور پانی کے لیے اکٹھے بارہ چشموں کا انتظام ہو گیا تو انھوں نے پھر بڑبڑانا شروع کیا کہ اس منّ و سلویٰ سے تو ہماری جان سوکھ گئی، ہمیں تو مصر کے کھیرے، ککڑیاں اور لہسن پیاز یاد آتے ہیں۔

حضرت موسیٰ نے جب ان کو فلسطین پر حملہ کرنے کے لیے ابھارا تو انھوں نے کہا کہ تم وہاں کے زور آور اور جبار باشندوں کی تلواروں سے ہمارا قیمہ کرانا چاہتے ہو۔ ہم اس کے لیے تیار نہیں ہیں۔ لڑنا ہے تو تم اور تمہارا خدا، دونوں جا کر لڑو۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔

بنی اسرائیل کی اس روش پر حضرت موسیٰ نے جن دردانگیز الفاظ میں بار بار اپنے رنج و غم کا اظہار فرمایا ہے ان کو تورات میں پڑھیے تو کچھ اندازہ ہو گا کہ انھیں اپنی قوم کے ہاتھوں کیا کیا دکھ جھیلنے پڑے ہیں۔

بنی اسرائیل کی اسی طرح کی ایذا رسانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہاں مسلمانوں کو نصیحت فرمائی ہے کہ تم اپنے

رسول کے ساتھ اس طرح کا معاملہ نہ کرو جس طرح کا معاملہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا ورنہ اسی انجام سے دوچار ہو گے جس انجام سے وہ دوچار ہوئے۔

'فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا' یعنی اللہ تعالیٰ نے بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہر الزام سے بری کیا۔ ہر تہمت کے مقابل میں ان کی سچائی، نیک نیتی اور راست بازی آشکارا ہوئی اور ان کے دشمن ذلیل و رسوا ہوئے۔ وہ اللہ کے نزدیک باوقار، باآبرو اور سرخ رُو ٹھہرے۔ ان کی وجاہت دنیا میں بھی چمکی اور آخرت میں بھی روشن ہوگی۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بالواسطہ بشارت ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۙ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا (۷۰-۷۱)

صحیح روش جو ایمان کا تقاضا ہے

یہود کی روش سے احتراز کرنے کی ہدایت کے بعد اس صحیح روش کے اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی جو اللہ اور رسول پر ایمان کا تقاضا ہے۔ فرمایا کہ اللہ سے ڈرو۔ یعنی اللہ اور اس کے رسول کو ایذا پہنچانے والے نہ بنو۔ وہ مجرموں کو پکڑتا دیر میں ہے لیکن جب پکڑتا ہے تو کوئی اس کی پکڑ سے نہ بھاگ سکتا ہے، نہ کوئی اس سے رہائی دلا سکتا ہے۔

'وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا' یعنی ایمان لانے کے مدعی بنے ہو تو وہ بات کہو جو اس ایمان کا براہِ راست تقاضا ہے اور اس کا سیدھا سادہ لازمی مطالبہ ہے۔ یہ اشارہ 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کے اعتراف و اقرار کی طرف ہے۔ اس اقرار سے ایمان کی تصدیق ہوتی ہے اور آگے کے لیے ہدایت کی راہیں کھلتی ہیں۔ اس میں یہود کے قول 'سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا' پر ایک لطیف تعریض بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہود کی بات بالکل الٹی تھی۔ وہ ایمان کے مدعی تھے لیکن ان کا کلمہ گویا 'سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا' (ہم نے سنا اور نافرمانی کی) تھا، تم ایمان کی سیدھی روش اختیار کرنا چاہتے ہو تو اپنا کلمہ اور شعار 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' (ہم نے سنا اور مانا) بناؤ۔

صحیح روش اختیار کرنے کا ثمرہ

'يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ' یہ اس 'قول سدید' کا ثمرہ بتایا ہے کہ اگر تم اپنے قول و عمل کے تضاد کو دور کر لو گے تو اللہ تمہارے اعمال کو برومند کرے گا، تمہاری ہر کل سیدھی ہو جائے گی اور تمہارا ہر قدم صحیح سمت میں اٹھے گا۔ اس صورت میں اگر تم سے کوئی غلطی بھی صادر ہوگی تو اللہ تعالیٰ تمہاری غلطیوں سے درگزر فرمائے گا۔ اللہ ان لوگوں کو نفس اور شیطان کے حوالے نہیں کرتا جو سیدھی راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔

'وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا' اس ٹکڑے نے کلام کے تدریجی ارتقاء کے اصول پر واضح کر دیا کہ 'قول سدید' سے مراد 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کا اقرار ہی ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ سمع و طاعت کا اقرار کرنے کے بعد زندگی کے ہر مرحلے میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں

وہ بہت بڑی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی خسارے کا سودا نہیں ہے بلکہ یہ ابدی بادشاہی کی کلید ہے تو جس کو بازی جیتنی ہو وہ جیتے۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۙ لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِينَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُورًا رَّحِيمًا (۷۲-۷۳)

انسان کا اصلی شرف

اب یہ انسان کا اصلی شرف واضح فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عہدِ اطاعت کا امین ہے۔ یہ عہد اختیار و ارادہ کی آزادی پر مبنی ہے اس وجہ سے وہی اس کا سزاوار ٹھہرا۔ اس لیے کہ عہد کا اہل وہی ہوتا ہے جس کو اختیار و ارادہ کی آزادی حاصل ہو۔ جو مخلوقات مجبور و مقہور ہیں ان سے کسی عہد و میثاق کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہ عہد اللہ تعالیٰ نے تمام ذریتِ آدم سے لیا ہے اور یہی عہد اس خلافت کی بنیاد ہے جو اس زمین میں آدم اور ذریتِ آدم کو حاصل ہوئی اور اسی خلافت کے مقتضیات کو بروئے کار لانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے اپنی ہدایت اور کتاب و شریعت نازل کرنے کا وعدہ فرمایا اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی فرمائی کہ جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے وہ جنت کے وارث ٹھہریں گے اور جو اس کی خلاف ورزی کریں گے وہ سب جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اسی وعدے کو پورا کرنے کے لیے اپنے نبی و رسول بھیجے جنھوں نے اپنی اپنی امتوں سے اس عہدِ اطاعت و بندگی کی تجدید کرائی اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اس کے نتائج سے آگاہ کیا۔

اس عہد کی بنیاد چونکہ انسان کے ارادہ کی آزادی پر ہے اس وجہ سے اس کی حیثیت شمشیر دو دم کی ہے۔ اگر انسان اپنے ارادہ کی آزادی کے ساتھ اپنے رب کی بندگی کے عہد کو پورا کرے تو اللہ کے نزدیک اس سے کوئی اونچا نہیں اور اگر وہ اس عہد کو پورا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے خدا کی بخشی ہوئی سب سے بڑی عزت کو اپنے لیے سب سے بڑی ذلت بنا لیا۔

ہر عہد ایک امانت ہے اور ہر امانت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ اس کی بابت امانت رکھنے والا ایک دن پرسش کرے کہ اس کی امانت کا حق ادا کیا گیا ہے یا اس میں خیانت کی گئی ہے۔ یہ چیز ایک روزِ جزا و سزا کو مستلزم ہوئی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ایک دن سب کو اکٹھا کرے گا اور ان کے اعمال کے رجسٹر ان کے سامنے رکھ کر فیصلہ فرمائے گا کہ کون کافر و منافق ہیں جو دوزخ کے سزاوار ہیں اور کون مومن و مخلص ہیں جو جنت کے حق دار ہیں۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اطاعت بالاختیار کی یہ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے بھی پیش کی تھی لیکن وہ اس عظیم ذمہ داری کے اٹھانے سے ڈرے اور اپنی معذرت پیش کر دی کہ ان

کو اس بارِ گراں سے معاف رکھا جائے۔ آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کی یہ معذرت زبانِ حال سے بھی ہو سکتی ہے اور زبانِ قال سے بھی۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کی زبانِ حال و قال دونوں سمجھتا ہے۔ قرآن میں اس بات کی تصریح ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے لیکن ان کی تسبیح کو صرف اللہ تعالیٰ ہی سمجھتا ہے، دوسرے اس کو نہیں سمجھتے۔

اسی طرح ہر ذمہ داری کے تحمل کے لیے ایک خاص صلاحیت درکار ہوتی ہے۔ اگر وہ صلاحیت موجود نہ ہو تو اس کا تحمل ممکن نہیں ہے۔ آپ ہر زمین میں ہر چیز کی کاشت نہیں کر سکتے۔ زمین کا ایک معمولی ٹکڑا آپ کے ایک تخم کا امین بن جاتا ہے اور وہ آپ کی امانت کو نہ صرف محفوظ رکھتا ہے بلکہ اس کو نشو و نما اور فروغ دیتا ہے۔ لیکن وہی تخم اگر آپ ایک وسیع سمندر، ایک عظیم پہاڑ یا ایک لق و دق صحرا میں ڈال دیں تو وہ اس کو نشو و نما نہیں دے سکتے بلکہ وہ تخم ضائع جائے گا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر کسی چیز کے اندر ایک چیز کے قبول کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو وہ اس سے لازماً ابا کرے گی۔ مثلاً ہماری آنکھ ایک خاص درجے کی روشنی کا تحمل کر سکتی ہے، اگر روشنی کی مقدار اس سے بڑھ جائے تو نگاہ خیرہ ہو جائے گی۔ اسی طرح ہمارا جسم ایک خاص درجے کی حرارت یا برودت برداشت کر سکتا ہے، اگر حرارت یا برودت اس سے زیادہ ہو جائے تو ہمارا جسم اس کو قبول کرنے سے ابا بھی کرے گا اور اس سے ڈرے گا بھی۔ ہمارے معدے میں خاص طرح کی چیزوں کے قبول کرنے کی صلاحیت ہے، اگر ہم ان کے سوا کوئی دوسری چیز اس میں ڈالنے کی کوشش کریں تو، خواہ بجائے خود وہ کتنی ہی قیمتی چیز ہو، معدہ اس کا متحمل نہیں ہو سکے گا۔ یہی حال آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کا اس امانت کے معاملے میں ہوا۔ ان کے اندر اس کے اٹھانے کا ظرف نہیں تھا اس وجہ سے انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا۔

وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ: یہ انسان کا شرف بیان ہوا ہے کہ جس بارِ امانت کو آسمان و زمین، دریا اور پہاڑ نہ اٹھا سکے اس کو انسان نے اٹھا لیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان اگرچہ اپنے وجودِ مادی کے اعتبار سے اس کائنات کی ایک نہایت حقیر ہستی ہے لیکن اپنی معنوی صلاحیتوں کے اعتبار سے آسمانوں سے اونچا، زمین سے وسیع اور پہاڑوں سے زیادہ مضبوط و سربلند ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز اس کے لیے مسخر کی گئی لیکن وہ کسی کے لیے بھی مسخر نہیں کیا گیا بلکہ ربِّ کائنات کے سوا کسی کے آگے اس کا جھکنا اس کے لیے باعثِ ننگ قرار پایا۔

إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا: یہ انسان کی اس صلاحیت کی طرف اشارہ ہے جس کی بنا پر وہ اس امانت کا اہل قرار پایا۔ وہ یہ ہے کہ یہ امانت متقضی تھی کہ انسان کے اندر متضاد داعیے موجود ہوں تاکہ اس کی آزمائش ہو سکے کہ وہ ان متضاد داعیوں کی کشاکش کے اندر اپنے رب کی اطاعت، بالاختیار کے عہد کو کس طرح نباہتا اور اس کی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ظلوم و جہول بنایا گیا۔

ظلم، عدل و حق کا ضد ہے اور جہل، علم اور حلم کا ضد ہے۔ 'ظلوم' اس کو کہیں گے جو عدل و حق کا شعور رکھتے ہوئے ظلم کا مرتکب ہونے والا ہو۔ اسی طرح 'جہول' اس کو کہیں گے جو علم و حلم کی صلاحیت کے باوصف جہل اور جذبات سے مغلوب ہو جانے والا ہو۔ یہی کشاکش انسان کی آزمائش ہے اور یہی اس کے تمام شرف کی بنیاد ہے۔ اگر وہ ظلم کی راہ اختیار کرنے کی آزادی رکھنے کے باوجود محض اپنے رب کی رضا کی خاطر عدل کی راہ پر استوار رہتا ہے اور اپنے سفلی جذبات کے اتباع کی آزادی کے باوجود محض اپنے رب کے خوف سے، اپنے جذبات پر قابو رکھتا ہے تو لاریب اس کا مرتبہ فرشتوں سے بھی اونچا ہوا اس لیے کہ ان کو خدا کی بندگی کی راہ میں کسی کشمکش سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ ان کا راستہ بالکل ہموار اور ان کا مزاج ظلم و جہل کے دواعی سے بالکل نا آشنا ہے لیکن انسان اگر بندگی کرتا ہے تو ہر قدم پر وہ اپنے نفس اور شیطان سے لڑ کر کرتا ہے اس وجہ سے اس کی بندگی فرشتوں کی بندگی سے اونچی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس انسان اپنے اس اختیار کے سبب سے جس طرح سب سے زیادہ اونچا ہے اسی طرح وہ سب سے زیادہ نیچا بھی ہو جائے گا اگر وہ اپنے اس اختیار کی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر ادا نہ کر سکے۔ یہی حقیقت سورۂ تین میں اس طرح واضح فرمائی گئی ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ أَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ إِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۴-۶)

اور ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، پھر اس کو اسفل سافلین میں گرا دیا البتہ وہ لوگ اس سے محفوظ رہے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے۔

حامل امانت ہونے کا لازمی نتیجہ

لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۔ یہ نتیجہ بیان ہوا ہے اس امانت کا کہ اس کا لازمی اقتضاء یہ ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں انسان اس امانت سے متعلق مسئول ہو کہ اس نے اس کا حق ادا کیا یا نہیں۔ تاکہ وہ لوگ، جنھوں نے اس کے معاملے میں منافقت کی روش اختیار کی ہو یا شرک کے مرتکب ہوئے ہوں وہ اپنی اس خیانت و بدعہدی کی سزا بھگتیں، خواہ مرد ہوں یا عورتیں اور وہ لوگ جنھوں نے رسوخ ایمان کے ساتھ اس کا حق ادا کیا ہو وہ اپنے رب کی رحمت کے سزاوار ٹھہریں، عام اس سے کہ وہ مردوں میں سے ہوں یا عورتوں میں سے۔

ہم دوسرے مقام میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ توبہ کا صلہ جب 'علیٰ' کے ساتھ آتا ہے تو یہ 'رحم' کے مفہوم پر بھی متضمن ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے یہ اہل ایمان کے لیے بشارت ہے کہ ہر چند یہ ذمہ داری ہے تو بہت بھاری لیکن اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ اس نے اپنے باایمان بندوں اور بندیوں کے لیے توبہ کی راہ بھی کھلی رکھی ہے۔ اگر وہ اپنی کسی کمزوری کے سبب سے کسی ظلم یا جہل کے مرتکب ہوں گے

اور پھر توبہ کر لیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کر کے ان پر رحم فرمائے گا۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ یہ سورہ قرآن حکیم کی مشکل سورتوں میں سے ہے اور میں اس پر قلم اٹھانے سے گھبراتا رہا ہوں۔ اگرچہ اس کی مشکلات، اپنے علم کے حد تک، میں نے بہت پہلے حل کر لی تھیں لیکن یہ تردد سراسر دامن گیر رہا کہ دل و دماغ میں جو کچھ ہے قلم اس کو ادا بھی کر سکے گا یا نہیں۔ اب یہ فیصلہ تو کتاب کے صاحب نظر قارئین کر سکیں گے کہ میں مشکلات سے عہدہ برآ ہو سکا یا نہیں اور ہو سکا تو کس حد تک لیکن میں نے کوشش بہت کی ہے۔ میری خواہش تھی کہ ابھی اس پر مزید غور و فکر جاری رکھوں، لیکن اب اس امانت کے ادا کرنے کا آخری وقت آچکا تھا اس وجہ سے جو کچھ ذہن میں تھا اس کو سپرد قرطاس کر دیا ہے۔ جو باتیں صحیح معلوم ہوں ان کو قبول کیجیے اور جہاں کوئی لغزش محسوس ہو اس کو نظر انداز فرمایئے۔ انسان بہر حال ظلوم و جہول ہے۔ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، اس سے التجا ہے کہ غلطیوں سے درگزر فرمائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

رحمان آباد —— ۱۷ رشوال ۱۳۹۴ھ

۳ رنومبر ۱۹۷۴ء

اتوار —— ۹ بجے صبح

تدبّرِ قرآن

۳۴

سبا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورتوں کا پانچواں گروپ

سورۂ سبا سے سورتوں کا پانچواں گروپ شروع ہو رہا ہے جو سورۂ حجرات پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں ۱۳ سورتیں ـــــ ازسبا تا الاحقاف ـــــ مکی ہیں۔ آخر میں تین سورتیں ـــــ محمد، الفتح، الحجرات ـــــ مدنی ہیں۔

ب۔ گروپ کا جامع عمود

مطالب اگرچہ اس گروپ میں بھی مشترک ہیں یعنی قرآنی دعوت کی تینوں اساسات ـــــ توحید، قیامت، رسالت ـــــ پر جس طرح پچھلے گروپوں میں بحث ہوئی ہے اسی طرح اس میں بھی یہ تمام مطالب زیرِ بحث آئے ہیں، البتہ نہجِ استدلال اور اسلوبِ بیان مختلف ہے اور جامع عمود اس کا اثباتِ توحید ہے جو اس مجموعہ کی تمام سورتوں میں نمایاں نظر آئے گا۔ دوسرے مطالب اسی کے تحت اور اسی کے تضمنات کی وضاحت کے طور پر آئے ہیں۔

ج۔ سورۂ سبا کا عمود اور اس کے مطالب کا تجزیہ

اس گروپ کی پہلی سورہ، سورۂ سبا ہے۔ اس کا عمود اثباتِ توحید و قیامت ہے۔ بنیاد اس کی شکر اور اس کے مقتضیات پر ہے اور مخاطب مُترفینِ قریش ہیں۔ ذیل میں ہم بالاجمال اس کے مطالب کا تجزیہ پیش کرتے ہیں جس سے اس کے تمام اجزاء کا ربط عمود کے ساتھ واضح ہو جائے گا۔

(۱-۹) تمہید، جس میں اللہ تعالیٰ ہی کے سزاوارِ شکر ہونے کی دعوت ہے۔ اس لیے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے اور آخرت میں بھی تمام اختیار و اقتدار اسی کا ہو گا۔ اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے اس وجہ سے نہ کسی کا کوئی عمل اس سے مخفی رہے گا، نہ کوئی کسی کو اپنی باطل سفارش سے چھڑا سکے گا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آخرت نہیں ہے وہ سخت گمراہی میں ہیں۔ آخرت ایک حقیقت اور خدا کی صفات کا لازمی تقاضا ہے۔ جن کے اندر علم کی رمق ہے وہ جانتے ہیں کہ قرآن جس توحید و قیامت کی دعوت دے رہا ہے وہ بالکل حق ہے، صرف بے فکرے اور لااُبالی لوگ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ان کی اصلی بیماری یہ ہے کہ انابت اور عبرت پذیری کی صلاحیت ان کے اندر مفقود

ہے۔ اگر یہ صلاحیت ان کے اندر ہوتی تو وہ دیکھ لیتے کہ خدا ان کو جب چاہے اور جہاں سے چاہے پکڑ سکتا ہے۔

(۱۰-۱۴) منکرین قریش کی تنبیہ کے لیے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی مثال کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تمام نعمتیں عطا فرمائیں لیکن وہ غرور واستکبار میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ اپنے رب کے شکر گزار و فرمانبردار رہے۔ انھوں نے دنیا کے فتنہ میں مبتلا ہو کر شیاطین کی پیروی نہیں کی بلکہ شیاطین سے بھی اپنی پیروی کرائی۔ جو اپنے رب کی فرمانبرداری کرتے ہیں اللہ تعالیٰ شیاطین کو بھی ان کی غلامی میں دے دیتا ہے اور جو اپنے رب کی ناشکری کرتے ہیں شیاطین ان پر مسلط ہو جاتے ہیں اور ان کو شیاطین کی غلامی کرنی پڑتی ہے۔

(۱۵-۲۱) ملکِ سبا کی تمثیل جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خدا کی نعمتیں پا کر جو قومیں خدا کی ناشکرگزاری کے بجائے طغیان و فساد میں مبتلا ہو جاتی ہیں اللہ تعالیٰ ان کو نہایت عبرت انگیز سزا دیا کرتا ہے۔ اہلِ سبا نے اپنے بارے میں ابلیس کے گمان کو سچا ثابت کر دیا جس کی پاداش میں اللہ نے ان کو اپنے تمام افضال سے محروم کر کے ایک افسانۂ پارینہ بنا دیا۔

(۲۲-۲۷) شرک، شرکاء اور شفاعتِ باطل کے عقیدے کی تردید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ اگر یہ مشرکین بے دلیل، محض اپنی انانیت کے غرور میں، اپنی ضد پر اڑے رہنا چاہتے ہیں تو ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ تم نے خدا کی دعوت پہنچا دی۔ اب ان کا فیصلہ اللہ کرے گا۔ وہ ہر چیز سے باخبر اور ہر معاملے کا دوٹوک فیصلہ کرنے والا ہے۔

(۲۸-۳۳) مخالفین کے اس معارضہ کا جواب کہ ہم اس وقت تک اس قرآن کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں جب تک وہ عذاب نہ دکھا دیا جائے جس کی ہم کو دھمکی دی جا رہی ہے۔

(۳۴-۳۹) منکرین کے اصل سببِ انکار کی طرف اشارہ کہ ان کو اس دنیا میں جو مال و جاہ حاصل ہے اس کو وہ خدا کے منظورِ نظر ہونے کی دلیل بنا بیٹھے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جس طرح اس دنیا میں وہ کامیاب ہیں اسی طرح آخرت میں بھی (اگر وہ ہوئی) وہی فائز المرام رہیں گے۔ حالانکہ اس دنیا کی نعمتیں اللہ تعالیٰ جس کو دیتا ہے آزمائش کے لیے دیتا ہے کہ وہ اس کو پا کر خدا کا شکر گزار بندہ بنتا ہے یا ناشکرا۔ آخرت میں اس کے ساتھ اللہ کا معاملہ اس کے عمل کے مطابق ہوگا۔

(۴۰-۴۳) یہ تنبیہ کہ اپنے جن معبودوں کی حمایت میں یہ لوگ قرآن اور پیغمبر کی مخالفت کے لیے آج آستینیں چڑھائے ہوئے ہیں ان میں سے ملائکہ کا حال یہ ہوگا کہ جب خدا قیامت کے دن ان سے سوال کرے گا کہ کیا یہ لوگ تمھاری پوجا کرتے رہے ہیں تو وہ اس سے فوراً اظہارِ براءت کریں گے اور جواب دیں گے کہ یہ جنوں کو پوجتے رہے ہیں، ہم اس سے بالکل بری ہیں۔

(۴۴-۵۴) خاتمۂ سورہ جس میں پہلے تو اس عظیم احسان کی طرف توجہ دلائی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کی صورت میں ان لوگوں پر فرمایا جو اس سے پہلے قرآن و کتاب سے بالکل ناآشنا تھے۔ پھر نہایت ناصحانہ انداز میں ان کو معاملے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کر کے فیصلہ کرنے کی دعوت دی اور آخر میں یہ دھمکی دی کہ اگر یہ وقت نکل گیا تو پھر ہمیشہ کے لیے پچھتاؤ گے لیکن گزرا ہوا وقت ہاتھ نہیں آئے گا۔

سُوْرَةُ سَبَاٍ (۳۴)

مَكِّيَّةٌ —— اٰيَاتُهَا ۵۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَلَهُ آیات ۱-۹
الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ① يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي
الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاۗءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۭ
وَهُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ ② وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ۭ
قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ
فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ
مُّبِيْنٍ ③ لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ
مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ④ وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰۗىِٕكَ
لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ⑤ وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ
اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ وَيَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ
الْحَمِيْدِ ⑥ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ
اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ⑦ اَفْتَرٰى عَلَى

اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي
الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ ﴿۸﴾ اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا
خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ
ع ۹ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَاۗءِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ﴿۹﴾

ترجمۂ آیات ۱-۹

شکر کا حقدار وہ اللہ ہی ہے جس کا وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور اسی کی حمد آخرت میں بھی ہوگی اور وہی حقیقی حکیم و خبیر ہے۔ وہ جانتا ہے ہر اس چیز کو جو زمین کے اندر داخل ہوتی ہے اور جو اس سے برآمد ہوتی ہے اور جو آسمان سے اترتی ہے اور جو اس میں چڑھتی ہے اور وہی رحم فرمانے والا اور بخشنے والا ہے۔ ۱-۲

اور جنھوں نے کفر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم پر قیامت نہیں آنے کی۔ کہہ دو، ہاں میرے خداوند عالم الغیب کی قسم، وہ ضرور تم پر آکے رہے گی! اس سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز مخفی نہیں ہے، نہ آسمانوں اور نہ زمین میں، اور نہ اس سے کوئی چھوٹی چیز اور نہ بڑی۔ مگر وہ ایک واضح کتاب میں مرقوم ہے، تاکہ وہ ان لوگوں کو صلہ دے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے۔ وہی لوگ ہیں جن کے لیے مغفرت اور رزق کریم ہے۔ اور جو ہماری آیات کو زک پہنچانے کی سعی میں سرگرم ہیں وہی ہیں جن کے لیے دردناک عذاب کا خاص حصہ ہوگا۔ ۳-۵

اور جن کو علم عطا ہوا ہے وہ، اس چیز کو جو تمھاری طرف تمھارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے، سمجھتے ہیں کہ یہی حق ہے اور وہ خدائے عزیز و حمید کے راستہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ ۶

اور جنھوں نے کفر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم تم کو ایک ایسا آدمی دکھائیں جو تم کو یہ خبر دے رہا ہے کہ جب تم بالکل ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو از سر نو ایک نئی خلقت میں اٹھائے جاؤ گے! کیا اس

نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے یا اس کو کسی قسم کا جنون ہے! بلکہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہی عذاب اور نہایت دور کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ ۷-۸

کیا انھوں نے اپنے آگے اور پیچھے آسمان و زمین پر نظر نہیں ڈالی! اگر ہم چاہیں تو ان کے سمیت زمین کو دھنسا دیں یا ان پر آسمان سے ٹکڑے گرا دیں! بے شک اس کے اندر ہر اس بندے کے لیے بہت بڑی نشانی ہے جو متوجہ ہونے والا ہو!

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَةِ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ (۱)

اس سورہ کی بنیاد شکر اور اس کے مقتضیات پر ہے

اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سورہ کی بنیاد شکر اور اس کے لوازم و مقتضیات پر ہے اور سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں یہ حقیقت بھی واضح ہو چکی ہے کہ شکر ہی پر توحید اور پھر پورے دین کی عمارت قائم ہے۔ منعم کے شکر کا واجب ہونا انسانی فطرت کی بدیہیات میں سے ہے۔ انسان پر جس کا بھی کوئی احسان ہوتا ہے وہ اس کا ممنون و شکر گزار ہوتا ہے۔ اگر کوئی اپنے محسن کا شکر گزار نہ ہو تو وہ لئیم و کمینہ ہے۔ اسی اصل پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ آسمان و زمین کی تمام نعمتیں، جن سے انسان ہر لمحہ متمتع ہو رہا ہے اور جن کے اوپر ہی اس کے بقا کا انحصار ہے، کس کی پیدا کردہ اور کس کے قبضۂ قدرت میں ہیں؟ یہ سورج، یہ چاند، یہ ابر، یہ ہوا، یہ ستارے اور سیارے کس کے بنائے ہوئے ہیں؟ یہ زمین، یہ دریا، یہ پہاڑ، یہ چرند و پرند، یہ اشجار و انہار اور یہ سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ان سوالوں کا صحیح جواب یہی ہے کہ یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کردہ، اسی کی مملوک اور اسی کے دستِ تصرف میں ہیں۔ پچھلی سورتوں میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ ان سوالوں کا یہی جواب قرآن کے کٹر سے کٹر مخالفین بھی دیتے تھے۔ اس آیت میں قرآن نے اسی بدیہی حقیقت کی یاد دہانی کی ہے کہ وہی اللہ جو آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا خالق و مالک ہے وہی ان تمام مخلوقات کے شکر کا حقیقی سزاوار بھی ہے جو اللہ کی پیدا کی ہوئی ان چیزوں سے متمتع ہو رہی ہیں۔ اس شکر کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ سب اسی کی عبادت و اطاعت کریں اور اس عبادت و اطاعت میں کسی دوسرے کو شریک نہ کریں اس لیے کہ کسی دوسرے کو ان چیزوں کے خلق یا ان کی تدبیر میں کوئی دخل نہیں ہے۔ دوسروں سے انسان کو کوئی فیض

پہنچتا ہے تو محض ایک واسطہ و ذریعہ کی حیثیت سے پہنچتا ہے۔ اس وجہ سے اگر ان کا کوئی حق انسان پر قائم بھی ہوتا ہے تو وہ خدا کے حق کے تحت ہوتا ہے نہ کہ خدا کے حق سے بالاتر یا اس کے برابر۔

شکر کے لازم کا ظہور آخرت میں

وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْآخِرَةِ ؕ اوپر کے ٹکڑے میں اللہ تعالیٰ کے اس حق کا ذکر تھا جو اس دنیا کی زندگی میں اس کے ہر بندے پر قائم ہوتا ہے۔ اب اس ٹکڑے میں اس کے اس حق کا ذکر ہے جو آخرت میں آشکارا ہوگا۔ فرمایا کہ اسی کی حمد آخرت میں بھی ہوگی۔ اس ٹکڑے سے کئی باتیں واضح ہوئیں۔

ایک یہ کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ربوبیت کا جو اہتمام فرمایا ہے اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کے بعد آخرت کا ظہور ہو۔ اگر آخرت نہ ہو تو یہ تمام ربوبیت بالکل بے معنی و بے غایت ہو کے رہ جاتی ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت متعدد مقامات میں ہو چکی ہے اس وجہ سے یہاں اشارے پر کفایت کیجیے۔

دوسری یہ کہ یہ اہل ایمان کے اس ترانۂ حمد کی طرف اشارہ ہے جو آخرت میں تمام حقائق کے ظہور اور اللہ تعالیٰ کے جملہ وعدوں کے ایفا کے بعد ان کی زبانوں سے بلند ہوگا۔ اس کی طرف سورۂ یونس میں اشارہ ہے: وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (یونس: ۱۰) (اور ان لوگوں کی آخری صدا یہ ہوگی کہ شکر کا حقیقی سزاوار اللہ، عالم کا خداوند ہے)۔

تیسری یہ کہ یہ شرکاء و شفعاء کی کلی نفی ہے کہ یہ تمام مزعومہ دیوی دیوتا جن کی شفاعت کی امید پر مشرکین نچنت بیٹھے ہیں، آخرت میں سب ہوا ہو جائیں گے۔ ان میں سے کوئی کسی کے کام آنے والا نہیں بنے گا۔ اس دن مشرکین اپنے معبودوں پر لعنت کریں گے اور معبود اپنے پجاریوں سے اعلان براءت کریں گے۔ سب کی پیشی اللہ واحد کے حضور میں ہوگی۔ اسی کا فیصلہ ناطق ہوگا اور سب پر یہ حقیقت آشکارا ہو جائے گی کہ سزاوار حمد صرف اللہ رب العالمین ہے۔ اس حقیقت کی طرف سورۂ قصص میں یوں اشارہ فرمایا گیا ہے: لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (القصص: ۷۰) (وہی حمد کا حق دار ہے دنیا میں اور اسی کی حمد ہوگی آخرت میں اور اسی کے اختیار میں تمام امور کا فیصلہ ہے اور اسی کے آگے تمہاری پیشی ہونی ہے)۔

مذکورہ بالا باتوں کی دلیل صفات الٰہی سے

وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۔ یہ اوپر کے تمام دعاوی کی دلیل اللہ تعالیٰ کی صفات سے پیش کی گئی ہے کہ وہ حکیم و خبیر ہے اس وجہ سے لازم ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں اپنے شکر گزار بندوں کو ان کی شکر گزاری کا صلہ دے اور ناشکرے اپنی ناسپاسی کی سزا بھگتیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ دنیا ایک بازیچۂ اطفال بلکہ ایک نہایت ظالمانہ کھیل بن کے رہ جاتی ہے اور العیاذ باللہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا خالق حکیم نہیں بلکہ ایک کھلنڈرا ہے حالانکہ اس کائنات کا ذرہ ذرہ یہ شہادت دے رہا ہے کہ اس کا خالق ایک حکیم ہے۔ اسی طرح اس کے حکیم ہونے کا یہ بھی تقاضا ہے کہ اس کے بے لاگ عدل کو کسی کی سفارش باطل نہ کر سکے اس لیے کہ اس صورت میں بھی اس کے حکیم ہونے کی نفی ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ خبیر بھی ہے اس لیے کہ

جب اس نے ہر چیز پیدا کی ہے تو ضروری ہے کہ وہ اس کے ایک ایک ذرہ اور ایک ایک حرکت و سکون سے باخبر بھی ہو چنانچہ فرمایا ہے 'اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ' (الملک : ۱۴) (کیا وہ نہیں جانے گا جس نے سب کچھ بنایا ہے) اس کے اس محیطِ کُل علم کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ کسی کے معاملے کا فیصلہ کرتے وقت نہ کسی دوسرے کے علم و خبر کا محتاج ہو اور نہ کوئی اس کو اپنی جھوٹی سفارش سے فریب دے سکے۔

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ ان تمام باتوں کو حصر کے اسلوب میں فرمایا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جب حقیقی خالق و مالک اور حقیقی حکیم و خبیر وہی ہے تو اس کے سوا کوئی دوسرا حمد و شکر کا سزاوار کس طرح ہو سکتا ہے۔

یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ؕ وَهُوَ الرَّحِیْمُ الْغَفُوْرُ (۲)

خدا کی صفت خبیر کی وضاحت

یہ اسی صفت 'خَبِیْرٌ' کی وضاحت ہے کہ اس کا علم اس کائنات کے ایک ایک ذرے اور ایک ایک حرکت و سکون کو محیط ہے۔ جو دانہ زمین میں ڈالا جاتا ہے وہ اس سے بھی باخبر ہوتا ہے اور جو پودا اس سے برآمد ہوتا ہے اس کو بھی وہ جانتا ہے۔ اسی طرح آسمان سے جو خیر و شر نازل ہوتا ہے وہ بھی اس کے علم میں ہوتا ہے اور جو چیزیں اس میں صعود کرتی ہیں ان سے بھی وہ آگاہ ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا علم تمام کلیات و جزئیات کو محیط ہے اور وہ ہر چیز کی نگرانی فرما رہا ہے۔ اس کی مملکت میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی نہ تو اس کے دائرۂ علم سے باہر ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ اس کے کسی گوشے میں اس کے علم و اذن کے بغیر کوئی کسی قسم کی نقل و حرکت یا دراندازی کر سکے۔ علم الٰہی کے اس احاطہ کی وضاحت اس مقصد سے کی گئی ہے کہ شرک کے عوامل میں سے ایک بہت بڑا عامل مشرکین کا یہ مغالطہ ہے کہ بھلا اتنی ناپیداکنار کائنات کے ہر کونے اور گوشے، ہر ایک کے قول و عمل اور ہر ایک کے دکھ اور درد سے خدا ہر لمحہ کس طرح واقف رہ سکتا ہے! اس وجہ سے اپنے تصور کے مطابق اس کائنات کے مختلف حصوں کو انھوں نے الگ الگ دیوتاؤں میں تقسیم کیا۔ اس کا تقرب حاصل کرنے اور اس کو اپنی ضروریات سے آگاہ کرنے کے لیے وسائل و وسائط ایجاد کیے۔ جنوں کو آسمان کی خبریں لانے والا مان کر ان کی پرستش کی، فرشتوں کو شفاعت کرنے والا سمجھ کر ان کو دیویوں کا درجہ دیا۔ اس آیت نے ان تمام توہمات پر ضرب لگائی کہ خدا کا علم ہر چیز کو محیط ہے اس وجہ سے کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ وہ اپنی پوری کائنات کے سارے نظام پر خود حاوی اور تنہا کافی ہے۔

مشرکین کے ایک مغالطہ کا ازالہ

'وَهُوَ الرَّحِیْمُ الْغَفُوْرُ' یعنی خدا کوئی ظالم اور غیر منصف بھی نہیں ہے کہ اس کو راضی کرنے یا اس کی آفتوں سے اپنے کو بچانے کے لیے کسی دوسرے کی سعی و سفارش کی ضرورت پیش آئے بلکہ وہ نہایت مہربان اور نہایت بخشنے والا ہے۔ اس کی رحمت کو متوجہ کرنے اور اس کی مغفرت حاصل کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ بندہ اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگے اور توبہ و اصلاح کرے۔ یہاں یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ شرک

کے عوامل میں سے ایک اہم عامل مشرکوں کا یہ مغالطہ بھی ہے کہ انھوں نے خدا کا تصور ایک نہایت ہولناک ہستی کی حیثیت سے کیا اور پھر اس کو راضی رکھنے کے لیے انھوں نے اپنے تصور کے مطابق وسائل و ذرائع ایجاد کیے۔ اس ٹکڑے نے اسی واہمہ پر ضرب لگائی ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَأْتِيْنَا السَّاعَةُ ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَأْتِيَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۳)

قیامت خدا کی صفات کا لازمی تقاضا ہے

یعنی جب اللہ حکیم و خبیر ہے، اس کا علم ہر چیز کا احاطہ بھی کیے ہوئے ہے تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ قیامت ضرور آئے لیکن جو ہٹ دھرم ہیں وہ اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں اور بڑے غرور کے ساتھ انکار کرتے ہیں کہ قیامت ہرگز نہیں آئے گی۔

'قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَأْتِيَنَّكُمْ' جس طنطنہ کے ساتھ منکرین کا انکار تھا اسی زور کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بقید قسم، جواب دلوایا کہ ان کو سنا دو کہ ہاں، میرے رب کی قسم! وہ تم پر ضرور آکے رہے گی۔

'عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ الآیۃ' 'عالم الغیب' 'رَبِّيْ' سے بدل واقع ہے یعنی میرے اس رب کی قسم جو تمام غیب سے واقف ہے، جس سے آسمانوں اور زمین میں، ذرہ کے برابر بھی کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ بلکہ ہر چیز ایک نہایت واضح رجسٹر میں درج ہے۔

اس آیت میں علم الٰہی کی وسعت کا بیان منکرین کی تہدید کے مقصد سے ہے کہ وہ جو کہتے ہوں کہ اس ڈھٹائی سے وہ قیامت کا جو انکار کر رہے ہیں تو یاد رکھیں کہ نہ صرف یہ کہ وہ آئے گی بلکہ ہر ایک کو اپنے ایک ایک قول و عمل کا، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، حساب بھی دینا ہے۔ ساتھ ہی اس میں ایک مغالطہ کا ازالہ بھی ہے وہ یہ کہ منکرین کے نزدیک قیامت کے استبعاد کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ اتنی وسیع دنیا کے ایک ایک شخص کے ہر قول و فعل کا علم کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ سب کا حساب کرنے بیٹھے گا! ان کے اس مغالطہ کو دور کرنے کے لیے یہاں بھی اللہ تعالیٰ کے محیطِ کل علم کا حوالہ دیا جس طرح اوپر توحید کے سلسلہ میں دیا ہے۔

لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ (۴-۵)

قیامت کا آنا کیوں ضروری ہے

یہ قیامت کی ضرورت واضح فرمائی کہ اس کا آنا کیوں ضروری ہے۔ فرمایا کہ اس لیے ضروری ہے کہ وہ نہ آئے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ خدا کے نزدیک نیک و بد دونوں یکساں ہیں حالانکہ یہ بات بالبداہت غلط ہے۔ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے اس وجہ سے لازمی ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں اللہ تعالیٰ ایمان و عمل صالح والوں کو ان کی نیکیوں کا صلہ اور جنھوں نے اللہ کی باتوں کو شکست دینے کی کوشش کی ان کو

ان کی اس سعیِ نامراد کی سزا دے۔

قیامت کا اصل مقصد اہلِ ایمان کو صلہ دینا ہے کفار کو سزا دینا اس کے لوازم میں سے ہے

یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قیامت کا اصل مقصد اہلِ ایمان کو صلہ دینا بتایا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس کا اصل مقصود درحقیقت ہے ہی یہی۔ مجرمین کو سزا دینا اس کے مقاصد میں سے نہیں بلکہ اس کے لوازم و نتائج میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا رحمت کے لیے بنائی ہے اور اس رحمت ہی کے لیے اس نے آخرت کا دن بھی رکھا ہے لیکن اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی نکلے گا کہ جو لوگ اپنے آپ کو اس رحمت کا سزاوار نہیں بنائیں گے وہ اس کی نقمت کے سزاوار ٹھہریں گے۔

اہلِ ایمان کے لیے دو چیزوں کا یہاں ذکر فرمایا ہے۔ ایک مغفرت، دوسری 'رزقِ کریم'۔ 'مغفرت' سے مراد یہ ہے کہ ایمان و عملِ صالح کی زندگی بسر کرتے ہوئے ان سے جو کوتاہیاں اور غلطیاں صادر ہوئی ہوں گی اللہ تعالیٰ ان سے درگزر فرمائے گا۔ 'رزقِ کریم' ان تمام افضال و عنایات کی ایک جامع تعبیر ہے جن کے وہ جنت میں وارث ٹھہریں گے۔

کفر کے سرغنوں کا انجام

کفار کا ذکر یہاں 'الَّذِیْنَ سَعَوْ فِیْٓ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ' کی صفت کے ساتھ فرمایا ہے۔ 'معاجزۃ' کے معنی ایک دوسرے کو شکست دینے کے قصد سے باہم مسابقت کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کی تگ و دو رات دن اللہ کی آیات اور اس کی باتوں کو شکست دینے کے لیے وقف رہی ہے ان کو اللہ تعالیٰ 'رجز الیم' کے عذاب میں سے حصہ دے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ اشارہ کفر کے سرغنوں کی طرف ہے جن کے لیے عذاب بھی مخصوص ہوگا۔ اسی مخصوص عذاب کو 'عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِیْمٌ' سے تعبیر فرمایا۔ 'رجز' اس عذاب کو کہتے ہیں جو نہایت ہولناک ہو۔

وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ وَيَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (۶)

عاقلوں کی تائید آدمی کے اطمینان کے لیے بس ہے

یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جن کو علمِ حقیقی کی روشنی عطا ہوئی۔ عام اس سے کہ وہ ان اہلِ کتاب میں سے ہوں[1] جنھوں نے اپنے نبیوں اور صحیفوں کے علم کو محفوظ رکھا یا ان سلیم الفطرت لوگوں میں سے ہوں جن کے قلوب ان کی سلامت روی کے باعث قرآن کی روشنی میں مستنیر ہوئے۔ فرمایا کہ یہ لوگ اس چیز کو بالکل حق سمجھتے ہیں جو تمھاری طرف اتاری گئی ہے۔ یعنی تم جس توحید کی دعوت دے رہے ہو اور جس قیامت سے لوگوں کو ڈرا رہے ہو، وہ اس کی تائید کر رہے ہیں کہ یہی حق ہے اور جو لوگ اپنے مزعومہ شرکاء و شفعاء کے بل پر بڑے طنطنہ کے ساتھ توحید اور قیامت کی تکذیب کر رہے ہیں وہ یکسر باطل پر ہیں۔ یہ بات یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے فرمائی گئی ہے کہ اگر بے فکرے اور لاابالی لوگ تمھاری مخالفت کر رہے ہیں تو اس کی پروا نہ کرو، تمھارے اطمینان کے لیے یہ چیز بس کافی ہے کہ جن کے اندر علم و معرفت کی روشنی

---

[1] اہلِ عرب میں جو لوگ حنیفیت کے پیرو تھے وہ بھی اسی زمرے میں شامل ہیں۔

ہے وہ تمہارے مؤید ہیں۔ آدمی کو پروا عاقلوں کی ہونی چاہیے نہ کہ احمقوں اور لاخیروں کی۔

'وَیَھْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ' یعنی یہ اہلِ علم اس حقیقت کو برملا تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کتاب لاریب خدائے عزیز و حمید کے راستہ کی طرف رہنمائی کرنے والی ہے۔ یعنی دوسروں نے جو دین گھڑ رکھے ہیں وہ تو تمام تر ضلالت اور ہلاکت کے کھڈ میں گرانے والے ہیں البتہ یہ کتاب خدا کی راہ دکھانے والی ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ کی دو صفتیں مذکور ہوئی ہیں ایک 'عزیز' دوسری 'حمید'۔ 'عزیز' سے اس کی عزت و قدرت کا اظہار ہو رہا ہے اور 'حمید' سے دنیا اور آخرت دونوں میں اسی کا سزاوارِ حمد ہونا اور یہ دونوں صفتیں توحید اور قیامت کو مستلزم ہیں، جیسا کہ اوپر کے مباحث سے واضح ہو چکا ہے۔

قرآن کی اصطلاح میں حقیقی علم

اس آیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ حقیقی علم، قرآن کی اصطلاح میں، صرف خدا کی معرفت اور آخرت کا علم ہے۔ اگر یہ علم کسی کے اندر نہ ہو تو دوسرے کتنے ہی علوم وہ پڑھ ڈالے اس کا یہ سارا علم اس کے لیے بار اور دوسروں کے لیے خطر ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے 'علما' صرف انہی کو کہا ہے جن کو خدا اور آخرت کی معرفت حاصل ہو:

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ (فاطر: ۲۸)

اللہ سے اس کے بندوں میں سے بس وہی ڈرتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں اور بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا، بخشنے والا ہے۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰی رَجُلٍ یُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ (۷)

کفار کا رویہ آنحضرت صلعم کی مخالفت میں

اہلِ ایمان کی روش کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اب یہ ان لوگوں کی روش بیان ہو رہی ہے جو علم کی روشنی سے محروم، کفر کے اندھیرے میں، بھٹک رہے ہیں۔ فرمایا کہ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ تمہارا اور تمہاری دعوت کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ لوگوں سے کہتے ہیں کہ آؤ ہم تمہیں ایک ایسا سرپھرا دکھائیں جو خدا کا رسول بن کر یہ منادی کرتا پھر رہا ہے کہ لوگ مر کر جب بالکل ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو وہ از سرِ نو زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے! ——— گویا ان کے نزدیک یہ بات اس قابل بھی نہیں کہ اس کی تردید میں کوئی دلیل دی جائے۔

اَفْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلِ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِی الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِیْدِ (۸)

یہ ان کے اسی استہزا کی مزید تفصیل اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا برمحل جواب ہے۔

'اَفْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ' یعنی وہ کہتے ہیں کہ اس شخص کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں رہا تو یہ مانا جائے کہ اس نے یہ خدا پر جھوٹ باندھا ہے کہ خدا نے اس کو رسول بنا کر بھیجا ہے اور وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس کی طرف سے کہہ رہا ہے یا پھر یہ مانا جائے کہ یہ بھی جنون کی ایک قسم ہے جس میں

یہ شخص مبتلا ہو گیا ہے! مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں بیک وقت اس شخص میں موجود ہیں۔ یہ مفتری بھی ہے اور مجنون بھی!

متمردین کے استہزاء کا باوقار جواب

'بَلِ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ الاٰیۃ'۔ ان متمردین کے اس استہزاء کا جواب قرآن نے فوراً دیا اور دیکھیے کتنا باوقار اور موثر جواب دیا ہے۔

فرمایا کہ ان لال بجھکڑوں نے تشخیص بہت غلط کی۔ خرابی نہ داعی میں ہے نہ دعوت میں بلکہ ساری خرابی خود ان لوگوں کے اندر ہے جو آخرت پر ایمان نہیں لا رہے ہیں۔ وہ عذاب اور نہایت دور کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ یعنی ایک گمراہی تو وہ ہوتی ہے جس سے پلٹ کر آنے اور اصلاح کا امکان باقی رہتا ہے، ہزار خرابی کے بعد بھی، لیکن جو آخرت کے عذاب میں مبتلا ہوا اس کی بازگشت کا پھر کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا۔ اس کے لیے امید کے تمام دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے اس انجام کو مستقبل کے صیغہ سے بیان کرنے کے بجائے حال کے اسلوب میں بیان فرمایا اس لیے کہ ان کا یہ انجام ان کے رویہ کے اندر ہی مضمر ہے۔ گویا آج ہی وہ اپنی رعونت کے سبب سے اس سے دوچار ہیں۔

اَفَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَیْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ (۹)

اس کائنات کی کسی چیز کا نفع رسانی بالاضطرار نہیں بلکہ خدا کے حکم سے ہے

اس مجموعۂ آیات کی پہلی آیت میں جو مضمون بیان ہوا ہے مجموعہ کے آخر میں اسی مضمون کا ایک نئے اسلوب سے اعادہ ہے۔ پہلی آیت میں فرمایا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کا ہے اس وجہ سے دنیا میں بھی شکر کا حقیقی سزاوار وہی ہے اور آخرت میں بھی اسی کی حمد ہوگی۔ یہاں فرمایا کہ کیا ان متکبرین نے اس حقیقت پر کبھی غور نہیں کیا کہ یہ آسمان جو ان کے سروں پر شامیانے کی طرح تنا ہوا ہے اور یہ زمین جو ان کے قدموں کے نیچے فرش کی طرح بچھی ہوئی ہے اور جن کے فوائد و برکات سے یہ متمتع ہو رہے ہیں، یہ ان کے تھامے ہوئے نہیں تھمے ہیں بلکہ ان کو اللہ ہی نے تھام رکھا ہے؛ اگر اللہ نے ان کو نہ تھام رکھا ہوتا تو یہ دونوں ان کے لیے نعمتوں کے بجائے نقمتوں کا ذریعہ بن جاتے۔ فرمایا کہ ہم جب چاہیں ان کے سمیت زمین کو دھنسا دیں اور جب چاہیں اسی آسمان سے ابرِ رحمت برسانے کے بجائے ان پر پتھر برسا دیں! اس کائنات کی کوئی چیز بھی انسان کو بالاضطرار نفع نہیں پہنچا رہی ہے بلکہ خدا کے حکم سے پہنچا رہی ہے اور کوئی چیز بھی براہِ راست انسان کے اختیار میں نہیں ہے بلکہ خدا کے حکم سے وہ اس کی نفع رسانی میں سرگرم ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے جو انسان پر واجب کرتی ہے کہ وہ کسی نعمت پر اترائے نہیں بلکہ اپنے اس رب کا شکر گزار رہے جس نے اس کو یہ نعمت بخشی ہے اور اس کو خدا کی نافرمانی اور اس سے بغاوت کا ذریعہ بنانے کے بجائے اس کو اسی کی خوشنودی اور فرمانبرداری میں استعمال کرے۔

یہی مضمون آگے والی سورہ ——— سورۂ فاطر ——— میں، جو اس کا مثنیٰ ہے، یوں

ارشاد ہوا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ یُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ	بے شک اللہ ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے
الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ۬ وَلَىِٕنْ زَالَتَاۤ	کہ وہ لڑھک نہ جائیں اور اگر وہ دونوں لڑھک جائیں
اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ	تو کسی کی تاب نہیں کہ وہ خدا کے چھوڑ دینے کے بعد
بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِیْمًا	ان کو تھام سکے۔ بے شک وہ نہایت، بردبار اور
غَفُوْرًا (فاطر: ۴۱)	بخشنے والا ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ۔ یعنی آسمانوں اور زمین کے اس پہلو پر اگر غور کرتے تو اس کے اندر اس بات کی بہت بڑی دلیل موجود ہے جس کی قرآن ان کو دعوت دے رہا ہے لیکن اس دلیل تک رسائی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر حقیقت کی طلب، عبرت پذیری کی صلاحیت اور متوجہ ہونے والا دل ہو جن کے اندر یہ اوصاف نہ ہوں ان کے لیے کوئی نشانی بھی کارگر نہیں ہو سکتی۔

۲- آگے کا مضمون۔ آیات ۱۰-۲۱

آگے تاریخ سے دو مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ پہلی مثال حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے عظیم بادشاہی، عظیم علم و حکمت اور آسمان و زمین کی بے شمار نعمتوں سے نوازا اور وہ ان نعمتوں کو پاکر طغیان و فساد میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ برابر اپنے رب کے شکر گزار اور فرماں بردار رہے۔ ان کی اس شکر گزاری کا صلہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دیا کہ ان کے لیے نعمتوں میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔

دوسری مثال اہلِ سبا کی ہے۔ ان کو بھی ایک نہایت آباد و زرخیز ملک کی حکومت ملی لیکن وہ اس کو پاکر طغیان و فساد میں مبتلا ہو گئے بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سیلاب بھیج کر اس طرح ان کو تباہ کر دیا کہ وہ ایک داستانِ پارینہ بن کر رہ گئے۔

یہ دونوں مثالیں قریش کے مُترفین و متکبرین کے سامنے پیش کی گئی ہیں کہ ان کے سامنے بھی یہ دونوں راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ وہ چاہیں تو حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح خدا کے شکر گزار رہ کر اپنے آپ کو خدا کی نعمتوں کا حقدار بنا سکتے ہیں اور چاہیں تو اہلِ سبا کی روش اختیار کر کے اس کے قہر کو بھی دعوت دے سکتے ہیں۔ ساتھ ہی اس میں یہ تذکیر بھی ہے کہ جب اس دنیا میں خدا کے قانونِ مجازات کے ظہور کی یہ مثالیں موجود ہیں تو آخرت میں اس کے ظہور کو کیوں مستبعد خیال کرتے ہو! ——— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۰-۲۱

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ؕ یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ وَالطَّیْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِیْدَ ۝۱۰ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِی السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا

صَالِحًا ۖ إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١﴾ وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ غُدُوُّهَا
شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۖ وَأَسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ ۖ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ
يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۖ وَمَنْ يَزِغْ مِنْهُمْ عَنْ أَمْرِنَا نُذِقْهُ
مِنْ عَذَابِ السَّعِيرِ ﴿١٢﴾ يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ مَحَارِيبَ
وَتَمَاثِيلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ رَاسِيَاتٍ ۚ اعْمَلُوا آلَ دَاوُودَ شُكْرًا ۚ
وَقَلِيلٌ مِنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ ﴿١٣﴾ فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا
دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنْسَأَتَهُ ۖ فَلَمَّا
خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَنْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ
الْمُهِينِ ﴿١٤﴾ لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ ۖ جَنَّتَانِ عَنْ
يَمِينٍ وَشِمَالٍ ۖ كُلُوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ ۚ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ
وَرَبٌّ غَفُورٌ ﴿١٥﴾ فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنَاهُمْ
بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ أُكُلٍ خَمْطٍ وَأَثْلٍ وَشَيْءٍ مِنْ سِدْرٍ
قَلِيلٍ ﴿١٦﴾ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِمَا كَفَرُوا ۖ وَهَلْ نُجَازِي إِلَّا الْكَفُورَ ﴿١٧﴾
وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً
وَقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ ۖ سِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا آمِنِينَ ﴿١٨﴾
فَقَالُوا رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا وَظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ
أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِكُلِّ صَبَّارٍ
شَكُورٍ ﴿١٩﴾ وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ إِلَّا فَرِيقًا
مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٠﴾ وَمَا كَانَ لَهُ عَلَيْهِمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا لِنَعْلَمَ

مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ۭ وَرَبُّكَ عَلٰي كُلِّ
ع ۲ / ۸ شَيْءٍ حَفِيْظٌ (۲۱)

ترجمۂ آیات ۱۰ - ۲۱

اور ہم نے داؤد کو اپنے خاص فضل سے نوازا۔ اے پہاڑو، تم بھی اس کے ساتھ تسبیح میں شرکت کرو اور یہی حکم ہم نے پرندوں کو بھی دیا۔ اور ہم نے اس کے لیے لوہے کو نرم کر دیا کہ ڈھیلی ڈھالی زرہیں بناؤ اور ان کے جوڑ پیوستہ رکھو اور سب نیک عمل کرو، بے شک تم جو کچھ کرتے ہو میں اس کو اچھی طرح دیکھ رہا ہوں۔ ۱۰-۱۱

اور ہم نے سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا۔ اس کا جانا بھی مہینہ بھر کا ہوتا اور آنا بھی مہینہ بھر کا ہوتا اور ہم نے اس کے لیے تانبے کا چشمہ بہا دیا اور جنات میں سے بھی اس کے لیے مسخر کر دیے جو اس کے رب کے حکم سے اس کے حضور خدمت کرتے (اور ان کے لیے ہمارا حکم یہ تھا کہ) جو ان میں سے ہمارے حکم سے سرتابی کرے گا تو ہم اس کو دوزخ کا عذاب چکھائیں گے۔ وہ اس کے لیے بناتے جو وہ چاہتا، محرابیں، مجسمے، حوضوں کے مانند لگن، اور لنگر انداز دیگیں ـــــ اے آلِ داؤد، شکرگزاری کے ساتھ عمل کرو اور میرے بندوں میں شکرگزار تھوڑے ہی ہیں۔ ۱۲-۱۳

پس جب ہم نے اس پر موت کا فیصلہ نافذ کیا تو ان کو اس کی موت سے نہیں آگاہ کیا مگر زمین کے کیڑے نے جو اس کے عصا کو کھاتا تھا پس جب وہ گر پڑا تب جنوں پر واضح ہوا کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں نہ پڑے رہتے۔ ۱۴

اور اہلِ سبا کے لیے بھی ان کے مسکن میں بہت بڑی نشانی موجود تھی۔ دہنے بائیں دونوں جانب باغوں کی دو قطاریں۔ اپنے رب کے بخشے ہوئے رزق سے متمتع ہو اور اس کے شکرگزار رہو! زمین شاداب و زرخیز اور پروردگار بخشنے والا ہے!! تو انھوں نے سرتابی

کی تو ہم نے ان پر بند کا سیلاب بھیج دیا اور ان کے باغوں کو دو ایسے باغوں سے بدل دیا جن میں بدمزہ پھل والے درخت اور جھاؤ اور بیری کی کچھ جھاڑیاں رہ گئیں۔ یہ ہم نے ان کی ناشکری کا بدلہ دیا اور ہم برا بدلہ ناسپاسوں ہی کو دیا کرتے ہیں! ۱۵ - ۱۷

اور ہم نے ان کے درمیان اور ان بستیوں کے درمیان، جن میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں ہمراہ بستیاں بھی آباد کیں اور ان کے درمیان سفر کی منزلیں ٹھہرا دیں۔ ان میں رات دن بے خوف و خطر سفر کرو۔ پس انھوں نے کہا، اے رب ہمارے سفروں میں دوری پیدا کر دے اور انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے تو ہم نے ان کو افسانہ پارینہ بنا دیا اور ان کو بالکل تتر بتر کر چھوڑا۔ بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ہر صبر کرنے والے، شکر کرنے والے کے لیے۔ ۱۸-۱۹

اور ابلیس نے ان کے اوپر اپنا گمان سچ کر دکھایا۔ سو انھوں نے اس کی پیروی کی۔ صرف اہلِ ایمان کا ایک گروہ اس سے بچ سکا۔ اور اس کو ان کے اوپر کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔ بس یہ کہ ہم ممیز کر دیں ان لوگوں کو جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں ان لوگوں سے جو اس کی بابت شک میں ہیں اور تمھارا رب ہر چیز کا نگران ہے۔ ۲۰ - ۲۱

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۖ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ (۱۰)

حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ پر اللہ تعالیٰ نے جو فضلِ خاص فرمایا اس کی تفصیل سورۂ انبیاء اور سورۂ نمل میں گزر چکی ہے۔ یہاں ہم اپنی بحث صرف ضروری حد تک محدود رکھیں گے۔

حضرت داؤدؑ کا سوز و گداز

'يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ'۔ یہ اشارہ ہے اس سوز و گداز کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو عطا فرمایا تھا کہ جب وہ پہاڑوں کے دامن میں بیٹھ کر اپنے خاص لاہوتی لحن میں اپنے رب کی حمد کا ترانہ چھیڑتے اور اپنی منظوم مناجاتیں پڑھتے تو شجر و حجر اور چرند پرند سب جھوم اٹھتے اور ان کی ہم نوائی کرتے۔

پہاڑوں اور پرندوں کی طرف سے ہم نوائی

'تَاْوِیْبٌ' کے اصل معنی 'ترجیع' کے ہیں یعنی کسی کے سُر میں اپنا سُر ملانا، اس کی آواز کو دہرانا، اس کی ہم آہنگی اور ہم نوائی کرنا۔ یوں تو اس کائنات کی ہر چیز خدا کی تسبیح کرتی ہے اور جب وہ تسبیح کرتی ہے تو لازماً تسبیح کرنے والوں کی ہم نوائی بھی کرتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے جس طرح حضرت داؤد کو خاص نوع کا لِحنِ اور خاص قسم کا لحن عطا فرمایا تھا اسی طرح اپنے خاص حکم سے پہاڑوں اور پرندوں کو یہ حکم بھی دیا تھا کہ جس وقت حضرت داؤد اپنے رب کی حمد و تسبیح کریں، وہ بھی ان کے ساتھ اس میں شریک ہوں۔ سورۂ انبیاء میں یہی مضمون یوں ادا ہوا ہے: 'وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَالطَّیْرَ' (۷۹) (اور ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کر دیا اور پرندوں کو بھی)۔

بزم کے بعد ان کی رزم کا حال

'وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِیْدَ' ان کی بزم کا حال بیان کرنے کے بعد یہ ان کی رزم کا حال بیان ہو رہا ہے کہ ہم نے اس کے لیے لوہے کو نرم کر دیا۔ اس کی وضاحت سورۂ انبیاء میں ہو چکی ہے کہ انھوں نے لوہے کو پگھلانے اور اس سے نہایت باریک کڑیوں کی زرہیں بنانے کے فن کو اتنی ترقی دی کہ لوہے کی زرہیں ایسی ڈھیلی ڈھالی بننے لگیں کہ معلوم ہوتا کسی کپڑے سے بنائی گئی ہیں جن کا پہننا نہایت آسان ہوتا اور حفاظت کے پہلو سے وہ لوہے کا کام دیتیں۔

اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِی السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (۱۱)

لوہے کی صنعت میں اولیت کا امتیاز

'سٰبِغٰتٌ' ڈھیلے ڈھالے لباس کو کہتے ہیں جو پورے جسم کو ڈھانک لے۔ یہاں یہ ڈھیلی ڈھالی زرہ کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ 'قَدِّرْ فِی السَّرْدِ' میں 'سَرْد' کے معنی بناوٹ کے اور 'تَقْدِیْر' کے معنی بناوٹ میں پورے تناسب کو ملحوظ رکھنے کے ہیں۔

لوہے سے ایسا لباس تیار کر لینا جو ڈھیلا ڈھالا بھی ہو اور اس کی کڑیوں میں پورا تناسب بھی ملحوظ رہ سکے بغیر اس کے ممکن نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد پر لوہے کے پگھلانے کی ایسی اعلیٰ سائنس کا انکشاف فرمایا، جس کی اوّلیت کا سہرا انہی کے سر ہے۔ اپنی اس ایجاد سے انھوں نے دفاعی اسلحہ میں ایک نہایت بیش قیمت اضافہ کیا جس سے ان کی فوجی قوت ان کے حریفوں کے مقابل میں بہت بڑھ گئی۔

اس فن کا اخلاقی تقاضا

'وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ' اوپر کے ٹکڑے میں اس فن کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے حوصلہ افزائی فرمائی گئی ہے۔ اس ٹکڑے میں اس فن کا اخلاقی تقاضا بیان ہوا ہے کہ اس کو پاکر بہک نہ جانا اور اس کو زمین میں فساد کا ذریعہ نہ بنانا بلکہ اس بات کو برابر یاد رکھنا کہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ یہ ہدایت اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور ان کے تمام آلِ داؤد اتباع کو فرمائی۔ اس کا ذکر بار بار زبور اور امثال میں بھی آیا ہے۔

اس زمانے میں انسان نے سائنس میں جو ترقی کی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے بڑے بڑے فائدے پہنچے ہیں اور پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن دو باتیں

انسان بھول گیا ہے۔ ایک یہ کہ سائنس کا ہر انکشاف، جو ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے ہوا ہے، دوسری یہ کہ ہر نعمت اور ہر قوت کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ انسان اس کو خدا کی امانت سمجھے اور یہ یاد رکھتا ہوا اس کو استعمال کرے کہ جس خدا نے یہ بخشش ہے وہ دیکھ رہا ہے کہ میں اس کو کہاں استعمال کرتا ہوں۔ ان دو حقیقتوں کے فراموش کر دینے کی وجہ سے اب سائنس انسان کے لیے ایک عظیم خطرہ بن گئی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ انسان اپنے ہی ایجاد کیے ہوئے اسلحہ سے کب خودکشی کر لے۔

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ۗ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۗ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ (۱۲)

حضرت سلیمانؑ کی بحری قوت

حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح لوہے کے استعمال کا نہایت اعلیٰ فن تعلیم فرمایا جس سے انھوں نے اپنی بری قوت میں بے مثال اضافہ فرمایا اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہوا کے کنٹرول کرنے کا فن عطا فرمایا جس سے انھوں نے اپنے بحری بیڑے کو اس قدر ترقی دی کہ ان کے جہازات مہینوں کا سفر بے روک ٹوک جاری رکھتے۔ سورۂ انبیاء کی آیت ۸۱ کے تحت ہم ذکر کر آئے ہیں کہ ان کے بادبانی جہازات نہایت دور دور کے سواحل تک سفر کرتے اور ان کے بادبان ایسے سائنٹیفک طریقہ پر بنائے گئے تھے کہ ہوا کی قلت یا شدت یا مخالفت سے ان کے سفر میں کوئی خلل واقع نہ ہوتا۔ سورۂ صٓ میں ہے: فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ (۳۶) (پس ہم نے ہوا کو اس کی خدمت میں لگا دیا تھا وہ نہایت سازگاری کے ساتھ اس کے حکم سے چلتی جہاں وہ پہنچنا) سورۂ انبیاء میں ہے: وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا (۸۱) (اور ہم نے سلیمان کے لیے بادِ تند کو بھی مسخر کر دیا تھا جو چلتی تھی اس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں)۔

آیت زیرِ بحث میں انھی جہازوں کے طولِ سفر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ان کی ایک ایک ٹرپ مہینہ مہینہ بھر کی طویل مدت پر ممتد ہوتی۔ ذکر اگرچہ ہوا کا ہے لیکن مقصود جہازوں ہی کا جانا اور آنا ہے۔ گویا اصل عامل کا ذکر کر کے معمول کی طرف اشارہ فرمایا ہے اس لیے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا اصل تصرف ہواؤں ہی میں ظاہر ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ لمبے لمبے سفر اسی صورت میں ممکن تھے جب یہ جہازات نہایت بڑے بڑے بھی ہوں اور ان کے ساتھ ہوا کے کنٹرول کرنے کا نظام اتنا اعلیٰ اور مستحکم ہو کہ وہ ہر قسم کے سمندروں کے اندر ہر نوع کی ہواؤں کا نہایت خوبی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں۔ یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ فصیح عربی میں 'غدو' اور 'رواح' کے الفاظ صبح اور شام کی قید سے مجرد ہو کر صرف جانے اور آنے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ (آل عمران: ۱۲۱) (اور جب کہ تم نکلے اپنے گھر سے مسلمانوں کو جنگ کے مورچوں میں مامور کرنے)۔ اسی طرح لفظ 'رواح' پر صاحب اقرب الموارد نے لکھا ہے کہ 'وقد يستعمل لمطلق المضي والذهاب' (یہ لفظ مطلق آنے اور جانے کے مفہوم میں بھی

استعمال ہوتا ہے)۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ ہوا کی تسخیر سے مراد مجرد ہوا کی تسخیر نہیں بلکہ جس طرح اوپر حضرت داؤدؑ کے لیے لوہے کو نرم کرنے سے مقصود ان کی اسلحہ سازی اور جنگی قوت کی طرف اشارہ ہے، چنانچہ دوسرے مقام میں اس کی وضاحت بھی فرما دی ہے ''وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْ بَاْسِكُمْ (الانبیاء: ۸۰)'' (اور ہم نے اس کو ایسے لباسوں کی صنعت سکھائی جو تمھاری جنگوں میں تمھیں محفوظ رکھے)، اسی طرح حضرت سلیمان کے لیے ہوا کی تسخیر سے مقصود ان کے بحری بیڑے کی قوت و شوکت کی طرف اشارہ مقصود ہے اور ان کے بحری بیڑے کی وسعت کا جو حال تھا اس کی طرف ہم سورۂ انبیاء کی تفسیر میں اشارہ کر چکے ہیں۔

تانبے کی صنعت

''وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ''۔ 'قطر' تانبے کو کہتے ہیں۔ تانبے کو تمدنی ترقی میں جو دخل حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اس عہد کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں تانبے کی بھی بہت بڑی مقدار برآمد ہوئی اور اس کو انھوں نے اپنی تمدنی و تعمیری ترقیوں میں نہایت خوبی کے ساتھ استعمال کیا۔ آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تانبا سیال شکل میں برآمد ہوتا اور پھر منجمد ہو کر مختلف ضرورتوں میں استعمال ہوتا۔ آگے بڑی بڑی دیگوں اور لگنوں کا ذکر آ رہا ہے، ظاہر ہے کہ وہ اسی کی بنتی تھیں۔ ہیکل کی تعمیر میں بھی، جیسا کہ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس دھات کا بہت استعمال کیا۔ آج عربوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے تیل کے چشمے جاری کر دیے ہیں، حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے اس نے تانبے کا چشمہ جاری کر دیا تھا۔ زمین کے جتنے خزانے بھی ماضی میں دریافت ہوئے یا آج دریافت ہو رہے ہیں یا مستقبل میں دریافت ہوں گے وہ سب اللہ ہی کی بخشی ہوئی رہنمائی سے دریافت ہوئے اور ہوں گے۔ جن کی نگاہیں حقیقت بین ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہر چیز کا منبع اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن جن کی نگاہوں کو سائنس نے خیرہ کر رکھا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ ان کی اپنی کارستانی ہے۔

تسخیر جنات کا علم

''وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ''۔ سورۂ نمل کی تفسیر میں ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا علم بھی عطا فرمایا تھا جس کے ذریعے سے وہ شریر جنوں کو قابو میں کر کے ان کو اپنے مختلف کاموں میں استعمال کرتے تھے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جن براہِ راست حضرت سلیمان علیہ السلام کے تصرف میں نہیں ہوتے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ ان کی اطاعت کرتے تھے۔ اور اگر ان سے کوئی عدول حکمی صادر ہوتی تو اللہ تعالیٰ ہی ان کو سزا دیتا تھا۔ ''وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ'' (ان میں سے جو ہمارے حکم کی سرتابی کرے گا تو ہم اس کو آگ کا عذاب چکھائیں گے)۔ بعض لوگوں نے جنوں سے دیوہیکل اور طاقتور آدمی مراد لیے ہیں لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ سورۂ نمل میں صاف تصریح ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر جنوں، انسانوں اور پرندوں سب پر مشتمل تھا۔ ''وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ'' (اور سلیمان کے ملاحظہ کے لیے اس کا لشکر — جنوں، انسانوں

اور پرندوں پر مشتمل ـــ اکٹھا کیا گیا) اگر جن سے مراد انسان ہی ہوتے تو یہاں جنوں کے الگ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

یَعْمَلُوْنَ لَہٗ مَا یَشَآءُ مِنْ مَّحَارِیْبَ وَ تَمَاثِیْلَ وَجِفَانٍ کَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا ؕ وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ (۱۳)

حضرت سلیمانؑ نے جنات سے تعمیری کام لیے

یہ ان کاموں کی تفصیل ہے جن میں حضرت سلیمانؑ ان مسخر جنوں کو استعمال کرتے تھے۔ یہ سارے کام تعمیری، تمدنی اور اصلاحی ہیں۔ یہود اپنے دورِ زوال میں جب علوم سفلیہ میں مبتلا ہوئے تو ان خرافات کو انھوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کیا۔ یہاں قرآن نے واضح فرمایا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے جنات کو جس علم سے مسخر کیا وہ اللہ تعالیٰ نے خاص اپنے فضل سے ان کو بخشا تھا، اس کو سفلی علوم سے کوئی تعلق نہیں تھا اور جنات سے جو کام انھوں نے لیے وہ سب تعمیری اور تمدنی کام تھے۔ ان کو انھوں نے فاسد اغراض کے لیے استعمال نہیں کیا۔ اس مضمون کی تفصیل سورۂ بقرہ میں آیت 'وَمَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ ... الآیۃ' کے تحت گزر چکی ہے۔

محاریب، اور تماثیل

مِنْ مَّحَارِیْبَ وَتَمَاثِیْلَ: یعنی ان جنوں سے حضرت سلیمان علیہ السلام محرابیں اور مجسمے بھی بنواتے تھے۔ 'محراب' میرے نزدیک اپنے معروف معنی ہی میں یہاں استعمال ہوا ہے۔ اس کے خاص طور پر ذکر کی وجہ یہ ہے کہ کسی عمارت کا سب سے زیادہ نمایاں حصہ اس کی محرابیں ہی ہوتی ہیں جو دیکھنے والوں کو سب سے پہلے نظر آتی ہیں۔ اس وجہ سے تعمیری آرٹ کا سب سے زیادہ مظاہرہ انہی پر ہوتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کی تعمیر کرائی ہوئی عمارتوں میں سے ہیکل اور ان کے محل کی تعمیر کی تفصیل کتاب سلاطین میں موجود ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی محرابوں پر تعمیری آرٹ کا پورا کمال صرف کیا گیا تھا۔ ان پر نہایت خوبصورت پھولوں کے نقش ابھارے گئے تھے۔

'تَمَاثِیْل'، 'تِمْثَال' کی جمع ہے۔ 'تِمْثَال' کسی چیز کی مصوّر یا کندہ کی ہوئی صورت، شبیہ یا اس کے پیکر اور مجسمہ کو کہتے ہیں۔ یہ صورت بے جان چیزوں کی بھی ہو سکتی ہے، مثلاً کسی دریا، پہاڑ، درخت، جھاڑی، پھول وغیرہ کی اور حقیقی یا فرضی جاندار چیزوں کی بھی ہو سکتی ہے، مثلاً انسان، فرشتے، جنات اور حیوانات وغیرہ کی ـــ تورات کی کتاب سلاطین سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ان دونوں ہی قسموں کی تماثیل بنوائیں۔ مثلاً ان کے محل کے ذکر کے سلسلہ میں ہے:

"اور ان حاشیوں پر جو پٹڑوں کے درمیان تھے شیر اور بیل اور کروبی بنے تھے" ۱- سلاطین ۷: ب - ۲۹

اسی طرح ہیکل کی تعمیر کے بیان میں ہے۔

"اور الہام گاہ میں اس نے زیتون کی لکڑی کے دو کروبی دس دس ہاتھ اونچے بنائے اور کروبی کا ایک بازو پانچ ہاتھ کا اور دوسرا بازو بھی پانچ ہی ہاتھ کا تھا"

"اور اس گھر کے اندر دیوار پر تھا جس پر لٹو اور کھلے ہوئے پھول کندہ کیے گئے تھے۔" سلاطین: باب ۱۸

"اس گھر کی سب دیواروں پر گرداگرد، اندر اور باہر کروبوں اور کھجور کے درختوں اور کھلے ہوئے پھولوں کی صورتیں کندہ کیں۔" سلاطین: ب ۶-۳۰

ایک اشکال کا جواب

جہاں تک بے جان چیزوں کی صورتوں اور مورتوں کا تعلق ہے ان کے جواز میں تو کوئی اختلاف رائے نہیں ہے، لیکن جاندار چیزوں، بالخصوص فرشتوں کی مورتوں کا معاملہ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو کس طرح جائز سمجھا۔ اگر اس کا جواب یہ دیا جائے، جیسا کہ عام طور پر ہمارے مفسرین نے دیا ہے، کہ بنی اسرائیل کی شریعت میں یہ چیزیں حرام نہیں تھیں تو یہ جواب تورات سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ تورات میں ان چیزوں کی حرمت نہایت واضح الفاظ میں وارد ہوئی ہے۔ خروج - ۲۰: ۲ - ۵ میں ہے:

"خداوند تیرا خدا جو تجھے زمینِ مصر سے، غلامی کے گھر سے، نکال لایا، میں ہوں۔ میرے حضور تیرے لیے دوسرا خدا نہ ہووے۔ تو اپنے لیے کوئی مورت یا کسی چیز کی صورت، جو اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر یا پانی میں زمین کے نیچے ہے مت بنا۔ تو ان کے آگے اپنے تئیں مت جھکا اور نہ ان کی عبادت کر کیونکہ میں تیرا خدا غیور خدا ہوں۔"

دیکھیے اس میں نہایت واضح الفاظ میں صورت یا مورت بنانے کی ممانعت ہے۔ اس وجہ سے یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ پچھلی شریعتوں میں یہ چیزیں جائز تھیں، صرف اسلام میں یہ حرام قرار دی گئی ہیں۔ یہ چیزیں پہلے بھی ناجائز تھیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے تورات کے کسی حکم کی خلاف ورزی کی۔ اس وجہ سے ہمارا خیال یہ ہے کہ انھوں نے اسی قسم کی تماثیل بنوائی ہوں گی جن کا تعلق محض آرٹ سے ہے اور مذہبی تقدس کا جن کے اندر کوئی شائبہ نہیں تھا۔ لیکن جب یہود میں مورت پرستی کا رواج ہوا ہو گا تو اس قسم کی چیزیں ان کے بادشاہوں نے بنوائی ہوں گی اور ان کو سندِ جواز دینے کے لیے ان کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا گیا ہو گا۔ آخر تمام علوم سفلیہ بھی تو حضرت سلیمان علیہ السلام ہی کی طرف یہود نے منسوب کیے جس کی تردید سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ اسی طرح کی خرافات ان کی طرف کتابِ سلاطین میں بھی منسوب کر دی گئی ہیں۔ یہ امر واضح رہے کہ یہود نے حضرت سلیمانؑ کو ایک پیغمبر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک بالکل دنیا دار بادشاہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور ان کی سیرت ہر پہلو سے انھوں نے داغدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

حضرت سلیمانؑ کا جود و کرم

'وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ رَّاسِيَاتٍ'۔ 'جفان' 'جفنۃ' کی جمع ہے جس کے معنی تھال اور لگن کے ہیں اور 'جوابی' 'جابیۃ' کی جس کے معنی حوض کے ہیں۔ 'راسیات' پہاڑوں کی صفت کے لیے آتا ہے۔ یہاں یہ ان بڑی بڑی دیگوں کے لیے آیا ہے جو اتنی بھاری بھرکم ہوتیں کہ آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں کی جا سکتی تھیں۔ وہ ایک ہی جگہ چولھوں پر نصب رہتیں اور بیک وقت منوں کے حساب سے

ان میں کھانا پکتا۔

اوپر کے ٹکڑے میں سلیمانی تمدّن کے آرٹ کے پہلو کو نمایاں کیا گیا تھا۔ اس ٹکڑے میں ان کے جود و کرم کو نمایاں کیا گیا ہے کہ جنّات حضرت سلیمانؑ کے لیے بڑے بڑے لگن بناتے جو حوضوں کے مانند ہوتے اور بھاری بھرکم دیگیں بناتے جو ایک ہی جگہ لنگر انداز رہتی تھیں۔ یہ حوضوں کے مانند لگن اور بھاری بھرکم دیگوں کا ذکر حضرت سلیمانؑ کے جود و کرم کی تعبیر کے لیے ہے۔ اگر آپ کو یہ کہنا ہو کہ فلاں شخص بڑا فیاض ہے، اس کے خوانِ کرم سے ایک خلقِ عظیم کی پرورش ہو رہی ہے تو فصیح عربی میں اس کی تعبیر کے لیے یہ دو حرف کافی ہوں گے کہ لَہٗ قُدُوْرٌ رٰسِیٰتٌ‘۔ عرب شعراء نے حاتم اور اپنے دوسرے فیاضوں کے لیے یہی استعارہ استعمال کیا ہے۔

رحمانی تمدن اور شیطانی تمدن

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت سلیمانؑ کے ہاتھوں جو تمدّن وجود میں آیا اس میں صرف سائنس، آرٹ اور شوکت کی نمائش ہی نہیں تھی بلکہ اس کے پہلو بہ پہلو اس میں غربا پروری کا نہایت وسیع اور فیاضانہ اہتمام بھی تھا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس تمدن کی تحسین فرمائی۔ جس تمدن میں یہ دونوں پہلو، پورے توازن کے ساتھ، موجود ہوں وہ مبارک تمدن ہے۔ اس کے برعکس جس تمدن میں آرٹ اور طمطراق کی نمائش تو ہو لیکن غربا فاقے کریں وہ تمدن شیطانی ہے۔

نعمت کا حق خدا کی شکرگزاری ہے

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا۔ یہ اس فضل و انعام کا حق بیان ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ پر فرمایا۔ ان کو ہدایت ہوئی کہ اس علم و سائنس اور ان ارضی و سماوی برکات کو پا کر بہک نہ جانا بلکہ اپنے رب کی شکرگزاری کے ساتھ ہر چیز اس کے صحیح محل میں برتنا اور ہر قدم صحیح سمت میں اٹھانا۔ یہ نصیحت یوں تو اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت زبانِ حال سے بھی کرتی ہے لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام پیغمبر تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے بھی ان کو اس کی ہدایت فرمائی۔ اس کا ذکر زبور اور امثال دونوں میں بار بار آتا ہے۔ یہاں ’اٰلَ دَاوٗدَ‘ سے خطاب کے اندر حضرت سلیمان علیہ السلام، ان کے آل و اولاد اور ان کے تمام اتباع کے لیے یہ یاد دہانی ہے کہ خدا کی شکرگزاری میں اپنے باپ کے نقشِ قدم کی پیروی کرنا اس لیے کہ یہ تمام عظمت و حشمت تم نے انہی سے وراثت میں پائی ہے اور ان کو اللہ نے یہ سب کچھ ان کی شکرگزاری کے صلہ میں عطا فرمایا تھا۔

ایک نہایت اہم تنبیہ

وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ۔ یہ ایک مزید تنبیہ اور نہایت اہم تنبیہ ہے کہ شکر کی راہ کوئی آسان راہ نہیں ہے بلکہ نہایت کٹھن راہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں بخشتا بہتوں کو ہے لیکن ان کو پا کر ان کا حق ادا کرنے والے بہت تھوڑے نکلتے ہیں۔ زیادہ ایسے ہی نکلتے ہیں جو خدا کے باغی و نافرمان بن جاتے ہیں۔ اس سے حکمتِ دین کا یہ نکتہ واضح ہوا کہ صبر اور شکر میں سے زیادہ مشکل امتحان شکر کا امتحان ہے۔ حضرت مسیحؑ کے ارشادات سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ انھوں نے اسی حقیقت کو یوں واضح فرمایا

کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں داخل ہونا آسان ہے پر دولت مند خدا کی بادشاہی میں نہیں داخل ہو سکتا۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ ۖ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَن لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ (۱۴)

جنات کے پاس علمِ غیب کا کوئی ذریعہ نہیں ہے

اوپر کی آیات سے ان لوگوں کی پوری پوری تردید ہو گئی جو اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ حضرت سلیمانؑ کی ساری کارفرمائیاں نعوذ باللہ جنات کی رہینِ احسان تھیں۔ اب آخر میں یہ اشارہ بھی فرما دیا کہ جنات کے پاس غیب کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ وہ اس سے اسی طرح بے خبر ہیں جس طرح دوسری مخلوقات بے خبر ہیں۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے حضرت سلیمانؑ کی وفات کے واقعہ کا حوالہ دیا ہے کہ جس وقت حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات ہوئی وہ اپنے مسخر جنوں کے کام کی نگرانی کر رہے تھے لیکن جنات کو ان کی موت کی خبر نہیں ہوئی۔ وہ بدستور اپنی بیگار میں جتے رہے۔ بالآخر ایک طویل وقفہ کے بعد ان کو پتہ چل سکا کہ حضرت سلیمانؑ کی وفات ہو چکی ہے تب وہ ان کی غلامی سے رہائی حاصل کر سکے۔

واقعہ کی صورت

واقعہ کی صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ اپنے اہم کاموں کی نگرانی، خصوصاً جو جنات کے ہاتھوں انجام پاتے، بنفسِ نفیس فرماتے۔ چنانچہ وہ اپنی عصا کی ٹیک لگائے ہوئے کسی تعمیری کام کی نگرانی کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں ان کی موت کا وقت آگیا اور فرشتۂ اجل نے ان کی روح قبض کر لی لیکن وہ جس طرح عصا کے سہارے کھڑے تھے اسی طرح بدستور قائم رہے اور جنات اس ڈر سے اپنے کام میں لگے رہے کہ حضرت سلیمانؑ موجود ہیں۔ بالآخر ان پر ایک عرصہ گزر گیا اور اس اثنا میں دیمک نے عصا کو نیچے سے کھا لیا، جس کے بعد ان کا جسدِ مبارک زمین پر گرا۔ تب جنات کو یہ احساس ہوا کہ اگر ان کو غیب کا علم ہوتا تو وہ اتنی دیر تک اس بیگار کی ذلت میں گرفتار نہ رہتے۔

'دَابَّةُ الْأَرْضِ'

'دَابَّةُ الْأَرْضِ' کا ذکر یہاں جن قرائن کے ساتھ ہوا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد دیمک ہے۔ 'مِنسَأَة' عصا کو کہتے ہیں۔ یہ تصریح تو یہاں نہیں ہے کہ حضرت سلیمانؑ اس حالت میں کتنی دیر کھڑے رہے لیکن نہ اس طرح جسم کا قائم رہنا ذرا مستبعد ہے اور نہ دیمک کا اس طرح عصا کو کھا جانا ذرا مستبعد ہے۔ دیمک بڑی ظالم چیز ہے۔ اگر یہ کسی چیز کو لگ جائے تو بہت جلد اس کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے، عصا تو ایک معمولی چیز ہے بالخصوص ایسی جگہوں میں جہاں یہ زیادہ ہو۔ پھر یہاں تو معاملے کی نوعیت بھی بالکل مختلف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ حضرت سلیمانؑ کی موت اس طرح واقع ہو کہ لوگوں پر یہ واضح ہو جائے کہ حضرت سلیمانؑ جو ہوا اور جنات پر تصرف رکھتے تھے، وہ بھی اپنے تئیں مرگِ ناگہانی سے نہ بچا سکے اور جنات کے دماغ سے بھی یہ خبط نکل جائے کہ وہ غیب جانتے یا جان سکتے ہیں۔ ان حقائق کو واضح کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کو یہ شکل دی اور اللہ تعالیٰ جس کام کو کرنا چاہے وہ اس کو جس طرح چاہے کر سکتا ہے۔

جنات پر کشف حقیقت

'تَبَیَّنَتِ الْجِنُّ الایۃ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اشرار جن، غیب کی ٹوہ میں ہمیشہ رہے ہیں اور اس مقصد کے لیے وہ آسمانوں میں بھی، جیسا کہ سورۂ جن اور قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہے، استراقِ سمع کے لیے بیٹھتے رہے ہیں۔ اور اپنے دامِ فریب میں آئے ہوئے انسانوں پر انھوں نے یہ دھونس بھی جما رکھی تھی کہ ان کے پاس غیب کے اسرار سے واقف ہونے کے ذرائع موجود ہیں لیکن اس واقعہ نے ان کی آنکھیں کھول دیں اور ان پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ آسمان تو بہت دور ہے، انھیں تو اپنے سر پر کے اتنے بڑے واقعہ کی بھی خبر نہ ہو سکی جس کے باعث انھیں غلامی کے رسوا کن عذاب میں کچھ عرصہ مزید گرفتار رہنا پڑا۔

اس ٹکڑے سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی بیگار میں صرف شریر جنوں کو لگایا تھا اور ان کے علم تسخیر کا تعلق صرف انہی سے تھا۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ۬ؕ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ (۱۵)

ناشکروں کا کردار اور ان کا انجام

'سبا' کا ذکر سورۂ نمل کی آیت ۲۲ کے تحت گزر چکا ہے۔ جو علاقہ اب یمن کہلاتا ہے وہی پہلے سبا کا علاقہ تھا۔ یہ نہایت زرخیز و شاداب خطہ تھا۔ اس کی اصل شاہراہ کے دونوں جانب نہایت شاداب باغوں کا سلسلہ تھا جو پورے علاقہ پر پھیلا ہوا تھا لیکن اس کے باشندوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فضل کی قدر نہیں کی، جس کی پاداش میں اللہ نے ان پر ایک سیلاب بھیجا جس سے پورا ملک تباہ ہو کر رہ گیا۔ اوپر حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیہما السلام کا کردار شکرگزار بندوں کے کردار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اب یہ ناشکروں کا کردار اور ان کا انجام پیش کیا جا رہا ہے۔ سورۂ نحل کی آیات ۱۱۲-۱۱۳ میں بھی ان کی مثال سے قریش کو عبرت دلائی گئی ہے۔

سبا اور اہل سبا

'لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ'۔ 'سَبَا' سے مراد یہاں اہل سبا ہیں۔ اور 'مسکن' یہاں خطہ اور علاقہ کے مفہوم میں ہے۔ لفظ 'اٰیۃ' کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل سبا کے لیے ان کے علاقے میں خدا کی رحمت و ربوبیت اور اس کے فضل و انعام کی بہت بڑی نشانی موجود تھی لیکن انھوں نے اس کی قدر نہیں کی۔ اس سے ان کو جو سبق حاصل کرنا تھا وہ سبق انھوں نے حاصل نہیں کیا۔

'جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ'۔ یہ اس نشانی کی وضاحت ہے کہ ان کے دونوں جانب، دہنے اور بائیں باغوں کی دو قطاریں تھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علاقہ کے وسط سے ان کی مرکزی شاہراہ گزرتی تھی اور اس شاہراہ کے دونوں جانب باغوں کی قطاریں تھیں۔ 'جَنَّتٰن' یہاں دو باغوں کے مفہوم میں نہیں بلکہ باغوں کی دو قطاروں کے مفہوم میں ہے۔ مثنیٰ کے اس طریقِ استعمال کی مثالیں عربی میں موجود ہیں اور یہاں اس کا قرینہ واضح ہے۔

'كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ'۔ خدا کی اس عظیم نشانی سے جو درس حاصل ہوتا ہے

اور جو اہلِ سبا کو حاصل کرتا تھا یہ اس کا بیان ہے کہ یہ عظیم رحمت و رفاہیت اپنی زبانِ حال سے ان کو درس دے رہی ہے کہ اپنے رب کے اس عظیم خوانِ کرم سے بہرہ مند ہوں اور اس کے شکر گزار رہیں۔

نعمت کا حق منعم کی شکرگزاری ہے

'بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ' 'طیبۃ' یہاں زرخیز و شاداب کے معنی میں ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے ——— یہ اسی درس کی مزید توضیح ہے کہ اگر وہ کھلی آنکھوں سے اپنے ملک کو دیکھتے تو اس وسیع خوانِ کرم کو، جس پر اس فیاضی کے ساتھ ان کے لیے نعمتیں چنی گئی تھیں، دیکھ کر ان پر یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی کہ جس نے یہ خوانِ کرم بچھایا ہے وہ بڑا ہی غفار و ستار آقا ہے جس نے بلا کسی استحقاق کے، ان کی ناقدریوں اور ناشکریوں کے باوجود، ان کے لیے اپنی نعمتوں کے یہ انبار لگا دیے ہیں ——— یہ حقیقت اس کتاب میں ہم جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں کہ نعمت پا کر منعم کی شکرگزاری کا شعور انسانی فطرت کا ایک بدیہی تقاضا ہے۔ یہ چیز حیوانات کی جبلت میں بھی داخل ہے۔ اگر کوئی انسان اس شعور سے عاری ہے تو وہ حیوانات سے بھی بدتر ہے۔

فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّ اَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ (۱۶)

سدِ مآرب

'عَرِم' کے معنی بعض اہلِ لغت نے زوردار بارش کے لکھے ہیں اور بعض نے اس کو 'عَرِمَة' کی جمع بتایا ہے، جو تہ بہ تہ اکٹھا کیے ہوئے پتھروں کے لیے آتا ہے۔ پھر یہیں سے یہ اس سد یا بند کے لیے بھی استعمال ہونے لگا جو کسی وادی کے درمیان پانی کو روکنے کے لیے بنایا جاتا ہے۔ اقرب الموارد میں ہے 'مُسَنّاة تعترض به الوادی' (وہ بند جو وادی کے بیچ میں بنایا جائے) جس طرح ہمارے منگلا اور تربیلا ڈیم ہیں۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح کا ایک کئی میل لمبا چوڑا ڈیم اہلِ سبا کا بھی تھا جو ان کو سیلاب کے خطرات سے محفوظ بھی کیے ہوئے تھا اور آب پاشی کے لیے بھی بقدرِ ضرورت اس سے ان کو پانی حاصل ہوتا تھا۔ تاریخوں میں اس کا ذکر سدِ مآرب کے نام سے آتا ہے۔ 'مآرب' سبا کا دارالسلطنت تھا۔ یہ بند غالباً ۵۴۲ء میں ٹوٹا اور اس کے ٹوٹنے سے سارا ملک تباہ ہو گیا۔

ناشکری کا انجام

'فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ' یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ نعمتیں دیں تو ان کو پا کر وہ خدا کے شکرگزار ہونے کے بجائے طغیان و فساد میں مبتلا ہوئے۔ سورۂ نحل کی آیت ۱۱۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو انذار کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک رسول بھیجا لیکن انھوں نے اس کی پروا نہ کی بالآخر ان پر خدا کا عذاب اس شکل میں آیا کہ ایک عظیم سیلاب نے ان کے بند کو توڑ دیا جس سے ان کا سارا ملک تاراج ہو کر رہ گیا۔

'وَبَدَّلْنٰهُمْ الاٰیۃ' 'خمط' بدمزہ، کڑوے کسیلے پھلوں کو کہتے ہیں۔ یعنی اس سیلاب نے ان کے ملک کو اس طرح تلپٹ کر کے رکھ دیا کہ شاداب باغوں کی جگہ کڑوے کسیلے پھلوں کے کچھ درخت اور کچھ جھاؤ اور بیری کی جھاڑیاں رہ گئیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیلاب نے صرف ان کے باغ ہی ویران نہیں کیے

بلکہ ان کے پورے علاقے پر کسی ایسی مٹی یا ریت کی تہ جما دی جس نے بچے کھچے درختوں کے مزاج بھی بدل دیے اور پورا علاقہ صرف جنگلی جھاڑیوں ہی کے لیے موزوں رہ گیا۔

ذٰلِکَ جَزَیۡنٰہُمۡ بِمَا کَفَرُوۡا ؕ وَ ہَلۡ نُجٰزِیۡۤ اِلَّا الۡکَفُوۡرَ (۱۷)

'مجازات' کے معنی بدلہ دینے کے ہیں۔ بدلہ برا بھی ہوتا ہے اور اچھا بھی۔ اس وجہ سے اس کے صحیح مفہوم کا تعین موقع و محل سے ہوتا ہے۔ یہاں موقع برے بدلہ کا ہے اس وجہ سے یہاں یہ لفظ اسی معنی میں لیا جائے گا۔ فرمایا کہ ہم نے ان کو یہ سزا ان کے کفرانِ نعمت کی پاداش میں دی اور اس قسم کی سزائیں ہم ناشکروں کے سوا کسی اور کو نہیں دیتے۔

وَ جَعَلۡنَا بَیۡنَہُمۡ وَ بَیۡنَ الۡقُرَی الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡہَا قُرًی ظَاہِرَۃً وَّ قَدَّرۡنَا فِیۡہَا السَّیۡرَ ؕ سِیۡرُوۡا فِیۡہَا لَیَالِیَ وَ اَیَّامًا اٰمِنِیۡنَ (۱۸)

اہلِ سبا کی رفاہیت کی مزید تفصیل

'اَلۡقُرَی الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡہَا' سے ملک شام وغیرہ کی طرف اشارہ ہے جن کے ساتھ اہلِ سبا کے تجارتی تعلقات تھے۔ یہ ملک بہت زرخیز تھے اس وجہ سے ان کی صفت 'بٰرَکۡنَا فِیۡہَا' آئی ہے۔ زرخیز ممالک سے تجارتی تعلقات بجائے خود آمدنی اور رفاہیت کا ذریعہ ہوتے ہیں۔

'قُرًی ظَاہِرَۃً' سے مراد وہ شہر اور قصبات ہیں جو اس شاہراہ پر واقع تھے جس کے دونوں جانب باغوں کی قطاریں تھیں۔ یعنی ان بستیوں کے علاوہ جو اندرونِ ملک واقع تھیں موزوں فاصلوں سے اس شاہراہ پر بھی بستیاں آباد تھیں جو ان کے لیے منزلوں کا کام دیتی تھیں۔ وہ ان میں بے خوف و خطر ٹھہرتے، آرام کرتے اور پھر آگے کی منزل کے لیے سفر کرتے۔

'وَ قَدَّرۡنَا فِیۡہَا السَّیۡرَ' یعنی یہ بستیاں ایسے مناسب فاصلوں پر واقع تھیں کہ گویا قدرت نے خود اپنے اہتمام سے ان کے لیے منزلیں مقرر کر دی تھیں۔

'سِیۡرُوۡا فِیۡہَا لَیَالِیَ وَ اَیَّامًا اٰمِنِیۡنَ'۔ یہ ان آسائشوں کی زبانِ حال کی تعبیر ہے کہ قدرت نے یہ سارا اہتمام کر کے گویا ان کے لیے ہر منزل پر یہ کتبہ لگا دیا کہ تمہاری خاطر یہ اہتمام ہم نے اس لیے کیا ہے کہ تم راتوں میں بھی اور دنوں میں بھی بے خوف و خطر سفر کر سکو ـــــــ یہاں اتنی بات حذف ہے کہ 'اور اپنے اس رب کے شکر گزار رہو جس نے تمہارے لیے یہ سارا اہتمام کیا ہے' ـــــــ اس کو حذف کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہر انعام کا یہ فطری تقاضا ہے اور اوپر آیت ۱۵ میں اس کا بیان ہو چکا ہے۔ اس وجہ سے اس کو دہرانے کے بجائے بعد والی آیت میں ان کے اس رویہ کی طرف اشارہ فرما دیا جو انھوں نے اختیار کیا اور جس کے نتیجہ میں وہ ان تمام نعمتوں سے محروم ہوئے۔

اس زمانے کی عام گمراہی کا اصلی سبب

یہاں یہ حقیقت ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام آسائشوں اور رفاہیتوں کے اہتمام کو براہِ راست اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ یہ حقیقت نفس الامری کا بیان ہے کہ اس دنیا میں انسان کو جو فتوحات بھی حاصل

ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ کے فضل ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن انسان اپنی ناشکری کے باعث ہر چیز کو اپنی سعی و تدبیر کا کرشمہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس زمانے کی عام گمراہی کا اصل سبب انسان کی یہی بے بصیرتی ہے اور سائنس کی ایجادات نے اس غرور میں اتنا اضافہ کر دیا ہے کہ اب اللہ ہی اس کو دور کر سکتا ہے۔

فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۭ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۱۹)

زبانِ حال کی تعبیر

یہ ان کے زبانِ قال کی نہیں بلکہ زبانِ حال کی تعبیر ہے کہ انھوں نے یہ رفاہیتیں پا کر رویہ جو اختیار کیا اس سے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ ان آسائشوں کے حقدار نہیں ہیں بلکہ اس بات کے سزاوار ہیں کہ ان کی بستیاں ویران ہو جائیں، ان کی منزلیں کٹھن ہو جائیں اور ان کی یہ ساری رفاہیتیں ان سے چھین لی جائیں۔ زبانِ حال کی تعبیرات کی مثالوں کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی نظیریں پیچھے گزر چکی ہیں اور یہ حقیقت بھی ہم واضح کر چکے ہیں کہ اصل شہادت زبانِ حال ہی کی ہوتی ہے نہ کہ زبانِ قول کی۔ یہود کا قول 'سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا' بھی ان کے حال ہی کی تعبیر ہے۔

'وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ'، یعنی انھوں نے خدا کی ناشکری و نافرمانی کی اور اس طرح خود اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھائے کہ خدا کے قہر و غضب کو دعوت دی۔ خدا کا انھوں نے کچھ نہیں بگاڑا۔

'فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ'۔ یہ ان کی ناشکری کا انجام بیان ہوا ہے کہ بالآخر وہ اس طرح پامال ہوئے کہ حاضر کے صفحہ سے مٹ کر صرف ماضی کی ایک داستانِ پارینہ بن کے رہ گئے۔ 'وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ'، یعنی جو سیلاب کی آفت سے بچے بھی وہ بھی ملک کی معیشت برباد ہو جانے کے باعث بالکل پراگندہ ہو گئے۔ کوئی کہیں گیا کوئی کہیں۔

ایک قابلِ غور نکتہ

'اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ'۔ اوپر آیت ۱۷ میں جس طرح اس سرگزشت کے اصل سبق کی طرف 'وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ' سے توجہ دلائی ہے اسی طرح یہاں اسی حقیقت کی طرف 'لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ' کے الفاظ سے توجہ دلائی ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اہلِ سبا کی سرگزشت یہاں دو مرتبہ دہرائی گئی ہے اور دونوں مرتبہ ان کے عبرت انگیز انجام کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ پہلے ان کے علاقے کی زرخیزی و شادابی کے ذکر کے بعد ان کی ناشکری اور اس کے انجام کی طرف اشارہ فرمایا پھر ان کی تمدنی و تجارتی ترقیوں کے ذکر کے بعد ان کے کفرانِ نعمت کے نتیجہ میں ان کے انتشار کی طرف۔ یہ اسلوبِ بیان اس لیے اختیار فرمایا گیا ہے کہ اصل مقصود جس کے لیے یہ سرگزشت سنائی جا رہی ہے نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ قرآن میں اس اسلوبِ بیان کی متعدد نہایت بلیغ مثالیں موجود ہیں۔

'صبر' اور 'شکر' کی نشانیاں

'صبر' اور 'شکر' دونوں توام ہیں۔ یہ دونوں بیک وقت مطلوب ہیں۔ جس کے اندر صبر نہ ہو وہ شکر کا حق ادا نہیں کر سکتا اور جس کے اندر شکر نہ ہو وہ صبر نہیں کر سکتا اور اس دنیا کے دارالامتحان میں ہر قدم پر بندے کا

امتحان ان دونوں ہی چیزوں میں ہوتا رہتا ہے اور اسی امتحان پر اس کی اُخروی کامیابی و ناکامی کا انحصار ہے۔ فرمایا کہ اس سرگزشت میں صبر و شکر کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ مثلاً

- اس دنیا میں جو نعمتیں بھی حاصل ہوتی ہیں وہ اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ ہوتی ہیں اس وجہ سے ان کو پا کر غرور میں مبتلا ہونے کے بجائے انسان کو اپنے رب کا شکرگزار اور اس کا فرمانبردار رہنا چاہیے۔
- جو نعمتیں بھی ملتی ہیں وہ کسی استحقاق کی بنا پر نہیں بلکہ امتحان کے طور پر ملتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو دے کر دیکھتا ہے کہ اس کے بندے اس کے شکرگزار رہتے ہیں یا ناشکری کرتے ہیں۔
- اس امتحان میں جو قومیں ناکام ہو جاتی ہیں وہ قومی حیثیت سے اس دنیا میں اس کا انجام دیکھ لیتی ہیں۔ آخرت میں ہر شخص کے سامنے انفرادی حیثیت سے اس کا انجام آئے گا۔

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ إِلَّا فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ (۲۰)

ناشکرے لوگ ابلیس کی توقعات پوری کرتے ہیں

یہ ابلیس کے اس گمان کی طرف اشارہ ہے جس کا اظہار اس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے اس وقت کیا تھا جب آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا اس کو حکم دیا گیا اور اس نے اس کی تعمیل سے انکار کیا۔ اس وقت اس نے یہ کہا تھا کہ میں اولادِ آدم پر اس طرح گھیرے ڈالوں گا کہ ان کی اکثریت تیری جگہ میری پیروی کرے گی ﴿وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ﴾ (الاعراف: ۱۷) (اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکرگزار نہیں پائے گا)۔ یہاں اس کا حوالہ دینے سے مقصود اس کے انجام کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ جب انھوں نے اپنے بارے میں ابلیس کے گمان کو سچا ثابت کر دیا تو لازماً ان کے سامنے اس کا انجام بھی آیا اور آئے گا یعنی اس دنیا میں یہ سیلاب کے عذاب سے دوچار ہوئے اور آخرت میں یہ جہنم کے عذاب میں جھونک دیے جائیں گے۔ قرآن میں جہاں ابلیس کی مذکورہ بالا دھمکی کا ذکر ہے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ جواب بھی مذکور ہے کہ 'جو تیری پیروی کریں گے خواہ جنوں میں سے ہوں یا انسانوں میں سے، میں ان سب کو جہنم میں بھر دوں گا'۔

'إِلَّا فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ' پیچھے سورۂ نحل کی آیت ۱۱۳ کے حوالہ سے ہم ذکر کر آئے ہیں کہ اہلِ سبا کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک رسول بھی بھیجا تھا۔ اس آیت سے واضح ہوا کہ ان کی اکثریت نے اس رسول کی تکذیب کر دی۔ صرف تھوڑے سے لوگ ان پر ایمان لائے اور وہی اس عذاب سے محفوظ رہے جو ان کی قوم پر آیا۔

وَمَا كَانَ لَهُ عَلَيْهِم مِّن سُلْطَانٍ إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يُؤْمِنُ بِالْآخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِي شَكٍّ ۗ وَرَبُّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ (۲۱)

ایک شبہ کا ازالہ

یہ ایک دفعِ دخلِ مقدر یعنی بر سرِ موقع ایک شبہ کا ازالہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ مبتلا رہے کہ شیطان کو لوگوں پر کوئی اختیار حاصل ہے کہ وہ جس کو چاہے گمراہ کر دے۔ فرمایا کہ شیطان کو اس طرح کا کوئی اختیار اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر نہیں دیا ہے۔ اس کو صرف اس بات کی مہلت ملی ہے کہ وہ لوگوں کو بدی کے راستہ کی دعوت دے سکتا ہے اور یہ مہلت اس کو اس لیے دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کا امتحان کرنا

چاہتا ہے کہ کون آخرت پر ایسا مضبوط ایمان رکھتا ہے کہ شیطان کی ترغیبات کے باوجود جادۂ حق پر استوار رہتا ہے اور کون شک میں مبتلا ہے کہ شیطان کے بہکانے سے اس کی راہ پر لگ جاتا ہے۔ 'لِنَعْلَمَ' سے پہلے کوئی فعل 'انظرناہ' یا 'امھلناہ' کے معنی میں محذوف ہے اور اس قسم کے حذف کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

'وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ' یعنی اللہ تعالیٰ اس رزم گاہِ امتحان میں شیطان اور انسان کو اتار کر خود الگ تھلگ ہو کر نہیں بیٹھ رہا ہے بلکہ ہر چیز کی نگرانی کر رہا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ شیطان اپنے حدود سے متجاوز ہو سکے اور ممکن نہیں ہے کہ انسان اپنی کسی دادرسی سے محروم رہ جائے۔ اگر انسان اپنا فرض اپنے امکان کی حد تک ادا کرنے کی کوشش کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی اس دنیا میں بھی مدد فرمائے گا اور آخرت میں بھی اس کی ہر سعی کا بھرپور صلہ دے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیطان اور اس کی ذریات کے غلبہ سے مایوس ہو کر ادائے فرض سے دستکش ہونا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو مہلت تو ضرور دی ہے لیکن اپنی دنیا اس کے حوالے نہیں کر دی ہے۔ بلکہ ہر چیز کی نگرانی وہ خود فرما رہا ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۲۲-۲۷

اوپر کی آیات میں یہ حقیقت واضح فرمائی کہ تمام رحمت و نعمت اللہ ہی کے اختیار میں ہے اس وجہ سے شکر گزاری اور بندگی کا حقیقی سزاوار وہی ہے۔ اب آگے مشرکین کو چیلنج کیا ہے کہ تم اپنے جن معبودوں کو خدا کا شریک بنائے بیٹھے اور ان کی سفارش کی امید پر خدا کی پکڑ سے بے فکر ہو ان کے حق میں کوئی دلیل اپنے پاس رکھتے ہو تو اس کو پیش کرو۔ ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان کرایا ہے کہ اگر تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، محض ضد اور مکابرت کی وجہ سے اپنی بات پر اڑے ہوئے ہو تو تمہارے ساتھ بحث میں ہم اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے بلکہ معاملہ اللہ کے حوالہ کرتے ہیں۔ وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ (آیات)
ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ (۲۲-۲۷)
وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿۲۲﴾ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا
لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ
رَبُّكُمْ ۭ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۲۳﴾ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ

اَلسَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ
ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قُلْ لَّا تُسْـَٔــلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْــَٔـلُ عَمَّا
تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ۭ وَهُوَ
الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۶﴾ قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَاۗءَ كَلَّا ۭ
بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾

ترجمۂ آیات ۲۲-۲۷

بلاؤ ان کو جن کو تم نے خدا کے سوا معبود گمان کر رکھا ہے! وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کوئی اختیار رکھتے ہیں اور نہ زمین میں۔ اور نہ ان دونوں میں ان کا کوئی ساجھا ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار ہے۔ اور اس کے ہاں کوئی شفاعت کارگر نہیں ہوگی مگر اس کے لیے جس کے لیے وہ اجازت دے۔ یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے دہشت دور ہوگی وہ پوچھیں گے کہ تمھارے رب نے کیا حکم فرمایا؟ وہ جواب دیں گے کہ بالکل حق ارشاد ہوا! اور وہ نہایت عالی مقام اور عظیم ہے! ۲۳

ان سے پوچھو، تم کو آسمانوں اور زمین سے کون رزق بہم پہنچاتا ہے؟ کہو، اللہ! اور ہم میں اور تم میں سے کوئی ایک ہدایت پر ہے یا کھلی ہوئی گمراہی میں! کہہ دو، نہ ہم نے جو جرم کیے ان کی بابت تم سے پرسش ہونی ہے اور نہ تمھارے اعمال سے متعلق ہم سے سوال ہوگا۔ کہہ دو، ہمارا رب ہم سب کو جمع کرے گا پھر ہمارے درمیان بالکل انصاف کے مطابق فیصلہ فرمائے گا اور وہی فیصلہ فرمانے والا اور علم والا ہے۔ ۲۴-۲۶

کہو، ذرا مجھے ان کو دکھاؤ تو جن کو تم نے شریک بنا کر اس کے ساتھ جوڑ رکھا ہے! ہرگز نہیں! بلکہ وہ اللہ عزیز و حکیم ہے! ۲۷

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ (۲۲)

مشرکین کو کھلا ہوا چیلنج

یہ مشرکین کو کھلا ہوا چیلنج ہے کہ جن کو تم نے خدا کا شریک گمان کر رکھا ہے ذرا ان کو بلاؤ، ہم بھی ان کی صورت دیکھیں وہ کیسے اور کہاں ہیں! اس قسم کا چیلنج مخاطب کو اس وقت دیا جاتا ہے جب اس کا دعویٰ بالکل ہی بے سروپا ہو اور ہر پہلو سے اس پر حجت تمام کی جا چکی ہو۔ یہی اندازِ خطاب آگے آیت ۲۷ میں ہے: 'قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ۚ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ' (ان سے کہو، ذرا مجھے ان کو دکھاؤ جن کو تم نے شریک بنا کر خدا کے ساتھ جوڑ رکھا ہے! ہرگز نہیں! بلکہ وہ اللہ عزیز و حکیم ہے)۔

'لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ'۔ یہ اسی چیلنج کی مزید وضاحت ہے کہ تم نے ان کو شریکِ خدا گمان کر رکھا ہے حالانکہ نہ وہ آسمانوں میں ذرہ برابر کوئی اختیار رکھتے نہ زمین میں۔ یہی بات اسی سورہ کی پہلی ہی آیت میں اس طرح واضح فرمائی گئی ہے 'لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ' (اسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے)۔

'وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ' یعنی ان دونوں کی خلقت میں ان کا کوئی بھی ساجھا نہیں ہے۔ دوسرے مقام میں فرمایا ہے: 'مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ' (الکہف ۵۱) (میں نے آسمانوں اور زمین کی خلقت کے وقت ان میں سے کسی کو نہیں بلایا کہ ذرہ برابر وہ میرا ہاتھ بٹائیں)۔

'وَمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ' یعنی زمین و آسمان کے انتظام و انصرام میں بھی خدا نے ان میں سے کسی کو اپنا معین و مددگار نہیں بنایا ہے بلکہ اپنی ساری خدائی کا انتظام تنہا وہ خود ہی سنبھالے ہوئے ہے اور یہ چیز ذرا بھی اس پر بار نہیں ہے۔ یہ مشرکین کے اس وہم کی تردید ہے کہ زمین چونکہ خدا کی مملکت کا نہایت دور دراز علاقہ ہے اس وجہ سے اس کا انتظام اس نے اپنے دوسرے شریکوں کے سپرد کر رکھا ہے۔

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۚ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (۲۳)

مشرکین کے مزعومہ تصورِ شفاعت کی نفی

حق و اختیار کی نفی کے بعد یہ ان کے مزعومہ تصورِ شفاعت کی بھی نفی کر دی۔ فرمایا کہ اگر ان کی شفاعت کی امید پر نچنت بیٹھے ہو تو یاد رکھو کہ خدا کے حضور میں کسی کی شفاعت کسی کے لیے نافع نہیں ہوگی مگر اس کے لیے جس کے لیے خدا اجازت دے یعنی اول تو خدا کے اذن کے بدون کوئی کسی کی شفاعت کی جرأت

ہی نہیں کرے گا، پھر اجازت کے بعد بھی وہ شفاعت صرف اسی کے لیے کرے گا جس کے لیے اس کو اجازت مرحمت ہوئی ہوگی۔ کسی ایسے کے بارے میں وہ زبان نہیں کھول سکے گا جس کے لیے اس کو اجازت نہ ملی ہو۔ دوسرے مقامات میں یہ وضاحت بھی فرما دی گئی ہے کہ وہ وہی بات کہے گا جو حق ہوگی۔ خدائے علام الغیوب کے آگے نہ کوئی کسی باطل کو حق بنا سکے گا اور نہ کوئی بات حق کے خلاف زبان سے نکال سکے گا۔

یہ مشرکین کے اس گمان کی تردید ہے جو وہ اپنے معبود فرشتوں سے متعلق رکھتے تھے کہ وہ خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں، اس وجہ سے وہ اپنے باپ سے جو بات چاہیں منوا سکتی ہیں اور خدا کو ان کی ناز برداری میں ان کی ہر بات ماننی پڑتی ہے۔

حَتّٰٓی اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوا الْحَقَّ ؛

'تفزیع' کے اصل معنی ڈرا دینے اور دہشت زدہ کر دینے کے ہیں لیکن جب اس کا صلہ 'عن' کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی دہشت دور کر دینے کے ہو جاتے ہیں۔ 'فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ' کے معنی ہوں گے 'جب ان کے دلوں سے دہشت دور کر دی جائے گی'۔

قیامت کے روز فرشتوں کا حال

یہ حال بیان ہوا ہے قیامت کے دن فرشتوں کا کہ اس دن آگے بڑھ کر ناز و تدلل کے ساتھ کسی کی شفاعت کرنا تو الگ رہا تمام خلق کی طرح ان پر بھی اس دن ایسا ہول طاری ہوگا کہ انھیں کچھ خبر نہیں ہوگی کہ لوگوں کے باب میں رب العزت کی بارگاہ سے کیا حکم صادر ہوا۔ جب ان کی دہشت دور ہوگی تو وہ دوسروں سے سوال کریں گے کہ تمھارے رب کی طرف سے کیا حکم صادر ہوا؟ وہ جواب دیں گے کہ بالکل بجا حکم صادر ہوا ہے۔

فرشتوں سے متعلق مشرکین کے اسی تصور کی تردید کرتے ہوئے سورۂ زمر میں یوں ارشاد فرمایا ہے:

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَ الْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۝ (الزمر ۳۹: ۶۷-۶۸)	اور انھوں نے اللہ کی صحیح شان نہیں پہچانی! اور وہ زمین کو قیامت کے دن مٹھی میں لے لے گا اور آسمان کی بساط بھی اس کے ہاتھ میں لپیٹی ہوئی ہوگی۔ وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ اور صور پھونکا جائے گا تو جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے، مگر جن کو اللہ محفوظ رکھنا چاہے۔ پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو سب اٹھ کھڑے ہوں گے تاکتے ہوئے۔

یہ باتیں احوالِ قیامت سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ ان کا صحیح تصور اس دنیا میں ممکن نہیں ہے لیکن یہ دونوں

آیتیں ایک ہی موقع و محل کی ہیں اس وجہ سے اگر آیت زیرِ بحث کا مفہوم سورۂ زمر کی مذکورہ بالا آیت کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یہ بات نکلتی ہے کہ جب پہلی دفعہ صور پھونکا جائے گا تو آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوقات بے ہوش ہو کر گر پڑیں گی۔ صرف وہی لوگ اس سے محفوظ رہ سکیں گے جن کو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ انہی لوگوں کا ذکر دوسرے مقام میں یوں آیا ہے۔ ﴿لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ﴾ (الانبیاء: ۱۰۳) (ان کو سب سے بڑے ہول کا غم لاحق نہیں ہوگا) پھر جب دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو سب لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے اور حیرت و دہشت کے ساتھ دیکھیں گے کہ یہ کیا ہو گیا اور کیا ہونے والا ہے! معلوم ہوتا ہے اسی مرحلے میں فرشتے وہ سوال کریں گے جو 'مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ' کے الفاظ سے یہاں مذکور ہے۔ اس سوال سے ان کی سراسیمگی اور دہشت زدگی کا اظہار ہو رہا ہے کہ ناز و اعتماد کے ساتھ آگے بڑھ کر کسی کی سفارش کرنا تو درکنار صورتِ حال ایسی ہوگی کہ خود ان کے اپنے اوسان بجا نہیں رہیں گے۔ وہ دوسروں سے پوچھیں گے کہ بارگاہِ الٰہی سے کیا حکم صادر ہوا ہے؟ دوسرے جواب میں صرف یہ کہیں گے کہ جو حکم ہوا ہے وہ بالکل حق ہے۔ 'الْحَقَّ' فعل محذوف سے منصوب ہے۔ یہ جواب ان لوگوں کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے جن کے معاملات کا اس دن فیصلہ ہوگا اس لیے کہ اس دن حق اس طرح واضح ہو جائے گا کہ کوئی بھی یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکے گا کہ اس کے ساتھ کوئی ناانصافی ہوئی ہے اور امکان اس کا بھی ہے کہ یہ جواب ان لوگوں کی طرف سے ہو جو اس دن کے ہول سے محفوظ رکھے جائیں گے اور جن کی طرف سورۂ زمر کی مذکورہ بالا آیت میں 'إِلَّا مَنْ شَاءَ اللَّهُ' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اگر یہ جواب ان لوگوں کی طرف سے مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس دن اکثریت کا حال تو یہ ہوگا کہ ان کو خود اپنی پڑی ہوگی وہ دوسروں کی سفارش کیا کریں گے اور جو اس دن کے ہول سے امان میں رکھے جائیں گے ان کا حال یہ ہوگا کہ وہ پکاریں گے کہ ربِّ عادل و کریم نے جو فیصلہ فرمایا ہے وہ بالکل حق فرمایا ہے ـــــ مطلب یہ ہے کہ جب اصل حقیقتِ حال یہ ہے تو وہ کون لوگ ہیں جن کی شفاعت پر مشرکین تکیہ کیے ہوئے ہیں!

'وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ' یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی ہی بلند و ارفع اور بڑی باعظمت و باجبروت ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے آگے اس کے اذن کے بغیر زبان کھول سکے اور نہ کسی کی یہ شان ہے کہ اس تک اس کی رسائی ہو سکے۔

فرشتوں میں سب سے زیادہ عالی مقام حضرت جبریل امین ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ تک رسائی کے معاملے میں ان کی بے بسی کا بھی یہ حال ہے کہ

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلّی بسوزد پرم

اس مسئلہ پر مزید بحث ان شاء اللہ اگلی سورہ میں آئے گی۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۲۴)

ایک مسلّم حقیقت

یعنی ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین سے کون تم کو روزی دیتا ہے؟ کون آسمانوں سے پانی برساتا، سورج چمکاتا اور موسمی تغیرات پیدا کرتا ہے اور کون زمین سے بیجوں کو اگاتا، سبزوں کو نشو و نما دیتا اور فصلوں کو بار آور کرتا ہے؟

'قُلِ اللّٰهُ' فرمایا کہ ان کو بتا دو کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کرتا ہے اور آسمانوں اور زمین کی یہ سازگاری اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ ان دونوں کے اندر ایک ہی خدائے قادر و قیوم کا ارادہ کارفرما ہے۔

یہاں سوال کرنے کے بعد اس کا جواب بھی خود ہی دے دیا ہے۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ اس جواب سے مخاطب کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ اہلِ عرب کے عقائد سے متعلق یہ بات ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں کہ وہ اپنی دیویوں دیوتاؤں میں سے کسی کو خالق یا رازق نہیں مانتے تھے بلکہ صرف سفارشی اور ذریعۂ تقرب مانتے تھے۔ قرآن میں یہ تصریح موجود ہے کہ اگر ان سے پوچھو کہ تم کو آسمانوں اور زمین سے کون روزی دیتا ہے تو جھٹ جواب دیں گے کہ اللہ! چونکہ یہ بات مخاطب کو تسلیم تھی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وہی مسلّم حقیقت یہاں ان کے سامنے رکھ دی ہے۔

ضدی مخاطب سے موادعت کا اعلان

'وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ' مطلب یہ ہے کہ اسی مسلّم حقیقت پر ہماری دعوت کی بنیاد ہے۔ اگر تم اس پر ہم سے جھگڑ رہے ہو تو مزید کسی بحث و جدال کی ضرورت نہیں ہے۔ یا تو ہم ہدایت پر ہیں اور تم کھلی ہوئی گمراہی میں ہو یا تم ہدایت پر ہو اور ہم ضلالت پر ہوں گے ـــ مطلب یہ ہے کہ جب تم ضدم ضدا میں اس حد تک دھاندلی پر اتر آئے ہو کہ ایک ہی سانس میں ایک حقیقت کو مانتے ہو، پھر اسی کو جھٹلاتے ہو تو تم سے مزید بحث جاری رکھنا بے سود ہے۔ اب تمہارا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ وہی فیصلہ فرمائے گا کہ کون ہدایت پر ہے اور کون ضلالت پر! ہمارے نزدیک یہ ٹکڑا موادعت کے مفہوم میں ہے نہ کہ ملاطفت کے مفہوم میں، جیسا کہ عام طور لوگوں نے سمجھا ہے۔

قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۲۵)

یہ وہی قطع حجت کا مضمون ہے جو اوپر والی آیت میں ہے، دوسرے الفاظ میں ہے۔ فرمایا کہ اگر تمہارے نزدیک ہم تمہارے معبودوں اور تمہارے آبائی رسوم کی مخالفت کے مجرم ہیں تو عند اللہ اس جرم کی مسئولیت ہمارے ہی اوپر ہے، تمہارے اوپر نہیں ہے۔ اسی طرح تم جو کچھ کر رہے ہو اس کی پرسش ہم سے نہیں ہونی ہے، تمہی سے ہونی ہے۔ ہمارے اوپر حق کو پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی، یہ فرض ہم نے ادا کر دیا۔ اب مزید بحث و جدال سے کچھ حاصل نہیں۔ تم اپنی راہ چلو، ہم اپنی راہ چلتے ہیں۔ کل کو اللہ تعالیٰ کے حضور فیصلہ ہو جائے گا کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔ یہی مضمون سورۂ شوریٰ کی آیت ذیل میں

یوں آیا ہے:

لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (۱۵)

ہمارے ساتھ ہمارے اعمال ہوں گے اور تمھارے ساتھ تمھارے اعمال، اب ہمارے اور تمھارے درمیان کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔

یہی قطعِ بحث کا مضمون سورۂ کافرون میں ہے 'لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ' (۶) (تمھارے لیے تمھارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین) قرآن مجید میں یہ مضمون، مختلف اسلوبوں سے، جگہ جگہ آیا ہے اور اس کا ایک خاص محل ہے۔ وہ یہ کہ جب مخاطب نے اپنی ضد اور مکابرت سے بالکل واضح حقائق کو جھٹلا دینے کی کوشش کی ہے تو اس سے یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اب بحث و مناظرہ سے کچھ حاصل نہیں، تم اپنا کام کرو، ہم اپنا کام کرتے ہیں۔ اس طرح کی آیات کو عام طور پر لوگوں نے مخاطب کے ساتھ اظہارِ رواداری کے مفہوم میں لیا ہے لیکن یہ اظہارِ رواداری کے مفہوم میں نہیں بلکہ اظہارِ بیزاری کے مفہوم میں ہیں۔ سیاق و سباق پر نگاہ نہ رکھنے کے سبب سے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی۔

قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ۚ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيمُ (۲۶)

یعنی ان سے کہہ دو کہ اگر یہاں تم ہماری بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہو تو نہ مانو، ایک ایسا دن آنے والا ہے جس میں ہمارا رب ہم کو اور تم کو، دونوں کو، جمع کرے گا اور پھر بالکل ٹھیک ٹھیک فیصلہ فرمائے گا کہ کون حق پر تھا اور کون باطل پر۔ وہ بہت بڑا فیصلہ کرنے والا ہے۔ اس کے فیصلہ کے خلاف کوئی دھاندلی مچانا کسی کے بس میں نہ ہوگا اور وہ ہر چیز کا پورا پورا علم رکھنے والا ہے۔ کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے۔

قُلْ أَرُونِيَ الَّذِينَ أَلْحَقْتُمْ بِهِ شُرَكَاءَ ۖ كَلَّا ۚ بَلْ هُوَ اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۲۷)

ایک طنزیہ سوال اور اس کا جواب

وہی مضمون جو اس مجموعۂ آیات کی پہلی آیت میں آیا ہے آخر میں دوسرے اسلوب سے پھر ارشاد ہوا ہے۔ اس کا انداز طنز و تحقیر اور تہدید و وعید کا ہے۔ فرمایا کہ ان سے کہو کہ ذرا مجھے ان کو دکھاؤ تو سہی جن کو تم نے شریکوں کی حیثیت سے خدا کے ساتھ چپکا رکھا ہے! آخر وہ کون اور کہاں ہیں جو ایسے عالی مقام ہیں کہ وہ خدا کی خدائی میں ساجھی بنا دیے گئے ہیں!

'كَلَّا بَلْ هُوَ اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ' سوال کے بعد خود ہی اس کا جواب دے دیا کہ ہرگز نہیں! کسی کا بھی یہ درجہ و مرتبہ نہیں ہے کہ اس کو خدا کا شریک قرار دیا جا سکے۔ اس کے بعد اس نفی کی دلیل اللہ تعالیٰ کی مسلّمہ صفات سے دی ہے۔ فرمایا کہ وہ 'عزیز' و 'حکیم' ہے۔ 'عزیز' یعنی سب کی رسائی سے بالاتر اور ہر چیز پر غالب و مقتدر۔ 'حکیم' یعنی اس کا ہر فعل غایت و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ ان صفات کا ذکر حصر کے اسلوب میں فرمایا ہے یعنی وہ ان صفات سے کمال درجہ متصف ہے اور جب وہ ان سے کمال درجہ متصف ہے تو ان کے ساتھ شرک کا کوئی جوڑ نہیں ہے اس لیے کہ اگر کسی کو اس کا شریک

اس پہلو سے مانا جائے کہ اس کائنات کے خلق و تدبیر میں خدا اس کا محتاج ہے تو یہ اس کے عزیز ہونے کی نفی ہے اور اگر اس پہلو سے مانا جائے کہ کوئی اپنی رسائی و تقرب سے اس کے بے لاگ عدل پر اثر انداز ہو سکتا ہے تو یہ اس کے حکیم ہونے کی نفی ہوئی۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ مشرکین کے شرک میں اصلی عامل کی حیثیت انہی دونوں غلط فہمیوں کو حاصل تھی۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی ان دونوں صفتوں کا حوالہ دے کر ان دونوں غلط فہمیوں کی بنیاد ڈھا دی۔

۶۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۲۸-۳۹

آگے کی آیات میں مخالفین کے ان مطالبات و اعتراضات سے تعرض فرمایا ہے جو وہ قرآن کی دعوت اور اس کے انذار کی تکذیب کے لیے پیش کر رہے تھے۔ اعتراضات و مطالبات کے جواب بھی دیے ہیں اور اس انجام کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے جس سے وہ لوگ لازماً دوچار ہوں گے جو ان لاطائل اعتراضات و شبہات کی آڑ لے کر حقیقت کو جھٹلائیں گے ——— آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۸-۳۹

وَمَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَّنَذِيرًا وَّلٰكِنَّ أَكْثَرَ
النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۲۸﴾ وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ ﴿۲۹﴾
قُلْ لَّكُمْ مِّيعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُونَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُونَ ﴿۳۰﴾
وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ
وَلَوْ تَرٰى إِذِ الظّٰلِمُونَ مَوْقُوفُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ
إِلٰى بَعْضِ الْقَوْلَ ۚ يَقُولُ الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا
لَوْلَآ أَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ ﴿۳۱﴾ قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا
لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوٓا أَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ إِذْ
جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِينَ ﴿۳۲﴾ وَقَالَ الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ
اسْتَكْبَرُوا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِذْ تَأْمُرُونَنَآ أَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ
وَنَجْعَلَ لَهٗٓ أَنْدَادًا ۚ وَأَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ

وَجَعَلْنَا الْأَغْلٰلَ فِيْٓ أَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٣٣﴾ وَمَآ أَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ إِلَّا قَالَ
مُتْرَفُوْهَآ ۙ إِنَّا بِمَآ أُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿٣٤﴾ وَقَالُوْا نَحْنُ أَكْثَرُ
أَمْوَالًا وَّأَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿٣٥﴾ قُلْ إِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ
الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٦﴾
وَمَآ أَمْوَالُكُمْ وَلَآ أَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى إِلَّا مَنْ
اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۡ فَأُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا
وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ﴿٣٧﴾ وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ
أُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿٣٨﴾ قُلْ إِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ
لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ وَمَآ أَنْفَقْتُمْ مِّنْ
شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿٣٩﴾

ترجمۂ آیات ۲۸-۳۹

اور ہم نے تو تم کو سب لوگوں کے واسطے بس بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جان رہے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ دھمکی کب ظاہر ہوگی، اگر تم لوگ سچے ہو! ان کو بتا دو کہ تمھارے لیے ایک خاص دن کی میعاد مقرر ہے جس سے نہ ذرا پیچھے ہٹو گے اور نہ آگے بڑھو گے۔ ۲۸-۳۰

اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں کہ نہ تو ہم اس قرآن پر ایمان لانے کے اور نہ اس چیز ہی پر جس کی وہ آگے کو خبر دے رہا ہے اور اگر تم اس وقت کو دیکھ پاتے جب کہ یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے کیے جائیں گے! ان کے آپس میں تو تکرار ہو رہی ہوگی۔ جو لوگ دبا کے رکھے گئے وہ ان لوگوں سے جنھوں نے تکبر کیا، کہیں گے کہ اگر تم لوگ نہ ہوتے تو ہم ضرور

ایمان لانے والوں میں سے ہوتے۔ وہ لوگ جو بڑے بنے ان لوگوں کو جو دبا کے رکھے گئے، جواب دیں گے کہ کیا ہم نے تم کو ہدایت سے روکا جب کہ وہ تمہارے پاس آچکی تھی! بلکہ تم خود ہی مجرم ہو۔ اور دبے ہوئے لوگ متکبرین سے کہیں گے، بلکہ تمہاری رات دن کی سازشیں تھیں (جو قبول حق میں مانع ہوئیں) جب کہ تم ہمیں سمجھاتے تھے کہ ہم اللہ کا کفر کریں اور اس کے شریک ٹھہرائیں۔ اور وہ دلوں میں نادم ہوں گے جب دیکھیں گے عذاب کو۔ اور ہم کافروں کی گردنوں میں طوق ڈالیں گے۔ یہ وہی بدلہ میں پائیں گے جو وہ کرتے رہے تھے۔ ۳۱-۳۳

اور ہم نے جس بستی میں بھی کوئی نذیر بھیجا تو اس کے اغنیاء نے یہی کہا کہ ہم تو اس پیغام کے منکر ہیں جو دے کر تم بھیجے گئے ہو۔ اور انھوں نے کہا کہ ہم تو تم سے مال و اولاد میں بڑھ کر ہیں اور ہم کبھی مبتلائے عذاب ہونے والے نہیں ہیں۔ ان سے کہہ دو، میرا رب ہی ہے جو رزق کشادہ کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ اور تمہارے مال اور تمہاری اولاد وہ چیز نہیں ہے جو تم کو ہمارا مقرب بنا دینے والی ہو۔ البتہ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے وہ لوگ ہیں کہ ان کے لیے ان کے اعمال کا مضاعف صلہ ہوگا اور وہ بالا خانوں میں چین سے براجمان ہوں گے۔ ۳۴-۳۷

اور جو زک دینے کے لیے ہماری آیات کے ابطال کی راہ میں سرگرم ہیں وہ لوگ عذاب میں داخل کیے جائیں گے۔ ۳۸

کہہ دو، میرا رب ہی ہے جو رزق کو کشادہ کرتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے اس کے لیے (اگر چاہتا ہے) اور جو کوئی چیز بھی تم خرچ

کروگے تو وہ اس کا بدلہ دے گا اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔ ۳۹

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۲۸)

رسول کی ذمہ داری صرف انذار اور بشارت ہے

یہ اظہارِ افسوس ہے ان لوگوں کی حالت پر جو قرآن کی دعوتِ توحید اور اس کے انذار عذاب و قیامت کی تکذیب کے لیے عذاب کا مطالبہ کرتے تھے تاکہ اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کر سکیں۔ فرمایا کہ ہم نے تم کو عذاب لانے والا نہیں بلکہ لوگوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے کہ تم ان لوگوں کو نجات اور رحمت کی بشارت دے دو جو تمھاری دعوت پر ایمان لا کر ایمان و عمل صالح کی زندگی اختیار کر لیں گے۔ اور ان لوگوں کو خدا کے اس قہر و غضب سے آگاہ کر دو جس سے تمھاری تکذیب کی صورت میں ان کو لازماً سابقہ پیش آئے گا۔ تمھاری ذمہ داری اس انذار و بشارت کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ عذاب لانے یا نہ لانے کا معاملہ ہم سے متعلق ہے۔ جب اس کا وقت آ جائے گا تو ہم یہ چیز بھی ان کو دکھا دیں گے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ یہ لوگوں کی بدبختی پر اظہارِ افسوس ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو عذاب سے پہلے ایک آگاہ کرنے والا بھیج دیا کہ لوگ چاہیں تو ایمان و عمل صالح کی زندگی اختیار کر کے اپنے لیے ابدی رحمت کی ضمانت حاصل کر لیں لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ رحمت کی جگہ عذاب ہی کے طالب ہیں۔ ان کو اس حقیقت کی خبر نہیں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کی طرف رسول بھیج دیتا ہے تو اس پر اللہ کی حجت تمام ہو جاتی ہے۔ اگر وہ قوم رسول کی تکذیب کر دیتی ہے تو سنتِ الٰہی کے بموجب وہ لازماً تباہ کر دی جاتی ہے۔ آگے والی سورہ، سورۂ فاطر میں اس حقیقت کی وضاحت یوں فرمائی گئی ہے:

اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ۝ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۭ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ۝ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ۝ ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ	تم تو بس ایک آگاہ کر دینے والے ہو۔ ہم نے تم کو حق کے ساتھ بشارت دینے والا اور آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی ہے جس میں ایک نذیر نہ آیا ہو۔ اور اگر یہ تم کو جھٹلاتے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ان سے پہلے جو قومیں گزری ہیں انھوں نے بھی جھٹلایا۔ ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیاں، صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے۔ پھر میں نے ان لوگوں کو پکڑا

نَكِيْرِ ۵ (۲۰-۲۳) جنھوں نے کفر کیا تو دیکھو کیسی ہوئی میری پھٹکار۔

اہل کتاب کو ایک برمحل تنبیہ

اس آیت میں 'کَآفَّةً لِّلنَّاسِ' کے الفاظ بھی قابلِ غور ہیں۔ آنحضرتؐ سے پہلے جو رسول آئے وہ صرف اپنی اپنی قوموں ہی کے لیے نذیر بن کر آئے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم الانبیاء و خاتم الرسل ہیں اس وجہ سے آپ کی بعثت تمام خلق کی طرف ہوئی۔ یہ حقیقت قرآن میں بھی مختلف پہلوؤں سے واضح فرمائی گئی ہے اور سابق صحیفوں میں آپ کی نسبت جو پیشین گوئیاں وارد ہیں، ان میں بھی آپ کی یہ حیثیت نمایاں ہے۔ ان کے حوالے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم نقل کر آئے ہیں۔ یہاں اس بات کی یاددہانی سے مقصود اہل کتاب کو متنبہ کرنا ہے۔ دعوت کے اس دور میں انھوں نے بھی درپردہ قریش کی پشت پناہی شروع کر دی تھی، اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس صفت کا حوالہ دے کر ان کو بھی آگاہ کر دیا گیا کہ جس رسول کی مخالفت میں وہ اپنی ذہانت و قابلیت صرف کر رہے ہیں وہ صرف قریش ہی کے لیے منذر و مبشر بن کر نہیں آیا ہے بلکہ اس کے ذریعے سے خود ان کی قسمت کا بھی فیصلہ ہونا ہے اس وجہ سے اگر وہ یہ خطرناک کھیل کھیلنا چاہتے ہیں تو اس کے نتائج بہت دُور تک سوچ لیں۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۹)

استہزا کرنے والوں کو جواب

یعنی وہ رسول کے انذار بالعذاب سے متنبہ ہونے اور اس سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کرنے کے بجائے رسول اور اس کے ساتھیوں کا استخفاف کرتے اور باندازِ طنز سوال کرتے ہیں کہ اگر تم لوگ اپنے انذار میں سچے ہو تو یہ بتاؤ کہ یہ دھمکی کب ظہور میں آئے گی؟ مطلب یہ ہے کہ یا تو اس کو دکھاؤ یا اس کا وقت متعین کرو ورنہ ہم اس کو محض لاف زنی سمجھتے ہیں۔

قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ (۳۰)

فرمایا کہ ان کو جواب دے دو کہ اس چیز کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ اس کے ظہور کے لیے ایک خاص وقت مقرر ہے۔ جب وہ وقت آجائے گا تو پھر نہ تو اس سے پیچھے ہٹ سکو گے اور نہ آگے ہی بڑھ سکو گے یہ حقیقت ہم جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نافرمانوں اور باغیوں کو بھی اتنی مہلت دیتا ہے کہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں تاکہ ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور یہ بات صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کسی قوم کا پیمانہ کب لبریز ہوا۔ اس بھید سے اللہ کا رسول بھی واقف نہیں ہوتا۔

لفظ 'یوم' یہاں وقت کے مفہوم میں ہے اور لفظ 'سَاعَة' لمحہ، پل اور وقتِ قلیل کے مفہوم میں۔

اس اسلوبِ بیان کے اندر سوال کرنے والوں کے طنز کے جواب میں یہ طنز بھی مضمر ہے کہ آخر کس برتے پر اس عذاب کا وقت معلوم کرنا چاہتے ہو، وہ اٹل وقت جب آجائے گا تو پھر کس کے ٹالے ٹل سکے گا!

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚۖ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ ِۨالْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا

لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ (۳۱)

الذی بین یدیہ کی تاویل

'وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ' کی دو تاویلیں لوگوں نے کی ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد قرآن سے پہلے نازل ہونے والے آسمانی صحیفے ہیں، دوسری یہ کہ یہ اس عذاب اور قیامت کی طرف اشارہ ہے جس سے قرآن ان کو آگاہ کر رہا تھا۔ ہمارے نزدیک یہ دوسرا قول سیاق و سباق سے زیادہ اوفق ہے۔ یعنی یہ کفار نہایت ڈھٹائی کے ساتھ قرآن کے انذار کا یہ جواب دیتے ہیں کہ نہ تو ہم اس قرآن ہی پر ایمان لانے والے ہیں اور نہ اس عذاب اور قیامت ہی کو ماننے کے لیے تیار ہیں جس کی وہ آگے کو خبر دے رہا ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم سے یہ بات منوانی ہے تو ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ یہ چیز ہمیں دکھا دی جائے۔ اگر یہ دکھائی نہیں جاتی تو پھر ہم اس دھونس میں آنے والے نہیں ہیں!

حذف کا ایک اسلوب

'وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ'۔ 'ظٰلِمُوْنَ' سے مراد یہی شامت زدہ لوگ ہیں جو خدا کی رحمت کو ٹھکرا کر اس کی نقمت کا مطالبہ کر رہے تھے۔ جواب شرط یہاں عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق محذوف ہے۔ حذف کا یہ طریقہ ان مواقع میں اختیار کیا جاتا ہے جہاں صورت حال تعبیر و تصویر سے ماوراء ہو۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو یہ شامت زدہ لوگ قرآن اور اس کے بعد آنے والی قیامت کا نہایت جسارت سے انکار کر رہے ہیں لیکن اگر تم کہیں ان کی اس حالت کو دیکھ پاتے جب کہ یہ اپنے رب کے حضور میں کھڑے کیے جائیں گے تو ...... اس 'تو' کے بعد اس منظر کا ذکر حذف کر دیا ہے جس سے یہ بات نکلی کہ اس کی ہولناکی تعبیر و تصویر کے حدود سے باہر ہے۔

لیڈروں اور اس کے پیرؤں کی تو تکار

'يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ ۣ الْقَوْلَ' کا صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ وہ آپس میں تو تکار کریں گے۔ اس کی تفصیل آگے کی آیات میں آ رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو ان کے لیڈر اور پیرو دونوں قرآن اور قیامت کی مخالفت پر متفق ہیں۔ لیڈر مخالفت کے لیے پیش پیش ہیں اور عوام ان کی تائید کرتے ہوئے ان کے جھنڈے اٹھائے پھر رہے ہیں لیکن جب خدا کے حضور میں ان کی پیشی ہوگی تو پیرو لیڈروں کو اپنی گمراہی کا ذمہ دار ٹھہرائیں گے اور لیڈر پیروؤں کو ملامت کریں گے کہ تم اپنی شامت کے خود ذمہ دار ہو کہ حق کے واضح ہو جانے کے بعد تم نے حق کے بجائے ہماری پیروی کی۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو لیڈر عوام کو یہ باور کرا رہے ہیں کہ وہ ان کی صوابدید پر اعتماد کریں، خیر و شر کی ذمہ داری ان پر ہے اور عوام آنکھ بند کر کے ان کے پیچھے چل رہے ہیں کہ کوئی خطرہ پیش آیا تو ان کے لیڈر اس سے ان کو بچا لیں گے لیکن جب اصل مرحلہ سامنے آئے گا تب معلوم ہوگا کہ ہر ایک اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے، کوئی دوسرا کسی کا بوجھ اٹھانے والا نہیں بنے گا۔

'يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ'۔ یہ اوپر والی بات کی وضاحت ہو رہی ہے۔ 'الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا' سے مراد وہ غرباء اور عوام ہیں جو اپنی غربت اور بے مائگی

کے سبب سے بڑوں اور سرمایہ داروں کے زبردست اوران کے آلۂ کار بنے رہے۔ اَلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا، سے ان کے سرمایہ دار لیڈر اور سردار مراد ہیں جنھوں نے اپنی ذات کو حق و باطل کا معیار بنا کر لوگوں کو اپنے پیچھے چلایا یہاں تک کہ اللہ و رسول کی مخالفت کے لیے بھی ان کو استعمال کیا۔ فرمایا کہ اس دن غرباء اور عوام اپنے لیڈروں اور سرمایہ داروں کو الزام دیں گے کہ یہ تم ہو کہ تمھاری بدولت ہم اس بدبختی سے دوچار ہوئے، تم نے ہماری راہ نہ ماری ہوتی تو ہم ضرور ایمان لانے والوں میں سے بنتے۔ مطلب یہ ہے کہ حق تو ہم سے مخفی نہیں رہا تھا اور ہمارے اندر اس کے اختیار کرنے کا جذبہ بھی ابھرتا تھا لیکن تمھارا دباؤ ہمارے اس جذبے کو دبا دیتا تھا اور ہم اپنی خواہش کے خلاف ایمان کی سعادت سے محروم رہ گئے اور بالآخر اس انجام کو پہنچے۔

قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰکُمْ عَنِ الْهُدٰی بَعْدَ اِذْ جَآءَکُمْ بَلْ کُنْتُمْ مُّجْرِمِیْنَ (۳۲)

لیڈر اپنے پیروؤں کو جھٹ جواب دیں گے کہ تمھارا الزام بالکل غلط ہے کہ تم کو ہم نے اللہ کی ہدایت سے روکا بلکہ مجرم تم خود ہو کہ نہایت واضح ہدایت آ جانے کے بعد بھی تم ہمارے پیرو بنے رہے۔ مطلب یہ ہے کہ حق نہ تو ہم پر مخفی تھا نہ تم پر۔ اللہ کے رسول نے حجت تمام کر دی تھی۔ یہ بات نہ ہوئی ہوتی تب تو کسی حد تک ہم کو الزام دینے میں تم بجانب حق ہوتے لیکن جب تم نے پورے دن کی روشنی میں ٹھوکر کھائی تو ہم کو مجرم ٹھہرانے کے بجائے اپنے سر پیٹو۔ ہم بھی مجرم ہیں اور ہماری ہی طرح تم بھی مجرم ہو ـــــ یہ بات ہے تو کفار کی لیکن قرآن نے یہ ایک سچی بات کی حیثیت سے نقل کی ہے اور اس میں ہر دور کے عوام کے لیے درسِ عبرت ہے کہ حق و ہدایت کے معاملے میں کوئی شخص مجرد اس عذر پر عنداللہ بری نہیں ہو سکتا کہ اس کو دوسروں نے گمراہ کیا بلکہ حق کی جستجو ہر شخص کی اپنی ذمہ داری ہے اور اس کے واضح ہونے کے بعد اس کی پیروی تا حدِ امکان ہر فرد پر لازم ہے۔ اس کے بغیر کوئی عنداللہ بری نہیں ہو سکتا۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا بَلْ مَکْرُ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّکْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ؕ وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِیْٓ اَعْنَاقِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ؕ هَلْ یُجْزَوْنَ اِلَّا مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۳۳)

عوام لیڈروں کے جواب میں کہیں گے کہ یہ تمھاری رات دن کی سازشیں تھیں کہ ہم حق کی پیروی سے محروم رہے۔ تم نے رسول کی ہدایت سے برگشتہ کرنے کے لیے پروپیگنڈے کی مہم چلا رکھی تھی اور ہمیں تم یہ سمجھاتے اور سکھاتے تھے کہ ہم برابر کفر و شرک پر جمے رہیں ـــــ اس جواب سے یہ بات نکلی کہ ان کو اس امر کا تو اعتراف ہوگا کہ حق ان پر واضح تھا لیکن وہ اس وجہ سے اس کی پیروی نہ کر سکے کہ ان کے لیڈروں

کی رات دن کی سازشوں نے انھیں اس کی پیروی سے محروم رکھا۔

'وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ'۔ 'اَسَرُّوا النَّدَامَةَ' اسی طرح کا محاورہ ہے جس طرح 'ابطن العداوۃ' ہے۔ 'ندامت' ایک کیفیت قلبی و باطنی ہے اس وجہ سے اس کے لیے 'اسرّ' استعمال ہوا ہے۔ مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس سوال و جواب کے بعد جب وہ دیکھیں گے کہ سامنے عذاب کھڑا ہے تو وہ اپنی بدبختی پر سخت پشیمان ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا یہ عذر مسموع نہیں ہوگا کہ وہ اپنے لیڈروں کی سازشوں کے سبب سے ہدایت کی پیروی سے محروم رہے بلکہ ان کو لازماً عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان کی پشیمانی کی وجہ یہ ہوگی کہ اس وقت ان کے سامنے یہ بات بالکل کھل کر آجائے گی کہ فی الحقیقت انھوں نے بالکل اپنے ضمیر کے خلاف اپنے لیڈروں کی پیروی کی۔ جو آدمی اپنے ضمیر کے خلاف کسی باطل کی پیروی کرتا ہے جب اس کا نتیجہ اس کے سامنے آتا ہے تو اس کو صرف نتیجہ کی تلخی ہی سے سابقہ نہیں پڑتا بلکہ اپنے ضمیر کی لعنت سے بھی اس کو دوچار ہونا پڑتا ہے اور یہ چیز اس کی مصیبت کو دوچند کر دیتی ہے۔ یہ مضمون احزاب کی آیات ۶۶-۶۸ میں گزر چکا ہے۔ مزید وضاحت مطلوب ہو تو اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

عمل اور جزا میں مشابہت

'وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْٓ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا'۔ فرمایا کہ ہم ان کافروں کی گردنوں میں طوق ڈال دیں گے۔ یہ عمل اور جزا میں مطابقت کی طرف اشارہ ہے۔ جو لوگ اپنی عقل اور اپنے ضمیر کو بالکل معطل کر کے اپنی باگ دوسروں کے ہاتھ میں پکڑا دیں گے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کو اس کی سزا یہ دے گا کہ ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے جائیں گے جن کو پکڑ کر دوزخ کے داروغے ان کو دوزخ میں گھسیٹیں گے۔

'هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ'۔ یعنی ان کی گردنوں میں یہ طوق جو ڈالے جائیں گے تو یہ ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی بلکہ دنیا میں جو کچھ انھوں نے کیا اسی کی اصل حقیقت ان کے سامنے اس شکل میں آئے گی۔ انھوں نے دوسروں کی غلامی کا قلادہ اپنی گردنوں میں ڈال کر اپنے رب کی نافرمانی کی جس کے نتیجہ میں ان کو دوزخ کے یہ اغلال اپنی گردنوں میں ڈالنے پڑیں گے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۳۴)

آنحضرت صلعم کو تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمھارے زمانے کے امراء و اغنیاء جو کچھ تمھارے ساتھ کر رہے ہیں یہی کچھ ہر زمانے کے مترفین نے اپنے اپنے زمانوں کے رسولوں کے ساتھ کیا ہے۔ انھوں نے بھی نہایت رعونت کے ساتھ اپنے رسولوں کو یہ جواب دیا کہ جو پیغام تم دے کر بھیجے گئے ہو ہم اس سارے کے منکر ہیں۔ یعنی نہ تو تمھاری دعوتِ توحید و ایمان کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں اور نہ تمھاری اس دھونس ہی میں آنے والے ہیں کہ اگر ہم نے تمھاری بات نہ مانی تو ہم پر کوئی عذاب آجائے گا۔

'أُرْسِلْتُمْ بِهٖ' کے اسلوب میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ جس رسالت کے تم مدعی ہو یہ بھی محض تمہارا زعم ہے جس کی ہمارے نزدیک کوئی حقیقت نہیں ہے۔

وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَّأَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ (۳۵)

مترفین کا اصلی مغالطہ

یعنی رسولوں کے انذار کی تکذیب کے حق میں جو دلیل انھوں نے پیش کی وہ یہی تھی جو تمہارے زمانے کے مترفین پیش کر رہے ہیں۔ انھوں نے رسول اور اس کے ساتھیوں کو جواب دیا کہ تم ہمیں ڈراتے ہو کہ ہمارا عقیدہ و عمل باطل ہے اور ہم خدا کے عذاب کے سزاوار ہیں اور حال یہ ہے کہ ہم مال و اولاد میں تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں۔ اگر تمہاری بات سچی ہوتی تو اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ مال و اولاد میں تم ہم سے بڑھ چڑھ کر ہوتے۔ 'وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ' یعنی جب صورتِ حال علانیہ تمہاری تکذیب کر رہی ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ تم محض لاف زنی کر رہے ہو، ہم پر نہ اس دنیا میں کوئی عذاب آنے والا ہے اور نہ آخرت میں (اگر تمہارے زعم کے مطابق وہ ہوئی) ہمیں کسی عذاب کا کوئی اندیشہ ہے۔

قُلْ إِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۶)

مغالطہ کا ازالہ

فرمایا کہ ان کا یہ مغالطہ رفع کرنے کے لیے ان کو بتا دو کہ اس دنیا میں مال و اولاد کی زیادتی نہ تو خدا کے منظورِ نظر ہونے کی دلیل ہے اور نہ اس کی کمی خدا کی نظروں میں حقیر ہونے کی۔ بلکہ یہ کمی و زیادتی تمام تر اللہ تعالیٰ کے اختیار اور اس کی حکمت پر منحصر ہے۔ وہ کسی کے رزق میں کشادگی دیتا ہے تو اس کے شکر کا امتحان کرتا ہے اور کسی کے رزق کو تنگ کرتا ہے تو اس کے صبر کو جانچتا ہے اور اصل کامیابی کا انحصار درحقیقت اس امتحان کے نتیجہ پر ہے جو آخرت میں سامنے آئے گا۔

'وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ' لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے ناآشنا ہیں۔ وہ اس حماقت میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کو جو مال و جاہ حاصل ہے یہ ان کی قابلیت و استحقاق کا کرشمہ اور خدا کے ہاں ان کے مقرب و منظورِ نظر ہونے کی دلیل ہے۔ اس طرح وہ شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کو اپنے لیے عذاب بنا لیتے ہیں۔

وَمَآ أَمْوَالُكُمْ وَلَآ أَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰىٓ إِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ز فَأُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ (۳۷)

'زُلْفٰى' مصدر ہے جس سے مقصود فعل کی تاکید ہے یعنی 'تُقَرِّبُكُمْ قُرْبَةً'۔ مطلب یہ ہے کہ مال و اولاد ان چیزوں میں سے نہیں ہیں جو خدا کے ہاں ذرا بھی وجہ قربت ہو سکیں۔ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ امتحان کے لیے دیتا ہے کہ ان کو پا کر بندہ اس کی ناشکری کرتا ہے یا ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اس وجہ سے خدا کے ہاں تقرب کا ذریعہ مال و اولاد نہیں بلکہ ایمان و عمل صالح ہے۔ اگر کسی نے ایمان و عمل صالح کی کمائی نہیں کی تو اس کے لیے مال و اولاد کی زیادتی صرف اس کے وبال میں

اضافہ کرے گی۔

'جزاء الضعف' کا مفہوم

'فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا'۔ لفظ 'ضعف' عربی میں کسی شے کے مثل کے لیے بھی آتا ہے اور اس کے امثال کے لیے بھی، خواہ وہ امثال کتنے ہی غیر محدود ہوں۔ اس وجہ سے اس ٹکڑے کا مفہوم یہ ہوگا کہ البتہ وہ لوگ جو ایمان و عمل صالح کی روش اختیار کریں گے ان کے لیے ان کے اعمال کا مضاعف صلہ ہوگا۔ اس مضاعف صلہ کی وضاحت قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں ہوئی ہے۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ اس کو دُگنے اجر کے محدود مفہوم میں نہ لیجیے[1]۔

'وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ'۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس دنیا میں تو مال و اولاد کے لیے ہر وقت خطرات ہیں اور کوئی بھی ان خطرات سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں کر سکتا لیکن جو لوگ مال و اولاد کو آخرت کی فلاح کا ذریعہ بناتے ہیں ان کو اس کا جو صلہ ملے گا وہ ابدی اور لازوال ہوگا۔ اس باب میں پھر ان کو کبھی کوئی تشویش لاحق نہیں ہوگی۔

وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ (۳۸)

یہ ان لوگوں کے انجام کا بیان ہے جنھوں نے مال و اولاد کی زیادتی کو اللہ کی آیات کو جھٹلانے اور رسول کو زچ کرنے کے لیے دلیل کے طور پر استعمال کیا۔ فرمایا کہ یہ لوگ پکڑ کر خدا کے عذاب میں لائے جائیں گے تاکہ اپنے کبر و غرور کی سزا بھگتیں۔ لفظ 'مُحْضَرُوْنَ' میں ان کی ذلت اور بے بسی کی جو تصویر ہے وہ ظاہر ہے۔

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (۳۹)

رزق و فضل کا صحیح مصرف

اس آیت کی تمہید اور اوپر کی آیت ۳۶ کی تمہید بعینہٖ ایک ہی ہے لیکن دونوں جگہ مدعا الگ الگ ہے۔ اوپر کی آیت میں یہ واضح فرمایا ہے کہ رزق کی کشادگی و تنگی تمام تر اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اس وجہ سے نہ اس کی کشادگی پر کسی کو اترانے کا حق ہے اور نہ اس کی تنگی سے کسی کو مایوس ہونا جائز ہے، بلکہ ہر شخص کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ یہ دونوں حالتیں اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت پیش آتی ہیں اور دونوں سے وہ اپنے بندوں کے شکر یا صبر کا امتحان کرتا ہے۔ اس آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی کہ ان مترفین کو یہ بتا دو کہ اللہ کے بخشے ہوئے رزق و فضل پر اکڑنے کے بجائے اس کو

---

[1] صاحب اقرب الموارد نے اس لفظ کی تشریح یوں کی ہے:

وجائز فی کلام العرب ان یکون الضعف المثل الواحد وما زاد علیہ من الامثال لیقال لک ضعفہ ای مثلاہ وثلاثۃ امثالہ لانہ فی الاصل زیادۃ غیر محصورۃ۔

خدا کی خوشنودی کے کاموں میں صرف کریں کہ یہی شکر کا تقاضا ہے اور وہ اطمینان رکھیں کہ جو کچھ بھی وہ خدا کی راہ میں خرچ کریں گے وہ ضائع جانے والا نہیں ہے بلکہ وہ چھوٹے سے چھوٹے انفاق کا بھی بھرپور صلہ دے گا۔ اور پر صلہ کے معاملے میں 'جَزَآءُ الضِّعْفِ' کا اصول بیان ہو چکا ہے اور اس کی وضاحت بھی ہو چکی ہے۔ آیت میں 'وَمَآ اَنْفَقْتُمْ' کے بعد 'فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ' کے الفاظ وضاحت قرینہ کی بنا پر حذف ہیں۔ 'اَخْلَفَ اللّٰہُ عَلَیْکَ' کے معنی ہوں گے 'رَدَّ عَلَیْکَ مَا ذَهَبَ' (تمھاری گئی ہوئی چیز خدا نے تمھیں لوٹا دی)۔

'وَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ' یعنی خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے اطمینان رکھیں کہ اللہ تعالیٰ بہترین رزق دینے والا ہے۔ آج وہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان کے خرچ کیے ہوئے خزف ریزوں کے عوض میں کل وہ ان کو کیا کچھ بخش سکتا ہے اور کیا کچھ بخش دے گا۔ لفظ 'خیر' یہاں ترجیح و تفضیل کے مفہوم میں نہیں بلکہ مطلق بیانِ صفت کے لیے ہے۔ اس اسلوب کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

۸۔ آگے کا مضمون ۔ آیات ۴۰ - ۴۵

آگے مترفین کو متنبہ کیا ہے کہ تم فرشتوں کو معبود بنا کر ان کی پرستش کر رہے ہو اور سمجھتے ہو کہ آخرت کا مرحلہ پیش آیا تو وہ تم کو بچا لیں گے حالانکہ آخرت میں وہ تم سے اعلان برارت کریں گے اور خدا کے عذاب سے تم کو کوئی بچانے والا نہیں بنے گا۔ یہ اللہ نے تم پر بہت بڑا احسان فرمایا ہے کہ تمھیں آگاہ کرنے کے لیے رسول بھیجا ہے لیکن تم بدبختی کے سبب سے اس کے کلام کو سحر قرار دے رہے ہو۔ بہتر ہے کہ ماضی کی قوموں کے انجام سے سبق لو۔ ان کو جو کچھ حاصل ہوا اس کا عشرِ عشیر بھی تم حاصل نہیں کر پائے ہو لیکن جب وہ اللہ کی پکڑ میں آ گئے تو پھر کوئی بھی ان کو پناہ دینے والا نہ بن سکا ۔۔۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۰-۴۵ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ أَهَٰٓؤُلَآءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا۟
يَعْبُدُونَ ﴿٤٠﴾ قَالُوا۟ سُبْحَٰنَكَ أَنتَ وَلِيُّنَا مِن دُونِهِم ۖ بَلْ كَانُوا۟
يَعْبُدُونَ ٱلْجِنَّ ۖ أَكْثَرُهُم بِهِم مُّؤْمِنُونَ ﴿٤١﴾ فَٱلْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ
بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَلَا ضَرًّا وَنَقُولُ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا۟ ذُوقُوا۟
عَذَابَ ٱلنَّارِ ٱلَّتِى كُنتُم بِهَا تُكَذِّبُونَ ﴿٤٢﴾ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ءَايَٰتُنَا
بَيِّنَٰتٍ قَالُوا۟ مَا هَٰذَآ إِلَّا رَجُلٌ يُرِيدُ أَن يَصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ

يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى ۭ وَقَالَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۳﴾
وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ
مِنْ نَّذِيْرٍ ﴿۴۴﴾ ۭ وَكَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ
اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ ۣ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۵﴾ ع ۵ / ۹ / ۱۱

ترجمہ آیات ۴۰-۴۵

اور اس دن کو یاد رکھو جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کرے گا پھر فرشتوں سے پوچھے گا کہ کیا یہ لوگ تمھاری پرستش کرتے رہے ہیں! وہ جواب دیں گے کہ تو پاک ہے۔ ان کے بالمقابل تو ہمارا کارساز ہے! بلکہ یہ جنوں کی پرستش کرتے رہے ہیں، ان کی اکثریت انھی پر ایمان رکھتی تھی۔ ۴۱

پس آج تم میں سے کوئی ایک دوسرے کو نہ تو کوئی نفع پہنچا سکے گا اور نہ نقصان۔ اور ہم ان ظالموں سے کہیں گے کہ اب اس دوزخ کے عذاب کا مزا چکھو جس کو جھٹلاتے رہے ہو! ۴۲

اور جب ان کو ہماری روشن آیات سنائی جاتی ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ یہ تو محض ایک شخص ہے جو چاہتا ہے کہ تم کو ان چیزوں سے روک دے جن کو تمھارے باپ دادا پوجتے آئے۔ اور انھوں نے کہا کہ یہ تو بس ایک من گھڑت جھوٹ ہے! اور ان کافروں نے حق کی بابت، جب کہ وہ ان کے پاس آگیا، کہا کہ یہ تو بس کھلا ہوا جادو ہے! اور ہم نے ان کو کتابیں نہیں دی تھیں جن کو وہ پڑھتے ہوں اور نہ ان کی طرف تم سے پہلے کوئی آگاہ کرنے والا بھیجا۔ ۴۳-۴۴

اور ان سے پہلے والوں نے بھی جھٹلایا۔ اور یہ تو اس کے عشر عشیر کو بھی نہ پہنچے جو ہم

نے ان کو دیا۔ تو انھوں نے میرے رسولوں کی تکذیب کی تو دیکھو، کیسی ہوئی ان پر میری پھٹکار! ۴۵

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ أَهٰٓؤُلَآءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ (۴۰)

قیامت کے دن فرشتوں کی گواہی

'جَمِيعًا' کی تاکید اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ قیامت کے دن کفار و مشرکین بھی اکٹھے کیے جائیں گے اور ان کے خلاف گواہی دلوانے کے لیے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو بھی اکٹھا کرے گا جن کی عبادت کے وہ مدعی رہے ہوں گے یا جن کی طرف انھوں نے اپنی بدعات منسوب کی ہوں گی۔ سورۂ مائدہ میں حضرات انبیاء علیہم السلام کی شہادت کا ذکر گزر چکا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ان تمام بدعات سے اپنی براءت کا اعلان کریں گے جو ان کے بعد ان کے مبتدع پیروؤں نے ایجاد کی ہوں گی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرشتوں کو بھی اکٹھا کر کے ان سے سوال کرے گا کہ یہ مشرکین (اشارہ مشرکین عرب کی طرف ہے) مدعی ہیں کہ یہ تمھاری عبادت کرتے رہے ہیں تو کیا ان کا یہ دعویٰ صحیح ہے؟ اس سوال کا مقصد ظاہر ہے کہ مشرکین پر اتمام حجت ہو گا کہ جن کو وہ شریک و شفیع سمجھ کر زندگی بھر پوجتے رہے ان کو نہ تو ان کی اس عبادت کی خبر ہے نہ انھوں نے اس کا ان کو حکم دیا اور نہ وہ ایک لمحہ کے لیے یہی گوارا کرنے کے لیے تیار ہیں کہ کوئی ان کو پروردگار عالم کا شریک بنا کر ان کی عبادت کرے۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ (۴۱)

فرشتے اس سوال کا فوراً یہ جواب دیں گے کہ 'سُبْحٰنَكَ' تو اس سے پاک اور ارفع ہے کہ تیرا شریک و سہیم ہو!

فرشتوں کے جواب کے چند خاص پہلو

فرشتوں کے اس جواب سے ایک حقیقت تو یہ واضح ہوئی کہ شرک ایک ایسی گھناؤنی چیز ہے کہ اس کا ذکر سنتے ہی وہ اس سے اپنی نفرت کا اظہار کریں گے اور اللہ جل شانہٗ کو اس سے ارفع قرار دیں گے کہ کوئی اس کا شریک و سہیم ہو۔

دوسری یہ بات واضح ہوئی کہ وہ اپنے اوپر اس کو ایک سنگین تہمت خیال کریں گے کہ کچھ ظالموں نے ان کو شرک کی گندگی میں ملوث کرنے کی کوشش کی۔

تیسری یہ بات نکلی کہ جن احمقوں نے ایسا کیا ہے اس کی ذمہ داری تمام تر انھی پر ہے۔ فرشتے اس سے بری ہیں کہ وہ کسی کو اپنی عبادت کا حکم دیں۔

'اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ' یہ فرشتوں کا اپنے رب سے استغاثہ ہوگا کہ ان ظالموں کے مقابل میں، جنھوں نے ہمیں اس جرم میں ملوث کرنے کی کوشش کی، تو ہمارا یاور و ناصر اور مولیٰ و مرجع ہے۔ ہم ان سے بری ہیں تو ہمیں ان کی تہمت سے بری فرما۔ 'مِنْ دُوْنِهِمْ' یہاں مقابل کے مفہوم میں ہے۔

مشرکین کی جنات پرستی

'بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ'۔ یعنی ان کا یہ زعم تو بالکل باطل ہے کہ یہ ہماری پرستش کرتے رہے ہیں البتہ یہ امر واقعی ہے کہ یہ لوگ جنوں کی پرستش کرتے رہے ہیں اس لیے کہ ان کی اکثریت انھی پر ایمان رکھنے والی تھی۔

فرشتوں کا یہ جواب بالکل حقیقت کے مطابق ہوگا۔ اس لیے کہ فرشتوں کے نام سے انھوں نے جو بت بنائے ــــ مثلاً لات، منات اور عزّیٰ وغیرہ ــــ یہ تو محض ان کے اپنے فرض کیے ہوئے نام تھے جن کا کوئی مسمّٰی موجود نہیں تھا۔ البتہ اپنے کاہنوں کے توسط سے انھوں نے جنوں سے رابطہ قائم کیا تھا اور چونکہ ان کو وہ علم غیب کا ذریعہ سمجھتے تھے اس وجہ سے ان کے لیے چڑھاوے اور قربانیاں بھی پیش کرتے اور ان کی جے بھی پکارتے۔ 'اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ' یعنی یہ ان پر اس حیثیت سے ایمان رکھتے رہے ہیں کہ وہ غیب کی خبروں کے لانے والے اور بذاتِ خود نافع و ضار ہیں۔

فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا ۭ وَنَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ (۴۲)

فرشتوں کی گواہی کے بعد ان کے پجاریوں کا فیصلہ

یعنی فرشتوں کے اس جواب کے بعد ان کے پجاریوں سے کہہ دیا جائے گا کہ تمھارا سارا اعتماد جن فرشتوں پر تھا ان کی گواہی تم نے علیٰ رؤوس الاشہاد سُن لی۔ پس آج کے دن کوئی بھی ایک دوسرے کے کام آنے والا نہ بن سکے گا۔ نہ وہ تمھیں کوئی نفع یا ضرر پہنچا سکتے اور نہ تم ان کو۔

'وَنَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا ......' میں 'اَلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا' سے مشرکین مراد ہیں جنھوں نے بے دلیل خدا کے شریک بنا کر 'ظلمِ عظیم' کا ارتکاب کیا اور جب پیغمبر نے ان کو خدا کے عذاب سے ڈرایا تو انھوں نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ اس کی تکذیب کی۔ فرمایا کہ اس آخری اتمامِ حجت کے بعد ہم ان سے کہیں گے کہ اب اس دوزخ کا مزا چکھو جس کو جھٹلاتے رہے ہو۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُكُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى ۭ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۴۳)

مخالفین کی ہٹ دھرمی پر اظہارِ تعجب

یہ ان لوگوں کی ہٹ دھرمی اور مکابرت پر اظہارِ تعجب اور ان کی محرومی و بدبختی پر اظہارِ افسوس ہے کہ یہ آفتاب پر خاک ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب ان کو ہماری نہایت روشن، محکم اور عقل و دل کو منور کر دینے والی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو یہ اپنے عوام کو ان کے خلاف یہ کہہ کر بھڑکاتے ہیں کہ یہ شخص

تمھارے ان معبودوں سے تم کو برگشتہ کرنا چاہتا ہے جن کو تمھارے بزرگ اسلاف برابر پوجتے آئے۔ حقائق کے خلاف عوام کو مشتعل کرنے کے لیے اسلاف کا حوالہ ہمیشہ سے مفسدین کے ہاتھ میں ایک کارگر حربہ رہا ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو کہ یہ واحد دلیل ہے جو ضلالت کے علم دار لیڈروں نے اپنی ضلالتوں کے حق میں پیش کی ہے۔ 'مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ' کی تنکیر میں بھی ایک زہر چھپا ہوا ہے۔ یعنی وہ اپنے عوام کو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ شخص جو اپنے آپ کو ایک فرستادۂ الٰہی کی حیثیت سے تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے تم اس کے اس چکمے میں نہ آؤ۔ یہ محض ایک عام قسم کا آدمی ہے جس نے محض تمھارے دینِ آبائی سے تم کو منحرف کرنے کے لیے یہ روپ دھارا ہے کہ اس کو خدا نے تمھاری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔

'وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى' یہ قرآن کے خلاف ان کے پروپیگنڈے کا حوالہ ہے کہ وہ اپنے عوام کو یہ باور کراتے ہیں کہ اس قرآن کے متعلق یہ دعویٰ جو کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اتارا ہے، یہ دعویٰ بالکل جھوٹ ہے جو محض تمھیں مرعوب کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک خود تراشیدہ کتاب ہے جو بالکل جھوٹ موٹ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کی جا رہی ہے۔

'وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ' یہ ان لوگوں کی اس تراژخائی پر اظہارِ حیرت ہے کہ یہ لوگ حق کی مخالفت میں اس وقت یہ سخن سازیاں کر رہے ہیں جب حق ان کے سامنے ظاہر ہو چکا ہے۔ اگر سورج افق سے غائب ہو اور کوئی ہٹ دھرم اس کے متعلق کوئی سوال اٹھائے تو یہ ہٹ دھرمی چنداں حیرت انگیز نہیں، لیکن جب سورج نصف النہار پر چمک رہا ہو اور کوئی اس کو جادو قرار دے تو یہ محض خرد باختگی ہے۔

'لِلْحَقِّ' میں 'حق' سے مراد قرآن ہے اور 'ل' یہاں 'فِی' کے مفہوم میں ہے۔ اس معنی میں اس کا استعمال معروف ہے۔ اس کتاب میں اس کی مثالیں گزر چکی ہیں۔

'اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ' یہ ان کے قول کی تفصیل ہے کہ اس قرآن کو وہ جادو قرار دیتے ہیں۔ قرآن کو جادو قرار دینے کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں کہ اس کی معجزانہ فصاحت و بلاغت اور تاثیر و تسخیر کے قائل تو اس کے کٹر سے کٹر مخالفین بھی تھے لیکن وہ اپنے عوام کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ یہ تاثیر و تسخیر محض اس کے پیش کرنے والے کی جادو بیانی کا کرشمہ ہے، اس کو خدا اور فرشتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

'وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ (۴۴)'

یہ ان مخالفین پر اظہارِ احسان اور ان کی اس ناقدری و محرومی پر اظہارِ افسوس ہے۔ فرمایا کہ یہ امّی اور قرآن و کتاب سے ناآشنا لوگ رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ اللہ نے ان کو کوئی کتاب دی تھی جو

ان کے لیے تعلیم و تعلّم اور ارشاد و ہدایت کا ذریعہ بنتی اور نہ تم سے پہلے ان کے پاس کوئی نذیر آیا تھا جو ان کو اس غفلت کی نیند سے جگاتا اور آگے کے خطرات سے آگاہ کرتا۔ اس صورتِ حال کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس عظیم نعمت کی یہ دل و جان سے قدر کرتے، آگے بڑھ کر اس کو ہاتھوں ہاتھ لیتے اور اس سے اپنی دنیا بھی سنوارتے اور آخرت کی بادشاہی بھی حاصل کرتے لیکن یہ اس کی مخالفت کر رہے ہیں اور اس طرح خدا کے اس قہر کو دعوت دے رہے ہیں جو سنتِ الٰہی کے مطابق اس قوم پر آکے رہتا ہے جو اس کے بھیجے ہوئے نذیر کو جھٹلا دیتی ہے۔

'کُتُبٌ' کے بعد 'یَدْرُسُوْنَهَا' کی صفت سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اب تک ان کو اس طرح کے آسمانی صحیفے نہیں عطا ہوئے تھے جس طرح کے صحیفے بنی اسرائیل کو عطا ہوئے کہ یہ ان کو پڑھتے پڑھاتے۔ حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کے ذریعے سے ان کو جو تعلیم ملی تھی اس کی نوعیت روایات کی تھی جو امتدادِ زمانہ سے تقریباً فراموش بھی ہو چکی تھیں اور بدعات کے غلبہ نے ان کا حلیہ بھی بالکل بگاڑ کے رکھ دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ ان کو اپنی کتاب دے کر ان پر اپنی نعمت تمام کر دے لیکن اُن کا حال یہ ہے کہ یہ اس کو سحر اور افترا قرار دے رہے ہیں۔

وَكَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَمَا بَلَغُوا مِعْشَارَ مَا آتَيْنَاهُمْ فَكَذَّبُوا رُسُلِي فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ (۴۵)

خدا کے نذیر کی تکذیب کا لازمی نتیجہ

یہ ان لوگوں کو تنبیہ ہے کہ خدا کے رسول اور اس کے نذیر کی تکذیب کا لازمی نتیجہ اس قوم کی تباہی ہے اور پوری تاریخ انسانی اس سنتِ الٰہی کی شاہد ہے۔

'وَمَا بَلَغُوا مِعْشَارَ مَا آتَيْنَاهُمْ' کلام کے بیچ میں ایک برمحل تنبیہ ہے کہ یہ ان قوموں کا حوالہ دیا جا رہا ہے جو کرّوفر، شان و شوکت اور اسباب و وسائل کی فراوانی کے اعتبار سے اس مقام پر پہنچ چکی تھیں کہ قریش کے یہ مترفین ان کی گردِ پا کو بھی نہیں پہنچے۔ لیکن جب انھوں نے اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی تو ان پر خدا کی پھٹکار جس طرح ہوئی اس کی تفصیلات قرآن میں بیان ہو چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان کو اپنے اسباب و وسائل کا غرّہ ہے تو یہ غرّہ بالکل بے بنیاد ہے۔ بڑی صولت و شوکت کی قومیں خدا کی ایک پھونک میں اڑ گئیں تو ان کی کیا حقیقت ہے۔ ان کو تو ان کا عُشرِ عشیر بھی حاصل نہیں ہوا۔ یہ تو اپنی تنگ ظرفی کے سبب سے بہت تھوڑے میں بہک گئے ہیں۔

۱۰۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۴۶-۵۴

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں مخالفین کو نہایت دردمندی کے ساتھ نصیحت بھی ہے اور نہایت پُر زور وعید بھی کہ ابھی موقع ہے کہ سنبھل جاؤ۔ اگر یہ وقت نکل گیا تو پھر گیا وقت ہاتھ نہیں

آئے گا۔ اس وقت پچھتاؤ گے لیکن یہ پچھتانا بالکل بے سود ہوگا۔ آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۴۶-۵۴

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ
تَتَفَكَّرُوْا ۣ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ
يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ﴿۴۶﴾ قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۭ
اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۴۷﴾ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ
يَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۴۸﴾ قُلْ جَاۗءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ
الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ ﴿۴۹﴾ قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰي نَفْسِيْ ۚ وَاِنِ
اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ ﴿۵۰﴾ وَلَوْ تَرٰٓى
اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿۵۱﴾ وَّقَالُوْٓا اٰمَنَّا
بِهٖ ۚ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۵۲﴾ وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ
قَبْلُ ۚ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۵۳﴾ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ
وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا
فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ﴿۵۴﴾ ع ۶ ۱۲

ترجمہ آیات ۴۶-۵۴

ان سے کہو، میں تمھیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں، وہ یہ کہ تم اللہ کی خاطر دو دو اور ایک ایک کر کے اٹھو پھر غور کرو۔ تمھارے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے۔ وہ تو ایک شدید عذاب سے پہلے تم کو آگاہ کرنے والا ہے۔ کہو، میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو تمھارے ہی لیے مانگا ہے۔ میرا اجر تو بس اللہ پر ہے اور وہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے۔ ۴۶-۴۷

کہہ دو، میرا رب حق کو (باطل پر) مارے گا۔ وہ تمام بھیدوں کو خوب جاننے والا ہے۔

کہہ دو کہ حق آگیا اور باطل نہ آغاز کرتا ہے اور نہ اعادہ۔ ۴۸-۴۹

کہہ دو اگر میں گمراہی پر ہوں تو میری گمراہی کا وبال مجھی پر ہے اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو یہ اس وحی کی بدولت ہے جو میرا رب میری طرف بھیج رہا ہے۔ وہ سننے والا اور نہایت قریب ہے۔ ۵۰

اور اگر تم دیکھ پاتے جب ان پر گھبراہٹ طاری ہوگی پس وہ کہیں بھاگ نہ سکیں گے اور پاس ہی سے دھر لیے جائیں گے اور وہ کہیں گے ہم اس پر ایمان لائے۔ اور اتنی دور سے ان کے لیے اس کا پانا کہاں! اور اس سے پہلے انھوں نے اس کا انکار کیا اور دور سے اٹکل کے تیر تکے چلاتے رہے اور ان کے اور ان کی چاہتوں کے درمیان دیوار حائل ہو جائے گی جس طرح اس سے پہلے ان کے ہم مشربوں کے ساتھ معاملہ ہوا۔ بے شک وہ بھی الجھن میں ڈالنے والے شک میں پڑے رہے۔ ۵۱-۵۴

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۚ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ (۴۶)

ایک دل سوز نصیحت

پیچھے آیات ۷-۸ میں گزر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی قوم کے متمردین کو عذاب قیامت سے ڈراتے تو وہ آپ کی اس بات کو ایک قسم کے خبط پر محمول کرتے۔ کہتے کہ اس شخص کو ایک قسم کا مالیخولیا ہے جس کے سبب سے آگے پیچھے اس کو عذاب ہی عذاب نظر آتا ہے۔ اسی کا جواب دیتے ہوئے نہایت ناصحانہ انداز میں فرمایا کہ ان سے کہو کہ میں تم سے ایک بات کہتا ہوں، خدارا اس پر عمل کرو۔ وہ یہ کہ اپنے ذہن کو ضد، تعصب اور غرور سے پاک کر کے، دو دو، ایک ایک کی صورت میں اٹھو، میری باتیں سنو اور معاملے پر سنجیدگی سے غور کرو۔ 'لِلّٰهِ' سے مقصود اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ اب تک تو تمھاری روش تمام تر نفس اور شیطان کے تابع رہی ہے اس وجہ سے تم معاملے پر غیر جانبدار ہو کر غور نہ کر سکے لیکن آدمی پر سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ کا ہے اور اللہ کو تم بھی مانتے ہو تو اس کی خاطر اپنے دوسرے

داعیات و محرکات سے آزاد ہو کر، اصل حقیقت پر غور کرنے کے لیے از سر نو اٹھو۔ ’اُٹھو‘، یعنی اس کا ارادہ کرو اور اس کے لیے کمر ہمت باندھو۔ تعصبات کی اس فضا میں یہ بات ہو گی تو تمھارے دلوں پر شاق، لیکن اللہ کے لیے اس شاق چیز کو گوارا کرو۔ یہی راہ سعادت کی راہ ہے۔

’مَثْنٰی وَفُرَادٰی‘ کی قید سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ بھیڑ کا ذہن حقائق کو سوچنے سمجھنے کا اہل نہیں ہوتا۔ اب تک تو تمھاری روش یہ رہی ہے کہ جہاں میری زبان سے کوئی بات نکلی تمھارے اشرار نے اس کے خلاف ہنگامہ برپا کرنے کی کوشش کی کہ کوئی میری بات سننے سمجھنے نہ پائے۔ یہ طریقہ چھوڑو اور اس کی جگہ یہ طریقہ اختیار کرو کہ دو دو اور ایک ایک کر کے میرے پاس آؤ، میری باتیں توجہ سے سنو، میرے دلائل پر غور کرو، اپنے شبہات پیش کر کے مجھ سے ان کے جواب معلوم کرو اور پھر غور کرو کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں جنون میں کہہ رہا ہوں یا تمھارے سامنے وہ انجام رکھ رہا ہوں جس سے کل تمھیں لازماً دوچار ہونا ہے۔

’مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ‘ یعنی اس طرح سنجیدگی کے ساتھ غور کرو گے تو تم پر یہ حقیقت خود واضح ہو جائے گی کہ تمھارے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے بلکہ خود تمھاری اپنی عقلوں پر پردہ پڑا ہوا ہے کہ تم اس کے خلاف جتھہ بندی کر کے اس کو زچ کرنے کے درپے ہو۔

لفظ ’صاحب‘ یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جس شخص کو تم خبطی اور دیوانہ قرار دے رہے ہو اس سے تمھیں کوئی نیا نیا سابقہ پیش نہیں آیا ہے بلکہ یہ تمھارے ہی اندر پیدا ہوا، تمھارے ہی سامنے پلا اور بڑھا اور تمھارے ہی آگے یہ اپنی اس عمر کو پہنچا۔ اس پورے زمانے میں تم نے دیکھا کہ یہ تمھارے ہر خیر میں شریک اور تمھارے ہر شر سے مجتنب رہا ہے۔ تم نے ہر آزمائش میں اس کو صادق اور امین پایا۔ اس کی سوجھ بوجھ اور اس کی عقل و بصیرت پر تم نے اعتماد کیا اور اس کو اپنے اندر سب سے بڑا عاقل و فرزانہ مانتے رہے لیکن آج اسی فرزانہ کو دیوانہ قرار دے رہے ہو! غور کرو، دیوانہ وہ ہے یا تم!

ایک بلیغ وقفہ

یہاں ’تَتَفَكَّرُوْا‘ کے بعد وقف ہے اور یہ وقف نہایت بلیغ ہے۔ گویا غور و فکر کی دعوت کے بعد لوگوں کو غور و فکر کے لیے تھوڑا سا وقت بھی دے دیا۔ اس کے بعد اس غور و فکر کا جو صحیح نتیجہ نکلنا چاہیے وہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ اس قسم کے وقف کی متعدد مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔

پیغمبر کی بے قراری کی اصلی وجہ

’اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ‘۔ یہ بات بھی یہاں نہایت برمحل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو تم دیکھتے ہو کہ اس کے دل و دماغ پر ایک ہی فکر، عذاب اور آخرت کی، ہر وقت سوار ہے۔ اٹھتے بیٹھتے ہر لمحہ وہ تم کو اسی سے ڈراتا اور اسی کے لیے تیاری کرنے کی نصیحت کرتا ہے۔ تمھاری تمام ناقدریوں، دل آزاریوں اور ستم رانیوں کے باوجود تمھارے پیچھے پھرتا ہے تو اس کی یہ بے قراری

بھی اس وجہ سے نہیں ہے کہ اس کو کوئی جنون لاحق ہے بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ جو عذاب تمہارے سروں پر منڈلا رہا ہے وہ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے لیکن تمھیں وہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ اس کی یہ ساری بے چینی و بے قراری تمھاری ہمدردی میں ہے لیکن تم اپنے اندھے پن کے سبب سے اس کی ان بے چینیوں اور بے قراریوں کو خبط و جنون پر محمول کرتے ہو۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ ایک رسول کو اپنی قوم پر آنے والے عذاب کا نظر آنا کوئی مجاز نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ رسول اپنی قوم کے لیے رحمت کی گھٹا بن کر آتا ہے لیکن اس رحمت کی گھٹا کے اندر ہی اس کی قوم کے لیے صاعقۂ عذاب بھی پوشیدہ ہوتا ہے اگر قوم اس کی تکذیب کر دیتی ہے۔ یہی عذاب آخرت کے عذاب کا دیباچہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ہر رسول نے اپنی قوم کو ان دونوں عذابوں سے ڈرایا ہے اور اس یقین کے ساتھ ڈرایا ہے کہ گویا وہ اپنی دونوں آنکھوں سے اس عذاب کو دیکھ رہا ہو۔ لیکن عقل کے اندھوں نے اس کے اس یقین کو جنون پر محمول کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا پر چڑھ کر 'واصباحاہ!' کا جو نعرہ لگایا وہ اسی یقین کا مظاہرہ تھا لیکن قریش کے لیڈروں نے اس سے متنبہ ہونے کے بجائے اس کا مذاق اڑایا۔

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (۴۷)

ایک ہی حقیقت دو مختلف اسلوبوں سے

یہ مضمون قرآن میں دو اسلوبوں سے آیا ہے اور دونوں کا مفاد ایک ہی ہے۔

ایک اسلوب یہ ہے کہ میں نے اپنی خدمت پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگا ہے کہ تم مجھ سے بدک رہے ہو، میرا اجر تو بس میرے رب ہی کے ذمہ ہے۔

دوسرا یہ کہ اگر میں نے تم سے کوئی بات چاہی ہے جس کو تم اجر سمجھتے اور بار محسوس کرتے ہو تو وہ اپنے لیے نہیں بلکہ تمھاری ہی دنیا و آخرت کی بہبود کے لیے چاہی ہے۔

پہلے اسلوب کی مثالیں بکثرت ہیں۔ ان کے حوالے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں یہ مضمون اس دوسرے اسلوب میں بیان ہوا ہے جس کی بعض نظیریں ہم نقل کرتے ہیں۔ سورۂ فرقان میں ہے:

قُلْ مَآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ — کہہ دو کہ میں نے اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگا ہے،

شَاۗءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (۵۷) — مگر یہ کہ جو چاہے اپنے رب کی راہ اختیار کرے۔

اگرچہ اس آیت کی تاویل پہلے اسلوب کے مفہوم میں بھی ہو سکتی ہے اور وہ بھی عربیت کے خلاف نہیں ہو گی لیکن اس کا یہ مطلب بھی بالکل واضح ہے کہ میں نے اپنی اس خدمت پر تم سے اپنے لیے کچھ نہیں چاہا ہے۔ اگر چاہا ہے تو تمھارے ہی لیے چاہا ہے کہ تم میں سے جو خدا کی راہ کا طالب ہو میں اس کو خدا کی صراط مستقیم دکھا دوں۔

اسی طرح سورۂ شوریٰ میں ہے:

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (۲۳)

کہہ دو کہ میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا مگر یہ کہ قرابت مندوں کے معاملے میں حسنِ سلوک کی روش اختیار کرو۔

اگرچہ اس آیت کی تاویل بھی پہلے اسلوب کی روشنی میں ہو سکتی ہے، اس پر اس کے محل میں ہم بحث کریں گے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی بالکل واضح ہے کہ اگر تم میری دعوت انفاق و صلۂ رحم کو بار سمجھتے ہو تو یہ بھی میں اپنے لیے نہیں بلکہ تمہارے ہی لیے اور تمہارے رشتہ داروں و قرابت مندوں ہی کے لیے چاہتا ہوں۔

اسی اسلوب پر آیت زیرِ بحث میں فرمایا کہ اول تو میں نے اپنی اس دعوت و تعلیم پر تم سے کسی اجر کا مطالبہ کیا نہیں، میرا اجر میرے رب کے ذمہ ہے؛ لیکن اگر تم میرے کسی مطالبے کو اپنے اوپر بار اور اس کو میرا اجر تصور کرتے ہو تو یہ تمہاری غلط فہمی و کج اندیشی ہے۔ میں نے تم سے جو کچھ بھی چاہا ہے اپنے لیے نہیں بلکہ تمہارے ہی لیے چاہا ہے۔ میں تمھیں خدا اور آخرت سے جو ڈراتا ہوں، نیکی کی تلقین کرتا ہوں، انفاق فی سبیل اللہ، اطعام فقرا و یتامیٰ اور غلاموں کو آزاد کرنے پر ابھارتا ہوں تو ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس میں میرا کوئی ذاتی مفاد ہو بلکہ ان کا فائدہ، انفرادی و اجتماعی دونوں پہلوؤں سے، تمہی کو حاصل ہوگا۔ تم ان باتوں پر عمل کر کے اپنی دنیا بھی سنوارو گے اور اپنی آخرت بھی بناؤ گے۔

یہ بات قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی فرمائی گئی ہے مخاطبوں کو ملامت اور ان سے اظہارِ بےنیازی کے سیاق ہی میں فرمائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان ناقدروں سے کہہ دو کہ میں نے اپنی دعوت پر کوئی ٹکٹ یا چندہ تو نہیں لگا رکھا ہے کہ وہ تمہارے لیے میرے پاس آنے اور میری بات سننے میں مانع ہو رہا ہو، تم ہر وقت میرے پاس آ سکتے ہو اور بے جھجک آ سکتے ہو۔ میری مجلس میں کسی پر کوئی قدغن نہیں۔ تمہارے امیر و غریب سب کے لیے میرا دروازہ کھلا ہوا اور میرا سینہ کشادہ ہے۔ اور اگر نہیں آتے تو یاد رکھو کہ میرا کچھ نہیں بگاڑو گے، اپنا ہی بگاڑو گے۔ میں نے کوئی دکان نہیں کھولی ہے کہ تمہاری بے التفاتی سے میری دکان بیٹھ جائے گی۔ میں نے تو اپنے رب سے مفت پایا ہے، مفت بانٹ رہا ہوں۔

'وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ'۔ یعنی میرا اجر جس اللہ کے ذمہ ہے وہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے۔ مجھے یہ اندیشہ نہیں ہے کہ میری کوئی حقیر سے حقیر خدمت بھی اس سے پوشیدہ رہے گی۔ وہ میری سرگرمیاں بھی دیکھ رہا ہے اور تمہاری ناقدریاں بھی اس کی نگاہوں میں ہیں۔ میں پورا بھروسہ رکھتا ہوں کہ وہ مجھے میری خدمات کا بھرپور صلہ دے گا۔

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ (۴۸)

ایک تنبیہ: 'يَقْذِفُ بِالْحَقِّ' کے بعد 'عَلَى الْبَاطِلِ' کے الفاظ بربنائے قرینہ محذوف ہیں، جیسا کہ دوسرے مقام میں

فرمایا ہے: بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ (الانبیاء: ۱۸) (ہم حق کو باطل پر ماریں گے پس وہ اس کا بھیجا نکال کے رکھ دے گا)۔

یعنی ان نادانوں کو بتا دو کہ اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ یہ دنیا یوں ہی پیدا ہوئی، یوں ہی تمام ہو جائے گی بلکہ ایک ایسا دن لازماً آنے والا ہے جس دن اس کا خالق اس کے حق و باطل میں فیصلہ فرمائے گا اور حق کو باطل پر مارے گا جس سے باطل پاش پاش ہو کے رہ جائے گا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اصلاً تو یہ بات آخرت کی عدالتِ کبریٰ سے متعلق ہے لیکن یہی نتیجہ اس عدالتِ صغریٰ کا بھی برآمد ہوتا ہے جو ایک رسول کی بعثت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہم جگہ جگہ اس سنتِ الٰہی کی وضاحت کر چکے ہیں کہ جس قوم کی طرف رسول کی بعثت ہوئی اس قوم کے حق و باطل کا فیصلہ لازماً ہو گیا۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر حضورؐ نے اعلان فرمایا کہ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (حق آگیا اور باطل نابود ہوا، بے شک باطل نابود ہی ہونے والی چیز ہے)۔

'عَلَّامُ الْغُيُوبِ' ہمارے نزدیک یہ مستقل جملہ ہے اور مبتدا یہاں محذوف ہے۔ یہ حق و باطل کے درمیان عدالت کی دلیل صفاتِ الٰہی سے پیش کی گئی ہے کہ اس کائنات کا رب تمام غیب کی باتوں کو جانتا ہے، کوئی چیز بھی اس سے مخفی نہیں ہے، اس وجہ سے کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اس کو کسی چیز کا فیصلہ کرنے میں کوئی زحمت پیش آئے گی۔ وہ ہر ایک کا پورا اعمال نامہ اس کے آگے رکھ دے گا جس میں اس کا ہر عمل درج ہوگا خواہ وہ کتنے ہی پوشیدہ گوشوں میں انجام دیا گیا ہو۔

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ (۴۹)

جس طرح اوپر کی آیت میں 'يَقْذِفُ بِالْحَقِّ' کے بعد 'زَهَقَ الْبَاطِلُ' کے الفاظ حذف ہیں اسی طرح یہاں 'جَآءَ الْحَقُّ' کے بعد 'زَهَقَ الْبَاطِلُ' کے الفاظ حذف ہیں اور اس خلا کو 'وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ' کے الفاظ نے بھر دیا ہے۔

باطل ایک بے ثبات چیز ہے

فرمایا کہ ان نادانوں کو بتا دو کہ اب حق قرآن کی شکل میں آگیا اور جب حق آگیا تو اس باطل کا نابود ہونا لازمی ہے جس کی وہ پرستش کرتے رہے ہیں۔ اب اگر وہ اس باطل کے ساتھ چمٹے رہے تو اس کے ساتھ وہ بھی پس جائیں گے۔

جن کا اس کائنات کے ابداء میں دخل نہیں ان کا اس کے اعادہ میں بھی کوئی دخل نہیں

'وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ' یہ باطل کی بے ثباتی کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ اس کارخانۂ کائنات کا آغاز اس کے خالق نے حق کے ساتھ فرمایا ہے اس وجہ سے لازم ہے کہ اس کی انتہا بھی حق پر ہو۔ جب باطل کا کوئی دخل اس کے ابداء میں نہیں ہے تو اس کے اعادہ میں اس کا دخل کس طرح ہو جائے گا؟ پس جو لوگ فرضی دیویوں دیوتاؤں کی سفارشوں پر تکیہ کیے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں یاد رکھیں کہ ان کے دیوتاؤں کے اختیار میں نہ کسی چیز کا ابداء ہے نہ اعادہ۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکینِ عرب اس کائنات

کے ابداء میں کسی کو شریک نہیں مانتے تھے لیکن وہ اس بات کے قائل تھے کہ اگر آخرت کا مرحلہ پیش آیا تو ان کی واپسی ان کے معبودوں کی طرف ہوگی جو اپنی سفارشوں سے ان کو وہاں بھی اعلیٰ مراتب دلوائیں گے۔ قرآن نے ان کی اسی غلط فہمی کے ازالہ کے لیے جگہ جگہ ان کے اس مغالطہ پر گرفت کی ہے کہ جب تم اس کائنات کے ابداء میں کسی کو شریک نہیں مانتے تو اس کے اعادہ میں کیوں شریک مانتے ہو؟

سورۂ یونس میں یہی مضمون اس طرح بیان فرمایا ہے:

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ۖ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۖ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ۚ (یونس ۴)

اسی کی طرف تم سب کی واپسی ہونی ہے۔ یہ اللہ کا شُدنی وعدہ ہے۔ بے شک وہی خلق کا آغاز فرماتا ہے پھر وہ اس کا اعادہ فرمائے گا تاکہ وہ ان لوگوں کو انصاف کے ساتھ بدلہ دے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے۔

پھر یہی مضمون دوسرے اسلوب سے یوں بیان ہوا ہے:

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۚ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ (یونس: ۳۴)

ان سے پوچھو تمھارے شرکا میں سے کوئی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہ اس کا اعادہ کرے گا؟ کہہ دو اللہ ہی خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہ اس کا اعادہ کرے گا۔ تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو!

قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِيْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ (۵۰)

وحی الٰہی کی تکذیب کا انجام

اب یہ ان لوگوں کو تنبیہ فرمائی کہ ان سے کہہ دو کہ اگر میں گمراہ ہوں، جیسا کہ تم سمجھتے ہو تو اس گمراہی کا خمیازہ بہرحال مجھ ہی کو بھگتنا ہے، تم اس کے وبال سے محفوظ ہو اس لیے کہ تم اس میں میرا ساتھ نہیں دے رہے ہو۔ لیکن اس مسئلہ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اس پر بھی اچھی طرح غور کر لو۔ وہ یہ کہ اگر میں ہدایت پر ہوں تو یہ ہدایت اس وحی کی بدولت مجھے حاصل ہوئی ہے جو میرا پروردگار مجھ پر نازل فرما رہا ہے۔ اس صورت میں میری تکذیب تمھارے لیے کوئی سہل چیز نہیں ہے بلکہ تم وحی الٰہی کے جھٹلانے والے ٹھہرتے ہو اور وحی الٰہی کی تکذیب کرنے والوں کا جو انجام ہونا چاہیے اور ہوگا وہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے نتائج و عواقب کو بہت دور تک سوچ لو!!

تفویض الی اللہ

اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ: یہ تفویض الی اللہ کا کلمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تم سے زیادہ بحث و جدال بے سود ہے۔ میں یہ آخری بات کہہ کے تمھارا معاملہ اپنے رب کے حوالے کرتا ہوں۔ تم نہ تو میری بات سننے کے لیے تیار ہو، نہ قریب آنے کے روادار ہو لیکن میرا رب میری باتیں سننے والا بھی ہے اور قریب بھی ہے۔ تو اب تمھارے پیچھے سر کھپانے کے بجائے اسی سے عرض معروض کروں گا جو سنتا اور قبول فرماتا ہے۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ (۵۱)

فیصلہ کن گھڑی: یہاں جوابِ شرط محذوف ہے۔ اس کی مثال آیت ۳۱ میں گزر چکی ہے۔ اس طرح جوابِ شرط کا محذوف ہونا اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ جواب تعبیر و تصویر سے مافوق ہے۔ فرمایا کہ آج تو ان کے استکبار کا یہ حال ہے کہ پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دے رہے ہیں لیکن اگر کہیں تم ان کے اس وقت کو دیکھ پاتے جب کہ وہ خدا کی اس گرفت میں آجائیں گے جس کو آج جھٹلا رہے ہیں تب تم کو ان کی بے بسی کا کچھ اندازہ ہوتا کہ کس طرح یہ ناک رگڑتے اور حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔ فرمایا کہ جب یہ خدا کے عذاب کی پکڑ میں آئیں گے تو گھبرا کر بھاگنے اور بچنے کی کوشش کریں گے لیکن خدا کی گرفت سے کون بچ سکتا ہے جو یہ اس سے بھاگ سکیں گے۔ 'وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ' یعنی یہ بھاگنا چاہیں گے لیکن پاس ہی سے دھر لیے جائیں گے۔ ان کے پاؤں کے نیچے یا ان کے سر کے اوپر سے اس طرح خدا کا عذاب ان کو اپنے قابو میں کر لے گا کہ کسی طرف بھی ان کو راہِ فرار سجھائی نہیں دے گی۔

وَقَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ (۵۲)

یعنی اس وقت ان کا سارا نشہ ہرن ہو جائے گا اور وہ پکار اٹھیں گے کہ اب ہم اس قرآن پر ایمان لائے۔ ضمیر کا مرجع یہاں قرآن ہے جس کا ذکر اوپر کی آیات میں گزر چکا ہے۔ قرآن کو پیش کرنے والے یعنی آنحضرتؐ از خود اس میں شامل ہیں۔

بعد از وقت ایمان: 'وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ' یعنی ایمان کا محل تو یہ دنیا ہے اور وہ بھی عذابِ الٰہی کے ظہور سے پہلے۔ تو جب عذابِ الٰہی ظاہر ہو جائے گا اس وقت تو یہ ایمان کی منزل سے اتنی دور نکل جائیں گے کہ وہاں سے ان کے لیے اس کے پا سکنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جائے گا۔ عذابِ الٰہی کی گرفت میں آجانے کے بعد تو فرعون جیسا سرکش بھی پکار اٹھا تھا کہ 'میں موسیٰ و ہارون کے رب پر ایمان لایا!' لیکن اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب ملا کہ 'آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ' (اب ایمان لائے! حالانکہ جب ایمان لانے کا وقت تھا تو تم نے نافرمانی کی)۔

'تناوش' کے معنی پا لینے کے ہیں اور 'اَنّٰى لَهُمْ' کا مفہوم یہ ہے کہ بھلا اس وقت اس کے پا لینے کا کیا امکان ہوگا!

دست کوتاہ است و خرما بر نخیل

وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ (۵۳)

'قذف بالحجارۃ' کے معنی ہیں پتھر پھینکا۔ 'قذف بالقول' "تکلم بلا تدبر ولا تامل"۔ یعنی بے سوچے سمجھے بات پھینک ماری۔ یہیں سے یہ 'رجماً بالغیب' یعنی اٹکل پچو بات کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب دیکھنے کے بعد وہ ایمان کا اقرار کریں گے حالانکہ اس سے پہلے وہ دور سے

بیٹھے ہوئے اٹکل کے تیر تکے چلاتے رہے تھے کہ یہ کتاب من گھڑت ہے، اس کا پیش کرنے والا (العیاذ باللہ) برخود غلط ہے، عذاب کی دھمکی محض دھونس ہے، قیامت کا ڈراوا محض خلل دماغ کا نتیجہ ہے اور اگر قیامت کا کوئی مرحلہ پیش آیا تو ہمارے شرکاء کے طفیل ہماری تفوق وہاں بھی قائم رہے گا۔ الغرض عقل کو بالائے طاق رکھ کے قرآن اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تکذیب کے جنون میں جو کچھ زبان پر آیا بکتے رہے لیکن جب حقیقت سامنے آجائے گی تو اس کا اقرار کریں گے لیکن یہ اقرار بعد از وقت اور بالکل بے سود ہوگا۔

وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ (۵۴)

امید کے تمام دروازے بند

یعنی جب فیصلہ کن عذاب نمودار ہو جائے گا تو ان کے اور ان کی تمام چاہتوں کے مابین دیوار حائل ہو جائے گی۔ وہ ایمان لانا چاہیں گے لیکن ان کا یہ چاہنا بے سود ہوگا۔ وہ مہلت کی درخواست کریں گے لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوگی۔ وہ اپنے شریکوں کو پکاریں گے لیکن ان کی طرف سے بھی ان کی کوئی فریادرسی نہیں ہوگی۔ غرض امید کے تمام دروازے ان پر بند ہو جائیں گے اور ایک ابدی مایوسی سے ان کو سابقہ پیش آئے گا۔

'كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ' یعنی ان کو بھی اسی صورت حال سے دوچار ہونا پڑے گا جس سے ان کے پیشرو ہم مشربوں کو دوچار ہونا پڑا۔ یہ اشارہ عاد، ثمود، اہل مدین اور فرعون وغیرہ کی طرف ہے جن کی سرگزشتیں تفصیل کے ساتھ قرآن میں سنائی جا چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس سے پہلے پیش نہ آچکی ہو۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان تمام قوموں کو اسی افتاد سے سابقہ پیش آیا جنھوں نے ان کی طرح اپنے رسولوں کے انذار کی تکذیب کی۔ اگر یہ ان کے حالات سے سبق نہیں لیتے تو لازماً انہی کے انجام سے دوچار ہوں گے۔

'اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ'۔ یعنی وہ بھی انہی کی طرح الجھن میں ڈالنے والے شک میں پڑے رہے یہاں تک کہ بالآخر فیصلہ کن گھڑی سر پر آہی گئی۔ 'شَكٍّ مُّرِيْبٍ' کی نوعیت پر ھود ۶۲، ۱۱۰ میں ہم گفتگو کر چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے، ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

رحمان آباد : ۳ر جنوری ۱۹۷۵ء
جمعہ - ۹ بجے دن

تدبرِ قرآن

۳۵

فاطر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ——— سورۂ سبا ——— کی توام سورہ ہے اس وجہ سے دونوں کے عمود میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اس کا بھی اصل مضمون توحید ہی ہے۔ اس کا آغاز خدا کی حمد کے اثبات اور فرشتوں کی الوہیت کے تصور کے ابطال سے ہوا ہے۔ پھر توحید ہی کے تحت رسالت و معاد سے متعلق وہ باتیں بیان ہوئی ہیں جو مقصد انذار کے پہلو سے ضروری اور سورہ کے مزاج اور اس کے زمانۂ نزول سے مناسبت رکھنے والی ہیں۔ پچھلی سورہ میں، یاد ہوگا، جنوں اور ملائکہ کی الوہیت کے تصور کا ابطال فرمایا ہے۔ اس سورہ میں ملائکہ کی الوہیت کے تصور کی تردید نسبۃً زیادہ واضح الفاظ میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکینِ عرب کے مزعوم معبودوں میں سب سے زیادہ اہمیت فرشتوں ہی کو حاصل تھی۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۳) شکر کا حقیقی سزاوار اللہ ہے۔ وہی آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ اسی نے فرشتوں کو بھی وجود بخشا ہے اور ان کو، اپنی حکمت کے مطابق، جن صلاحیتوں اور قوتوں سے چاہا ہے بہرہ مند کیا ہے۔ ان کو بذاتِ خود کوئی اختیار و اقتدار حاصل نہیں ہے۔ تمام رزق و فضل خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ وہ بخشنا چاہے تو کوئی اس کی بخشش کو روک نہیں سکتا اور روکنا چاہے تو کوئی اس سے دلوا نہیں سکتا۔ پس عبادت کا اصل حقدار وہی ہے۔ اس کے سوا دوسروں کی پوجا محض جہالت و حماقت ہے۔

(۴-۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ اگر تمہاری قوم کے لوگ تمہاری تکذیب کر رہے ہیں تو اپنی پیشرو قوموں کے نقشِ قدم کی پیروی کر رہے ہیں اور وہ لازماً اسی انجام سے دوچار ہوں گے جس سے وہ دوچار ہوئیں۔ ان کے اعمال ان کی نگاہوں میں کھبا دیے گئے ہیں اور یہ اللہ کے قانون کی زد میں آ چکے ہیں تو ان کے غم میں اپنے کو گھلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔

قریش کو انذار کہ پیغمبرؐ جس چیز سے تم کو ڈرا رہا ہے وہ ایک امر شدنی ہے تو اپنی موجودہ دنیوی کامیابیوں سے کسی دھوکے میں نہ رہو اور شیطان کے پھندوں میں نہ پھنسو، وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے تو اپنے دشمن کو دشمن ہی سمجھو۔ بڑا ہی نادان ہے وہ جو اپنے دشمن کو دوست بنا بیٹھے۔

(۹ - ۱۰) حشر و نشر کی ایک واضح دلیل کی طرف اشارہ اور یہ تنبیہ کہ جو حشر کے دن خدا کے ہاں تقرب کا طالب ہو وہ جھوٹے سہاروں پر زندگی نہ گزارے۔ اس دن فرضی دیولیوں دیوتاؤں کے بل پر کسی کو تقرب حاصل نہیں ہوگا۔ خدا کے ہاں کام آنے والی چیز کلمۂ طیبہ ـــــ کلمۂ توحید ـــــ ہے اور اس کلمۂ طیبہ کو بلندی عمل صالح سے حاصل ہوتی ہے۔ جس کو آخرت کی عزت مطلوب ہو وہ ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کرے۔ اس سے ہٹ کر جو راہیں نکالی گئی ہیں وہ سب فریب نفس کی راہیں ہیں اور ان کا انجام ابدی تباہی ہے۔

(۱۱ - ۱۸) مال و اولاد اور رزق و فضل خدا کا عطیہ ہیں۔ عمر کی زیادتی و کمی خدا کے اختیار میں ہے۔ ان میں سے کسی چیز میں بھی کسی دوسرے کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اس کائنات کے اضداد میں جو توافق ہے وہ اس بات کی کھلی ہوئی شہادت ہے کہ اس میں ایک ہی خدائے قادر و قیوم کا ارادہ کارفرما ہے۔ اس کے سوا جن کو معبود بنایا گیا ہے نہ ان کو کوئی اختیار حاصل ہے اور نہ وہ قیامت کے روز کسی کے کچھ کام آنے والے بنیں گے۔

لوگوں کو یہ تنبیہ کہ تمہیں اصل حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔ اگر تم نے اس کی قدر نہ کی تو اپنا ہی بگاڑو گے خدا کا کچھ نہیں بگاڑو گے۔ خدا تمہارا محتاج نہیں ہے بلکہ تمہی خدا کے محتاج ہو۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ تمہاری دعوت انہی لوگوں پر اثر انداز ہو سکتی ہے جن کے اندر زندگی کی کچھ رمق ہے۔ جو بالکل مردہ ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ ان کے لیے جو انجام مقدر ہو چکا ہے وہ اسی سے دوچار ہوں گے۔

(۱۹ - ۲۸) ایمان لانے اور نہ لانے والوں کی تفصیل اور اس کائنات میں جو اختلاف و تضاد پایا جاتا ہے اس کی حکمت کی طرف اشارہ کہ جس طرح اس میں اللہ نے نور و ظلمت کو پیدا کیا ہے اور ان دونوں کی خلقت حکمت و مصلحت پر مبنی ہے اسی طرح ایمان و کفر کا یہ تصادم بھی خدا کی حکمت پر مبنی ہے۔ اس وجہ سے یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ سب ایمان سے بہرہ مند ہو جائیں گے۔ ایمان صرف وہی لائیں گے جن کے اندر علم و معرفت کی روشنی اور اس کی قدر ہے۔

(۲۹ - ۳۸) ان علمائے اہل کتاب کی تحسین و حوصلہ افزائی جو تمام بگاڑ اور فساد کے باوجود اللہ کی کتاب پر قائم ہیں اور اس بات کی طرف اشارہ کہ جس طرح ان کو تورات پر قائم رہنے کی سعادت حاصل ہوئی اسی طرح قرآن پر بھی ایمان لانے کی ان کو سعادت حاصل ہوگی اس لیے کہ یہ انہی پیشین گوئیوں کا مصداق ہے جو اس کی بابت تورات اور دوسرے صحیفوں میں وارد ہوئی ہیں۔ تورات کے بعد اس قرآن کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے امیوں پر عظیم احسان فرمایا ہے کہ اس کے ذریعہ سے اس نے ان کو دنیا کی امامت بخشی ہے بشرطیکہ وہ اس کی قدر کریں۔ پھر فرمایا کہ اگرچہ ان میں ناقدرے اور ناشکرے بھی ہیں لیکن ساتھ ہی ان میں معقولیت پسند اور نیکی کی راہوں میں سبقت کرنے والے بھی ہیں۔ اس طرح کے لوگ اس پر ایمان لائیں گے رہے وہ لوگ جو اس نعمت کی ناقدری کریں گے تو وہ اس انجام سے دوچار ہوں گے جو اس طرح کے لوگوں کے لیے اللہ کے

ہاں مقدر ہے۔

(۳۹-۴۱) قریش کو تہدید و وعید کہ تم دنیا میں پہلی قوم نہیں ہو بلکہ پچھلی قوموں کے جانشین ہو اس وجہ سے خدا نے جس میزانِ عدل سے ان کو تولا کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس سے تم کو نہ تولے۔ خدا کے ہاں الگ الگ ترازو اور الگ الگ باٹ نہیں ہیں بلکہ سب کے لیے ایک ہی میزان ہے۔ تمھاری سرکشی کے باوجود خدا جو ڈھیل تمھیں دے رہا ہے اس کو اپنی کامیابی نہ سمجھو بلکہ یہ تمھارے خسارہ میں اضافہ ہے۔ خدا حلیم و غفور ہے اس وجہ سے تمھیں مہلت دے رہا ہے لیکن جب وہ پکڑے گا تو تمھارے یہ فرضی دیوی دیوتا تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔ آسمان و زمین خدا کے تھامے تھمے ہوئے ہیں تمھارے ان دیوتاؤں نے ان کو نہیں تھام رکھا ہے۔

(۴۲-۴۵) قریش کو یہ یاددہانی کہ رسول کی بعثت سے پہلے تو تم اس ولولہ کا اظہار کرتے تھے کہ اگر تمھارے اندر کسی رسول کی بعثت ہوئی تو تم دنیا کی سب سے زیادہ ہدایت یافتہ قوم بنو گے لیکن جب رسول آیا تو رات دن اس کے خلاف سازشوں میں سرگرم ہو اور خدا کے اسی قہر کو دعوت دے رہے ہو جو رسولوں کی تکذیب کرنے والوں پر ہمیشہ نازل ہوا۔ یاد رکھو کہ اگر خدا کسی قوم کو فوراً پکڑنا چاہے تو کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا لیکن اس نے ہر قوم کے فیصلہ کے لیے ایک خاص وقت مقرر کر رکھا ہے۔

مطالب کے اس تجزیہ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی اس سورہ کا اندرونی نظام اور سابق سورہ سے اس کا تعلق بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اب اللہ کا نام لے کر ہم سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ وبیدہ اللہ التوفیق وھو الھادی الی الصواب۔

سورة فاطر (۳۵)

مكية ——— اٰياتها ۴۵

بسم الله الرحمٰن الرحيم

آيات الحمد لله فاطر السمٰوٰت والارض جاعل الملٰئكة رسلا
۱-۸ اولي اجنحة مثنٰى وثلٰث وربٰع يزيد في الخلق ما يشاء
ان الله علٰى كل شيء قدير (۱) ما يفتح الله للناس من رحمة
فلا ممسك لها وما يمسك فلا مرسل له من بعده وهو
العزيز الحكيم (۲) يٰايها الناس اذكروا نعمت الله عليكم هل
من خالق غير الله يرزقكم من السماء والارض لا اله الا هو
فانّٰى تؤفكون (۳) وان يكذبوك فقد كذبت رسل من قبلك
والى الله ترجع الامور (۴) يٰايها الناس ان وعد الله حق فلا تغرنكم
الحيٰوة الدنيا ولا يغرنكم بالله الغرور (۵) ان الشيطٰن لكم عدو
فاتخذوه عدوا انما يدعوا حزبه ليكونوا من اصحٰب
السعير (۶) الذين كفروا لهم عذاب شديد والذين اٰمنوا و
ع ۱ ۱۳ عملوا الصٰلحٰت لهم مغفرة واجر كبير (۷) افمن زين له سوء

عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ
يَّشَآءُ ۖ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا
يَصْنَعُوْنَ ﴿٨﴾

ترجمۂ آیات ۱-۸

شکر کا سزاوار حقیقی اللہ ہے۔ آسمانوں اور زمین کا خالق، فرشتوں کو دو دو، تین تین اور چار چار پروں والے پیغام رساں بنانے والا۔ وہ خلق میں جو چاہے اضافہ کر دیتا ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱

اللہ لوگوں کے لیے جس رحمت کا فتح باب کرے تو اس کو کوئی روکنے والا نہیں اور جس کو روک لے تو اس کے بعد کوئی اس کو کھولنے والا نہیں اور وہی حقیقی عزیز و حکیم ہے۔ ۲

اے لوگو! تمھارے اوپر اللہ کا جو انعام ہے اس کا دھیان کرو۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق بہم پہنچاتا ہو! اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو! ۳

اور اگر یہ تمھیں جھٹلاتے ہیں تو کچھ غم نہ کرو، تم سے پہلے بھی کتنے رسولوں کی تکذیب کی گئی ہے اور اللہ ہی کے سامنے سارے امور پیش کیے جائیں گے۔ ۴

اے لوگو! اللہ کا وعدہ شدنی ہے تو تم کو یہ دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ اللہ کے باب میں تم کو فریب کار شیطان فریب میں رکھے۔ بے شک شیطان تمھارا دشمن ہے تو تم اس کو دشمن ہی سمجھو۔ وہ تو اپنی پارٹی کو صرف جہنم کا ایندھن بنانے کے لیے بلاتا ہے۔ جنھوں نے کفر کیا ان کے لیے سخت عذاب ہے اور جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے مغفرت اور بہت بڑا اجر ہے۔ ۵-۷

کیا وہ جس کی نگاہوں میں اس کا برا عمل کھبا دیا گیا ہے، پس وہ اس کو اچھا خیال کرنے لگا ہے (ایمان لانے والا بن سکتا ہے!) پس اللہ ہی جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے تو ان کے غم میں تم اپنے کو ہلکان نہ کرو، اللہ باخبر ہے ان کاموں سے جو وہ کر رہے ہیں۔ ۸

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ جَاعِلِ الۡمَلٰٓـئِكَةِ رُسُلًا اُولِىۡۤ اَجۡنِحَةٍ مَّثۡنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ‌ ؕ يَزِيۡدُ فِى الۡخَلۡقِ مَا يَشَآءُ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ (۱)

دین کی بنیاد توحید ہے اور توحید کی حقیقت اللہ ہی کی شکرگزاری ہے

یاد ہوگا، پچھلی سورہ کا آغاز بھی اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ ہی سے ہوا ہے۔ اس سے دونوں سورتوں کے مزاج کی مناسبت واضح ہوتی ہے۔ دین کی بنیاد توحید پر ہے اور توحید کی حقیقت اللہ ہی کی شکرگزاری ہے اس لیے کہ آسمانوں اور زمین کو عدم سے وجود میں لانے والا اللہ ہی ہے اور بندوں کو جو ظاہری و باطنی نعمتیں بھی حاصل ہوئی ہیں سب اللہ ہی کا عطیہ ہیں۔

فرشتوں کی حیثیت قاصدوں کی ہے نہ کہ معبودوں کی

'جَاعِلِ الۡمَلٰٓـئِكَةِ رُسُلًا اُولِىۡۤ اَجۡنِحَةٍ مَّثۡنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ'۔ 'جَاعِلِ الۡمَلٰٓـئِكَةِ' بدل ہے 'فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ' سے۔ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر اس کی اہمیت کے پہلو سے فرمایا کہ جو اللہ آسمانوں اور زمین کا خالق ہے اسی نے فرشتوں کو بھی پیغام رسانی کے مقصد سے وجود بخشا ہے۔ فرشتوں کے خاص طور پر ذکر کی وجہ یہ ہے کہ عربوں کی میتھالوجی (MYTHOLOGY) میں سب سے زیادہ اہمیت فرشتوں ہی کو حاصل تھی۔ وہ ان کو خدا کی چہیتی بیٹیوں کا درجہ دیتے اور اسی حیثیت سے ان کی عبادت کرتے تھے۔ ان کا تصور یہ تھا کہ اگر یہ خوش رہیں تو ان کے واسطے سے سب کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ اس عقیدے نے ان کے ہاں خدا کے وجود کو بالکل معطل کر دیا تھا۔ وہ خدا کو رسمی طور پر مانتے تو تھے لیکن ان کی تمام شکرگزاری اور عبادت کے مرکز ان کے وہ اصنام ہی تھے جو انھوں نے اپنے زعم کے مطابق فرشتوں کے نام پر بنا رکھے تھے۔ یہاں ان کے اسی زعم باطل کی تردید کے لیے ارشاد ہوا کہ شکر کا سزاوار اللہ ہے جو تمام آسمانوں اور زمین کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے۔ اسی نے فرشتوں کو بھی پیغام بری کی ڈیوٹی پر مقرر فرمایا ہے یعنی یہ فرشتے نہ آسمان و زمین کی تخلیق میں کسی نوع سے شریک ہیں اور نہ الوہیت میں ان کا کوئی حصہ ہے بلکہ یہ صرف خدا کے پیغام رساں ہیں جن کے ذریعے سے خدا اپنے رسولوں کو اپنے احکام سے آگاہ کرتا ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ جن لوگوں نے ان قاصدوں کو مقصود کا اور نامہ بروں کو محبوب کا درجہ دے کر انہی کی پرستش شروع کر رکھی ہے انھوں نے نہ خدا کی قدر پہچانی، نہ ان قاصدوں کی اور نہ اپنی ہی۔

فرشتوں کے درمیان فرقِ مراتب

'اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ' صفت ہے 'رُسُلًا' کی۔ 'اَجْنِحَة' جمع ہے 'جَنَاح' کی۔ 'جناح' آدمیوں کے بازوؤں کے لیے بھی آتا ہے اور پرندوں کے پروں کے لیے بھی جن سے وہ اڑتے ہیں۔ یہاں یہ لفظ فرشتوں کے لیے استعمال ہوا ہے اس وجہ سے اس کی نوعیت متشابہات کی ہے یعنی ان کی اصل حقیقت کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ مقصود اس سے یہاں ہم کو صرف اس حقیقت کا علم دینا ہے کہ سب فرشتے ایک ہی درجے کے نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی مصلحتوں کے تحت مختلف درجے کی قوتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ کسی کی قوتِ پرواز کم ہے کسی کی زیادہ۔ کچھ دو پروں کی قوت سے اڑتے ہیں، کچھ تین کی، کچھ چار کی۔

یہ پَر فرشتوں کے ہیں اس وجہ سے ان کی قوتِ پرواز کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور یہ چار تک کا ذکر بھی تحدید کے مفہوم میں نہیں ہے۔ مقصود یہاں صرف ان کے مراتب و منازل کے تفاوت کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ اس وجہ سے اگر اللہ تعالیٰ کے پاس ایسے فرشتے بھی ہوں جن کی قوتِ پرواز اس سے زیادہ ہو تو اس آیت سے اس کی نفی نہیں ہوتی۔ چنانچہ بعض حدیثوں میں حضرت جبریلؑ کے پروں کی تعداد اس سے زیادہ مذکور ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوتِ پرواز اور رسائی تمام فرشتوں سے زیادہ ہے۔ مقصود یہاں صرف یہ واضح کرنا ہے کہ جن نادانوں نے فرشتوں کو الوہیت کے زمرے میں داخل کر رکھا ہے ان کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ بلند کا پتہ نہیں ہے۔ خدائی میں شریک ہونا تو درکنار اس کے قاصد اور سفیر ہونے میں بھی ان سب کا درجہ و مرتبہ ایک نہیں ہے بلکہ کسی کی رسائی کسی منزل تک ہے اور کسی کی پہنچ کسی مقام تک۔ اسی حقیقت کا اعتراف سورۂ صافات میں حضرت جبریل امینؑ کی زبان سے یوں منقول ہے۔

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ	اور ہم میں سے ہر ایک کے لیے بس ایک معین مقام
وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۝ وَاِنَّا	ہے اور ہم ہر وقت صف بستہ رہنے والے ہیں اور
لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ۝ (۱۶۴-۱۶۶)	ہم ہر وقت تسبیح کرتے رہنے والے ہیں۔

صفات اور صلاحیتوں میں کمی بیشی کرنا اللہ ہی کے اختیار میں ہے

'یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ' یعنی اللہ تعالیٰ جن صلاحیتوں اور قوتوں کی مخلوق چاہے پیدا کر سکتا ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس نے فرشتوں کو اگر اپنی پیغام بری کے لیے پیدا کیا تو یہ بھی اس کی قدرت و حکمت کا کرشمہ ہے۔ اگر ان کے درجات میں تفاوت رکھا تو یہ بھی اسی کی قدرت کی ایک شان ہے کہ اگر وہ اپنی خلق یا اس کی صلاحیتوں میں کوئی مزید اضافہ کرنا چاہے تو اس پر بھی وہ قادر ہے۔ صفات اور صلاحیتوں میں کمی بیشی کرنا اللہ کے اختیار میں ہے۔ اگر کسی کی صفات اور

قوتوں میں اس نے افزونی عطا فرمائی ہے تو اس کے بھی معین حدود ہیں جس کی بنا پر نہ کسی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ خدا کی خدائی میں شریک ہونے کا مدعی بن جائے نہ یہ جائز ہے کہ دوسرے اس کو خدائی میں شریک بنا دیں۔

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۲)

اس بات کی دلیل کہ کیوں اللہ ہی سزاوار شکر ہے

یہ دلیل بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں خدا ہی شکر کا سزاوار ہے۔ فرمایا کہ اللہ تمھارے لیے جس فضل و رحمت کا بھی دروازہ کھولنا چاہے وہ اس کو کھول سکتا ہے، کوئی اس کے فضل و رحمت کو روک نہیں سکتا۔ اسی طرح اگر وہ کسی رحمت سے محروم کرنا چاہے تو کسی کی طاقت نہیں کہ وہ تمھیں اس سے بہرہ مند کر سکے۔ یہی مضمون سورۂ زمر میں یوں بیان ہوا ہے۔

قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ	اللہ کے سوا جن معبودوں کو تم پکارتے ہو کبھی تم
دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ	نے ان پر غور کیا ہے۔ اگر اللہ مجھے کوئی ضرر پہنچانا
هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ	چاہے تو کیا وہ اس کے دفع کرنے والے بن سکتے
بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ	ہیں! یا اللہ مجھے کسی رحمت سے نوازنا چاہے تو کیا
رَحْمَتِهٖ ۭ (الزمر: ۳۸)	وہ اس کی رحمت کو روک سکتے ہیں!

مقصد یہ ہے کہ جب اصل حقیقت یہ ہے تو فرشتوں اور جنوں کو تم نافع و ضار سمجھ کر ان کی عبادت جو کرتے ہو یہ محض تمھاری حماقت ہے۔ نفع و ضرر تمام تر خدا ہی کے اختیار میں ہے اس وجہ سے شکر اور عبادت کا حق دار تنہا وہی ہے۔

آیت میں ایک ہی چیز (رحمت) کے لیے ضمیر پہلے مؤنث آئی، پھر اسی کے لیے مذکر آئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک جگہ لفظ کا لحاظ ہے دوسری جگہ مفہوم کا۔ اس کی متعدد نظیریں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں۔

'مِنْ بَعْدِهٖ' یعنی مِنْ بَعْدِ اِمْسَاكِهٖ۔ آگے اسی سورہ میں فرمایا ہے 'وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ' (۴۱) (اگر وہ دونوں (آسمان و زمین) اپنی جگہ سے ٹل جائیں تو خدا کے بعد کوئی ان کو تھامنے والا نہیں بن سکتا)۔

'وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ' یعنی اصل غالب و مقتدر وہی ہے۔ وہ کھولتا اور وہی روکتا ہے اور یہ کھولنا اور باندھنا تمام تر اس کی حکمت کے تقاضوں کے تحت ہوتا ہے اس لیے کہ وہ حکیم بھی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۭ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ڮ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (۳)

اتمام حجت کے لیے ایک سوال

اوپر کی آیات میں جو مضمون اصولی طور پر بیان ہوا ہے اسی مضمون کو اتمام حجت کے انداز میں، لوگوں کو مخاطب کر کے، فرمایا کہ لوگو، اللہ کی جو نعمتیں تم کو حاصل ہیں ان میں سے ایک ایک کا دھیان کرو اور ان پر غور کرو۔ لفظ 'نعمت' یہاں جنس نعمت کے مفہوم میں ہے۔ غور کرنے کے لیے ان کے سامنے مسئلہ کو سوال کی صورت میں رکھا کہ یہ آسمان و زمین میں سے جو تمھیں روزی مل رہی ہے، آسمان سے پانی برستا ہے اور زمین سے تمھاری معاش و معیشت کی گوناگوں چیزیں پیدا ہوتی ہیں، کیا تم کہہ سکتے ہو کہ خدا کے سوا کوئی اور خالق ہے جو تمھیں یہ چیزیں بخشتا ہے۔

سوال کا جواب

'لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ' ان کی طرف سے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر خود اس کا جواب دیا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ خود جواب دینے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس سوال کا صحیح جواب اس کے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ دوسری یہ کہ مشرکینِ عرب، جو یہاں مخاطب ہیں، اس سوال کا یہی جواب، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہے، دیتے بھی تھے۔ فرمایا کہ جب اصل حقیقت یہ ہے اور تم کو بھی اس سے انکار نہیں ہے تو پھر کہاں تمھاری عقل الٹ گئی ہے کہ دوسری چیزوں کو تم معبود بنائے بیٹھے ہو!

وَاِنْ یُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۴)

آنحضرت صلعم کو تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر ایسے سرپھرے لوگ تمھاری تکذیب کر رہے ہیں تو یہ کوئی تعجب یا غم کی بات نہیں ہے، تم سے پہلے جو رسول آئے اس طرح کے لوگوں نے ان کی بھی تکذیب کی۔ مطلب یہ ہے کہ اس میں تمھاری کسی تقصیر کو دخل نہیں ہے بلکہ تمام تر دخل اس میں ان مکذبین کی مخصوص ذہنیت کو ہے۔ ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ یہ اپنی پیش رو قوموں کی روش پر چل رہے ہیں تو اس روش کا جو انجام اُن کے سامنے آیا وہی اِن کے سامنے بھی آئے گا۔

'وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ'۔ سارے امور خدا کی طرف لوٹتے ہیں اور اسی کی طرف لوٹیں گے۔ یعنی خدا اس معاملہ میں غیر جانبدار یا غیر متعلق نہیں ہے بلکہ ہر چیز اس کے سامنے آ رہی ہے اور آئے گی اور آخری فیصلہ اسی کا ہوگا تو اسی کے بھروسہ پر اپنے کام میں لگے رہو اور ان کے معاملے کو اللہ پر چھوڑو۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ جو لوگ اللہ کے سوا دوسروں کو مولیٰ و مرجع بنائے بیٹھے ہیں ایک دن اپنی اس طمع خام کا انجام خود دیکھ لیں گے۔

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا ۫ وَلَا یَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ (۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے بعد مخالفین کو دھمکی دی کہ تم کو پچھلی قوموں کے انجام سے جو ڈرایا جا رہا ہے اس کو ہوائی بات نہ سمجھو۔ اللہ کی یہ وعید شدنی ہے۔ اس وقت تمھیں دنیا کی زندگی کی

جو رفاہیت حاصل ہے وہ تمھیں دھوکے میں نہ رکھے۔ تم اپنی موجودہ رفاہیت کو اپنے رویّہ کی صحت کی دلیل گمان کرتے ہو اور پیغمبر کی وعید کا مذاق اڑاتے ہو کہ بھلا تم پر عذاب کیوں اور کدھر سے آ جائے گا لیکن جب اللہ کے وعدے کے ظہور کا وقت آئے گا تو تم دیکھ لو گے کہ جس چیز سے تمھیں ڈرایا جا رہا تھا وہ بالکل تمھارے سامنے ہی موجود تھی۔

سب سے بڑے فتنہ سے آگاہی

وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ۔ غرور کے معنی فریب کار کے ہیں اور یہاں اس سے مراد شیطان ہے اس لیے کہ سب سے بڑا فریب کار شیطان ہی ہے۔ فرمایا کہ خدا کے باب میں فریب کار شیطان تمھیں دھوکے میں نہ رکھے۔ خدا بڑا رحیم و کریم بھی ہے اور بڑا ہی منتقم و قہار بھی۔ تمھارے تمام طغیان و فساد کے باوجود اس نے تمھیں جو ڈھیل دے رکھی ہے تو اس سے اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ تم اس کی گرفت سے باہر ہو یا تمھارے مزعومہ شرکاء نے تم کو بچا رکھا ہے یا وہ تم کو اس کی پکڑ سے بچا لیں گے۔ اللہ کا نہ کوئی شریک ہے نہ کوئی اس کی پکڑ سے بچانے والا بن سکتا۔ شیطان نے تم کو اس فریبِ نفس میں اس لیے مبتلا کیا ہے کہ اس طرح وہ تم کو سیدھے جہنم میں لے جا رہا ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ خدا کی صفات کے باب میں گمراہی دراصل تمام گمراہیوں کی جڑ ہے اس وجہ سے شیطان یہیں سے انسان پر گھات لگاتا ہے۔ اسی خطرے سے آیت وَمَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ (الانفطار: ۶) میں آگاہ فرمایا گیا ہے۔

إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا ۚ إِنَّمَا يَدْعُو حِزْبَهُ لِيَكُونُوا مِنْ أَصْحَابِ السَّعِيرِ (۶)

یعنی شیطان تمھارا دشمن اور کھلا ہوا دشمن ہے تو اپنے دشمن کو دشمن ہی سمجھو اور اس کی چالوں سے بچ کے رہو۔ یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ وہ تو تمھارا دشمن ہے لیکن تم نے اس کو اپنا مرشد سمجھ کر اپنی باگ اس کے ہاتھ میں پکڑا دی ہے! اگر اپنی باگ اس کے ہاتھ میں پکڑا دی ہے تو اس کا انجام سن لو کہ اس کی تمام سرگرمیوں کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ اس کی پارٹی میں شامل ہو جائیں وہ ان سب کو جہنم کے گھاٹ پر لے جا اتارے۔

الَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ (۷)

وعدۂ حق کی وضاحت

یہ اللہ تعالیٰ کے اس وعدۂ حق کی وضاحت ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۵ میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے باب میں کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ یہ دنیا نیکی اور بدی، خیر اور شر میں کسی امتیاز کے بغیر یوں ہی چلتی رہے گی جنھوں نے یہ گمان کر رکھا ہے ان کو شیطان نے خدا کی صفات کے باب میں سخت دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ ایک ایسا دن لازماً آنے والا ہے جس دن وہ لوگ عذاب شدید سے دوچار ہوں گے جنھوں نے کفر کیا ہو گا اور جن لوگوں نے ایمان و عمل صالح کی زندگی گزاری ہو گی وہ مغفرت اور اجر عظیم

کے حق دار ٹھہریں گے۔

اَفَمَنْ زُیِّنَ لَہٗ سُوْٓءُ عَمَلِہٖ فَرَاٰہُ حَسَنًا ط فَاِنَّ اللّٰہَ یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ز صلے فَلَا تَذْھَبْ نَفْسُکَ عَلَیْھِمْ حَسَرٰتٍ ط اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ بِمَا یَصْنَعُوْنَ (۸)

جو لوگ خدا کے قانون کی زد میں آ چکے وہ ایمان نہیں لائیں گے

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں تو اس میں تمہاری کسی تقصیر کو دخل نہیں ہے بلکہ یہ قانونِ الٰہی کی زد میں آئے ہوئے لوگ ہیں تو ان کے غم میں اپنے کو ہلکان نہ کرو۔ ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے تو جب وہ باخبر ہے تو ان کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کے وہ مستحق ہوں گے۔

'اَفَمَنْ زُیِّنَ لَہٗ سُوْٓءُ عَمَلِہٖ فَرَاٰہُ حَسَنًا' کے بعد جواب بر بنائے قرینہ محذوف ہے۔ اگر اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی۔ کیا وہ جس کی نگاہوں میں اس کی بدعملی کھبا دی گئی ہے اور وہ اپنی بدی کو نیکی سمجھنے لگا ہے، تم اس کو ہدایت دینے والے بن سکتے ہو؟ مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کا ہدایت پانا سنتِ الٰہی کے خلاف ہے تو ایسے لوگوں کی فکر میں اپنے کو گھلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرنا چاہیے۔ سورۂ زمر کی آیت ۱۹ میں یہی بات یوں ارشاد ہوئی ہے۔

اَفَمَنْ حَقَّ عَلَیْہِ کَلِمَۃُ الْعَذَابِ ط اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِی النَّارِ ج

کیا وہ جس پر عذاب کی بات پوری ہو چکی ہے! کیا تم اس کو بچانے والے بن سکو گے جو دوزخ میں پڑ چکا۔

اس ٹکڑے سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ کسی برائی کے ارتکاب کی ایک حالت تو وہ ہے کہ آدمی اس کا ارتکاب کرتا ہے لیکن اس کے اندر اس کے برائی ہونے کا احساس زندہ رہتا ہے۔ دوسری حالت یہ ہے کہ اس کی برائی اس کی نگاہوں میں اس طرح کھبا دی جاتی ہے کہ وہ اسی کو ہنر، اسی کو فیشن، اسی کو ترقی کا زینہ اور اسی کو تہذیب و تعلیم کا تقاضا سمجھنے لگتا ہے۔ پہلی حالت میں یہ توقع رہتی ہے کہ اس کو اگر تذکیر و تنبیہ کی جائے تو وہ سنبھل جائے گا لیکن دوسری حالت دل کے مسخ اور عقل کے ماؤف ہو جانے کی علامت ہے جس کو قرآن نے 'ختم قلوب' یا 'رین' سے تعبیر فرمایا ہے۔ جو اس بیماری میں مبتلا ہوا، وہ خدا کے قانون کی زد میں آ چکا، اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔

'فَاِنَّ اللّٰہَ یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ' یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے اور جس کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آ رہے ہیں۔ آگے اسی سورہ میں اس کی مزید وضاحت آ رہی ہے۔

'فَلَا تَذْھَبْ نَفْسُکَ عَلَیْھِمْ حَسَرٰتٍ ط اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ بِمَا یَصْنَعُوْنَ' مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے غم میں ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ انھوں نے خود عقلی و روحانی خودکشی کی ہے اگر یہ ایمان نہیں لا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تمہاری دعوت میں کوئی کسر ہے بلکہ ان کے دلوں پر

ٹھہر ہو چکی ہے تو ان کا غم کھانے کے بجائے ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ وہ ان کی ساری کارستانیاں دیکھ رہا ہے، ان کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کے یہ سزاوار ہوں گے۔

'حَسَرٰتٍ' حال بھی ہو سکتا ہے اور مفعول لہٗ بھی۔ کلامِ عرب میں دونوں کی نظیریں ملتی ہیں۔ اور 'عَلَيْهِمْ' کا تعلق میرے نزدیک 'حَسَرٰتٍ' سے ہے جس طرح 'يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ' میں ہے۔ اس کا جمع کی صورت میں آنا فرطِ غم کے اظہار کے لیے ہے۔

۲۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۹-۱۸

آگے اس وعدۂ نصرت کی، جس کا ذکر اوپر آیت ۵ میں ہوا ہے، بطورِ تمہید پہلے دلیل بیان فرمائی ہے، پھر بتایا ہے کہ جس کو خدا کا تقرب اور اس کی بارگاہ میں سرخ روئی مطلوب ہو وہ جھوٹے معبودوں کو تقرب کا ذریعہ بنانے کے بجائے اس کا صحیح طریقہ اختیار کرے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی ایمان اور عملِ صالح کی راہ پر چلے۔ ایمان خدا کی طرف صعود کرنے والی چیز ہے اور عملِ صالح اس کو سہارا دیتا اور رفعت بخشتا ہے۔ اس کے سوا خدا کے تقرب کی کوئی اور راہ نہیں ہے۔ جن لوگوں نے یہ راہ چھوڑ کر دوسری راہیں نکالی ہیں اور اصل راہ سے لوگوں کو ہٹانے کے لیے رات دن طرح طرح کی سازشوں میں سرگرم ہیں ان کی ساری سازشوں کے تار و پود ایک دن بکھر جائیں گے۔

پھر یہ واضح فرمایا کہ مال و اولاد میں بڑھوتری، عمر میں کمی بیشی اور اس طرح کی تمام باتیں اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہیں، فرشتوں یا جنوں یا دوسرے فرضی معبودوں کو ان میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اس کائنات کے اضداد میں جو توافق ہے وہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اس کے اندر صرف ایک ہی خدائے قادر و قیوم کا ارادہ کارفرما ہے۔ اس کے سوا کسی کو ذرہ برابر بھی کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

اس کے بعد لوگوں کو متنبہ فرمایا کہ یہ دعوت جو تمھیں دی جا رہی ہے تمھارے ہی نفع کے لیے دی جا رہی ہے۔ خدا کو تمھاری کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ تمھی خدا کے محتاج ہو۔ یہ دعوت قبول کرو گے تو اپنی دنیا و عاقبت سنوارو گے اور اگر نہ کرو گے تو اپنے ہی کو تباہ کرو گے۔ ساتھ ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ کس مزاج کے لوگ اس دعوت کو قبول کریں گے اور کس طرح کے لوگ اس سے محروم رہیں گے ـــــ آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۹-۱۸
وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ
فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۝۹ مَنْ كَانَ

يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ۭ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ
وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ۭ وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّـيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ
شَدِيْدٌ ۭ وَمَكْرُ اُولٰۗىِٕكَ هُوَ يَبُوْرُ ۝١٠ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ
مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ۭ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ
اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۭ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ۭ
اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝١١ وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ڰ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ
سَاۗىِٕغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۭ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا
وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا
مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝١٢ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ
النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ڮ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۭ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ
مِنْ قِطْمِيْرٍ ۝١٣ۭ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَاۗءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا
اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۭ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۭ وَلَا يُنَبِّئُكَ
مِثْلُ خَبِيْرٍ ۝١٤ۧ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ ع ٧ ١٤
الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝١٥ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝١٦ۚ
وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۝١٧ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَ
اِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ
ذَا قُرْبٰى ۭ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا

الصَّلٰوةَ ۚ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝۱۸

ترجمۂ آیات ۹-۱۸ اور اللہ ہی ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو پس وہ ابھارتی ہیں بادلوں کو پھر ہم ان کو ہانکتے
ہیں کسی خشک زمین کی طرف پس ہم اس سے اس زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد از سرِ نو
زندگی بخش دیتے ہیں۔ اسی طرح لوگوں کا از سرِ نو زندہ ہو کر اٹھنا ہے۔ ۹

جو عزت کا طالب ہو تو یاد رکھے کہ عزت تمام تر اللہ ہی کے لیے ہے۔ اس کی طرف
صعود کرتا ہے پاکیزہ کلمہ اور عملِ صالح اس کلمہ کو سہارا دیتا ہے۔ اور جو لوگ بری چالیں چل
رہے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اور ان کی چال نابود ہو کے رہے گی۔ ۱۰

اور اللہ نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر پانی کی بوند سے اور پھر تم کو جوڑے جوڑے
بنایا۔ اور کوئی عورت نہ حاملہ ہوتی ہے اور نہ جنتی ہے مگر اس کے علم سے۔ کسی عمر والے کی
عمر میں نہ زیادتی ہوتی نہ کمی مگر یہ ایک کتاب میں نوشتہ ہے۔ یہ سب اللہ کے لیے
آسان ہے۔ ۱۱

اور دونوں دریا یکساں نہیں ہیں۔ ایک شیریں، پیاس بجھانے والا، پینے کے لیے
خوش گوار ہے اور ایک کھاری کڑوا ہے۔ اور تم دونوں سے تازہ گوشت کھاتے اور زینت
کی چیز نکالتے ہو جس کو پہنتے ہو۔ اور تم دیکھتے ہو کشتیوں کو اس میں پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں
تاکہ تم اس کے فضل کے طالب بنو اور تاکہ تم شکر گزار بنو۔ وہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں
اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ ہر ایک
گردش کرتا ہے ایک معین وقت کے لیے۔ وہی اللہ تمھارا رب ہے، اسی کی بادشاہی ہے۔
رہے وہ جن کو اس کے سوا تم پکارتے ہو تو وہ ذرہ برابر کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں رکھتے۔

اگر تم ان کو پکارو گے تو وہ تمھاری فریاد نہیں سنیں گے اور اگر سنیں گے بھی تو تمھاری فریاد رسی نہیں کریں گے اور قیامت کے دن تمھارے شرک کا انکار کریں گے۔ اور ایک باخبر کی طرح کوئی دوسرا تمھیں آگاہ نہیں کر سکتا! ۱۲-۱۴

اے لوگو! تمھی اللہ کے محتاج ہو، اللہ تو بے نیاز و ستودہ صفات ہے۔ اگر وہ چاہے تو تمھیں فنا کر دے اور ایک نئی مخلوق لا کھڑی کرے اور یہ اللہ کے لیے ذرا مشکل نہیں۔ ۱۵-۱۷

اور کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی اور اگر کوئی بوجھل جان اپنے بوجھ کے اٹھانے میں کسی سے طالب مدد ہوگی تو اس میں ذرا بھی اس کا ہاتھ نہیں بٹایا جائے گا اگرچہ وہ قرابت مند ہی کیوں نہ ہو۔ تم تو بس انہی لوگوں کو ڈرا سکتے ہو جو غیب میں رہتے اپنے رب سے ڈرتے اور نماز کا اہتمام کرتے ہیں۔ اور جو پاکی حاصل کرتا ہے وہ اپنے لیے حاصل کرتا ہے اور اللہ ہی کی طرف سب کی واپسی ہے۔ ۱۸

۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ (۹)

یہ دنیا اپنے وجود میں ایک تعلیم گاہ ہے

اوپر آیت ۵ میں جس وعدہ شدنی کی یاد دہانی فرمائی ہے کائنات کے مشاہدات سے یہ اس کی دلیل پیش کی ہے کہ اس کو مستبعد نہ سمجھو۔ مرنے کے بعد لوگوں کو قبروں سے اٹھا کھڑا کرنا اللہ کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ تم اسی دنیا میں برابر دیکھتے ہو کہ زمین بالکل خشک پڑی ہوتی ہے، اس میں سبزہ اور روئیدگی کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ہوتا کہ اللہ کسی طرف سے ہواؤں کو بھیجتا ہے۔ وہ تمھارے دیکھتے دیکھتے بادلوں کو ابھارتی اور جمع کرتی ہیں۔ پھر ہم ان کو اس مردہ زمین کی طرف ہانک کے لے جاتے اور اس کو سیراب کر دیتے ہیں جس سے اس کے ہر گوشے میں از سر نو زندگی نمودار ہو جاتی ہے۔ فرمایا کہ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ اسی طرح قیامت کے دن لوگوں کا از سر نو جی کر اٹھنا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ مرنے اور مرنے کے بعد زندہ ہونے کا

مشاہدہ تو تم کو اس دنیا میں اللہ برابر کرا رہا ہے تو تم قیامت کو ناممکن کیوں خیال کیے بیٹھے ہو! ــــ یہ حقیقت اس کتاب میں جگہ جگہ ہم واضح کرتے آرہے ہیں کہ یہ دنیا اپنے وجود میں ان تمام حقائق کی تعلیم کے لیے ایک بہترین تعلیم گاہ ہے جن کی قرآن تعلیم دے رہا ہے۔ اگر انسان عقل و بصیرت سے کام لے تو قرآن کے ہر دعوے کی دلیل اس کو اپنے دہنے بائیں سے مل سکتی ہے۔

عربیت کا ایک اسلوب

اس آیت میں اسلوب کلام بھی قابلِ توجہ ہے۔ پہلے ماضی کا صیغہ 'اَرْسَلَ' استعمال ہوا ہے۔ پھر مضارع 'تُثِیْرُ' آگیا۔ اس کے بعد 'سُقْنٰـهُ' اور 'اَحْیَیْنَا' متکلم کے صیغے آگئے۔ اسلوب کا یہ تنوع اپنے اندر گوناگوں خوبیاں رکھتا ہے جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ ماضی تو صرف بیانِ واقعہ کے لیے آتا ہے۔ مضارع میں تصویرِ حال کا پہلو بھی ہوتا ہے اور متکلم کا صیغہ التفات و عنایاتِ خاص پر دلیل ہوتا ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ۭ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ۭ وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ وَمَكْرُ اُولٰۗىِٕكَ هُوَ يَبُوْرُ (۱۰)

خدا کے تقرب کا واحد ذریعہ ایمان اور عمل صالح ہے

مطلب یہ ہے کہ قیامت تو بہر حال شدنی ہے اور ہر ایک کو اللہ کے حضور میں پیش ہونا ہے۔ رہا یہ سوال کہ خدا کے ہاں کن کو عزت و سرخروئی حاصل ہوگی اور کن کو ذلت و نامرادی سے دوچار ہونا پڑے گا تو جن کو اس سوال کا صحیح جواب مطلوب ہے وہ یاد رکھیں کہ عزت تمام تر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اس وجہ سے جس کو بھی یہ حاصل ہوگی اسی کے تعلق اور اسی کی عزت بخشی سے حاصل ہوگی۔

'اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ'، یہ اس عزت کے حاصل کرنے کا طریقہ ارشاد ہوا ہے کہ بندوں کی طرف سے اللہ کی طرف صعود کرنے والی چیز کلمۂ طیب، یعنی کلمۂ ایمان، ہے۔ اس کے سوا دوسری کوئی چیز نہیں جو خدا سے توسل اور قربت کا ذریعہ بن سکے۔ اس کلمۂ ایمان کو جو چیز سہارا دیتی اور رفعت بخشتی ہے وہ عمل صالح ہے۔ عمل صالح کے بغیر کلمۂ ایمان مرجھا کے رہ جاتا ہے۔ گویا کلمۂ ایمان کی مثال انگور کی بیل کی ہوتی جو ہے تو بجائے خود نہایت ثمربار لیکن اس کی شادابی و ثمرباری کا تمام تر انحصار اس امر پر ہے کہ اس کو کوئی سہارا ملے جس پر وہ چڑھے، پھیلے اور پھولے پھلے۔ یہ سہارا اس کو عمل صالح سے حاصل ہوتا ہے۔ عمل صالح ہی اس کو پروان چڑھاتا اور مثمر و بارآور بناتا ہے۔ پس جس طرح انگور کی بیل سہارے کے بغیر سکڑ کے رہ جاتی ہے اسی طرح ایمان بھی عمل صالح کے بدون مرجھا کے رہ جاتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے 'اَلْكَلِمُ الطَّيِّبُ' سے کلمۂ ایمان ہی مراد لیا ہے اور یہاں اس کے پہلو بہ پہلو عمل صالح کا ذکر خود اس بات کی شہادت ہے کہ اس سے کلمۂ ایمان ہی مراد ہے۔ لفظ 'طَیِّب' اس کلمہ کی زرخیزی و ثمرباری کی طرف اشارہ کر رہا ہے اس لیے کہ فلسفۂ دین کے نقطۂ نظر سے یہی کلمہ تمام علم و حکمت

بی جڑ ہے۔ جس نے اس کو پا لیا اس نے تمام علم و حکمت کے خزانے کی کلید پا لی اور یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ ایمان اور عمل صالح دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ جس طرح ایمان کے بغیر عمل کی کوئی بنیاد نہیں اسی طرح عمل کے بغیر ایمان ایک بے جان شے ہے۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے سورۂ ابراہیم کی آیات ۲۴-۲۶ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں ایک نظر اس پر ڈال لیجیے۔

یہ بات یہاں مشرکین پر یہ حقیقت واضح کرنے کے لیے فرمائی گئی ہے کہ تم اپنے معبود ملائکہ کو خدا کے ہاں عزت و سرفرازی کا واسطہ سمجھے بیٹھے ہو حالانکہ عزت صرف اللہ کے لیے ہے اور اللہ کا قرب حاصل کرنے کا واحد ذریعہ وہ ایمان ہے جس کے ساتھ عمل صالح کی تائید موجود ہو۔ قرآن میں مشرکین کی نسبت یہ بات جگہ جگہ نقل ہوئی ہے کہ وہ اپنے معبودوں کو خدا کے ہاں عزت و سرخروئی کا ذریعہ خیال کرتے تھے مثلاً

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى (الزمر: ۳)
ہم ان کو صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا سے قریب تر کر دیں۔

دوسری جگہ ہے۔

وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ آلِهَةً لِيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا (مریم: ۸۱)
اور انھوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود بنا رکھے ہیں تاکہ وہ ان کے لیے عزت کا ذریعہ بن سکیں۔

ان کے اسی واہمہ پر یہاں ضرب لگائی ہے کہ اس جنت الحمقاء سے نکلو اور خدا کے ہاں عزت کے طالب ہو تو اس کے لیے ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کرو۔

'وَالَّذِينَ يَمْكُرُونَ السَّيِّئَاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ' یعنی جو لوگ اس حقیقت کا مواجہہ کرنے کے بجائے اپنے پندار کے تحفظ اور اللہ کے دین اور اس کے رسول کو زک پہنچانے کے لیے طرح طرح کی بری چالیں چل رہے ہیں وہ یاد رکھیں کہ اس طرح ان کو عزت نہیں حاصل ہوگی بلکہ وہ اپنے لیے ایک سخت عذاب کا سامان کر رہے ہیں۔

اس ٹکڑے میں 'سَيِّئَاتِ' کا نصب کچھ بیگانہ سا محسوس ہوتا ہے اس لیے کہ فعل 'مکر' اس طرح متعدی نہیں ہوتا۔ صاحب کشاف نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ 'سَيِّئَاتِ' یہاں مصدر کی صفت ہے۔ یعنی 'یمکرون المکرات السیئات' یہ توجیہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ آگے آیت ۴۳ میں اس کی نظیر موجود ہے۔

'وَمَكْرُ أُولَئِكَ هُوَ يَبُورُ' یعنی جو لوگ اسی فریب نفس میں خود بھی مبتلا اور دوسروں کو بھی مبتلا رکھنے کے لیے رات دن جوڑ توڑ میں سرگرم ہیں وہ یاد رکھیں کہ ایک دن ان کی یہ ساری سازشیں اور سرگرمیاں نابود ہو جائیں گی۔ یہاں مبتدا کے اعادے سے کلام میں یہ زور پیدا ہو گیا ہے کہ ان لوگوں کی ان ساری سازشوں سے کسی دوسرے کا کچھ نہیں بگڑے گا بلکہ تباہی ان کی سازشوں ہی پر آئے گی اور وہ انھی کی خرابی کا باعث ہوں گی۔ آگے اس مضمون کو کھول دیا ہے۔ فرمایا ہے 'وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا

بِاَھْلِہٖ (اور بُری چالیں انہی کو تباہ کرتی ہیں جو بری چالیں چلتے ہیں) اس لیے کہ حق ایک متاع مشترک اور سب کی فلاح کا ذریعہ ہے۔ اگر کوئی اس کی مخالفت کرتا ہے تو خود اپنی ہی آنکھیں پھوڑتا اور اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارتا ہے۔

وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَۃٍ ثُمَّ جَعَلَکُمْ اَزْوَاجًا ؕ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰی وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِہٖ ؕ وَمَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِہٖٓ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ (۱۱)

مشرکین کے ایک واہمہ کی تردید

یعنی اولاد اور عمر میں جو کمی بیشی بھی ہوتی ہے وہ اللہ کے علم اور اسی کے حکم سے ہوتی ہے۔ ان چیزوں میں بھی تمہارے ان دیویوں دیوتاؤں کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اس وجہ سے ان کے لیے بھی تمہیں خدا ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اس کے سوا کسی دوسرے کا سہارا نہیں ڈھونڈنا چاہیے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مال و اولاد اور صحت و زندگی اور اس قبیل کی دوسری مطلوبات ہمیشہ شرک کے عوامل میں سے رہی ہیں۔ جن کے ہاں اولاد نہیں ہوتی، یا ہوتی ہے لیکن زندہ نہیں رہتی، یا صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں، اولاد نرینہ نہیں پیدا ہوتی اس طرح کے لوگ اگر وہمی ہوتے ہیں تو شیطان بڑی آسانی سے ان کا رُخ تھانوں، استھانوں، قبروں اور مزاروں کی طرف موڑ دیتا ہے۔ مشرکین عرب کے شرک میں بھی اس عامل کو بڑا دخل رہا ہے۔ وہ اپنے معبودوں کو آسمان و زمین کا خالق تو نہیں سمجھتے تھے لیکن رزق اور مال و اولاد وغیرہ کے معاملات میں ان کو ——— خاص طور پر فرشتوں کو ——— بہت دخیل سمجھتے تھے۔ اسی طرح بیماری اور موت وغیرہ کے معاملے میں وہ جنوں کو متصرف خیال کر کے ان کی پوجا کرتے۔ ہم سورۂ انعام کی تفسیر میں ذکر کر آئے ہیں کہ بعض جنوں کو وہ اتنا خطرناک سمجھتے تھے کہ ان کے لیے اپنی اولاد تک کی قربانی کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر کسی بیٹے یا بیٹی کی قربانی دے کر ان کو راضی نہ رکھا جائے تو یہ ساری اولاد چٹ کر جاتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ کسی بیماری میں مبتلا ہوتے وہ بھی ان دیویوں دیوتاؤں کی طرف رجوع کرتے اور ان سے صحت اور طولِ عمر کی دعا کرتے۔ اس آیت میں انہی اوہام پر ضرب لگائی ہے۔

ایک مسلّم حقیقت کی یاددہانی

وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَۃٍ ثُمَّ جَعَلَکُمْ اَزْوَاجًا۔ یہ ٹکڑا آگے کے مضمون کے لیے بطور تمہید ہے۔ اس میں اس مسلّم حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ اللہ ہی ہے جس نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے ان کی نسل چلائی پھر تم کو جوڑے جوڑے بنایا۔ مطلب یہ ہے کہ سارا گھر بنایا اور بسایا تو خدا نے اور یہ ایسی حقیقت ہے جس سے تمہیں بھی انکار نہیں ہے تو اس گھر کو بسا کر آخر خدا کو کیا مشکل پیش آئی کہ وہ اس کے رزق، اولاد اور عمر وغیرہ کے معاملات دوسروں کے سپرد کرنے پر مجبور ہو گیا؟ کیا جو تمہیں مٹی سے بنا سکتا ہے، پانی کی ایک بوند سے تمہاری نسل چلا سکتا ہے، تمہیں میاں بیوی کی صورت میں آباد کر سکتا ہے، وہ تمہارے رزق، تمہاری اولاد اور تمہاری عمر کے معاملات کو سرانجام دینے سے قاصر ہے کہ ان کے لیے تمہیں دوسرے آستانوں کا محتاج بنائے!

ایک غلط فہمی کا ازالہ

وَمَا تَحۡمِلُ مِنۡ اُنۡثٰی وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلۡمِہٖ ۔ یہ اوپر والی تمہید کے لازمی نتیجہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ جس نے آدم علیہ السلام کا یہ کنبہ بسایا ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کون عورت کب حاملہ ہوئی اور اس کے پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ کب اس کو جنے گی اور کس شکل میں جنے گی! ——— یہاں علم کا حوالہ خاص طور پر اس وجہ سے دیا کہ مشرکین عرب خدا کے خالق ہونے کے منکر نہیں تھے ان کو وہم تھا تو یہ تھا کہ اتنی وسیع و عریض دنیا کے ہر معاملے کی خبر خدا کو کس طرح ہو سکتی ہے اس وجہ سے بہت سے معاملات، جو رزق و عمر اور اولاد وغیرہ سے متعلق ہیں، اس نے اپنے شرکاء کے حوالے کر دیے ہیں۔ قرآن نے 'اِلَّا بِعِلۡمِہٖ' کے لفظ سے ان کے اسی واہمہ پر ضرب لگائی ہے کہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی اس دنیا میں ایسا نہیں ہوتا جو اس کے خالق کے دائرۂ علم سے باہر ہو۔

وَمَا یُعَمَّرُ مِنۡ مُّعَمَّرٍ وَّلَا یُنۡقَصُ مِنۡ عُمُرِہٖۤ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ ۔ لفظ 'مُعَمَّرٌ' یہاں طویل العمر کے مفہوم میں نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جس کو کوئی عمر ملتی ہے خواہ طویل یا قصیر۔ صاحب کشاف نے اس کا یہی مفہوم لیا ہے اور ہمارے نزدیک یہی صحیح ہے۔

یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید وضاحت ہے کہ جس کو بھی کوئی عمر نصیب ہوتی ہے اور پھر اس عمر میں سے جو گھٹتے اور دن کم ہوتے ہیں وہ خدا کے حکم اور علم سے ہوتے ہیں۔ 'اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ' یہ اوپر کے الفاظ 'اِلَّا بِعِلۡمِہٖ' کی جگہ پر ہے اور اس سے اوپر والا مضمون مزید محکم و موثق ہو گیا ہے۔ یعنی صرف یہی نہیں کہ خدا ان ساری باتوں کو جانتا ہے بلکہ ان میں سے ہر چیز ایک عظیم کتاب میں مندرج ہے۔ اس وہم میں نہ رہو کہ خدا کسی چیز کو بھول جائے گا۔

اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ ۔ یہ اسی شبہ کا ازالہ ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ اہل عرب اس وہم میں مبتلا تھے کہ بھلا خدا تن تنہا ان تمام جزئیات امور کا احاطہ کس طرح کر سکتا ہے! اس وہم کے تحت انھوں نے خدا کی مدد کے لیے شرکاء و اعوان ایجاد کیے اور پھر ان کی عبادت میں اس طرح لگے کہ خدا ان کے ہاں ایک وجود معطل ہو کے رہ گیا ——— یہ ان کے اسی واہمہ کی تردید ہے کہ خدا کے لیے ان کاموں میں سے کوئی کام بھی مشکل نہیں ہے کہ وہ کسی شریک و مددگار کا محتاج ہو۔

وَمَا یَسۡتَوِی الۡبَحۡرٰنِ ٭ۖ ہٰذَا عَذۡبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُہٗ وَہٰذَا مِلۡحٌ اُجَاجٌ ؕ وَمِنۡ کُلٍّ تَاۡکُلُوۡنَ لَحۡمًا طَرِیًّا وَّتَسۡتَخۡرِجُوۡنَ حِلۡیَۃً تَلۡبَسُوۡنَہَا ۚ وَتَرَی الۡفُلۡکَ فِیۡہِ مَوَاخِرَ لِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِہٖ وَلَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ۔ یُوۡلِجُ الَّیۡلَ فِی النَّہَارِ وَیُوۡلِجُ النَّہَارَ فِی الَّیۡلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ ۫ۖ کُلٌّ یَّجۡرِیۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ لَہُ الۡمُلۡکُ ؕ وَالَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ مَا یَمۡلِکُوۡنَ مِنۡ قِطۡمِیۡرٍ ۔ ۱۲-۱۳

کائنات کے اضداد کا توافق توحید کی دلیل ہے

یہ ایک دوسرے پہلو سے شرک اور شرکاء کی تردید فرمائی گئی۔ اس کائنات میں اضداد کا جو تصادم ہے یہ بھی شرک کے نہایت اہم عوامل میں سے ہے۔ قرآن نے مختلف پہلوؤں سے اس کی تردید فرمائی ہے اور ہم

اس کی وضاحت کرتے آرہے ہیں۔ یہاں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں اضداد کا وجود اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کے اندر مختلف ارادے کارفرما ہیں اس لیے کہ اس کے اضداد میں ظاہری تضاد کے ساتھ ساتھ نہایت گہری سازگاری بھی پائی جاتی ہے جس سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ کوئی بالاتر اور ہمہ گیر و ہمہ جہت قوتِ قاہرہ ان تمام اضداد پر حاوی ہے جو ان کو اپنی حکمت کے تحت اس کائنات کی مجموعی بہبود کے لیے استعمال کر رہی ہے۔

'وَمَا یَسْتَوِی الْبَحْرٰنِ ۔ الآیۃ' یعنی دیکھو، دو سمندر ہیں اور دونوں اپنی ظاہری خصوصیات و صفات میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ایک کا پانی شیریں، پیاس بجھانے والا اور خوشگوار ہے، دوسرے کا کھاری، کڑوا۔ یہ دونوں آپس میں ٹکراتے ہیں لیکن یہ نہیں ہوتا کہ کھاری سمندر میٹھے سمندر پر غالب ہو کر اس کو کھاری بنا دے یا شیریں سمندر کھاری کے مزاج کو بدل دے بلکہ ایک بالاتر قوت نے ان دونوں کو ٹکرانے کے باوجود ان کے حدود کا پابند کر رکھا ہے۔ سورۂ رحمان میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ ۔ بَیْنَھُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ (الرحمان: ۱۹-۲۰) (اس نے چھوڑے دو دریا، دونوں باہم دگر ٹکراتے ہیں لیکن ان دونوں کے درمیان ایک اوٹ ہوتی ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے)۔

پھر یہ دیکھو کہ کس طرح یہ اپنے تضاد و اختلاف کے باوجود اپنے سے بالاتر مقصد کی خدمت بجا لاتے ہیں کہ تم دونوں ہی سے اپنے لمبے لمبے بحری سفروں میں جہاں تازہ گوشت حاصل کرنا ناممکن ہوتا، ان سے تازہ گوشت حاصل کر لیتے ہو اور غذا کے ساتھ اپنی زینت کے لیے ان سے قیمتی موتی بھی نکالتے ہو۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ یہ تمہارے لیے اس طرح مسخر ہیں کہ تمہارے جہازات ان کے سینے پر سے موجوں کو پھاڑتے ہوئے چلتے ہیں تاکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر کر کے تم اللہ کے رزق و فضل کے طالب بنو اور اس کے شکرگزار رہو ۔۔۔ مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کے ظاہری تضاد میں گم ہو کے نہ رہ جاؤ بلکہ ان اضداد کے باہمی توافق پر بھی نگاہ ڈالو تو یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ ایک ہی خدائے قادر و قیوم نے اس دنیا کو وجود بخشا ہے اور اسی نے اپنی قدرت و حکمت سے اس کے تمام اجزائے مختلفہ کو انسان کی خدمت میں لگا رکھا ہے تاکہ انسان اپنے پروردگار کا شکرگزار رہے۔

'یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ الآیۃ' ۔ یہ اسی حقیقت کی طرف ایک دوسری مثال سے توجہ دلائی ہے کہ یہی حال تمہارے سامنے روز آنے والی رات اور روز ظاہر ہونے والے دن کا بھی ہے۔ وہ بھی بظاہر ضدین کی نسبت رکھتے ہیں لیکن ان کے درمیان بالکل زوجین کا توافق پایا جاتا ہے۔ دونوں ہی اس دنیا کے بقا اور تمہاری راحت و معیشت کے لیے ضروری ہیں۔ یہی حال سورج اور چاند کا بھی ہے۔ نادانوں نے ان کو معبود بنا کر پوجا حالانکہ وہ اپنے وجود سے شہادت دیتے ہیں کہ خدا نے ان کو اپنی خلق کی خدمت کے لیے مسخر کر رکھا ہے۔ چنانچہ دونوں اپنے معین نظامِ اوقات کے ساتھ برابر تمہاری خدمت میں سرگرم رہتے ہیں۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۔ یہ خلاصہ ہے اوپر کی ساری بحث کا کہ یہی اللہ جس کی یہ شانیں، تدبیریں اور حکمتیں دیکھتے ہو تمہارا رب ہے اور اسی کے قبضۂ قدرت میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے۔

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۔ قِطْمِیر اس باریک غلاف کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے اوپر ہوتا ہے۔

یہ وہی بات منفی اسلوب سے فرمائی گئی ہے کہ وہ جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے اور پوجتے ہو تو وہ اس دنیا کے خلق و تدبیر میں ذرہ برابر بھی دخل نہیں رکھتے۔

اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۭ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۭ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ (۱۴)

اِسْتَجَابَ لَهٗ کے معنی ہیں اس کا جواب دیا یا اس کی فریاد رسی کی۔

فرضی معبودوں کی بے بسی دنیا اور آخرت دونوں میں

یہ ان کے مزعومہ دیوتاؤں کی بے بسی اور بے حقیقتی واضح فرمائی ہے کہ اگر تم اپنی کسی مشکل میں ان کو مدد کے لیے پکارو گے تو اول تو وہ تمہاری فریاد سنیں گے نہیں اور سن بھی لیں تو وہ تمہاری کوئی فریاد رسی نہیں کریں گے۔ ان کی یہ بے بسی اس دنیا میں بھی واضح ہے اور آخرت میں یہ مزید ہو جائے گی۔ مشرکین جن چیزوں کو پوجتے تھے اول تو ان کا کوئی مستقل وجود ہی نہیں تھا اس وجہ سے ان کے سننے یا فریاد رسی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر کچھ ایسی ہستیوں کو پوجتے تھے جن کا کوئی وجود ہے تو اول تو وہ آخرت میں اپنی بے خبری کا اظہار کریں گی کہ ہمیں علم نہیں کہ یہ لوگ ہماری عبادت کرتے رہے ہیں۔ ثانیاً ان میں سے جو صالحین ہوں گے مثلاً ملائکہ اور انبیاء وہ تو صاف الفاظ میں اعلان برأت کریں گے۔ اور جو اشرار ہوں گے مثلاً جنات و شیاطین تو وہ ان فریاد کرنے والوں کو جواب دیں گے کہ یہ تمہاری بدبختی تھی کہ تم نے ہماری پرستش کی، اب اس کا انجام بھگتو۔ اب نہ تم ہمارے کچھ کام آ سکتے اور نہ ہم تمہاری کوئی فریاد رسی کر سکتے ہیں۔

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۔ یعنی اس دنیا میں تو وہ تمہاری فریاد سے بے خبر اور تمہاری فریاد رسی سے بے بس ہیں اور قیامت کے دن وہ تمہارے شرک کا انکار کریں گے۔ چنانچہ فرشتوں کے انکار کی تفصیل سورۂ سبا میں بدیں الفاظ گزر چکی ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ (سبا: ۴۰-۴۱)

اور اس دن کا دھیان کرو جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کرے گا، پھر فرشتوں سے پوچھے گا کہ کیا یہ لوگ تمہاری پرستش کرتے رہے ہیں؟ وہ جواب دیں گے کہ تو پاک ہے! ان کے مقابل میں تو ہمارا کارساز ہے بلکہ یہ لوگ جنوں کی پوجا کرتے رہے ہیں۔

نہایت بلیغ تنبیہ

وَلَا یُنَبِّئُکَ مِثْلُ خَبِیْرٍ۔ یہ آخر میں تنبیہ اور نہایت ہی زوردار اور بلیغ تنبیہ ہے۔ خَبِیْرٍ کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان باتوں کو سن لو اور اچھی طرح سن لو اس لیے کہ غیب کے پردوں میں کیا ہے اور کل کیا کچھ تمھارے سامنے آنے والا ہے اس کا ایک حقیقی باخبر ہی جانتا ہے۔ اس سے بڑھ کر تمھیں ان حقائق سے کوئی دوسرا باخبر نہیں کر سکتا۔ تمھاری بدقسمتی ہوگی اگر تم نے اس کی قدر نہ کی اور جھوٹی آرزوؤں میں پھنسے رہ گئے!

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ ج وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ۝ اِنْ یَّشَاْ یُذْھِبْکُمْ وَیَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ ۝ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ (۱۵-۱۷)

یہ اسی تنبیہ پر اضافہ اور نہایت زوردار اضافہ ہے۔ خطاب بھی 'یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ' کے الفاظ سے ہے کہ سب کان کھول کر سن لیں کہ تعلیم و تذکیر کا یہ سارا اہتمام جو کیا گیا ہے، اور خدا کا رسول لوگوں کو جگانے اور جھنجھوڑنے کے لیے اپنے رات دن جو ایک کیے ہوئے ہے تو اس لیے نہیں کہ لوگوں کے ایمان نہ لانے سے خدا کا کوئی کام اٹکا ہوا ہے، خدا تو بالکل بے نیاز اور اپنی ذات میں ستودہ صفات ہے، البتہ تم لوگ خود خدا کے محتاج ہو، اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ خدا کی بے نیازی کا تو یہ عالم ہے کہ وہ چاہے تو تم سب کو فنا کر دے اور تمھاری جگہ ایک دوسری نئی مخلوق لا بسائے۔ اگر وہ یہ کرنا چاہے تو یہ کام ذرا بھی اس کے لیے مشکل نہیں ہے۔ یہ محض تمھارے اوپر اس کی رحمت و عنایت ہے کہ تمھاری ان ناقدریوں اور ناشکریوں کے باوجود تمھیں مہلت دیے جا رہا ہے۔ بہتر ہے کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاؤ ورنہ یاد رکھو کہ نہ خدا کا کچھ بگاڑو گے نہ اس کے رسول کا بلکہ اپنے ہی کو تباہ کرو گے۔

'ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ' کی وضاحت ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں کہ خدا اپنی ذات میں کامل ہے، اس کا یہ کمال اس کی ذات سے خارج کی کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔ ساتھ ہی وہ حمید یعنی تمام صفاتِ حمد سے متصف بھی ہے۔ خلق کے ساتھ اس کا تعلق کسی احتیاج پر نہیں بلکہ تمام تر اس کی رحمت و عنایت پر مبنی ہے۔

من نہ کردم خلق تا سودے کنم
بلکہ کردم خلق تا جودے کنم

وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ط وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَۃٌ اِلٰی حِمْلِھَا لَا یُحْمَلْ مِنْہُ شَیْءٌ وَّلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی ط اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَیْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ط وَمَنْ تَزَکّٰی فَاِنَّمَا یَتَزَکّٰی لِنَفْسِہٖ ط وَاِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ (۱۸)

یہ اسی اوپر والے مضمون کی مزید وضاحت دوسرے پہلو سے ہے۔ فرمایا کہ اس دن کوئی جان کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی بلکہ ہر ایک کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑے گا۔

'وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى'۔ 'مُثْقَلَةٌ' سے پہلے موصوف محذوف ہے یعنی 'نفس مثقلۃ' (اپنے بارِ گناہ کے نیچے دبی ہوئی جان)۔ اسی طرح 'الٰی حِمْلِهَا' میں 'حِمْل' سے پہلے مضاف محذوف ہے اور 'کان' کے بعد اس کا اسم 'المدعو' محذوف ہے۔ یہ تمام محذوفات اعلیٰ عربیت کے معروف قواعد کے مطابق ہیں۔

آنحضرت صلعم کو تسلی

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی اپنے گناہوں سے بوجھل جان کسی کو پکارے گی کہ ذرا وہ اس کے بوجھ کے اٹھانے میں اس کو سہارا دے دے تو کوئی اس کا ہاتھ ٹیلنے والا نہیں بنے گا اگرچہ جس کو وہ مدد کے لیے پکارے وہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ نیک تو اس لیے اس کا ہاتھ نہیں بٹائیں گے کہ جب وہ دنیا میں اس کے گناہوں میں اس کے ساتھی نہ بنے تو وہ آخرت میں اس کے ساتھی کیوں بنیں اور جو بد ہوں گے وہ خود اپنے بوجھ کے تلے دبے ہوں گے وہ کسی دوسرے کو کیا سہارا دے سکیں گے!

'اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ'۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ تم ان حقائق سے لوگوں کو باخبر کردو، اگر یہ متنبہ ہوتے ہیں تو فبہا۔ نہیں ہوتے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ تمہارا انذار صرف انہیں لوگوں پر کارگر ہو سکتا ہے جو اپنی عقل اور سمع و بصر و فؤاد کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں اور غیب ہی رہتے اپنے رب سے ڈریں اور نماز کا اہتمام کریں رہے وہ لوگ جو سب کچھ آنکھوں سے دیکھ کر ماننا چاہتے ہیں تو ان کا علاج تمہارے پاس نہیں ہے۔ ان کا معاملہ ہمارے اوپر چھوڑو۔

'وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ' کا ذکر یہاں ایمان کے اولین ثمرہ اور خشیتِ رب بالغیب کی علامت کے طور پر ہوا ہے۔ جو شخص غیب میں خدا سے ڈرتا ہے وہ لازماً نماز کا اہتمام کرتا ہے۔ جو نماز سے بے پروا ہے وہ خدا سے بے پروا ہے اگرچہ وہ زبان سے ایمان کے کتنے ہی بلند بانگ دعوے کرے۔

'وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ'۔ یہ نماز کے فائدے کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جو شخص گناہوں کے بوجھ سے سبکدوش اور پاکیزہ ہونا چاہتا ہو وہ جھوٹے سہاروں پر اعتماد کرنے کے بجائے نماز کا اہتمام کرے۔ یہ چیز اس کو گناہوں سے پاک کرے گی اور جس نے پاکیزگی حاصل کی وہ اپنا ہی بھلا کرے گا اس لیے کہ اللہ کسی کی عبادت و اطاعت کا محتاج نہیں ہے بلکہ بندے خود ہی اس کے محتاج ہیں اور سب کی واپسی بہرحال اسی کی طرف ہونی ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۱۹-۲۸

آگے یہ حقیقت واضح فرمائی کہ کس طرح کے لوگ ایمان لائیں گے اور کس قسم کے لوگ اس نعمت سے محروم رہیں گے۔ اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے اس کائنات کے اندر اضداد کے وجود کی طرف توجہ

ولائی کہ دیکھتے ہو کہ اس کے اندر روشنی بھی ہے اور تاریکی بھی، گرمی بھی ہے اور سردی بھی۔ اسی طرح زمین میں زرخیز قطعات بھی ہیں جو بارش کا چھینٹا پڑتے ہی لہلہا اٹھتے ہیں اور بنجر علاقے بھی ہیں جو ہزار بارش ہو لیکن ویران ہی پڑے رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح اشخاص و افراد کے اندر بھی مختلف قسم کی صلاحیتیں رکھنے والے ہیں۔ جن کی صلاحیتیں زندہ ہیں وہ اس رحمت کی بارش سے، جو قرآن کی صورت میں نازل ہوئی ہے، فائدہ اٹھائیں گے اور جن کی صلاحیتیں مردہ ہو چکی ہیں وہ اس کے فیض سے محروم رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح روشنی و تاریکی اور سردی و گرمی کو اس کائنات کی مجموعی مصلحت کے لیے پیدا کیا ہے اسی طرح اس کے اندر حق کے طالبوں کی طرح باطل کے پسند کرنے والوں کو بھی مہلت دی ہے اس لیے کہ حق و باطل کے اسی تصادم ہی کے اندر اہلِ حق کے جوہر نکھرتے ہیں اور اہلِ باطل پر اللہ کی حجت تمام ہوتی ہے ــــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ﴿١٩﴾ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ ﴿٢٠﴾ وَ آیات ۱۹-۲۸
لَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ ﴿٢١﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ۚ
إِنَّ اللَّهَ يُسْمِعُ مَن يَشَاءُ ۖ وَمَا أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِي الْقُبُورِ ﴿٢٢﴾
إِنْ أَنتَ إِلَّا نَذِيرٌ ﴿٢٣﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۚ
وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ﴿٢٤﴾ وَإِن يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَ
الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ وَبِالزُّبُرِ وَ
بِالْكِتَابِ الْمُنِيرِ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ أَخَذْتُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۖ فَكَيْفَ كَانَ
نَكِيرِ ﴿٢٦﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ ع ۱۲ ۱۵
ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا ۚ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ
مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ ﴿٢٧﴾ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ
وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَٰلِكَ ۗ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ
الْعُلَمَاءُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ ﴿٢٨﴾

ترجمۂ آیات ۱۹-۲۸

نابینا اور بینا دونوں یکساں نہیں ہوں گے اور نہ تاریکی اور روشنی اور سایہ اور دھوپ یکساں ہیں اور نہ زندہ اور مردے یکساں ہوں گے۔ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے سناتا ہے اور تم ان کو سنانے والے نہیں بن سکتے جو قبروں کے اندر ہیں۔ تم تو بس ایک نذیر ہو۔ ہم نے تم کو حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی ہے جس کے اندر ایک نذیر نہ آیا ہو۔ اور اگر یہ لوگ تم کو جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے جو لوگ ہوئے ہیں انھوں نے بھی جھٹلایا۔ ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل، صحیفوں اور روشن کتاب کے ساتھ آئے تھے۔ پھر میں نے ان لوگوں کو پکڑا تو دیکھو کیسی ہوئی ان کے اوپر میری پھٹکار! ۱۹-۲۶

تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا پس ہم نے اس سے مختلف رنگوں کے پھل پیدا کر دیے۔ اور پہاڑوں میں بھی سفید اور سرخ مختلف رنگوں کی دھاریاں ہیں اور بھجنگ کالی بھی۔ اور انسانوں، جانوروں اور چارپایوں کے اندر بھی مختلف رنگ کے ہیں۔ اسی طرح اللہ سے اس کے بندوں میں سے وہی ڈریں گے جو علم رکھنے والے ہیں۔ بے شک اللہ غالب اور بخشنے والا ہے۔ ۲۷-۲۸

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ (۱۹)

ہدایت و ضلالت کے معاملہ میں خدا کا قانون

'اعمٰی' سے مراد یہاں عقل و دل کے اندھے ہیں اور 'بصیر' سے وہ لوگ مراد ہیں جن کی عقل و دل کی صلاحیتیں زندہ ہیں اور وہ ان سے کام لیتے ہیں۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ تمھاری دعوت قبول کرنے کے معاملے میں ہر ایک کا حال یکساں نہیں ہوگا۔ جن لوگوں نے اپنی عقل کی آنکھیں پھوڑ لی ہیں اور جن کے دل بے نور ہو چکے ہیں وہ لوگ تمھاری دعوت قبول کرنے والے نہیں

بنیں گے خواہ تم کتنے ہی جتن کرو۔ تمھاری روشنی سے صرف وہی لوگ فائدہ اٹھائیں گے جن کے اندر بصیرت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ اس کی بخشی ہوئی فطری صلاحیتوں کو زندہ رکھتے اور ان کی قدر کرتے ہیں ان کی بصیرت و ہدایت میں وہ مزید اضافہ فرماتا ہے اور جو لوگ ان صلاحیتوں کی قدر نہیں کرتے ان کو مزید عطا ہونا تو درکنار ان سے وہ بھی سلب کر لی جاتی ہیں جو ان کو عطا ہوئی ہوتی ہیں۔ سورۂ نمل میں یہی مضمون ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝ وَمَا أَنْتَ بِهٰدِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۖ إِنْ تُسْمِعُ إِلَّا مَنْ يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا ۝ (النمل: ۸۰-۸۱)

تم مردوں کو اپنی بات نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو سنا سکتے جب کہ وہ پیٹھ پھیر کے بھاگے جا رہے ہوں۔ اور تم اندھوں کو بھی ان کی ضلالت سے موڑ کر ہدایت پر نہیں لا سکتے۔ تم تو بس انھیں کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان رکھنے والے ہوں۔

وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ۝ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ (۲۰-۲۱)

بُروں کے اعمال میں بھی اس کائنات کی مصلحت ہے

فرمایا کہ جس طرح اس دنیا میں تاریکی بھی ہے اور روشنی بھی، سایہ بھی ہے اور گرمی بھی؛ اور یہ دونوں یکساں نہیں ہو سکتے، اسی طرح یہ دونوں قسم کے لوگ جن کا ذکر اوپر ہوا یکساں نہیں ہو سکتے۔ تاہم جس طرح تاریکی اور روشنی، سایہ اور گرمی دونوں میں اس دنیا کی مصلحت مضمر ہے اسی طرح اس قسم کے لوگوں کے وجود میں بھی قدرت کی مصلحت ہے۔ اس مصلحت کا ذکر قرآن کے دوسرے مقامات میں ہوا ہے۔ وہاں واضح فرمایا ہے کہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے چونکہ انسان کے اختیار کے امتحان کے لیے پیدا کی ہے اس وجہ سے اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ اس میں ایک خاص حد تک ان لوگوں کو بھی مہلت ملے جو اس کی بخشی ہوئی صلاحیتوں کی قدر نہیں کرتے اور حق کی جگہ باطل ہی کے پرستار بن کے زندگی گزارتے ہیں۔

اس میں دوسرے 'لا' کے اعادے کو بعض اہل ادب نے زائد مانا ہے، لیکن ہمارے نزدیک یہ زائد نہیں بلکہ تاکید کے لیے ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ۚ إِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَاءُ ۚ وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ (۲۲)

یہ وہی مضمون دوسرے الفاظ اور دوسرے اسلوب میں بیان ہوا ہے۔ اس دور میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کی بیزاری سے بڑی پریشانی تھی۔ آپ کو اندیشہ تھا کہ مبادا اس میں آپ ہی کی کسی کوتاہی کو دخل ہو۔ آپ کی یہ پریشانی دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مختلف اسلوبوں سے تسلی دی کہ تمھارا کام زندوں کو سنانا ہے، مردوں کو جگانا تمھاری ذمہ داری نہیں ہے۔ جن کی صلاحیتیں زندہ ہیں

وہ تمھاری بات سن رہے ہیں اور مان رہے ہیں۔ رہے وہ جو عقلی و روحانی اعتبار سے بالکل مردہ ہو چکے ہیں اگر تم چاہتے ہو کہ یہ بھی تمھاری بات سننے والے بن جائیں تو یہ ہونے سے رہا۔

'اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ' ، 'اسماع' یہاں بات کو سننے اور ماننے کی توفیق دینے کے مفہوم میں ہے۔ یعنی یہ اللہ ہی ہے جو سچی بات سننے اور اس کو ماننے کی، جس کو چاہتا ہے، توفیق دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہر چاہنا اس کی حکمت کے تحت ہے۔ اس معاملے میں اس کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ اس کی بخشی ہوئی فطری صلاحیتوں کو زندہ رکھتے ہیں ان کو تو وہ مزید سننے سمجھنے اور ماننے کی توفیق بخشتا ہے اور جو لوگ اپنی فطری ہدایت کی قدر نہیں کرتے وہ اخلاقی اعتبار سے مردوں کے حکم میں ہیں ان کو زندہ کرنا خدا کے سوا کسی کے امکان میں نہیں۔

اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ۝ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۭ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (۲۳-۲۴)

رسول کی ذمہ داری

یہ تبلیغ و دعوت کے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری کی حد واضح فرما دی کہ تم بس لوگوں کو آنے والے خطرے سے آگاہ کر دینے والے ہو۔ یہ ذمہ داری تمھارے اوپر نہیں ہے کہ لوگ تمھاری بات مان بھی لیں۔ تم کو خدا نے حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ جن باتوں کی تم خبر دے رہے ہو ان میں سے ہر بات شُدنی ہے۔ پس تمھارا کام یہ ہے کہ جو لوگ تمھاری باتوں پر کان دھریں ان کو ان کے مبارک انجام کی خوش خبری سنا دو۔ اور جو لوگ تمھاری باتوں سے منہ موڑیں ان کو ان کے انجامِ بد سے آگاہ کر دو۔ اس سے زیادہ تمھاری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس وجہ سے تمھیں ان کے لیے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

'وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ' یعنی تم دنیا میں پہلے نذیر نہیں ہو، بلکہ ماضی میں جو قومیں گزری ہیں ان میں بھی اللہ نے اپنے نذیر بھیجے تو ان کی سرگزشت میں تمھارے لیے بھی سبق ہے اور تمھاری قوم کے لیے بھی درسِ عبرت ہے۔ تمھارے ساتھ اللہ وہی معاملہ کرے گا جو اس نے اپنے رسولوں کے ساتھ کیا اور تمھاری قوم کے ساتھ بھی لازماً وہی معاملہ کرے گا جو پچھلی قوموں کے ساتھ اس نے کیا۔

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ۝ ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ (۲۵-۲۶)

یہ اسی اجمال کی وضاحت ہے۔ فرمایا کہ اگر یہ لوگ تمھاری تکذیب کر رہے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ان سے پہلے جو قومیں گزری ہیں اسی طرح انھوں نے بھی اپنے اپنے رسولوں کی تکذیب کی۔ یہ روایت پہلے سے چلی آ رہی ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ پہلی بار تمھاری ہی قوم نے تمھارے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ صورتِ حال پہلی بار پیش آئی ہوتی تب تو تمھارے لیے یہ وجہ تشویش ہو سکتی تھی کہ

مبادا اس میں تمہاری کسی کوتاہی کو دخل ہو لیکن جب ہر رسول کے ساتھ اس کی قوم نے یہی سلوک کیا ہے تو معلوم ہوا کہ رسولوں کے ساتھ ان کی قوموں کی روش ہمیشہ سے یہی رہی ہے۔

'جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۔ الآیۃ' یعنی یہ بات بھی نہیں تھی کہ اُن کے رسول خالی ہاتھ آئے ہوں، بلکہ وہ نہایت واضح دلائل و معجزات، صحیفوں اور روشن کتاب کے ساتھ آئے لیکن ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی ان کو قائل کرنے والی نہ بن سکی۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے مخالفوں سے بھی تم یہ توقع نہ رکھو کہ اگر ان کی طلب کے مطابق ان کو کوئی نشانی دکھا دی جائے تو یہ ایمان لانے والے بن جائیں گے۔ اس قسم کے لوگوں کے لیے ساری نشانیاں، سارے صحیفے اور تمام کتابیں بے سود ہیں۔

'بَیِّنٰت' اور 'زُبُر' تو عام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر رسول کو ان سے مسلح کر کے بھیجا۔ 'کتاب منیر' سے اشارہ تورات کی طرف ہے۔ قرآن مجید سے پہلے کتاب منیر کی حیثیت اسی کو حاصل رہی۔

مکذبین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ

'ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا' قوموں نے جو روش اختیار کی وہ اوپر مذکور ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ جو معاملہ کیا یہ اس کا بیان ہے۔ فرمایا کہ جب انھوں نے رسول کی تکذیب کر دی تو ہم نے ان کو پکڑا اور جب پکڑا تو دیکھو کس طرح پکڑا اور کیسی عبرت انگیز سزا ان کو دی! مطلب یہ ہے کہ اگر تمھاری قوم بھی اپنی اسی روش پر جمی رہی تو اس کے ساتھ بھی ہم یہی معاملہ کریں گے۔ ہمارا قانون سب کے لیے ایک ہی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ۭ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ (۲۷)

آیات ۲۰-۲۲ کا مضمون ایک نئے اسلوب سے

وہی حقیقت جو آیات ۲۰-۲۲ میں سمجھائی گئی ہے اس کائنات کی دوسری مثالوں کی روشنی میں سمجھائی جا رہی ہے۔ گویا آیات ۲۳-۲۶ بیچ میں بطور التفات آ گئی تھیں۔ ان کے ختم ہونے کے بعد کلام پھر اپنے اصل سلسلہ سے مربوط ہو گیا۔ فرمایا کہ دیکھتے نہیں کہ اللہ آسمان سے بارش نازل کرتا ہے تو اس سے ایک ہی قسم کی چیز نہیں اُگتی بلکہ طرح طرح کی مختلف النوع اور مختلف الالوان چیزیں اُگ پڑتی ہیں۔ اسی سے خوش نما، خوش رنگ اور خوش ذائقہ پھلوں والی چیزیں بھی اُگتی ہیں اور اسی سے ناقص زمینوں میں جھاڑ جھنکاڑ بھی اُگتے ہیں۔ یہی حال اس قرآنی بارش کا بھی ہے۔ اس سے بھی صالح طبیعتوں کی صلاحیتیں بھی ابھریں گی اور جن کے اندر کھوٹ اور فساد ہے وہ بھی ابھر کر سامنے آئے گا۔ اس لیے کہ شیطان اس کو ٹھنڈے پیٹوں نہیں برداشت کرے گا بلکہ وہ بھی اپنی ذریات کو اس کے مقابلے کے لیے ابھارے گا۔ لفظ 'الوان' عربی میں صرف رنگوں ہی کے مفہوم میں نہیں آتا بلکہ انواع و اقسام کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ آگے بھی اسی آیت میں یہ لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

سورۂ اعراف میں بارش کے اثرات کے اس پہلو کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ۔ (الاعراف : ۵۸)

اور جو زمین زرخیز ہوتی ہے تو اس کے رب کے حکم سے اس کی نباتات بھی اچھی اگتی ہیں اور جو ناقص ہوتی ہے تو اس کی نباتات بھی ناقص ہی اگتی ہیں۔

اس آیت کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں، اس مقام کی وضاحت کے لیے ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

'وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِیْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِیْبُ سُوْدٌ' 'جُدَدٌ' جمع ہے 'جُدَّة' کی۔ یہ لفظ اصلاً تو سبزوں اور گدھوں کی پیٹھوں پر مختلف رنگوں کی جو دھاریاں ہوتی ہیں ان کے لیے آتا ہے لیکن یہاں یہ ان مختلف الالوان سلوں اور چٹانوں کے لیے آیا ہے جن کی دھاریاں یا قطاریں پہاڑوں کے اندر پائی جاتی ہیں۔

اسلوب سے متعلق ایک سوال کا جواب

'غَرَابِیْبُ' جمع ہے 'غربیب' کی۔ اس کے معنی ہیں کالا بھجنگ۔ یہ لفظ عام طور پر 'اسود' کی تاکید کے لیے آتا ہے۔ مثلاً کہیں گے 'اسود غربیب'۔ فلاں چیز کالی بھجنگ ہے۔ اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں یہ 'سُوْد' سے پہلے کیوں آیا، تاکید کا مقدم آنا تو بلاغت کے خلاف ہے؟ اس سوال کے جواب مختلف اہل ادب نے مختلف دیے ہیں۔ بعض نے اس کو بدل کے مفہوم میں لیا ہے جو وضاحت کے طور پر آیا ہے۔ اگر یہ توجیہ مان لی جائے تو یہ اس پہلو سے صحیح ہے کہ جو بدل وضاحت کے طور پر آتا ہے وہ درحقیقت تاکید ہی کے لیے آتا ہے۔ اس صورت میں متکلم گویا اپنی بات سادہ الفاظ میں پھر مخاطب کے سامنے دہرا دیتا ہے کہ اچھی طرح اس کے ذہن نشین ہو جائے۔ یہاں سیاہ قسم کے پتھروں کی طرف اس وضاحت کے ساتھ توجہ دلانے کی وجہ یہ ہے کہ مقصود یہ سمجھانا ہے کہ جس طرح پہاڑوں میں سیاہ پتھر ہوتے ہیں اسی طرح لوگوں کے اندر سیاہ قلب افراد ہوتے ہیں اور جس طرح سفید و سرخ اور سیاہ پتھروں کا الگ الگ مصرف ہے۔ اسی طرح سیاہ قلب افراد کا بھی ایک محل اور مصرف ہے جس کے لیے قدرت نے ان کو اس دنیا میں مہلت دی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ۗ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ (۲۸)

فرمایا کہ جمادات کی طرح انسانوں، جانداروں اور چوپایوں میں بھی قدرت کی یہی گوناگونی و بوقلمونی نمایاں ہے۔ لفظ 'الوان' یہاں بھی صرف رنگوں کے مفہوم میں نہیں بلکہ انواع و اقسام کے وسیع مفہوم میں ہے۔ یعنی صورت، سیرت، صفات، مزاج، خصوصیات اور عادات و اطوار کے اعتبار سے ان میں بڑا فرق و اختلاف پایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہر جانور سے دودھ کی توقع نہیں کی جا سکتی اسی طرح ہر آدمی سے خدا کی خشیت کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہیے۔ اللہ کے بندوں میں سے اس

سے ڈرنے والے وہی بنیں گے جن کے اندر علم و معرفت کی روشنی ہوگی۔

لفظ 'عُلَمٰٓؤُا' یہاں اصطلاحی مفہوم میں نہیں بلکہ اپنے حقیقی مفہوم میں ہے۔ اوپر آیت ۱۸ میں جس طرح فرمایا ہے 'اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَیْبِ' (تم تو بس انہی لوگوں کو ڈرا سکتے ہو جو غیب میں رہتے اپنے رب سے ڈرنے والے بنیں) اسی طرح یہاں فرمایا ہے 'کَذٰلِکَ ۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا' اس سے معلوم ہوا کہ ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو محض ظاہر پرست ہوتے ہیں، محسوسات سے آگے نہ ان کو کچھ نظر آتا اور نہ اس سے آگے وہ کچھ دیکھنے کی کوشش ہی کرتے، دوسرے وہ ہوتے ہیں جن کے اندر ظاہر سے باطن اور مجاز سے حقیقت تک پہنچنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اور جو اپنے بطن و فرج کی مطلوبات سے زیادہ اہمیت اپنی عقل اور روح کے مطالبات کو دیتے ہیں۔ درحقیقت یہی لوگ ہیں جو انسانیت کے گلِ سرسبد اور علماء کے لقب کے اصلی مستحق ہیں اور یہی لوگ ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے بنتے ہیں اور اللہ کے رسولوں کی دعوت ان کو اپیل کرتی ہے۔

'اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ' جس طرح اوپر والی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لیے فرمائی گئی ہے اسی طرح 'عزیز' اور 'غفور' کی صفات کا حوالہ بھی آپ کی تسلی ہی کے لیے دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج جو لوگ تمہاری دعوت کو رد کر رہے ہیں خدا جب چاہے ان کو پکڑ سکتا ہے لیکن وہ 'عزیز' ہونے کے ساتھ ساتھ 'غفور' بھی ہے اس وجہ سے جب تک اس کی حکمت مقتضی ہوتی ہے وہ اس طرح کے لوگوں کو مہلت دیتا ہے۔

صحیح علم کا منبع اللہ کی معرفت ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحیح علم کا منبع درحقیقت اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔ جس کو خدا کی معرفت حاصل نہیں ہوئی وہ علم سے بالکل محروم ہے اگرچہ وہ دنیا جہان کی کتابیں حفظ کر ڈالے۔ اسی طرح یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جس کو خدا کی معرفت حاصل ہے اس کے اندر لازماً خدا کی خشیت بھی ہوگی۔ اگر کوئی شخص خدا کی خشیت سے محروم ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کی معرفت سے بھی محروم ہے۔ یہی معرفت اور خشیت انسان کے تمام علوم و افکار میں حقیقی زندگی پیدا کرتی ہے جس سے علوم و فنون دنیا کے لیے موجب خیر و برکت بنتے ہیں۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو انسان کی ساری ذہانت شیطان کی مقصد برآری میں صرف ہوتی ہے اور وہ بالآخر تباہی کا موجب بنتی ہے۔

ایک سوال کا جواب

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو کہ مذکورہ بالا آیات سے تو یہ بات نکلتی ہے کہ جس طرح اس کارخانۂ کائنات میں اللہ تعالیٰ نے مختلف الانواع چیزیں پیدا کی ہیں اور ان سب کے پیدا کرنے میں اس کی حکمت و مصلحت ہے اسی طرح ان لوگوں کے وجود میں بھی حکمت و مصلحت ہے جو حق کے مخالف، خدا کی خشیت سے خالی اور باطل کے علم بردار ہیں۔ جب صورت واقعہ یہ ہے تو آخر یہ لوگ سزاوار ملامت اور مستحق عتاب و عذاب کس بنا پر ہیں؟ اگرچہ ہم اوپر کی سطروں میں اس شبہے کو صاف کرتے آئے ہیں

لیکن یہاں پھر اس کی طرف اشارہ کیے دیتے ہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے فطرت اللہ پر پیدا کیا ہے اس وجہ سے اس کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ اپنی فطرت کے داعیات کا ساتھ دے لیکن چونکہ وہ حیوانات و جمادات کی طرح مجبور نہیں بلکہ ذی اختیار ہے اس وجہ سے ان میں بہتیرے اپنی فطرت اور اپنے رب کے احکام کی خلاف ورزی بھی کرتے ہیں۔ اپنے اختیار کے اس سوءِ استعمال پر وہ مستحق سزا ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ ان کو مہلت دیتا ہے تاکہ ان پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو جائے اور ان کی مخالفتِ حق اہلِ حق کے امتحان کا ذریعہ بن سکے۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ایک پہلو سے ان کا وجود مطابق حکمت و مصلحت ہے اور قدرت اسی حکمت و مصلحت ہی کی خاطر ان کو اس دنیا میں ایک خاص وقت تک کے لیے مہلت دیتی ہے لیکن دوسرے پہلو سے یہ مستحق سزا ہیں کہ انھوں نے اپنے سمع و بصر کی صلاحیتوں کی قدر نہیں کی اور نفس کی خواہشوں کی پیروی میں اپنے اختیار کو غلط استعمال کیا۔

۶۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۲۹-۳۸

اوپر کے پیرے میں جو بات اصولی حیثیت سے بیان فرمائی ہے آگے کی آیات میں اسی کو واقعاتِ حالات پر منطبق کیا ہے یعنی یہ واضح فرمایا ہے کہ پچھلی امتوں کے وارثین میں سے کون لوگ ہیں جو علماء کے لقب کے مستحق ہیں اور وہ اس قرآن پر ایمان لانے والے بنیں گے اور اب جس قوم کو اللہ نے اپنی کتاب کی وراثت کے لیے منتخب کیا ہے اس کے اخیار یا اشرار اس کے ساتھ کیا رویہ اختیار کریں گے۔ پھر ان دونوں کے نتائج اعمال کی وضاحت فرمائی ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَٰبَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا آیات
رَزَقْنَٰهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَٰرَةً لَّن تَبُورَ ﴿٢٩﴾ لِيُوَفِّيَهُمْ ۲۹-۳۸
أُجُورَهُمْ وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِۦٓ ۚ إِنَّهُۥ غَفُورٌ شَكُورٌ ﴿٣٠﴾ وَالَّذِىٓ
أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ۗ
إِنَّ اللَّهَ بِعِبَادِهِۦ لَخَبِيرٌۢ بَصِيرٌ ﴿٣١﴾ ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَٰبَ الَّذِينَ
اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۖ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِۦ وَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ
وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرَٰتِ بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ﴿٣٢﴾

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ
لُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۳۳﴾ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ
عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۨ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ
مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ﴿۳۵﴾
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا
يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ﴿۳۶﴾ وَهُمْ
يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا
نَعْمَلُ ؕ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ؕ
فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿۳۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ ع ۱۱ ۱۶
وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۳۸﴾

بے شک جو لوگ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے، نماز کا اہتمام کرتے اور جو کچھ ہم نے ترجمۂ آیات ۲۹-۳۸
ان کو رزق دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں وہ ایک ایسی تجارت
کے امیدوار ہیں جس کے لیے کبھی کساد بازاری نہیں۔ تاکہ اللہ ان کو ان کے اعمال کا اجر بھی
دے اور ان کے لیے اپنے فضل میں سے زیادہ بھی کرے۔ بے شک وہ بخشنے والا
اور قبول فرمانے والا ہے۔ اور ہم نے تمھاری طرف جو کتاب وحی کی ہے، یہی حق ہے،
ان پیشین گوئیوں کی مصداق جو اس کے پہلے سے موجود ہیں۔ بے شک اللہ
اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا، دیکھنے والا ہے۔ ۲۹-۳۱

پھر ہم نے کتاب کا وارث بنایا ان لوگوں کو جن کو اپنے بندوں میں سے منتخب کیا،

پس ان میں سے کچھ تو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں، کچھ ان میں سے میانہ رَو ہیں اور کچھ ان میں سے اللہ کی توفیق سے بھلائیوں میں سبقت کرنے والے ہیں یہی سب سے بڑا فضل ہے۔ ان کے لیے ہمیشگی کے باغ ہوں گے جن میں وہ داخل ہوں گے، ان میں ان کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور اس میں ان کا لباس ریشم ہوگا۔ اور وہ کہیں گے شکر ہے اللہ کا جس نے ہم سے غم کو دور کیا۔ بے شک ہمارا رب بخشنے والا، قبول فرمانے والا ہے۔ جس نے ہمیں اپنے فضل سے اس اقامت کے گھر میں اتارا، اس میں نہ ہمیں کوئی کلفت پہنچے گی اور نہ کبھی تکان لاحق ہوگی۔ ۳۲-۳۵

اور جنھوں نے کفر کیا ان کے لیے جہنم کی آگ ہے۔ نہ ان کی قضا ہی آئے گی کہ مر جائیں اور نہ ان سے ان کا عذاب ہی کچھ ہلکا کیا جائے گا۔ ایسا ہی ہم بدلہ دیں گے ہر ناشکرے کو۔ اور وہ اس میں واویلا کریں گے۔ اے ہمارے رب! ہم کو اس سے نکال، اب ہم نیک عمل کریں گے، ان اعمال سے مختلف جو ہم اب تک کرتے رہے ہیں —— کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی کہ جو یاددہانی حاصل کرنا چاہے اس میں یاددہانی حاصل کر سکے! اور تمھارے پاس آگاہ کرنے والا بھی پہنچا! تو اب اس عذاب کو چکھو۔ ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں بنے گا۔ اللہ آسمانوں اور زمین کے غیب کو جاننے والا ہے۔ بے شک وہ سینوں کے بھیدوں سے بھی اچھی طرح باخبر ہے۔ ۳۶-۳۸

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ (۲۹)

علماء کی تفصیل

اوپر آیت ۲۸ میں جن لوگوں کو 'علماء' کہا ہے اور جن کی تعریف میں فرمایا ہے کہ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈریں گے جو علم رکھنے والے ہیں) یہ انہی علماء کی تفصیل ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے، نماز کا اہتمام کرتے اور خدا کے بخشے ہوئے رزق و فضل میں سے فیاضی کے ساتھ سرّاً و علانیۃً راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں، یہ لوگ ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں اور ان کا یہ انفاق ایک ایسی تجارت ہے جس کے لیے مستقبل میں کسی کساد بازاری کا اندیشہ نہیں بلکہ اس کی برکات میں برابر اضافہ ہوتا رہے گا۔

یہ اشارہ اگرچہ ان تمام صالحین کی طرف ہو سکتا ہے جو ان صفات سے متصف تھے لیکن میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہ ان علمائے اہل کتاب کی طرف اشارہ ہے جو قرآن پر ایمان لائے اور قرآن نے جگہ جگہ جن کی تعریف فرمائی ہے۔ میرے نزدیک اس کا قرینہ یہ ہے کہ ان کے ذکر کے بعد بنی اسماعیل کے اخیار و اشرار کا ذکر آیت ۳۲ میں مستقلاً آ رہا ہے اور ان کا ذکر ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا (پھر ہم نے کتاب کا وارث بنایا اپنے بندوں میں سے ان لوگوں کو جن کو اس کے لیے منتخب کیا) کے الفاظ سے ہوا ہے۔ یہاں لفظ 'ثُمَّ' (پھر) اس بات کی دلیل ہے کہ اوپر جن لوگوں کا ذکر ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن سے پہلے کی کتاب کے وارث بنائے گئے تھے اور وہ اللہ کی توفیق سے اس پر قائم رہے جس کی برکت سے ان کو قرآن کے نازل ہونے کے بعد اس پر بھی ایمان لانے کی سعادت حاصل ہوئی۔

یہاں ان صالحین اہل کتاب کی تعریف میں تین باتوں کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔ تلاوتِ کتاب اللہ، اقامتِ صلوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی تین چیزیں دین کی حقیقی محافظ اور خشیتِ الٰہی کی اصلی علامت ہیں اور قرآن میں نہایت تصریح کے ساتھ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ یہود نے اپنی کتاب فراموش کر دی تھی، نماز ضائع کر بیٹھے تھے اور ان پر بخالت و زر پرستی کی بیماری مسلط ہو گئی تھی اس وجہ سے وہ قرآن پر ایمان لانے کی سعادت سے محروم رہے۔ ان کے اندر سے صرف وہ لوگ قرآن پر ایمان لائے جو ان بیماریوں سے محفوظ رہے۔

'یَرْجُوْنَ تِجَارَۃً لَّنْ تَبُوْرَ' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جنھوں نے اس دنیا کی زندگی کو مقصود بنا کر حرام و حلال کی کمائی سے اپنی تجوریاں بھریں اور ہر ایک نے راک فیلر بننے کی کوشش کی ان کا حشر تو ایک دن یہ ہونا ہے کہ ان کی ساری دولت خاک اور راکھ ہو کر اڑ جائے گی۔ البتہ جو لوگ اپنی دولت اللہ کی راہ میں خرچ کریں گے وہ اپنا سرمایہ ایک ایسے کاروبار میں لگا رہے ہیں جس میں کبھی کسی خسارے کا اندیشہ نہیں ہے۔

لِیُوَفِّیَہُمْ اُجُوْرَہُمْ وَیَزِیْدَہُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ ط اِنَّہٗ غَفُوْرٌ شَکُوْرٌ (۳۰)

پر ان کے انفاق کے محرک کی طرف اشارہ بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بھرپور صلہ کا وعدہ بھی کہ وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں نہ ریاء و نمائش کے لیے خرچ کرتے ہیں، نہ اس کا کوئی معاوضہ چاہتے اور نہ اس کا کوئی احسان جتاتے ہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتے ہیں کہ وہ ان کو اس کا پورا پورا صلہ دے اور اپنے فضل سے اس پر مزید اضافہ فرمائے۔ چنانچہ ان کا رب ان کے ساتھ ان کی توقعات کے مطابق معاملہ کرے گا اس لیے کہ وہ کوتاہیوں اور غلطیوں کو معاف اور بندوں کے اعمال کی قدر فرمانے والا ہے۔ یہاں 'غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ' کی صفات کا حوالہ بندوں کی امید افزائی کے لیے ہے کہ ان کی نیکیاں قبول کرنے کے معاملے میں اللہ تعالیٰ بڑی چشم پوشی سے کام لے گا اور ان کے چھوٹے چھوٹے عمل کو بھی قدر و عزت کے ساتھ قبول فرمائے گا۔

وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ (۳۱)

صالحینِ اہلِ کتاب کو دعوتِ ایمان

یہ صالحینِ اہلِ کتاب کو دعوتِ ایمان ہے کہ جو کتاب ہم نے تم پر وحی کی ہے یہی حق ہے! اس لیے تمام طالبینِ حق کو چاہیے کہ اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں اور حرزِ جاں بنائیں۔ 'هُوَ الْحَقُّ' میں حصر کا جو مضمون ہے وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس سے پہلے اللہ نے اہلِ کتاب کو جو کتاب دی اس کو انھوں نے اپنی تحریفات سے رطب و یابس کا مجموعہ بنا ڈالا اس وجہ سے وہ حق کی نعمت سے محروم ہو گئے تھے۔ اب اللہ نے اس کتاب کی صورت میں اس کو بالکل بے آمیز اور کامل شکل میں از سرِ نو اجاگر کیا ہے تاکہ یہ خلق کی ہدایت کا ذریعہ بنے۔

'مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ'۔ یہ اس کتاب کی حقانیت کی وہ دلیل ہے جو خاص طور پر اہلِ کتاب پر اتمامِ حجت کے لیے قرآن میں جگہ جگہ مذکور ہوئی ہے کہ یہ کتاب ان پیشین گوئیوں کا مصداق ہے جو سابق صحیفوں میں اس کے باب میں پہلے سے وارد ہیں۔ ان پیشین گوئیوں کا حوالہ ان کے محل میں ہم تفصیل سے دے چکے ہیں۔

'اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ'۔ فرمایا کہ اللہ نے اس حق کی حفاظت کا یہ اہتمام اس لیے فرمایا کہ وہ اپنے بندوں کے حال کی خبر رکھنے والا اور ان کے بناؤ اور بگاڑ کو برابر دیکھتے رہنے والا ہے۔ چنانچہ جب اس نے دیکھا کہ جس ہدایت سے اس نے ان کو نوازا تھا یا سانوں کی خیانت سے وہ اس سے محروم ہو گئے تو اس کی حفاظت کا اس نے از سرِ نو انتظام فرمایا۔ اگر وہ یہ انتظام نہ فرماتا تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ وہ اپنی خلق کے خیر و شر سے بالکل بے تعلق ہے۔ حالانکہ وہ بے تعلق نہیں بلکہ ایک ایک چیز سے باخبر اور ہر جزئیہ پر نظر رکھنے والا ہے۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ

وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ (۳۲)

خلق کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کا انتظام

یہ اس انتظام کا ذکر ہے جو اپنی ہدایت سے خلق کو بہرہ یاب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ’اَلَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا‘ سے یہاں بنی اسماعیل یا بالفاظ دیگر ’امیین عرب‘ من حیث الجماعت مراد ہیں جن کے اندر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اپنا وہ آخری رسول بھیجنے کا وعدہ فرمایا تھا جس کے ذریعے سے خلق کو آخری اور کامل شریعت ملنے والی تھی۔ فرمایا کہ ہم نے اپنے بندوں میں سے ایک دوسرے گروہ کو چنا اور اس کو اپنی کتاب کا وارث بنایا۔ ’وارث بنایا‘ کے الفاظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ اس سے پہلے جو لوگ کتاب الٰہی کے وارث بنائے گئے تھے (یعنی بنی اسرائیل) ان سے یہ امانت چھینی اور ایک دوسرے گروہ کو جس کو اس شرف کے لیے منتخب کیا، یعنی بنی اسماعیل کو، یہ امانت بخشی۔

امیوں کے اسی شرف کی طرف اشارہ سورۂ جمعہ کی آیت ’هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ الآیۃ‘ میں ہے اور قرآن نے جگہ جگہ ان کے اس شرف کا حوالہ دے کر ان کو ایمان کی دعوت دی ہے کہ وہ اس کی قدر کریں۔ اگر انھوں نے اس کی قدر نہ کی تو دنیا کی امامت کی جس عزت کے لیے اللہ نے ان کا انتخاب فرمایا ہے وہ اس سے اپنے کو محروم کر لیں گے۔ امیوں کی اس عزت افزائی کا ذکر سورۂ نساء میں یوں آیا ہے۔

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ۔ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۭ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ۔ (النساء: ۵۴-۵۵)

کیا (بنی اسرائیل) اس فضل کی بنا پر لوگوں پر (بنی اسماعیل پر) بڑا حسد کر رہے ہیں جو ہم نے ان پر (بنی اسماعیل پر) کیا؟ (اگر وہ حسد کر رہے ہیں تو جتنا حسد کرنا چاہیں کر لیں) ہم نے تو آل ابراہیم (بنی اسماعیل) کو کتاب اور حکمت بھی عطا فرمائی اور ان کو ایک عظیم بادشاہی بھی بخشی تو ان میں سے (بنی اسماعیل میں سے) کچھ تو اس کتاب پر ایمان لائے اور ان میں سے کچھ اس سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں اور دوزخ کی آگ ان کے لیے کافی ہے۔

اس آیت کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں آیت زیر بحث کو سمجھنے کے لیے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ جس طرح اس آیت میں بنی اسماعیل من حیث الجماعت مراد ہیں اور ان کو کتاب و حکمت اور ملک عظیم دیے جانے کا ذکر ہے اسی طرح آیت زیر بحث میں ان کی جس برگزیدگی کی طرف اشارہ ہے وہ من حیث الجماعت ان کو حاصل ہوئی۔ یہود کو ان کی اس برگزیدگی پر بڑا حسد تھا اور ان کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کا ایک بڑا محرک یہی تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ آپ کی نبوت اگر قائم ہو گئی تو اس

طرح وہ مذہبی پیشوائی جو اب تک ان کو حاصل رہی ہے ان کے حریفوں یعنی بنی اسمٰعیل کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ قرآن نے جگہ جگہ بنی اسرائیل کے اس کھوٹ سے عربوں کو آگاہ کیا ہے اور ان کو دعوت دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جس شرف سے نوازا اور جس منصب عظیم کے لیے ان کا انتخاب فرمایا ہے اس کی قدر کریں، اس کی مخالفت کر کے اپنے دشمنوں کی مقصد برآری کا سامان نہ کریں۔ اسی طرح یہاں اس برگزیدگی کا حوالہ اس مقصد سے دیا ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اس فضل و انعام کی قدر کریں، اس سے محروم نہ رہیں۔

قرآن کے باب میں بنی اسمٰعیل کا رویہ من حیث الافراد۔ پہلا گروہ

فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ یہ من حیث الافراد ان کا وہ رویہ بیان ہوا ہے جو انھوں نے اللہ تعالیٰ کے اس انعام کے جواب میں اختیار کیا۔ فرمایا کہ ان میں تین قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں یعنی اپنا ایڑی چوٹی کا زور اس کی مخالفت میں صرف کر رہے ہیں۔ نہ خود اس کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں نہ کسی دوسرے ہی کو قبول کرنے دینا چاہتے ہیں۔ سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت میں اسی گروہ کا ذکر وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ کے الفاظ سے ہوا ہے یعنی خود بھی اس سے اعراض کیے ہوئے ہیں اور دوسروں کو بھی اس سے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ امر واضح رہے کہ لفظ 'صد' رکنے اور روکنے دونوں معنوں میں آتا ہے۔ اسی گروہ کو یہاں 'ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی یہ اپنی اس مخالفت سے اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں کہ اپنے لیے خدا کے سب سے بڑے فضل سے محرومی اور جہنم کے عذاب کا سامان کر رہے ہیں ورنہ جہاں تک خدا کے دین کا تعلق ہے اس کو ان کی مخالفت سے کوئی گزند پہنچنے والا نہیں ہے۔ لفظ 'ظلم' سے قرآن مجید میں بالعموم شرک کو تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۂ صافات میں ہے: وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ (۱۱۳) (اور ان دونوں (ابراہیم و اسحاق) کی ذریت میں نیکوکار بھی ہیں اور اپنی جانوں پر کھلا ہوا ظلم ڈھانے والے بھی) مفسرین نے عام طور پر 'الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا' سے امتِ مسلمہ کو مراد لیا ہے اور پھر اس سے یہ نتیجہ بھی، معلوم نہیں، کس طرح نکال لیا ہے کہ یہ ظالمین بھی بخش دیے جائیں گے۔ ہم نے آیت کا صحیح موقع و محل معین کر دیا ہے اس وجہ سے اس خیال کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ہماری تائید میں حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد سے روایات بھی ہیں۔ اگر ضرورت ہو تو تفسیر ابن کثیر یا تفسیر ابن جریر میں دیکھ لیجیے۔ ان بزرگ مفسرین نے 'ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ' سے ان لوگوں کو مراد لیا ہے جن کا ذکر سورۂ واقعہ میں 'اَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ' سے ہوا ہے۔

دوسرا گروہ

'وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ' یہ دوسرے گروہ کا ذکر ہے۔ 'مقتصد' میانہ رو کو کہتے ہیں۔ یعنی یہ لوگ مخالفت تو نہیں کرتے ہیں لیکن آگے بڑھ کر اس دعوتِ حق کی حمایت کا حوصلہ بھی نہیں کر رہے ہیں۔ ان کا مخالفت نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو اس دعوت کے حق ہونے کا احساس ہے لیکن

یہ احساس اتنا قوی نہیں ہے کہ وہ تمام پیش و عقب سے بالکل بے پروا ہو کر اس کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ قرآن نے ان کے لیے یہ لفظ استعمال کر کے فی الجملہ ان کے متعلق یہ امید دلائی ہے کہ یہ لوگ پہلے گروہ (ظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ) کی طرح اس نعمت سے محروم رہنے والے نہیں ہیں بلکہ دیر سویر ان کا تردد رفع ہو جائے گا اور اللہ نے چاہا تو یہ اس دعوت کے پُرزور حامیوں میں بن جائیں گے۔

تیسرا گروہ — 'وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ' یہ تیسرے گروہ کا ذکر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اندر حق کا شعور اتنا قوی ہوتا ہے کہ ہر دعوتِ حق ان کو فوراً اپیل کرتی ہے اور ان کی قوتِ ارادی اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ جب ان کو کوئی چیز اپیل کر لیتی ہے تو وہ اس کی خاطر راہ کے تمام عقبات ایک ہی جست میں پار کر جاتے ہیں اور اس کی حمایت یا مدافعت میں کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتے بلکہ تمام رکاوٹوں کا پوری دلیری سے مقابلہ کرتے ہوئے نیکی اور بھلائی کے ہر میدان میں گوئے سبقت لے جانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں۔ یہ اشارہ اسلام کے سابقون اولون کی طرف ہے جن کے سرخیل سیدنا ابوبکر صدیقؓ تھے۔

اس گروہ کی سبقت بالخیر کے ساتھ 'بِإِذْنِ اللّٰهِ' کی قید اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ اس رتبۂ بلند کی سرفرازی ہر ایک کا حصہ نہیں ہے بلکہ اللہ ہی جس کو چاہے یہ رتبہ بخشتا ہے۔ یہ اس سنتِ الٰہی کا حوالہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں تقدم اور تاخر کے لیے مقرر کر رکھی ہے اور جس کی طرف اس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

'ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ' یہ اس مرتبۂ بلند کا بیان ہے جو ان سابقون بالخیرات کو حاصل ہوگا۔ اور اس میں نہایت بلیغ انداز میں 'مقتصدین' کے لیے دعوت بھی ہے کہ ابھی موقع ہے کہ وہ بھی اس فضلِ کبیر میں حصہ دار بننے کے لیے قسمت آزمائی کر سکتے ہیں تو وہ تذبذب کو چھوڑیں اور ہمت کر کے آگے بڑھیں۔ یہاں ہم ان اشارات پر کفایت کرتے ہیں۔ ان شاء اللہ سورۂ واقعہ کی تفسیر میں اس کے تمام اطراف زیرِ بحث آئیں گے۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ (۳۳)

آخرت کا صلہ — یہ آخرت میں ان جانبازوں کا صلہ بیان ہوا ہے کہ ان کے لیے اقامت کے باغ ہوں گے جن میں وہ داخل ہوں گے۔ یعنی ان باغوں میں ان کا داخل ہونا محض وقتی سیر و تفریح کے لیے نہیں ہوگا بلکہ ہمیشہ کے لیے ہوگا۔ 'يُحَلَّوْنَ' مجہول کا صیغہ تشریف و تکریم پر دلیل ہے۔ سونے کے کنگن، موتی اور ریشم وغیرہ کا ذکر تقریبِ فہم کے لیے ہے کہ جنت کی نعمتوں کا مخاطب کچھ تصور کر سکے۔ ان چیزوں کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ ان کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوگا جب یہ آخرت میں سامنے آئیں گی۔

پہلے زمانہ میں سلاطین سونے کے کنگن اور موتی پہنتے تھے، اس وجہ سے جنت کے لباس کا تصور دینے کے لیے یہ تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۭ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُۨ ۝ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ (۳۴-۳۵)

اہلِ جنت کے احساسات اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے ظہور کے بعد

یعنی اہلِ جنت جب اللہ تعالیٰ کے تمام وعدوں کی صداقت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو بے ساختہ ان کی زبانوں پر کلمۂ شکر جاری ہو جائے گا کہ الحمدللہ ہم اپنے رب کے جن وعدوں کے لیے جیے اور مرے وہ سب ہماری امیدوں سے کہیں بڑھ کر پورے ہوئے۔ اس نے ہمارے سارے غم دُور کر دیے۔ اب نہ ماضی کا کوئی پچھتاوا باقی رہا نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ۔ ہمارا رب غفور و شکور ہے۔ اس نے ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرمایا اور ہماری ایک ایک نیکی کو شرفِ قبول بخشا۔ اہلِ جنت کے اسی کلمۂ شکر کا ذکر دوسرے مقام میں یوں ہوا ہے۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (یونس: ۱۰) (اور ان کا آخری کلمہ یہ ہوگا کہ شکر ہے اللہ رب العالمین کے لیے)۔

'دَارَ الْمُقَامَةِ' سے مراد ہمیشہ کی اقامت کا گھر ہے یعنی اس سے پہلے تو ہم دنیا میں ایک سرائے فانی میں تھے اور ہم نے اس کو ایک سرائے فانی ہی سمجھا۔ اب ہمارے رب نے ہم کو اپنے فضل و رحمت کے ایک ایسے گھر میں اتارا ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ اس میں نہ ہمارے لیے کوئی محنت و مشقت ہے اور نہ کوئی تکان اور افسردگی۔ یہ امر واضح رہے کہ بہتر سے بہتر عیش بھی حاصل ہو تو آدمی اس کے اندر بھی افسردہ ہو جاتا ہے اگر اس کی خواہش کے مطابق اس میں تجدّد و تنوع نہ ہوتا رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی جنت ایسی بنائی ہے کہ اس میں ایسا بے عل و غش اور متنوع عیش حاصل ہوگا کہ اہلِ جنت اس کے اندر اکتاہٹ نہیں محسوس کریں گے۔

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا یُقْضٰى عَلَیْهِمْ فَیَمُوْتُوْا وَلَا یُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِیْ كُلَّ كَفُوْرٍ ۝ وَهُمْ یَصْطَرِخُوْنَ فِیْهَا ۚ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَیْرَ الَّذِیْ كُنَّا نَعْمَلُ ۭ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا یَتَذَكَّرُ فِیْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِیْرُ ۭ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ نَّصِیْرٍ (۳۶-۳۷)

کفار کے انجام کا بیان

یہ کفار کے انجام کا بیان ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ جہنم میں اتارے گا جہاں ان کا حال یہ ہوگا کہ نہ ان کو موت ہی آئے گی کہ مر کے اس عذاب سے رہائی پائیں، نہ ان کے عذاب میں تخفیف ہی کی جائے گی کہ ذرا دم لے لیں۔ 'مِنْ عَذَابِهَا' کے بعد 'فَیَسْتَرِیْحُوْا' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ بربنائے قرینہ محذوف ہے۔

'كَذٰلِكَ نَجْزِیْ كُلَّ كَفُوْرٍ' یعنی یہ جو کچھ ہم سنا رہے ہیں، یہ صرف دوسروں ہی کی سرگزشت نہیں ہے بلکہ ہر ناشکرے نابکار کو ہم اسی طرح سزا دیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ بھی اسی سزا کے مستحق

ٹھہریں گے جو آج ہماری کتاب اور ہمارے رسول کی تکذیب کر رہے ہیں۔ اس فقرے سے کلام بالکل مطابق حال ہو گیا ہے۔

وَهُمْ يَصْطَرِخُونَ فِيهَا الآية۔ وہ اسی جہنم میں پڑے فریاد کریں گے کہ اے رب، ہم کو یہاں سے ایک بار رہائی دے کہ ہم دنیا میں جا کر نیک عمل، اس سے بالکل مختلف، کریں جو ہم اب تک کرتے رہے ہیں۔

اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيرُ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو جواب ملے گا کہ کیا تمہیں اتنی مہلت نہیں ملی جس میں ایک یاد دہانی حاصل کرنے والا یاد دہانی حاصل کر سکے؟ علاوہ ازیں تمہارے پاس ایک آگاہ کر دینے والا رسول بھی آیا! تو اب کس بات کے لیے مہلت مانگتے ہو؟ اب تمہارا کوئی مددگار نہیں بن سکتا، اب تو جس عذاب کے اسباب تم نے فراہم کیے اس کا مزہ چکھو۔

اس آیت سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے عمر بھی کافی دی اور ان پر کسی منذر کے ذریعے حجت بھی تمام کر دی گئی ان کے ساتھ تو کسی قسم کی رعایت نہیں ہو گی لیکن جو لوگ سن و سال کی پختگی کو پہنچنے سے پہلے ہی مر گئے یا قتل ہو گئے ان کے ساتھ معاملہ نسبتہً ذرا نرم ہو گا۔

اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۳۸)

اس سے دو باتیں واضح فرمائی گئی ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کے تمام بھیدوں کو جاننے والا ہے اس وجہ سے کوئی ان باتوں کو محض ڈراوا نہ سمجھے بلکہ یہ حقائق ہیں جو ایک دن سب کے سامنے ظاہر ہو کے رہیں گے۔

دوسری یہ کہ جو لوگ یہ فریاد کریں گے کہ اگر ان کو دوبارہ مہلت ملے تو وہ نیکی کریں گے، خدا ان کے جھوٹ کو بھی جانتا ہے ـــــ اس طرح کے لوگوں کو اگر پھر مہلت دی جائے تو وہ وہی کریں گے جو اب تک کرتے رہے ہیں۔

۸۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۳۹-۴۵

آگے کی آیات میں مشرکین عرب کو دھمکی ہے کہ تم اس ملک میں پہلی قوم نہیں ہو بلکہ پچھلی قوموں کے جانشین ہو تو ان کے حالات اور انجام سے سبق لو۔ اگر وہ قوت و شوکت میں تم سے بڑھ کر ہونے کے باوجود، رسولوں کی تکذیب کے جرم میں تباہ کر دی گئیں تو اسی جرم کا ارتکاب کر کے خدا کے قہر و غضب سے تم کس طرح بچ جاؤ گے؟ خدا کا قانون تو ہر قوم کے لیے ایک ہی ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یاد رکھو کہ آسمان و زمین تمہارے ان معبودوں کے تھامے نہیں تھمے ہوئے ہیں بلکہ خدا ہی کے تھامے تھمے ہیں۔ اگر خدا ان کو درہم برہم کر دے تو کوئی دوسرا ان کو نہیں سنبھال سکتا۔ تمہاری سرکشی کے باوجود اگر خدا نے تمہیں ڈھیل دے

رکھی ہے تو اس سے کسی غلط فہمی میں نہ رہو، خدا پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا لیکن جب پکڑتا ہے تو کوئی اس سے بھاگ نہیں سکتا۔

اسی ضمن میں یہ یاددہانی بھی کی گئی ہے کہ اس سے پہلے تو یہ قسمیں کھا کھا کے یہ وعدے کرتے تھے کہ اگر ان کے اندر کسی رسول کی بعثت ہوئی تو یہ دنیا کی سب سے زیادہ ہدایت یافتہ قوم بنیں گے لیکن جب رسول آیا تو محض استکبار کے سبب سے اس کی مخالفت اور رات دن اس کے خلاف سازشوں میں سرگرم ہیں حالانکہ حق کے خلاف جو سازشیں کی جاتی ہیں ان کے پھندوں میں وہی لوگ پھنستے ہیں جو سازشوں کے جال بُنتے ہیں۔

غور کیجیے تو اس پیرے میں، جس کو خاتمۂ سورہ کی حیثیت حاصل ہے، فواصل یعنی قوافی بدل گئے ہیں۔ قوافی کی یہ اچانک تبدیلی متکلم کے لب و لہجہ کی تبدیلی کی دلیل ہوتی ہے اور اس تبدیلی سے مقصود مخاطب کو ایک نئے پہلو سے متوجہ کرنا ہوتا ہے ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۖ وَلَا آیات ۳۹۔۴۵
يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ إِلَّا مَقْتًا ۖ وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ
كُفْرُهُمْ إِلَّا خَسَارًا ﴿٣٩﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ شُرَكَاءَكُمُ الَّذِينَ تَدْعُونَ
مِنْ دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ
فِي السَّمَاوَاتِ أَمْ آتَيْنَاهُمْ كِتَابًا فَهُمْ عَلَىٰ بَيِّنَتٍ مِنْهُ ۚ بَلْ إِنْ
يَعِدُ الظَّالِمُونَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا إِلَّا غُرُورًا ﴿٤٠﴾ إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ
أَحَدٍ مِنْ بَعْدِهِ ۚ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ﴿٤١﴾ وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ
جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَاءَهُمْ نَذِيرٌ لَيَكُونُنَّ أَهْدَىٰ مِنْ إِحْدَى
الْأُمَمِ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُمْ نَذِيرٌ مَا زَادَهُمْ إِلَّا نُفُورًا ﴿٤٢﴾ اسْتِكْبَارًا
فِي الْأَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۚ وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ ۚ فَهَلْ يَنْظُرُونَ
إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۖ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ

اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿۴۳﴾ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَمَا كَانَ
اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ
عَلِيْمًا قَدِيْرًا ﴿۴۴﴾ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ
عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا
جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ ع ۱۷/۸

ترجمہ آیات ۳۹-۴۵

وہی ہے جس نے تم کو زمین میں جانشین بنایا تو جو کفر کرے گا اس کے کفر کا وبال اسی پر آئے گا اور کافروں کے لیے ان کا کفر، ان کے رب کے نزدیک، اس کے غضب کی زیادتی ہی کا موجب ہوگا اور کافروں کے لیے ان کا کفران کے خسارے ہی میں اضافہ کرے گا۔ ۳۹

کہو، ذرا تم دیکھو تو اپنے ان شریکوں کو جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو! مجھے دکھاؤ، انھوں نے زمین میں سے کیا پیدا کیا ہے! کیا ان کی آسمانوں میں کوئی حصہ داری ہے؟ آیا ہم نے ان کو کوئی کتاب دی ہے تو وہ اس کی کسی واضح دلیل پر ہیں! بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے سے محض پُرفریب وعدے کر رہے ہیں۔ ۴۰

اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ ٹل نہ جائیں۔ اور اگر وہ ٹل جائیں تو اس کے بعد کوئی اور ان کو تھامنے والا نہیں بن سکتا۔ بے شک وہ نہایت حلیم و غفور ہے۔ ۴۱

اور انھوں نے اللہ کی پکی پکی قسمیں کھائیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نذیر آیا تو وہ ہر امت سے زیادہ ہدایت اختیار کرنے والے بنیں گے۔ پس جب ان کے پاس ایک نذیر آیا تو

اس چیز نے، زمین میں ان کے تکبّر کے باعث، ان کی بیزاری اور ان کی بری چالوں ہی میں اضافہ کیا۔ اور بری چال تو اسی کو گھیرتی ہے جو بری چال چلتا ہے۔ پس یہ نہیں انتظار کر رہے ہیں مگر اسی سنتِ الٰہی کا جو اگلوں کے باب میں ظاہر ہوئی۔ تو تم سنتِ الٰہی میں نہ کوئی تبدیلی پاؤ گے اور نہ تم سنتِ الٰہی کو ٹلتے ہی ہوئے پاؤ گے۔ کیا انھوں نے زمین میں سفر نہیں کیا کہ دیکھتے کہ کیسا ہو چکا ہے انجام ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں حالانکہ وہ قوت میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے۔ اور آسمانوں اور زمین کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے کہ وہ اللہ کے قابو سے باہر نکل سکے۔ وہ علم والا اور قدرت رکھنے والا ہے۔ ۴۲-۴۴

اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے اعمال کی پاداش میں فوراً پکڑتا تو زمین کی پشت پر ایک جاندار کو بھی نہ چھوڑتا لیکن وہ ان کو ایک معیّن مدت تک مہلت دیتا ہے۔ پس جب ان کی مدت پوری ہو جائے گی تو اللہ اپنے بندوں کو خود دیکھنے والا ہے۔ ۴۵

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ ؕ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَیْهِ كُفْرُهٗ ؕ وَلَا یَزِیْدُ الْكٰفِرِیْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ۚ وَلَا یَزِیْدُ الْكٰفِرِیْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا (۳۹)

خدا کا عدل ہر قوم کے لیے یکساں ہے

یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ اس سرزمین میں آج جو اقتدار تم کو حاصل ہے یہ نہ تمہارا اپنا پیدا کردہ ہے اور نہ تم اس ملک میں پہلی بار برسرِ اقتدار آئے ہو بلکہ تم سے پہلے بھی قومیں گزر چکی ہیں جن کو خدا نے ان کے کفر و استکبار کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور ان کی جگہ تم کو متمکن کیا تو اگر وہی روش تم نے اختیار کی تو اسی انجام سے دوچار ہونے کے لیے بھی تیار رہو جو ان کے سامنے آیا۔ خدا نے قوموں کے عزل و نصب کے لیے جو میزانِ عدل قائم کر رکھی ہے اس کا فیصلہ ہر قوم کے لیے بالکل بے لاگ ہے۔ جن قوموں کی سرگزشتیں تم کو سنائی گئی ہیں وہی تاریخ تم بھی دہراؤ گے اگر انہی کے نقشِ قدم پر چلو گے۔ یہ مضمون انعام آیت ۱۹۵ اور اعراف آیت ۱۰۰ کے تحت بھی تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔

کفر کا خمیازہ کفر کرنے والوں ہی کو بھگتنا پڑے گا

فَمَنۡ کَفَرَ فَعَلَیۡہِ کُفۡرُہٗ الاٰیۃ: یعنی یہ بھی یاد رکھو کہ کسی کے کفر سے خدا کا کچھ نہیں بگڑتا بلکہ اس کا خمیازہ خود کفر کرنے والے ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ خدا کسی کا محتاج نہیں ہے بلکہ لوگ ہی اس کے محتاج ہیں۔ اگر وہ کفر کریں گے تو اس سے خدا کا کچھ بگاڑنے کے بجائے اس کے غضب میں اضافہ کریں گے اور یہ چیز دنیا اور آخرت میں انہی کی تباہی کا موجب ہوگی۔

قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ شُرَکَآءَکُمُ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ؕ اَرُوۡنِیۡ مَاذَا خَلَقُوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ اَمۡ لَہُمۡ شِرۡکٌ فِی السَّمٰوٰتِ ۚ اَمۡ اٰتَیۡنٰہُمۡ کِتٰبًا فَہُمۡ عَلٰی بَیِّنَتٍ مِّنۡہُ ۚ بَلۡ اِنۡ یَّعِدُ الظّٰلِمُوۡنَ بَعۡضُہُمۡ بَعۡضًا اِلَّا غُرُوۡرًا (۴۰)

شرکاء کی بے حقیقتی

یہ ان کے شرکاء کی بے حقیقتی کی طرف توجہ دلائی کہ کیا ان کے بل پر خدا کی پکڑ سے نچنت بیٹھے ہو! ذرا ان کو دیکھو تو بھلا ان کی کیا حقیقت ہے! 'اَرَءَیۡتُمۡ' اس طرح کے مواقع میں اظہار تعجب اور تحقیر کے لیے آتا ہے۔ فرمایا کہ اگر زمین میں سے کوئی چیز انھوں نے پیدا کی ہو تو وہ مجھے دکھاؤ۔ یا آسمانوں میں ان کی کوئی حصہ داری ہو تو وہ مجھے بتاؤ۔

'اَمۡ اٰتَیۡنٰہُمۡ کِتٰبًا الاٰیۃ'۔ اس ٹکڑے میں اسلوب کلام بدل کر حاضر کے بجائے غائب کا ہوگیا ہے جس سے تعجب اور اظہار بیزاری کے مضمون میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ فرمایا کہ جب آسمانوں اور زمین میں کسی نوعیت سے ان کی کوئی حصہ داری ثابت نہیں تو آخر کس دلیل کی بنا پر ان کو خدا کی خدائی میں انھوں نے شریک بنایا ہے؟ کیا ہم نے ان کو کوئی کتاب دی ہے جس میں ہم نے تسلیم کیا ہو کہ فلاں اور فلاں ہماری خدائی میں شریک ہیں اور انھوں نے اسی کی سند پر ان کو ہمارا شریک بنایا ہے!

لیڈروں کا فریب عوام کے ساتھ

'بَلۡ اِنۡ یَّعِدُ الظّٰلِمُوۡنَ بَعۡضُہُمۡ بَعۡضًا اِلَّا غُرُوۡرًا'۔ یعنی ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے۔ نہ ان کے پاس کوئی دلیل ہے نہ کوئی سند۔ بلکہ یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے لوگ بس یوں ہی بے دلیل و سند ایک دوسرے کو سبز باغ دکھا رہے ہیں کہ ان کے فلاں بت کے قبضہ میں یہ یہ اختیارات ہیں اور فلاں کی عبادت سے یہ برکات حاصل ہوتی ہیں۔ ان کی یہ ساری باتیں محض فریب ہیں جس میں ان کے لیڈر ان کو مبتلا کیے ہوئے ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ یُمۡسِکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ اَنۡ تَزُوۡلَا ۬ۚ وَ لَئِنۡ زَالَتَاۤ اِنۡ اَمۡسَکَہُمَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنۡۢ بَعۡدِہٖ ؕ اِنَّہٗ کَانَ حَلِیۡمًا غَفُوۡرًا (۴۱)

یعنی اگر یہ اس غلط فہمی میں ہیں کہ جس عذاب سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے اس سے ان کے مزعومہ دیوی دیوتا بچا لیں گے یا بچائے ہوئے ہیں تو انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ آسمانوں اور زمین کو ان کے محور و مدار پر خدا ہی ٹکائے ہوئے ہے۔ اگر وہ ذرا ان کی باگ ڈھیلی چھوڑ دے تو پھر کسی کی طاقت نہیں ہے کہ ان کو تھام سکے۔ پھر چشم زدن میں سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا۔ یعنی لوگوں کی سرکشی اور استکبار کے باوجود خدا لوگوں کو جو ڈھیل دیتا ہے تو اس وجہ سے دیتا ہے کہ وہ حلیم و غفور ہے۔ وہ قہر کرنے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ لوگوں کے جرائم کے باوجود ان سے درگزر کرتا اور ان کو مہلت دیتا ہے۔ تاکہ جو شخص بھی اپنی اصلاح کرنی چاہے وہ کرلے۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا (۴۲)

اہل عرب کے اندر ایک رسول کی بعثت کی روایت

اہل عرب چونکہ امّی یعنی کتاب و شریعت سے ناآشنا تھے اس وجہ سے اہل کتاب بالخصوص یہود ان کو حقیر خیال کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے علماء نے یہ فتویٰ دے رکھا تھا کہ ان امّیوں کی امانت ہڑپ کر جانے اور ان سے سود لینے میں ان کے لیے کوئی قباحت نہیں ہے۔ آیت لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ کے تحت ہم ان خانہ زاد فتووں کا حوالہ دے چکے ہیں۔ مشرکین جب یہود کی اس طرح کی باتیں سنتے تو فطری طور پر ان کے اندر ایک قسم کا احساسِ کہتری پیدا ہوتا اور وہ ان کے جواب میں قسمیں کھا کے، بڑے طنطنہ کے ساتھ، یہ کہتے کہ اگر ہمارے اندر کسی رسول کی بعثت ہوتی تو ہم دوسری تمام قوموں سے زیادہ ہدایت یافتہ قوم بن کے دکھا دیں گے۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ سابق صحیفوں میں آخری رسول کی بعثت سے متعلق جو پیشین گوئیاں وارد ہیں ان میں، جیسا کہ تفسیر سورۂ اعراف میں ہم واضح کرچکے ہیں نہایت صریح الفاظ میں یہ بات موجود ہے کہ اس رسول کی بعثت بنی اسماعیل (امّیوں) میں ہوگی۔ علمائے یہود اگرچہ یہ بات چھپاتے تھے لیکن ان کے اندر ایسے علماء بھی تھے، خاص طور پر نصاریٰ میں، جو امیوں کے اندر ایک رسول کی بعثت کے منتظر تھے۔ چنانچہ قرآن نے آیت وَاِذَا سَمِعُوْا الاٰیۃ (المائدۃ: ۸۳) میں اس کا نہایت شاندار الفاظ میں حوالہ دیا ہے۔ اس قسم کے علماء کے ذریعے سے بنی اسماعیل کے اندر بھی یہ روایت موجود تھی کہ ان کے اندر ایک رسول کی بعثت ہونے والی ہے اور وہ یہود کے مقابل میں اس کا اظہار بھی کرتے رہتے تھے کہ اگر ہمارے اندر کسی رسول کی بعثت ہوئی تو ہم تمہاری طرح کمزور اور بودے ثابت نہیں ہوں گے بلکہ ہدایت قبول کرنے کے معاملے میں سب پر بازی لے جائیں گے۔ ان کی اسی بات کی یاددہانی کرتے ہوئے قرآن نے ان کے حال پر اظہارِ افسوس کیا ہے کہ پہلے تو بہت بڑھ چڑھ کر آنے والے رسول کی حمایت و نصرت کے دعوے کرتے رہے لیکن جب وہ آیا تو ان کی ہدایت میں اضافہ ہونے کے بجائے ان کی نفرت و بیزاری میں اضافہ ہوا۔ ان کے اس رویے کا ذکر سورۂ صافات میں بھی ہوا ہے۔ فرمایا ہے۔

وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ۙ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۙ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۙ فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (صافات: ۱۶۷-۱۷۰)	اور بے شک یہ لوگ کہتے رہے ہیں کہ اگر ہمارے پاس اگلوں کی کوئی یاددہانی ہوتی تو ہم خدا کے مخصوص بندوں میں سے ہوتے تو انھوں نے اس کا انکار کردیا تو وہ جلد جان لیں گے۔

اِسۡتِكۡبَارًا فِی الۡاَرۡضِ وَمَكۡرَ السَّیِّیِٕ ؕ وَلَا یَحِیۡقُ الۡمَكۡرُ السَّیِّئُ اِلَّا بِاَهۡلِهٖ ؕ فَهَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا سُنَّتَ الۡاَوَّلِیۡنَ ۚ فَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبۡدِیۡلًا ۚ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحۡوِیۡلًا ﴿۴۳﴾

استکبار ہے باعث رسول کی تکذیب

یہ رسول سے ان کی بیزاری کا سبب بیان ہوا ہے کہ اس کا سبب صرف استکبار ہے۔ حق ان پر اچھی طرح واضح ہے لیکن ملک میں جو قیادت و سیادت ان کو حاصل ہے اس کو یہ کسی قیمت پر قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اس وجہ سے اس صریح حق کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ان کو یہ اندیشہ ہے کہ اگر انھوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت تسلیم کر لی تو ان کی سیادت ختم ہو جائے گی۔

'وَمَكۡرَ السَّیِّیِٕ' کا عطف 'نُفُوۡرًا' پر ہے۔ یعنی جس رسول کی ہدایت کے علمبردار بننے کے مدعی تھے جب وہ آیا تو اس کے دشمن بن کے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کو زک پہنچانے کے لیے اس کے خلاف مکروہ سازشوں میں سرگرم ہو گئے۔ لفظ 'مکر' چونکہ اچھے معنوں میں بھی آتا ہے اس وجہ سے اس کے ساتھ 'سَیِّیِٕ' کی قید لگا کر ان کے مکر کی نوعیت واضح فرما دی۔ پیچھے آیت ۱۰ میں بھی ان کی بری سازشوں اور اس کے انجام کا ذکر گزر چکا ہے۔

بری سازش کرنے والا خود اپنے کو تباہ کرتا ہے

'وَلَا یَحِیۡقُ الۡمَكۡرُ السَّیِّئُ اِلَّا بِاَهۡلِهٖ'۔ حق کے خلاف جو شخص سازش کرتا ہے وہ درحقیقت خود اپنے خلاف سازش کرتا ہے۔ بظاہر تو وہ یہ جال دوسرے کے لیے بُنتا ہے لیکن اس جال میں سب سے پہلے وہ خود پھنستا ہے۔ صحیح راہ بتانے والے کی مخالفت کرنا خود اپنی راہ گم اور اپنی عاقبت برباد کرنا ہے۔ دوسروں کو اس سازش سے کوئی ضرر اللہ کے اذن کے بغیر وہ نہیں پہنچا سکتا لیکن اپنے کو وہ بہرحال ہلاکت کے حوالہ کر دیتا ہے۔

حق کے خلاف سازش کرنے والوں کے لیے سنت الٰہی

'فَهَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا سُنَّتَ الۡاَوَّلِیۡنَ'۔ 'یَنۡظُرُوۡنَ' یہاں انتظار کرنے کے معنی میں ہے اور 'سُنَّتَ الۡاَوَّلِیۡنَ' کے اندر عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق کچھ الفاظ حذف ہیں۔ ان کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہو گی — 'فَهَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا سُنَّتَ اللّٰهِ فِی الۡاَوَّلِیۡنَ'۔ یعنی اگر یہ لوگ اپنے تکبر اور حق بیزاری کے باعث اب مخالفت اور سازش ہی کے درپے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب یہ منتظر ہیں کہ ان سے پہلے جو قومیں گزری ہیں، اللہ کی جو سنت ان کے لیے ظاہر ہوئی وہ ان کے لیے بھی ظاہر ہو جائے اور جس طرح رسولوں کی تکذیب کے جرم میں وہ تباہ کر دی گئیں اسی طرح یہ بھی تباہ کر دیے جائیں۔

سنت الٰہی نہ بدلتی نہ ٹلتی ہے

'فَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبۡدِیۡلًا ۚ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحۡوِیۡلًا'۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت پُرزور الفاظ میں تسلی دی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ اسی کے منتظر ہیں تو اطمینان رکھو کہ سنتِ الٰہی نہ بدلتی ہے، نہ ٹلتی ہے۔ 'نہ بدلنے' کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ہر قوم کے لیے بالکل یکساں اور بے لاگ ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ جو رویہ ایک قوم کے لیے باعثِ ہلاکت ہو چکا ہے وہی رویہ دوسری قوم اختیار کرے تو وہ اس انجام سے بچ جائے۔ 'نہ ٹلنے' کا مفہوم یہ ہے کہ جب اس کے ظہور کا وقت آ جائے گا تو وہ لازماً ظہور میں آ کے رہے گی۔ پھر اس کو ٹالنا یا اس کے رخ کو بدلنا کسی کے بس میں بھی نہیں ہو گا۔

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَكَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ مِن شَيْءٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا (۴۴)

ملک کے آثار سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت

اللہ کی جو سنت پچھلی قوموں کے معاملے میں ظاہر ہوئی اور جس کے آثار خود ملکِ عرب میں موجود تھے یہ ان کی طرف توجہ دلائی کہ کیا ان لوگوں نے اپنے ملک کی سیاحت کبھی اس مقصد سے نہیں کی کہ اپنی ان پیشرو قوموں کے آثار و نشانات دیکھتے جو قوت و شوکت میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں لیکن رسولوں کی تکذیب کی پاداش میں ان کا انجام نہایت عبرت انگیز ہوا!

'اَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا' کے اسلوب سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس کی سیاحت تو انھوں نے بہت کی ہے۔ اپنے تجارتی سفروں میں برابر معذب قوموں کی بستیوں پر سے گزرتے رہے ہیں لیکن کبھی خاص اس مقصد سے انھوں نے ان کے آثار پر نظر نہیں ڈالی کہ وہ اس کیفرِ کردار کو کیوں پہنچیں؟ حالانکہ دیکھنے اور فائدہ اٹھانے کی اصل چیز یہی ہے۔ اب بھی موقع باقی ہے کہ اس نگاہ سے ان کے آثار دیکھیں اور ان کے انجام سے سبق حاصل کریں۔ قوت و شوکت میں قریش ان کے پاسنگ نہیں ہیں، لیکن خدا نے جب ان کو پکڑا تو وہ اس کی گرفت سے باہر نہ نکل سکیں۔ آسمانوں اور زمین میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو خدا کی گرفت سے باہر نکل سکے۔ خدا کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے، کوئی چیز اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے۔ ساتھ ہی وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے، کوئی کام اس کی قدرت سے باہر نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو اپنے علم اور اپنی قدرت، دونوں میں کامل ہے کوئی اس سے بھاگ کے کہاں جا سکتا ہے؟

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَىٰ ظَهْرِهَا مِن دَابَّةٍ وَلَٰكِن يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِعِبَادِهِ بَصِيرًا (۴۵)

سنتِ الٰہی کا ایک اور پہلو

یہ اسی سنتِ الٰہی کے ایک دوسرے پہلو کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ان لوگوں کی پکڑ تو لازماً ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ مجرمین کو ان کے اعمال کی پاداش میں فوراً نہیں پکڑا کرتا۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہے تو کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا، وہ چشم زدن میں روئے زمین سے ہر زندہ کو ختم کر دے، لیکن وہ حلیم و غفور ہے اس وجہ سے ایک معین مدت تک لوگوں کو مہلت دیتا ہے تاکہ جس کو توفیق ہو وہ توبہ اور اصلاح کرے اور جو اپنی ضد ہی پر مرنا چاہے اس پر اللہ کی حجت پوری ہو جائے۔ جب ان کی معین مدتِ مہلت پوری ہو جائے گی تو پھر اللہ ان کو دیکھے گا کہ وہ کس پاداش کے مستحق ہیں۔

'بِمَا كَسَبُوا' کے بعد 'علیٰ عجل' یا اس کے ہم معنی الفاظ محذوف ہیں۔ 'وَلَٰكِن يُؤَخِّرُهُمْ' کے الفاظ سے اس کی وضاحت ہو گئی ہے۔

بتوفیقِ ایزدی ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

رحمان آباد

۴ / فروری ۱۹۷۵ء

تدبّرِ قرآن

۳۶

یٰسٓ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سورۂ یٰسٓ اور گروپ کی پچھلی دونوں سورتوں کے عمود میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ پچھلی سورتوں میں توحید، معاد اور رسالت کے جو مطالب زیرِ بحث آئے ہیں انہی پر اس میں بھی بحث ہوئی ہے۔ البتہ تفصیل و اجمال اور نہج استدلال کے اعتبار سے فرق ہے۔ پچھلی سورہ کے بعض مطالب اس میں تاریخی اور فطری دلائل سے اچھی طرح محکم و مدلل کر دیے گئے ہیں۔ اس کا آغاز اثباتِ رسالت کے اسی مضمون سے ہوا ہے جس پر سابق سورہ تمام ہوئی ہے۔ اور فلسفۂ دین کے نقطۂ نظر سے غور کیجیے تو یہ حقیقت بھی واضح طور پر نظر آئے گی کہ اس کی بنیاد بھی، پچھلی سورتوں کی طرح، تشکر اور اس کے مقتضیات ہی پر ہے۔ آگے ہم سورہ کے مطالب کا تجزیہ پیش کرتے ہیں جس سے اس کا عمود اور نظام ان شاء اللہ اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۱۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اثبات اور آپ کو تسلی کہ یہ پُر حکمت قرآن خود اس بات کی سب سے بڑی شہادت ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ یہ قرآن، خدائے عزیز و رحیم کی طرف سے، ان لوگوں پر ایک عظیم احسان ہے جو اب تک خدا کی تعلیم و ہدایت سے بالکل محروم ضلالت میں بھٹک رہے تھے۔ یہ محض ان کی بدقسمتی ہے کہ استکبار کے سبب سے یہ اس کو جھٹلا رہے ہیں۔ ان کی پچھلی روایات اور ان کی مستقبل کی آرزوئیں ان کے لیے حجاب بنی ہوئی ہیں اس وجہ سے نہ یہ ماضی سے کوئی سبق لے رہے ہیں اور نہ مستقبل کا کچھ دھیان کر رہے ہیں۔ آپ ایسے بے فکروں کے لیے زیادہ پریشان نہ ہوں۔ جو خدا سے ڈریں اور نصیحت کو سنیں ان کو مغفرت اور اجرِ عظیم کی بشارت دیجیے۔ جو نہیں سنتے ان کا معاملہ ہمارے حوالے کیجیے۔ ان کا اگلا پچھلا سب ہمارے رجسٹر میں درج ہے۔ ہم ان سے نمٹ لیں گے۔

(۱۳-۳۲) قریش کی عبرت کے لیے ایک بستی کی تمثیل جس کے باشندوں کے انذار کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو

رسول بھیجے جب انھوں نے ان کی نہیں سنی تو اللہ نے ایک تیسرے بندے کو ان رسولوں کی تائید کے لیے اٹھایا لیکن انھوں نے اس کی بھی کوئی پروا نہیں کی۔ ان کی تنبیہ کے لیے اس دوران میں جو نشانیاں ظاہر ہوئیں لوگوں نے ان کو ان رسولوں کی نحوست قرار دیا اور اس جرم میں ان کو سنگسار کر دینے کی دھمکی دی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے اپنے عذاب سے اس بستی کو ہلاک کر دیا۔

(۳۳-۴۴) اس کائنات میں خدا کی قدرت، حکمت، پروردگاری اور رحمت کی جو نشانیاں ہیں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ اور اس امر کا بیان کہ یہ ساری نشانیاں اللہ تعالیٰ کے شکر کو واجب کرتی ہیں جس کا لازمی تقاضا توحید ہے اور ساتھ ہی یہ حشر و نشر اور جزا و سزا کو متلازم ہیں۔

(۴۵-۵۰) اس امر کا بیان کہ جب لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا جاتا ہے اور اس سے بچنے کے لیے اللہ کی راہ میں انفاق کی دعوت دی جاتی ہے تو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جن کو خدا نے اپنے فضل سے محروم رکھا ہم اپنا مال ان پر کیوں خرچ کریں! انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ خدا کو جب عذاب لانا ہوگا تو اس کے لیے اسے کوئی تیاری نہیں کرنی پڑے گی بلکہ وہ چشم زدن میں آجائے گا جس کے بعد کسی کو لب ہلانے کی فرصت نصیب نہیں ہوگی۔

(۵۱-۶۵) قیامت کی تصویر اور اس دن ایمان لانے والوں اور اس کے جھٹلانے والوں کا جو حال ہوگا اس کی تفصیل۔

(۶۶-۶۸) عذاب کا مطالبہ کرنے والوں کو یہ تنبیہ کہ سمع و بصر کی جو صلاحیتیں خدا نے بخشی ہیں ان سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنی عقل سے کام لو۔ اگر ان صلاحیتوں سے فائدہ نہ اٹھایا تو خدا ان کو مسخ بھی کر سکتا ہے اور یہ کام خدا کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔

(۶۹-۸۳) خاتمۂ سورہ جس میں ابتدائے سورہ کے مضمون کو ایک نئے اسلوب سے لیا ہے۔ توحید اور قیامت کی بعض نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ تمہارا کام زندوں کو جگانا ہے۔ جو لوگ اخلاقی اعتبار سے مردہ ہو چکے ہیں ان پر تمہارا کلام کارگر نہیں ہو سکتا۔

سُوْرَةُ يٰسٓ (۳۶)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ۸۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۱۲ يٰسٓ (۱) وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ (۲) اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۳) عَلٰى
صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۴) تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ (۵) لِتُنْذِرَ قَوْمًا
مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ (۶) لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ
فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۷) اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ
فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ (۸) وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ
سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (۹) وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ
اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۰) اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ
وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ (۱۱) اِنَّا نَحْنُ
وقف غفران نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ
ع ۱ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ (۱۲)

ترجمہ آیات ۱-۱۲ یہ سورہ یٰسٓ ہے۔ شاہد ہے پُر حکمت قرآن کہ تم رسولوں میں سے ہو۔ ایک نہایت
سیدھی راہ پر۔ جس کو نہایت اہتمام سے اتارا ہے خدائے عزیز و رحیم نے کہ تم ان لوگوں کو آگاہ

کردو جن کے اگلوں کو آگاہ نہیں کیا گیا پس وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بہتوں پر ہماری بات پوری ہو چکی ہے تو وہ ایمان لانے والے نہیں بنیں گے۔ ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک ہیں پس ان کے سر اٹھے رہ گئے اور ہم نے ان کے آگے سے بھی ایک روک کھڑی کر دی ہے اور ان کے پیچھے سے بھی ایک روک کھڑی کر دی ہے۔ اس طرح ہم نے ان کو ڈھانک دیا ہے پس ان کو سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ اور ان کے لیے یکساں ہے، ان کو ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، وہ ایمان نہیں لانے کے۔ تم تو بس انہی کو ڈرا سکتے ہو جو نصیحت پر دھیان کریں اور غیب میں خدائے رحمان سے ڈریں۔ سو ایسے لوگوں کو مغفرت اور باعزت صلہ کی بشارت دو۔ بے شک ہم مُردوں کو زندہ کریں گے اور ہم نوٹ کر رہے ہیں جو کچھ انھوں نے آگے کے لیے بڑھایا اور جو کچھ پیچھے چھوڑا اور ہم نے ہر چیز ایک واضح کتاب میں محفوظ کر لی ہے۔ ۱-۱۲

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰسٓ (۱)

یہ حروف مقطعات میں سے ہے جن پر ایک جامع بحث سورۂ بقرہ کی تفسیر کے شروع میں گزر چکی ہے۔ یہ اس سورہ کا قرآنی نام ہے۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی 'یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ' کے لیے ہیں لیکن یہ بات بالکل بے دلیل ہے۔

وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ ۝ اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ (۲-۳)

قرآن کے اعجاز میں اصلی دخل اس کی حکمت کو ہے

'و' قسم کے مفہوم میں ہے اور قسم عربی میں، جیسا کہ ہمارے استاذ مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب 'الامعان فی اقسام القرآن' میں وضاحت فرمائی ہے، شہادت کے لیے آتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ پر حکمت قرآن جو تم لوگوں کو سنا رہے ہو، خود اس بات کی شہادت کے لیے کافی ہے کہ تم رسولوں کے زمرے سے تعلق رکھنے والے ہو۔ رسول کے سوا کوئی دوسرا اس طرح کا حکیمانہ اور معجز کلام پیش کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے اعجاز میں اصلی دخل اس کی حکمت، اس کے فلسفہ کو ہے۔ اس کی زبان کی بلاغت و جزالت

مزید براں ہے۔

عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۴)

قرآن سے اعراض فطرت سے انحراف کا نتیجہ ہے

یہ خبر کے بعد دوسری خبر ہے اور اس کا بغیر حرف عطف کے آنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ قرآن حکیم بیک وقت دونوں باتوں کا شاہد ہے۔ اس بات کا بھی کہ تم اللہ کے رسولوں میں سے ہو اور اس بات کا بھی کہ تم بالکل سیدھی راہ پر ہو اور لوگوں کو سیدھی راہ پر چلنے کی دعوت دے رہے ہو۔ تنکیر یہاں تفخیم شان کے لیے ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ راہ عقل و فطرت اور خدا کی بتائی ہوئی نہایت سیدھی راہ ہے۔ جو لوگ یہ سیدھی راہ اختیار کرنے سے گریز کر رہے ہیں انھوں نے اپنی فطرت بگاڑ لی ہے اور اپنی عقل سے کام لینا چھوڑ دیا ہے اس وجہ سے انھیں سیدھی چیز ٹیڑھی نظر آ رہی ہے۔

تَنْزِیْلَ الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ (۵)

قرآن انذار اور بشارت ہے

'تَنْزِیْلَ' فعل محذوف سے منصوب ہے۔ اس کے معنی کی وضاحت دوسرے مقام میں ہم کر چکے ہیں کہ یہ کسی چیز کو درجہ بدرجہ نہایت اہتمام کے ساتھ اتارنے کے لیے بھی آتا ہے۔ یہ قرآن کے ایک دوسرے پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس کو خدائے عزیز و رحیم نے نہایت اہتمام و تدریج کے ساتھ اتارا ہے کہ لوگ اس پر غور کریں، اس کو سمجھیں اور اس سے صراط مستقیم کی رہنمائی حاصل کریں۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی دو صفتوں کا حوالہ ہے۔ ایک 'عزیز' دوسری 'رحیم'۔ ان میں ایک صفت انذار کے لیے ہے اور دوسری بشارت کے لیے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس کی تکذیب کریں گے وہ یاد رکھیں کہ یہ کسی سائل کی درخواست نہیں بلکہ ایک عزیز و مقتدر کا فرمان واجب الاذعان ہے جو سرکشی کرنے والوں کو لازماً سزا دے گا۔ ساتھ ہی وہ رحیم بھی ہے اور اپنی اس رحمت ہی کے لیے اس نے یہ کتاب اتاری ہے۔ تو جو اللہ کے بندے اس قرآن کی قدر کریں گے ان کو وہ اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے گا۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ (۶)

بنی اسماعیل کو تنبیہ

یہ قرآن کے اتارنے کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ نے اس کو اس اہتمام سے اس لیے اتارا ہے کہ جن کے اندر تم سے پہلے کسی رسول کی بعثت نہیں ہوئی تھی اور وہ غفلت میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کو تم زندگی کے انجام سے اچھی طرح آگاہ کر دو۔ یہ اشارہ بنی اسماعیل کی طرف ہے اور یہ اس عظیم احسان کا بیان ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور حضرات انبیاء علیہم السلام کی پیشین گوئیوں کے مطابق اللہ تعالیٰ نے امیوں پر کیا۔ اس میں ان کے لیے ترغیب کے ساتھ یہ ترہیب بھی ہے کہ اگر انھوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو اپنے لیے سب سے بڑی سعادت کی جگہ سب سے بڑی شقاوت کا سامان کریں گے۔ یہی مضمون دوسرے مقامات میں اس طرح بیان ہوا ہے۔ 'لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ' (القصص: ۴۶) (تاکہ تم ان لوگوں کو آگاہ کر دو جن کے پاس تم سے پہلے کوئی نذیر نہیں آیا)۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓی اَکْثَرِھِمْ فَھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (۷)

سرکشوں سے اعراض کی ہدایت

'قول' سے اشارہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرف ہے جو اس نے ابلیس کے جواب میں اس وقت فرمایا تھا جب اس نے یہ دھمکی دی تھی کہ میں ذریت آدم کی اکثریت کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (میں ایسے تمام جنوں اور انسانوں سے جو تیری پیروی کریں گے دوزخ کو بھر دوں گا) اسی قول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمھارا فرض انذار کرنا ہے وہ کرتے رہو لیکن یہ توقع نہ رکھو کہ ان میں سے ہر شخص تمھاری دعوت قبول کرے گا بلکہ ان میں بہتیرے ایسے ہیں جن پر ہماری بات صادق آچکی کہ وہ ابلیس کی پیروی کے جرم میں جہنم کے ایندھن بنیں گے۔ اس طرح کے لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ ان کے درپے اور ان کے لیے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِیَ اِلَی الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ (۸)

متکبرین کے استکبار کی تصویر

یہ ان ایمان نہ لانے والوں کے استکبار کی تصویر ہے کہ گویا ان کی گردنوں میں ایسے طوق پڑے ہوئے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک پہنچتے ہیں جس کے سبب سے ان کے سر اس طرح اٹھے ہوئے رہ گئے ہیں کہ نہ وہ نیچے کی طرف جھک سکتے ہیں اور نہ اوپر ہی کی طرف اٹھ سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ وہ زمین کی نشانیاں دیکھ سکتے اور نہ آسمان کے عجائب ہی پر نگاہ ڈال سکتے۔ ان کی اس حالت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے کہ ہم نے ان کو ایسا بنا دیا ہے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم جگہ جگہ اشارہ کرتے آ رہے ہیں، یہ ہے کہ کسی فرد یا گروہ کی یہ حالت اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق ہوتی ہے۔ جو لوگ حق سے انحراف و اعراض کی یہ روش دیدہ و دانستہ اختیار کر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے آنکھیں بند کر کے زندگی گزارتے ہیں ان کے اوپر اللہ ان کی خواہشیں اور ان کے اعمال اسی طرح مسلط کر دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر کوئی تعلیم و تذکیر ان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ اسی حقیقت کی طرف كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (المطففین: ۱۴) میں اشارہ فرمایا ہے۔

'مقمح' اصل میں اس اونٹ کو کہتے ہیں جس کا سر پیچھے کی جانب اس طرح باندھ دیا گیا ہو کہ اس کی گردن ایک خاص حد سے نہ نیچے ہو سکے نہ اوپر۔ بالکل یہی حال اس شخص کا ہوتا ہے جس کے گلے میں آہنی طوق ڈال دیا جائے۔ وہ بھی اپنا سر نہ نیچے کر سکتا ہے نہ اوپر بلکہ ایک خاص زاویہ پر اس کی گردن تنی رہتی ہے۔ یہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، متکبرین کی تصویر ہے۔ اس طرح کے لوگ اپنے اوپر نیچے اور دہنے بائیں کی تمام نشانیوں سے بے خبر ہی رہتے ہیں۔ ان کو اپنی 'انا' کے سوا اور کسی چیز کی طرف کبھی توجہ نہیں ہوتی۔

وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (۹)

یہ اوپر والے مضمون ہی کی وضاحت ہے کہ اس طرح ہم نے ان کے آگے اور پیچھے دونوں طرف سے اوٹ کھڑی کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے جس کے سبب سے انھیں کچھ سجھائی نہیں

دے رہا ہے۔ ان کی اسی حالت پر سورۂ سبا میں اظہارِ تعجب فرمایا ہے: اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (۹) (کیا ان لوگوں نے ان کے آگے اور پیچھے جو آسمان و زمین ہیں ان پر نگاہ نہیں ڈالی؟) اس طرح کے متکبرین کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ یہ اپنی پچھلی روایات اور اپنے مستقبل کے مطامع کے غلام ہوتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں ان کی راہ میں اس طرح روک بن جاتی ہیں کہ ان سے ہٹ کر وہ کوئی چیز دیکھنے کے قابل رہ ہی نہیں جاتے۔

وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۰)

ظاہر ہے کہ اس طرح کے لوگ ایک سخت قسم کی عقلی و اخلاقی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا اصل مقصد کے لحاظ سے بالکل بے سود ہوتا ہے۔ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں بنتے۔ ان کو اگر انذار کیا جاتا ہے تو محض اتمامِ حجت کے لیے کہ قیامت کے دن یہ کوئی عذر نہ پیش کر سکیں۔ سورۂ بقرہ کے شروع میں ختمِ قلوب پر جو بحث گزر چکی ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ (۱۱)

قرآن ان پر کارگر ہو سکتا ہے جو عقل سے کام لیں

یعنی تمہاری تعلیم و تذکیر تو بس انہی کے اوپر کارگر ہو سکتی ہے جو تمہاری نصیحت سنیں، اس پر غور کریں اور اپنے دلوں کے دروازے اس کے لیے کھولیں نیز یہ کہ وہ اپنی عقل سے کام لیں، نرے محسوسات کے غلام بن کے زندگی نہ گزاریں کہ جب تک ان کو عذاب نہ دکھا دیا جائے اس وقت تک کوئی بات ماننے ہی کے لیے تیار نہ ہوں۔ ایمان معتبر وہ ہے جو سمع و بصر اور عقل و دل کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا کر لایا جاتا ہے نہ کہ حقائق کو آنکھوں سے دیکھ کر۔ فرمایا کہ جو لوگ سب کچھ آنکھوں سے دیکھ کر ایمان لانا چاہتے ہیں ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ البتہ ان لوگوں کو مغفرت اور اجرِ کریم کی بشارت دو جو غیب میں رہتے خدائے رحمان سے ڈرتے ہیں۔

خدا کی خشیت اس کی رحمانیت کا تقاضا ہے

یہ حقیقت ہم جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ خدا سے خشیت درحقیقت اس کی رحمانیت کا تقاضا ہے۔ وہ رحمان ہے اس وجہ سے لازم ہے کہ وہ نیکوں کو ان کی نیکی کا صلہ اور بدوں کو ان کی بدی کی سزا دے۔ اسی رحمانیت کے ظہور کے لیے اس نے جزا اور سزا کا دن مقرر کیا ہے جس میں اس کی کامل رحمت اور اس کے کامل عدل کا ظہور ہوگا۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ (۱۲)

روزِ جزا کی یاد دہانی

یہ اسی روزِ جزا کی یاد دہانی ہے جو اس کی رحمانیت کا لازمی تقاضا ہے۔ فرمایا کہ ایک دن آئے گا کہ ہم تمام مُردوں کو زندہ کریں گے اور اس دنیا میں انھوں نے آگے کے لیے جو کچھ کیا اور پیچھے کے لیے جو کچھ چھوڑا ہے ہم اس سارے کو قلم بند کر رہے ہیں۔ مقصود اس سے اس کے لازم کو واضح کرنا ہے کہ جب ہم سب کو

زندہ بھی کریں گے اور ہر ایک کے اعمال نوٹ بھی کر رہے ہیں تو لازماً ہر ایک کے ساتھ اس کے اعمال کے مطابق معاملہ بھی کریں گے۔ اس لازمی نتیجہ کی یہاں وضاحت نہیں کی۔ اس کی وجہ اول تو یہ ہے کہ یہ بغیر ذکر کے بھی واضح ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ قیامت کے باب میں منکرین کا اصلی شبہ صرف دو پہلوؤں سے تھا۔ ایک اس پہلو سے کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کو مستبعد سمجھتے تھے۔ دوسرا اس پہلو سے کہ اتنی وسیع دنیا کے تمام اعمال و اقوال کون محفوظ رکھ سکتا ہے کہ وہ ایک دن اس سارے کا حساب کرنے بیٹھے؟ یہ دونوں شبہات یہاں صاف کر دیے جس کے بعد اس کا لازمی نتیجہ خود بخود سامنے آ گیا۔

'مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ' میں وہی مضمون بیان ہوا ہے جو دوسرے مقام میں 'یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ اس دنیا میں انسان بہت سے کام اپنے تصور کے مطابق، آخرت کے لیے کرتا ہے اور بہت سے کام اپنی اس دنیا کی زندگی یا اپنے بعد والوں کے لیے کرتا ہے۔ فرمایا کہ ہم اس کے ان دونوں ہی طرح کے کاموں کو نوٹ کر رہے ہیں۔

'امام مبین' سے مراد

'وَكُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْۤ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ'۔ 'اِمَام' کے اصلی معنی رہنما، ہادی، لیڈر اور مرجع کے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ اس کتاب کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو سب کے لیے رہنما اور مرکز و مرجع کی حیثیت رکھتی ہو۔ چنانچہ ہود آیت ۱۷ اور احقاف آیت ۱۲ میں یہ لفظ تورات کے لیے آیا ہے۔ یہاں یہ اس مرکزی کتاب کے لیے استعمال ہوا ہے جس میں ہر شخص کے اعمال درج ہوں گے اور جس کے مطابق ہر شخص جزا یا سزا پائے گا۔ یہ اوپر والے ٹکڑے کی مزید وضاحت ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ لوگوں کے اعمال و اقوال کی تحریر میں ہم نے کسی غفلت و بے پروائی سے کام لیا ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ ہر چیز ایک نہایت واضح دفتر میں ہم نے درج کر رکھی ہے جو سب کے سامنے اس کا سارا کچا چٹھا پیش کر دے گا۔

۲۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۱۳-۲۲

ایک بستی کی مثال

آگے قریش کے سامنے رسولوں کی تکذیب کا انجام واضح کرنے کے لیے ایک بستی کی مثال پیش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بستی والوں کے انذار کے لیے اپنے دو رسول بھیجے لیکن انھوں نے ان کی تکذیب کر دی۔ اس کے بعد اللہ نے اپنے ایک تیسرے مُنذر سے اپنے رسولوں کو کمک پہنچائی لیکن بستی والوں نے اس کی بھی کوئی پروا نہ کی۔ ان کی تنبیہ کے لیے جو نشانیاں ظاہر ہوئیں ان کو انھوں نے رسولوں کی نحوست پر محمول کیا اور ان کو سنگسار کر دینے کی دھمکی دی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک فیصلہ کن عذاب بھیج کر ان کو بالکل پامال کر دیا۔

اس بستی سے کس بستی کی طرف اشارہ ہے؟

قرآن نے اس بستی کا نام نہیں لیا ہے اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے کون سی بستی مراد ہے؟ مفسرین نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس سے مراد انطاکیہ ہے اور یہاں جن رسولوں کا ذکر ہے وہ اللہ کے رسول نہیں بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھیجے ہوئے سفیر تھے جن کو حضرتؑ نے اپنے شاگردوں میں سے انتخاب کر کے انطاکیہ والوں کے انذار کے لیے بھیجا تھا۔ میرے سامنے بروقت جو تفسیریں ہیں ان سب میں یہی روایت نقل ہوئی ہے۔ ابن کثیرؒ نے اس پر متعدد شبہات وارد کر کے اگرچہ اس کو مجروح کر دیا ہے لیکن اس کے سوا کوئی اور قول چونکہ ان کو نہیں ملا اس وجہ سے انھوں نے بھی اختیار اسی کو کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ قول متعدد وجوہ سے بے بنیاد ہے۔

۱۔ اس کے بے بنیاد ہونے کی پہلی وجہ یہ ہے کہ یہاں ان رسولوں کا جس طرح ذکر ہوا ہے اور انھوں نے اپنے آپ کو جس حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے اس سے صاف واضح ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھیجے ہوئے رسول نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسول تھے اور اسی حیثیت سے انھوں نے اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ مثلاً فرمایا ہے اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ (یاد کرو جب کہ ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے تو انھوں نے ان کو جھٹلا دیا تو ہم نے ایک تیسرے سے ان کو قوت پہنچائی تو انھوں نے لوگوں کے سامنے اعلان کیا کہ ہم تمھاری طرف رسول ہو کر آئے ہیں) آگے اسی سلسلہ میں یہ بھی آتا ہے کہ جب لوگوں نے اس بنا پر ان کو جھٹلایا کہ وہ انہی کی طرح بشر ہیں تو انھوں نے قید قسم کے ساتھ کہا کہ رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ (ہمارا رب گواہ ہے کہ ہم تمھاری طرف رسول ہو کر آئے ہیں)۔ اگر یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھیجے ہوئے سفیر تھے تو ان کے بھیجے کو اللہ تعالیٰ نے اس صراحت و تاکید کے ساتھ اپنی طرف کیوں منسوب فرمایا؟ اور اگر انھوں نے اپنے آپ کو اللہ کے رسول کے بجائے حضرت عیسیٰؑ کے سفیر کی حیثیت سے لوگوں کو دعوت دی ہوتی تو لوگ ان کی بشریت کی بنا پر ان کی تکذیب کیوں کرتے؟ رسولوں کے مکذبین نے ان کی بشریت کو تکذیب کا بہانہ تو اس بنیاد پر بنایا کہ وہ خدا کے رسول ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ اس پر لوگ یہ اعتراض اٹھاتے تھے کہ اگر خدا کو کوئی رسول بھیجنا ہوتا تو کیا وہ ہمارے ہی جیسے انسانوں کو رسول بناتا، آخر اس نے اپنے فرشتوں یا کسی اور برتر مخلوق کو اس منصب کے لیے کیوں نہیں انتخاب کیا؟

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں پیش آیا اور اس کا نتیجہ اہل انطاکیہ کی تباہی کی شکل میں ظاہر ہوا تو یہ اتنا بڑا واقعہ تھا کہ انجیلوں اور بائبل ہسٹری میں اس کا ذکر ضرور ہوتا لیکن نہ تو انجیلوں میں اس کا کوئی ذکر ہے اور نہ تاریخوں ہی میں اس کی طرف کوئی اشارہ ہے بلکہ تاریخوں میں اس کے برعکس یہ اشارہ ملتا ہے کہ اہل انطاکیہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان

لانے میں سبقت کی۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ یہاں اس واقعہ کا ذکر قریش کے سامنے ایک معروف واقعہ کی حیثیت سے ہوا ہے۔ چنانچہ یہاں قریہ پر الف لام عہد کا داخل ہے۔ ’اصحاب قریۃ‘ نہیں کہا ہے بلکہ ’اصحاب القریۃ‘ فرمایا ہے۔ اور موقع و محل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ یہاں کسی معروف واقعہ کا ذکر کیا جائے اس لیے کہ اس سے مقصود قریش کو انذار و تخویف ہے اور یہ مقصد صرف ایک مشہور واقعہ ہی سے حاصل ہو سکتا تھا نہ کہ ایک ایسے واقعہ سے جس سے وہ بالکل بے خبر ہوں۔

۴۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام بنی اسرائیل کے رسول تھے اس وجہ سے غیر قوموں کو نہ تو انھوں نے خود دعوت دی اور نہ ان کی طرف اپنے شاگردوں ہی کو بھیجا بلکہ انھوں نے غیر قوموں کے پاس جانے سے اپنے شاگردوں کو روکا۔ ان کا ارشاد ہے کہ ’میں صرف اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں ہی کی تلاش کے لیے آیا ہوں‘۔ غیر قوموں کے بارے میں ان کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ ’میرے پاس جو روٹی ہے وہ صرف بچوں ہی کے لیے ہے، کتوں کے آگے اس کو ڈالنا ٹھیک نہیں ہے‘۔ اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انطاکیہ میں انھوں نے اپنے شاگردوں کو کن کے پاس بھیجا؟ غیر قوموں کے پاس تو ظاہر ہے کہ وہ بھیج نہیں سکتے تھے۔ رہے بنی اسرائیل تو بشریت کی بنیاد پر تو انھوں نے حضرت عیسٰیؑ کی بھی تکذیب نہیں کی تو اس بنیاد پر وہ ان کے شاگردوں کی تکذیب کیوں کرتے؟ وہ جن نبیوں کے معتقد تھے ان کو وہ بشر مانتے تھے اس وجہ سے وہ یہ اعتراض نہیں اٹھا سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے خلاف ہر قسم کے فتنے اٹھائے لیکن یہ اعتراض نہیں اٹھایا کہ آپ بشر ہیں بلکہ قریش نے جب یہ اعتراض اٹھایا تو قرآن نے بنی اسرائیل ہی کو گواہ کی حیثیت سے پیش کیا کہ ان سے پوچھ لو کہ ہم نے جتنے نبی یا رسول بھیجے سب بشر ہی تھے۔

۵۔ پانچویں وجہ یہ ہے کہ آگے مذکور ہے کہ ان رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں ان کے اوپر ایسا فیصلہ کن عذاب آیا کہ وہ بالکل پامال ہو کے رہ گئے: ’اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ (۲۹)‘ (بس ہماری ایک ڈانٹ ہی تھی کہ وہ چشم زدن میں پامال ہو کے رہ گئے) اس قسم کے فیصلہ کن عذاب سے متعلق ہم سنتِ الٰہی کی وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ صرف رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں، کامل اتمام حجت کے بعد ہی، آیا ہے۔ یہود کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تکذیب کے نتیجہ میں ان پر اس طرح کا کوئی عذاب نہیں آیا جس طرح کا عذاب سابق رسولوں کے مکذبین پر آیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس جرم میں ان پر قیامت تک کے لیے لعنت کر دی۔ لعنت کا عذاب تمام عذابوں سے زیادہ سخت ہے جس کے سبب سے وہ دنیا میں بھی ہمیشہ ذلیل و پامال رہیں گے اور آخرت میں بھی ان کے لیے ذلت و رسوائی ہے۔ اس کی وضاحت سورۂ اعراف اور سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر میں ہم کر

چکے ہیں۔

اس قول کے ضعف کے یہ وجوہ بالکل واضح ہیں۔ ان کے علاوہ بعض اور وجوہ بھی ہیں جو آگے آیات کی تفسیر کے ذیل میں سامنے آئیں گے۔ ہمارے نزدیک اس قریہ سے اشارہ مصر کی طرف ہے جہاں حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام اور تیسرے مردِ حق کی تکذیب کے نتیجہ میں فرعون اور اس کی قوم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا۔ اس کے قرائن و دلائل کی تفصیل آیات کی تفسیر کے ذیل میں آئے گی۔

اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۳-۳۲

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾
اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ
فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ
مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ﴿۱۵﴾
قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ
الْمُبِيْنُ ﴿۱۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ
وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸﴾ قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ۭ اَئِنْ
ذُكِّرْتُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ
رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۰﴾ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ
اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ
تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۲﴾ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ
بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ﴿۲۳﴾ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ
ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾ اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾ قِيْلَ ادْخُلِ
الْجَنَّةَ ۭ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ

مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۷﴾ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ
مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً
وقف غفران فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ﴿۲۹﴾ يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ
اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۰﴾ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ
الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا
مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۲﴾ ع ۲ ۱

ترجمہ آیات ۱۳-۳۲

اور ان کو بستی والوں کی مثال سناؤ، جب کہ ان کے پاس فرستادے آئے۔ جب کہ ہم نے ان کے پاس دو رسول بھیجے تو لوگوں نے ان کی تکذیب کر دی تو ہم نے ایک تیسرے سے ان کی تائید کی تو انھوں نے لوگوں سے کہا کہ ہم تمہارے پاس بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ لوگوں نے جواب دیا کہ تم تو بس ہمارے ہی جیسے بشر ہو! اور خدائے رحمان نے کوئی چیز بھی نازل نہیں کی ہے، تم لوگ بالکل جھوٹ دعویٰ کرتے ہو۔ ۱۳-۱۵

انھوں نے کہا کہ ہمارا رب گواہ ہے کہ ہم تمہاری طرف رسول ہو کر آئے ہیں۔ اور ہماری ذمہ داری بس واضح طور پر پہنچا دینے کی ہے۔ لوگوں نے کہا، ہم تو تمہیں منحوس سمجھتے ہیں، اگر تم لوگ باز نہ رہے تو ہم تم کو سنگسار کر چھوڑیں گے اور تم کو ہمارے ہاتھوں بڑا دکھ پہنچے گا۔ رسولوں نے جواب دیا کہ تمھاری نحوست تمہارے ساتھ ہے۔ کیا اس چیز کو تم نے نحوست سمجھا کہ تمہیں یاددہانی کی گئی! بلکہ تم خود حدود سے گزر جانے والے لوگ ہو۔ ۱۶-۱۹

اور شہر کے پرلے سرے سے ایک شخص بھاگا ہوا آیا۔ اس نے کہا، اے میری قوم کے لوگو، رسولوں کی پیروی کرو۔ ان لوگوں کی پیروی کرو جو تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتے اور وہ

راہِ راست پر بھی ہیں۔ اور میں کیوں نہ بندگی کروں اس ذات کی جس نے مجھ کو پیدا کیا اور اسی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے! کیا میں اس کے سوا دوسروں کو معبود بناؤں! اگر خدائے رحمان مجھے کوئی تکلیف پہنچانی چاہے تو نہ ان کی سفارش میرے کچھ کام آئے گی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکیں گے۔ بے شک میں اس وقت ایک کھلی ہوئی گمراہی میں ہوں گا۔ میں تمھارے رب پر ایمان لایا تو میری بات سنو —— ارشاد ہوا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اس نے کہا کاش! میری قوم جانتی کہ میرے رب نے مجھے بخش دیا اور مجھے عزت پانے والوں میں سے بنایا! ۲۰-۲۷

اور اس کے بعد اس کی قوم پر ہم نے آسمان سے کوئی فوج نہیں اتاری اور نہ ہم اتارنے والے ہی تھے۔ بس ایک ڈانٹ تھی کہ دفعتہً وہ پامال ہو کے رہ گئے۔ افسوس ہے بندوں کے حال پر! جو رسول بھی ان کے پاس آئے وہ ان کا مذاق ہی اڑاتے رہے۔ کیا انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ کتنی قومیں ان سے پہلے ہوئی ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا، اب وہ ان کے پاس واپس آنے والی نہیں۔ بے شک وہ سب ہمارے ہی حضور میں حاضر کیے جائیں گے۔ ۲۸-۳۲

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلًا اَصۡحٰبَ الۡقَرۡيَةِ ۘ اِذۡ جَآءَهَا الۡمُرۡسَلُوۡنَ (۱۳)

قریش کی عبرت کے لیے مصر کی مثال

'لَهُمۡ' میں ضمیر کا مرجع قریش ہیں اور 'اَصۡحٰبَ الۡقَرۡيَةِ' میں 'قَرۡيَة' پر الف لام اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ بستی مخاطب کے لیے ایک معہود و معلوم بستی تھی۔ آگے کے اشارات دلیل ہیں کہ اس سے مراد مصر ہے جس کی سرگزشت، مختلف اسلوبوں سے، قرآن میں، قریش کی عبرت پذیری کے لیے بیان ہوئی ہے اور جس کے حالات سے وہ واقف تھے۔ 'اِذۡ جَآءَهَا الۡمُرۡسَلُوۡنَ' سے اس بات کی طرف اشارہ ہے

کہ یہاں مقصود مخاطب کو اس وقت کے حالات کی طرف توجہ دلانا ہے جب ان کی طرف رسولوں کی بعثت ہوئی ہے۔ فرمایا کہ ان لوگوں کو اس بستی کی سرگزشت کی طرف توجہ دلاؤ کہ جو انجام اس بستی والوں کا ہوا وہی حال ان کا بھی ہوگا اگر انھوں نے انہی کی روش اختیار کی۔

ایک تیسرے بندے سے رسولوں کی تائید

إِذْ أَرْسَلْنَآ إِلَيْهِمُ ٱثْنَيْنِ فَكَذَّبُوهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوٓا۟ إِنَّآ إِلَيْكُم مُّرْسَلُونَ (۱۴)

یہ 'إِذْ جَآءَهَا ٱلْمُرْسَلُونَ' کے اجمال کی وضاحت ہو رہی ہے کہ پہلے ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے تو انھوں نے ان کو جھٹلا دیا۔ پھر ہم نے ایک تیسرے بندے سے ان دونوں رسولوں کو کمک پہنچائی اور انھوں نے ان کو دعوت دی کہ ہم تمھارے پاس خدا کے بھیجے ہوئے آئے ہیں تو تم لوگ ہماری بات سنو اور مانو۔

'ٱثْنَيْنِ' سے مراد تو ظاہر ہے کہ حضرت موسٰی و حضرت ہارون علیہما السلام ہیں۔ رسولوں کی تاریخ میں یہی ایک مثال ملتی ہے کہ کسی قوم کی طرف بیک وقت دو رسول اللہ تعالیٰ نے بھیجے۔ اس اہتمام خاص کے وجوہ کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔ جب فرعونیوں نے ان کی تکذیب کر دی تو اللہ تعالیٰ نے ایک تیسرے بندے کو ان رسولوں کی تائید کے لیے اٹھایا۔

تیسرے سے کون مراد ہے؟

اس تیسرے سے کون مراد ہے؟ میرے نزدیک اس سے وہ مومنِ آلِ فرعون مراد ہے جس کی جانبازیوں کا ذکر حضرت موسٰی علیہ السلام کی سرگزشت کے ذیل میں یہاں بھی آگے ہوا ہے اور قرآن کے دوسرے مقامات، بالخصوص سورۂ مومن، میں بھی ہوا ہے۔ حضرت موسٰی علیہ السلام کی تائید و حمایت میں اس مردِ حق نے جو کچھ کیا ہے اور جس بے خوفی و جانبازی کے ساتھ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حیثیت حضرت موسٰی علیہ السلام کی امت میں وہی تھی جو اس امت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہے۔ یہ اگرچہ اصطلاحی مفہوم میں رسول نہیں تھے لیکن جہاں تک رسولوں کی تائید و حمایت کا تعلق ہے اس کے لیے انھوں نے جان لڑا دی۔ چنانچہ الفاظِ قرآن سے خود یہ بات نکلتی ہے کہ ان کا ذکر یہاں ایک رسول کی حیثیت سے نہیں بلکہ رسولوں کے ایک خاص مددگار کی حیثیت سے ہوا ہے۔

آگے آیت ۲۰ میں ان کا تفصیل کے ساتھ تعارف بھی قرآن نے کرایا ہے اور ان کی وہ آخری یادگار تقریر بھی آ رہی ہے جو حضرت موسٰی علیہ السلام کی تائید میں انھوں نے کی ہے۔

اس تقریر اور تعارف پر غور کیجیے تو اس سے میرے قیاس کی تائید ہوگی۔

مثلاً یہاں ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے 'وَجَآءَ مِنْ أَقْصَا ٱلْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَىٰ' (اور شہر کے دور کے حصہ سے ایک شخص بھاگا ہوا آیا) بعینہٖ انہی الفاظ میں ان کا تعارف سورۂ قصص آیت ۲۰ میں ہوا ہے۔ 'وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ أَقْصَا ٱلْمَدِينَةِ يَسْعَىٰ قَالَ يَٰمُوسَىٰٓ إِنَّ ٱلْمَلَأَ يَأْتَمِرُونَ بِكَ لِيَقْتُلُوكَ فَٱخْرُجْ إِنِّى لَكَ مِنَ ٱلنَّٰصِحِينَ' (اور ایک شخص شہر کے پرلے سرے سے بھاگا

ہوا آیا اور اس نے بتایا کہ اے موسیٰ! اعیانِ حکومت تمہارے قتل کے مشورے کر رہے ہیں تو تم یہاں سے نکل جاؤ، میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں)۔ یہ اس موقع کا ذکر ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ایک مصری کے قتل کا واقعہ صادر ہو گیا تھا اور فرعون کے آدمی ان کے قتل کے مشورے کر رہے تھے۔ اس وقت اسی مردِ حق نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دشمنوں کی سازش سے آگاہ کیا اور ان کو کہیں نکل جانے کا مشورہ دیا۔ جس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدین کو ہجرت فرمائی۔ ان کی جس تائید و حمایت کا یہاں حوالہ ہے اس کی ایک مثال تو یہیں آگے آ رہی ہے۔ اس کے علاوہ قرآن نے ان کے متعدد کارناموں کا حوالہ دیا ہے۔ سورۂ مومن کی آیت ۲۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرعون کے خاص شاہی خاندان کے ایک فرد تھے لیکن نہایت حق پرست تھے۔ ان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ان کی بعثت سے پہلے بھی نہایت ہمدردی تھی چنانچہ اوپر سورۂ قصص کا جو حوالہ نقل ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انھیں پتہ چلا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جان کو خطرہ ہے تو وہ چین سے بیٹھے نہیں رہے۔ بلکہ دور سے بھاگے ہوئے حضرت موسیٰؑ کے پاس پہنچے اور ان کو خطرے سے آگاہ کیا —— اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دعوائے نبوت کے بعد جب فرعون اور اس کے اعیان نے حضرت موسیٰ کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا تو اس مردِ حق نے بھرے دربار میں جو تقریر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تائید میں کی وہ قرآن نے سورۂ مومن میں نقل کی ہے۔ ہم یہ تقریر اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ اس کو پڑھیے تو کچھ اندازہ ہوگا کہ ان کا مرتبہ و مقام کیا تھا اور ان کی اس تائید و حمایت (تعزیز) کی نوعیت کیا تھی جس کا قرآن نے یہاں حوالہ دیا ہے۔ سورۂ مومن کی آیات ۲۶ - ۵ہم سامنے رکھ لیجیے۔

> "فرعون نے درباریوں سے کہا کہ تم لوگ مجھے موسیٰ کو قتل کر لینے دو، اگر وہ سچا ہے تو اپنی مدد کے لیے اپنے رب کو بلائے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تمہارا دین بدل دے گا یا ملک میں فساد برپا کر کے رہے گا۔ موسیٰ نے کہا میں ہر متکبر سے، جو روزِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا، اپنے اور تمہارے رب کی پناہ مانگتا ہوں۔
>
> اور ایک مردِ مومن، جو فرعون کے خاندان میں سے تھا اور اب تک اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا، بولا کہ کیا تم لوگ ایک شخص کو محض اس گناہ میں قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے درآنحالیکہ وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے نہایت واضح نشانیاں لے کر آیا ہے! اگر وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ہے تو اس کا وبال اسی پر آئے گا اور اگر وہ سچا ہے تو یاد رکھو کہ جس چیز سے وہ تم کو ڈرا رہا ہے اس کا کوئی حصہ تم کو پہنچ کے رہے گا۔ اللہ کبھی حد سے تجاوز کرنے والے اور جھوٹے کو بامراد نہیں کرتا۔ اے میری قوم کے لوگو! آج تم کو اس ملک میں اقتدار حاصل ہے لیکن کل اگر خدا کا عذاب ہم پر آ دھمکا تو خدا کے قہر سے ہم کو کون بچائے گا!

فرعون نے کہا، میں تمھیں وہی رائے دے رہا ہوں جو میری سوچی سمجھی ہوئی رائے ہے اور یاد رکھو کہ میں بالکل ٹھیک راہ کی طرف تمھاری رہنمائی کر رہا ہوں۔

مردِ مومن نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! میں تم پر اسی طرح کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں جس طرح کا عذاب پچھلی قوموں ـــــ نوح، عاد، ثمود کی قوموں اور ان کے بعد والوں ـــــ پر آیا۔ اللہ بندوں کے لیے ظلم کو پسند نہیں کرتا۔

اے میری قوم کے لوگو، میں تم پر ایک بڑی ہلچل کے دن کا اندیشہ رکھتا ہوں جس دن تم پیٹھ پیچھے بھاگو گے۔ اور کوئی تم کو خدا کے غضب سے بچانے والا نہیں ہوگا۔ یاد رکھو کہ جس کو خدا گمراہ کر دے اس کو کوئی دوسرا راہ دکھانے والا نہیں بن سکتا۔ اس سے پہلے تمھارے پاس یوسف کھلی نشانیوں کے ساتھ آئے لیکن تم ان کی دعوت کی طرف سے برابر شک ہی میں رہے۔ یہاں تک کہ جب ان کی وفات ہوگئی تو تم یہ سمجھ بیٹھے کہ اللہ اب کوئی رسول نہیں بھیجے گا۔ اللہ حدود سے تجاوز کرنے والوں اور شکیوں کو اسی طرح گمراہی میں ڈال دیتا ہے۔ یعنی ان لوگوں کو جو بغیر کسی دلیل کے اللہ کی آیات کے بارے میں جھگڑتے ہیں، ایسے لوگ اللہ اور اہلِ ایمان کے نزدیک زیادہ مبغوض ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح ہر متکبر و جبار کے دل پر مہر کر دیا کرتا ہے۔

فرعون نے ہامان کو مخاطب کر کے کہا، اے ہامان! میرے لیے ایک محل بنواؤ تاکہ میں آسمانوں کے اطراف میں جھانک کر دیکھوں کہ موسیٰ کا رب کہاں ہے! میں تو اس کو بالکل جھوٹا سمجھتا ہوں ....

مردِ مومن نے کہا، اے میری قوم کے لوگو، میری پیروی کرو، میں تمھیں سیدھی راہ دکھا رہا ہوں۔

اے میری قوم کے لوگو! یہ دنیا کی زندگی تو چند روزہ ہے، اصل ٹھکانا تو آخرت ہے۔ جو کسی برائی کا ارتکاب کرے گا تو وہ اسی کے مطابق بدلہ پائے گا ـــــ اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، تو یہی لوگ ہیں جو جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر بے حساب فضل ہوگا۔

اے میری قوم کے لوگو! کیا بات ہے کہ میں تو تمھیں نجات کی طرف بلا رہا ہوں اور تم مجھے دوزخ کی طرف بلا رہے ہو! تم مجھے دعوت دے رہے ہو کہ میں اللہ کا انکار کروں اور ایسی چیزوں کو اس کا شریک ٹھہراؤں جن کے باب میں مجھے کوئی علم نہیں اور میں تمھیں خدائے عزیز و غفار کی طرف دعوت دے رہا ہوں ـــــ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ تم جن کی طرف مجھے دعوت دے رہے ہو ان کی دہائی نہ دنیا میں کچھ نافع نہ آخرت میں۔ ہمارا لوٹنا اللہ کی طرف ہوگا اور حدود سے تجاوز کرنے والے جہنم کے ایندھن بنیں گے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کو بہت جلد تم یاد کرو گے۔ میں اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔

بے شک اللہ اپنے بندوں کا نگرانِ حال ہے۔ تو اللہ نے اس کو لوگوں کی بری سازشوں سے محفوظ رکھا اور آلِ فرعون کو بُرے عذاب نے گھیر لیا۔"

تین کا تیسرا

اس مردِ بزرگ کی یہ پوری تقریر پڑھیے۔ یہ تقریر انھوں نے مصر کے دارالامراء (HOUSE OF LORDS) میں اعیانِ حکومت کے سامنے اس وقت کی ہے جب فرعون نے حضرت موسیٰ کے قتل کی تجویز پیش کی ہے اور اعیانِ حکومت کو اپنی تجویز سے متفق کرنا چاہا ہے۔ اس وقت تک انھوں نے اپنا ایمان پوشیدہ رکھا تھا لیکن جب یہ فیصلہ کن وقت آگیا تو انھوں نے پردہ اٹھا دیا اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تائید اور حق کی حمایت میں، فرعون اور قوم کے تمام اعیان و اکابر کے سامنے، انھوں نے جو کچھ کہا ہے، جن دلائل کے ساتھ کہا ہے اور جس جرأت و بے خوفی کے ساتھ کہا ہے، اس کی مثال انبیاء اور صدیقین کی تاریخ کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتی۔ پھر یہ بات بھی یاد رکھیے کہ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں بلکہ خاندانِ شاہی کے ایک رکنِ رکین تھے اس وجہ سے ان کی اس نصیحت کو اعیانِ حکومت کسی اسرائیلی عصبیت پر محمول نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ پر تو انھوں نے یہ الزام لگایا کہ یہ اسرائیلیوں کو بغاوت پر ابھارنا چاہتے ہیں لیکن یہ صدائے حق جو انہی کے اندر کے ایک مردِ بزرگ کی طرف سے اٹھی، اس کے خلاف وہ اپنے عوام کے اندر کیا بدگمانی پھیلا سکتے تھے! ــــ اس مردِ جلیل کا یہی وہ شاندار اور زندۂ جاوید کارنامہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے 'فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ' کے الفاظ سے ذکر فرمایا۔ یہ اس معنی میں تو رسول نہیں تھے جس معنی میں حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ رسول تھے لیکن ان کے سب سے زیادہ طاقتور، سب سے زیادہ جاں نثار اور سب سے بڑے وفادار و راستباز ساتھی ضرور تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو تین کے تیسرے کا درجہ دیا۔

'قَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ' یہ جمع کے صیغہ سے ان سب کا یہ کہنا کہ 'اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ' اس امر کو مستلزم نہیں ہے کہ یہ تینوں حضرات ایک ہی درجہ کے رسول تھے بلکہ یہ بات علیٰ سبیل التغلیب ارشاد ہوئی ہے۔ ایک سفارت کے تمام ارکان ایک ہی درجہ و منصب کے نہیں ہوتے لیکن اصل ذمہ داری میں چونکہ سب شریک ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کو اس طرح اپنے کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے کا حق ہوتا ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اصل رسول کی حیثیت تو صرف حضرت موسیٰؑ کو حاصل تھی۔ حضرت ہارونؑ بھی اصل رسول نہیں بلکہ حضرت موسیٰؑ کے وزیر تھے۔ اسی طرح اس مردِ ثالث کی حیثیت رسول کی نہیں بلکہ ان رسولوں کے سب سے بڑے جاں نثار و مددگار کی تھی لیکن انھوں نے حضرت موسیٰؑ کی دعوت کی پوری ذمہ داری اپنے اوپر لے لی تھی اور اپنی قوم کو غلط کار لیڈروں کی پیروی سے روک کر حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ اور اپنی پیروی کی دعوت دے رہے تھے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اسی زمرے میں شمار فرمایا۔

قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا

تَكْذِبُوْنَ (۱۵)

فرعونیوں کا پامال اعتراض

یہ وہی اعتراض ہے جو ہر رسول کے مکذبین نے اپنے اپنے رسولوں کے خلاف اٹھایا ہے کہ تم تو ہمارے ہی جیسے انسان ہو تو تم خدا کے رسول کیسے ہوئے! اگر خدا کو کوئی رسول بھیجنا ہوتا تو کسی برتر مخلوق کو رسول بنا تا نہ کہ ہمارے ہی جیسے انسانوں کو۔ یہ اعتراض قرآن میں رسولوں کے مکذبین کی زبان سے بار بار نقل ہوا ہے۔ فرعون اور اس کے اعیان کو بھی حضرت موسیٰؑ پر یہ اعتراض تھا اور یہی اعتراض قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بھی اٹھایا تھا۔

'وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ الْاٰیَة'۔ یعنی تمہارا یہ دعویٰ کہ خدا نے تم پر کوئی کتاب یا وحی نازل کی ہے، بالکل جھوٹ ہے۔ خدا نے کوئی چیز بھی نازل نہیں کی ہے۔

قَالُوْا رَبُّنَا یَعْلَمُ اِنَّآ اِلَیْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ○ وَمَا عَلَیْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ (۱۶-۱۷)

اعتراض کا جواب اور تنبیہ

'رَبُّنَا یَعْلَمُ' قسم کے مفہوم میں آتا ہے۔ اس کی وضاحت ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں۔ ان کی تکذیب کے جواب میں انھوں نے قسم کے ساتھ فرمایا کہ ہم تمہارے پاس خدا کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ جس طرح آیت ۱۴ میں 'مُرْسَلُوْنَ' علیٰ سبیل التغلیب آیا ہے اسی اسلوب پر یہاں بھی جمع آیا ہے۔

'وَمَا عَلَیْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ' یہ ان کی طرف سے لوگوں کو تنبیہ ہے کہ اگر تم ہم کو جھٹلاتے ہو تو جھٹلاؤ۔ ہمارے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ذمہ داری ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہم تم کو خدا کی بات نہایت واضح طور پر پہنچا دیں۔ تمہارے دلوں میں ایمان اتار دینا ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر تم نے ہماری بات نہ مانی تو اس کا انجام خود بھگتو گے۔ ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں گے۔

قَالُوْٓا اِنَّا تَطَیَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَیَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۱۸)

لفظ 'تَطَیُّر' کی تحقیق اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ یہاں یہ بری فال لینے اور کسی کو منحوس سمجھنے کے مفہوم میں ہے۔

فرعونیوں کی طرف سے حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں پر نحوست کا الزام

یعنی ان رسولوں کی دعوت کے زمانے میں اہل مصر پر جو آفتیں، ان کی تنبیہ کے لیے نازل ہوئیں ان سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے انھوں نے ان کو حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیا اور کہا کہ یہ آفتیں ہمارے اعمال کے سبب سے ہم پر نہیں آرہی ہیں، جیسا کہ موسیٰؑ اور ان کے ساتھی دعویٰ کر رہے ہیں بلکہ یہ ان کی اس گمراہ کن دعوت کے نتیجہ میں پیش آرہی ہیں جس سے ہمارے دیوتا ناراض ہیں۔ ساتھ ہی ان کو دھمکی بھی دی کہ اگر تم لوگ اس بدعقیدگی کی اشاعت سے باز نہ آئے تو ہم اپنے دیوتاؤں کی حرمت کی حفاظت کے لیے تم کو سنگسار کر دیں گے اور اس کے علاوہ بھی بہت سے دکھ تم کو ہمارے ہاتھوں جھیلنے پڑیں گے۔ یہ مضمون سورۂ اعراف میں بھی گزر چکا ہے۔ فرمایا ہے۔ 'وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ ○ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ

قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ (۱۳۰-۱۳۱)

(اور ہم نے قومِ فرعون کو قحط اور پھلوں کی کمی میں مبتلا کیا کہ وہ نصیحت حاصل کریں تو جب ان کے حالات اچھے ہوتے کہتے کہ یہ تو ہمارا حق ہی ہے اور اگر ان کو کوئی آفت پہنچتی تو اس کو موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیتے)۔

قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ؕ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ (۱۹)

نحوست آدمی کے اپنے اعمال کے اندر ہوتی ہے

لفظ 'طائر' کی تحقیق بھی اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ یہاں اس کے معنی نحوست کے ہیں۔ یہ ان رسولوں کا جواب ہے کہ تم اپنی بدبختی کے اسباب دوسروں کے اندر ڈھونڈتے ہو حالانکہ تمھاری نحوست خود تمھارے ساتھ ہے۔ یہ جو کچھ پیش آ رہا ہے تمھارے اپنے ہی عقائد و اعمال کا نتیجہ ہے اس وجہ سے دوسروں کو ملزم ٹھہرانے کے بجائے اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھو اور اپنے اعمال و عقائد کا جائزہ لو۔

'اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ' یعنی تم ہمیں جو منحوس ٹھہرا رہے ہو تو کیا اس گناہ میں کہ ہماری طرف سے تم کو یاد دہانی کی گئی اور نیک و بد سے آگاہ کیا گیا ہے!

'بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ' یعنی یہ تمھاری سرکشی و بدبختی کی انتہا ہے کہ خدا کے حدود کو توڑ کر اپنے لیے خطرات کو دعوت دیتے ہو پھر خدا کے جو بندے تمھیں ان خطرات سے آگاہ کرتے ہیں ان کے شکرگزار ہونے کے بجائے اُلٹے انھی کو ان خطرات کا سبب قرار دیتے ہو۔

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ۙ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (۲۰-۲۱)

تیسرے منذر کی طرف سے تائیدِ حق

اوپر آیت ۱۴ میں جس تیسرے مُنذر کی طرف اشارہ ہے یہ اس کی تائیدِ حق کی تفصیل ہے۔ اوپر سورۂ اعراف کی آیت کے حوالہ سے ہم بیان کر چکے ہیں کہ 'رَجُلٌ' سے مراد وہی مومنِ آلِ فرعون ہے جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ سورۂ مومن میں ہوا ہے اور جس کی تقریر کا حوالہ ہم اوپر دے چکے ہیں ـــ اس کا واضح قرینہ یہ ہے کہ جن الفاظ میں ان کا تعارف یہاں کرایا گیا ہے بعینہٖ انھی الفاظ میں سورۂ اعراف میں بھی کرایا گیا ہے۔

'جَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى' سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ان کی ہمدردی محض لفظی نہیں بلکہ عملی تھی۔ اپنے خس خانوں میں بیٹھے بیٹھے تو بہت سے لوگ کسی مقصدِ حق اور مردِ حق کی تعریف و تحسین کر دیتے ہیں لیکن ایسے افراد، بالخصوص امرا و اغنیاء کے طبقہ میں بہت کم نکلتے ہیں جو عملاً اس حق کے لیے سرگرمی دکھائیں۔ لیکن اس مردِ حق کا حال اس سے مختلف تھا۔ ان کا مکان شہر کے ایک بعید کنارے پر تھا، جیسا کہ لفظ 'اقصٰی' سے واضح ہوتا ہے، لیکن جب کبھی انھوں نے یہ محسوس فرمایا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو کوئی خطرہ درپیش ہے تو وہ بھاگ کر، جیسا کہ لفظ 'یسعٰی' سے واضح ہوتا ہے، وہاں پہنچے ہیں اور اپنے تمام خاندانی

مفادات بلکہ اپنی جان تک خطرے میں ڈال کر ان کے لیے سپر بن گئے ہیں۔ اسی طرح کے ایک موقع کا حوالہ قرآن نے یہاں دیا ہے اور قرینہ دلیل ہے کہ یہ وہی موقع ہے جب انھوں نے فرعون کے سامنے وہ تقریر فرمائی ہے جو پیچھے ہم نقل کر آئے ہیں۔ آگے کی آیات سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

مردِ مومن کی تقریر کا اجمالی حوالہ

'قَالَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ' یہ اس تقریر کا اجمالی حوالہ ہے جو انھوں نے فرعون اور اس کے اعیان کے سامنے کی ہے۔ 'اِتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ' میں 'مُرْسَلِیْنَ' سے ان کا اشارہ زمرۂ مرسلین کی طرف ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اپنے کو بھی اصطلاحی مفہوم میں ایک رسول سمجھتے رہے ہوں۔ ان کے اس ارشاد میں اصل زور اس بات پر ہے کہ قوم کے لوگوں کو فرعون، ہامان، قارون اور اس قسم کے مفسد لیڈروں کے پیچھے چلنے کے بجائے ان لوگوں کے پیچھے چلنا چاہیے جن کو خدا نے لوگوں کی رہنمائی کے لیے بھیجا ہے یا جو لوگ ان کا ساتھ دے رہے اور ان کی پیروی کر رہے ہیں۔

رسولوں کے حق میں دو واضح دلیلیں

'اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْـَٔلُکُمْ اَجْرًا' یہ رسولوں کی پیروی کے حق میں دو دلیلیں ہیں۔ ایک یہ کہ ان رسولوں کا اس دعوت کے ساتھ کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہیں ہے بلکہ وہ ہر غرض سے بالاتر ہو کر محض خلق کی ہدایت کے لیے یہ سارے دکھ جھیل رہے ہیں۔ برعکس اس کے دوسرے لیڈر جو اس دعوتِ حق کی مخالفت کر رہے ہیں وہ محض اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔

دوسری دلیل انھوں نے یہ دی کہ 'وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ'۔ یہ رسول بے غرض ہونے کے ساتھ ساتھ ہدایت پر بھی ہیں۔ اس دلیل سے یہ بات نکلتی ہے کہ بے غرضی ایک شخص کی نیک نیتی کی شہادت تو ضرور ہے لیکن مجرد نیک نیتی اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ حق پر بھی ہے۔ اس وجہ سے کسی شخص کی نیک نیتی اور بے غرضی کے ساتھ ساتھ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس کی بات عقل و منطق کے معیار پر بھی پوری اترتی ہے یا نہیں۔ اگر وہ بے غرض بھی ہے اور اس کی دعوت عقل و منطق کی رو سے بھی صحیح ہے تو اس کی پیروی نہ کرنا بدبختی ہے۔

وَمَا لِیَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ یُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْـًٔا وَّلَا یُنْقِذُوْنِ ۝ اِنِّیْٓ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ اِنِّیْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّکُمْ فَاسْمَعُوْنِ (۲۲-۲۵)

قوم کے لیڈروں کی ملامت کا جواب

اندازِ کلام دلیل ہے کہ یہ بات انھوں نے قوم کے لیڈروں کی ملامت کے جواب میں فرمائی ہے۔ جب انھوں نے کھلم کھلا لوگوں کو رسولوں کی پیروی کی دعوت دی ہو گی تو ظاہر ہے کہ مفاد پرست لیڈروں نے ان کو قوم اور دینِ آبائی کا دشمن ٹھہرایا ہو گا۔ ان کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ آخر اس کی بندگی میں کیوں نہ کروں جس نے مجھے وجود بخشا اور جس کی طرف تم سب کو لوٹنا ہے۔ 'وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ' میں خطاب کا صیغہ تنبیہ کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج جس رب کی بندگی سے تم لوگ اس شدّ و مد کے ساتھ مجھے روک

رب ہے جو ایک دن پیشی سب کی اسی کے حضور میں ہونی ہے اور تمھیں اس کے آگے جواب دہی کرنی ہے۔

ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً الاٰية: یعنی یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں تمھارے کہنے سے ایسی چیزوں کو معبود بناؤں جن کی بے بسی کا یہ حال ہے کہ اگر خدا مجھے کوئی دکھ پہنچانا چاہے تو نہ ان کی سفارش میرے لیے کچھ نافع ہو سکتی ہے اور نہ وہ بذاتِ خود ہی یہ حیثیت رکھتے کہ مجھے اس دکھ سے نجات دے سکیں!

اِنِّیْٓ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ: یعنی اگر میں ایسا کروں تو یہ ایسی کھلی ہوئی گمراہی ہوگی جس کے لیے میرے پاس کوئی عذر نہ ہوگا۔

اِنِّیْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ: یہ قوم کو فیصلہ کن اور دنداں شکن جواب ہے کہ تم لوگ اچھی طرح کان کھول کر میری یہ بات سن لو کہ میں تمھارے رب پر ایمان لایا۔ مطلب یہ ہے کہ اب مجھے اس راہ سے ہٹانے کی کوشش میں اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ تم خود بھی یہی راہ اختیار کرو جو میں نے اختیار کی ہے اور اسی رب پر ایمان لاؤ جس پر میں ایمان لایا ہوں اس لیے کہ فی الحقیقت وہی تمھارا بھی رب ہے۔ اگر تم اس سے مجھے برگشتہ کرنے کی کوشش کرو گے تو اپنے رب ہی سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرو گے۔

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۭ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۙ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ (۲۶-۲۷)

دشمنوں کے شر سے حفاظت کی بشارت

مذکورہ اعلان کے بعد ظاہر ہے کہ ان کی پوری قوم ان کی دشمن بن کر ان کے خلاف سازشوں میں لگ گئی ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو سازشوں کے شر سے محفوظ رکھا اور حمایتِ حق کی راہ میں انھوں نے یہ بازی جو کھیلی اس کے صلہ میں ان کو جنت کی بشارت دی گئی جس پر انھوں نے اس تمنا کا اظہار فرمایا کہ کاش میری قوم بھی اس بات کی قدر و قیمت جانتی جس کے صلہ میں مجھے یہ مغفرت اور سرفرازی حاصل ہوئی۔

یہاں اس بات کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ یہ بشارت ان کو کس موقع پر دی گئی ہے۔

کلام کے سیاق و سباق پر غور کرنے سے تین امکان سامنے آتے ہیں۔

ایک یہ کہ ان کے اس اعلان کے بعد قوم کے اشرار نے ان کو شہید کر دیا اور اس وقت ان کو یہ بشارت دی گئی ہو۔

دوسرا یہ کہ اس کے بعد انھوں نے قوم کے رویہ سے مایوس ہو کر ہجرت فرمائی ہو اور اس وقت ان کو یہ بشارت ملی ہو۔

تیسرا یہ کہ اس کے بعد چونکہ ان کا مشن پورا ہو چکا تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس بشارت کے ساتھ ان کو وفات دی ہو۔

ان میں سے پہلا امکان کلام کے سیاق و سباق کی روشنی میں اگرچہ زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے لیکن سورۂ مومن کے حوالے سے اوپر ہم نے ان کی جو تقریر نقل کی ہے اس کے آخر میں یہ تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے ان کو قوم کی سازشوں کے شر سے محفوظ رکھا۔ ان کے وداعی کلمات کے بعد ان کی حفاظت کا ذکر یوں ہوا ہے:

فَسَتَذْكُرُونَ مَآ أَقُولُ لَكُمْ ۚ وَأُفَوِّضُ أَمْرِىٓ إِلَى ٱللَّهِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ بَصِيرٌۢ بِٱلْعِبَادِ ۝ فَوَقَىٰهُ ٱللَّهُ سَيِّـَٔاتِ مَا مَكَرُوا۟ ۖ وَحَاقَ بِـَٔالِ فِرْعَوْنَ سُوٓءُ ٱلْعَذَابِ ۝ (المؤمن : ۴۴ - ۴۵)

(اے میری قوم کے لوگو!) میں جو کچھ تم سے کہہ رہا ہوں اس کو تم عنقریب یاد کرو گے۔ میں اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حالات کو دیکھنے والا ہے۔ پس اللہ نے اس کو ان سازشوں کی آفات سے محفوظ رکھا جو لوگوں نے اس کے خلاف کیں اور آلِ فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا۔

اس آیت کی روشنی میں یہ امکان تو خارج از بحث ہو جاتا ہے کہ ان کو قتل کیا گیا ہو البتہ مذکورہ بالا دو امکان باقی رہ جاتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان دو میں سے کون سی صورت پیش آئی۔ اس کا صحیح علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ بس اتنی بات یقینی ہے کہ حق کی حمایت میں جو جاں بازی انھوں نے دکھائی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا انعام ان کو یہ ملا کہ اسی دنیا میں 'مبشر بالجنۃ' قرار پائے۔

وَمَآ أَنزَلْنَا عَلَىٰ قَوْمِهِۦ مِنۢ بَعْدِهِۦ مِن جُندٍ مِّنَ ٱلسَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنزِلِينَ ۝ إِن كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَٰحِدَةً فَإِذَا هُمْ خَٰمِدُونَ ۝ (۲۸ - ۲۹)

'مِنۢ بَعْدِهِۦ' میں مذکورہ بالا دو باتوں کا امکان ہے۔ ان کی موت کے بعد یا ان کی ہجرت کے بعد۔

رسولوں کے مکذبین کے لیے سنتِ الٰہی

یہ اس سنتِ الٰہی کا حوالہ ہے جس سے مکذبین کو لازماً سابقہ پیش آتا ہے جب کہ رسول اور اس کے ساتھی قوم کو چھوڑ کر ہجرت کر جاتے ہیں۔ فرمایا کہ اس کے بعد ہمیں اس کی قوم کو پامال کرنے کے لیے آسمان سے کوئی فوج نہیں اتارنی پڑی بلکہ ہماری ایک ہی ڈانٹ میں وہ پامال ہو کے رہ گئے۔ لفظ 'صیحۃ' عذاب کی تعبیر ہے۔ 'وَمَا كُنَّا مُنزِلِينَ' سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ان کے لیے آسمان سے کوئی فوج نہ اتارنے کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کے کاموں کے لیے ہم اپنی فوجیں نہیں اتارا کرتے، بس ہماری ایک ڈانٹ ہی کافی ہو جاتی ہے۔

یہ حقیقت بھی نگاہ میں رہے کہ ہر چند یہ عذاب اصلاً حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ کی تکذیب کے نتیجہ میں آیا لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے اس کو اس بندۂ مومن کی تکذیب کے نتیجہ کی حیثیت سے ذکر فرمایا ہے۔ اس سے رسول کے ساتھیوں کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ان کا یہ درجہ ہوتا ہے کہ ان کی تکذیب رسول کی تکذیب کے ہم معنی بن جاتی ہے اور اس کا وہی انجام ہوتا ہے جو رسول کی تکذیب کا ہوتا ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ حضرت موسیٰؑ کے مکذبین ـــــ فرعون اور اس کی قوم ـــــ پر جو عذاب آیا اس کی شکل تو یہ ہوئی کہ فرعون اپنی تمام فوج سمیت دریا میں غرق کر دیا گیا لیکن یہاں جس عذاب کا ذکر ہے اس میں غرق کے واقعہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے بلکہ الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پر بھی کوئی اسی طرح کا عذاب آیا جس طرح کا عذاب عاد و ثمود اور دوسری پچھلی قوموں پر آیا جس کا اندیشہ اس مردِ مومن نے اپنی اس تقریر میں ظاہر کیا تھا جو سورۂ مومن کے حوالے سے اوپر نقل ہوئی ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ فرعون اور اس کی قوم پر دونوں قسم کے عذاب آئے ـــــ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی فوجوں کو ایک سائیکلونی طوفان کے ذریعے سے سمندر میں غرق کر دیا، دوسری طرف رعد و برق اور زلزلہ کے عذاب نے مصر کی تمام تعمیرات اور اس کے سارے باغ و چمن تاراج کر دیے۔ اس دوسرے عذاب کا ذکر تورات میں نہیں ہے لیکن قرآن میں اس کا ذکر نہایت واضح الفاظ میں ہے ـــ مثلاً فرمایا ہے:

وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ (الاعراف: ۱۳۷)	اور ہم نے تاراج کر دیے وہ سب کچھ جو فرعون اور اس کی قوم کے لوگ بناتے رہے تھے اور ان کے انگوروں کے وہ باغ بھی جن کو وہ ٹٹیوں پر چڑھاتے تھے۔

یہی بات سنتِ الٰہی کے مطابق بھی ہے۔ رسول کی تکذیب کے نتیجہ میں جو عذاب کسی قوم پر آیا ہے اس نے قوم کے قومی وجود کی جڑ کاٹ دی ہے۔ یہ بات مجرد فرعون اور اس کی فوجوں کے غرق ہونے سے نہیں پوری ہو سکتی تھی۔ یہ اسی طرح کے کسی عذاب سے پوری ہو سکتی تھی جس کی طرف سورۂ اعراف کی مذکورہ بالا آیت اشارہ کر رہی ہے۔ اسی کا ذکر یہاں آیت زیرِ بحث میں ہے۔

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ (۳۰)

مکذبینِ رسول کی بدبختی پر اظہارِ افسوس

یہ مکذبینِ رسول کی بدبختی پر اظہارِ افسوس ہے کہ ہمیشہ سے لوگوں کا حال یہی رہا ہے کہ جب اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے کوئی رسول بھیجا تو لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا ہے اور پھر اس کے انجامِ بد سے دوچار ہوئے ہیں۔ چنانچہ جو روش فرعون اور اس کی قوم نے اپنے رسولوں کے ساتھ اختیار کی آج وہی روش قریش نے اپنے رسول اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ اختیار کی ہے اور لازماً یہ بھی اسی انجام سے دوچار ہوں گے جس سے ان کے پیشرو دوچار ہوئے۔ رسول، خدا کی سب سے بڑی رحمت بن کر آتا ہے لیکن اس کو مذاق بنا لیا جائے تو پھر اس سے بڑی نقمت بھی کوئی نہیں ہے۔

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُونِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝ وَإِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ (۳۱-۳۲)

یہ قریش کو رسولوں کے ساتھ استہزا کا انجام دکھانے کے لیے ماضی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ کھیل جو وہ کھیل رہے ہیں یہ ایک نہایت خطرناک کھیل ہے۔ یہ کھیل کھیلنے والی قومیں اس دنیا سے اس طرح مٹی ہیں کہ اب وہ کبھی واپس آنے والی نہیں ہیں۔ بلکہ اب ان سب کی حاضری ہمارے ہی سامنے ہونی ہے اور ہم ہی ان کا حساب کریں گے۔

لمّا کا استعمال

'وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا' میں 'لَمَّا' اسی طرح کا ہے جس طرح سورۂ طارق میں ہے 'اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ' (بے شک ہر جان پر ایک نگران مامور ہے)۔ یہ 'اِنْ' مخففہ ہے اور 'ل' اس کا قرینہ ہے چونکہ جملہ میں کچھ صوتی خلا رہ جاتا ہے اس وجہ سے اس کو بھرنے کے لیے اس کو 'لَمَّا' کر دیتے ہیں۔ معنی پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔

۴- آگے کا مضمون۔ آیات ۳۳-۵۰

آگے آفاق کی نشانیوں سے رسول کی دعوت اور اس کے انذار کی تائید کی ہے اور ان لوگوں کو تنبیہ فرمائی ہے جو کائنات کی ان تمام نشانیوں سے آنکھیں بند کیے ہوئے کسی نئی نشانی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ گویا اوپر کی تاریخی شہادت کے بعد کلام از سرِ نو تمہید سے متصل ہو گیا ہے جس میں یہ بات فرمائی گئی تھی کہ ان کی اصلی بیماری یہ ہے کہ استکبار ان کو اوپر یا نیچے کی کسی نشانی کی طرف متوجہ نہیں ہونے دے رہا ہے ورنہ ان کے آگے اور پیچھے نشانیوں کی کمی نہیں ہے۔ ان کے اس رویہ اور اس کے انجام کی مثال قومِ فرعون سے دینے کے بعد پھر ان کو آسمان و زمین کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۳-۵۰

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۖ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ
يَاْكُلُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا
فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ﴿۳۴﴾ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ۭ
اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا
تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ
الَّيْلُ ښ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَالشَّمْسُ
تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۳۸﴾ وَالْقَمَرَ

قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ﴿۳۹﴾ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ
لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ
يَّسْبَحُوْنَ ﴿۴۰﴾ وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ
الْمَشْحُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَاِنْ نَّشَاْ
نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا
وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۴۴﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ
وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ
رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا
رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَاۗءُ
اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ڰ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۷﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا
الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً
تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى
ع ۱۸ ۳ ۲ اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع

ترجمہ آیات ۳۳-۵۰

اور ایک بہت بڑی نشانی ان کے لیے مردہ زمین ہے۔ اس کو ہم نے زندہ کیا اور اس سے غلے اُگائے پس اس میں سے وہ کھاتے ہیں۔ اور اس میں ہم نے کھجوروں اور انگوروں کے باغ لگائے اور اس میں چشمے جاری کر دیے کہ وہ اس کے پھل کھائیں، اور یہ ان کے ہاتھوں کی کارگزاری نہیں ہے تو کیا وہ شکر نہیں کرتے! ۳۳-۳۵

پاک ہے وہ ذات جس نے تمام قسمیں پیدا کیں ان چیزوں میں سے بھی جن کو زمین اگاتی

ہے اور خود ان کے اندر سے بھی اور ان چیزوں میں سے بھی جن کو وہ نہیں جانتے۔ ۳۶

اور ان کے لیے ایک بہت بڑی نشانی رات ہے۔ ہم اس سے دن کو کھینچ لیتے ہیں پس وہ دفعتہً اندھیرے میں رہ جاتے ہیں اور سورج اپنے ایک معین مدار پر گردش کرتا ہے، یہ خدائے عزیز وعلیم کی منصوبہ بندی ہے! اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں ٹھہرا دی ہیں یہاں تک کہ وہ کھجور کی پرانی ٹہنی کے مانند ہو کے رہ جاتا ہے۔ نہ سورج کی مجال ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت کر سکتی۔ ہر ایک اپنے خاص دائرے میں گردش کرتا ہے۔ ۳۷-۴۰

اور ان کے لیے ایک بہت بڑی نشانی یہ ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا اور ان کے لیے اسی کے مانند (خشکی میں بھی) چیزیں پیدا کیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں۔ اور اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں پھر نہ ان کا کوئی فریاد رس ہوگا اور نہ ان کو نجات مل سکے گی۔ بس یہ ہماری رحمت اور ایک وقت معین تک ان کو بہرہ مند کرنا ہے۔ ۴۱-۴۴

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز سے ڈرو جو تمھارے آگے اور پیچھے ہے کہ تم پر رحم کیا جائے (تو وہ اعراض کرتے ہیں) اور ان کے رب کی نشانیوں میں سے جو نشانی بھی ان کے پاس آتی ہے وہ اس سے اعراض ہی کرنے والے بنے رہتے ہیں۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ تم کو رزق بخشا ہے اس میں سے خرچ کرو تو جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ کیا ہم ان لوگوں کو کھلائیں جن کو خدا چاہتا تو کھلاتا! یہ تو تم لوگ ایک صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہو! ۴۵-۴۷

اور وہ پوچھتے ہیں کہ یہ دھمکی کب پوری ہو گی اگر تم لوگ سچے ہو! یہ لوگ بس ایک ڈانٹ ہی کے منتظر ہیں جو ان کو آ پکڑے گی اور وہ جھگڑتے ہی رہ جائیں گے! پس نہ تو وہ کوئی وصیت کر پائیں گے اور نہ اپنے لوگوں کے پاس لوٹ ہی سکیں گے۔ ۴۸ - ۵۰

۵ - الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاٰیَۃٌ لَّھُمُ الۡاَرۡضُ الۡمَیۡتَۃُ ۚۖ اَحۡیَیۡنٰھَا وَاَخۡرَجۡنَا مِنۡھَا حَبًّا فَمِنۡہُ یَاۡکُلُوۡنَ ۝ وَجَعَلۡنَا فِیۡھَا جَنّٰتٍ مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ وَّفَجَّرۡنَا فِیۡھَا مِنَ الۡعُیُوۡنِ ۝ لِیَاۡکُلُوۡا مِنۡ ثَمَرِہٖ ۙ وَمَا عَمِلَتۡہُ اَیۡدِیۡھِمۡ ؕ اَفَلَا یَشۡکُرُوۡنَ (۳۳-۳۵)

دلیل ربوبیت سے خدا کی شکرگزاری اور اس کی عبادت کا مطالبہ

یہ سب سے پہلے زمین کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مردہ زمین کی از سرِ نو زندگی سے قیامت، توحید اور آسمانی ہدایت کے نزول پر جن گوناگوں پہلوؤں سے استشہاد کیا ہے اس کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔ یہاں ربوبیت کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے اور پھر خدا کی شکرگزاری کے حق کا مطالبہ کیا ہے جو بندوں پر لازماً عائد ہوتا ہے۔ اس شکر کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ بندے تنہا اپنے رب ہی کی بندگی کریں اس لیے کہ ان نعمتوں میں سے کوئی نعمت بھی نہ تو انسان کی اپنی سعی و تدبیر سے وجود میں آئی ہے اور نہ کوئی دوسرا ان کو وجود میں لانے والا بنا ہے۔

'وَاٰیَۃٌ لَّھُمُ الۡاَرۡضُ الۡمَیۡتَۃُ' لفظ اٰیَۃٌ کی تنکیر تفخیم شان پر دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو اگر کسی نشانی کی طلب ہے تو اس کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے لیے ایک سب سے بڑی نشانی ان کے پاؤں کے نیچے بچھی ہوئی یہ زمین ہی ہے۔ یہ بالکل مردہ ہوتی ہے، ہم اپنی بارش بھیج کر اس کو زندہ کرتے اور پھر اس سے غلے پیدا کرتے ہیں اور ان غلوں ہی پر ان کی معاش کا انحصار ہے۔ پھر یہ غور کریں تو ان کو معلوم ہو گا کہ ہم نے ان کی معاش کے لیے صرف غلے ہی کا انتظام نہیں کیا ہے بلکہ ہم نے اس میں ان کے لیے کھجور اور انگور اور دوسرے پھلوں کے باغ بھی اگائے ہیں اور ان باغوں کو شاداب رکھنے کے لیے چشمے بھی جاری کر دیے ہیں۔

'لِیَاۡکُلُوۡا مِنۡ ثَمَرِہٖ ۙ وَمَا عَمِلَتۡہُ اَیۡدِیۡھِمۡ ؕ اَفَلَا یَشۡکُرُوۡنَ'۔ یہ اس تمام اہتمام ربوبیت کا حق بیان فرمایا ہے کہ یہ سارا اہتمام ہم نے اس لیے کیا کہ بندے ہماری نعمتوں سے بہرہ مند ہوں اور اس امر پر دھیان کریں کہ یہ ان کے ہاتھوں کی کارفرمائی نہیں ہے بلکہ ایک رب رحیم و کریم و منعم کی بخشش ہے

جس نے ان کو بغیر کسی استحقاق کے ان نعمتوں سے بہرہ مند کیا ہے کہ وہ اس کے شکرگزار و فرمانبردار بنیں۔ لیکن ان کی ناسپاسی کا یہ حال ہے کہ یہ تمام نعمتوں سے فائدہ تو اٹھا رہے ہیں لیکن جب ان کو خدا کی شکرگزاری کی دعوت دی جاتی ہے تو اکڑتے اور نشانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔

زبان کا ایک خاص اسلوب

'مِنْ ثَمَرِہٖ' کی ضمیر کے مرجع کے بارے میں اہلِ تاویل کا اختلاف ہے۔ اکثر لوگوں نے اس کا مرجع اللہ تعالیٰ کو مانا ہے۔ (یعنی لوگ اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے پھل کھائیں اور اس کے شکرگزار رہیں) اس تاویل میں مجھے تکلف محسوس ہوتا ہے۔ اوپر سے اسلوب کلام متکلم کا چلا آ رہا ہے اس وجہ سے اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے یہاں 'مِنْ ثَمَرِہٖ' کے بجائے 'مِنْ اَثْمَارِنَا' یا اس کے ہم مطلب کوئی اور اسلوب ہوتا اگرچہ یہ بھی کچھ موزوں نہ ہوتا۔ میرے نزدیک اس ضمیر کا مرجع 'ارض' ہی ہے جس کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے لیکن اس کے لیے یہاں ضمیر مذکر اس اسلوب پر آئی ہے جس کو اہلِ ادب 'علیٰ سبیل التاویل' سے تعبیر کرتے ہیں۔ عربی زبان میں یہ قاعدہ ہے کہ بعض مرتبہ ضمیر لفظ کے ظاہر کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس کے مفہوم کے اعتبار سے آتی ہے۔ اس کی متعدد مثالیں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔ یہاں 'ارض' کے لیے مذکر ضمیر استعمال کر کے یہ اشارہ فرما دیا کہ اس سے 'بلد طیب' مراد ہے۔ اس لیے کہ بارش ہونے کو تو ہر خشک و تر اور ہر بنجر اور زرخیز زمین پر ہوتی ہے لیکن بار آور وہی زمین ہوتی ہے جو زرخیز ہوتی ہے۔ یہ مضمون سورۂ اعراف میں اس طرح بیان ہوا ہے۔ 'وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا' (اعراف: ۵۸) (اور جو زمین زرخیز ہوتی ہے اس کی نباتات تو اس کے رب کے حکم سے خوب اگتی ہیں اور جو زمین ناقص ہوتی ہے اس سے ناقص ہی چیز اگتی ہے)۔

'وَمَا عَمِلَتْهُ اَیْدِیْهِمْ' یہ جملہ معترضہ کے محل میں ہے اور یہ ایک نہایت اہم یاددہانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان پھلوں کو کھائیں اور یہ یاد رکھیں کہ ان کو وجود میں لانے والے وہ نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اسی حقیقت کا تذکر ہی آدمی کے اندر شکر کا جذبہ ابھارتا ہے اور یہی شکر تمام دین کی بنیاد ہے۔ جو لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں وہ اللہ کی نعمتوں کو اپنے استحقاق اور اپنی قابلیت و صلاحیت کا کرشمہ سمجھتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ خدا کے شکرگزار بندے بننے کے بجائے استکبار میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ استکبار اپنی فطرت کے اعتبار سے شرک اور تمام فساد فی الارض کا پیش خیمہ ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ (۳۶)

توحید پر استدلال

لفظ 'ازواج' انواع و اقسام کے معنی میں بھی آتا ہے اور جوڑے جوڑے کے مفہوم میں بھی۔ یہاں یہ دونوں ہی معنوں کا جامع ہے۔ زمین سے جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں ان کو دیکھیے تو ان کے اندر گوناگونی اور تنوع بھی ہے اور ہر چیز جوڑے جوڑے کی شکل میں بھی نظر آتی ہے۔ اسی طرح انسانوں کو دیکھیے تو ان کی شکلوں، رنگوں، قامتوں اور زبانوں میں عظیم فرق نظر آئے گا اور ساتھ ہی ان کے اندر جوڑے جوڑے

ہونے کا وصف بھی پایا جاتا ہے۔ یہی حال اس عالم کے اس حصہ کا ہے جو ہمارے علم کی رسائی سے باہر ہے۔ اب ایک قدم آگے بڑھ کر غور کیجیے تو یہ حقیقت بھی آپ پر واضح ہو گی کہ اس کے تنوع کے اندر مقصد کی ہم آہنگی اور اس کے تضاد کے اندر توافق کی سازگاری پائی جاتی ہے۔ یہ چیز اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کائنات پر ایک ہی خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کا ارادہ کارفرما ہے۔ کوئی دوسرا اس میں دخیل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات شرک کے ہر شائبہ سے پاک ہے اور اس کی اس پاکی کی شہادت اس کائنات کی ہر چیز دے رہی ہے۔

آخرت کا دلیل

نیز یہ بات بھی واضح ہوئی کہ جب ہر چیز جوڑا جوڑا ہے اور ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر اپنے مقصد کو پورا کرتی ہے تو لازم ہے اس دنیا کا بھی کوئی جوڑا ہو ورنہ یہ بالکل بے مقصد و بے غایت ہو کے رہ جاتی ہے اور یہ بات ایک حکیم خالق کی شان سے بعید ہے کہ وہ کوئی عبث اور بے مقصد کام کرے۔ چنانچہ اس دنیا کے اس خلا کو بھرنے کے لیے اس نے آخرت بنائی ہے۔

آیت کا مدعا یہ ہوا کہ یہ کائنات اپنے وجود سے توحید اور آخرت کی شہادت دے رہی ہے اور اس کا خالق اس بات سے پاک ہے کہ اس کا کوئی شریک ہو یا اس نے یہ دنیا بالکل بے مقصد بنائی ہو۔ لفظ سُبْحٰنَ تنزیہہ کے لیے آتا ہے۔ یہاں اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

وَاٰیَۃٌ لَّھُمُ الَّیْلُ ۚ نَسْلَخُ مِنْہُ النَّھَارَ فَاِذَا ھُمْ مُّظْلِمُوْنَ (۳۷)

شب اور روز کی نشانی

فرمایا کہ اگر یہ لوگ غور کریں تو ان کے لیے رات بھی خدا کی قدرت، حکمت، ربوبیت اور توحید کی ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ ہم اس کے اوپر ایک نور کی چادر اوڑھا دیتے ہیں تو ان کے لیے روشن دن نمودار ہو جاتا ہے جس میں وہ اپنے کام کاج انجام دیتے ہیں۔ پھر ہم اپنی یہ نورانی چادر اس سے کھینچ لیتے ہیں تو وہ تاریکی میں ہو جاتے ہیں جس میں وہ آرام کرتے ہیں۔ اگر ہم اپنی یہ نورانی چادر نہ اوڑھائیں تو ہمیشہ تاریکی ہی میں رہیں اور اگر اس چادر کو نہ کھینچیں تو ان کو کبھی شب کا سکون نہ میسر ہو۔ روز و شب کا یہ ایاب و ذہاب اور خلق کے مفاد کے لیے ان کی یہ سازگاری اس بات کی صاف دلیل ہے کہ یہ دنیا اضداد کی کوئی رزم گاہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک خالق کی بنائی ہوئی دنیا ہے جو اس کے تمام اضداد کو اس کے مجموعی مفاد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّھَا ۭ ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (۳۸)

سورج کی نشانی

یہ دن کے اندر ظاہر ہونے والی سب سے بڑی نشانی کی طرف توجہ دلائی کہ اس سورج کو دیکھیں کہ یہ پوری پابندی کے ساتھ اپنے ایک معین محور و مدار پر گردش کرتا ہے۔ مجال نہیں کہ اپنے محور و مدار سے ذرا ہٹ سکے یا اس کی پابندی اوقات میں منٹ یا سیکنڈ کا بھی فرق پیدا ہو سکے۔ کیا یہ اس بات کی شہادت ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے آپ سے آپ ہو رہا ہے، اس کے پیچھے کوئی مدبر

اور کارفرما طاقت نہیں ہے؟ یا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے پیچھے ایک قاہر و مقتدر اور علیم و حکیم ہستی ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی باگ ہے اور وہ اپنے بنائے ہوئے نقشہ اور اپنے قرار دادہ منصوبہ کے مطابق ہر چیز کو استعمال کر رہی ہے؟ اس کا صحیح جواب، عقل و فطرت کے مطابق، صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ یعنی یہ دنیا نہ تو اتفاق سے وجود میں آئی ہوئی کوئی چیز ہے اور نہ یہ آپ سے آپ چل رہی ہے بلکہ یہ ایک ایسی ہستی کی پلاننگ کا کرشمہ ہے جو ہر چیز پر قادر و غالب اور ہر چیز کا علم رکھنے والی ہے۔

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ (۳۹)

چاند کی نشانی

فرمایا کہ یہی حال اس دنیا کی دوسری سب سے بڑی نشانی —— چاند —— کا ہے۔ وہ بھی نہ خود کار ہے، نہ خود مختار بلکہ ہم نے اس کے لیے منزلیں ٹھہرا رکھی ہیں جو ہر ماہ اس کو طے کرنی پڑتی ہیں یہاں تک کہ منزلیں طے کرتے کرتے وہ بالآخر کھجور کی پرانی ٹہنی کے مانند ہو کے رہ جاتا ہے۔

عُرْجُوْن کھجور کی اس ٹہنی کو کہتے ہیں جس میں خوشے لگتے ہیں۔ یہ ٹہنیاں خشک ہونے کے بعد خمدار ہو کر بالکل وہ شکل اختیار کر لیتی ہیں جو شکل آخری اور ابتدائی تاریخوں میں چاند کی ہوتی ہے۔ یہ تشبیہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ جس چاند کو نادان لوگ پوجتے ہیں اس غریب کی بے بسی کا یہ حال ہے کہ ہر ماہ اس کو مختلف منازل فلکی طے کرنی پڑتی ہیں جس سے وہ سوکھ کے کانٹا اور اس طرح خمیدہ کمر ہو کے رہ جاتا ہے جس طرح کھجور کی سوکھی ٹہنی۔

لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (۴۰)

ساری کائنات ایک ہی خدا کے ہاتھ میں ہے

یعنی اس کائنات کا سارا نظام اس کے خالق نے اس طرح اپنے قابو میں کر رکھا ہے کہ نہ سورج کی مجال ہے کہ وہ اپنے مدار سے نکل کر چاند کے مدار میں جا گھسے اور اس کو پکڑ لے اور نہ رات کی مجال ہے کہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی دن پر سبقت کر جائے بلکہ ان میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے دائرے میں گردش کرنی پڑتی ہے —— یہ اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز کی باگ ایک ہی خدائے قدیر و علیم کے ہاتھ میں ہے اور وہی تنہا ہر چیز کا مالک و مختار ہے۔ اگر اس کے سوا کسی اور کا بھی اس میں کوئی دخل ہوتا تو یہ دنیا اپنے اضداد کے تصادم میں تباہ ہو جاتی۔ خاص طور پر یہ حقیقت تو بالکل نمایاں ہے کہ جو چیزیں جتنی ہی زیادہ نمایاں ہیں اور جن کے نمایاں ہونے ہی کی بنا پر قوموں نے ان کو معبود مان کر ان کی پرستش کی وہ اپنے وجود ہی سے یہ اعلان کر رہی ہیں کہ وہ سب سے زیادہ مسخر و محکوم ہیں، مجال نہیں ہے کہ وہ اپنے دائرۂ کار سے ایک انچ بھی اِدھر یا اُدھر سرک سکیں۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۙ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ

یَرْکَبُوْنَ ۝ وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِیْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ یُنْقَذُوْنَ ۝ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰی حِیْنٍ (۴۱-۴۴)

کشتی کی نشانی

'ذُرِّیَّتَهُمْ' میں 'هُمْ' سے مراد مخاطب بحیثیت انسان ہیں اور 'ذُرِّیَّة' نسل کے مفہوم میں ہے۔ 'مَشْحُوْن' بھری ہوئی کشتی کو کہتے ہیں۔ فرمایا کہ اگر ان کو مزید نشانی کی طلب ہو تو وہ اس بات کو دیکھیں کہ ہم نے نسلِ انسانی کے بحری سفر کے لیے یہ اہتمام کیا ہے کہ ان کی کشتیاں سمندر کے سینہ پر سے ہزاروں ٹن سامان لے کر چلتی ہیں اور نہیں ڈوبتیں۔

خشکی کے سفینے

'وَخَلَقْنَا لَهُمْ الاٰیة' فرمایا کہ جس طرح سمندر کے سفر کے لیے ہم نے کشتی بنائی ہے اسی طرح کی چیزیں ہم نے خشکی کے سفر کے لیے بھی بنائی ہیں مثلاً گھوڑے اور اونٹ وغیرہ۔ خاص طور پر اونٹ کو عرب میں سفینۂ صحرا کی حیثیت حاصل تھی۔ اسی حکم میں وہ سواریاں بھی داخل ہیں جو اب سائنس کی مدد سے ایجاد ہوئی ہیں یعنی موٹریں، لاریاں، بسیں، ہوائی جہاز وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں جن قوانین کے تحت کام کرتی ہیں وہ خدا ہی کے بنائے اور اسی کے سکھائے ہوئے ہیں۔ انسان انہی قوانین سے کام لے کر مختلف چیزیں ایجاد کرتا اور ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف منسوب فرمایا اس لیے کہ اصل حقیقت یہی ہے۔

ہر چیز اللہ کے فضل کا کرشمہ ہے

'وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِیْخَ لَهُمْ الاٰیة'۔ 'صَرِیْخ' فریاد اور فریاد رسی کے معنی میں بھی آتا ہے اور فریاد کرنے اور فریاد رسی کرنے والے کے معنی میں بھی۔ یہاں یہ تمام معانی کے اعتبار سے موزوں ہے۔ فرمایا کہ یہ ہماری رحمت ہے کہ ان کی لدی پھندی کشتیاں سمندر کے سینہ پر دوڑتی ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو ان کو کشتی سمیت غرق کر دیں پھر نہ وہ کوئی فریاد کر سکیں اور نہ کوئی ان کی فریاد رسی کر سکے اور نہ وہ اس ورطۂ ہلاکت سے کسی طرح نجات پا سکیں۔

'اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰی حِیْنٍ' فرمایا کہ انسان کو یہ جو کچھ بھی حاصل ہے نہ اس کے اب وجد کی میراث ہے اور نہ اس کی اپنی قوت و قابلیت کا کرشمہ بلکہ یہ محض خدا کا فضل اور اس کی رحمت ہے جس سے ایک وقتِ خاص تک کے لیے اس نے اس کو بہرہ مند کیا ہے۔ بالآخر وہ وقت آنے والا ہے جب اللہ تعالیٰ ان تمام نعمتوں سے متعلق پرسش کرے گا کہ ان کا شکر اور حق ادا کیا گیا یا نہیں!

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَیْنَ اَیْدِیْکُمْ وَمَا خَلْفَکُمْ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ (۴۵)

ناشکروں کو تنبیہ!

یعنی جب ان کو تنبیہ کیا جاتا ہے کہ تمہارے آگے اور پیچھے جو آسمان و زمین ہیں ان سے ڈرو کہ زمین تمہارے سمیت دھنسا نہ دی جائے اور آسمان سے تم پر ٹکڑے نہ گرا دیے جائیں تو وہ متنبہ ہونے کے بجائے اعراض کرتے اور عذاب کی نشانی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ 'اِذَا' کا جواب یہاں بربنائے وضاحت قرینہ محذوف ہے اور 'مَا بَیْنَ اَیْدِیْکُمْ وَمَا خَلْفَکُمْ' کے بعد 'مِنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ' کے الفاظ محذوف ہیں۔ سورہ

سبا میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔ اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ (۹) (کیا وہ اپنے آگے اور پیچھے کے آسمان اور زمین پر غور نہیں کرتے! اگر ہم چاہیں تو ان کے سمیت زمین کو دھنسا دیں یا ان کے اوپر آسمان سے ٹکڑے گرا دیں)۔

وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ (۴۶)

یعنی یہ اعراض و انکار اس طرح ان پر مستولی ہو گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو آیت بھی ان کی تعلیم و تذکیر کے لیے آتی ہے وہ بالکل بے سود ہو کے رہ گئی ہے۔ کوئی چیز بھی ان کے اوپر کارگر نہیں ہوتی۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۴۷)

ایک جاہلی فلسفہ

اوپر والی آیت میں ان کی جس بے حسی اور سنگدلی کی طرف اشارہ ہے یہ اس کی ایک مثال بیان ہوئی ہے کہ جب ان کو شکر کی دعوت دی جاتی ہے، جیسا کہ اوپر آیت ۳۵ میں ہے۔ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ تو یہ رعونت کے ساتھ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ چنانچہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو رزق و فضل تم کو بخشا ہے اس کا حق یہ ہے کہ اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور ان غریبوں کی مدد کرو جو مدد کے محتاج ہیں تو وہ مسلمانوں کو یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ تمہاری صریح گمراہی ہے کہ جن کو اللہ نے محروم رکھنا چاہا ہے ان کو تم کھلانا چاہتے ہو۔ اگر اللہ ان کو بھی ہماری طرح کھلانا پہنانا چاہتا تو آخر اس کے پاس کس چیز کی کمی تھی۔ لیکن جب اس نے ایسا نہیں کیا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس نے ان کے لیے یہی چاہا ہے اور جب اس نے ان کے لیے یہی چاہا ہے تو ہم ان کے اوپر کوئی احسان کر کے خدا کو خوش نہیں کریں گے بلکہ اس کی ناراضگی مول لیں گے! ـــــ اس فلسفۂ جاہلی کا حوالہ دے کر اس پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس لیے کہ اس کی قساوت و سفاہت اس قدر واضح ہے کہ اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں تھی۔ مقصود بس یہ دکھانا ہے کہ جب دل بگڑتے ہیں اور عقل الٹتی ہے تو آدمی کا حال یہ ہو جاتا ہے!

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ۝ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ (۴۸-۵۰)

یعنی اللہ کی جو آیتیں ان کو سنائی جاتی ہیں ان پر تو وہ کوئی دھیان نہیں کرتے، بس یہ مطالبہ ان کی طرف سے پیہم ہے کہ جس عذاب سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے وہ ان کو دکھا دیا جائے۔ اس کے بغیر وہ اس کی خبر دینے والوں کو سچا ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً الاٰية۔ لفظ 'صَيْحَةً' آیت ۲۹ میں گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ اس

طنطنہ کے ساتھ وہ اس عذاب کا جو مطالبہ کر رہے ہیں تو کس برتے پر کر رہے ہیں! خدا کو اس کے لیے کوئی سروسامان نہیں کرنا ہے۔ اس کی تو بس ایک ڈانٹ ہی ان کے لیے کافی ہوگی۔ وہ ان بحثوں ہی میں پڑے ہوں گے کہ وہ ان کو دبوچ لے گی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ نہیں آ رہا ہے تو اس کے نہ آنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کی تیاری نہیں ہو پائی ہے۔ اس کی تیاری میں کوئی کسر نہیں ہے۔ بس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے سبب سے لوگوں کو مہلت دے رہا ہے۔

'فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً الآیۃ' یعنی خدا کی وہ ایک ہی ڈانٹ ایسی ہوگی کہ جو جہاں ہے وہ وہیں دبوچ لیا جائے گا۔ اس کو اتنی فرصت بھی نصیب نہیں ہوگی کہ کسی کو کوئی وصیت کر سکے یا اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ سکے۔

۶۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۵۱-۶۸

آگے واضح فرمایا ہے کہ جس طرح اس دنیا میں کوئی عذاب لانے کے لیے ہماری ایک ہی ڈانٹ کافی ہے اسی طرح جب ہم قیامت لانی چاہیں گے تو اس کے لیے بھی ہمیں کوئی خاص اہتمام نہیں کرنا ہوگا بلکہ ایک ہی نفخِ صور میں سب اٹھ کھڑے ہوں گے۔

اس کے بعد روزِ قیامت کی تصویر ہے کہ اہلِ ایمان اس دن اپنی دلچسپیوں میں مگن ہوں گے اور کفار اپنے نتائجِ اعمال سے دوچار ہوں گے۔ اس دن کسی کو زبان سے کچھ بولنے کی اجازت نہیں ہوگی بلکہ ہر شخص کے ہاتھ پاؤں خود اس کے خلاف گواہی دیں گے۔

پھر دھمکی دی ہے کہ یہ لوگ اس ڈھٹائی کے ساتھ جو عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں تو یاد رکھیں کہ یہ ہمارے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ ہم چاہیں تو ان کو ان کی جگہ ہی پر اس طرح مسخ کر دیں کہ یہ تمام قوتوں اور صلاحیتوں سے چشم زدن میں بالکل محروم ہو کے رہ جائیں۔ اس کے آثار وہ اس دنیا میں دیکھ سکتے ہیں بشرطیکہ ان کے پاس آنکھیں ہوں۔ اگر ہم نے ان کو مسخ نہیں کیا تو اس وجہ سے نہیں کہ یہ کام ہمارے لیے مشکل ہے بلکہ یہ ہماری رحمت ہے کہ ہم لوگوں کو ان کی سرکشی کے باوجود مہلت دیتے ہیں۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے:

آیات ۵۱-۶۸

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ﴿۵۱﴾
قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ
وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ

جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ ﴿٥٣﴾ فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا
تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٥٤﴾ إِنَّ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي
شُغُلٍ فَاكِهُونَ ﴿٥٥﴾ هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ فِي ظِلَالٍ عَلَى الْأَرَائِكِ
مُتَّكِئُونَ ﴿٥٦﴾ لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَلَهُم مَّا يَدَّعُونَ ﴿٥٧﴾ سَلَامٌ
قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِيمٍ ﴿٥٨﴾ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ ﴿٥٩﴾
أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ۖ إِنَّهُ لَكُمْ
عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٦٠﴾ وَأَنِ اعْبُدُونِي ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٦١﴾ وقف غفران
وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا ۖ أَفَلَمْ تَكُونُوا تَعْقِلُونَ ﴿٦٢﴾
هَٰذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ﴿٦٣﴾ اصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنتُمْ
تَكْفُرُونَ ﴿٦٤﴾ الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ
وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٦٥﴾ وَلَوْ نَشَاءُ لَطَمَسْنَا
عَلَىٰ أَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَأَنَّىٰ يُبْصِرُونَ ﴿٦٦﴾ وَلَوْ نَشَاءُ
لَمَسَخْنَاهُمْ عَلَىٰ مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوا مُضِيًّا وَلَا يَرْجِعُونَ ﴿٦٧﴾ ع ١٧ ٣
وَمَن نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۖ أَفَلَا يَعْقِلُونَ ﴿٦٨﴾

ترجمہ آیات ٥١-٦٨

اور صُور پھونکا جائے گا تو وہ دفعتہً قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف چل پڑیں گے
وہ کہیں گے، ہائے ہماری بدبختی! ہم کو ہماری قبر سے کس نے اٹھا کھڑا کیا! ـــــ یہ تو وہی
چیز ہے جس کا خدائے رحمان نے وعدہ کیا تھا اور پیغمبروں کی بات سچی نکلی! بس وہ ایک ڈانٹ
ہوگی، بس وہ دفعتہً سب کے سب ہمارے حضور حاضر کردیے جائیں گے۔ ٥١-٥٣

پس آج کے دن کسی جان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ اور تم کو بس وہی بدلے میں ملے گا جو تم کرتے رہے ہو۔ بے شک اہلِ جنت آج اپنی دلچسپیوں میں مگن ہوں گے۔ وہ اور ان کی بیویاں، سایوں میں تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے بیٹھیں گے۔ اور اس میں ان کے لیے میوے ہوں گے اور ان کے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو وہ مانگیں گے۔ ان کو سلام کہلایا جائے گا پروردگارِ رحیم کی طرف سے! ۵۴-۵۸

اور اے مجرمو! آج الگ ہو جاؤ۔ اور اے آدم کے بیٹو! کیا میں نے تمھیں یہ ہدایت نہیں کر دی تھی کہ شیطان کی بندگی نہ کیجیو، بے شک وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اور یہ کہ میری ہی بندگی کیجیو۔ یہی سیدھی راہ ہے۔ اور اس نے تم میں سے ایک خلقِ کثیر کو گمراہ کر لیا، تو کیا تم سمجھتے نہیں تھے! یہ ہے وہ جہنم جس سے تم کو ڈرایا جاتا رہا ہے۔ اب اپنے کفر کی پاداش میں اس میں داخل ہو جاؤ۔ ۵۹-۶۴

آج ہم ان کے مونہوں پر مہر کر دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم کو بتائیں گے اور ان کے پاؤں شہادت دیں گے جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔ ۶۵

اور اگر ہم چاہتے تو ان کی آنکھیں مٹا دیتے پھر وہ راستہ کی طرف بڑھتے تو کس طرح دیکھ پاتے! اور اگر ہم چاہتے تو ان کی جگہ ہی پر ان کو مسخ کر دیتے تو نہ وہ آگے بڑھ سکتے اور نہ پیچھے لوٹ سکتے۔ اور جس کو ہم زیادہ عمر دیتے ہیں ہم اس کو اس کی خلقت میں پیچھے لوٹا دیتے ہیں تو کیا وہ سمجھتے نہیں؟ ۶۶-۶۸

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَإِذَا هُمْ مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ (۵۱)

تاخیرِ عذاب کی حکمت

اوپر کی آیات ۴۸-۴۹ میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ رسول کی تکذیب کی صورت میں جس عذاب کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے اگر وہ ٹل رہا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے لیے کوئی خاص تیاری کرنی ہے جو ابھی نہیں ہو پائی ہے۔ وہ عذاب بھیجنا چاہے تو اس کے لیے بس اس کی ایک ہی ڈانٹ کافی ہے۔ اب یہ فرمایا کہ یہی حال قیامت کا بھی ہے۔ اس کے لانے کے لیے بھی خدا کو کوئی خاص اہتمام و انتظام نہیں کرنا پڑے گا، بلکہ جوں ہی صور پھونکا جائے گا لوگ بھاگتے ہوئے اپنے رب کی طرف چل پڑیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ رسول کو زچ کرنے کے لیے عذاب یا قیامت کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ یاد رکھیں کہ ان کاموں میں سے کوئی کام بھی اللہ کے لیے ذرا مشکل نہیں ہے۔ یہ تو چشم زدن میں ہو جانے والے کام ہیں۔ اگر اس کے باوجود نہیں ہو رہے ہیں تو اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر توبہ اور اصلاح کر لیں۔

قَالُوْا یٰوَیْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ؐ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ (۵۲)

مذاق اڑانے والوں کا حال قیامِ قیامت کے وقت

یعنی یہ مذاق اڑانے والے لوگ اس وقت گھبراہٹ اور سراسیمگی میں اپنے سر پیٹیں گے اور کہیں گے کہ یہ کس نے ہم کو ہماری قبروں سے اٹھا کھڑا کیا! یہ سوال تحقیق کے لیے نہیں بلکہ اپنی بدبختی کے اظہار کے لیے وہ کریں گے کہ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ مرنے کے بعد اٹھنا نہیں ہو گا لیکن یہ تو واقعہ ثابت ہوا۔

هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ۔ یہ ان کے قول کا حصہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تو وہی بات ہوئی جس کی خدائے رحمان کی طرف سے ہم کو آگاہی دی گئی تھی، رسولوں کی بات بالکل سچی نکلی۔ اور اس کا بھی امکان ہے کہ یہ بات فرشتوں کی زبانی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وقت ان کی تذلیل کے لیے فرمائی جائے کہ اب اپنی بدبختی پر سر پیٹو، یہ وہی چیز تمھارے سامنے آئی ہے جس سے خدائے رحمان نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے تم کو آگاہ کر دیا تھا لیکن تم نے ان کی کوئی پروا نہیں کی۔ میرا رجحان اس دوسری بات کی طرف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے نظائر سے واضح تائید اسی کی نکلتی ہے۔ سورۂ صافات میں ہے:

فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ یَنْظُرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا یٰوَیْلَنَا هٰذَا یَوْمُ الدِّیْنِ ۝ هٰذَا یَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (۱۹-۲۱)	بس وہ ایک ڈانٹ ہی ہو گی کہ دفعتہً وہ اٹھ کے تاکنے لگیں گے اور کہیں گے۔ ہائے ہماری بدبختی! یہ تو جزا و سزا کا دن آ گیا —— یہ وہی فیصلہ کا دن ہے جس کو تم جھٹلاتے تھے

اس میں آخری فقرہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو بالکل بر وقت ان کی تفضیح کے لیے کہلایا جائے گا۔

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَیْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِیْعٌ لَّدَیْنَا مُحْضَرُوْنَ (۵۳)

یہ سب کچھ بالکل چشم زدن میں، محض ہماری ایک ڈانٹ سے ہو جائے گا۔ اس کے لیے نہ ہمیں دمدمے

بنانے پڑیں گے، نہ زمین نصب کرنی پڑیں گی۔ جس طرح ہم اپنے کلمۂ 'کن' سے جو چیز چاہیں وجود میں لا سکتے ہیں اسی طرح اپنی ایک ڈانٹ سے جو قیامت برپا کرنی چاہیں برپا کر سکتے ہیں۔ 'جمیع' تاکید کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ پھر کوئی ہم سے بچ کے نکل سکے گا۔ اس کے بعد ان کے سب چھوٹے اور بڑے، امیر اور مامور، عابد اور معبود یکڑ کر ہمارے حضور حاضر کر دیے جائیں گے۔ 'مُحْضَرُوْنَ' ان کی ذلت کی تصویر کے لیے ہے کہ وہ اس طرح ہمارے سامنے حاضر کیے جائیں گے جس طرح مجرم عدالت کے سامنے حاضر کیے جاتے ہیں۔

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۵۴)

ہر ایک کے سامنے اس کا اپنا ہی عمل آئے گا

اس آیت میں تصویرِ حال کا اسلوب ہے۔ گویا وہ دن سامنے ہے اور مخاطب سے یہ بات کہی جا رہی ہے۔ قرآن میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔

فرمایا کہ آج عدلِ کامل کے ظہور کا دن ہے۔ آج کسی جان پر ذرہ برابر ظلم نہیں ہوگا۔ 'وَلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ'۔ یہ اسی عدلِ کامل کا بیان ہے کہ آج جس اصول پر لوگوں کے ساتھ معاملہ ہوگا وہ یہ ہے کہ جس نے جو کچھ کیا ہوگا وہی وہ بدلے میں پائے گا۔ ظاہر ہے کہ جب اپنی ہی کمائی سامنے آنے والی ہے تو اس میں کسی ظلم و ناانصافی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِيْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ۚ هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ۚ لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ ۚ سَلٰمٌ ۣ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ (۵۵-۵۸)

اہلِ جنت کی تصویر

اس دن اہلِ جنت کا جو حال ہوگا یہ اس کی تصویر ہے۔ فرمایا کہ اس دن اہلِ جنت اپنی خاص دلچسپی میں مگن ہوں گے۔ 'شُغُل' کی تنکیر تفخیمِ شان کے لیے ہے۔

'هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ الاٰیۃ' یہ ان کی بیویوں کا ذکر آیا ہے کہ وہ بھی ان کی دلچسپیوں میں شریک ہوں گی۔ ان کا ذکر خاص اہتمام سے اس لیے ضروری ہوا کہ آدمی کی کوئی دلچسپی اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک اس کے اہل و عیال بھی اس میں شریک نہ ہوں۔ 'عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ' یہ سب سے اعلیٰ نشست کی تصویر ہے۔ اس زمانے میں بادشاہ اور ملکہ مزین تختوں ہی پر ٹیک لگا کر بیٹھتے تھے۔ اہلِ جنت اپنی ابدی بادشاہی میں اسی طرح بیٹھیں گے۔

'لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ الاٰیۃ' اس میں ان کے آگے پھل پیش کیے جائیں گے اور مزید جو کچھ وہ طلب کریں گے 'مَا يَدَّعُوْنَ' یعنی 'مَا يَشْتَهُوْنَ' جو کچھ وہ چاہیں گے وہ سب ان کے لیے حاضر ہوگا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اس دنیا میں کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی نہ اب تک یہ درجہ حاصل ہو سکا ہے اور نہ آئندہ کبھی حاصل ہو سکے گا کہ وہ جو کچھ چاہے اس کے لیے وہ فوراً حاضر کر دیا جائے۔ لیکن اہلِ جنت کو جنت میں یہ درجہ حاصل ہوگا اور ہمیشہ حاصل ہوگا۔

سب سے بڑی سرفرازی

'سَلٰمٌ ۣ قَوۡلًا مِّنۡ رَّبٍّ رَّحِیۡمٍ' یہ اس سب سے بڑی سرفرازی کا ذکر ہے جو اہلِ جنت کو جنت میں حاصل ہوگی کہ ربِ رحیم کی طرف سے ان کو سلام کہلایا جائے گا۔ میرے نزدیک جملہ کی تالیف یوں ہے۔ 'تَحِیَّتُہُمۡ سَلٰمٌ قَوۡلًا مِّنۡ رَّبٍّ رَّحِیۡمٍ' مبتدا یہاں حذف کر دیا گیا ہے تاکہ مخاطب کی ساری توجہ خبر پر مرکوز ہو جائے۔ سورۂ احزاب میں ارشاد فرمایا ہے۔ 'تَحِیَّتُہُمۡ یَوۡمَ یَلۡقَوۡنَہٗ سَلٰمٌ' (۴۴) (اور ان کا خیر مقدم جس دن وہ اس سے ملیں گے سلام سے ہوگا) احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے جنت کے تمام دروازوں سے داخل ہوں گے اور اہلِ جنت کو اللہ تعالیٰ کا سلام پہنچائیں گے ـــــ کون اندازہ کر سکتا ہے اہلِ جنت کی اس سرفرازی کا کہ ان کو ربِ رحیم و کریم کی طرف سے سلام و پیغام موصول ہوں گے!!

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست!

وَامۡتَازُوا الۡیَوۡمَ اَیُّہَا الۡمُجۡرِمُوۡنَ ۞ اَلَمۡ اَعۡہَدۡ اِلَیۡکُمۡ یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّیۡطٰنَ ۚ اِنَّہٗ لَکُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ۙ وَّ اَنِ اعۡبُدُوۡنِیۡ ؕ ہٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ ۞ وَلَقَدۡ اَضَلَّ مِنۡکُمۡ جِبِلًّا کَثِیۡرًا ؕ اَفَلَمۡ تَکُوۡنُوۡا تَعۡقِلُوۡنَ (۵۹-۶۲)

مجرموں کا حشر

اہلِ جنت کا حال بیان کرنے کے بعد اب یہ مجرموں کا حشر بیان ہو رہا ہے۔ ان کو حکم ہوگا کہ اے مجرمو! دنیا میں تو تم میرے باایمان بندوں کے ساتھ لیے چلے رہے اس لیے کہ دنیا دارالامتحان تھی لیکن اب جزائے اعمال کا دن آگیا۔ اس وجہ سے اب تم میرے باایمان بندوں سے الگ ہو جاؤ اور اپنے اعمال کی سزا بھگتو۔ اب تمھاری دنیا الگ اور ان کی دنیا الگ ہے۔

'اَلَمۡ اَعۡہَدۡ اِلَیۡکُمۡ یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ الآیۃ'۔ 'عَہِدَ' کا صلہ جب 'اِلٰی' کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ضامن اور ذمہ دار بنانے کے ہوتے ہیں۔ مثلاً 'وَعَہِدۡنَاۤ اِلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ وَاِسۡمٰعِیۡلَ اَنۡ طَہِّرَا بَیۡتِیَ لِلطَّآئِفِیۡنَ' (البقرۃ: ۱۲۵) (اور ہم نے ابراہیم و اسماعیل کو اس بات کا ذمہ دار بنایا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھنا) یہ مجرموں کو اس وقت بطور ملامت یاد دہانی کی جائے گی کہ آدم کے بیٹو! کیا میں نے تم کو اس عہد کا پابند نہیں کیا تھا کہ شیطان کی بندگی نہ کرنا، وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے بلکہ صرف میری ہی بندگی کرنا۔ یہ نہایت سیدھی راہ ہے جس پر چلنے والے مجھ تک پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن تم ایسے بدقسمت نکلے کہ اس نے تمھارے اندر سے ایک خلقِ کثیر کو گمراہ کر ڈالا، کیا تم اتنی عقل و تمیز نہیں رکھتے تھے کہ اپنے دوست اور دشمن میں امتیاز کر سکتے؟ اور اس بات کو یاد رکھتے کہ اس نے اپنے فریب سے تمھارے باپ آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلوایا اور اولادِ آدم کے ساتھ اس کی دشمنی قیامت تک کے لیے ہے۔

شیطان کی دشمنی، شیطان کے چیلنج، اولادِ آدم کو اللہ تعالیٰ کی یاد دہانی اور اس سلسلہ کے دوسرے امور جن کی طرف یہاں اشارہ ہے پچھلی سورتوں، خاص طور پر بقرہ اور اعراف میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکے ہیں۔ ان اجمالات کو ان کی روشنی میں سمجھیے۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ (۶۳-۶۴)

یعنی اگر تم نے میرے عہد اور میری تنبیہ کو یاد نہیں رکھا تو اس کا انجام اب اس جہنم کی صورت میں تمہارے سامنے ہے۔ اس سے میرے رسول اور میرے نیک بندے تم کو ڈراتے رہے لیکن تم برابر ان کی باتوں کا انکار کرتے رہے۔ اب اس میں داخل ہو، یہی تمہارا ٹھکانا ہے۔

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۶۵)

ہاتھ پاؤں کی گواہی

اوپر کی آیات میں اسلوبِ کلام خطاب کا تھا، اس آیت میں غائب کا ہوگیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اوپر کی آیات میں زجر و ملامت ہے جس کے لیے موزوں اسلوب خطاب ہی کا ہے اور اس آیت میں ان کی بے بسی کی تصویر ہے جس کے لیے غائب کا اسلوب زیادہ موزوں ہے۔ فرمایا کہ آج کے دن ہم ان کے مونہوں پر مہر کر دیں گے اور ان کے ہاتھ اور پاؤں کو ناطق بنا دیں گے جو ان کی ساری کارستانیوں کی سرگزشت ہم کو سنا دیں گے۔ مونہوں پر مہر کر دینے کی وجہ یہ ہوگی کہ زبان جھوٹ بھی بول سکتی ہے اور عذر بھی تراش سکتی ہے لیکن ہاتھ پاؤں وہی بیان کریں گے جو انھوں نے کیا ہوگا۔ اس طرح انسان پر خود اس کے اعضا و جوارح حجت قائم کر دیں گے اور یہ حجت تمام حجتوں پر بھاری ہوگی — یہ مضمون سورۂ رحمان میں بھی ہے — فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ۝ .... يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ۝ (الرحمٰن : ۳۹، ۴۱) (پس اس دن کسی انسان اور جن سے اس کے گناہ کے بابت پرسش کی نوبت نہیں آئے گی..... مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچان لیے جائیں گے پس ان کی چوٹیاں اور ان کی ٹانگیں پکڑ کے جہنم میں پھینک دیا جائے گا)۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ (۶۶)

تنبیہ و تہدید

یعنی جب ان کا حال یہ ہے کہ اپنی ان صلاحیتوں سے جو اللہ نے ان کو بخشی ہیں کوئی کام ہی نہیں لے رہے ہیں تو یہ مستحق ہیں کہ ہم ان سے ان کو محروم کر دیں اور یہ کام ہمارے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ ہم چاہتے تو ان کی آنکھیں مٹا دیتے، پھر یہ راستہ کی تلاش میں بھٹکتے پھرتے لیکن ان کو راہ نہ ملتی۔ لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا تو یہ ہماری رحمت ہے اور اب بھی ان کے لیے موقع ہے کہ یہ ہماری اس رحمت سے فائدہ اٹھائیں اور آنکھیں بند کر کے زندگی نہ گزاریں — 'لَوْ' شرط فی الماضی کے لیے آتا ہے اور ہمارے نزدیک یہاں مضارع سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے۔ یعنی 'وَلَوْ كُنَّا نَشَآءُ'۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّلَا يَرْجِعُوْنَ (۶۷)

اسی طرح اگر ہم چاہتے تو ان کو ان کی جگہ ہی پر مسخ کر کے رکھ دیتے تو پھر نہ وہ آگے ہی کو بڑھ سکتے اور نہ پیچھے ہی کو پلٹ سکتے لیکن یہ ہماری عنایت ہے کہ ہم نے ایسا نہیں کیا بلکہ ان کو مہلت دیے ہوئے ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو سنبھل جائیں اور خدا کی بخشی ہوئی صلاحیتوں کا حق پہچانیں، ان کی قدر کریں اور اپنے رب

کے شکر گزار بندے نہیں۔

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۚ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ (۶۸)

انسانی زندگی کے احوال سے اوپر کے دعوے کی دلیل

اوپر جو دھمکی دی گئی ہے یہ انسانی زندگی کے احوال و شاہدات سے اس کی دلیل دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے لوگوں کی قوتوں اور صلاحیتوں کو مسخ کر دینا ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ انسان جب وجود میں آتا ہے تو وہ ایک مضغۂ گوشت ہوتا ہے پھر اللہ تعالیٰ درجہ بدرجہ اس کو قوت و توانائی بخشتا ہے یہاں تک کہ وہ جوانی کی تمام قوتوں اور صلاحیتوں سے بھرپور ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے اوپر بڑھاپا طاری ہونا شروع ہوتا ہے اور درجہ بدرجہ وہ اسی ضعف و ناتوانی کی حالت کی طرف لوٹ جاتا ہے جس میں وہ اپنی ولادت کے وقت مبتلا تھا ـــــ قرآن نے اس حالت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً (الروم: ۵۴) (اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ناتوانی سے، پھر ناتوانی کے بعد اس نے توانائی بخشی پھر توانائی کے بعد ضعف اور بڑھاپا طاری کر دیا) یہ عام حالت کی تصویر ہے۔ ہر شخص جو جوانی اور پیری کے مراحل سے گزرتا ہے اس کو اس کا تجربہ ہوتا ہے۔ قوتوں اور صلاحیتوں کی ناتوانی کا اس سے کہیں زیادہ تجربہ ان لوگوں کو ہوتا ہے جن کو ارذل عمر کے مرحلے سے سابقہ پڑتا ہے۔ قرآن نے ان کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا (النحل: ۷۰) (اور تم میں بعض وہ بھی ہوتے ہیں جو ارذل عمر کو پہنچائے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ جاننے کے بعد کچھ نہیں جانتے)۔

آیت زیر بحث میں اسی صورتِ حال کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس دنیا میں تم دیکھتے ہو کہ جس کی عمر ہم زیادہ کرتے ہیں درجہ بدرجہ اس کی قوتوں اور صلاحیتوں میں ہم اس کو پیچھے کی طرف لوٹا دیتے ہیں۔ یعنی جس ناتوانی کے دور سے وہ زندگی کا آغاز کرتا ہے اسی ناتوانی کی طرف پھر وہ واپس لوٹا دیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام قوتیں اور صلاحیتیں خدا ہی کی بخشی ہوئی ہیں وہ جب چاہے ان کو واپس لے سکتا ہے اور اس طرح واپس لے سکتا ہے کہ کسی کو اپنے دیئے بائیں کا بھی کچھ ہوش باقی نہ رہے تو حیف ہے ان لوگوں پر جو اللہ کی ان نعمتوں کی قدر نہ کریں اور ان کو پاکر خدا کے شکر گزار ہونے کے بجائے استکبار میں مبتلا ہو جائیں۔

'تنکیس' اور 'نکس' کو عام اہلِ لغت بالکل ہم معنی قرار دیتے ہیں۔ یعنی کسی شے کو پیچھے کی طرف لوٹا دینا۔ لیکن میرے نزدیک تنکیس میں تدریج کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے یعنی درجہ بدرجہ کسی چیز کو پیچھے کی طرف لوٹانا۔ قرآن میں یہ دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں اور دونوں جگہ یہ فرق ملحوظ ہے۔ لفظ 'خلق' یہاں 'خلقت' کے مفہوم میں ہے اور اس معنی میں یہ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔

۸۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۶۹-۸۳

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ خاتمہ میں تمہید کے مضمون کو، ایک نئے اسلوب سے پھر لے لیا ہے۔

یاد ہوگا، سورہ کا آغاز قرآن حکیم کی قسم سے ہوا ہے اور اس حکیمانہ کتاب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی دلیل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اس کتاب کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے امیوں پر عظیم احسان فرمایا ہے لیکن اس پر ایمان وہی لائیں گے جن کے اندر زندگی کی رمق ہوگی۔ اس تمہید کے بعد کلام کا رخ قرآن کے دعاوی کے اثبات کی طرف مڑ گیا ہے۔ یہاں بھی غور کیجیے تو وہی بات ایک نئے اسلوب سے آئی ہے۔ پہلے ان مخالفین کی تردید ہے جو قرآن کو شاعری اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر قرار دیتے تھے۔ پھر یہ واضح فرمایا ہے کہ کن لوگوں پر یہ کلام اثر انداز ہوگا اور کون لوگ اس سے محروم رہیں گے۔ اس کے بعد ربوبیت کی بعض واضح آیات کی طرف اشارہ کر کے اس دعوتِ تشکر کا اعادہ کیا ہے جس پر اس سورہ کی بنیاد ہے۔ اس کے بعد کلام کا رخ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کی طرف مڑ گیا ہے کہ لوگ تمہاری مخالفت میں جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا غم نہ کرو، جو لوگ اللہ پر بھی پھبتیاں چست کرنے سے باز نہیں آتے وہ اگر تمہارا مذاق اڑائیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ آیات
مُّبِيْنٌ ﴿۶۹﴾ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۰﴾ اَوَلَمْ ۶۹-۸۳
يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿۷۱﴾
وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ
وَمَشَارِبُ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ
يُنْصَرُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ﴿۷۵﴾
فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۶﴾ اَوَلَمْ وقف لازم
يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۷﴾ وَ
ضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِىَ رَمِيْمٌ ﴿۷۸﴾
قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُۨ ﴿۷۹﴾
الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ

تُوْقِدُوْنَ ﴿۸۰﴾ اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ
عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۭ بَلٰي ۤ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۱﴾ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ وقف غفران
اِذَآ اَرَادَ شَـيْـــًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۸۲﴾ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ ۵
بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ ع ۱۶ ۴

ترجمۂ آیات ۶۹-۸۳

اور ہم نے اس کو شعر کی تعلیم نہیں دی ہے اور یہ اس کے شایانِ شان بھی نہیں۔ یہ تو بس یاددہانی اور نہایت واضح قرآن ہے تاکہ وہ ان لوگوں کو آگاہ کردے جن کے اندر زندگی ہے اور کافروں پر حجت تمام ہوجائے۔ ۶۹-۷۰

کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ ہم نے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے ان کے لیے چوپائے پیدا کیے، پس وہ ان کے مالک ہیں! اور ہم نے ان کو ان کا مطیع بنا دیا، پس ان میں سے بعض پر وہ سوار ہوتے ہیں اور بعض سے وہ غذا حاصل کرتے ہیں اور ان میں ان کے لیے دوسری منفعتیں اور پینے کی چیزیں بھی ہیں۔ تو کیا وہ شکر نہیں کرتے۔ ۷۱-۷۳

اور انھوں نے اس توقع پر اللہ کے سوا دوسرے معبود بنائے ہیں کہ ان کی مدد کی جائے گی۔ وہ ان کی مدد نہیں کرسکیں گے۔ بلکہ وہ ان کی حاضر کی ہوئی فوج بنیں گے۔ تو ان کی بات تم کو مبتلائے غم نہ کرے، ہم جانتے ہیں جو کچھ وہ چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ ۷۴-۷۶

کیا انسان نے غور نہیں کیا کہ ہم نے اس کو پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا تو وہ ایک کھلا ہوا حریف بن کر اٹھ کھڑا ہوا! اور اس نے ہم پر ایک پھبتی چست کی! اور اپنی پیدائش کو بھول گیا! کہتا ہے کہ بھلا ہڈیوں کو کون زندہ کرسکتا ہے جب کہ وہ بوسیدہ ہوجائیں گی! کہہ دو ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا۔ اور وہ ہر مخلوق سے اچھی طرح باخبر ہے۔

وہی ہے جس نے تمہارے لیے سرسبز درخت سے آگ پیدا کر دی پس تم اس سے آگ جلا لیتے ہو۔ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا وہ ان کی جیسی مخلوق پیدا کرنے پر قادر نہیں! ہاں وہ قادر ہے اور وہی اصل پیدا کرنے والا اور جاننے والا ہے۔ اس کا معاملہ تو بس یوں ہے کہ جب وہ کسی بات کا ارادہ فرماتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ پس پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۷۷-۸۳

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ (۶۹)

شعر و شاعری نبوت کے شایان شان نہیں ہے

ضمیر مفعول کا مرجع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ ان لوگوں کے خیال کی تردید ہے جو قرآن کو شاعری اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک شاعر قرار دیتے تھے۔ فرمایا کہ نہ ہم نے اپنے رسول کو شعر کی تعلیم دی، نہ یہ چیز اس کے شایانِ شان ہی ہے۔ یہ ان لوگوں کو جواب دیا گیا ہے جو قرآن کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کو محض اس کے پیش کرنے والے کی شاعرانہ جادو بیانی کا کرشمہ قرار دیتے تھے تاکہ ان کے عوام پر یہ اثر نہ پڑنے پائے کہ وہ اس کی تاثیر و تسخیر سے مرعوب ہو کر اس کو آسمانی کتاب مان لیں۔ عوام کو قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے برگشتہ کرنے کے لیے وہ کہتے تھے کہ قرآن ہے تو بے شک ایک نہایت فصیح و بلیغ کلام لیکن اس کی یہ فصاحت و بلاغت اس وجہ سے نہیں ہے کہ یہ کوئی آسمانی وحی ہے، جیسا کہ اس کا پیش کرنے والا دعویٰ کرتا ہے، بلکہ جس طرح ہمارے اونچے درجے کے شاعروں کے کلام میں تاثیر و تسخیر ہے اسی طرح اس شخص کے کلام میں بھی تاثیر و تسخیر ہے۔ اس وجہ سے اس شخص کو زیادہ سے زیادہ ایک اونچے درجے کا شاعر سمجھنا چاہیے نہ کہ ایک نبی اور رسول اور اس قرآن کو ایک شاعرانہ کلام ہی کا رتبہ دینا چاہیے نہ کہ وحی و الہام کا۔ قرآن نے ان کے اس خیال کی مختلف اسلوبوں سے جگہ جگہ تردید کی ہے۔ خاص طور پر سورۂ شعرآء میں اس فرق کو نہایت تفصیل سے نمایاں فرمایا ہے جو ایک نبی اور ایک شاعر کے درمیان ایک عامی کو بھی نظر آ سکتا ہے۔ تفصیل کے طالب اس پر ایک نظر ڈال لیں۔

'وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ' سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ شاعری نبوت کی شان سے ایک فروتر چیز ہے۔ اس کے فروتر ہونے کے دو پہلو ہیں۔

ایک پہلو تو یہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی روایات و خصوصیات اور شاعروں کی

روایات و خصوصیات میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ سورۂ شعراء میں شاعروں کی تین خصوصیات بیان ہوئی ہیں اور یہ تینوں ہی شانِ نبوت کے منافی ہیں۔

ان کی ایک خصوصیت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ صرف گفتار کے غازی ہوتے ہیں، کردار کے غازی نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس نبی اپنی ہر بات پر سب سے اوّل اور سب سے بڑا عمل کرنے والا خود ہوتا ہے۔

دوسری خصوصیت ان کی یہ مذکور ہوئی ہے کہ ان کا کلام متضاد افکار کا مجموعہ ہوتا ہے۔ وہ ہر وادی میں ہرزہ گردی کرتے اور ایک ہی سانس میں کفر و اسلام دونوں کی باتیں کرتے ہیں۔ اس کے بالکل برعکس نبی کی ہر بات اپنی اصل اور فرع دونوں میں بالکل متحد و مربوط اور باہم دگر وابستہ و پیوستہ ہوتی ہے۔

ان کی تیسری خصوصیت یہ بیان ہوئی ہے کہ ان کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں۔ برعکس اس کے انبیائے کرام کے پیرو ہمیشہ سوسائٹی کے اخیار ہوئے ہیں۔

اگرچہ اس کلیہ میں بعض استثناء بھی ہیں جن کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے لیکن بہت کم۔ عام حالت یہی ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو شعر و شاعری کی چھوت سے محفوظ رکھا۔

انبیاء کی شان سے اس کے فروتر ہونے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ شاعری کا تعلق تمام تر جذبات سے ہے۔ یہ جذبات ہی سے پیدا ہوتی ہے اور جذبات ہی پر عمل کرتی ہے۔ یہ اچھے جذبات ابھارتی ہے اگر اس کے اندر اچھے جذبات ظاہر کیے گئے ہوں اور برے جذبات بھی برانگیختہ کرتی ہے اگر اس کو برے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا جائے۔ اس دائرہ سے باہر اس کا وجود بالکل بے کار ہے۔ حضرات انبیائے کرام جس مشن پر مامور ہوتے ہیں اس کا تعلق صرف جذبات سے نہیں بلکہ انسانی زندگی کے ہر پہلو سے ہوتا ہے اس وجہ سے ان کی اصل اپیل جذبات کے بجائے انسان کی عقل سے ہوتی ہے جو زندگی کے ہر پہلو میں رہنمائی کرتی ہے۔ انھیں لوگوں کو صرف ابھارنا ہی نہیں ہوتا بلکہ ان کی تربیت بھی کرنی ہوتی ہے، ان کی غلطیوں کو درست کرنا ہوتا ہے، ان کو انفرادی و اجتماعی زندگی کے آداب و اصول سکھانے ہوتے ہیں، ان کو حکومت و ریاست کے قوانین و ضوابط بتانے ہوتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ انھیں دنیا اور آخرت دونوں کی حسنات سے لوگوں کو بہرہ مند کرنا ہوتا ہے۔ یہ سارے کام ظاہر ہے کہ شاعری کے بس سے باہر ہیں۔ ان کاموں کے لیے ضرورت کسی شاعر کے دیوان یا مجموعۂ کلام کی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کتاب مبین کی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کو شاعر نہیں بلکہ اپنی کتاب مبین کا حامل بنایا۔

ایک سوال کا جواب

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ جب شاعری حضرات انبیائے کرام کی شان اور ان کے مقصد سے ایک فروتر چیز ہے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو زبور شعر کی شکل میں کیوں عطا فرمائی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس اصل رہنما کتاب زبور نہیں بلکہ تورات تھی۔ زبور کی حیثیت محض تورات کے ایک ضمیمہ کی سمجھیے جس میں حضرت داؤد علیہ السلام کی کچھ دعائیں، مناجاتیں، ان کے مواعظ اور

ان کی پُر حکمت نصیحتیں ہیں۔ تورات کے ساتھ مل کر تو یہ ایک نہایت بابرکت خزانہ حکمت ہے لیکن تورات کے بغیر یہ اس مقصد کے لیے کافی نہیں ہے جس کے لیے حضرات انبیاء کی بعثت ہوئی۔

قرآن کے ذکر ہونے کے مختلف پہلو

'اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ' یعنی یہ قرآن شعر و شاعری نہیں بلکہ ایک عظیم یاددہانی اور ایک واضح صحیفۂ ہدایت ہے تاکہ یہ خلق کی اصلاح اور لوگوں کی رہنمائی کا ذریعہ بنے۔ قرآن کے 'ذکر' ہونے کا مفہوم اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں۔ یہ ان تمام حقائق کی بھی یاددہانی کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کے اندر ودیعت فرمائے ہیں، اس پوری تاریخ ہدایت کی بھی یاددہانی کرتا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پھیلی ہوئی ہے اور ان تمام نتائج و عواقب کی بھی یاددہانی کرتا ہے جو دنیا اور آخرت، دونوں میں لازماً پیش آکے رہیں گے اگر اللہ کے رسول کی تکذیب کی گئی۔

'قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ' یعنی ایک جامع صحیفۂ ہدایت جو زندگی کے ہر پہلو کے لیے اپنے اندر نہایت واضح، ٹھوس، محکم اور مدلل رہنمائی رکھتا ہے اور ہر حقیقت کو اس طرح کھول کر بیان کرتا ہے کہ کسی انصاف پسند کے لیے کسی شبہے کی گنجائش باقی نہ رہے۔ ایسی مدلل، مبرہن اور منضبط کتاب کو شعر و شاعری سے کیا تعلق! دنیا کی پوری تاریخ میں کس شاعر نے اس طرح کی کتاب پیش کی ہے!

لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۷۰)

قرآن کے اتارے جانے کا مقصد

'لِيُنْذِرَ' کا فاعل نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ اس قرآن مبین کے اتارے جانے کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر یہ قرآن اس لیے اتارا ہے کہ اس کے ذریعے سے وہ ان لوگوں کو انذار کرے جن کے اندر حیاتِ عقلی و روحانی کی رمق باقی ہے۔ رہے وہ لوگ جن کے دل مردہ ہو چکے ہیں وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھائیں گے البتہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر حجت پوری ہو جائے گی اور وہ خدا کے ہاں یہ عذر نہیں کر سکیں گے کہ ان کے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا ورنہ وہ ہدایت اختیار کرنے والے بنتے۔

فعل 'انذار' یہاں اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے اور 'حَیّ' سے دل کے زندہ مراد ہیں۔ ایک مُنذر انذار کرتا تو سب کو ہے لیکن اس کا انذار کارگر صرف انہی لوگوں پر ہوتا ہے جن کی فطرت زندہ ہوتی ہے۔ اس لیے کہ بات پر دھیان وہی کرتے ہیں، جیسا کہ فرمایا ہے: 'اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ' (یٰس: ۱۱) (تم انہی کو ڈرا سکتے ہو جو نصیحت پر دھیان کریں)۔ چونکہ حقیقت کے اعتبار سے زندہ وہی لوگ ہوتے ہیں اس وجہ سے قرآن نے انہی کو زندہ کہا ہے۔ جو اس وصف سے محروم ہیں وہ زندہ نہیں بلکہ مردہ ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کی نسبت فرمایا ہے: 'وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ' (فاطر: ۲۲) اس اسلوبِ بیان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ تسلی بھی ہے کہ تمہارا کام زندوں کو جگانا ہے، مردوں کو جگانا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ مضمون مختلف اسلوبوں سے قرآن میں بار بار بیان ہوا ہے۔

'الْقَوْلُ' سے مراد وہ قول ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے چیلنج کے جواب میں فرمایا تھا کہ میں بنی آدم

کی ہدایت کے لیے اپنی کتاب اور اپنی ہدایت نازل کروں گا۔ پھر جو اس کے بعد بھی تیری پیروی کریں گے تو میں ان سب کو تیرے سمیت جہنم میں بھر دوں گا۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ۝ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ۝ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ (۷۱-۷۳)

قرآن کی دعوت کی تائید میں آیاتِ ربوبیت کا حوالہ

ان آیات کا موقع و محل سمجھنے کے لیے اس سورہ کی آیات ۳۳-۴۵ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ جس طرح وہاں قرآن کے انذار اور اس کی دعوت توحید کا حوالہ دینے کے بعد بعض آیاتِ ربوبیت کی طرف توجہ دلائی ہے اور پھر خدا ہی کی شکرگزاری کا مطالبہ کیا ہے اسی طرح یہاں بھی قرآن کی دعوت کی تائید میں اپنی ربوبیت کی بعض نشانیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد خدا ہی کی شکرگزاری کا مطالبہ کیا ہے۔ گویا تمہید کا مضمون خاتمہ میں ایک نئے اسلوب سے پھر سامنے آگیا۔

'اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ الاٰية' فرمایا کہ کیا وہ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ ہم نے اپنی قدرت و حکمت سے چوپائے بنائے اور پھر ان کو ان کا مالک بنا دیا۔ وہ ان پر پوری آزادی سے مالکانہ تصرف کرتے اور اپنی تمام ضروریات میں ان کو استعمال کرتے ہیں۔ 'مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ' میں وہی بات ایک دوسرے اسلوب سے فرمائی گئی ہے جو پیچھے آیت ۳۵ میں 'وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ' کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں خود اپنے وجود سے شاہد ہیں کہ صرف خدا ہی کی قدرت و حکمت نے ان کو وجود بخشا ہے، کسی دوسرے کی مجال نہیں تھی کہ ان کو وجود میں لا سکتا یا ان کو انسان کا مطیع و فرمانبردار بنا سکتا۔ یہ محض ربِّ کریم کی کریمی ہے کہ اس نے ان کو اپنی قدرت و حکمت سے بنایا اور پھر ان کو انسان کی غلامی میں دے دیا ـــــ مطلب یہ ہے کہ یہ صورتِ حال دعوت دیتی ہے کہ انسان غور کرے کہ قدرت کے اس بے پایاں انعام کے عوض میں اس پر کوئی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے یا نہیں؟ قرآن اس سوال کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا اور اس کے نتائج سے آگاہ کرنا چاہتا ہے لیکن احمق لوگ حقیقت کی اس یاددہانی کو شاعری سمجھتے ہیں۔

'وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ الاٰية' یعنی یہ محض خدا کی ربوبیت و رحمت ہے کہ اس نے ان چوپایوں کو انسان کی معاشی ضروریات کے لیے سازگار بنایا اور پھر ان کو اس طرح انسان کا مطیع بنا دیا ہے کہ وہ جس طرح چاہے ان کو استعمال کرتا ہے۔ اگر خدا نہ چاہتا تو یہ چوپائے نہ تو انسان کی ضروریات کے لیے سازگار ہوتے اور نہ وہ ان کو اپنا مطیع بنا سکتا۔ آخر دنیا میں کتنے جانور ایسے ہیں جو نہ تو انسان کی ضروریات کے لیے کارآمد ہیں اور نہ وہ ان کو چوپایوں کی طرح اپنا غلام ہی بنا سکتا ہے۔ اگر وہ ان کو مسخر بھی کر لے جب بھی وہ ایک بوجھ تو اس کے لیے بن سکتے ہیں لیکن اس کا کوئی بوجھ اٹھانے والے نہیں بن سکتے۔ فرمایا کہ ان چوپایوں ہی میں سے بعض وہ ہیں جن سے وہ سواری کا کام لیتا ہے اور بعض وہ ہیں جن سے وہ اپنی غذائی ضروریات پوری کرتا ہے۔

وَلَهُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ۚ أَفَلَا يَشْكُرُونَ۔ یعنی سواری اور غذا کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد ان سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان کی کھال، ان کے بال، ان کی ہڈی، ان کے بول و براز، غرض ان کی کون سی چیز ہے جو انسان کے لیے نافع نہیں ہے۔ اسی طرح ان کے دودھ اور اس دودھ سے بنی ہوئی پینے کی مختلف چیزیں ـــ دہی، لسی، چھاچھ ـــ سب انسان کے لیے لذیذ، خوش گوار اور صحت بخش ہیں۔ أَفَلَا يَشْكُرُونَ۔ تو کیا یہ نعمتیں ان کے اوپر کوئی حق نہیں عائد کرتیں اور ان سے یہ مطالبہ نہیں کرتیں کہ جس رب کی بخشی ہوئی نعمتوں سے وہ فائدہ اٹھا رہے ہیں اس کے شکر گزار و فرماں بردار بھی بنیں! یہ نعمتیں زبانِ حال سے انسان کو یہ سبق پڑھا رہی ہیں اور اسی سبق کی یاد دہانی اللہ کی کتاب بھی کر رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی واضح حقیقت کو سمجھنے اور ماننے کے بجائے اس کو شاعری قرار دے کر اس سے گریز کی راہیں کیوں سوچ رہے ہو!

وَاتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ آلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنصَرُونَ ۝ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَهُمْ وَهُمْ لَهُمْ جُندٌ مُّحْضَرُونَ (۷۴-۷۵)

حقیقت سے فرار کے لیے چور دروازے

یعنی اس واضح حقیقت کا مواجہہ کرنے کے بجائے انھوں نے حقیقت سے فرار کے لیے چور دروازے پیدا کیے ہیں۔ حق تو یہ تھا کہ جس رب کی نعمتوں سے بہرہ مند ہو رہے ہیں اس کے حقوق و فرائض پہچانتے اور ان کو ادا کرتے لیکن انھوں نے کیا یہ ہے کہ خدا کے سوا کچھ دوسرے معبود انھوں نے ایجاد کیے ہیں اور ان کے کچھ رسوم ادا کر کے یہ توقع کر رہے ہیں کہ اگر خدا کی طرف سے کوئی گرفت ہوئی تو ان کی مدد سے وہ چھوٹ جائیں گے۔

لَا يَسْتَطِيعُونَ الآیۃ۔ فرمایا کہ ان کی مدد تو وہ کیا خاک کر سکیں گے۔ البتہ یہ ہو گا کہ ان کے ساتھ یہ بھی ان کی فوج کی حیثیت سے خدا کے حضور میں حاضر کیے جائیں گے اور پھر اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا کہ یہ کس سزا کے مستحق ہیں۔

فَلَا يَحْزُنكَ قَوْلُهُمْ ۘ إِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ (۷۶)

آنحضرت صلعم کو تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ جو کچھ بھی کہیں اس کو برداشت کرو، اس کا غم نہ کرو۔ یہ تمھیں شاعر، خبطی اور مفتری جو کچھ بھی کہتے ہیں کہنے دو اور یہ اطمینان رکھو کہ اللہ ان کی خفیہ سازشوں اور تمرازتوں سے بھی اچھی طرح واقف ہے اور جو کچھ یہ علانیہ کہہ اور کر رہے ہیں اس کو بھی جانتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب خدا سب کچھ جانتا ہے تو تم کیوں غم کرو! تم خدا کا کام کر رہے ہو، کرتے رہو اور یہ بھروسہ رکھو کہ تمھارے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے تمھارا رب کافی ہے۔

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ۝ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ ۖ قَالَ مَن يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ (۷۷-۷۸)

'انسان' سے مراد قریش ہی ہیں جن سے یہاں بحث ہے۔ بے التفاتی کے اظہار کے لیے لفظ عام استعمال فرمایا ہے۔

'ضَرَبَ مَثَلًا' کوئی تمثیل بیان کرنے یا حکمت کی بات کہنے کے لیے بھی آتا ہے اور موقع ہو تو کسی پر طنز یا پھبتی چست کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یہاں یہ اس دوسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

یہ کلام اپنے ماسبق سے دو پہلوؤں سے ربط رکھتا ہے۔ اوپر کی آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تسلی دی گئی ہے اس سے بھی اس کا تعلق ہے اور اُس سے اوپر کی آیات میں قریش کو خدا کی ربوبیت کے جو مقتضیات بتائے گئے ہیں اس سے بھی اس کا ربط ہے۔

تسلی کے مضمون سے اس کا ربط یوں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا ہے کہ جو سر پھرے لوگ خدا پر بھی پھبتی چست کر رہے ہیں اور اپنی پیدائش کو بھول کر بڑے طنطنہ سے یہ سوال کر رہے ہیں کہ بوسیدہ ہڈیوں میں کون زندگی پیدا کر سکتا ہے وہ اگر پیغمبر پر طنز کریں اور اس کو شاعر و مجنون قرار دیں تو ان سے کیا بعید ہے۔

ربوبیت کے مضمون سے اس کا تعلق یوں ہے کہ ربوبیت جس طرح شکر اور توحید کو مقتضی ہے اسی طرح ایک روزِ حساب و کتاب کو بھی مقتضی ہے (اس مضمون کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے) لیکن انسان کی بلادت کا یہ حال ہے کہ وہ خدا کی نعمتوں سے متمتع ہونے کے باوجود یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ کوئی روزِ حساب و کتاب بھی آنے والا ہے جس دن اس سے ان نعمتوں کی بابت پرسش ہونی ہے اور اگر اس کو اس کی یاد دہانی کی جاتی ہے تو وہ ایک حریف بن کر سامنے آتا ہے اور اپنی پہلی خلقت کو بالکل بھول کر طنزیہ انداز میں سوال کرتا ہے کہ بھلا بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے! فرمایا کہ ان کو بتا دو کہ ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی بار پیدا کیا۔ اگر پہلی بار ان کو پیدا کرنے میں اس کو کوئی زحمت نہیں پیش آئی تو دوبارہ اس کو پیدا کرنے میں کیوں زحمت پیش آئے گی!

'وَنَسِيَ خَلْقَهٗ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ احمقانہ سوال وہی کر سکتا ہے جس کو اپنی پہلی خلقت یاد نہ رہی ہو۔ جس کو اپنی پہلی خلقت یاد ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو اسی مٹی سے وجود میں لایا ہے تو وہ یہ سوال نہیں کر سکتا اگر کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کا حریف بن کر اس سے لڑنے اٹھا ہے۔

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِيٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُ ۙ (۷۹)

'وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ'۔ 'خلق' یہاں مخلوق کے معنی میں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوقات کو جانتا ہے۔ 'اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ' (کیا وہ نہیں جانے گا جس نے پیدا کیا)۔ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ مٹی میں رل مل جانے کے بعد وہ ان کو بھول جائے گا۔ وہ ان کے وجود کے ایک ایک ذرے سے باخبر ہے۔ 'قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ' (ق — ۴) (زمین ان کے اندر سے جو کچھ کم کرتی ہے ہم اس کو جانتے رہے ہیں اور ہمارے پاس سارا ریکارڈ رکھنے والی ایک کتاب ہے)۔

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ (۸۰)

ضد سے ضد کا ظہور

یعنی اس بات کو مستبعد نہ خیال کرو کہ راکھ اور مٹی سے زندگی نمودار ہو جائے گی۔ ضد سے ضد کے نمودار ہونے کا کرشمہ تم برابر اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو۔ تم سرسبز درخت کی دو شاخیں لیتے اور ان کو ایک دوسرے سے رگڑ کر ان سے آگ جلا لیتے ہو۔ جس خدا نے اپنی قدرت کی یہ شان دکھائی ہے اس کے لیے یہ کیا بعید ہے کہ وہ مٹی اور راکھ کے اندر سے زندگی نمودار کر دے! 'الشجر الاخضر' سے مراد وہ درخت ہیں جو عرب کے بعض علاقوں میں پائے جاتے ہیں اور صحراؤں کے مسافر ان کی شاخوں سے چقماق کا کام لیتے رہے ہیں۔

سلف میں سے بعض لوگوں نے اس آیت کی تاویل اس سے مختلف بھی کی ہے لیکن مجھے اس میں تکلف محسوس ہوتا ہے۔ یہ تاویل بالکل واضح ہے۔ عرب میں بعض درخت پائے جاتے تھے جن سے لوگ چقماق کا کام لیتے تھے۔ کتابوں میں ان کے نام بھی مذکور ہوئے ہیں۔ اگر اب یہ درخت نہ پائے جاتے ہوں یا بہت نایاب ہوں تو اس سے کچھ فرق نہیں پیدا ہوتا۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے برابر محو و اثبات ہوتا رہتا ہے۔ اگر قرآن کے مخاطبِ اول اس سے واقف تھے تو یہ استدلال بالکل برمحل ہے۔ اس کی اصل بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ ضد سے ضد کے وجود کے شواہد اس دنیا میں موجود ہیں اور یہ ایک ایسی بات ہے جس سے انکار کی گنجائش کسی کے لیے بھی نہیں ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ سب سے زیادہ زوردار آگ پانی کے اندر پائی جاتی ہے!

اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؕ بَلٰی ٭ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ (۸۱)

سوال کا جواب ایک دوسرے پہلو سے

اسی استبعاد کو ایک دوسرے پہلو سے رفع فرمایا ہے کہ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کر دیا اور اس کو اس میں کوئی مشکل نہیں پیش آئی کیا وہ ان کی جیسی مخلوق کو دوبارہ پیدا کر دینے پر قادر نہیں ہو سکتا؟ یہ سوچیں کہ ان دونوں میں زیادہ مشکل کام کون سا ہے؟ 'بَلٰی ٭ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ' یہ اس سوال کا خود ہی جواب دیا ہے کہ ہاں، وہ پوری طرح قادر ہے کہ ان کو دوبارہ پیدا کر دے۔ اس جواب سے مخاطب کے لیے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی اگرچہ وہ کتنی ہی سخن سازیاں کرے۔ 'وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ' یہ اللہ تعالیٰ کی صفات سے مذکورہ دعوے پر دلیل ہے کہ اصل پیدا کرنے والا اور علم رکھنے والا تو خدا ہی ہے۔ اوپر آیت ۷۹ میں فرمایا ہے 'وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمٌ' اسی مضمون کو یہاں زیادہ زوردار الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ خدا بڑا پیدا کرنے والا ہے، کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اس دنیا کو پیدا کر کے وہ تھک گیا یا اس کی قوتِ تخلیق ختم ہو گئی بلکہ وہ اسی طرح تازہ دم ہے جس طرح پہلے تھا اور وہ اپنی ہر مخلوق کے اجزائے ترکیبی سے اچھی طرح باخبر ہے، وہ جب چاہے گا ازسرِنو اس کے پور پور اور جوڑ جوڑ کو ٹھیک کرے گا۔

إِنَّمَآ أَمْرُهُۥٓ إِذَآ أَرَادَ شَيْـًٔا أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ (۸۲)

یعنی کوئی اس غلط فہمی میں بھی نہ رہے کہ کسی چیز کو پیدا کرنے کے لیے خدا کو کارخانے قائم کرنے پڑتے ہیں یا سرمایہ، میٹیریل، لیبر اور مشینوں کا اہتمام و انتظام کرنا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے کسی ارادے کی تکمیل میں کسی چیز کا بھی محتاج نہیں ہے۔ اس کا معاملہ بس یوں ہے کہ جب وہ کسی بات کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کو حکم فرماتا ہے کہ وہ ہو جائے اور وہ اس کے حکم کے مطابق ہو جاتی ہے۔

فَسُبْحَٰنَ ٱلَّذِى بِيَدِهِۦ مَلَكُوتُ كُلِّ شَىْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۸۳)

'ملکوت' کے معنی اختیار و اقتدار کے ہیں۔ یہ آخر میں تنبیہ فرمائی کہ جس خدا کے ہاتھ میں ہر چیز کی زمام ہے اور جس کی طرف ہی تمھیں لوٹ کر جانا ہے وہ ہر نقص و عیب سے منزّہ ہے تو اس کو ہر عیب سے منزّہ مانو اور اس کی پاکی بیان کرتے رہو۔ اس کی ذات و صفات اور اس کے حقوق میں کوئی شریک نہیں، وہ ہر شرکت سے ارفع ہے، اس نے یہ دنیا عبث نہیں بنائی ہے اس وجہ سے ہر ایک کو خدا کے حضور حاضر ہونا اور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔ اس کے لیے لوگوں کو مرنے اور سڑ گل جانے کے بعد دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا ذرا مشکل نہیں، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے، کوئی چیز بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں اور کسی کا کوئی قول و عمل بھی اس سے مخفی نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی رہنمائی سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ الحمد للہ علیٰ ذٰلک

رحمان آباد
۸/ مارچ ۱۹۷۵ء

تدبرِ قرآن

۳۷

الصّٰفّٰت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ——— سورۂ یٰسٓ ——— کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے، دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ توحید، قیامت اور رسالت کے اصولی مباحث جس طرح اس گروپ کی پچھلی سورتوں میں زیرِبحث آئے ہیں اسی طرح اس میں بھی زیرِبحث آئے ہیں البتہ نہجِ استدلال اور ترتیبِ بیان مختلف ہے۔ توحید جو اس پورے گروپ کی روح ہے، اس سورہ میں بھی نمایاں ہے۔ لیکن اس میں اس کے ایک خاص پہلو ——— الوہیتِ ملائکہ کے تصور کے ابطال ——— کو زیادہ وضاحت کے ساتھ لیا ہے۔ احوالِ قیامت کی تصویر اس میں ایسے زاویہ سے پیش کی گئی ہے جس سے مشرکین کے عوام اور ان کے لیڈروں کی باہمی تو تکار سامنے آتی ہے۔ حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی پوری تاریخ بھی اس میں اجمالاً بیان ہوئی ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جن قوموں نے رسولوں کی تکذیب کی اللہ تعالیٰ نے ان کو مٹا دیا؛ فلاح صرف رسولوں اور ان کی پیروی کرنے والوں کو حاصل ہوئی۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کا اجمالی تجزیہ یہ ہے۔

(۱-۱۰) ملائکہ خدا کے حضور میں ہمیشہ اس کے احکام کی تعمیل کے لیے حاضر اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم رہتے ہیں۔ وہ اپنے عمل سے شہادت دے رہے ہیں کہ وہ خدا کے نہایت فرمانبردار اور اطاعت گزار بندے ہیں نہ کہ اس کے شریک، جیسا کہ نادانوں نے سمجھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قرب صرف ملائکہ کو حاصل ہے، جنّات و شیاطین کی رسائی ملاءِ اعلیٰ تک نہیں ہے۔ اگر وہ ملاءِ اعلیٰ کی باتوں کی کچھ سن گن لینے کی کوشش کرتے ہیں تو ملائکہ ان کو دھتکارتے اور شہابِ ثاقب ان کا تعاقب کرتے ہیں اس وجہ سے وہ غائب کی باتیں جاننے سے قاصر ہیں۔ جو لوگ ان کو علمِ غیب حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے مرتبۂ بلند سے بے خبر ہیں۔

(۱۱-۳۹) ان لوگوں کو تنبیہ جو قیامت کا مذاق اڑا رہے تھے۔ قیامت کے دن ان کا اور ان کے لیڈروں کا

جو حال ہو گا اس کی تصویر۔ مقصود اس سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ ان کے مغرورانہ رویہ کو ابھی نظر انداز کرو۔ وہ دن آنے والا ہے جب ان کے عوام اپنے لیڈروں پر لعنت کریں گے کہ انھوں نے ان کو پیغمبر کی پیروی سے روکا اور لیڈر اپنے پیروؤں کو ملامت کریں گے کہ وہ خود شامت زدہ تھے کہ انھوں نے حق کے واضح ہو جانے کے بعد اس کا انکار کیا۔

(۴۰ - ۶۱) ان اہلِ ایمان کا صلہ جو گمراہ کرنے والے ساتھیوں اور لیڈروں کے علی الرغم رسول کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ان کو قیامت کے دن جو سرورِ ابدی حاصل ہو گا اس کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ۔

(۶۲ - ۷۰) باپ دادا کی اندھی تقلید کے جنون میں رسول اور اس کے طریقہ کی مخالفت کرنے والوں کو جس انجام سے سابقہ پیش آئے گا اس کی طرف اشارہ۔

(۷۱ - ۱۴۸) تاریخ کی شہادت کہ جن قوموں کو اللہ تعالیٰ نے کسی رسول کے ذریعہ سے انذار کیا اگر انھوں نے رسول کی تکذیب کر دی تو ہلاک کر دی گئیں۔ صرف وہ لوگ خدا کی پکڑ سے محفوظ رہے جنھوں نے رسول کی پیروی کی۔ اللہ کی رحمت و برکت، اللہ کے رسولوں اور ان کی پیروی کرنے والوں ہی کے لیے ہے۔

(۱۴۹ - ۱۸۲) خاتمۂ سورہ جس میں کلام تمہید کے مضمون سے پھر مربوط ہو گیا ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام کی زبانی یہ شہادت دلوائی گئی ہے کہ فرشتوں کی جماعت برابر خدا کے احکام کی تعمیل اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم رہتی ہے اور ہم خدا کے فرمانبردار بندے ہیں نہ کہ اس کے شریک و شفیع۔ آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اللہ کی مدد اور غلبہ تمھارے اور تمھارے ساتھیوں ہی کے لیے ہے۔ تمھارے مخالفین لازماً ناکام ہوں گے جو پہلے تو رسول کی بعثت کے منتظر رہے لیکن جب وہ آیا تو حسد و تکبر کے سبب سے اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ تم ان سے درگزر کرو اور صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ۔ سلامتی اللہ کے رسولوں ہی کے لیے ہے۔

سُورَةُ الصّٰٓفّٰتِ (۳۷)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ۱۸۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ﴿۱﴾ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۙ﴿۲﴾ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۙ﴿۳﴾ آیات

اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ؕ﴿۴﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَ ۱-۱۰

رَبُّ الْمَشَارِقِ ؕ﴿۵﴾ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ۨالْكَوَاكِبِ ۙ﴿۶﴾

وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۚ﴿۷﴾ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى

وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۖ﴿۸﴾ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۙ﴿۹﴾

اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴿۱۰﴾

شاہد ہیں صفیں باندھے، حاضر رہنے والے فرشتے؛ پھر زجر کرنے والے (شیاطین کو)؛ ترجمہ آیات

پھر ذکر کرنے والے (اپنے رب کا) کہ تمھارا معبود ایک ہی ہے۔ وہی خداوند ہے آسمانوں اور ۱-۱۰

زمین اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کا۔ اور وہی خداوند ہے سارے اطرافِ مشرق کا۔ ۱-۵

بے شک ہم ہی نے سجایا ہے سمادِ دنیا کو ستاروں کی زینت سے اور اس کو محفوظ کیا ہے

اچھی طرح ہر سرکش شیطان کی دراندازی سے۔ اور وہ ملاءِ اعلیٰ کی طرف کان نہیں لگانے پاتے

اور وہ ہر جانب سے دھتکارے جاتے ہیں کھدیڑنے کے لیے اور ان کے لیے ایک دائمی عذاب

ہے۔ مگر یہ کہ کوئی اچک لے کوئی بات تو ایک دمکتا شعلہ اس کا تعاقب کرتا ہے۔ ۶-۱۰

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا (۱)

قسم شہادت کے لیے 'وَ' قسم کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو قسمیں کھائی ہیں یہ تعظیم کے لیے نہیں بلکہ مقسم علیہ پر شہادت کے لیے ہیں۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ 'الامعان فی اقسام القرآن' میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے۔ ہمارے قلم سے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔ قسم کے اس مفہوم کی روشنی میں 'وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا' کا ترجمہ 'شاہد ہیں صفیں باندھے ہوئے حاضر رہنے والے فرشتے' کیا جائے تو یہ قسم کے مفہوم کو بالکل ٹھیک ٹھیک ادا کرنے والا ہوگا۔

صافات فرشتوں کی صفت ہے 'صَآفّٰتٌ' یہاں فرشتوں کی صفت کے طور پر آیا ہے اور اس کی وضاحت اسی سورہ میں خود حضرت جبریلؑ کی زبانی ہو گئی ہے۔ ان کا ارشاد نقل ہوا ہے: 'وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۝ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۝ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ' (۱۶۴-۱۶۶) (اور ہم میں سے ہر ایک کے لیے ایک معین مقام ہے' اور ہم تو صف بستہ رہنے والے ہیں اور ہم تو تسبیح کرتے رہنے والے ہیں)۔

قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان فرشتوں کا ذکر ہے جو ملاءِ اعلیٰ کے زمرے سے تعلق رکھتے اور عرش الٰہی کے ارد گرد صف بستہ رہتے ہیں۔ سورۂ زمر میں ان کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے: 'وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ' (۷۵) (اور تم دیکھو گے فرشتوں کو گھیرے ہوئے عرش کے ارد گرد' اپنے رب کی تسبیح کرتے ہوئے' اس کی حمد کے ساتھ)۔

فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا (۲)

دوسری صفت 'زجر' کے معنی جھڑکنے، ڈانٹنے اور دھتکارنے کے ہیں۔ یہ انہی فرشتوں کی دوسری صفت بیان ہوئی ہے کہ اگر شیاطین ملاءِ اعلیٰ کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ان کو دھتکارتے ہیں۔ شیاطین کو ملاءِ اعلیٰ سے دور رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص انتظام بھی فرمایا ہے جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا (۳)

تیسری صفت یہ ان فرشتوں کی تیسری صفت ہے۔ تلاوتِ ذکر سے مراد وہی چیز ہے جو سورۂ زمر میں 'يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ' کے الفاظ سے اور اس سورہ میں 'وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ' کے الفاظ سے مذکور ہوئی ہے یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح کرتے ہیں۔

صفات میں ترتیب یہاں عربی زبان کا یہ قاعدہ پیش نظر رہے کہ جب صفات کا بیان اس طرح 'ف' کے ساتھ ہو جس

طرح یہاں ہے تو یہ دو باتوں پر دلیل ہوتا ہے۔ ایک اس بات پر کہ یہ تمام صفات ایک ہی چیز کی ہیں اس وجہ سے جن لوگوں نے ان صفات کے الگ الگ موصوف قرار دیے ہیں ان کی رائے ہمارے نزدیک عربیت کے خلاف ہے۔ دوسری اس بات پر کہ ان صفات میں ایک تدریجی ترتیب ہے۔ ہم نے جو تاویل کی ہے اس سے پہلی بات تو بالکل واضح ہے کہ یہ تمام صفات ملائکہ کی ہیں۔ رہی دوسری بات تو غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان صفات میں اسی طرح کی ترتیب ہے جس طرح کی ترتیب ہماری نمازوں میں ہوتی ہے جس طرح ہم خدا کے سامنے صف بستہ کھڑے ہوتے ہیں، پھر شیطان سے تعوّذ کرتے ہیں، پھر اپنے رب کی حمد و تسبیح کرتے ہیں اسی طرح ملائکہ بھی عرشِ الٰہی کے ارد گرد صف بستہ کھڑے ہوتے ہیں، پھر شیاطین کو زجر کرتے ہیں، پھر اپنے رب کی حمد و تسبیح کرتے ہیں۔

اِنَّ اِلٰـهَكُمْ لَوَاحِدٌ (۴)

مقسم علیہ — یہ اس قسم کا مقسم علیہ ہے۔ فرشتوں کی اس بندگی اور اس حمد و تسبیح کو شہادت میں پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ تمھارا رب ایک ہی ہے۔ اس سے یہ بات نکلی کہ جن لوگوں نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مان کر ان کو خدائی میں شریک کر رکھا ہے اور ان کی شفاعت کی امید پر ان کی پوجا کر رہے ہیں وہ بالکل حماقت میں مبتلا ہیں۔ فرشتوں کا خود اپنا طرزِ عمل ان نادانوں پر ایک کھلی ہوئی نکیر ہے۔ اس لیے کہ وہ برابر خدا کی بندگی اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم ہیں اور یہ احمق لوگ ان کو شریکِ خدا بنا کر ان کی پوجا میں لگے ہوئے ہیں۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ (۵)

یہ خبر کے بعد دوسری خبر ہے۔ یعنی وہی اللہ واحد تمام آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کا خداوند ہے اور وہی تمام مشرق و مغرب کا مالک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اس نے اپنی ناپیدا کنار مملکت کے دور دراز گوشوں کا انتظام اپنے دوسرے شریکوں کے سپرد کر رکھا ہے۔ وہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہے۔ وہ اپنی کائنات کے ہر گوشے اور کونے کا مالک خود ہے اور خود ہی اپنے احکام کے تحت اس کا انتظام فرماتا ہے۔ اس کائنات میں فرشتوں کا اگر کوئی دخل ہے تو خدا کے شریک کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس کے فرمانبردار سفیروں اور کارندوں کی حیثیت سے ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اپنے رب کے احکام کی تعمیل میں کرتے ہیں۔

جمع کے استعمال کا ایک خاص محل — 'رَبُّ الْمَشَارِقِ' میں 'مَشَارِق' جمع اپنے اطراف کی وسعت کے اعتبار سے ہے۔ سورۂ اعراف میں لفظ 'اعراف' کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں کہ جمع بعض مرتبہ کسی شے کی وسعت اور اس کے طول کو ظاہر کرنے کے لیے بھی آتی ہے۔ قرآن میں 'مشارق' اور 'مغارب' کے الفاظ اسی اعتبار سے آئے ہیں۔ اسی طرح جہاں مقصود کسی شے کے دونوں کناروں کی طرف اشارہ کرنا ہو وہاں اس کو بعض اوقات مثنیٰ کی شکل میں لاتے ہیں چنانچہ

قرآن میں 'مشرقین' اور 'مغربین' بھی استعمال ہوئے ہیں۔ 'رَبُّ الْمَشَارِقِ' کے بعد 'رَبُّ الْمَغَارِبِ' بر بنائے وضاحت قرینہ حذف ہے۔ اس لیے کہ 'مغارب' 'مشارق' کے تحت ہیں۔ جب اصل کا ذکر آ گیا تو فرع کا ذکر گویا خود بخود ہو گیا۔ بعض جگہ اس کو واضح بھی فرمایا ہے۔ مثلاً: 'فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ' (المعارج ۔ ۴۰) (پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں مشارق اور مغارب کے رب کی کہ بے شک ہم قادر ہیں)۔ 'مشارق' کے خاص اہتمام کے ساتھ ذکر کرنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دنیا میں مشرکوں نے سب سے زیادہ پرستش سورج کی کی ہے جو مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ نِ الْكَوَاكِبِ ۝ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ (۶-۷)

شیاطین جن کی تردید

اوپر کی آیات میں ملائکہ کا ذکر ہوا ہے کہ نادانوں نے تو ان کو خدائی کا درجہ دے رکھا ہے اور ان کے ملاء اعلیٰ تک کا حال یہ ہے کہ وہ برابر اپنے رب کے آگے صف بستہ اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم رہتے ہیں۔ اب آگے کی آیات میں شیاطین جن کا ذکر آ رہا ہے کہ نادانوں نے ان کی نسبت یہ گمان کر رکھا ہے کہ ان کی رسائی ملاء اعلیٰ تک ہے اور وہ وہاں سے غیب کی خبریں حاصل کرتے ہیں چنانچہ اسی توقع پر ان کی پرستش کی جاتی ہے کہ یہ علم غیب کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ حالانکہ ملاء اعلیٰ تک کسی کی بھی رسائی نہیں ہے۔ اگر کوئی شریر جن وہاں تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر شہاب ثاقب کی مار پڑتی ہے۔

'وَحِفْظًا' فعل محذوف کی تاکید ہے۔ یعنی 'وَحَفِظْنٰهَا حِفْظًا' اس وجہ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آسمان کو ہم نے شیاطین کی دراندازی سے اچھی طرح محفوظ کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ستارے ایک طرف تو آسمانِ زیریں کی زینت ہیں، دوسری طرف قدرت ان سے یہ کام بھی لیتی ہے کہ جو شیاطین ملاء اعلیٰ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو انہی ستاروں کے ذریعے سے سرزنش کی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں یہ مضمون مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے۔ مثلاً: 'وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ' (الملک: ۵) (اور ہم نے سماء دنیا کو تاروں سے سجایا ہے اور ان کو شیاطین کے سنگسار کرنے کے لیے بھی بنایا ہے) دوسرے مقام میں ہے: 'وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ۝ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ' (الحجر: ۱۶-۱۸) (اور ہم نے آسمان میں برج بنائے ہیں اور اس کو دیکھنے والوں کے لیے تاروں سے مزین کیا ہے اور اس کو ہر شیطانِ رجیم سے محفوظ کیا ہے اور اگر کوئی چھپ کے ملاء اعلیٰ کی باتیں سننے کی کوشش کرتا ہے تو ایک دمکتا شہاب اس کا تعاقب کرتا ہے)۔

لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ (۸-۹)

'لَا يَسَّمَّعُوْنَ' یہ نفی فعل، نفی فائدہ فعل کے پہلو سے ہے۔ یعنی شیاطین ملاء اعلیٰ کی باتیں سننے کی

کوشش کرتے تو ہیں لیکن وہ کان لگانے پاتے نہیں، جب وہ یہ کرنا چاہتے ہیں تو ہر جانب سے ان پر سنگ باری ہوتی ہے۔ 'دُحُوْرٌ' کے معنی دھتکارنے اور کھدیڑنے کے ہیں اور 'وَاصِبٌ' کے معنی دائم کے۔ یعنی اس دنیا میں تو وہ اس طرح ملعون و مرجوم رہیں گے اور آخرت میں ان کے لیے ایک دائمی عذاب ہے۔

اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ (۱۰)

یعنی قدرت کے اس محکم انتظام کے بعد اس بات کا تو امکان ہے نہیں کہ کوئی شیطان ملاءِ اعلیٰ تک پہنچ سکے یا ان کی باتیں سن سکے۔ کوئی شریر جن اگر کچھ کر سکتا ہے تو یہ کر سکتا ہے کہ اچکوں کی طرح کوئی بات اچکنے کی کوشش کرے۔ سو اس کے سدباب کے لیے بھی یہ انتظام ہے کہ آسمان کی برجیوں سے ایک دہکتا شعلہ اس کا تعاقب کرتا ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ نہ فرشتوں کو خدا کی خدائی میں کوئی دخل ہے اور نہ جنات کی رسائی ملاءِ اعلیٰ تک ہے کہ وہاں سے وہ غیب کی کوئی خبر معلوم کر سکیں اس وجہ سے جو لوگ فرشتوں کو خدا کی چہیتی بیٹیاں سمجھ کر پوج رہے ہیں وہ بھی احمق اور جو جنات کو علم غیب کا وسیلہ سمجھ کر ان سے تعلق و توسل پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ بھی احمق۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ عربوں کے شرک اور ان کی کہانت کی تمام گرم بازاری انہی دو مذکورہ تصورات پر تھی۔ قرآن نے یہاں جنوں اور فرشتوں دونوں کی حقیقت واضح کر کے ان کی ضلالت کے اس سارے کاروبار کو ختم کر دیا۔

۲- آگے کا مضمون - آیات ۱۱-۷۴

آگے احوالِ قیامت کی تفصیل ہے اور مقصود اس سے یہ دکھانا ہے کہ جو لوگ اللہ کے سوا دوسری چیزوں کی پرستش کر رہے ہیں قیامت کے دن ان کا اور ان کے معبودوں کا کیا حال ہونا ہے۔ شرک کے علم بردار لیڈر اور ان کے پیرو کس طرح ایک دوسرے پر لعنت کریں گے! اور اہلِ ایمان، جو تمام مخالفتوں کے علی الرغم توحید اور قیامت کے عقیدے پر جمے رہیں گے، اللہ تعالیٰ ان کو کس فوزِ عظیم سے نوازے گا: —— آیات کی تلاوت فرمائیے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ۭ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ آیات
لَّازِبٍ ﴿۱۱﴾ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ﴿۱۳﴾ ۱۱-۷۴
وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾
ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۱۶﴾ اَوَاٰبَاۗؤُنَا

الْاَوَّلُوْنَ ﴿١٧﴾ قُلْ نَعَمْ وَاَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ﴿١٨﴾ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ
وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿١٩﴾ وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ
الدِّيْنِ ﴿٢٠﴾ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿٢١﴾ ع ٥
اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿٢٢﴾
الربع مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴿٢٣﴾ وَقِفُوْهُمْ
اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ ﴿٢٤﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴿٢٥﴾ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ
مُسْتَسْلِمُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿٢٧﴾
قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴿٢٨﴾ قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا
مُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٩﴾ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا
طٰغِيْنَ ﴿٣٠﴾ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ ۖ اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ ﴿٣١﴾ فَاَغْوَيْنٰكُمْ
اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ ﴿٣٢﴾ فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿٣٣﴾ اِنَّا
كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿٣٤﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ
اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ
مَّجْنُوْنٍ ﴿٣٦﴾ بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٣٧﴾ اِنَّكُمْ لَذَآئِقُوا
الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ ﴿٣٨﴾ وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٣٩﴾ اِلَّا
عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿٤٠﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿٤١﴾ فَوَاكِهُ ۚ
وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ ﴿٤٢﴾ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿٤٣﴾ عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿٤٤﴾
يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴿٤٥﴾ بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿٤٦﴾

لَا فِيهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُونَ ﴿٤٧﴾ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ
عِينٌ ﴿٤٨﴾ كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُونٌ ﴿٤٩﴾ فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ
يَّتَسَآءَلُونَ ﴿٥٠﴾ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي قَرِينٌ ﴿٥١﴾ يَّقُولُ أَئِنَّكَ
لَمِنَ الْمُصَدِّقِينَ ﴿٥٢﴾ ءَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَإِنَّا
لَمَدِينُونَ ﴿٥٣﴾ قَالَ هَلْ أَنْتُمْ مُّطَّلِعُونَ ﴿٥٤﴾ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِي سَوَآءِ
الْجَحِيمِ ﴿٥٥﴾ قَالَ تَاللّٰهِ إِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِينِ ﴿٥٦﴾ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّي
لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِينَ ﴿٥٧﴾ أَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِينَ ﴿٥٨﴾ إِلَّا مَوْتَتَنَا الْأُولٰى
وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ﴿٥٩﴾ إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٦٠﴾ لِمِثْلِ
هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُونَ ﴿٦١﴾ أَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا أَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّومِ ﴿٦٢﴾
إِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِينَ ﴿٦٣﴾ إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ
الْجَحِيمِ ﴿٦٤﴾ طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيٰطِينِ ﴿٦٥﴾ فَإِنَّهُمْ لَاٰكِلُونَ
مِنْهَا فَمَالِـُٔونَ مِنْهَا الْبُطُونَ ﴿٦٦﴾ ثُمَّ إِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ
حَمِيمٍ ﴿٦٧﴾ ثُمَّ إِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَإِلَى الْجَحِيمِ ﴿٦٨﴾ إِنَّهُمْ أَلْفَوْا آبَآءَهُمْ
ضَآلِّينَ ﴿٦٩﴾ فَهُمْ عَلٰى آثٰرِهِمْ يُهْرَعُونَ ﴿٧٠﴾ وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ أَكْثَرُ
الْأَوَّلِينَ ﴿٧١﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا فِيهِمْ مُّنْذِرِينَ ﴿٧٢﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِينَ ﴿٧٣﴾ إِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿٧٤﴾ ع ٢ ٥٣ ٦

ترجمۂ آیات ۱۱-۱۲: پس ان سے پوچھو کہ کیا ان کے پیدا کرنے کا معاملہ زیادہ سخت ہے یا ان چیزوں
کا جو ہم نے پیدا کی ہیں! ہم نے ان کو تو چپکتی مٹی سے پیدا کیا ہے! بلکہ تم تعجب کر رہے ہو

اور یہ لوگ مذاق اڑا رہے ہیں اور جب ان کو یاد دہانی کی جاتی ہے تو وہ دھیان نہیں کرتے۔ اور جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اس کا مذاق اڑاتے اور کہتے ہیں یہ تو بس ایک کھلا ہوا جادو ہے۔ کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو پھر ہم اٹھائے جائیں گے! اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی! ۱۱-۱۷

ان کو جواب دے دو کہ ہاں تم اٹھائے بھی جاؤ گے اور ذلیل بھی ہو گے۔ بس وہ تو ایک ہی ڈانٹ ہو گی پس وہ تاکنے لگیں گے۔ اور کہیں گے، ہائے ہماری شامت! یہ تو جزا کا دن ہے! یہ وہی فیصلہ کا دن ہے جس کو تم جھٹلاتے رہے تھے! ۱۸-۲۱

جمع کرو ان کو جنھوں نے ظلم کیا اور ان کے ہم مشربوں کو اور ان کو جن کی یہ اللہ کے سوا پرستش کرتے رہے ہیں پھر ان سب کو دوزخ کا رستہ دکھاؤ۔ اور ان کو ذرا روکو، ان سے کچھ پوچھنا بھی ہے! کیا بات ہے، اس وقت تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کر رہے ہو! بلکہ یہ تو آج بڑے ہی فرماں بردار بنے ہوئے ہیں! ۲۲-۲۶

اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے، پوچھتے ہوئے۔ کہیں گے، تم ہی ہمارے پاس آتے تھے دہنے سے ...... وہ جواب دیں گے، بلکہ تم لوگ خود ایمان لانے والے نہیں تھے۔ اور ہمارا تمھارے اوپر کوئی زور تو تھا نہیں بلکہ تم خود ہی سرکش لوگ تھے۔ پس ہمارے اوپر ہمارے رب کی بات پوری ہو کے رہی۔ ہم کو اس کا مزا چکھنا ہی ہو گا۔ ہم نے تم کو گمراہ کیا، ہم خود بھی گمراہ تھے۔ پس وہ سب اس دن عذاب میں شریک ہوں گے۔ ۲۷-۳۲

ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کریں گے۔ ان کا حال یہ تھا کہ جب ان سے کہا جاتا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو یہ اکڑتے اور کہتے تھے کہ کیا ہم ایک شاعر دیوانہ کے کہنے

سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں! بلکہ وہ حق لے کر آیا ہے اور وہ رسولوں کی پیشین گوئیوں کا مصداق ہے۔ ۳۴-۳۷

بے شک تم کو دردناک عذاب چکھنا پڑے گا۔ اور یہ تو تم اسی کا بدلہ دیے جا رہے ہو جو تم کرتے رہے ہو۔ پس اللہ کے مخصوص بندے ہی اس سے محفوظ رہیں گے۔ یہ لوگ ہیں کہ ان کے لیے معلوم رزق ہو گا۔ میوے، اور وہ نعمت کے باغوں میں بڑی عزت سے ہوں گے۔ تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ ان کے لیے شرابِ معین کے جام گردش میں ہوں گے۔ بالکل صاف شفاف، پینے والوں کے لیے لذت ہی لذت! نہ اس میں کوئی ضرر ہو گا اور نہ وہ اس سے نڈھال ہوں گے۔ اور ان کے پاس باحیا، غزال چشم حوریں ہوں گی گویا کہ شتر مرغ کے محفوظ انڈے ہیں۔ ۳۸-۴۸

پس وہ ایک دوسرے کی طرف پوچھتے ہوئے متوجہ ہوں گے۔ ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا کہ میرا ایک ساتھی تھا جو کہا کرتا تھا کہ کیا تم بھی قیامت کی تصدیق کرنے والوں میں ہو! کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو ہم بدلہ پانے والے بنیں گے! کہے گا ذرا جھانک کے دیکھو تو سہی! تو وہ جھانکے گا اور اس کو جہنم کے بالکل بیچ میں دیکھے گا کہے گا، خدا کی قسم! تم تو مجھے تباہ ہی کر دینے والے تھے! اگر میرے رب کا فضل نہ ہوتا تو میں بھی آج پکڑا ہوا ہوتا۔ ہے نا یہ حقیقت کہ اب ہم پہلی موت کے بعد کبھی مرنے والے نہیں اور نہ ہم پر عذاب ہو گا! بے شک بڑی کامیابی یہی ہے! جس کو کوشش کرنی ہو وہ اس کے لیے کوشش کرے!! ۴۹-۶۱

ضیافت کے لیے یہ بہتر ہے یا درختِ زقوم! ہم نے اس کو ظالموں کے لیے ایک

فتنہ بنایا ہے۔ وہ ایسا درخت ہے جو قعرِ دوزخ میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے برگ وبار گویا شیاطین کے سر ہوں۔ وہ لوگ اسی کو کھائیں گے اور اسی سے پیٹ بھریں گے، پھر ان کے لیے اس کے اوپر گرم پانی کی ملونی ہوگی۔ پھر ان کا مرجع دوزخ کی طرف ہوگا۔ انھوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہی میں پایا۔ پھر یہ بھی انہی کے نقشِ قدم پر بھاگتے رہے۔ اور ان سے پہلے بھی اگلوں میں اکثر گمراہ ہوئے۔ اور ہم نے ان میں اپنے منذر بھیجے تو دیکھو، ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جن کو انذار کیا گیا۔ صرف ہمارے مخصوص بندے ہی اس انجام سے محفوظ رہے۔ ۶۲-۷۴

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَاسْتَفْتِهِمْ أَهُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ۚ إِنَّا خَلَقْنٰهُم مِّن طِينٍ لَّازِبٍ (۱۱)

امکانِ قیامت کی ایک واضح دلیل

احوالِ قیامت کے بیان کے لیے پہلے بطور تمہید اس کے امکان کے سوال کو لیا ہے کہ اگر یہ لوگ تمہارے انذارِ قیامت کو اس بنا پر جھٹلاتے ہیں کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جانا ان کے نزدیک مستبعد ہے تو ان سے پوچھو کہ یہ آسمان و زمین، یہ دریا اور پہاڑ، یہ سورج اور چاند جو خدا نے پیدا کیے ہیں ان کو پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا آدمیوں کو؟ تو جو خدا یہ عظیم چیزیں عدم سے وجود میں لانے پر قادر ہے وہ انسان جیسی حقیر چیز کو دوبارہ پیدا کرنے سے کیوں عاجز رہے گا؟ یہی مضمون سورۂ مومن میں یوں بیان ہوا ہے۔ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۵۷) (آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا لوگوں کو پیدا کرنے سے زیادہ مشکل ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے) یہی سوال دوسرے مقام میں یوں اٹھایا ہے: ءَأَنْتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ ۚ بَنٰهَا (النّٰزعٰت: ۲۷) (کیا تمہارا پیدا کیا جانا زیادہ مشکل ہے یا آسمان کا جس کو بنایا)۔

إِنَّا خَلَقْنٰهُم مِّن طِينٍ لَّازِبٍ۔ 'طین لازب' چپکنے والی مٹی کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو تو ہم نے چپکنے والی مٹی سے بنا ڈالا۔ ہمیں ان کے بنانے کے لیے کوئی خاص سر و سامان فراہم نہیں کرنا پڑا تھا کہ دوبارہ اس کو فراہم کرنا ہمارے لیے مشکل ہو جائے۔ جس مٹی سے ہم نے ان کو بنایا اس کی بہت بڑی مقدار ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم جب چاہیں گے ان کو پھر بنا دیں گے۔ جب پہلی بار ہمیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تو دوبارہ ہمارے لیے یہ کام کیوں مشکل ہو جائے گا!

یہاں أَمْ مَّنْ خَلَقْنَا میں 'مَنْ' کے استعمال سے ذہن اس طرف بھی جاتا ہے کہ مقابلہ ملائکہ وغیرہ

جنات کی خلقت سے کیا جا رہا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ان سے پوچھو کہ ان کو پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا دوسری مخلوقات جو ہم نے پیدا کی ہیں (مثلاً جنات اور ملائکہ) ان کو پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے۔ ان کو تو ہم نے مٹی سے پیدا کیا ہے اور ملائکہ اور جنوں کو تو نور اور نار سے پیدا کیا ہے تو اگر ہم ان کے پیدا کرنے پر قادر ہو گئے تو ان کو دوبارہ پیدا کرنے سے کیوں قاصر رہ جائیں گے!

بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ (۱۲)

تکلم اور مخاطب میں بُعد المشرقین

یعنی تمہارے لیے ان کا انکار تعجب انگیز ہے اور ان کے لیے تمہارا یہ دعویٰ وجہ تمسخر ہے۔ تم حیران ہو رہے ہو کہ بھلا کوئی عاقل ایسی واضح حقیقت کو کس طرح جھٹلا سکتا ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ مذاق اڑا رہے ہیں کہ کوئی شخص عقل و ہوش رکھتے ہوئے اس طرح کی بات کس طرح کہہ سکتا ہے! مطلب یہ ہے کہ تمہارے اور ان کے درمیان بُعدُ المشرقین ہے اور تم ان کی اس دوری کا صحیح اندازہ نہیں کر رہے ہو اس وجہ سے ان کا رویہ تمہارے لیے وجہ پریشانی ہے۔

وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ (۱۳)

یہ اس بُعد ذہنی کا لازمی نتیجہ بیان ہوا ہے کہ جب ان کے سوچنے کا انداز اتنا مختلف ہے کہ جو چیز تمہارے نزدیک بدیہی ہے وہ ان کے نزدیک ایک مذاق ہے تو تمہاری ساری تذکیر و تنبیہ ان کے لیے بالکل بے سود ہے۔ ان کو جو نصیحت بھی کی جاتی ہے وہ سب ہوا میں اڑ جاتی ہے۔ کوئی دلیل بھی ان پر کارگر نہیں ہوتی۔

وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ۝ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۱۴-۱۵)

فرمایا کہ اس طرح کے لوگ کسی بڑے سے بڑے معجزہ سے بھی قائل نہیں ہوتے۔ زچ کرنے کے لیے اس کا مطالبہ تو کرتے ہیں لیکن جب کوئی نشانی ان کے سامنے آتی ہے تو اس کا مذاق اڑاتے اور کہتے ہیں کہ یہ تو ایک کھلا ہوا جادو ہے۔

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ (۱۶-۱۷)

یہ تعبیر ہے ان کے مذاق کی۔ فرمایا کہ وہ کہتے ہیں کہ بھلا جب ہم مر جائیں گے اور سڑ گل کر مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو اس کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے؟ اور تعجب پر تعجب ان کو یہ ہے کہ کیا ان کے آباء و اجداد بھی اٹھائے جائیں گے! یہ باتیں ان کو عقل سے بالکل بعید معلوم ہوتی ہیں اس وجہ سے وہ سمجھتے ہیں کہ جو لوگ اس چیز سے ان کو ڈراتے ہیں وہ دیوانے ہیں۔

قُلْ نَعَمْ وَاَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ (۱۸)

چونکہ ان کا سوال بانداز مذاق ہے اس وجہ سے اس کا جواب بھی نہایت تیکھے انداز میں دیا ہے۔ فرمایا کہ جی ہاں، آپ لوگ اٹھائے بھی جاؤ گے اور اس وقت نہایت ذلیل بھی ہو گے!

فَاِنَّمَا هِيَ زَجۡرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمۡ يَنۡظُرُوۡنَ (۱۹)

ظہورِ قیامت کے وقت منکرین کی حواس باختگی

یعنی یہ لوگ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ ان کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کو کوئی خاص اہتمام و انتظام کرنا پڑے گا۔ یہ کام صرف ایک ڈانٹ میں انجام پا جائے گا۔ ایک ہی ڈانٹ میں وہ دفعۃً اٹھ کر تاکنے لگیں گے۔ سورۂ نازعات میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: 'فَاِنَّمَا هِيَ زَجۡرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝ فَاِذَا هُمۡ بِالسَّاهِرَةِ' (۱۳-۱۴) (بس وہ ایک ہی ڈانٹ ہوگی کہ وہ دفعۃً بیداری کی حالت میں آ جائیں گے)۔ اس اسلوبِ بیان میں سراسیمگی اور دہشت زدگی کا جو مضمون ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔

وَقَالُوۡا يٰوَيۡلَنَا هٰذَا يَوۡمُ الدِّيۡنِ (۲۰)

یعنی جس قیامت کا آج اس رعونت کے ساتھ انکار کر رہے ہیں اس وقت پکار اٹھیں گے کہ ہائے ہماری شامت! یہ تو وہی جزا و سزا کا دن آگیا جس کو ہم جھٹلاتے رہے تھے۔

هٰذَا يَوۡمُ الۡفَصۡلِ الَّذِيۡ كُنۡتُمۡ بِهٖ تُكَذِّبُوۡنَ (۲۱)

ان کی اس بات پر فرشتے کہیں گے کہ جی ہاں! یہ وہی فیصلہ کا دن ہے جس کو تم لوگ جھٹلاتے رہے تھے!

اُحۡشُرُوا الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا وَاَزۡوَاجَهُمۡ وَمَا كَانُوۡا يَعۡبُدُوۡنَ ۝ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَاهۡدُوۡهُمۡ اِلٰى صِرَاطِ الۡجَحِيۡمِ (۲۲-۲۳)

'اَلَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا' سے مراد مشرکین ہیں۔ اس لیے کہ سب سے بڑا ظلم شرک ہی ہے۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ اشارہ خاص طور پر ائمۂ شرک کی طرف ہے۔

لفظ 'اَزۡوَاج' یہاں ہم مشربوں، اتباع اور پیروکاروں کے لیے استعمال ہوا ہے۔

'مَا كَانُوۡا يَعۡبُدُوۡنَ' سے مراد ان کے شرکائے جن اور وہ اصنام و احجار ہیں جن کی وہ پرستش کرتے رہے تھے۔

قیامت کے دن ان سب کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کو حکم ہوگا کہ ان سب کو اکٹھا کر کے ان کو جہنم کا رستہ دکھاؤ۔

وَقِفُوۡهُمۡ اِنَّهُمۡ مَّسۡـُٔوۡلُوۡنَ ۝ مَا لَكُمۡ لَا تَنَاصَرُوۡنَ ۝ بَلۡ هُمُ الۡيَوۡمَ مُسۡتَسۡلِمُوۡنَ (۲۴-۲۶)

یہ اس دن ان کی ذلت اور بے بسی کی تصویر ہے۔

منکرین کی ذلت و بے بسی

ارشاد ہوگا کہ اچھا، ذرا دیر کے لیے ان کو روکو، ان سے ایک بات تو پوچھ لی جائے۔ 'مَا لَكُمۡ لَا تَنَاصَرُوۡنَ' یہ وہ بات ہے جس کو پوچھنے کے لیے ان کو روکا جائے گا۔ ارشاد ہوگا کیا وجہ ہے، آج تم لوگ ایک دوسرے کی مدد نہیں کر رہے ہو؟ دنیا میں تو تم ایک دوسرے کے جھنڈے اٹھائے پھرے لیکن آج نہ لیڈر پیروؤں کی کوئی مدد کر رہے ہیں اور نہ پیرو لیڈروں کی، نہ معبود عابدوں کے

لیے کچھ کرتے نظر آرہے ہیں اور نہ عابد معبودوں کے لیے کسی جوشِ فدویت کا اظہار کر رہے ہیں۔ آخر ہر ایک پر نفسی نفسی کی حالت کیوں طاری ہے! ایک دوسرے کے لیے اصلی جاں نثاری کا وقت تو اب آیا ہے لیکن اس وقت تو ہر ایک کو صرف اپنی پڑی ہوئی ہے!!

'بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ'۔ 'استسلام' کے معنی حوالے کر دینے اور مطیع بن جانے کے ہیں۔ فرمایا کہ آج تو یہ لوگ بڑے ہی مطیع و نیاز مند بنے ہوئے ہیں! کل تک تو ان کی رعونت کا یہ عالم تھا کہ پیٹھ پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتے تھے لیکن آج سب نے ہتھیار ڈال دیے ہیں!

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ (۲۷)

لیڈروں اور پیروؤں کی توتکار

'تساءل' یہاں باہم سوال و جواب کے مفہوم میں ہے اور آگے تفصیل آرہی ہے اس توتکار کی جو اس دن لیڈروں اور ان کے پیروؤں میں ہوگی۔

قَالُوْٓا اِنَّکُمْ کُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ہ قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۲۸-۲۹)

قرینہ دلیل ہے کہ پہلے 'قَالُوْٓا' کے فاعل عوام ہیں اور دوسرے کے ان کے لیڈر۔ یعنی اس دن عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ یہ آپ ہی لوگوں کی لائی ہوئی شامت ہے۔ آپ ہی لوگ دہنے اور بائیں سے ہر وقت ہم کو گھیرے رہتے تھے کہ ہم پیغمبر کی بات نہ سنیں۔ اگر آپ لوگ ہماری راہ میں اڑنگے نہ ڈالتے تو ہم ضرور ایمان لانے والے بنتے۔ لیڈر ان کی بات کاٹ کر فوراً ان کو جواب دیں گے کہ تمہارا یہ الزام بالکل جھوٹ ہے۔ تم لوگ خود ہی ایمان لانے والے نہیں تھے۔

وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ (۳۰)

'سلطان' کے معنی زور اور اختیار کے ہیں۔ یعنی ہمارا تمہارے دلوں پر کوئی زور و اختیار تو تھا نہیں کہ تم اپنا قصور ہمارے سر تھوپتے ہو۔ تم خود نافرمان اور سرکش لوگ تھے کہ حق کے واضح طور پر سامنے آجانے کے بعد تم نے اس کی پیروی کرنے کے بجائے ہماری بات مانی۔

ایک نادر اسلوب

'تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ' کے ٹکڑے کی تاویل میں ہمارے مفسرین کو بڑی الجھن پیش آئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات اسلوبِ کلام کی اس ندرت کو نہیں سمجھ سکے جو یہاں ملحوظ ہے۔ قرآن میں اہل دوزخ کے باہمی سوال و جواب کے سلسلے میں یہ بلیغ اسلوب جگہ جگہ استعمال ہوا ہے کہ متکلم کی بات شروع ہوتے ہی مخاطب اس کو کاٹ کر اس کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ اس کے لگائے ہوئے الزام سے اپنے کو بچا لے جائے۔ پچھلی سورتوں میں اس کی بعض مثالوں کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ آگے بھی، خاص طور پر آخری گروپ کی سورتوں میں، اس کی نہایت بلیغ مثالیں آئیں گی۔

یہاں بھی وہی اسلوب ہے۔ عوام جونہی اپنے لیڈروں کو ملامت کرنا چاہیں گے اور ان کی زبان سے یہ کلمہ نکلے گا کہ آپ ہی لوگ ہمارے پاس آتے تھے دہنے سے .... " تو ان کے لیڈر سمجھ جائیں گے

کہ یہ لوگ کہنا چاہتے ہیں کہ تم ہی لوگ ہمارے دہنے بائیں سے آ آ کر ہمیں پیغمبر کی بات سننے سے روکتے رہے ہو چنانچہ جونہی ان کی زبان سے لفظ 'عَنِ الْیَمِیْنِ' نکلے گا وہ فوراً سبقت کر کے ان کی بات کاٹ دیں گے اور اپنا دفاع شروع کر دیں گے۔ ان کی اس مداخلت اور اس قطع کلام کو ظاہر کرنے کے لیے قرآن نے بات 'عَنِ الْیَمِیْنِ' ہی پر ختم کر دی ہے تاکہ اسلوبِ کلام ہی سے یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ آج جو لوگ آنکھ بند کر کے اپنے لیڈروں کی پیروی کر رہے ہیں ایک دن آئے گا کہ ان کے لیڈر ان کو بات بھی پوری نہیں کہنے دیں گے بلکہ بیچ ہی سے بات کاٹ کر اپنی براءت کا اعلان شروع کر دیں گے۔ سورۂ سبا کی آیات ۳۱-۳۳ کے تحت لیڈروں اور عوام کی تو تکار کی تفصیل گزر چکی ہے۔ اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ ۖ اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ ۝ فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ (۳۱-۳۲)

یہ بھی لیڈروں ہی کی بات نقل ہوئی ہے کہ اب ایک دوسرے پر الزام تھوپنے سے کچھ حاصل نہیں، مجرم ہم بھی ہیں اور تم بھی ہو اس وجہ سے خدا کی وہ بات جو اس نے ابلیس کے چیلنج کے جواب میں فرمائی تھی کہ میں تجھ کو اور تیری پیروی کرنے والوں کو جہنم میں بھر دوں گا، ہم دونوں پر پوری ہو چکی ہے۔ اب ہم کو لازماً وہ عذاب چکھنا ہے جو ہمارے جیسے شامت زدوں کے لیے مقدر ہے 'فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ' یعنی ہم سزاوارِ ملامت اس صورت میں ہوتے جب ہم خود نیک ہوتے اور تم کو بد بنانے کی کوشش کرتے، ہم جو کچھ خود تھے وہی ہم نے تم کو بنانے کی کوشش کی۔ یہ تمہاری بے بصیرتی تھی کہ تم نے ہماری پیروی کی اور اس سے بڑی بے بصیرتی یہ ہے کہ ہماری پیروی کا جو انجام سامنے آیا ہے اس کے لیے موردِ الزام ہم کو ٹھہراتے ہو! آخر اندرائن سے تم نے سیب کھانے کی توقع کیوں کی؟

فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِى الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ (۳۳)

لیڈر اور پیرو دونوں جہنم میں

مطلب یہ ہے کہ اس دن عوام کا یہ عذر کچھ کام نہیں آئے گا کہ ان کی گمراہی کے ذمہ دار دوسرے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو اتنی عقل دی ہے کہ وہ حق و باطل میں امتیاز کر سکے، بالخصوص جب کہ باطل کے مقابلے میں حق کی دعوت دینے والے بھی موجود ہوں۔ اس وجہ سے ایسے عوام اور ایسے لیڈر دونوں عذاب میں حصہ دار ہوں گے۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ۝ اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ (۳۴-۳۶)

مجرمین قریش کا انجام

آخرت میں پیش آنے والا ماجرا سن کر اب یہ کلام کو مطابقِ حال کر دیا کہ یہ صرف دوسروں ہی کی سرگزشت نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا یہی معاملہ تمام مجرموں کے ساتھ ہوگا۔ ان کا جرم یہ تھا کہ جب ان کو دعوت دی جاتی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو وہ غرور سے اکڑتے اور کہتے کہ بھلا ہم ایک خبطی شاعر کے

کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے ہیں! تو جب یہی بات آج کے لوگ اپنے رسول کو کہتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ یہی صورت ان کو پیش نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ کا معاملہ تو تمام مجرموں کے ساتھ ایک ہی ہوگا۔

بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ (۳۷)

قریش کو جواب

یہ قریش کو جواب دیا گیا ہے کہ جو شخص تمہیں توحید کی دعوت دے رہا اور خدا کے عذاب سے ڈرا رہا ہے یہ کوئی دیوانہ یا شاعر نہیں ہے بلکہ وہ تم کو ایک امر شدنی کی خبر دے رہا ہے۔ اس کے رسولِ برحق ہونے کی نہایت واضح دلیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت مسیحؑ تک تمام رسولوں نے اس کی پیشین گوئی کی اور اس کی بعثت سے ان کی پیشین گوئیوں اور ان کی تعلیمات کی تصدیق ہوئی ہے۔ یہ شخص تمہارے اندر کوئی اجنبی ہے اور نہ اس کی تعلیمات تمہارے لیے انوکھی ہیں۔ اس کی خبر پچھلے رسولوں نے دی ہے اور اس کی تعلیمات کی تصدیق پچھلے صحیفوں سے ہو رہی ہے۔ اگر تم اس بات سے بے خبر ہو تو اہلِ کتاب سے پوچھو، ان میں جو ایمان دار ہوں گے وہ اس بات کی تصدیق کریں گے ـــــ یہ ساری باتیں پچھلی سورتوں میں تفصیل سے زیرِ بحث آ چکی ہیں اس وجہ سے ہم یہاں اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

اِنَّكُمْ لَذَآئِقُوا الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ ۚ وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۳۸-۳۹)

یعنی اللہ کا رسول تمہیں جس عذاب کی خبر دے رہا ہے اس کو خبط و جنون پر محمول نہ کرو بلکہ وہ ایک حقیقت ہے۔ اگر تم نے اس کی تکذیب کر دی تو تمہیں لازماً اس دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اور یہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی بلکہ یہ ٹھیک ٹھیک تمہارے اعمال کا بدلہ ہوگا جو تمہارے سامنے آئے گا۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ (۴۰)

عذاب سے محفوظ رہنے والے

استثناء یہاں منقطع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس انجام سے ہر ایک کو سابقہ پیش آنے والا ہے۔ اللہ کے وہی بندے اس سے محفوظ رہیں گے جن کو اللہ نے اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیا ہو۔ یہ بات ہم جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحمت کے لیے انہی بندوں کو خاص کرتا ہے جو اپنے ایمان و عمل سے اس کا استحقاق پیدا کرتے ہیں۔ لفظ 'مخلَص' صرف اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے کہ جس کو جو کچھ بھی ملے گا خدا ہی کے فضل و رحمت سے ملے گا، کسی دوسرے کے امکان میں یہ نہیں ہے کہ وہ کسی کو کچھ دے دلا سکے، جیسا کہ مشرکین نے گمان کر رکھا ہے۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ (۴۱)

'رزقِ معلوم' کا مفہوم

فرمایا کہ بے شک یہ لوگ ہیں جن کے لیے خدا کے ہاں معلوم و متعارف رزق ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے کھانے پینے کے اوقات کا پروگرام بھی ان کے منشا کے مطابق معین ہوگا اور جو چیزیں ان کے سامنے پیش کی جانے والی ہوں گی وہ بھی ان کی پسند اور ان کے انتخاب کے موافق ہوں گی۔ دوزخیوں کا حال

تو یہ ہوگا کہ دوزخ کے داروغے ان کے آگے، جب ان کے جی میں آئے گا، کچھ پھینک ماریں گے اور جو چیزیں بھی پھینکیں گے وہ بالکل اجنبی اور ایک سے ایک بڑھ کر بُری ہوں گی لیکن اہلِ جنت کے سامنے جو چیزیں بھی پیش کی جائیں گی ان کی طلب، ان کی پسند اور ان کے پروگرام کے مطابق پیش کی جائیں گی۔ وہ چیزیں ان کے لیے انجان نہیں ہوں گی کہ ان کو دیکھ کر انقباض یا وحشت ہو بلکہ ہر چیز جانی پہچانی ہوتی ہوگی البتہ معیار ہر چیز کا وہ ہوگا جو جنت اور اہلِ جنت کے لیے خاص ہوگا۔ كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوا هٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا (البقرۃ: ۲۵) (جب جب ان کے سامنے اس جنت کے پھلوں میں سے کچھ پیش کیا جائے گا وہ کہیں گے یہ تو وہی چیز ہمارے سامنے لائی گئی جو پہلے دی گئی اور وہ اس سے ملتی جلتی چیز دیے جائیں گے) اس آیت کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس مقام کو سمجھنے کے لیے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

فَوَاكِهُ ۖ وَهُمْ مُّكْرَمُونَ ۙ فِي جَنّٰتِ النَّعِيمِ ۙ عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِينَ (۴۲-۴۴)

یعنی ان کے سامنے میوے پیش کیے جائیں گے اور ان کے ساتھ نہایت اعزاز و اکرام کا معاملہ ہوگا۔ اہلِ دوزخ کے متعلق تو آیت ۱۸ میں گزر چکا ہے کہ نہایت ذلت کے ساتھ وہ دوزخ کے باڑے میں بھر دیے جائیں گے اور آگے آیات ۶۲-۶۷ میں آ رہا ہے کہ زقوم ان کو کھانے کے لیے اور کھولتا پانی پینے کو دیا جائے گا۔ اس کے برعکس اہلِ جنت کو کھانے کے لیے میوے ملیں گے اور ان کے ساتھ نہایت عزت کا سلوک ہوگا۔

'فِي جَنّٰتِ النَّعِيمِ' سے ان کے مستقل مستقر کا پتہ دے دیا کہ وہ نعمت کے باغوں میں ہوں گے اس وجہ سے ان کو تمام نعمتیں بھی جو وہ چاہیں گے اور جتنی چاہیں گے، حاصل ہوں گی۔

اہلِ جنت کی باہمی محبت و خوش دلی

'عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِينَ' سے ان کی باہمی محبت و خوش دلی کا اظہار ہو رہا ہے کہ وہ تختوں پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ یہ امر واضح رہے کہ جب دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف رنجش و کدورت ہو تو آدمی ایک دوسرے سے منہ پھیر کر بیٹھتا ہے۔ اہلِ جنت کے دل چونکہ ایک دوسرے سے بالکل صاف ہوں گے اس وجہ سے ایک دوسرے کی طرف رُخ کر کے بیٹھیں گے۔ اُوپر اہلِ دوزخ کی باہمی تو تکار کی تفصیل گزر چکی ہے۔ اس کے مقابل میں یہ اہلِ جنت کی تصویر پیش کی جا رہی ہے۔

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَأْسٍ مِّنْ مَّعِينٍ ۙ بَيْضَاءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِينَ ۚ لَا فِيهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُونَ (۴۵-۴۷)

اہلِ جنت کی شراب

'كَأْسٌ' عربی میں ظرف اور مظروف یعنی پیالہ اور شراب دونوں کے لیے آتا ہے۔ 'مَعِينٌ' خالص اور بے آمیز کو کہتے ہیں۔ سورۂ ملک آیت ۳۰ میں اس معنی کے لیے نظیر موجود ہے۔ 'غَوْلٌ' خفیہ طور پر ہلاک کرنے کے معنی میں آتا ہے اور یہیں سے یہ کسی مخفی ضرر کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ 'يُنْزَفُونَ'

نڈھال ہونے کے معنی میں بھی آتا ہے اور تعطّلِ عقل کے معنی میں بھی۔ یہاں یہ دونوں معنی بنتے ہیں۔ شراب کا ردِ عمل خمار، اعضاء شکنی اور شدید اضمحلال کی شکل میں بھی ظاہر ہوتا ہے اور تعطّلِ عقل کی صورت میں بھی، پہلی صورت جسمانی اذیت کی ہے اور دوسری صورت اخلاقی فساد کی۔ اہلِ جنت کی شراب ان دونوں آفتوں سے پاک ہوگی۔ آیات کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے لیے شراب خالص کے جام گردش میں ہوں گے۔ یہ شراب ہر غل وغش سے پاک، نہایت صاف شفاف اور پینے والوں کے لیے سراپا لذت وسرور ہوگی، اس میں نہ تو کوئی مخفی ضرر ہوگا اور نہ اس کے پینے سے عقل معطل ہوگی ـــــ یعنی اس میں وہ خوبیاں تو تمام ہوں گی جو اعلیٰ سے اعلیٰ شراب میں ہونی چاہئیں اور ساتھ ہی وہ ہر اس خرابی سے پاک ہوگی جو اس دنیا کی بہتر سے بہتر شراب میں بھی لازماً ہوتی ہیں۔

وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ۝ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ (۴۸-۴۹)

اہلِ جنت کی حوریں

انسان کی کوئی لذت وخوشی بھی عورت کے بغیر مکمل نہیں ہوتی اس وجہ سے جنت کی نعمتوں کے بعد یہ ان حوروں کا ذکر ہوا جو اہلِ جنت کو ملیں گی۔ جنت کے ذکر میں آپ نے دیکھا کہ عربوں کے خاص ذوق کا لحاظ ہے اس لیے کہ وہی قرآن کے مخاطبِ اول تھے اسی طرح حوروں کے ذکر میں بھی تشبیہ و تعریف کے وہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو شعرائے عرب کنواریوں اور نازنینوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ 'قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ' کے اصل معنی ہیں نگاہیں نیچی رکھنے والیاں۔ یہ ان کے باحیا ہونے کی تعبیر ہے۔ اہلِ عرب عورت کا سب سے بڑا حسن اس کی حیا کو قرار دیتے تھے۔ 'عِیْن' جمع ہے 'اعین' کی یعنی وہ بڑی آنکھوں والیاں غزال چشم ہوں گی۔

'وَكَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ'۔ 'بیض مکنون' سے شتر مرغ کے انڈے مراد ہیں۔ کلامِ عرب میں نازنینوں کی تشبیہ شتر مرغ کے انڈوں سے بکثرت ملتی ہے اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس تشبیہ میں عفت، صیانت اور رنگ تینوں چیزوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ 'مکنون' سے ان کے اچھوتے ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جس طرح اہلِ عرب کنواریوں کی حفاظت میں بڑے غیور رہا کرتے تھے اسی طرح شتر مرغ بھی اپنے انڈوں کی حفاظت میں جان لڑا دیتا ہے۔ تشبیہ میں یہاں سنہرے رنگ کے انڈے مراد ہیں۔ نازنینوں کے سنہرے رنگ کا شعرائے عرب بہت ذکر کرتے ہیں۔ 'معشوقہ' کے لیے 'صفراء' کی صفت ان کے ہاں بہت معروف ہے۔ میں ان تمام باتوں کی تائید میں کلامِ عرب کے حوالے پیش کر سکتا ہوں لیکن غیر ضروری طوالت سے بچنا چاہتا ہوں۔

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ (۵۰)

اہلِ جنت کا ایک مکالمہ

اب آگے آیت ۶۱ تک اہلِ جنت کے ایک باہمی مکالمے کا حوالہ ہے جو اس وقت ان کے مابین ہوگا جب وہ تختوں پر ٹیک لگائے جنت میں بیٹھے ہوں گے۔ اس دنیا میں حق کی خاطر مزاحمتوں کا

مقابلہ کرنے میں انھوں نے جو کامیابیاں حاصل کی ہوں گی ان پر ان کو جو خوشی ہوگی اس کا بھی اس مکالمہ سے اندازہ ہوتا ہے اور اس بے خودی کا بھی جو اس تصور سے ان پر طاری ہوگی کہ اب موت، اور عذاب کے اندیشوں سے ان کو ہمیشہ کے لیے رہائی حاصل ہوگئی۔

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّیْ کَانَ لِیْ قَرِیْنٌ ۙ یَّقُوْلُ اَئِنَّکَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِیْنَ ۝ ءَاِذَا مِتْنَا وَ
کُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِیْنُوْنَ ۝ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ۝ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ ۝
قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ کِدْتَّ لَتُرْدِیْنِ ۙ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّیْ لَکُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِیْنَ ۝ اَفَمَا نَحْنُ بِمَیِّتِیْنَ ۙ
اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰی وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ۝ (۵۱ - ۵۹)

اصحابِ جنت میں سے ایک صاحب اپنے پاس بیٹھے ہوئے دوسرے ساتھیوں کو اپنے ماضی کی ایک سرگزشت سنائیں گے کہ میرا ایک ملنے والا تھا جو بڑے تعجب سے مجھ سے سوال کیا کرتا تھا کہ کیا تم بھی ان لوگوں میں سے ہو جو قیامت کو مانتے ہیں! کیا تمھاری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ جب ہم مر کر مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو اپنے اعمال کی جزا و سزا بھگتنے کے لیے دوبارہ اٹھائے جائیں گے!!

قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ: اس کے بعد وہ ساتھیوں سے کہیں گے ذرا دیکھو تو سہی اس کا کیا بنا! یہ اسلوبِ کلام، عربی میں کسی کو کسی کام پر ابھارنے کے لیے آتا ہے جس طرح ہم کہتے ہیں 'ذرا معلوم تو کرو بھلا! ذرا جھانک کے دیکھو تو سہی!' مطلب یہ کہ جس جزا کے دن کو وہ اتنا مستبعد سمجھتا تھا کہ اس کے خلاف روز مجھ سے لڑتا تھا وہ دن آ گیا، اب ذرا اس کا پتہ کرو کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے!

فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ: یہ کہتے ہوئے وہ خود ہی جھانک کے دیکھیں گے۔ تو وہ ان کو جہنم کے بیچ میں نظر آئے گا۔ 'سَوَآء' کے معنی وسط کے ہیں ـــــ اس سے اہلِ جنت کی قوتوں اور صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے تخت پر بیٹھے بیٹھے جس شخص کو چاہیں گے دیکھ لیں گے اگرچہ وہ کتنا ہی دور ہو اور اس سے بات بھی کر لیں گے۔

قَالَ تَاللّٰهِ ..... لَکُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِیْنَ: اس کے بعد وہ اس کو لتاڑیں گے کہ ظالم تو مجھے بھی لے ڈوبا تھا! یہ تو اللہ کا فضل ہوا کہ تمھارے فریب سے میں محفوظ رہا۔ ورنہ آج جس طرح تم اس عذاب میں گرفتار ہو اسی طرح میں بھی گرفتار ہوتا!!

اَفَمَا نَحْنُ بِمَیِّتِیْنَ ..... وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ: اس کا یہ انجام اور اپنی یہ کامیابی دیکھ کر گویا وہ خوشی سے اچھل پڑیں گے اور اپنے ساتھیوں سے کہیں گے، کیا یہ واقعہ ہے کہ اب ہم موت کے پنجے سے ہمیشہ کے لیے محفوظ اور عذاب کے اندیشہ سے ہمیشہ کے لیے نچنت ہو گئے!! مطلب یہ ہے کہ اگر یہ بازی ہم نے جیت لی تو سب سے بڑی بازی جیت لی۔ اسلوبِ کلام پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کی کامیابی ان کی توقعات سے اتنی زیادہ ہوگی کہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی انھیں اپنے اوپر اعتبار نہیں ہوگا اور وہ اپنے ساتھیوں

سے اس کی تصدیق چاہیں گے۔

إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ لِمِثْلِ هَٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ (۶۰-۶۱)

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی بات پر استدراک ہے کہ اصل کامیابی یہ ہے جو اللہ کے ان بندوں کو حاصل ہوگی جو آخرت کو پیشِ نظر رکھ کر زندگی گزاریں گے تو جس کو بازی کھیلنی ہو اس کے لیے بازی کھیلے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ رات دن دنیا کے عشق ہی میں سرگرم ہیں اگر انھوں نے کوئی کامیابی حاصل بھی کرلی تو کتنے دنوں کے لیے، بالآخر تو مرنا اور ایک دن جزا و سزا کے لیے خدا کے حضور پیش ہونا ہے تو اس حیاتِ چند روزہ کی خاطر اپنی تمام مساعی برباد کرنے کے بجائے ابدی کامیابی کے لیے کمر ہمت کیوں نہ باندھیں!

أَذَٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا أَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّومِ ۝ إِنَّا جَعَلْنَاهَا فِتْنَةً لِّلظَّالِمِينَ ۝ إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ ۝ طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيَاطِينِ ۝ فَإِنَّهُمْ لَآكِلُونَ مِنْهَا فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ ۝ ثُمَّ إِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيمٍ (۶۲-۶۷)

اہلِ دوزخ کا حشر

اہلِ جنت کے بعد اب یہ اہلِ دوزخ کی ضیافت کا بیان ہے۔ اس کا آغاز اس سوال سے کیا ہے کہ اہلِ جنت کو جو کچھ حاصل ہوگا اس کا ذکر تو سن چکے اب یہ بتاؤ کہ یہ ضیافت بہتر ہے یا زقوم والی ضیافت جس سے اہلِ دوزخ کو سابقہ پیش آنا ہے!

إِنَّا جَعَلْنَاهَا الآیۃ: فرمایا کہ اس درخت کو ان ظالموں کے لیے ہم نے ایک فتنہ بنایا ہے جس کی آڑ لے کر انھوں نے دوزخ کا خوب خوب مذاق اڑایا ہے۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جب ان کو قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ دوزخ میں ان کو کھانے کو زقوم ملے گا تو انھوں نے اس سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے اس پر فقرے چست کیے کہ خوب ہے یہ دوزخ کہ اس میں آگ بھی ہوگی، درخت بھی ہوں گے اور پانی بھی! فرمایا کہ یہ درخت ان کے لیے فتنہ بن گیا اور اس کے پردے میں انھوں نے ایک ایسی حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش کی جس سے بہر حال انھیں سابقہ پیش آنا ہے۔

إِنَّهَا شَجَرَةٌ الآیۃ: فرمایا کہ ان کو تعجب ہے کہ آگ میں درخت کس طرح ہوگا! اور اس درخت کی فطرت یہ ہے کہ اس کے اُگنے کا اصلی علاقہ قعرِ دوزخ ہی ہے یہ اسی میں پھلتا پھولتا ہے۔

ایک بلیغ تشبیہ

طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيَاطِينِ: یہ تشبیہ نہایت بلیغ ہے۔ بعض مرتبہ تشبیہ کسی خیالی چیز سے دی جاتی ہے لیکن وہ مرئی و شاہد چیزوں سے زیادہ ذہنوں سے قریب ہوتی ہے۔ مثلاً آپ کسی پراگندہ حال و پراگندہ بال شخص کو کہیں کہ کیا بھوت کی سی شکل بنا رکھی ہے! بھوت اگرچہ ایک خیالی چیز ہے لیکن اس کا ایک تصور ہر شخص کے ذہن میں موجود ہے اس وجہ سے یہ تشبیہ اس شخص کو جس خوبی کے ساتھ مصوّر کرے گی کوئی دوسری تشبیہ مشکل ہی سے کرسکے گی۔ اسی طرح یہاں دوزخ کے زقوم کے پتوں اور کانٹوں کو شیاطین کے سروں سے تشبیہ دی ہے، گویا بہت سے شیاطین ننگے سر کھڑے ہوں۔ ہر چند یہ تشبیہ ہے

خیالی لیکن ذہنوں میں شیاطین کا ایک خوفناک تصور موجود ہے اس وجہ سے اس کو سن کر دل پر ایک کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

'فَإِنَّهُمْ لَآكِلُونَ .... مِنْ حَمِيمٍ' فرمایا کہ یہ زقوم ان کی غذا بنے گا اور یہ اس کے کھانے پر اس طرح مضطر ہوں گے کہ اسی سے اپنے پیٹ بھریں گے۔ اور پھر اس کو حلق سے اتارنے اور ہضم کرنے کے لیے اس کے اوپر سے کھولتا ہوا پانی پئیں گے۔

ثُمَّ إِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَإِلَى الْجَحِيمِ (۶۸)

یہ زقوم اہلِ دوزخ کو بطور 'نُزُل' کے ملے گا جیسا کہ آیت ۶۲ میں تصریح ہے۔ 'نُزُل' اس چیز کو کہتے ہیں جو اولین ضیافت کے طور پر مہمان کے سامنے پیش کی جائے۔ فرمایا کہ ان کی اولین ضیافت تو اس زقوم اور کھولتے پانی سے ہوگی۔ پھر اس کے بعد ان کا اصل ٹھکانا جہنم بنے گی جہاں ان کے سارے اعمال کے نتائج ان کے سامنے آئیں گے۔

إِنَّهُمْ أَلْفَوْا آبَاءَهُمْ ضَالِّينَ ۝ فَهُمْ عَلَىٰ آثَارِهِمْ يُهْرَعُونَ (۶۹-۷۰)

گمراہی کی اصل علت

یہ ان کی تمام گمراہی کی اصل علت کا پتہ دیا ہے کہ انھوں نے اپنی عقل و بصیرت سے کام نہیں لیا بلکہ آنکھیں بند کر کے اپنے باپ دادا کے طریقہ کی پیروی کی۔ ان کے باپ دادا گمراہ تھے، انہی کی گمراہی انھوں نے اختیار کر لی اور جب اللہ کے رسولوں نے ان کو عقل سے کام لینے اور حق و باطل میں امتیاز کرنے کی دعوت دی تو انھوں نے نہایت غرور سے یہ کہہ کے ان کی دعوت رد کر دی کہ بھلا ایک خبطی شاعر کے کہنے سے ہم اپنے ان معبودوں کو چھوڑ دیں گے جن کی پوجا ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں! اس سے معلوم ہوا کہ اندھی تقلید گمراہی کے سب سے بڑے عوامل میں سے ہے۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ انسان کی عقل اور اس کے ارادہ کا امتحان کر رہا ہے اس وجہ سے جو شخص اپنی عقل اور اپنے ارادے کو معطل رکھے گا وہ خدا کے امتحان میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ أَكْثَرُ الْأَوَّلِينَ ۝ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا فِيهِم مُّنذِرِينَ ۝ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنذَرِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ (۷۱-۷۴)

'قَبْلَهُمْ' میں ضمیر کا مرجع قریش ہیں۔ اب یہاں سے کلام کا رخ تاریخی دلائل کی طرف مڑ رہا ہے۔ فرمایا کہ جس طرح کی گمراہی میں یہ (قریش) مبتلا ہیں اسی طرح کی گمراہی میں ان سے پہلے اکثر قومیں مبتلا ہو کر کیفرِ کردار کو پہنچ چکی ہیں۔ یہ اشارہ ان قوموں کی طرف ہے جن کا ذکر تفصیل سے پچھلی سورتوں میں گزر چکا ہے اور وہ اس سورہ میں بھی آگے آ رہا ہے۔ فرمایا کہ ان کی اصلاح کے لیے ہم نے ان کے اندر اپنے مُنذر بھیجے کہ وہ ان کی غلط روش کے انجام سے ان کو آگاہ کر دیں لیکن انھوں نے انہی کی طرح باپ دادا کی تقلید

کے جنون میں ان منذروں کی بات رد کردی بالآخران کے سامنے وہی انجام آیا جو انذار کے بعد لازماً ہر قوم کے سامنے آتا ہے۔ صرف اللہ کے وہی بندے اس سے محفوظ رہے جن کو اللہ نے اپنی رحمت کے لیے خاص کرلیا —— مطلب یہ ہے کہ یہی کچھ ان کے سامنے بھی آنے والا ہے تو تم صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ اور ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔

۴۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۷۵۔۱۴۸

آگے اختصار کے ساتھ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت اسمٰعیل، حضرت اسحاق، حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت الیاس، حضرت لوط اور حضرت یونس علیہم السلام کی سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں اور ہر سرگزشت کے آخر میں اس مضمون کی ترجیع ہے کہ اللہ نے اپنے پیغمبر کو رحمت و سلامتی سے نوازا، اس کی دعوت کو فروغ بخشا اور اپنے خوب کار بندوں کو اللہ تعالیٰ ہمیشہ اسی طرح صلہ دیتا ہے۔ یہی ترجیع درحقیقت ان سرگزشتوں کا لب لباب ہے۔

پیغمبروں کے ذکر میں ترتیب حضرت ہارون علیہ السلام تک تو تاریخی ہے اس کے بعد ترتیب صفاتی ہو گئی ہے۔ اس کی وضاحت آیات کی تفسیر کے ذیل میں آئے گی۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۷۵ تا ۱۴۸ وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ
مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ﴿۷۷﴾ وَتَرَكْنَا
عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۷۸﴾ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۹﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ
نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۱﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا
وقف لازم الْاٰخَرِيْنَ ﴿۸۲﴾ وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ﴿۸۳﴾ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ
سَلِيْمٍ ﴿۸۴﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۸۵﴾ اَئِفْكًا اٰلِهَةً
دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ﴿۸۶﴾ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَنَظَرَ
نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ ﴿۸۸﴾ فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴿۸۹﴾ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ﴿۹۰﴾
فَرَاغَ اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۹۱﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ فَرَاغَ
عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ ﴿۹۳﴾ فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ﴿۹۴﴾ قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ

مَا تَنْحِتُونَ ﴿٩٥﴾ وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ﴿٩٦﴾ قَالُوا ابْنُوا لَهُ
بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ﴿٩٧﴾ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ
الْأَسْفَلِينَ ﴿٩٨﴾ وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿٩٩﴾ رَبِّ هَبْ لِي
مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿١٠٠﴾ فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ ﴿١٠١﴾ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ
قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرَىٰ
قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ﴿١٠٢﴾
فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ﴿١٠٣﴾ وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ ﴿١٠٤﴾ قَدْ
صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿١٠٥﴾ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ
الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ﴿١٠٦﴾ وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ﴿١٠٧﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي
الْآخِرِينَ ﴿١٠٨﴾ سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ﴿١٠٩﴾ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿١١٠﴾
إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿١١١﴾ وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِنَ
الصَّالِحِينَ ﴿١١٢﴾ وَبَارَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلَىٰ إِسْحَاقَ ۚ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَ
ع ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ مُبِينٌ ﴿١١٣﴾ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿١١٤﴾ وَ
نَجَّيْنَاهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ ﴿١١٥﴾ وَنَصَرْنَاهُمْ فَكَانُوا هُمُ
الْغَالِبِينَ ﴿١١٦﴾ وَآتَيْنَاهُمَا الْكِتَابَ الْمُسْتَبِينَ ﴿١١٧﴾ وَهَدَيْنَاهُمَا الصِّرَاطَ
الْمُسْتَقِيمَ ﴿١١٨﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْآخِرِينَ ﴿١١٩﴾ سَلَامٌ عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿١٢٠﴾
إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿١٢١﴾ إِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٢٢﴾
وَإِنَّ إِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٢٣﴾ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٢٤﴾
أَتَدْعُونَ بَعْلًا وَتَذَرُونَ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ ﴿١٢٥﴾ اللَّهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ

أَبَآئِكُمُ الْأَوَّلِينَ ﴿١٢٦﴾ فَكَذَّبُوهُ فَإِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ ﴿١٢٧﴾ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ
الْمُخْلَصِينَ ﴿١٢٨﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ﴿١٢٩﴾ سَلَامٌ عَلَىٰ إِلْ يَاسِينَ ﴿١٣٠﴾
إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿١٣١﴾ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٣٢﴾ وَ
إِنَّ لُوطًا لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٣٣﴾ إِذْ نَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ أَجْمَعِينَ ﴿١٣٤﴾ إِلَّا
عَجُوزًا فِي الْغَابِرِينَ ﴿١٣٥﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْآخَرِينَ ﴿١٣٦﴾ وَإِنَّكُمْ لَتَمُرُّونَ
عَلَيْهِمْ مُصْبِحِينَ ﴿١٣٧﴾ وَبِاللَّيْلِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٣٨﴾ وَإِنَّ يُونُسَ لَمِنَ ع ۴ ۲۵ ۸
الْمُرْسَلِينَ ﴿١٣٩﴾ إِذْ أَبَقَ إِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ ﴿١٤٠﴾ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ
الْمُدْحَضِينَ ﴿١٤١﴾ فَالْتَقَمَهُ الْحُوتُ وَهُوَ مُلِيمٌ ﴿١٤٢﴾ فَلَوْلَا أَنَّهُ كَانَ
مِنَ الْمُسَبِّحِينَ ﴿١٤٣﴾ لَلَبِثَ فِي بَطْنِهِ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿١٤٤﴾ فَنَبَذْنَاهُ النصف
بِالْعَرَاءِ وَهُوَ سَقِيمٌ ﴿١٤٥﴾ وَأَنْبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِنْ يَقْطِينٍ ﴿١٤٦﴾ وَ
أَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ مِائَةِ أَلْفٍ أَوْ يَزِيدُونَ ﴿١٤٧﴾ فَآمَنُوا فَمَتَّعْنَاهُمْ
إِلَىٰ حِينٍ ﴿١٤٨﴾

ترجمہ آیات ۷۵-۱۴۸

اور نوح نے ہم سے فریاد کی پس کیا ہی خوب ہیں ہم فریاد سننے والے! اور ہم نے اس کو اور اس کے لوگوں کو بہت بڑی کلفت سے نجات دی اور ہم نے اس کی ذرّیّت ہی کو باقی رہنے والا بنایا اور ہم نے اس کے طریقہ پر پچھلوں میں ایک گروہ کو چھوڑا۔ نوح پر سلامتی ہے دنیا والوں میں! ہم خوب کاروں کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں۔ بے شک وہ ہمارے باایمان بندوں میں سے تھا۔ پھر ہم نے اوروں کو غرق کر دیا۔ ۷۵-۸۲

اور اسی کی جماعت میں سے ابراہیم بھی تھا۔ جب کہ وہ حاضر ہوا اپنے رب کے حضور میں

قلبِ سلیم کے ساتھ۔ جب کہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ بھلا تم لوگ کس چیز کو پوجتے ہو! کیا اللہ کے سوا دوسرے من گھڑت معبودوں کے طالب ہو! تو خداوندِ عالم کے باب میں تمہارا کیا گمان ہے! پس اس نے ایک نظر ستاروں پر ڈالی۔ پس کہا، میں تو ماندہ ہو رہا ہوں۔ پس وہ لوگ اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔ پس وہ نظر بچا کے ان کے دیوتاؤں کی طرف گیا۔ بولا، آپ لوگ نوش نہیں کرتے! کیا بات ہے کچھ بولتے نہیں! پھر مارا ان کو بھرپور ہاتھ۔ پس لوگ آئے اس کی طرف بھاگے ہوئے۔ اس نے کہا، کیا تم لوگ اپنے ہی ہاتھوں کی گھڑی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو! اللہ ہی نے پیدا کیا ہے تم کو بھی اور ان چیزوں کو بھی جن کو تم بناتے ہو۔ انھوں نے کہا، اس کے لیے ایک مکان بناؤ پس اس کو آگ میں جھونک دو۔ پس انھوں نے اس کے ساتھ چال کرنی چاہی تو ہم نے انہی کو نیچا دکھایا۔ اور اس نے کہا، میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں۔ وہ میری رہنمائی فرمائے گا۔ اے میرے رب، مجھے اولادِ صالح عطا فرما۔ تو ہم نے اس کو ایک بُردبار فرزند کی بشارت دی۔ ۸۳ - ۱۰۱

پس جب وہ اس کے ساتھ چلنے پھرنے کی عمر کو پہنچا اس نے کہا، اے میرے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ تو غور کر لو تمہاری کیا رائے ہے! اس نے جواب دیا کہ اے میرے باپ، آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے اس کی تعمیل کیجیے۔ آپ ان شاء اللہ مجھے ثابت قدموں میں پائیں گے۔ پس جب دونوں نے اپنے تئیں اپنے رب کے حوالے کر دیا اور ابراہیم نے اس کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا اور ہم نے اس کو آواز دی، اے ابراہیم بس تم نے خواب کو سچ کر دکھایا! بے شک ہم خوب کاروں کو اسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں۔ بیشک یہ کھلا ہوا امتحان تھا اور ہم نے اس کو ایک عظیم قربانی کے عوض چھڑا لیا۔ اور ہم نے اس کی ملت

پر پچھلوں میں ایک گروہ کو چھوڑا۔ سلامتی ہو ابراہیم پر! اسی طرح ہم خوب کاروں کو صلہ دیتے ہیں۔ بے شک وہ ہمارے باایمان بندوں میں سے تھا۔ اور ہم نے اس کو اسحاق کی خوشخبری دی، ایک نبی کی زمرۂ صالحین میں سے۔ اور ہم نے اس پر بھی اور اسحاق پر بھی برکتیں نازل کیں اور ان کی ذریت میں سے خوب کار بھی ہیں اور اپنی جانوں پر کھلے ہوئے ظلم ڈھانے والے بھی۔ ۱۰۲ - ۱۱۳

اور ہم نے موسیٰ اور ہارون پر اپنا فضل کیا۔ اور ان کو اور ان کی قوم کو ایک عظیم مصیبت سے نجات دی۔ اور ہم نے ان کی مدد کی تو وہی غالب آنے والے بنے۔ اور ہم نے ان کو روشن کتاب عطا فرمائی۔ اور ان کو صراطِ مستقیم کی ہدایت بخشی۔ اور ہم نے ان کے طریقہ پر پیچھے والوں میں ایک گروہ کو چھوڑا۔ سلامتی ہو موسیٰ اور ہارون پر۔ ہم خوب کاروں کو اسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں۔ بے شک وہ دونوں ہمارے باایمان بندوں میں سے تھے۔ ۱۱۴ - ۱۲۲

اور الیاس بھی پیغمبروں میں سے تھا۔ جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا، کیا تم لوگ ڈرتے نہیں! کیا تم لوگ بعل کو پکارتے ہو اور بہترین خالق کو چھوڑتے ہو! ——— اللہ کو جو تمہارا بھی خداوند ہے اور تمہارے اگلے باپ دادوں کا بھی! تو انھوں نے اس کو جھٹلا دیا تو بے شک وہ گرفتار ہونے والوں میں سے ہوں گے۔ اللہ کے خاص بندے محفوظ رہیں گے ور ہم نے اس کے طریقہ پر پچھلوں میں ایک گروہ کو چھوڑا۔ اِلیاسیوں پر سلامتی ہو! ہم اسی طرح صلہ دیتے ہیں خوب کاروں کو۔ بے شک وہ ہمارے باایمان بندوں میں سے تھا۔ ۱۲۳-۱۳۲

اور بے شک لوط بھی پیغمبروں میں سے تھا۔ جب کہ ہم نے اس کو اور اس کے لوگوں کو، سب کو نجات دی بجز ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے بنی۔ پھر ہم نے اوروں

کو ہلاک کر دیا۔ اور تم ان کی بستیوں پر گزرتے ہو صبح کو بھی اور شب میں بھی، تو کیا تم سمجھتے نہیں! ۱۳۳۔۱۳۸

اور بے شک یونس بھی پیغمبروں میں سے تھا۔ یاد کرو جب کہ وہ بھاگا ایک بھری کشتی کی طرف۔ پس قُرعہ ڈالا پس وہ دھکیلا گیا پس اس کو نگل لیا مچھلی نے اور وہ سزاوارِ ملامت تھا۔ پس اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا تو لوگوں کے اٹھائے جانے کے دن تک اس کے پیٹ ہی میں پڑا رہ جاتا۔ پس ہم نے ڈال دیا اس کو خشک زمین پر اور وہ نڈھال تھا اور اس پر ایک درخت بیل والا اُگا دیا۔ اور اس کو رسول بنا کر بھیجا ایک لاکھ بلکہ اس سے زیادہ کی طرف پس وہ لوگ ایمان لائے تو ہم نے ایک مدت تک ان کو کھانے برتنے کی مہلت دی۔ ۱۳۹۔۱۴۸

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيبُونَ ۝ وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ (۷۵-۷۶)

حضرت نوح کی فریاد اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب

یہ حضرت نوح علیہ السلام کی اس فریاد کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے اپنے رب کے سامنے اس وقت کی ہے جب وہ ایک طویل مدت تک اپنی قوم کو دعوت دینے کے بعد اس کے ایمان سے کلیۃً مایوس ہو گئے ہیں اور جس کا ذکر سورۂ شعراء آیات ۱۱۷، ۱۱۸ میں گزر چکا ہے۔ سورۂ نوح میں ان کی یہ فریاد تفصیل سے نقل ہوئی ہے، جس کے آخری الفاظ یہ ہیں۔

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِينَ دَيَّارًا ۝ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (۲۶-۲۷)

اور نوح نے اپنے رب سے دعا کی، اے میرے رب! زمین پر تو کافروں میں سے کسی کو چلتا پھرتا نہ چھوڑ۔ اگر تو ان کو چھوڑے رکھے گا تو وہ صرف نابکاروں اور ناشکروں ہی کو جنم دیں گے۔

یہ فریاد حضرت نوح علیہ السلام نے اس وقت کی جب وہ اپنی طاقت کا آخری قطرہ بھی نچوڑ چکے تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی فریاد فوراً سنی۔ چنانچہ ان لوگوں کے سوا جو حضرت نوحؑ پر ایمان لائے تھے بقیہ سارے لوگ غرق کر دیے گئے۔ سورۂ نوح میں ان کی قوم کے نابکاروں کا انجام ان الفاظ میں بیان ہوا ہے،

مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا (نوح: ۲۵)

وہ اپنے جرائم کی پاداش میں غرق کر دیے گئے، پھر آگ میں داخل کیے گئے اور انھوں نے اللہ کے مقابل میں اپنے لیے کوئی مددگار نہیں پایا۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو تسلی دی گئی ہے کہ صبر کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ تمھاری دعاؤں اور جاں فشانیوں سے بے خبر نہیں ہے۔ جب قوم پر حجت تمام ہو جائے گی تو تم دیکھ لو گے کہ اللہ کی نصرت کس طرح ظاہر ہوتی ہے اور تمھارے دشمن کس طرح نامراد و پامال ہوتے ہیں۔

وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۚ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ (۷۶-۷۷)

فرمایا کہ ہم نے نوحؑ اور اس کے ساتھیوں کو اس عظیم آفت سے محفوظ رکھا جس میں نوحؑ کی پوری قوم مبتلا ہوئی۔ 'اھل' سے مراد ان کے تمام باایمان اہل و عیال ہیں اگرچہ اس لفظ کا اطلاق، جیسا کہ اس کے محل میں ہم وضاحت کر چکے ہیں، کسی شخص کے اتباع پر بھی ہوتا ہے لیکن حضرت نوح علیہ السلام پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ذریت ہی کے کچھ لوگ ایمان لائے اور وہی لوگ باقی رہنے والے بنے جن سے از سرِ نو یہ دنیا آباد ہوئی۔ باقی سارے لوگ اپنی سرکشی کی پاداش میں غرق کر دیے گئے۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ (۷۸)

دعوت کے فروغ کی بشارت

اس ٹکڑے میں ایک مضاف اور 'تَرَكْنَا' کا مفعول عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق محذوف ہیں۔ یہ محذوفات کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ ہم نے اس کی ملت پر پچھلوں میں سے ایک گروہ کو قائم رکھا۔ یہ ان کی دعوت کی کامیابی کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے دشمنوں کی تمام مخالفت کے علی الرغم اللہ تعالیٰ نے ان کی دعوت کو فروغ دیا، اخلاف میں ان کے حاملین پیدا ہوئے اور ان کے دشمن نیست و نابود ہوئے۔ اس میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بشارت ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھاری دعوت کو فروغ دے گا، آنے والی نسلوں میں یہ قائم و دائم رہے گی اور جو لوگ آج تمھاری مخالفت میں سرگرم ہیں ان کا کوئی نام لینے والا بھی باقی نہیں رہے گا۔

سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ (۷۹-۸۲)

یہ حضرت نوح علیہ السلام کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحسین و آفرین اور دنیا و آخرت دونوں میں برکت و سلامتی کی بشارت ہے کہ اس دنیا میں جو مقام اس کو حاصل ہوا وہ اس سے پہلے کسی کو حاصل نہیں ہوا۔ تمام خلق میں یہ بازی اسی نے جیتی۔

خوب کار بندوں کے لیے ابدی بشارت

'اِنَّا كَذٰلِكَ ...... الآیۃ' یہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ یہ معاملہ صرف حضرت نوح علیہ السلام ہی

کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خوب کار بندوں کے ساتھ ہمیشہ یہی معاملہ کیا ہے اور آئندہ بھی وہ اپنے مخلص بندوں کے ساتھ یہی کرے گا۔ یہ فضیلت کسی ذات کے ساتھ نہیں بلکہ صفات کے ساتھ مخصوص ہے۔ جو لوگ اپنے اندر 'احسان' کی صفت پیدا کریں گے اللہ تعالیٰ ان کو اسی طرح صلہ دے گا۔ لفظ 'احسان' کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ اس کی اصل حقیقت پورے اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری ہے۔

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ: یہاں لفظ 'مومن' اپنے کامل معنی میں ہے۔ یہ فقرہ بھی حضرت نوحؑ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحسین و آفرین کے مفہوم میں ہے کہ بے شک وہ ہمارے راسخ الایمان بندوں میں سے تھا۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایمان کا دعویٰ اور اس کی دعوت لے کر اٹھتے ہیں ان کو اپنے سامنے یہ اسوہ رکھنا چاہیے۔ ایمان کا حقیقی تقاضا یہی ہے۔ جو لوگ اس طرح ایمان کا حق ادا کرتے ہیں وہی لوگ مرتبۂ احسان پر فائز ہوتے ہیں اور انہی کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ فضیلت ہے جو نوحؑ کو حاصل ہوئی۔

ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ: یعنی اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو چھانٹ لیا جن کے اندر صلاحیت تھی، باقی سارے لوگوں کو غرق کر دیا۔ یہی اس دنیا کی خلقت کی غایت ہے۔ اس کے اندر سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو چھانٹ لے گا جو اپنے اندر صلاحیت کا ثبوت دیں گے۔ باقی سارے لوگوں کو خس و خاشاک کی طرح جہنم میں جھونک دے گا۔

وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ (۸۳)

حضرت ابراہیمؑ اور ان کی دعوت

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد سب سے زیادہ جلیل القدر نبی و رسول حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ ان کی نسبت فرمایا کہ یہ بھی انہی کے زمرہ اور گروہ میں سے ہیں۔ جو دعوت خلق کو انھوں نے دی وہی دعوت انھوں نے بھی دی اور اللہ کی راہ میں جس ایمان و احسان کا مظاہرہ انھوں نے کیا اسی صدق و اخلاص کا مظاہرہ انھوں نے بھی کیا۔ اوپر آیت ۷۸ میں یہ بات جو فرمائی ہے کہ نوحؑ کی ملت پر ہم نے پچھلوں میں سے ایک گروہ کو قائم رکھا یہ اسی کے تسلسل کی طرف اشارہ ہے کہ جس ملت کے داعی حضرت نوحؑ تھے اسی ملت کے داعی بن کر حضرت ابراہیم علیہ السلام اٹھے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ تمام انبیاء کی ملت اصلاً ایک ہی ہے اور وہ ہے ملتِ اسلام۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث اس کے محل میں گزر چکی ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ تالمود سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تربیت حضرت نوح علیہ السلام نے فرمائی ہے۔ اگرچہ اس روایت پر میں مطمئن نہیں ہوں لیکن اس کی صحت اگر باور کر لی جائے تو حضرت ابراہیمؑ کے حضرت نوحؑ کے زمرے میں سے ہونے کا ایک اور پہلو بھی نکل آتا ہے۔

اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (۸۴)

حضرت ابراہیمؑ کی کامل حنیفیت

یہ تعبیر ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کامل حنیفیت، اللہ کی طرف ان کی پوری یکسوئی اور ان کے کمال صدق و اخلاص کی۔ 'قلب سلیم' سے مراد وہ دل ہے جو شرک و نفاق کے امراض سے بالکل محفوظ و پاک ہو۔ سورۂ شعراء میں ہے: یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (۸۸-۸۹) (اس دن کو یاد رکھو جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد، صرف وہ لوگ فیروز مند ہوں گے جو خدا کے حضور میں قلب سلیم لے کر حاضر ہوں گے) یعنی نہ تو ان کے دلوں کے اندر شرک و نفاق کا کوئی روگ ہوگا اور نہ ان کی وفاداری منقسم ہوگی بلکہ ان کے دل ہر آلائش سے پاک ہوں گے اور ان کی محبت و اطاعت تمام تر اللہ واحد کے لیے ہوگی۔

اِذْ قَالَ لِاَبِیْہِ وَقَوْمِہٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ۝ اَئِفْکًا اٰلِـھَۃً دُوْنَ اللّٰہِ تُرِیْدُوْنَ (۸۵-۸۶)

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حنیفیت اور ان کے کمال اخلاص و توحید کے بیان کے لیے ان کی اس دعوت کا حوالہ ہے جو انھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کو دی۔

'مَاذَا تَعْبُدُوْنَ' کے الفاظ تحقیر پر دلیل ہیں۔ یعنی انھوں نے ان کو ملامت فرمائی کہ بھلا یہ کیا بے حقیقت چیزیں ہیں جن کو تم لوگ پوج رہے ہو!

'اِفْک' کے معنی جھوٹ اور بے حقیقت بات کے ہیں۔ یعنی کیا محض جھوٹ موٹ، اپنے جی سے گھڑ کر، خدا کے سوا تم دوسرے معبودوں کے طالب بنے ہو!

فَمَا ظَنُّکُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۸۷)

یہ جملہ الفاظ کے لحاظ سے جتنا مختصر ہے معانی کے اعتبار سے اتنا ہی وسیع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم خدا کے سوا دوسرے معبودوں کے طالب بنے ہو تو خدائے رب العالمین کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟ کیا تم اس بدگمانی میں مبتلا ہو کہ یہ تنہا تمھاری ضروریات کی کفالت اور تمھاری حفاظت سے قاصر ہے؟ کیا وہ اکیلا اس دنیا کے انتظام سے عاجز ہے اس وجہ سے تم نے اس کے لیے مددگار تلاش کیے ہیں؟ کیا تم اس وہم میں مبتلا ہو کہ وہ اس دنیا کے ہر گوشے اور ہر فرد کے حالات سے باخبر نہیں ہو سکتا اس وجہ سے اس کو باخبر کرنے کے لیے دوسرے وسائل و وسایط کی ضرورت ہے؟ کیا تم اس کے عدل و رحم سے مایوس ہو کہ اس کی رحمت حاصل کرنے کے لیے تم نے اپنے جی سے اس کے دربار کے لیے سفارشی ٹھہرائے ہیں؟ مطلب یہ ہوا کہ جب تک خدا کے بارے میں اس قسم کی کوئی بدگمانی کسی کو نہ ہو اس وقت تک وہ اس کے سوا کسی کو اپنا معبود بنانے کا ننگ گوارا نہ کرے گا! اور اگر کوئی شخص اپنے رب سے اس قسم کا کوئی سوءِ ظن رکھتا ہے تو اسے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ العیاذ باللہ خدا کوئی بے حمیت و بے غیرت ہستی نہیں ہے کہ وہ اپنی ذات اور اپنی مملکت میں ہر ایک کی شرکت و مداخلت گوارا کرے بلکہ وہ عزیز و جبار اور غیور و متکبر ہے اس وجہ سے وہ ایسے تمام لوگوں کو جہنم میں جھونک دے گا جو اس کی خدائی میں شریک بننے کے مدعی ہوں گے یا دوسروں کو شریک بنائیں گے۔

فَنَظَرَ نَظْرَۃً فِی النُّجُوْمِ ۝ فَقَالَ اِنِّیْ سَقِیْمٌ ۝ فَتَوَلَّوْا عَنْہُ مُدْبِرِیْنَ ۝ فَرَاغَ اِلٰی

اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ۝ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًاۢ بِالْيَمِيْنِ (۸۸-۹۳)

قوم کے سامنے ان کے معبودوں کی بے حقیقتی کی وضاحت

مذکورہ بالا تقریر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے، معلوم ہوتا ہے، معبد میں کسی تقریب کے موقع پر کی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے یہ اسکیم بنائی کہ اپنی قوم کے لوگوں کے سامنے ان کے معبودوں کی بے حقیقتی بھی طرح واضح کر دیں۔ اس کے لیے یہ طریقہ انھوں نے اختیار کیا کہ شب میں تقریب سے فارغ ہو کر جب لوگ وہاں سے رخصت ہونے لگے تو انھوں نے ایک نظر اس طرح ستاروں پر ڈالی گویا وقت کا اندازہ کرنا چاہتے ہوں اور لوگوں کے کانوں میں بات ڈالتے ہوئے فرمایا کہ میں اس وقت ماندہ ہو رہا ہوں۔ لوگوں نے یہ سمجھا کہ رات زیادہ گزر چکی ہے اور یہ نوجوان دن بھر کا تھکا ہوا ہے اس وجہ سے اس وقت گھر نہیں جانا چاہتا بلکہ یہیں معبد میں رات گزارنی چاہتا ہے۔ یہ ایک معمولی بات تھی اس وجہ سے لوگ ان کو وہاں چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو سدھارے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب تنہائی ملی تو وہ نظر بچا کے بت خانے میں جا گھسے۔ پہلے بتوں پر کچھ طنزیہ فقرے چست کیے کہ آخر آپ لوگوں کے سامنے یہ بھوجن جو رکھا ہوا ہے اس کو نوش کیوں نہیں فرماتے اور اس درجہ خاموشی کیوں ہے، کچھ بولتے کیوں نہیں!! اس کے بعد چند بھرپور ہاتھ ایسے مارے کہ ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ دوسرے مقام میں ہے کہ تمام چھوٹے بتوں کو توڑ دیا صرف بڑے بت کو ایک خاص مصلحت سے، جس کی وضاحت سورۂ انبیاء میں ہو چکی ہے، چھوڑ دیا۔

مفسرین کی ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہ اصل واقعہ کی سیدھی سادی شکل ہے جو الفاظِ قرآن سے سامنے آتی ہے لیکن مفسرین نے معلوم نہیں کس طرح اس کے تحت بعض ایسی روایتیں نقل کر دی ہیں جن سے یہ بات نکلتی ہے کہ نعوذ باللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس موقع پر غلط بیانی کی اور وہ ستاروں کے مؤثر ہونے پر عقیدہ رکھتے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں پر جو نظر ڈالی تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ ستارہ پرستوں کی طرح ان کی کسی تاثیر کے قائل تھے بلکہ وہ محض وقت کا اندازہ کرنا چاہتے تھے۔ جب تک گھڑیوں کا رواج نہیں ہوا تھا لوگ شب میں، وقت کا اندازہ کرنا ہوتا تو، ستاروں کو دیکھتے اور دن میں سورج کو۔ اس زمانے میں جس طرح وقت معلوم کرنے کے لیے ہر شخص کی نگاہ کلائی کی گھڑی کی طرف جاتی ہے بدویانہ زندگی میں اس مقصد کے لیے ہر شخص کی نظر بے ساختہ آسمان کی طرف اٹھتی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی بالکل اسی مقصد سے ستاروں پر ایک نظر ڈالی۔ اس کا کوئی تعلق نہ ستارہ پرستوں کے اوہام سے تھا اور نہ کواکب کی تاثیر سے۔

اسی طرح انھوں نے یہ جو فرمایا کہ اِنِّیْ سَقِیْمٌ تو یہ بھی انھوں نے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔ 'سقیم' عربی زبان میں مریض، ماندہ، مضمحل، نڈھال اور ضعیف و ناتواں سب کے لیے آتا ہے۔ جس کلام کے دروبست میں چستی نہ ہو اس کو بھی سقیم کہتے ہیں۔ اسی سورہ میں آگے حضرت یونسؑ کے ذکر میں ہے کہ

'فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ' (۱۴۵) ظاہر ہے کہ یہ لفظ یہاں ضعیف و کمزور ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اوپر ہم یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ موقع معبد میں کسی میلے کا تھا۔ ایسے موقع پر ایک حد تک ماندہ و مضمحل تو ہر شخص ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت کا احساس حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی فرمایا اور چونکہ وہ معبد کے اندر ہی رات گزارنے کا ارادہ رکھتے تھے اس وجہ سے انھوں نے آسمان پر ایک نظر ڈال کر اُدُ یہ فقرہ فرما کر معبد کے ذمہ داروں اور محافظوں کو یہ تصور دے دیا کہ گویا وہ تکان و اضمحلال اور زیادہ رات گزر جانے کے سبب سے اس وقت گھر جانا نہیں چاہتے بلکہ یہیں پڑ رہنا چاہتے ہیں۔ اس طرح اگرچہ معبد کے اندر قیام کے لیے انھوں نے ایک توریہ کیا جس سے معبد کے محافظ مغالطہ میں پڑ گئے لیکن اس توریہ کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو طریقہ اختیار فرمایا اور جو الفاظ زبان سے نکالے اس میں نہ کسی جھوٹ کی آمیزش تھی نہ کسی بدعقیدگی کی بلکہ یہ اسی طرح کا ایک پاکیزہ توریہ تھا جس کی بعض نہایت عمدہ مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

'فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ'

حضرت ابراہیمؑ کے توریہ سے معبد کے پہرہ داروں کو مغالطہ

یہ رویہ بیان ہوا ہے معبد کے پہرہ داروں اور ذمہ داروں کا۔ انھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے انداز اور ان کے فقرے سے یہ گمان کیا کہ یہ نوجوان تکان محسوس کر رہا ہے اور رات چونکہ زیادہ گزر چکی ہے اس وجہ سے اس وقت گھر جانا نہیں چاہتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ ارادہ ان کو بالکل بے ضرر محسوس ہوا اس وجہ سے انھوں نے اس میں مخل ہونا پسند نہیں کیا بلکہ ان کو چھوڑ کر وہ اپنے اپنے ٹھکانوں کو چلے گئے۔

'فَرَاغَ اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ' لفظ 'رَوْغَان' عربی میں نظر بچا کر، کترا کر اور کاوا لگا کر کہیں جانے یا پہنچنے کے لیے آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے بتوں تک پہنچنے کے لیے یہ اہتمام اس وقت کیا ہے جب ان کو اندازہ ہو گیا کہ پہرے دار سو چکے ہیں۔ اس وقت وہ چپکے سے اٹھے اور دبے پاؤں، سب کی نگاہیں بچا کر، معبد کے اس حصے میں پہنچ گئے جہاں بت رکھے ہوئے تھے۔

'فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ' پہلے انھوں نے ان پر کچھ طنزیہ فقرے چست کیے۔ فرمایا کہ یہ لذیذ کھانے اور حلوے جو آپ کے پجاریوں نے آپ لوگوں کے سامنے پیش کیے ہیں ان کو آخر تناول کیوں نہیں فرماتے! اور یہ آپ لوگ چُپ چُپ سے کیوں ہیں، کچھ گفتگو کیوں نہیں کرتے!
ان طنزیہ فقروں سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس وقت یہ اقدام کیا ان پر کسی گھبراہٹ کا کوئی اثر نہیں تھا، بلکہ وہ نہایت خوشگوار موڈ میں تھے کہ ان کو، اپنی اسکیم کے مطابق، ان خداوندوں کی تواضع کرنے کا نہایت عمدہ موقع ہاتھ آ گیا اور ان کی تدبیر بالکل کامیاب رہی۔

'فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًاۢ بِالْيَمِيْنِ' اس جملہ کی اصل ترکیب کلام یوں ہے، 'فَرَاغَ عَلَيْهِمْ يَضْرِبُهُمْ ضَرْبًا'

بِالْيَمِيْنِ، اس وجہ سے اس کا صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ 'پس وہ ان پر پل پڑا، مارتے ہوئے، بھرپور ہاتھ'۔ لفظ 'یمین' دہنے ہاتھ کے لیے آتا ہے اور دہنے ہاتھ کی ضرب چونکہ بھرپور ہوتی ہے اس وجہ سے یہاں یہ بھرپور ہاتھ مارنے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ (۹۴)

پہرے داروں کا رویہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ

یہاں سرگزشت کا کچھ حصہ حذف ہے جس کی وضاحت سورۂ انبیاء سے ہوتی ہے۔ جس وقت حضرت ابراہیمؑ نے بتوں کو توڑا ہے اس وقت تو کسی کو خبر نہیں ہوئی۔ بعد میں جب پہرے داروں کو اس حادثہ کی اطلاع ہوئی اور یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ کس کی کارستانی ہو سکتی ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ بتوں کی ہجو کرتے رہے تھے اور انھوں نے دھمکی بھی دے رکھی تھی کہ وہ ان بتوں کے ساتھ ایک چال کرنے والے ہیں اس وجہ سے معبد کے ذمہ داروں کی رائے یہی قرار پائی کہ ہو نہ ہو یہ انھی کی کارروائی ہے۔ چنانچہ سارے لوگ بھاگے ہوئے ان کے پاس پہنچے اور ان سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ پہلے تو انھوں نے لوگوں کا مذاق اڑایا اور بڑے بت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس نے توڑا ہوگا اور ساتھ ہی ان کی حماقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے فرمایا کہ مجھ سے کیوں پوچھتے ہو، اپنے ان معبودوں ہی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے جن پر یہ مصیبت گزری ہے! اگر یہ اپنے سر پر آئی ہوئی مصیبت کو نہ خود دفع کر سکتے اور نہ اس کو بیان ہی کر سکتے ہیں تو آخر یہ کس مرض کی دوا ہیں کہ تم ان کی پوجا کر رہے ہو! حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس معارضہ سے اول اول تو وہ بہت شرمائے لیکن پھر حمیتِ جاہلیت ان پر غالب آگئی اور بولے کہ بھلا ان سے ہم کس طرح پوچھیں، یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ یہ بولتے نہیں! ان کے اس اعتراف کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو اچھی طرح لتاڑا جس سے برہم ہو کر انھوں نے ان کو آگ میں جلا دینے کی سازش کی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ سازش ناکام بنا دی۔

قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۙ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (۹۵-۹۶)

اتمام حجت کے بعد قوم کو ملامت

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے لوگوں کو یہ ملامت اس وقت کی ہے جب انھوں نے ان پر، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، حجت تمام کر دی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ شامت زدو، تم اپنے ہی ہاتھوں کی گھڑی ہوئی، لکڑی اور پتھر کی مورتوں کی پوجا کرتے ہو! اللہ کی پوجا تو اس لیے کی جاتی ہے کہ اس نے ہم کو پیدا کیا ہے لیکن تمھاری عقل اس طرح ماری گئی ہے کہ تم جن کو خود اپنے ہاتھوں تراشتے ہو انھی کی پوجا کرتے ہو گویا اپنے خالقوں کے خالق تم خود ہو۔ یاد رکھو کہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور ان لکڑیوں اور پتھروں کو بھی پیدا کیا ہے جن سے تم اپنے معبودوں کو تراشتے ہو اور ان جنات و ملائکہ کو بھی پیدا کیا ہے جن کے تم پیکر تراشتے ہو۔ بعض متکلمین نے 'وَمَا تَعْمَلُوْنَ' سے یہ استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی بندوں کے افعال و اعمال کا بھی خالق ہے۔ اس آیت سے یہ استدلال ہمارے نزدیک بالکل

بے محل ہے۔ ہم نے اس کی صحیح تاویل واضح کردی ہے اس وجہ سے اس کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ۝ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْأَسْفَلِينَ (۹۷-۹۸)

حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کی سازش اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی حفاظت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس واضح مخالفت کے بعد معبد کے ذمہ داروں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ ان کو آگ میں جلا دیں لیکن یہ کام انھوں نے علانیہ کرنے کے بجائے ایک خفیہ چال کے ذریعے سے کرنا چاہا۔ یہ بات فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا (پس انھوں نے اس کے ساتھ ایک چال کرنی چاہی) سے واضح ہوتی ہے۔ کَیْد کی شکل اختیار کرنے کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ قابو سے باہر نہ نکل سکیں اور اس کا بھی امکان ہے کہ کسی علانیہ اقدام کی صورت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان کی طرف سے کسی مزاحمت کا اندیشہ رہا ہو۔ بدویانہ دورِ زندگی میں خاندانی عصبیت بڑی اہمیت رکھنے والی چیز تھی۔ چنانچہ قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک مدت تک کوئی علانیہ اقدام کرنے سے اسی اندیشہ کے سبب سے ہچکچاتے رہے۔

یہ سوال کہ انھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کے لیے کیا تدبیر اختیار کی ایک مشکل سوال ہے۔ قرآن اور تورات میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس کی روشنی میں اس سوال کا قطعی جواب دیا جاسکے۔ زیربحث آیات سے صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ بت خانے کے پروہتوں نے یہ اسکیم بنائی کہ ایک آتشکدہ بناکر اس میں حضرت ابراہیمؑ کو کسی بہانے لے جایا جائے اور پھر ان کو آگ میں جھونک دیا جائے۔ قرآن کے دوسرے مقام سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان کو آگ میں ڈالا بھی گیا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و رحمت سے ان کو آگ کے ضرر سے محفوظ رکھا اور دشمنوں کی چال ناکام ہوئی۔

وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ (۹۹)

حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت

اس واقعہ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے ایمان سے مایوس ہوکر اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر وہاں سے ہجرت کا ارادہ فرما لیا۔ ہجرت کا فیصلہ ایک بڑا اہم فیصلہ ہوتا ہے۔ نبی اپنے ماحول سے کٹ کر ایک بالکل نئے ماحول میں داخل ہونے کا ارادہ کرتا ہے اور کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ نیا ماحول اس کے لیے سازگار ثابت ہوگا یا ناسازگار۔ اس وجہ سے اس راہ میں اس کا تمام تر اعتماد اللہ تعالیٰ ہی کی دستگیری و رہنمائی پر ہوتا ہے۔ یہاں سَیَهْدِیْنِ کے لفظ سے اسی اعتماد کا اظہار ہو رہا ہے کہ اگرچہ حالات بالکل پردے میں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ رہنمائی فرمائے گا۔ اس کا وعدہ ہے کہ جو لوگ اس کی راہ میں جدوجہد کریں گے وہ ان کے لیے راہ کھولے گا۔

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصّٰلِحِينَ (۱۰۰)

اپنے ساتھیوں کی تمنا

اپنے خویش و اقارب اور خاندان و قبیلہ سے کٹنے کے بعد سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت محسوس

ہوتی ہے وہ اچھے ساتھی ہیں۔ چنانچہ ہجرت کے ساتھ ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی کہ لے رب! ان برے لوگوں کی جگہ تو مجھے اچھے ساتھی دے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا میرے نزدیک صرف صالح اولاد ہی کے لیے نہیں بلکہ اچھے رفیقوں اور مددگاروں کے لیے بھی تھی جن میں صالح اولاد بدرجۂ اولیٰ شامل ہے۔

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ (۱۰۱)

دعا کی قبولیت اور حضرت اسمٰعیلؑ کی ولادت کی بشارت

یہ دعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور ان کو ایک فرزند کی ولادت کی خوش خبری دی گئی۔ اس فرزند سے ظاہر ہے کہ حضرت اسماعیلؑ مراد ہیں۔ اس کے بعض وجوہ بالکل واضح ہیں۔

۱۔ اس کی اول وجہ یہ ہے کہ یہی حضرت ابراہیمؑ کی اس وقت اکلوتی اولاد تھے جس کے لیے انھوں نے دعا فرمائی تھی۔ حضرت اسحاقؑ کے متعلق اس کے محل میں ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے ان کے لیے دعا نہیں فرمائی تھی، بلکہ وہ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے انعام کے طور پر، ان کو عطا ہوئے۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آگے ان کی قربانی کا ذکر آ رہا ہے اور حضرت ابراہیمؑ نے قربان حضرت اسماعیلؑ کو کیا نہ کہ حضرت اسحاقؑ کو۔ اس واقعہ میں یہود نے جو تحریفات کی ہیں ان کا پردہ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے رسالۂ ذبیح میں پوری طرح چاک کر دیا ہے۔ تفصیل کے طالب اس کا مطالعہ فرمائیں۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اس فرزند کی صفت یہاں 'حلیم' آئی ہے۔ یہ صفت ان کی اس عزیمت و استقامت کی تعبیر ہے جس کا مظاہرہ انھوں نے باپ کی چھری کے نیچے کیا اور جس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو 'صادق الوعد' 'صابر' اور 'حلیم' کے القاب سے نوازا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ بعینہٖ یہی صفت 'حلیم' قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کے لیے بھی آئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ اپنے باپ کی صفات کے سب سے زیادہ نمایاں مظہر تھے۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (۱۰۲)

حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کا واقعہ

'سعی' سے مراد یہاں دوڑنے پھرنے کی عمر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ فرزند عزیز جب باپ کے ساتھ دوڑنے پھرنے کی عمر کو پہنچا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت ہو رہی ہے کہ اس کو اپنے رب کی خاطر قربان کر دیں۔ اوپر یہ اشارہ گزر چکا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ، حضرت ابراہیمؑ کو ان کی دعا کے نتیجہ میں اس وقت ملے تھے جب وہ اپنے خاندان اور اپنی قوم کو چھوڑ کر ایک دوسرے ملک کو ہجرت فرما چکے تھے اور واحد چیز جو اس غربت میں ان کے لیے دلجمعی کا ذریعہ بن سکتی تھی ان کا یہی اکلوتا فرزند تھا۔ اس فرزند کی عمر اس وقت اتنی ہو چکی تھی کہ وہ باپ کے ساتھ چلنے پھرنے اور اس کے چھوٹے موٹے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹانے لگ گیا تھا۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان کی عمر ۱۳ برس کی تھی۔ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ اس عمر میں بیٹا باپ کی نگاہوں میں سب سے زیادہ

محبوب ہوتا ہے۔ غور کیجیے کہ کتنا سخت امتحان ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام ڈالے جاتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی وفاداری میں کوئی شخص اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا جب تک اپنی سب سے زیادہ عزیز چیز اس کی راہ میں قربان کرنے کے لیے تیار نہ ہو جائے۔ اس وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اس امتحان میں ڈالے گئے۔ اگرچہ یہ ہدایت خواب میں ہوئی تھی اور خواب کی بات محتاج تاویل و تعبیر ہوتی ہے اس لیے حضرت ابراہیمؑ چاہتے تو اس کی کوئی تاویل کر لیتے لیکن وہ ایک صداقت شعار اور وفادار بندے تھے اس وجہ سے اس کی کوئی تعبیر نکالنے کے بجائے وہ اس کی من و عن تعمیل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیْۤ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی۔ اس راہ میں پہلا قدم انھوں نے یہ اٹھایا کہ فرزند کے حوصلہ کا بھی اندازہ کر لینا چاہا۔ فرمایا کہ بیٹے میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تمھیں ذبح کر رہا ہوں تو تم بھی غور کر لو کہ تمھاری کیا رائے ہے؟ اسلوبِ کلام سے متبادر ہوتا ہے کہ یہ خواب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک سے زیادہ مرتبہ نظر آیا۔ اگر ایک ہی بار نظر آیا ہوتا تو اس کے اظہار کے لیے اِنِّیْ رَاَیْتُ فِی الْمَنَامِ کا اسلوب زیادہ موزوں رہتا۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ بات بھی ظاہر فرما دی کہ ہر چند یہ خواب ایک سے زیادہ مرتبہ ان کو نظر آیا ہے لیکن ہے بہرحال یہ ایک خواب تاکہ معاملہ کی اصل نوعیت بیٹے پر اچھی طرح واضح ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی عقل و فہم پر اسی وقت سے بھروسہ تھا۔ ان کو توقع تھی کہ اس معاملے میں اس کی رائے ان کے لیے صحیح فیصلہ کرنے میں مددگار ہو گی۔

قَالَ یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ۔ حضرت اسماعیلؑ نے اس خواب کو خواب کے بجائے امرِ الٰہی سمجھا اور فوراً جواب دیا کہ والد ماجد! آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے آپ بے دریغ اس کی تعمیل کیجیے اور میری طرف سے مطمئن رہیے۔ ان شاء اللہ آپ مجھے پوری طرح ثابت قدم پائیں گے۔

فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ (۱۰۳)

اصل مرحلہ

اب یہ اصل مرحلہ یعنی قربانی کا بیان ہو رہا ہے۔ 'اسلام' کے معنی اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دینے کے ہیں۔ یعنی باپ اور بیٹا دونوں امتحان کے لیے آمادہ ہو گئے۔ باپ نے بیٹے کو ذبح کر دینے کے لیے چھری نکال لی اور بیٹے نے اپنے آپ کو ذبح کر دینے کے لیے حوالے کر دیا۔ وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا۔ پیشانی کے بل پچھاڑنے کی توجیہ بعض لوگوں نے یہ کی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے چاہا کہ ذبح کے وقت بیٹے کا محبوب چہرہ سامنے نہ ہو تاکہ رقتِ قلب چھری چلانے میں مانع نہ ہو لیکن یہ توجیہ میرے نزدیک صحیح نہیں ہے جو باپ اس طرح اپنے اکلوتے اور محبوب لختِ جگر پر چھری چلانے کے لیے آستینیں چڑھا لے گا وہ اس قسم کی تسلیوں کا محتاج نہیں ہو سکتا۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے بیٹے کو سجدہ کی حالت میں قربان کرنا چاہا اس وجہ سے پیشانی کے بل

پچھاڑا۔ سجدہ کی ہیئت خدا کے قرب کی سب سے زیادہ محبوب ہیئت اسلام میں بھی ہے، جیسا کہ ارشاد ہے وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (سجدہ کرو اور اپنے رب سے قریب تر ہو جا!) اور اس کی یہ حیثیت قدیم مذاہب میں بھی مسلّم رہی ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب بیت اللہ نہ تو تعمیر ہوا تھا اور نہ عبادت کے لیے کوئی متعین قبلہ ہی تھا۔ اگر کوئی متعین قبلہ ہوتا تو ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ بھی بیٹے کو قبلہ رُخ لٹاتے جس طرح ہم جانوروں کو ذبح کرتے وقت قبلہ رُخ لٹاتے ہیں۔

وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۙ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (۱۰۴-۱۰۵)

امتحان میں حضرت ابراہیمؑ کی فیروزمندی

قریب تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چھری چل جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو آواز دی کہ اے ابراہیم! تو نے خواب سچ کر دکھایا اور یہ فیروزمندی جو اس امتحان میں تم نے حاصل کی یہ تمھاری خوب کاری اور تمھارے اخلاص و احسان کا صلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے خوب کار بندوں کو اسی طرح اپنے امتحانوں میں سرفرازی بخشتا ہے۔

'قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا' ہم اوپر یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ خواب میں جو کچھ دکھایا جاتا ہے وہ محتاج تاویل و تعبیر ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو یہ خواب جو دکھایا گیا اس کی اصل تعبیر یہ تھی کہ وہ اس بیٹے کو خدا کی نذر کر دیں۔ یہ مقصود نہیں تھا کہ اس کو وہ فی الواقع ذبح کر دیں۔ چنانچہ جب وہ بیٹے کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے تو خواب کا جو اصل منشا تھا وہ پورا ہو گیا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو بشارت دے دی کہ خواب کا مقصد پورا ہو چکا اب مزید کسی اقدام کی ضرورت نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا حکم عمل سے پہلے ہی منسوخ کر دیا انھوں نے ایک غیر ضروری تکلف کیا ہے۔ صحیح تاویل واضح ہو جانے کے بعد اس کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

'كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ' سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جو لوگ اللہ کے صدق و اخلاص اور اس کے احکام کی تعمیل کے باب میں 'احسان' کی روش اختیار کرتے ہیں، یعنی ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ خدا کے ہر حکم کی تعمیل اس طرح کریں جس طرح اس کے کرنے کا حق ہے، ان کو اللہ تعالیٰ یہ صلہ دیتا ہے کہ وہ اس کے بڑے بڑے امتحانوں میں شاندار کامیابیاں حاصل کرتے ہیں اور پھر اس کے صلے میں آخرت کی ابدی بادشاہی کی فیروزمندیاں پاتے ہیں۔ برعکس اس کے جن لوگوں کی روش دین کے معاملے میں فرار پسندانہ رہتی ہے وہ آہستہ آہستہ خدا کی آزمائشوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت سے بالکل محروم ہو جاتے ہیں جس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوتا ہے کہ آخرت کی کامیابیوں کی راہ ان کے لیے بالکل ہی بند ہو جاتی ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ (۱۰۶)

حضرت ابراہیمؑ کی کامیابی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحسین

یہ حضرت ابراہیمؑ کی اس کامیابی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحسین و آفرین ہے کہ یہ کوئی معمولی امتحان نہیں تھا بلکہ بہت بڑا امتحان تھا جس میں ابراہیم علیہ السلام نے بازی جیتی! جس امتحان کو خود اللہ تعالیٰ بڑا امتحان قرار دے اس کے بڑے ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ اور اگر اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسی کامیابی حاصل کی جس کی داد خود اللہ تعالیٰ نے 'قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا' کے شاندار الفاظ سے دی تو اس میں شبہ نہیں کہ اس آسمان کے نیچے نہ اس سے بڑا کوئی امتحان پیش آیا اور نہ اس سے زیادہ شاندار کامیابی کسی نے حاصل کی۔

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (۱۰۷)

اس قربانی کی دائمی یادگار

فرمایا کہ ہم نے اسمٰعیلؑ کو ایک ذبح عظیم کے عوض چھڑا لیا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم نے ابراہیمؑ کو یہ ہدایت فرمائی کہ وہ اس بیٹے کی جگہ ایک مینڈھے کی قربانی کر دیں اور یہ قربانی ایک عظیم قربانی کی شکل میں ہمیشہ ہمیش آئندہ نسلوں میں اس واقعہ کی یادگار کی حیثیت سے باقی رہے گی۔ یہی قربانی ہے جو مناسکِ حج میں شامل ہو کر حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے آج تک برابر چلی آ رہی ہے اور قیامِ قیامت تک باقی رہے گی —— یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قربانی اگرچہ تمام ادیان میں حضرت آدمؑ کے وقت سے چلی آ رہی ہے لیکن دنیا میں کسی قربانی نے یہ عظمت و اہمیت اور یہ وسعت و ہمہ گیری نہیں حاصل کی جو حضرت ابراہیمؑ کی اس قربانی نے حاصل کی۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ (۱۰۸)

یہ وہی ترجیع ہے جو اوپر حضرت نوحؑ کی سرگزشت میں گزر چکی ہے۔ اس کی وضاحت ہو چکی ہے کہ پچھلوں کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک امت کو اس ملتِ ابراہیمؑ پر باقی رکھا۔ سورۂ شعراء آیت ۸۴ میں حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا گزر چکی ہے: 'وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ' (اے رب پچھلوں میں میرا پائیدار چرچا قائم رکھ) اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی اور شہرتِ دوام کی وہ سرفرازی ان کو بخشی جس کی مثال نہیں مل سکتی۔

سَلٰمٌ عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ (۱۰۹)

یہ مستقل جملہ ہے۔ یعنی ابراہیمؑ پر اس کے اس صدق و اخلاص کے صلہ میں، دنیا اور آخرت میں سلامتی اور برکت ہے۔ لفظ 'سلام' کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔

كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (۱۱۰)

'كَذٰلِكَ' کا اشارہ اسی سلامتی و برکت کی طرف ہے۔ فرمایا کہ ہم اپنے خوب کار بندوں کو اسی طرح اپنی رحمتوں اور برکتوں سے نوازتے ہیں۔

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۱۱)

لفظ 'مُؤْمِنِیْنَ' یہاں اپنے حقیقی مفہوم میں ہے۔ فرمایا کہ بے شک ابراہیمؑ ہمارے حقیقی مومن بندوں میں سے تھا۔ اس سے ایمان کی اصل حقیقت واضح ہوئی کہ حقیقی ایمان وہ ہے جس کے اندر اخلاصؔ احسان کی وہ روح ہو جس کی مثال حضرت ابراہیمؑ نے پیش کی ۔ ہر مدعی کا ایمان اللہ کے ہاں درخورِ اعتنا نہیں ہے۔

وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (۱۱۲)

حضرت اسحاقؑ کی ولادت کی خوشخبری

اس امتحان میں کامیابی کے صلہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دوسرے بیٹے حضرت اسحاقؑ کی ولادت کی خوش خبری دی اور اس خوش خبری کے ساتھ ہی اس امر سے بھی آگاہ فرما دیا کہ وہ صالحین میں سے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو منصبِ نبوت سے سرفراز فرمائے گا۔ ان صفات کا ذکر بشارت کے ساتھ ہی اس وجہ سے ضروری ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے مجرد ایک فرزند کی ولادت کوئی اہمیت رکھنے والی بات نہیں تھی۔ وہ حضرت اسماعیلؑ کو پاکر اولاد کی طرف سے بالکل مطمئن ہو چکے تھے۔ چنانچہ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ان کو حضرت اسحاقؑ کی خوشخبری دی گئی تو انھوں نے فرمایا کہ "کاش! اسماعیلؑ ہی تیرے حضور جیتا رہے!" البتہ یہ بات ان کے لیے بشارت ہو سکتی تھی کہ پیدا ہونے والا فرزند صالح اور نبی ہو گا۔

اس سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ یہود نے حضرت اسحاقؑ کے ذبیح ہونے کی روایات جو گھڑی ہیں وہ بالکل بے اصل ہیں۔ حضرت اسحاقؑ قربانی کے واقعہ کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔ وہ قربان ہونے والے فرزند نہیں بلکہ قربانی کا انعام ہیں جو اس دنیا میں حضرت ابراہیمؑ کو ملا۔

وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ ۭ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ (۱۱۳)

ضمیر مجرور کا مرجع

'عَلَیْهِ' کی ضمیر مجرور کا مرجع حضرت اسماعیلؑ ہیں۔ جن لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ کو مرجع قرار دیا ہے ان کی رائے بالکل غلط ہے۔ اگر مرجع حضرت ابراہیمؑ ہوتے تو اس کے بعد 'مِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا' کی جگہ 'مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ' موزوں رہتا۔ اس لیے کہ حضرت اسحاقؑ حضرت ابراہیمؑ کے کوئی مدِ مقابل نہیں بلکہ انہی کی ذریت میں سے ہیں۔

حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحٰقؑ کے اخلاف کو ایک یاددہانی

فرمایا کہ ہم نے اسماعیلؑ اور اسحاقؑ دونوں کو اس دنیا میں برومند کیا۔ دونوں کی اولاد خوب پھولی پھلی۔ ان کی اولاد میں سے کچھ اپنے صالح باپوں کے نقشِ قدم پر چلنے والے خوب کار اور مخلص و مومن ہیں اور کچھ ان کے طریقہ سے بالکل منحرف ہو کر کفر و شرک میں مبتلا ہیں اور اس طرح اپنی جانوں پر کھلا ہوا ظلم ڈھانے والے بن گئے ہیں۔ یہ گویا دونوں کی اولاد —— بنی اسماعیل و بنی اسرائیل —— کو ایک برمحل یاددہانی ہے کہ وہ متنبہ ہوں کہ وہ کن پاکیزہ لوگوں کی اولاد ہیں، ان کو کیا طریقہ اختیار کرنا تھا اور وہ کہاں بھٹک رہے ہیں۔

ایک نحوی سوال کا جواب

یہاں ایک نحوی سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ 'فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ' سے جو بات

شروع ہوئی ہے وہ یہاں تک چلی آئی ہے اور یہ نہ معلوم ہو سکا کہ 'لَمَّا' کا جواب کیا ہے؟ اس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ بعض اوقات 'لَمَّا'، 'إِذَا' اور اس نوع کے دوسرے شرطیہ جملوں میں جواب حذف ہو جاتا ہے اور متکلم کا زور کلام اس محذوف کا قائم مقام بن جاتا ہے۔ یہ طریقہ خصوصیت کے ساتھ ان مواقع میں اختیار کیا جاتا ہے جہاں جواب کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ الفاظ اس کی تعبیر سے قاصر ہوتے ہیں۔ اس کی ایک واضح مثال سورۂ زمر میں بھی آئے گی: وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ (۷۳) (اور جن لوگوں نے اپنے رب سے ڈرتے ہوئے زندگی گزاری وہ گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جائے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جب اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے پاسبان ان کا سلام کے ساتھ خیر مقدم کریں گے کہ مبارک ہو، اس میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جائیے اور وہ کہیں گے شکر ہے اس اللہ کا جس نے اپنا وعدہ ہم سے پورا کیا) دیکھ لیجیے اس آیت میں بھی 'إِذَا' کا جواب محذوف ہے جو خود کلام کے زور سے واضح ہو رہا ہے۔ اسی طرح آیت زیر بحث میں بھی جواب محذوف ہے۔ الفاظ اس کی تعبیر سے قاصر ہیں لیکن وہ خود واضح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب باپ اور بیٹے دونوں نے اپنے رب کی رضا جوئی کے لیے یہ اقدام کر ڈالا تو تصور کرو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کیسی عظیم رحمتوں کے مستحق ٹھہرے ہوں گے!

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ۝ وَنَجَّيْنَاهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ ۝ وَنَصَرْنَاهُمْ فَكَانُوا هُمُ الْغَالِبِينَ (۱۱۴-۱۱۶)

حضرت موسیٰ اور ان کی قوم

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد سب سے زیادہ جلیل القدر رسول حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام ہیں جو ایک جبار دشمن کو شکست دے کر ایک عظیم الشان امت کے بانی ہوئے اور جن کی لائی ہوئی شریعت ایک مدت دراز تک ایک وسیع دنیا پر حکمران رہی۔ فرمایا کہ ہم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کو بھی اپنی شریعت و ہدایت کے فضل سے نوازا اور ان کو اور ان کی قوم ——— بنی اسرائیل ——— کو ایک بہت بڑی کلفت ——— فرعونیوں کی غلامی ——— سے نجات دی اور ان کی مدد کی تو بالآخر وہی غالب رہے۔ 'نَصَرْنَاهُمْ' میں ان نصرتوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو بنی اسرائیل کو من حیث القوم ان کے دشمنوں کے مقابل مصر سے نکلنے کے بعد حاصل ہوئیں۔

وَآتَيْنَاهُمَا الْكِتَابَ الْمُسْتَبِينَ ۝ وَهَدَيْنَاهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (۱۱۷-۱۱۸)

کتاب کی شکل میں تعلیم الٰہی کا آغاز تورات سے ہوا

'کتاب مستبین' اور 'کتاب مبین' دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ اس سے مراد تورات ہے۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کسی امت کو بھی شریعت ایک واضح کتاب کی شکل میں نہیں عطا فرمائی بلکہ لوگوں کو صرف زبانی تعلیم دی گئی۔ تورات کو یہ خاص امتیاز حاصل ہے کہ اس میں شریعت ایک مرتب و

روشن کتاب کی شکل میں دی گئی۔

تورات اگرچہ نازل تو ہوئی حضرت موسیٰ پر لیکن حضرت ہارونؑ چونکہ باقاعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے شریک رسالت بنائے گئے تھے اس وجہ سے اس کے دیے جانے کے شرف میں ان کو بھی شریک فرمایا۔ اور ان دونوں ہی کی نسبت فرمایا کہ ہم نے ان کو صراط مستقیم کی ہدایت بخشی۔ اس ٹکڑے سے ضمناً ان اتہامات کی تردید ہو گئی جو یہود نے حضرت ہارون علیہ السلام پر لگائے ہیں اور جن کی تردید ان کے محل میں تفصیل کے ساتھ ہو چکی ہے۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْآخِرِينَ ۝ سَلَامٌ عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ۝ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ إِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ (۱۱۹ - ۱۲۲)

یہ اسی مضمون کی ترجیع ہے جو اوپر گزر چکا ہے اور جس کے ہر جزو کی وضاحت ہو چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان دونوں رسولوں کا طریقہ بھی ان کے بعد قائم رہا۔ ان پر اللہ کی طرف سے برکت و سلامتی نازل ہوئی اور ان کے دشمن ذلیل و نامراد ہوئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے خوب کار و وفا شعار بندوں کو اسی طرح صلہ دیا کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج بھی جو لوگ خدا اور اس کے دین کے لیے اس صدق و اخلاص کا ثبوت دیں گے اسی طرح وہ بھی خدا کی رحمت و برکت کے مستحق ٹھہریں گے، اللہ تعالیٰ ان کے کام کو پائداری بخشے گا، ان کی دعوت کے حامل پیدا ہوں گے اور تاریخ میں ان کا نام روشن رہے گا۔

بعض انبیاء کا ذکر اجمال کے ساتھ

یہاں تک تاریخ کے جلیل القدر انبیاء اور ان کے کارناموں کا حوالہ تھا اور ان کے ذکر میں ترتیب بالکل تاریخی ہے۔ آگے اجمال کے ساتھ حضرت الیاس، حضرت لوط اور حضرت یونس علیہم السلام کی طرف اشارہ ہے۔

حضرت الیاسؑ

'الیاس' سے مراد وہی ہیں جن کا ذکر تورات میں 'ایلیا' کے نام سے ہوا ہے اور جن کا زمانہ ۸۹۰ قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔ سورۂ انعام آیت ۸۵ میں ان کا نام حضرات زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کے ساتھ آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صفات کے اعتبار سے یہ انہی انبیاءؑ کے زمرہ کے نبی ہیں۔ بعض لوگوں نے ان سے حضرت ادریسؑ کو مراد لیا ہے لیکن یہ خیال غلط ہے۔ حضرت ادریسؑ کا ذکر قرآن میں ان کے نام سے موجود ہے۔

حضرت لوطؑ

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے رشتہ دار، ان کے ہم عصر اور انہی کے تربیت کردہ ہیں۔

حضرت یونسؑ

حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر سورۂ یونس اور سورۂ انبیاء میں تفصیل سے ہو چکا ہے کہ یہ غیرتِ حق کے جوش سے مغلوب ہو کر، اللہ تعالیٰ کے حکم سے پہلے ہی ہجرت فرما گئے تھے جس پر ان کو عتاب ہوا اور وہ قوم کی طرف پھر واپس کیے گئے اور ان کی دعوت سے پوری قوم ایمان لائی۔

ان انبیاء کے ذکر سے مقصود

مقصود ان انبیاء کے ذکر سے بھی اسی حقیقت کو واضح کرنا ہے جو اوپر کے انبیائے عظام کے ذکر میں واضح فرمائی گئی ہے کہ ہرچند انبیاء کو وہ قوت و جمعیت حاصل نہیں ہوئی جو نوحؑ، ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کو حاصل ہوئی اور انہیں اپنے ماحول سے بالکل بیگانہ ماحول میں کام کرنا پڑا تاہم اللہ تعالیٰ نے ان کے

کام کو بھی فروغ دیا اور ان کے بعد ان کی دعوت اور ان کی ملّت بھی باقی رہی۔ سب سے آخر میں حضرت یونسؑ کے ذکر کی یہ اہمیت ہے کہ دعوتِ حق کے کام میں عجلت، اگرچہ حمیتِ حق کے تقاضے ہی سے ہو، جائز نہیں ہے بلکہ صبر و استقلال کے ساتھ نبی کو اپنے کام میں لگے رہنا چاہیے۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کب تک کسی قوم میں زندگی کی رمق باقی ہے اور کب اس کا پیمانہ لبریز ہوا۔

وَإِنَّ إِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ أَتَدْعُونَ بَعْلًا وَتَذَرُونَ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ ۝ اللَّهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ (۱۲۳-۱۲۶)

حضرت الیاسؑ کی دعوت

'بعل' اس دیوتا کا نام ہے جس کو حضرت الیاسؑ کی قوم پوجتی تھی۔ قرینہ دلیل ہے کہ شہر 'بعلبک' کا نام اسی دیوتا کی نسبت سے پڑا ہے اس لیے کہ 'بک'، مخفف ہے 'بکہ' کا جس کے معنی شہر کے ہیں۔ انھوں نے اپنی قوم کو دعوت دی کہ بدبختو! بہترین خالق، اللہ کو چھوڑ کر، جو تمھارا اور تمھارے تمام اگلوں کا رب ہے، تم 'بعل' کو پوجتے ہو! 'بہترین خالق' سے اس حقیقت کا اظہار ہے کہ وہ صرف خالق ہی نہیں بلکہ بہترین خالق ہے۔ اسی نے پیدا کیا، اسی نے تمام ظاہری و باطنی صلاحیتیں بخشیں، وہی پرورش کر رہا ہے اور وہی تم سب کا اور تمھارے تمام اگلوں کا رب ہے تو آخر اس کو چھوڑ کر بعل کو پوجنے کا کیا تک ہے؟ تمھاری خلقت اور ربوبیت میں اس کا کیا دخل ہے؟

فَكَذَّبُوهُ فَإِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ ۝ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ (۱۲۷-۱۲۸)

فرمایا کہ ان کی قوم کے لوگوں نے ان کی تکذیب کر دی جس کی پاداش میں تمام مکذبین اللہ تعالیٰ کے حضور میں مجرموں کی طرح پیش ہوں گے۔ صرف وہی لوگ اس سے محفوظ رہیں گے جن کو اللہ نے اپنی بندگی کے لیے خاص کر لیا اور وہ حضرت الیاسؑ پر ایمان لائے۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ (۱۲۹)

یہ وہی ترجیع ہے جو دوسری سرگزشتوں کے سلسلہ میں گزر چکی ہے یعنی جن لوگوں نے الیاسؑ کی مخالفت کی ان کا تو کوئی نام لیوا باقی نہیں رہا لیکن الیاسؑ کے نام اور اس کے کام کو اللہ نے باقی رکھا۔

سَلَامٌ عَلَىٰ إِلْ يَاسِينَ ۝ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ (۱۳۰-۱۳۲)

'اِلْ یَاسِیْنَ' میرے نزدیک 'الیاس' کی جمع ہے اور اس سے مراد ان کے تمام آل و اتباع ہیں۔ عربی میں اس طرح جب کسی اسم کی جمع آتی ہے تو اس سے اس کے تمام اجزاء و فروع مراد ہوتے ہیں۔ قرآن میں 'طور سینین'، 'طور' کی جمع اسی اصول پر استعمال ہوئی ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ نبی پر جو برکت و سلامتی نازل ہوتی ہے اس میں اس کے تمام جاں نثار ساتھی بھی شامل ہوتے ہیں۔

'اِنَّا كَذٰلِكَ ..... الاٰیۃ' اس کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ مقصود اس کے بار بار اعادہ سے یہ ہے کہ یہ ایک سنتِ الٰہی ہے۔ جو لوگ اس طرح اپنے ایمان و احسان کا مظاہرہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے

نام کو زندہ رکھتا ہے اور جو لوگ ان کی مخالفت کرتے ہیں ان کا کوئی نام لیوا باقی نہیں رہتا۔

وَإِنَّ لُوطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ نَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عَجُوزًا فِي الْغَابِرِينَ ۝ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْآخَرِينَ ۝ وَإِنَّكُمْ لَتَمُرُّونَ عَلَيْهِم مُّصْبِحِينَ ۝ وَبِاللَّيْلِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۱۳۳-۱۳۸)

حضرت لوطؑ کی دعوت

یہ حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی قوم کی سرگزشت کا حوالہ ہے۔ فرمایا کہ وہ بھی ہمارے رسولوں میں سے تھا۔ اس کی قوم نے بھی اس کی تکذیب کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اس کو اس کے تمام باایمان اہل و عیال کے ساتھ اپنے عذاب سے نجات دی اور بقیہ ساری قوم کو تباہ کر دیا۔ اس کے اہل میں سے ایک بڑھیا ——— حضرت لوطؑ کی بیوی ——— ایمان سے محروم رہ جانے کے باعث پیچھے رہ جانے والوں میں سے بنی چنانچہ وہ بھی تباہ ہونے والوں کے ساتھ تباہ ہوئی۔ اس لیے کہ نبی کے ساتھ مجرد رشتہ داری کسی کے کام آنے والی چیز نہیں ہے بلکہ کام آنے والی چیز ایمان اور عمل صالح ہے۔

قریش کو ایک برمحل تنبیہ

آخر میں اس ترجیع کے بجائے جو اوپر کی تمام سرگزشتوں کے ساتھ آئی ہے یہاں قریش کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم ان کی بستیوں پر سے اپنے تجارتی سفروں میں برابر دن میں بھی گزرتے ہو اور رات میں بھی تو آخر اس بات پر کیوں نہیں سوچتے کہ جس خدا نے اپنے رسولوں کے مکذبین کے ساتھ ہمیشہ یہ معاملہ کیا ہے تمہارے باب میں اس کی سنت کیوں بدل جائے گی! گویا ترجیع والی بات تو یہاں از خود واضح تھی اس وجہ سے اس کی جگہ ایک مزید برمحل تنبیہ مخاطبوں کے کان میں ڈال دی گئی جس کے لیے قوم لوط کے محل وقوع نے ایک نہایت مناسب تقریب پیدا کر دی تھی۔

وَإِنَّ يُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ أَبَقَ إِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ (۱۳۹-۱۴۰)

حضرت یونسؑ کی سرگزشت

حضرت یونس علیہ السلام کی سرگزشت سورۂ یونس اور سورۂ انبیاء وغیرہ میں گزر چکی ہے۔ اس سرگزشت میں تورات کے راویوں نے جو خلط مبحث کر دیا ہے اس پر اس کے محل میں ہم مفصل گفتگو کر چکے ہیں۔ یہ اہل نینوا کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ ان کی قوم نے ان کی دعوت کی ناقدری کی تو یہ غیرت حق کے جوش میں قوم کو چھوڑ کر ایک ایسے جہاز پر سوار ہو گئے جو کسی مقام کے سفر کے لیے بالکل تیار کھڑا تھا۔ راستے میں جہاز طوفان میں گھر گیا۔ جہاز رانوں نے اپنی روایت کے مطابق یہ فیصلہ کیا کہ جہاز میں کوئی ایسا شخص سوار ہو گیا ہے جو مجرم ہے اور جب تک وہ الگ کر کے دریا میں نہیں ڈالا جائے گا جہاز اس ورطۂ ہلاکت سے باہر نہیں نکل سکتا۔ بالآخر مجرم کو متعین کرنے کے لیے قرعہ کی نوبت آئی، قرعہ حضرت یونسؑ کے نام نکلا اور وہ دریا میں پھینک دیے گئے۔ دریا میں ان کو غالباً کسی شارک نے نگل لیا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی تسبیح کی بدولت ان کو بچایا اور مچھلی نے ان کو ساحل کی ریت پر اگل دیا۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ساحل کی شدید تمازتِ آفتاب سے ان کو بچانے کے لیے کدو کی ایک بیل اگا دی جس کے سایہ نے اس کمزوری کی حالت میں ان کی حفاظت کی۔ بالآخر جب ان کے اوسان بجا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو پھر قوم کے پاس

جانے اور اس کو دعوت دینے کی ہدایت فرمائی۔ اب کے انھوں نے دعوت دی تو اہلِ نینوا کی پوری آبادی جس کی تعداد ایک بلکہ ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ تھی ایمان لائی۔

یہ سرگزشت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو اس غرض سے سنائی گئی ہے کہ وہ بھی قوم کے رویہ سے بددل نہ ہوں بلکہ دعوت کے کام میں لگے رہیں۔ نبی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق و باطل کی کشمکش کے ایک محاذ پر مامور ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ خدا کے حکم کے بغیر اس محاذ سے ہٹے اگرچہ اس کا محرک کوئی نیک جذبہ ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جو آزمائشیں اپنے رسول کے لیے لکھی ہیں اس کو ان سے بہرحال گزرنا ہے۔ اگر وہ آزمائش سے گھبرائے گا تو ہو سکتا ہے کہ وہ ایک آزمائش سے بچنے کی کوشش میں کسی دوسری اس سے بڑی آزمائش میں گرفتار ہو جائے۔ اسی طرح قوم کو جو مہلت اتمامِ حجت کے لیے ملنی چاہیے وہ بھی سنتِ الٰہی کے مطابق ضروری ہے اور یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کسی قوم پر کب اللہ کی حجت پوری ہوئی۔ حضرت یونس علیہ السلام نے اپنے گمان کے مطابق یہ فیصلہ کر لیا کہ اہلِ نینوا ایمان لانے والے نہیں ہیں حالانکہ واقعات نے ثابت کر دیا کہ پوری قوم میں ایمان لانے کی صلاحیت موجود تھی۔

حضرت یونسؑ کی لغزش کی نوعیت

'اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ'۔ 'اَبَقَ' سے اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے جب حضرت یونسؑ قوم کو چھوڑ کر کسی دوسرے مقام کو چلے جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ حضرات انبیاء نفس کی پیروی میں تو کبھی ٹھوکر نہیں کھاتے لیکن اتباعِ حق کے جوش میں کبھی کبھی وہ بھی حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں، اگرچہ یہ چیز بجائے خود بری نہیں ہے بلکہ پسندیدہ ہے لیکن حضرات انبیاء چونکہ حق کی کسوٹی ہوتے ہیں اس وجہ سے اس پہلو میں بھی اگر ان سے کوئی بے اعتدالی ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر بھی ان کی گرفت فرماتا ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام سے اسی طرح کی لغزش صادر ہوئی۔ ان کی قوم نے جب ان کی دعوت کی ناقدری کی تو وہ آزردہ ہو کر وہاں سے چل کھڑے ہوئے کہ ایسے ناقدروں کے آگے موتیوں کے پھینکنے سے کیا حاصل! معلوم ہوتا ہے کہ وہاں سے کہیں جانے کا فیصلہ کیا تو فوراً ہی کسی مقام کے سفر کے لیے کوئی جہاز بھی لدا پھندا تیار مل گیا۔ 'مشحون' کے معنی ہیں لدی اور بھری ہوئی کشتی۔ اس لفظ کے لانے سے مقصود یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ وہ قوم سے بیزار ہو کر کہیں چلے جانا چاہتے تھے، ان کی تمنا کے مطابق ان کو جہاز بھی تیار مل گیا اور وہ بے درنگ اس پر سوار ہو گئے۔ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر ان کو غور کرنے اچھی طرح موقع نہیں ملا۔

فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ (۱۴۱)

معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت کے مطابق، جس کی طرف ہم نے تمہید میں اشارہ کیا، جب قرعہ ڈالنے کی نوبت آئی تو یہ خدمت انجام دینے کے لیے جہاز والوں نے حضرت یونسؑ ہی کا انتخاب کیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی

ہوگی کہ جہاز میں سب سے زیادہ ثقہ اور باوقار وہی نظر آئے ہوں گے اور قرعہ کا کام ایک ثقہ آدمی ہی کے لیے موزوں تھا لیکن قدرت کی نیرنگی دیکھیے کہ قرعہ حضرت یونس علیہ السلام کے نام کا نکلا اور وہ اس فیصلۂ غیبی کے مطابق دریا میں دھکا دیے گئے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ 'عبدِ آبق'، مفرور غلام کو کہتے ہیں جو اپنے آقا کی مفوضہ ڈیوٹی چھوڑ کر بھاگا ہو۔ گویا حضرت یونس علیہ السلام ایک مفرور غلام قرار پائے اور جہاز والوں کی طرف سے اس جرم کی سزا میں دریا میں ڈال دیے گئے۔

فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ (۱۴۲)

'حوت' سے مراد کوئی بڑی قسم کی سمندری مچھلی ہے۔ سمندر میں وہیل اور شارک کے قسم کی مچھلیاں ہوتی ہیں جو آدمی کو سموچا نگل سکتی ہیں۔ اسی قسم کی کسی مچھلی نے حضرت یونسؑ کو نگل لیا۔ 'وَهُوَ مُلِيْمٌ' یعنی یہ افتادِ جو ان کو پیش آئی تو وہ اس کے سزاوار تھے اس لیے کہ ان سے ایک ایسا فعل سرزد ہوا تھا جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو مستحق تنبیہ ٹھہرایا۔ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ اگرچہ حضرت یونسؑ نے جو اقدام کیا تھا وہ ایک نیک جذبہ سے کیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے اذن کے بدون کیا تھا اس وجہ سے اس پر ان کی گرفت ہوئی اور گرفت آدمی کے درجہ اور مرتبہ کے اعتبار سے ہوتی ہے اس وجہ سے گرفت سخت ہوئی۔

فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ۝ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (۱۴۳-۱۴۴)

'مُسَبِّحِيْنَ' میں جس تسبیح کی طرف اشارہ ہے اس کی وضاحت دوسرے محل میں ہو چکی ہے کہ اس سے مراد 'لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ' کا ورد ہے۔ یہ اپنی غلطی کے اعتراف اور اللہ تعالیٰ کے استغفار کا بہترین کلمہ ہے جو حضرت یونس علیہ السلام کی زبان پر جاری ہو گیا اور اس کلمہ نے ان کو اس پکڑ سے چھڑا لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جونہی حضرت یونس علیہ السلام پر یہ حادثہ گزرا ان کو متنبہ ہو گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عتاب ہوا ہے اور وہ پورے دل سے اپنے رب کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس کلمہ کی شان اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اسی نے ان کو بچا لیا ورنہ جس مچھلی نے ان کو نگلا تھا اسی کا پیٹ قیامت تک کے لیے ان کا مدفن بن جاتا۔

فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ۝ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ (۱۴۵-۱۴۶)

اللہ تعالیٰ کے حکم سے بالآخر مچھلی نے دریا کی کسی ریتی پر ان کو اگل دیا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت وہ بالکل ہی مضمحل اور نڈھال ہوں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے وہاں کدو کے قسم کی کسی بیل کا سایہ کر دیا جس کے سایہ نے ان کو دریا کے کنارے کی سخت دھوپ سے بچایا اور کچھ عرصہ کے بعد ان کے اوسان بجا ہوئے۔

وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ۝ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (۱۴۷-۱۴۸)

جب ان کے اوسان بجا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو پھر ان کی قوم کے پاس دعوت کے لیے

جس کی تعداد ایک لاکھ بلکہ اس سے بھی زیادہ تھی اور یہ سارے لوگ اسلام لائے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو عذاب سے بچایا اور ان کی مہلت مقررہ تک کے لیے ان کو کھانے پلنے کا موقع دیا۔ 'اَوْ' 'بَلْ' کے معنی میں بھی آتا ہے۔ تورات کے صحیفوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان لانے والوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تھی۔

۶- آگے کا مضمون۔ آیات ۱۴۹-۱۸۲

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ سورہ کا خاتمہ اسی مضمون پر ہوا ہے جس سے اس کا آغاز ہوا ہے اور قرآن کے اسلوب بیان کی اس خصوصیت کی طرف متعدد سورتوں میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ جس مضمون سے سورہ کا آغاز ہوا ہے اسی پر اس کا اختتام بھی ہوا ہے۔

اس سورہ کا آغاز اس کی ابتدائی آیات پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیجیے، ملائکہ کی الوہیت اور جنات کی غیب دانی کے ابطال سے ہوا ہے۔ اس کے بعد قریش کی تنبیہ کے لیے حضرات انبیاء کی سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ تمام انبیاء نے اسی بات کی دعوت دی ہے جس کی دعوت آج ان کو دی جا رہی ہے اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح کی گئی ہے کہ جن لوگوں نے رسولوں کی تکذیب کی وہ تباہی سے دوچار ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور ان کے ساتھیوں پر اپنی برکت و رحمت نازل فرمائی۔ دنیا میں بھی ان کے نام اور کام کو عزت و پائداری حاصل ہوئی اور آخرت میں بھی ان کے لیے ابدی بادشاہی کی بشارت ہے۔ بعینہٖ یہی مضمون آخر میں ایک نئے اسلوب سے آیا ہے۔ پہلے مشرکین قریش کو چیلنج کیا ہے کہ تم فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مان کر ان کی جو پرستش کرتے ہو اور جنات اور خدا کے درمیان تم نے جو رشتہ جوڑ رکھا ہے اگر تمہارے پاس اس کی کوئی عقلی یا نقلی دلیل ہے تو اس کو پیش کرو، ورنہ خدا کے غضب سے ڈرو۔ پھر خدا کے حضور میں ملائکہ کی جو اصل پوزیشن ہے حضرت جبریلؑ کی زبانی اس کی وضاحت کرائی ہے تاکہ جو لوگ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بنائے بیٹھے اور ان کی پوجا کر رہے ہیں ان کے سامنے ملائکہ کے سب سے بڑے فرد کی زبان سے ان کی حماقت پر ضرب لگا دی جائے کہ فرشتے خود اپنا درجہ و مقام کیا بتاتے ہیں اور ان کے احمق پرستار ان کو کیا سمجھتے ہیں۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ اللہ کے رسولوں کے لیے فتح و نصرت کا جو وعدہ ہو چکا ہے وہ تمہارے لیے بھی پورا ہو گا اس وجہ سے صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ، تمہارے مخالفین عنقریب اپنا انجام دیکھ لیں گے ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ أَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُونَ ﴿۱۴۹﴾ أَمْ خَلَقْنَا آیات ۱۴۹-۱۸۲
الْمَلَائِكَةَ إِنَاثًا وَهُمْ شَاهِدُونَ ﴿۱۵۰﴾ أَلَا إِنَّهُمْ مِنْ إِفْكِهِمْ
لَيَقُولُونَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَدَ اللَّهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿۱۵۲﴾ أَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى

الْبَنِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۵﴾ اَمْ
لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵۶﴾ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۷﴾ وَ
جَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ۭ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ
لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ
الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۰﴾ فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ﴿۱۶۲﴾
اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۶۳﴾ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۱۶۴﴾ وَّ
اِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۶۷﴾
لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۹﴾
فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا
الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ
الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۴﴾ وَّاَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ
يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۵﴾ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ
فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۷﴾ وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۸﴾ وَّاَبْصِرْ
فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾
وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۲﴾ ع ۵

ترجمۂ آیات ۱۴۹-۱۸۲

تو ان سے پوچھو، کیا تیرے رب کے لیے بیٹیاں ہیں اور ان کے لیے بیٹے! کیا ہم نے
فرشتوں کو عورتیں بنایا اور وہ دیکھ رہے تھے! آگاہ، یہ لوگ محض من گھڑت طور پر یہ
بات کہہ رہے ہیں کہ خدا نے اولاد بنائی ہے اور یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ کیا اس نے بیٹیوں پر

بیٹیوں کو ترجیح دی! تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو! کیا تم ہوش سے کام نہیں لیتے! کیا تمھارے پاس واضح حجت ہے! پس پیش کرو تم اپنی کتاب اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ ۱۴۹ - ۱۵۷

اور انھوں نے خدا اور جنوں کے درمیان بھی رشتہ جوڑ رکھا ہے۔ اور جنوں کو خوب پتہ ہے کہ وہ عذاب میں گرفتار ہوں گے۔ اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ بجز ان کے جو اللہ کے خاص بندے ہیں۔ پس تم اور جن کو تم پوجتے ہو خدا سے برگشتہ نہیں کر سکتے مگر انھی کو جو جہنم میں پڑنے والے ہیں۔ ۱۵۸ - ۱۶۳

اور ہم میں سے ہر ایک کے لیے بس ایک معین مقام ہے اور ہم تو خدا کے حضور میں صف بستہ رہنے والے ہیں۔ اور ہم تو اس کی تسبیح کرتے رہنے والے ہیں۔ ۱۶۴ - ۱۶۶

اور بے شک یہ لوگ کہتے رہے تھے کہ اگر ہمارے پاس پہلوں کی کوئی تعلیم ہوتی تو ہم اللہ کے خاص بندوں میں سے ہوتے۔ تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا تو وہ عنقریب جان لیں گے۔ ۱۶۷-۱۷۰

اور ہمارے خاص مرسل بندوں کے لیے ہمارا یہ فیصلہ پہلے سے صادر ہو چکا ہے کہ مدد کے حقدار وہی ہوں گے اور ہمارا ہی لشکر غالب رہنے والا بنے گا۔ تو کچھ دنوں کے لیے ان سے اعراض کرو اور ان کو دیکھو، وہ عنقریب دیکھ لیں گے۔ ۱۷۱ - ۱۷۵

کیا وہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں! تو یاد رکھیں کہ وہ جب ان کے صحنوں میں اترے گا تو بڑی ہی بری ہو گی ان لوگوں کی صبح جن کو اس سے آگاہ کیا جا چکا ہے۔ تو کچھ دنوں کے لیے ان سے اعراض کرو اور دیکھو، وہ بھی عنقریب دیکھ لیں گے۔ ۱۷۶ - ۱۷۹

تیرا رب، عزت کا مالک، ان باتوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ اور پیغمبروں پر

سلامتی ہے اور شکر کا سزاوار اللہ ہے، عالم کا خداوند۔ ۱۸۰-۱۸۲

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ (۱۴۹)

اس کلام کا عطف سورہ کے ابتدائی مضمون پر ہے

اس کلام کا عطف، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ابتدائے سورہ کے مضمون پر ہے۔ اگرچہ کلام کے دونوں حصوں کے درمیان باعتبار الفاظ بُعد نظر آتا ہے لیکن یہ بُعد محض ظاہری ہے، حقیقت کے اعتبار سے کلام بالکل مربوط ہے۔ شروع میں ملائکہ اور جنات کی الوہیت کی تردید کے بعد بعینہٖ اسی 'فَاسْتَفْتِهِمْ' کے لفظ سے آیت ۱۱ میں کلام کا رخ قریش کے لیے تہدید و وعید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی کی طرف مڑ گیا تھا اور یہی مضمون یہاں تک پورے تسلسل کے ساتھ جاری رہا ہے۔ اس کے ختم ہونے کے بعد اسی 'فَاسْتَفْتِهِمْ' پر عطف کر کے اصل مسئلہ کو پھر لے لیا اور فرمایا کہ ان لوگوں سے، جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مان کر، ان کی پوجا کر رہے ہیں، پوچھو کہ تم اپنے لیے تو بیٹے پسند کرتے ہو تو تیرے رب کے لیے انھوں نے بیٹیاں کیوں پسند کی ہیں! مطلب یہ ہے کہ اول تو خدا کی طرف بیٹوں اور بیٹیوں کی نسبت ہی ایک شدید قسم کی جہالت ہے لیکن انھوں نے جہالت پر جہالت یہ کی ہے کہ خدا کے لیے انھوں نے وہ چیز پسند کی ہے جو اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں۔ حالانکہ عقل و فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ خدا کی طرف اس کی شایانِ شان صفات منسوب کی جائیں اور انھوں نے صرف یہی ظلم نہیں کیا ہے کہ اس کی طرف اس کی شان کے منافی صفت منسوب کی ہے بلکہ ایک ایسی صفت منسوب کی ہے جس کو خود اپنے لیے بھی باعثِ ننگ خیال کرتے ہیں۔

اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ (۱۵۰)

یعنی اس اعتماد کے ساتھ یہ لوگ جو یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں تو آخر یہ بات کس دلیل کی بنا پر یہ کہہ رہے ہیں؟ کیا جب ہم نے فرشتوں کو پیدا کیا تو یہ لوگ وہاں موجود تھے! سورہ زخرف میں یہی بات ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے: وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ۭ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ۭ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔــلُوْنَ (۱۹) (کیا انھوں نے فرشتوں کو جو اللہ کے بندے ہیں، عورتیں بنا دیا! کیا یہ ان کی پیدائش کے وقت موجود تھے! ان کا یہ بیان لکھ لیا جائے گا اور ان سے اس کی پرسش ہو گی)۔

اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ۝ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۱۵۱-۱۵۲)

یعنی دلیل ان کے پاس نہ کوئی عقلی ہے نہ نقلی اور نہ انھوں نے اس کا کوئی مشاہدہ کیا ہے۔ بس اپنے جی سے گھڑ کے یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ خدا کے اولاد ہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ بالکل جھوٹے ہیں۔

اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ۝ مَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۱۵۳-۱۵۵)

یعنی اگر اسے اولاد ہی کا شوق تھا تو سوچنے کی بات ہے کہ اس نے بیٹوں پر بیٹیوں کو کیوں ترجیح دی؟ وہ جب بیٹے بھی پیدا کر سکتا تھا تو آخر اس نے اپنے لیے وہ چیز کیوں گوارا کی جس کو تم اپنے لیے بادلِ نخواستہ ہی گوارا کرتے ہو۔ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ: تمھاری عقل کو کیا ہو گیا ہے کہ تم ایسا الٹا فیصلہ کرتے ہو۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ، یعنی تمھاری یہ بات صاف شہادت دے رہی ہے کہ تم ذرا بھی ہوش و گوش سے کام لینے والے لوگ نہیں ہو ورنہ آخر تم خدا کے لیے وہ بات کس طرح پسند کرتے ہو جو اپنے لیے پسند کرنے پر تیار نہیں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بات اپنی صداقت کے ثبوت کے لیے کسی حجت و استدلال کی محتاج نہیں بلکہ صرف تذکّر یعنی چیتنے اور دھیان کرنے کی محتاج ہے۔ اگر کوئی شخص بالکل ہی بلید یا لاابالی نہ ہو تو وہ ادنیٰ توجہ اس کو سمجھ سکتا ہے۔

اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ۔ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۵۶ - ۱۵۷)

فرمایا کہ اگر تمھارے پاس اس کی کوئی واضح حجت ہو تو اس کو پیش کرو۔ 'واضح حجت' کی وضاحت یہاں 'کتاب' کے لفظ سے فرما دی ہے کہ اگر تمھارے پاس کسی آسمانی کتاب کی شہادت تمھارے اس دعوے کے حق میں موجود ہو تو اس کو پیش کرو۔ خدا کے باب میں کسی کو کوئی بات من گھڑت طور پر کہنے کا حق نہیں ہے۔ بلکہ صرف دلیل و برہان کی بنیاد پر کہنے کا حق ہے اور سب سے زیادہ واضح برہان اس کی کتاب ہو سکتی ہے جو اس نے لوگوں کی تعلیم و ہدایت کے لیے اتاری ہو۔

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ۭ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۝ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ (۱۵۸ - ۱۶۰)

فرشتوں کے علاوہ جنوں کو بھی انھوں نے خدا کے ساتھ جوڑ رکھا ہے

ان آیات میں سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ بطور جملہ معترضہ ہے اور اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ کا تعلق وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ سے ہے۔ قرآن میں متعدد نظیریں موجود ہیں کہ جب کسی بات کی فوری تردید کی ضرورت ہوتی ہے تو تردید اصل سلسلۂ کلام کے بیچ میں آ جاتی ہے۔ اس سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ بات ایسی گھنونی ہے کہ متکلم کو اس کی تردید کے معاملہ میں اتنا توقف بھی گوارا نہیں کہ اس کی بات پوری ہو لے۔

آیات کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے صرف یہی غضب نہیں کیا ہے کہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بنایا ہے بلکہ اس سے بھی بڑا ستم یہ کیا ہے کہ جنوں اور خدا کے درمیان بھی انھوں نے رشتہ جوڑ رکھا ہے۔ فرشتوں کو انھوں نے خدا کی ذات میں شریک بنایا ہے اور جنات کو خدا کے حقوق اور اس کی صفات میں۔ عبادت خاص اللہ تعالیٰ کا حق ہے لیکن یہ بدقسمت لوگ جنوں کو نافع و ضار اور علم غیب کے حصول کا ذریعہ مانتے اور اسی وہم کی بنیاد پر ان کی عبادت کرتے اور ان کے لیے قربانیاں اور چڑھاوے پیش کرتے ہیں۔

"وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّھُمْ لَمُحْضَرُوْنَ" یعنی یہ بالکل مدعی سست اور گواہ چست' والی بات ہے، جنات کو تو اچھی طرح علم ہے کہ وہ خدا کی مخلوق ہیں اور ان کو اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے ایک دن اپنے رب کے حضور میں حاضر ہونا ہے اور جو ان میں مجرم ہوں گے وہ اپنے جرم کی پاداش میں مبتلائے عذاب ہوں گے، لیکن ان لال بجھکڑوں نے ان کو خدائی میں شریک مان کر ان کی پوجا شروع کر رکھی ہے۔

ایک جملہ معترضہ

"سُبْحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوْنَ" یہ بات نہایت گھنونی تھی کہ جنات کو خدا کے ساتھ جوڑ دیا جائے اس وجہ سے بلاتوقف اس کی تردید فرما دی کہ خدا کی ذات والاصفات اس قسم کی تمام نسبتوں سے پاک ہے، نہ کوئی اس کی ذات میں شریک ہے، نہ صفات میں۔ وہ اپنی ذات و صفات میں بالکل وحدہٗ لاشریک ہے اس وجہ سے وہ اپنے حقوق میں بھی بالکل یکتا اور لاشریک ہے۔

"اِلَّا عِبَادَ اللّٰہِ الْمُخْلَصِیْنَ" یہ استثناء "اِنَّھُمْ لَمُحْضَرُوْنَ" سے ہے۔ چونکہ "مُحْضَرُوْنَ" کے اندر یہ مفہوم موجود ہے کہ خدا کے حضور سب مجرموں کی طرح گرفتار کر کے حاضر کیے جائیں گے اس وجہ سے اس استثناء کے ذریعے سے یہ بات واضح فرما دی کہ اس سے صرف وہی بچیں گے جن کو اللہ اپنی توفیق بخشے، اپنی سنت کے مطابق، اپنی بندگی و اطاعت کے لیے خاص کر لے اور وہ شیطان کے فتنوں سے محفوظ رہ جائیں۔

زمخشری کو معلوم نہیں کیا مغالطہ پیش آیا کہ یہاں انھوں نے جنوں سے فرشتوں کو مراد لیا ہے۔ ہم نے آیات کی صحیح تاویل واضح کر دی ہے، اس وجہ سے اس کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ قرآن میں ملائکہ و جنات کا ذکر دو بالکل مختلف الجنس اور مختلف الصفات مخلوقات کی حیثیت سے ہوا ہے، ان دونوں کو ایک قرار دینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بس زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ جنات اپنی خلقت کے اعتبار سے انسان کے بالمقابل ملائکہ سے قریب تر ہیں اس لیے کہ جنات کی خلقت نار سے ہوئی ہے، فرشتوں کی نور سے اور انسان کی مٹی سے۔

فَاِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ۝ مَآ اَنْتُمْ عَلَیْہِ بِفٰتِنِیْنَ ۝ اِلَّا مَنْ ھُوَ صَالِ الْجَحِیْمِ (۱۶۱-۱۶۳)

اللہ تعالیٰ کی آزمائشیں صرف امتحان کے لیے ہیں

بعض اہلِ تاویل نے "عَلَیْہِ بِفٰتِنِیْنَ" میں "عَلٰی" کو خلاف کے مفہوم میں لیا ہے اور ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کو قرار دیا ہے۔ مجھے اس پر جزم نہیں ہے لیکن اگر یہ توجیہ قبول کر لی جائے تو ان آیات میں جنات پرستوں کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ تم اور تمھارے یہ معبود دونوں مل کر، اپنے اس فتنے کے ذریعے سے جو تم نے کھڑا کیا ہے، خدا سے صرف انھی لوگوں کو برگشتہ کر سکتے ہو جو اپنی بداعمالیوں کے باعث خود جہنم میں پڑنے والے ہیں۔ گویا جو بات ابلیس کے چیلنج کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمائی تھی کہ تیرا زور صرف انھی پر چلے گا جو تیری پیروی کرنے والے بنیں گے، میرے مخلص بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا، وہی بات یہاں دوسرے الفاظ میں فرما دی گئی ہے اور مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے نظام میں یہ آزمائشیں جو رکھی ہیں یہ لوگوں کو گمراہی میں ڈالنے کے لیے نہیں، بلکہ محض امتحان

کے لیے ہیں۔ اللہ کے جو بندے اس امتحان میں پورے اترنے کی کوشش کریں گے، شیطان اور اس کے پرستاران کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

ضمیر مجرور کے مرجع سے متعلق فراہی کی رائے

استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ضمیر مجرور کا مرجع 'مَا تَعْبُدُوْنَ' ہے۔ ان کے نزدیک تاویل یہ ہے کہ تم اپنے ان معبودوں پر صرف انہی لوگوں کو مفتون بنا سکتے ہو جو خود جہنم ہی میں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس تاویل پر بھی مجھے پورا جزم نہیں ہے۔ میں نے اس کا حوالہ صرف اس لیے دے دیا ہے کہ جو اصحابِ علم ان آیات پر غور کرنا چاہیں وہ اس کو بھی سامنے رکھیں۔

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۝ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۝ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ (۱۶۴-۱۶۶)

فرشتوں کی حیثیت سے متعلق حضرت جبریلؑ کا بیان

فرشتوں کی حیثیت سے متعلق اوپر جو باتیں بیان ہوئی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ اب ان آیات میں فرشتوں کے گل سرسبد، حضرت جبریل امینؑ اللہ تعالیٰ کے حکم سے براہِ راست اپنی اور تمام ملائکہ کی حیثیت واضح فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں ان کا مرتبہ و مقام کیا ہے اور اس کی بارگاہ میں وہ کن اعمال و اشغال میں مشغول رہتے ہیں۔ مقصود اس سے ان لوگوں کی تفضیح ہے جو فرشتوں کو خدائی میں شریک مان کر ان کی پرستش کر رہے تھے کہ وہ سن لیں کہ تمام فرشتوں کے سردار کا بیان کیا ہے اور یہ احمق لوگ فرشتوں کو کیا بنائے بیٹھے ہیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قرآن میں متعدد نہایت واضح مثالیں اس کی موجود ہیں کہ اثنائے کلام میں کوئی بات براہِ راست حضرت جبریلؑ کی زبانی کہلوا دی گئی ہے۔ اس کی نظیر مطلوب ہو تو سورۂ مریم کی آیات ۶۴-۶۵ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ یہ طریقہ ان مواقع میں اختیار کیا گیا ہے جہاں بات حضرت جبریلؑ کی زبان سے کہے جانے کے باعث زیادہ مؤثر اور بلیغ ہو گئی ہے۔ یہ موقع اسی قسم کا ہے۔ جو لوگ فرشتوں کے شریکِ خدا ہونے کے وہم میں مبتلا تھے ان کے وہم پر ضرب لگانے کے لیے سب سے زیادہ مؤثر چیز یہی ہو سکتی تھی کہ خود حضرت جبریلؑ ان کے آگے اپنی اور پورے زمرۂ ملائکہ کی حیثیت واضح کر دیں۔ اس مقصد کے لیے حضرت جبریل علیہ السلام کی شہادت سے بڑی شہادت کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ اب دیکھیے کہ حضرت جبریلؑ کیا فرماتے ہیں۔

'وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ'۔ وہ پہلی بات یہ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک کا دائرۂ کار معین اور اس کی رسائی محدود ہے۔ وہ اپنی نسبت بھی یہی بیان دیتے ہیں کہ ان کی رسائی کی بھی ایک خاص حد ہے اس سے باہر وہ بھی نہیں جا سکتے۔ اس مسئلہ پر سورۂ فاطر کی آیت ا کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرشتوں کی حیثیت خدا کے محکوم و تابعدار اہلکاروں کی ہے۔ وہ نہ اپنے حدود سے باہر پر مار سکتے، نہ کسی امر میں خدا کے اذن کے بغیر دخل دے سکتے، نہ کوئی کام بطور خود کرنے کی جرأت کر سکتے۔ اب کتنے احمق ہیں وہ لوگ جو خدا کے ان محکوم

بندوں کو شریک خدائی مان کر ان سے یہ توقع لیے بیٹھے ہیں کہ وہ ان کے لیے جو چاہیں کر سکتے ہیں یہاں تک کہ خدا بھی اگر ان پر ہاتھ ڈالنا چاہے گا تو وہ اس سے بھی ان کو بچا لیں گے۔

'وَإِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُّونَ ۝ وَإِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُونَ'۔ دوسری بات انھوں نے یہ فرمائی کہ ہم ہر وقت اس کے حضور میں صف بستہ رہنے والے اور اس کی تسبیح کرتے رہنے والے ہیں۔ فرشتوں کی صف بستگی کا ذکر اس سورہ کی پہلی ہی آیت میں ہوا ہے اور اس کے تحت ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔ 'مُسَبِّحُوْنَ' سے مقصود وہی چیز ہے جو سورہ کے شروع میں 'فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا' کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ عرش الٰہی کے اردگرد فرشتوں کی نماز ہے جو عبدیت کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ وہاں اس کو 'ذکر' سے تعبیر فرمایا ہے، یہاں 'تسبیح' سے اور قرآن میں نماز کی تعبیر ان دونوں ہی لفظوں سے ہوئی ہے۔ تسبیح میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے یعنی خدا کو ان تمام باتوں سے ارفع و منزہ قرار دینا جو اس کی شان کے منافی ہیں۔ حضرت جبریلؑ نے یہ لفظ استعمال کر کے گویا یہ بات واضح فرمائی کہ خدا کے شریک بننا تو درکنار ہم تو برابر خدا کو ان تمام خلافِ شان باتوں سے پاک قرار دینے میں سرگرم رہتے ہیں۔

وَإِنْ كَانُوا لَيَقُولُونَ ۝ لَوْ أَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِنَ الْأَوَّلِينَ ۝ لَكُنَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ۝
فَكَفَرُوا بِهِ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (۱۶۷-۱۷۰)

قریش کی ایک تعلّی

یہ مضمون پیچھے سورۂ فاطر کی آیت ۴۲ میں بھی گزر چکا ہے اور وہاں ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔ قریش کے سامنے جب یہ بات آتی کہ یہود اور دوسری قوموں نے اپنے نبیوں اور رسولوں کی تکذیب کی تو وہ بانداز تعلّی کہتے کہ بڑے ہی بدقسمت تھے وہ لوگ جنھوں نے اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی، اگر ہمارے پاس اگلوں کی کوئی تعلیم ہوتی یا ہمارے پاس اللہ کا کوئی رسول آتا تو ہم یہ رویہ نہ اختیار کرتے بلکہ ہم اس کی تعلیم کی پیروی کرتے اور خدا کے نہایت خاص بندے بن کر دکھا دیتے۔ آدمی کو جو چیز حاصل نہ ہو اس کے متعلق وہ یہی دعویٰ کرتا ہے کہ اگر مجھے یہ چیز حاصل ہو جائے تو میں یہ کارنامے کر کے دکھا دوں گا لیکن جب وہ اس کو حاصل ہو جاتی ہے تو اکثر حالات میں وہ اگلے نالائقوں سے بھی بڑھ کر نالائق ثابت ہوتا ہے۔ آج کتنے لوگ ہیں جو بڑے طنطنہ کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر ان کے ہاتھ میں حکومت کی باگ پکڑا دی جائے تو وہ دنیا کو خلافت فاروقی کا جلوہ از سرِ نو دکھا دیں گے لیکن جب ان کا امتحان ہوتا ہے تو وہ پہلے ہی قدم پر بالکل نالائق، خائن اور چور ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم نکلتے ہیں جو اس ذمہ داری کے اہل ثابت ہوں اور ان لوگوں کے اندر تو ایک بھی اہل نہیں نکلتا جو بڑے بلند بانگ دعاوی کے ساتھ اس کے مدعی بن کر اٹھتے ہیں۔ اس دنیا کی پوری تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے۔

'فَكَفَرُوا بِهِ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ'۔ فرمایا کہ یہ لوگ جس چیز کے متمنی اور مدعی تھے جب وہ آئی تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا اور اس کی تکذیب کے لیے طرح طرح کے بہانے تلاش کر رہے ہیں تو یہ عنقریب جان لیں گے کہ ان کی اس تکذیب کا کیا انجام ان کے سامنے آتا ہے۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ۝ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ ۝ وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ (۱۷۱-۱۷۳)

قریش کو ایک تنبیہ

یہ اس انجام کی طرف اشارہ ہے جس سے رسولوں کے مکذبین کو لازماً دوچار ہونا پڑتا ہے اور مقصود اس سے قریش کو متنبہ کرنا ہے کہ اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو وہی سنتِ الٰہی ان کے باب میں بھی ظاہر ہوگی جو اس سے پہلے دوسرے مکذبین کے لیے ظاہر ہو چکی ہے۔

'کلمۃ' سے مراد یہاں وہ سنتِ الٰہی ہے جو اپنے رسولوں سے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جگہ جگہ واضح فرما دی ہے۔ مثلاً

'كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ' (المجادلۃ: ۲۱) (اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں غالب رہوں گا اور میرے رسول۔ بے شک اللہ قوی اور غالب ہے)۔

دوسرے مقام میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ سنت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ (المؤمن: ۵۱)

اور ہم لازماً اپنے رسولوں کی اور اہل ایمان کی مدد کریں گے دنیا کی زندگی میں بھی اور اس دن بھی جس دن گواہ گواہی دینے کو اٹھیں گے۔

ہم اس کتاب میں جگہ جگہ وضاحت کر چکے ہیں کہ جس قوم پر اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی رسول کے ذریعے سے حجت تمام کی اگر وہ ایمان نہیں لائی ہے تو لازماً تباہ کر دی گئی ہے۔ رسول اتمام حجت کا آخری ذریعہ ہوتا ہے اس وجہ سے اس کا ظہور قوم کے لیے خدا کی عدالت کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے حق و باطل کے درمیان جو کشمکش برپا ہوتی ہے وہ اس کے اور اس کے ساتھیوں کے غلبہ اور اس کے مخالفوں کی تباہی پر منتہی ہوتی ہے۔ ہم نے اس سنت کے تمام مراحل کی وضاحت اس کے محل میں کر دی ہے۔ یہاں نبی اور رسول کے اس فرق کو بھی ملحوظ رکھیے جس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

'وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ'۔ رسول اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کا لشکر بھی ہوتا ہے اور جن کے ساتھ خدا کے فرشتوں کا لشکر ہو دنیا کی کوئی قوت ان کو شکست نہیں دے سکتی۔ اس لشکر کو امتحان کے طور پر آزمائشیں تو پیش آتی ہیں لیکن فتح بالآخر اسی کو حاصل ہوتی ہے۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتَّى حِينٍ ۝ وَأَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُونَ (۱۷۴-۱۷۵)

نبی صلعم کو تلقین صبر

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور صبر و انتظار کی تلقین ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کچھ عرصے کے لیے ان کی زیادتیوں سے اعراض کرو تاکہ اللہ کی حجت ان پر تمام ہو جائے اور یہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں۔ تم ان کو کچھ عرصے تک دیکھو کہ یہ کیا بنا رہے ہیں، یہ بھی عنقریب دیکھ لیں گے کہ انھوں نے کیا بنایا اور اس کا انجام کس شکل میں ان کے سامنے آیا!

أَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ۝ فَإِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِينَ ۝ وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتَّى

حِيْنٍ ۝ وَّاَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ (۱۷۲-۱۷۹)

یعنی رسول کی تکذیب کی صورت میں ان کو جس عذاب سے ڈرایا جا رہا ہے اگر وہ اس کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب تک وہ عذاب یا اس کا کوئی نمونہ ان کو دکھا نہ دیا جائے گا وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں تو ان کو آگاہ کر دو کہ وہ عذاب کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ وہ جب ان کے صحنوں اور میدانوں میں اترے گا تو جن کو اس سے آگاہ کیا جا چکا ہے ان کے لیے وہ وقت نہایت برا ہو گا۔ رسول کے انذار کے بعد جو عذاب آیا کرتا ہے وہ اس قوم کو ہمیشہ کے لیے پامال کر دیتا ہے۔

یہ امر بیان ملحوظ رہے کہ عرب میں غارت گری کا اصلی وقت صبح کا وقت ہوتا تھا اس وجہ سے لفظ 'صباح' غارت گری اور حملہ کے مفہوم میں بھی آتا ہے اور 'واصباحا' کے نعرے میں اس کا یہی مفہوم ہے۔

اس کے بعد پھر اسی تسلی اور وعید کے مضمون کا اعادہ فرمایا جو اوپر آیات ۱۷۴-۱۷۵ میں گزر چکا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ ابھی کچھ دنوں اور ان کی ان ژاژ خائیوں کو نظر انداز اور انتظار کرو اور کفار کو دھمکی دی کہ جلد وہ وقت آ رہا ہے جب وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے جس سے ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (۱۸۰)

یعنی تمہارا رب جو تمام عزت و اقتدار کا حقیقی مالک ہے وہ ان تمام باتوں سے ارفع اور پاک ہے جو یہ مشرکین اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس نے ان کو ان خرافات سے آگاہ اور ان کے نتائج سے باخبر کر دیا۔ اگر وہ اب بھی ان باتوں سے باز نہیں آتے تو اس کا انجام دیکھیں گے۔

وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ (۱۸۱)

اوپر دوسرے رسولوں کے سلسلہ میں جس طرح سلامتی کی یہ بشارت وارد ہوئی ہے اسی طرح آخر میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بشارت ہے کہ جو سنتِ الٰہی تمام رسولوں کے لیے ظاہر ہوئی وہی تمہارے لیے ہے۔ اللہ کے رسولوں کے لیے سلامتی ہے۔ تباہی ان کے دشمنوں کے لیے ہے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۸۲)

اور اللہ حمد و شکر کا سزاوار ہے اس وجہ سے وہ اس کشمکشِ حق و باطل میں لازماً حق کا بول بالا کرے گا اور باطل کو شکست دے گا۔ وہ عالم کا پروردگار ہے اس کی اس پروردگاری کا لازمی تقاضا ہے کہ اس دنیا میں بھی اس کا عدل ظاہر ہو اور آخرت میں بھی اس کے عدلِ کامل کا ظہور ہو۔ یہی اس کی ربوبیت کا تقاضا ہے اور اسی بنیاد پر وہ دنیا اور آخرت دونوں میں سزاوارِ حمد ہے۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

رحمان آباد ـــــ ۲۹ راپریل ۱۹۷۵ء

تدبرِ قرآن

۳۸

ص

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

اس گروپ کی پچھلی سورتوں کی طرح اس سورہ کی بنیاد بھی توحید ہی پر ہے۔ اس میں یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ قرآن قریش کے لیے ایک عظیم یاددہانی ہے لیکن یہ محض اپنے کبر و غرور اور شرک پرستی کے جوش و جنون میں اس کی مخالفت کر رہے ہیں اور اس انجام سے بالکل بے پروا ہیں جس سے قرآن ان کو آگاہ کر رہا ہے۔ یہ اس انجام کو دیکھ کر اس پر ایمان لائیں گے لیکن اس وقت کا ایمان بالکل بے سود ہوگا۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۱۱) یہ قرآن لوگوں کے لیے یاددہانی ہے لیکن لوگ کبر و غرور کی بنا پر اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ان سے پہلے کتنی قومیں گزر چکی ہیں جنھوں نے اللہ کی یاددہانی کے معاملے میں یہی روش اختیار کی اور وہ ہلاک ہوئیں۔ یہ بھی انھی کی طرح اس وقت ایمان لائیں گے جب پانی سر سے گزر چکے گا۔ ان لوگوں پر یہ بات شاق گزری ہے کہ انھی کے اندر کا ایک شخص اللہ کے رسول کی حیثیت سے، ان کو شرک کے انجام سے ڈرائے چنانچہ وہ پورے جوش کے ساتھ اپنے معبودوں اور دینِ آبائی کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور رسول کو ساحر و کذاب قرار دے رہے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کی تمام نعمتوں کا اجارہ دار اپنے آپ کو سمجھے بیٹھے ہیں۔ اس وجہ سے اس خبط میں مبتلا ہیں کہ اگر اللہ کو کوئی کتاب اتارنی ہوتی تو وہ انھی کے اندر کے کسی رئیس پر اتارتا نہ کہ (نعوذ باللہ) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسے ایک قلاش آدمی پر! گویا آسمان و زمین کی خدائی انھی کے ہاتھ میں ہے۔ انھیں پتہ نہیں ہے کہ جب خدا کی پکڑ میں آ جائیں گے تو کسی کی کچھ پیش نہیں جائے گی۔

(۱۲-۱۶) ماضی کی بعض سرکش قوموں کا حوالہ جنھوں نے اللہ کے رسولوں کے ساتھ یہی متکبرانہ روش اختیار کی اور بالآخر کیفرِ کردار کو پہنچیں۔ اسی ذیل میں قریش کو تنبیہ کہ خدا کے قہر کو دعوت نہ دو۔ تم اس کی ایک ڈانٹ کی بھی تاب نہیں لا سکتے۔

(۱۷-۲۶) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین اور حضرت داؤد علیہ السلام کی زندگی کے بعض واقعات کا حوالہ کہ اللہ نے ان کو بے مثال قوت و حشمت دی لیکن وہ اس سے کسی گھمنڈ میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ ان کی دولت و شوکت میں جتنا ہی اضافہ ہوتا گیا اتنی ہی ان کی شکرگزاری اور انابت میں بھی ترقی ہوتی گئی۔ وہ دوسروں کے واقعات

سے متنبہ ہو کر اپنی زندگی کی اصلاح کے لیے سبق حاصل کرتے۔ ان کی حکومت ایک عادلانہ حکومت تھی۔ انھوں نے خدا کی زمین میں حق و عدل قائم کیا۔ استکبار میں مبتلا ہو کر اس میں فساد نہیں برپا کیا۔

(۲۷-۲۹) ایک برمحل تنبیہ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا بازیچۂ اطفال نہیں بنائی ہے۔ اس کو جو لوگ بازیچۂ اطفال سمجھتے ہیں وہ آخرت کے منکر ہیں۔ اگر آخرت نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس دنیا کے خالق کی نظر میں مصلح اور مفسد، متقی اور فاجر دونوں یکساں ہیں۔ ایک حکیم خالق کے متعلق یہ بات تصور بھی نہیں کی جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب اسی لیے اتاری ہے کہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں، اس کی دلیلوں سے یاددہانی حاصل کریں اور اس قسم کی مہلک غلط فہمیوں سے نکلیں۔

(۳۰-۴۰) حضرت سلیمان علیہ السلام کی دولت و حشمت اور ان کے شکر و انابت کے بعض واقعات کا حوالہ بالکل اسی مقصد سے جس مقصد سے اوپر حضرت داؤد علیہ السلام کے بعض واقعات کا حوالہ گزرا ہے۔

(۴۱-۴۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے بعض انبیاء علیہم السلام کا اجمالی حوالہ کہ راہِ حق میں ان کو جو مصیبتیں پیش آئیں انھوں نے خندہ پیشانی اور استقلال کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا جس کے صلہ میں اللہ نے ان کو دنیا اور آخرت دونوں میں سرخروئی عطا فرمائی۔

(۵۰-۶۴) اس حقیقت کا اظہار کہ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے اس وجہ سے لازماً اس کے بعد ایک فیصلے کا دن آئے گا جس میں متقی اور فاجر دونوں اپنے اپنے اعمال کی جزا یا سزا پائیں گے۔ اسی جزا و سزا کی وضاحت۔

(۶۵-۸۸) خاتمۂ سورہ جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ اعلان کہ میں ایک منذر ہوں، اللہ واحد و قہار کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ میں جس بات کی خبر دے رہا ہوں وہ ایک امرِ شدنی ہے اور جو لوگ بربنائے استکبار اس کی تکذیب کر رہے ہیں وہ ابلیس کی پیروی کر رہے ہیں اور وہ اسی انجام سے دوچار ہوں گے جو ابلیس اور اس کے پیرووں کے لیے مقدر ہے۔

سُوْرَةُ صٓ (۳۸)

مَكِّيَّةٌ —— اٰيَاتُهَا ۸۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ ۝۱ بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ آيات
وَّشِقَاقٍ ۝۲ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ ۱-۲۶
حِیْنَ مَنَاصٍ ۝۳ وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ
الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝۴ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ
اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝۵ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَ
اصْبِرُوْا عَلٰٓی اٰلِهَتِكُمْ ۚۖ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ۝۶ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا
فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚۖ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝۷ ءَاُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ
مِنْۢ بَیْنِنَا ؕ بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِیْ ۚ بَلْ لَّمَّا یَذُوْقُوْا عَذَابِ ۝۸
اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآىِٕنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِیْزِ الْوَهَّابِ ۝۹ اَمْ لَهُمْ
مُّلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا ۣ فَلْیَرْتَقُوْا فِی الْاَسْبَابِ ۝۱۰
جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ ۝۱۱ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ
نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ ۝۱۲ وَثَمُوْدُ وَقَوْمُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ

لْئَيْكَةِ ۚ أُولَٰئِكَ الْأَحْزَابُ ﴿١٣﴾ إِنْ كُلٌّ إِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ

ع ۱ ۱۴ ۱۰ عِقَابِ ﴿١٤﴾ وَمَا يَنْظُرُ هَٰؤُلَاءِ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً مَا لَهَا مِنْ

فَوَاقٍ ﴿١٥﴾ وَقَالُوا رَبَّنَا عَجِّلْ لَنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ﴿١٦﴾

ترجمۂ آیات ۱-۱۶

یہ سورۂ صٓ ہے۔ قسم ہے یاددہانی سے معمور قرآن کی (کہ اس کی ہر بات حق ہے) بلکہ جن لوگوں نے اس کا انکار کیا وہی گھمنڈ اور مخاصمت میں مبتلا ہیں۔ ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کردیں تو انھوں نے اس وقت ہائے پکار کی جب کوئی مفر باقی نہیں رہا۔ ۱-۳

ان لوگوں نے تعجب کیا کہ ان کے پاس انہی میں سے ایک آگاہ کرنے والا آیا۔ اور کافروں نے کہا یہ تو ساحر اور جھوٹا ہے۔ کیا اس نے تمام معبودوں کو ایک کر دیا! یہ تو بڑی ہی عجیب بات ہوئی! ان کے لیڈر اٹھ کھڑے ہوئے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو بے شک یہ کام کرنے کا ہے! ہم نے یہ بات اس دورِ آخر میں تو سنی نہیں! یہ محض ایک من گھڑت بات ہے! کیا ہمارے اندر سے اسی شخص پر یہ یاددہانی نازل کی گئی! بلکہ یہ لوگ میری یاددہانی کے باب میں مبتلائے شک ہیں۔ بلکہ اب تک انھوں نے میرے عذاب کا مزا نہیں چکھا۔ ۴-۸

کیا تیرے رب عزیز و وہاب کے فضل کے خزانے انہی کی تحویل میں ہیں! کیا آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کی بادشاہی انہی کے اختیار میں ہے! اگر ایسا ہے تو وہ آسمانوں کے اندر چڑھ جائیں (جب میرا عذاب آجائے گا) تو اس وقت جماعتوں میں سے کوئی بڑے سے بڑا لشکر بھی شکست کھا کے رہے گا۔ ۹-۱۱

ان سے پہلے قوم نوح، عاد اور کھونٹوں والے فرعون نے تکذیب کی اور ثمود، قوم لوط اور ایکہ والوں نے بھی۔ یہ پارٹیاں ہیں۔ ان سب ہی نے رسولوں کو جھٹلایا تو میرا عذاب

ان پر نازل ہو کے رہا۔ اور یہ لوگ بھی صرف ایک ڈانٹ کے منتظر ہیں۔ جس کے بعد کوئی ڈھیل نہیں۔ اور انھوں نے کہا کہ اے رب، ہمارا حساب روزِ حساب سے پہلے ہی چکا دے۔ ۱۲-۱۶

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ (۱)

'صٓ' حروفِ مقطعات میں سے ہے۔ یہ اس سورہ کا قرآنی نام ہے۔ ان حروف پر جامع بحث بقرہ کے شروع میں گزر چکی ہے۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی متعین کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ محض تکلف ہے۔

قرآن کے 'ذکر' سے موسوم ہونے کے بعض پہلو

'وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ' جس طرح قرآن کی قسم سورۂ یٰسٓ میں 'حکیم' کی صفت کے ساتھ وارد ہوئی ہے اسی طرح یہاں 'ذِی الذِّکْرِ' کی صفت کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔ 'ذکر' کا اصل مفہوم یاددہانی کرنا ہے۔ قرآن سرتاسر یاددہانی ہے۔ اس وجہ سے اس کا نام بھی جگہ جگہ 'ذکر' آیا ہے۔ آگے آیت ۸ میں اس کا یہی نام آیا ہے۔ اس کے اس نام اور اس صفت سے موسوم و موصوف ہونے کے کئی پہلو ہیں۔

—— یہ ان تمام حقائق کی یاددہانی کرتا ہے جو انسان کی فطرت کے اندر ودیعت ہیں لیکن انسان ان کو بھولا ہوا ہے۔

—— اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے خلق کے لیے جو ہدایت نازل فرمائی اور جس کو لوگ بھلا بیٹھے تھے، یہ اس کی بھی یاددہانی کرتا ہے۔

—— اللہ تعالیٰ کی رحمت اور نقمت کے ظہور کے جو بڑے بڑے واقعات اس دنیا میں پیش آئے، اس کے اندر ان کی بھی یاددہانی ہے۔

—— رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کو جس انجام سے دوچار ہونا پڑا، یہ ان سے بھی باخبر کرتا ہے۔

—— اس دنیا کی زندگی کے بعد جس مرحلۂ حساب و کتاب اور جزا و سزا سے لوگوں کو سابقہ پیش آنا ہے، یہ اس کو بھی یاد دلاتا ہے۔

یہ سارے پہلو اس کی صفت 'ذِی الذِّکْرِ' کے اندر موجود ہیں۔ آگے اسی سورہ کی آیات ۸، ۱۷، ۲۶، ۲۹، ۴۹ اور ۸۷ کے تحت ان کی وضاحت آ رہی ہے۔

مُقسَم علیہ قسم کے اندر مضمر ہے

اس قسم کا مُقسَم علیہ یہاں الفاظ میں مذکور نہیں ہے بلکہ وہ قسم کے اندر ہی مضمر ہے۔ یہ طریقہ ان مواقع میں اختیار کیا جاتا ہے جہاں قسم کی نوعیت ایسی ہو کہ مُقسَم علیہ ذکر کے بغیر اس سے واضح ہو رہا ہو۔ یہاں یہی صورت ہے۔ مقصد یہ ہے کہ قرآن جن یاد دہانیوں سے مملو ہے وہ اس بات پر شاہد ہیں کہ آج قریش کو جن باتوں کی تذکیر کی جا رہی ہے وہ بالکل ناقابلِ انکار ہیں۔ اگر وہ ان کو نہیں مان رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ قرآن کے اندر کسی ریب و شک کی گنجائش ہے بلکہ اس کا سبب محض ان کی انانیت اور مخاصمت ہے۔

بَلِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِیۡ عِزَّۃٍ وَّ شِقَاقٍ (۲)

قرآن کی مخالفت کی اصل علت

'اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا' سے مراد یہاں خاص طور پر قریش ہیں۔ فرمایا کہ ان کے انکار کی وجہ یہ نہیں ہے کہ قرآن کی تذکیر میں کوئی کسر ہے بلکہ یہ گھمنڈ اور مخاصمت میں مبتلا ہیں۔ ان کے اس گھمنڈ اور ضد کی وضاحت آگے کی آیات میں آ رہی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ خرابی قرآن میں نہیں بلکہ خود ان لوگوں کے اپنے اندر ہے۔ قرآن ہر پہلو سے نہایت مدلل، دلنشین اور مؤثر یاد دہانی کر رہا ہے لیکن جن لوگوں نے انانیت اور مخالفت کی روش اختیار کر رکھی ہو ان پر اس کی تذکیر کیا کارگر ہو سکتی ہے!

کَمۡ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ فَنَادَوۡا وَّ لَاتَ حِیۡنَ مَنَاصٍ (۳)

ماضی کی تاریخ کی طرف ایک اشارہ

یعنی ان کی انانیت پر یہ بات بہت شاق گزر رہی ہے کہ انھیں ڈرایا جا رہا ہے کہ اگر وہ قرآن کی تکذیب پر اڑے رہے تو خدا کے عذاب کی زد میں آ جائیں گے۔ حالانکہ تاریخ کی کتنی مثالیں ان کو سنائی جا چکی ہیں کہ جن قوموں نے ان کی طرح ضد کی ہم نے ان کو تباہ کر دیا۔ جب وہ خدا کی پکڑ میں آ گئیں تو انھوں نے بہت ہائے پکار اور توبہ و ایمان کی منادی کی۔ لیکن اس وقت ان کے لیے کوئی مفر باقی نہیں رہا تھا اس لیے کہ ظہورِ عذاب کے بعد توبہ اور ایمان کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔

'لَاتَ'

'لَاتَ' اصل میں 'لَا' ہے البتہ اس کے ساتھ 'ت' کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اسی طرح کا اضافہ 'ثُمَّ' اور 'رُبَّ' کے ساتھ بھی ہو جاتا ہے۔ البتہ اس صورت میں یہ وقت کی نفی کے لیے خاص ہو جاتا ہے جس طرح یہاں ہے۔

وَ عَجِبُوۡۤا اَنۡ جَآءَہُمۡ مُّنۡذِرٌ مِّنۡہُمۡ ۫ وَ قَالَ الۡکٰفِرُوۡنَ ہٰذَا سٰحِرٌ کَذَّابٌ (۴)

مکذبین کا غرور

یعنی ان کو اس بات پر تعجب ہوا کہ انہی کے اندر کا ایک شخص ان کے لیے خدا کا منذر بن کر آیا۔ خدا کو کوئی منذر ہی بھیجنا ہوتا تو کسی مافوق بشر ہستی کو منذر بناتا، انہی جیسے ایک انسان کو منذر بنانے کے کیا معنی! اور اگر انسان ہی کو منذر بنانا تھا تو آخر خدا کی نظر ایک غریب آدمی پر کیوں پڑی، مکہ اور طائف کے سرداروں میں سے کسی کو اس مقصد کے لیے اس نے کیوں نہیں انتخاب کیا؟ گویا پیغمبر کی بشریت بھی ان کے لیے وجہ انکار بنی اور ان کی غربت و ناداری بھی۔ اس آیت میں پہلی وجہ انکار کی طرف اشارہ ہے، آگے آیت ۸ میں دوسری وجہ انکار کا ذکر آ رہا ہے اور یہ دونوں باتیں غرور و گھمنڈ میں داخل

ہیں جس کا ذکر اوپر لفظ 'عزت' سے ہوا ہے۔

قرآن سے عوام کو برگشتہ کرنے کے لیے قریش کے لیڈروں کا ایک شعلہ

'وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ' یعنی اپنے اس عُجب و استکبار کی بنا پر ان کافروں نے ہمارے پیغمبر کو 'ساحر' اور 'کذاب' قرار دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساحر اور قرآن کو سحر کہنے کی وجہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ قریش کے لیے قرآن کی معجزانہ فصاحت و بلاغت سے تو انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی لیکن وہ اپنے عوام پر یہ اثر نہیں پڑنے دینا چاہتے تھے کہ وہ اس فصاحت و بلاغت سے مسحور ہو کر اس کو کلامِ الٰہی مان لیں۔ اس چیز سے لوگوں کو بچانے کے لیے وہ قرآن کو سحر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساحر کہتے اور لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے کہ اس شخص کے کلام میں جو تاثیر و تسخیر ہے وہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اس پر آسمان سے وحی آتی ہے بلکہ یہ کلام کا جادوگر ہے اس وجہ سے اس کی باتیں دلوں پر اثر کرتی ہیں۔ قرآن کو شعر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہنے کی وجہ بھی یہی تھی۔

'کَذَّابٌ' کے معنی ہیں جھوٹا، لپاٹیا اور لاف زن۔ یہ لفظ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کی تردید کے جوش میں کہتے۔ یعنی ہے تو یہ شخص کلام کا جادوگر لیکن عوام پر اپنی دھونس جمانے کے لیے دعویٰ یہ کرتا ہے کہ وہ جو کچھ لوگوں کو سنا رہا ہے وہ خدا کی طرف سے اس پر وحی ہوتا ہے اور وہ خدا کا منذر ہو کر آیا ہے۔ چونکہ ان کو اصل چڑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت ہی سے تھی اس وجہ سے اس کی تردید میں وہ نہایت سخت تھے جس کا اظہار اس لفظ سے بھی ہو رہا ہے۔

اس آیت کا اسلوبِ بیان شاہد ہے کہ اس میں ان محروم القسمت لوگوں کے حال پر اظہارِ حسرت ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تو ان کی تنبیہ و تذکیر کے لیے ان کے اندر ایک منذر بھیجا، ان کے لیے ایک یاد دہانی کرنے والی کتاب نازل فرمائی لیکن وہ غرور کے سبب سے اس بات پر تعجب کر رہے ہیں کہ انہی جیسا ایک بشر ان کے پاس انذار کے لیے آئے۔ اس رعونت میں ان کافروں نے اللہ کے رسول کو ساحر اور کذاب بنا ڈالا۔

أَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ (۵)

قریش کا زہریلا پروپیگنڈا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کے ساتھ دوسری چیز جس سے قریش کے لیڈروں کو سب سے زیادہ چڑ تھی وہ آپ کی دعوتِ توحید تھی۔ اس کی آڑ لے کر وہ اپنے عوام کو آپ کے خلاف خوب بھڑکاتے۔ چونکہ قبیلہ قبیلہ کے بُت جدا جدا تھے اور ہر قبیلہ اپنے بُت کے ساتھ اندھی بہری عقیدت رکھتا تھا اس وجہ سے وہ قبائل کی عصبیت بھڑکانے کے لیے یہ زہریلا پروپیگنڈا کرتے کہ اس شخص نے تمام معبودوں کو ختم کر کے ایک معبود بنا ڈالا، اس سے زیادہ عجیب بات اور کیا ہو سکتی ہے! اس فقرے کے اندر غور کیجیے تو دو زہر چھپے ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ اس شخص نے اس معبود کے سوا، جس کو یہ خود معبود مانتا ہے دوسرے تمام معبودوں کی خدائی ختم کر دی۔ دوسرا یہ کہ یہ اس نے ایسی حرکت کی ہے جو ایک نہایت انوکھی حرکت ہے

جس کی کوئی مثال ہم اپنے آبار و اجداد کی تاریخ میں نہیں پاتے۔ لفظ 'عُجَابٌ' کے اندر 'عجیب' کے مقابل میں مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ پروپیگنڈا پوری قوم عرب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مشتعل کر دینے کے لیے کافی تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے شر سے اپنے پیغمبر کو محفوظ رکھا۔

وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓی اٰلِهَتِكُمْ ۚۖ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ (۶)

لیڈروں کے طرزِ عمل کی تصویر

یہ تصویر ہے اس رویے کی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید سے لوگوں کو برگشتہ کرنے کے لیے قریش کے لیڈر اختیار کرتے۔ اگر وہ کبھی دیکھتے کہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سے متاثر ہو رہے ہیں تو یہ وہاں سے چل کھڑے ہوتے اور دوسروں کو بھی اکساتے کہ یہاں سے چلو، اس شخص کی باتیں نہ سنو بلکہ اپنے معبودوں کی عبادت پر جمے رہو۔

اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ۔ یعنی کرنے کا اصلی کام یہ ہے۔ یہ شخص جو وعظ تمھیں سنا رہا ہے یہ تمھارے دینِ آبائی سے تم کو پھیرنے کی کوشش ہے۔ اس کے برعکس کرنے کا کام، جو ہم میں سے ہر شخص کا مطلوب ہونا چاہیے یہ ہے کہ ہم اس کی تمام کوششوں کے علی الرغم اپنے معبودوں کی عبادت پر آخر دم تک جمے رہیں۔

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚۖ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ (۷)

عرب کی تاریخ سے متعلق قرآن اور قریش کے نقطۂ نظر کا اختلاف

یہ قریش کی طرف سے اس تاریخ کی تردید ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ملتِ عرب کی بیان فرماتے۔ آپ نے حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بعد کے انبیاء کی تاریخ سے یہ واضح فرما دیا تھا کہ ان تمام انبیاء نے توحید خالص کی تعلیم دی، خاص کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم و دعوت اور حضرت اسماعیلؑ اور بیت اللہ کی جو تاریخ قرآن میں نہایت وضاحت سے بیان ہوئی ہے اس کا مقصد عربوں پر اسی حقیقت کو واضح کرنا تھا کہ ان کی ملت کی اصلی تاریخ حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ سے شروع ہوتی ہے اور ان بزرگ نبیوں نے اپنی اولاد کو اس سرزمین میں اسلام کی خدمت اور توحید خالص کی دعوت کے لیے بسایا تھا اور اسی مقصد کے لیے اس گھر کی تعمیر فرمائی تھی جس کے آج قریش متولی بنے ہوئے ہیں۔ اور جس کے کونے کونے میں انھوں نے بتوں کو لا بسایا ہے۔ یہ تاریخ قریش کے تمام مزعومات پر ایک ضرب کاری تھی لیکن یہ اس قدر واضح اور دل نشین تھی کہ اس کے خلاف کہنے کے لیے ان کے پاس کوئی ایسی بات نہیں تھی جو لوگوں کو اپیل کر سکے لیکن وہ اپنے گھمنڈ اور اپنی مکابرت کے سبب سے اس کو ماننے کے لیے بھی تیار نہیں تھے اس وجہ سے کہتے کہ یہ توحید کی بات ہم نے اپنی ملت کے دورِ آخر میں تو سنی نہیں اس وجہ سے یہ ساری داستان جو توحید کے حق میں ہم کو سنائی جاتی ہے بالکل من گھڑت ہے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ اگر ملتِ عرب کی تاریخ یہ ہوتی جو قرآن میں بیان کی جا رہی ہے اور جس کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس تحدی کے ساتھ پیش کر رہے ہیں تو آخر اس کی کچھ صدائے بازگشت اس ملت کے دورِ آخر میں بھی تو ہونی چاہیے تھی! لیکن ہم نے اپنے آبا و اجداد سے تو اس طرح کی کوئی بات نہیں سنی۔ ہم نے یہی دین

ان سے پایا، اسی پر چل رہے ہیں اور اسی پر چلتے رہیں گے۔

بعض لوگوں نے 'ملّتِ آخرہ' سے ملّتِ عیسوی کو مراد لیا ہے لیکن اس کا کوئی قرینہ یہاں نہیں ہے۔ ملّتِ عیسوی کا حوالہ تو اس شکل میں ان کے لیے معتبر و مؤثر ہوتا جب وہ اور ان کے عوام اس کے معتقد ہوتے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی دعوت ملّتِ عیسوی کی بنیاد پر دی ہوتی۔

ءَاُنۡزِلَ عَلَیۡهِ الذِّكۡرُ مِنۡۢ بَیۡنِنَا ؕ بَلۡ هُمۡ فِیۡ شَكٍّ مِّنۡ ذِكۡرِیۡ ۚ بَلۡ لَّمَّا یَذُوۡقُوۡا عَذَابِ (۸)

قریش کے پندارِ سیادت پر ضرب

یعنی وہ اپنی ریاست و امارت کے غرور میں کہتے ہیں کہ اگر خدا کو کوئی کتاب کسی بشر پر اتارنی ہی ہوتی تو کیا اس کے لیے ہمارے اندر سے اس کو یہی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ملے! اللہ تعالیٰ اگر یہ کام کرنا چاہتا تو اس کے لیے وہ مکہ یا طائف کے رئیسوں میں سے کسی کا انتخاب کرتا نہ کہ ان کے جیسے ایک مفلس و نادار آدمی کا۔ اس نے تمام سرفرازیاں تو ہم کو بخشیں تو اس عزت کے لیے وہ ان کا انتخاب کیوں کرتا؟ یہ ان کے اس پندار کا بیان ہے جس کا ذکر آیت ۲ میں 'فِیۡ عِزَّةٍ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔ اُن کے اس پندار پر ضرب لگانے کے لیے فرمایا کہ 'بَلۡ هُمۡ فِیۡ شَكٍّ مِّنۡ ذِكۡرِیۡ ۚ بَلۡ لَّمَّا یَذُوۡقُوۡا عَذَابِ' کہ ان کی یہ تمام مشیخت مآبیاں اس وجہ سے ہیں کہ ان کو اس قرآن کے ذریعے جس عذاب کی یاددہانی کی جارہی ہے اس کی طرف سے ابھی وہ شک میں ہیں، یہ اس کو محض ہوائی بات سمجھ رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک وہ ان کے سامنے آیا نہیں اور یہ لوگ مجرد باتوں سے قائل ہونے والے اسامی نہیں ہیں بلکہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھ کر ماننے والے لوگ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی تو ان کو دلیلوں سے سمجھانے کی کوشش کی جارہی ہے لیکن اگر یہ دلیلوں سے نہ سمجھے تو بالآخر عذاب کا تازیانہ بھی ان کے لیے نمودار ہوجائے گا۔

اَمۡ عِنۡدَهُمۡ خَزَآئِنُ رَحۡمَةِ رَبِّكَ الۡعَزِیۡزِ الۡوَهَّابِ (۹)

رعونت کا جواب

یہ ان کی اس رعونت کا جواب ہے جس کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ ہے کہ یہ اپنے سوا خدا کے کسی فضل و رحمت کا حقدار کسی کو نہیں سمجھتے، گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام خزانوں کی کنجیاں انہی کو پکڑا دی ہیں کہ یہ جس کو چاہیں دیں اور جس کو چاہیں محروم رکھیں۔ چنانچہ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ ان کے دائرہ سے باہر اللہ تعالیٰ کسی کو نبوت و رسالت اور قرآن و کتاب کا حامل کس طرح بنا سکتا ہے! انھیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ 'عزیز' اور 'وہاب' یعنی اپنے تمام خزانوں کا بلا شرکتِ غیرے مالک و متصرف اور بڑا ہی بخشنے والا ہے۔ وہ اپنے ان بندوں کو بھی بڑی فیاضی سے بخشتا ہے جو ان کی نظروں میں اگرچہ کسی چیز کے اہل نہیں ہیں لیکن خدا کی نظروں میں ان کا بڑا مرتبہ ہے چنانچہ اس نے اگر ان کو اسبابِ زمین کے کچھ خزف ریزے دیے ہیں جن پر یہ اترا رہے ہیں تو اس نے جس کو چاہا ہے نبوت و رسالت اور علم و حکمت کی بادشاہی بخش دی ہے جس سے بڑے منصب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سورۂ طور میں بھی یہ مضمون بیان

ہوا ہے، اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ (کیا تیرے رب کے خزانے اس کے پاس ہیں یا یہ داروغے مقرر کر دیے گئے ہیں!)۔

اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ فَلْيَرْتَقُوْا فِى الْاَسْبَابِ (۱۰)

یہ اسی اوپر والی بات کی مزید تفصیل ہے۔ یعنی اگر ان کا زعم یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ان کے ہاتھ میں ہے تو آسمانوں پر چڑھ جائیں اور اس رحمت کو روک دیں جو اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر نازل فرما رہا ہے۔

'اسباب' سے مراد 'اسباب السموٰت' ہے۔ یہ لفظ کسی چیز کے اطراف اور متعلقات کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ اس کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔

جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ (۱۱)

عذابِ الٰہی 'هُنَالِكَ' کا اشارہ اسی عذاب کی طرف ہے جس کا ذکر آیت ۸ میں 'لَمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ' کے کا مقابلہ دنیا الفاظ سے گزرا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اس قرآن کی تصدیق کے لیے عذابِ الٰہی کے ظہور کے کی بڑی سے منتظر ہیں تو یاد رکھیں کہ جب وہ عذاب آ جائے گا تو کوئی بڑے سے بڑا لشکر بھی خواہ کسی بھی قوم کا ہو، بڑی طاقت بھی اس کے مقابل میں نہیں ٹک سکے گا۔ بلکہ وہ لازماً شکست کھائے گا۔ 'جُنْدٌ' کی تنکیر یہاں تفخیم شان کے نہیں کر سکتی لیے اور 'مَا' اس تنکیر کی تاکید کے لیے ہے۔ یعنی کوئی لشکر بھی ہو اور وہ کتنی ہی قوت و صولت رکھتا ہو، عذابِ الٰہی کے مقابل میں وہ نہیں ٹک سکتا۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ ۙ وَثَمُوْدُ وَقَوْمُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ ۭ اُولٰٓئِكَ الْاَحْزَابُ ۝ اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ (۱۲-۱۴)

ذوالاوتاد 'ذُو الْاَوْتَادِ' کا لفظی ترجمہ ہوگا 'میخوں والا' لیکن عربی میں میخوں سے خیموں کو تعبیر کرتے ہیں اور پھر خیموں سے بطریق کنایہ فوجیں مراد لیتے ہیں۔ یہ اسی طرح کا کنایہ ہے جس طرح 'قدور راسیات' سے کسی شخص کی فیاضی کو تعبیر کرتے ہیں، چنانچہ قرآن میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی فیاضی کی تعبیر کے لیے یہ کنایہ آیا ہے۔ یہاں 'ذوالاوتاد' سے فرعون کی کثیر فوجوں کی طرف اشارہ ہے جو خیموں میں رہتی تھیں۔ فرعون کی فوجوں کی کثرت کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ آیا ہے اور یہ تمام فوجیں اس کے ساتھ عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو کر سمندر میں غرق ہوئیں۔

'اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ' سے مراد اصحاب مدین ہیں۔ 'ایکۃ' کے معنی جنگل کے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے 'مدین' کے پاس کوئی جنگل بھی تھا اس وجہ سے یہ لوگ اس نام سے بھی معروف تھے۔ اس کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔

اوپر آیت ۸ میں یہ بات جو فرمائی ہے کہ جب عذابِ الٰہی آ جائے گا تو کسی جماعت یا قوم کی قوت

وجمعیت کتنی ہی ہو، وہ اس کے مقابل میں نہیں ٹک سکے گی، یہ اسی بات کا تاریخی ثبوت ہے کہ ان تمام قوموں نے اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی اور جب اس کی پاداش میں ان پر اللہ کا عذاب آیا تو ان میں سے کوئی بھی اس کے مقابل میں نہ ٹک سکی۔

'اُولٰٓئِکَ الْاَحْزَابُ' میں خبر حذف کر دی گئی ہے۔ اس لیے کہ موقع ومحل سے یہ خود واضح ہے اور بعد کا ٹکڑا اس کو مزید واضح کر رہا ہے۔ یعنی دیکھ لو یہ بڑی نامی گرامی قومیں تھیں لیکن ان کا حشر کیا ہوا! جب اللہ کا عذاب آیا تو یہ سب خس وخاشاک کی طرح اُڑ گئیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہی حشر تمھارا بھی ہونا ہے اگر تم نے بھی انہی کی روش اختیار کی۔

'اِنْ کُلٌّ اِلَّا کَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ' یعنی ان میں سے ہر ایک کا اصل جرم یہی تھا کہ انھوں نے اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی اور اسی جرم کے مرتکب تم بھی ہو رہے ہو۔ 'فَحَقَّ عِقَابِ' اصل میں 'حَقَّ عِقَابِیْ' ہے۔ قافیہ کی رعایت سے 'ی' گر گئی ہے جس طرح 'لَمَّا یَذُوْقُوْا عَذَابِ' میں گر گئی ہے۔

وَمَا یَنْظُرُ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَیْحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ ۝ وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ یَوْمِ الْحِسَابِ (۱۵-۱۶)

'فَوَاق' کے معنی وقفہ اور مہلت کے ہیں۔

'قِطّ' حصہ اور نصیب کے معنی میں آتا ہے۔

مطالبۂ عذاب اور اس کا جواب

اشارہ قریش کی طرف ہے کہ یہ لوگ بڑے طنطنہ سے عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں گویا اس کے مقابلہ کے لیے انھوں نے کوئی ناقابلِ تسخیر دفاعی لائن تعمیر کر لی ہے حالانکہ ان کو پامال کر دینے کے لیے خدا کی ایک ہی ڈانٹ کافی ہوگی، دوسری کی نوبت بھی نہیں آنے پائے گی اور اس کی پکڑ ایسی ہوگی کہ پھر ایک لمحہ کے لیے بھی ان کو فرصت نصیب نہیں ہوگی۔

'وَقَالُوْا رَبَّنَا ... الاٰیۃ' یہ مطالبۂ عذاب کے معاملے میں ان کی رعونت کا بیان ہے کہ یہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تکذیب کے جوش میں یہاں تک کہہ گزرے کہ اے رب! اگر یہ شخص اپنے اس دعوے میں سچا ہے کہ ہم نے اس کی تکذیب کی تو ہم پر کوئی عذاب آجائے گا تو وہ عذاب قیامت سے پہلے ہی ہم پر آجائے تاکہ اس کی سچائی ثابت ہو جائے اگر یہ سچا ہے اور (نعوذ باللہ) اس کا جھوٹ ثابت ہو جائے اگر یہ جھوٹا ہے، جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں۔ قریش کے اس مطالبہ کا ذکر سورۂ انفال میں بھی بدیں الفاظ گزر چکا ہے۔

وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ کَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِکَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (۳۲)	اور جب کہ انھوں نے کہا، اے اللہ، اگر یہی حق ہو تیرے پاس سے تو ہم پر پتھر برسا دے آسمان سے یا کوئی اور دردناک عذاب ہم پر نازل کر۔

روایات میں ابوجہل سے متعلق بھی یہ بات منقول ہے کہ بدر کے موقع پر اس نے یہ دعا کی تھی کہ اے خدا، جو ہمارے اندر سے اس قطعِ رحم کا باعث ہوا ہے کہ قریش کی تلوار خود قریش ہی کے مقابل میں بے نیام ہے، اس کو تو کل کچل دیجیو!

۲- آگے کا مضمون - آیات ۱۷-۲۹

آگے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت ہوئی کہ تم مخالفوں کی اس تمام مخالفت کے باوجود اپنے موقفِ حق پر ڈٹے رہو اور حضرت داؤد علیہ السلام کی سرگزشت سے خود بھی سبق حاصل کرو اور ان لوگوں کو بھی اُن کے حالات سناؤ کہ اللہ نے اُن کو جو دولت و حشمت دی اس کا عشرِ عشیر بھی قریش کو حاصل نہیں ہے لیکن وہ یہ سب کچھ پا کر ان کی طرح غرور و گھمنڈ میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ جتنا ہی ان پر اللہ کا انعام بڑھتا گیا اتنی ہی ان کی شکرگزاری اور توجہ الی اللہ میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ لوگوں کے مقدمات بڑے صبر و حلم سے سنتے اور عدل کے مطابق ان کے فیصلے کرتے اور اگر ان مقدمات کے اثنا میں کوئی بات ان کے سامنے ایسی آجاتی جو خود ان کے لیے سبق آموز ہوتی تو فوراً اپنے رب کے آگے توبہ و استغفار کے لیے سجدے میں گر پڑتے۔ اللہ نے ان کو جو عظیم حکومت دی وہ انھوں نے اللہ کے احکام کے مطابق چلائی، استکبار میں مبتلا ہو کر اپنی خواہشوں کی پیروی نہیں کی۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ جو لوگ زمین میں اقتدار پا کر خدا کے اقتدار اور آخرت کے محاسبہ کو بھول جائیں گے وہ اللہ کی پکڑ سے نہیں بچیں گے۔ اس لیے کہ یہ دنیا اس کے خالق نے بازیچۂ اطفال نہیں بنائی ہے بلکہ اس کے بعد ایک ایسا دن لازماً آنا ہے جس میں وہ ان لوگوں کو صلہ دے جو اس زمین میں اس کی خلافت کا حق ادا کریں اور وہ لوگ کیفرِ کردار کو پہنچیں جو استکبار میں مبتلا ہو کر اس میں دھاندلی مچائیں —— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۷-۲۹

اِصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَ اذۡكُرۡ عَبۡدَنَا دَاوٗدَ ذَا الۡاَیۡدِ ۚ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۷﴾
اِنَّا سَخَّرۡنَا الۡجِبَالَ مَعَهٗ یُسَبِّحۡنَ بِالۡعَشِیِّ وَ الۡاِشۡرَاقِ ﴿ۙ۱۸﴾ وَ الطَّیۡرَ
مَحۡشُوۡرَةً ؕ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۹﴾ وَ شَدَدۡنَا مُلۡكَهٗ وَ اٰتَیۡنٰهُ الۡحِكۡمَةَ
وَ فَصۡلَ الۡخِطَابِ ﴿۲۰﴾ وَ هَلۡ اَتٰىكَ نَبَؤُا الۡخَصۡمِ ۘ اِذۡ تَسَوَّرُوا وقف لازم
الۡمِحۡرَابَ ﴿ۙ۲۱﴾ اِذۡ دَخَلُوۡا عَلٰی دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنۡهُمۡ قَالُوۡا لَا تَخَفۡ ۚ
خَصۡمٰنِ بَغٰی بَعۡضُنَا عَلٰی بَعۡضٍ فَاحۡكُمۡ بَیۡنَنَا بِالۡحَقِّ وَ لَا تُشۡطِطۡ

وَاهْدِنَا إِلَىٰ سَوَاءِ الصِّرَاطِ ﴿٢٢﴾ إِنَّ هَٰذَا أَخِي لَهُ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ نَعْجَةً
وَلِيَ نَعْجَةٌ وَاحِدَةٌ فَقَالَ أَكْفِلْنِيهَا وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ ﴿٢٣﴾ قَالَ
لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ إِلَىٰ نِعَاجِهِ ۖ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ
لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَ
قَلِيلٌ مَّا هُمْ ۗ وَظَنَّ دَاوُودُ أَنَّمَا فَتَنَّاهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهُ وَخَرَّ رَاكِعًا
وَأَنَابَ ۩ ﴿٢٤﴾ فَغَفَرْنَا لَهُ ذَٰلِكَ ۖ وَإِنَّ لَهُ عِندَنَا لَزُلْفَىٰ وَحُسْنَ السجدة
مَآبٍ ﴿٢٥﴾ يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ
النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ إِنَّ الَّذِينَ
يَضِلُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ
الْحِسَابِ ﴿٢٦﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۚ ذَٰلِكَ ع ۱۲ ۱۱
ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِنَ النَّارِ ﴿٢٧﴾ أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ
كَالْفُجَّارِ ﴿٢٨﴾ كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ
أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿٢٩﴾

یہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور ہمارے بندے داؤد، زور و قوت والے کا حال سناؤ، ترجمہ آیات ۱۷-۲۱
بے شک وہ اللہ کی طرف بڑا ہی رجوع کرنے والا تھا۔ ہم نے اس کے ساتھ پہاڑوں کو لگا دیا جو
شام و صبح اس کے ساتھ تسبیح کرتے اور پرندوں کو بھی، جھنڈ کے جھنڈ — سب اللہ کی طرف
رجوع کرنے والے تھے۔ ہم نے اس کی سلطنت مستحکم کر دی تھی اور اس کو حکمت اور معاملات کے

فیصلہ کی صلاحیت عطا فرمائی تھی۔ ۱۷-۲۰

کیا تمھیں فریقوں کے معاملہ کی خبر پہنچی ہے جب کہ وہ دیوار پھاند کر محراب میں داخل ہو گئے۔ جب کہ وہ داؤد کے پاس جا پہنچے تو وہ ان سے ڈرا۔ وہ بولے کہ آپ ڈریں نہیں، ہم دو فریقِ معاملہ ہیں، ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔ تو ہمارے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ فرمائیے اور کوئی بے انصافی نہ کیجیے اور صحیح راہ کی طرف ہماری رہنمائی کیجیے۔ ۲۱-۲۲

یہ میرا بھائی ہے۔ اس کے پاس ننانوے ۹۹ دُنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہی دُنبی ہے۔ پس اس نے کہا کہ یہ بھی میرے حوالے کر دے اور بحث میں اس نے مجھے دبا لیا۔ داؤد نے کہا، اس نے تمھاری دنبی کو اپنی دنبیوں میں ملانے کا مطالبہ کر کے تمھارے اوپر ظلم کیا ہے۔ اور اکثر شرکاء اسی طرح ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں۔ بس وہی اس سے مستثنیٰ ہیں جو ایمان رکھتے اور عمل صالح کرتے ہیں اور ایسے لوگ بہت ہی تھوڑے ہیں۔ اور داؤد نے گمان کیا کہ ہم نے اس کا امتحان کیا ہے تو اس نے اپنے رب سے استغفار کیا اور اس کے حضور جھک پڑا اور توبہ کی۔ تو ہم نے اس کو معاف کر دیا اور بے شک اس کے لیے ہمارے پاس خاص مقامِ قرب اور اچھا انجام ہے۔ ۲۳-۲۵

اے داؤد، ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تو لوگوں کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔ اور خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمھیں اللہ کی راہ سے ہٹا دے۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے بوجہ اس کے کہ انھوں نے روزِ حساب کو بھلائے رکھا۔ ۲۶

اور ہم نے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں عبث نہیں پیدا کی ہیں۔ یہ ان لوگوں کا گمان ہے جنھوں نے کفر کیا تو ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا دوزخ کی ہلاکت ہے۔ کیا

ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے عمل صالح کیے زمین میں فساد مچانے والوں کی طرح کر دیں گے، یا ہم متقیوں کو فاجروں کی طرح بنا دیں گے!! یہ نہایت مبارک کتاب ہے جو ہم نے تمھاری طرف اتاری ہے تاکہ لوگ اس کی آیات پر تدبر کریں اور صاحب عقل اس سے یاددہانی حاصل کریں۔ ۲۷-۲۹

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاذْکُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَیْدِ اِنَّہٗٓ اَوَّابٌ (۱۷)

حضرت داؤدؑ کی زندگی کا نمونہ پیغمبرؐ کے لیے بھی اور قریش کے لیے بھی

حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے نہایت مؤثر واقعات زندگی انبیاء، نمل اور سبا میں بھی گزر چکے ہیں۔ یہاں کچھ نئے واقعات ان کی زندگی کے سنائے گئے ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی موجب تسلی ہیں اور قریش کے لیڈروں کے لیے بھی نہایت سبق آموز ہیں، اگر وہ ان سے فائدہ اٹھائیں۔ لفظ "اُذْکُرْ" یہاں اپنے اندر دو پہلو رکھتا ہے۔ ایک کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے کہ اپنے مخالفوں کی ان دل آزار باتوں پر صبر اور ہمارے بندے داؤد کے حالاتِ زندگی سے تسلی حاصل کرو کہ وہ طاقت و قوت رکھنے کے باوجود کس علم و تحمل کے ساتھ لوگوں کے ناگوار رویے کو برداشت کرتے، نہایت عدل و مہربانی کے ساتھ ان کے معاملات کے فیصلے فرماتے اور دوسروں کے واقعات سے خود اپنی زندگی کے لیے سبق حاصل کرتے۔

دوسرے کا تعلق قریش کے ان متمردین سے ہے جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے کہ ان لوگوں کو ہمارے صاحبِ قوت و جمعیت بندے داؤدؑ کے حالاتِ زندگی سناؤ کہ باوجودیکہ ان کو ان سے کہیں زیادہ دولت و حشمت حاصل تھی لیکن اس چیز نے اِن کی طرح کسی غرور و استکبار میں اُن کو مبتلا نہیں کیا بلکہ وہ اپنے رب کی طرف برابر متوجہ رہنے والے بندے تھے۔ ان کے واقعاتِ زندگی شاہد ہیں کہ وہ دوسروں کے واقعات سے اپنی فروگذاشتوں پر متنبہ ہو کر اپنے رب کے آگے توبہ و استغفار کے لیے گر پڑتے۔

قوت نعمت اس وقت ہے جب اس کے ساتھ انابت ہو

'اِنَّہٗٓ اَوَّابٌ' یعنی وہ اپنے رب کی طرف بڑے رجوع ہونے والے بندے تھے۔ یہاں آگے جو واقعات بیان ہوئے ہیں وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے اسی وصف کو نمایاں کرنے والے ہیں۔ دوسری سورتوں میں ان کی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی شکرگزاری کے وصف کو نمایاں فرمایا گیا ہے۔ اس سورہ میں ان کی خشیت و انابت کے پہلو کو نمایاں فرمایا گیا تاکہ قریش کے اس کبر و غرور پر ضرب پڑے جس کا ذکر پہلی آیت میں 'عزت و

شقاق' کے الفاظ سے ہوا ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رکھیے کہ انسان فرشتہ نہیں ہے کہ اس سے کسی غلطی کا صدور ہی نہ ہو۔ انسان جب اختیار کی نعمت سے نوازا گیا ہے اور اس کے اس اختیار کی آزمائش بھی ہو رہی ہے تو ہر قدم پر اس سے غلطی کا امکان ہے لیکن یہ غلطی کا امکان اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہلاکت کے لیے نہیں رکھا ہے بلکہ یہ بھی اس کے لیے سب سے بڑی سعادت کے حصول کا ذریعہ ہے اگر وہ اپنی غلطی کے بعد اپنے رب کی طرف رجوع ہونا اور توبہ و استغفار کرنا سیکھ جائے۔ انسان کی شامت اس وقت آتی ہے جب وہ جرم پر جرم کیے چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کے جرائم اس طرح اس پر مسلط ہو جاتے ہیں کہ خود متنبہ ہونا تو الگ رہا اگر کوئی اللہ کا بندہ اس کو متنبہ کرتا ہے تو وہ کبر و غرور کے سبب سے اس کے بھی درپئے آزار ہو جاتا ہے۔ قرآن نے یہاں 'ذَا الْاَیْدِ' اور 'اَوَّابٌ' دونوں صفتوں کو ایک ساتھ ذکر کر کے یہ دکھایا ہے کہ کوئی صاحب قوت و حکومت شخص اللہ تعالیٰ کا منظور نظر بندہ اس وقت بنتا ہے جب قوت و شوکت کے ساتھ اس کے اندر 'اَوَّابِیَّت' کی صفت پائی جائے۔ اگر قوت و صولت اس کے اندر 'عزت و شقاق' کی رعونت پیدا کر دے تو یہ نمرودیت اور فرعونیت ہے جو اللہ کے نزدیک ملعون و مبغوض ہے۔

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ یُسَبِّحْنَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِشْرَاقِ ۙ وَالطَّیْرَ مَحْشُوْرَةً ؕ كُلٌّ لَّهٗ اَوَّابٌ (۱۸-۱۹)

حضرت داؤدؑ کی اوابیت

یہ حضرت داؤد علیہ السلام کی 'اَوَّابِیَّت' کی وضاحت ہے کہ وہ شام و صبح دامنِ کوہ میں بیٹھ کر اپنے رب کی تسبیح کرتے اور جب وہ اپنے خاص لحن میں زبور کے منظوم نغمے چھیڑتے تو پہاڑ بھی ان کی ہمنوائی کرتے اور پرندے بھی جھنڈ کے جھنڈ جمع ہو کر ان کے سُر میں اپنے سُر ملاتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے پُرسوز لحن اور ان کے دردمند دل میں ایسی تاثیر و تسخیر رکھی تھی کہ ان کے اردگرد کی پوری فضا ان کی صدائے بازگشت سے گونج اٹھتی اور دشت و جبل، چرند و پرند سب توبہ و مناجات کے لیے ان کے شریک بزم بن جاتے —— اس حقیقت کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں کہ اس کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے لیکن ہم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے لیکن ہمارے نہ سمجھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی بھی ان کو نہیں سمجھتا۔ حضرت داؤدؑ کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح پہاڑوں کو موم کر دینے والا اور پرندوں کو جذب کر لینے والا سوز و لحن بخشا تھا اسی طرح ان کو وہ گوش شنوا بھی عطا فرمایا تھا کہ وہ ان کی تسبیح و مناجات کو سمجھ سکیں۔ پچھلی سورتوں میں ان باتوں کی وضاحت ہو چکی ہے اس وجہ سے یہاں ہم اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔

وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَیْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ (۲۰)

حضرت داؤدؑ کی قوت و صولت

یہ حضرت داؤد علیہ السلام کی قوت و صولت کا بیان ہے جس کا ذکر اوپر 'ذُوالْاَیْدِ' کے لفظ سے ہوا ہے۔ 'شَدَدْنَا مُلْكَهٗ' یعنی ہم نے اس کی حکومت اچھی طرح مستحکم کی تھی اور اس کو مستحکم رکھنے کے لیے اس کو 'حکمت' اور 'فصل خطاب' کی صلاحیت سے نوازا تھا۔ حکمت کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے

'فصلِ خطاب' سے مراد فیصلۂ نزاعات کی صلاحیت ہے۔ لفظ خطاب آگے آیت ۲۳ میں بحث و نزاع کے مفہوم میں آیا بھی ہے۔

حکومت کے استحکام کے لیے لازمی شے

اس سے معلوم ہوا کہ حکومت کے استحکام کے لیے اوّل شے یہ ہے کہ حکمران 'حکمت' کے نور سے منوّر اور فیصلۂ معاملات کی صلاحیت سے بھرپور ہوں۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو حکومت کی بنیاد ریت پر ہے اگرچہ اس کے پاس دوسرے اسباب و وسائل کی کتنی ہی وافر مقدار موجود ہو۔ یہ حکمت اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط تعلق سے حاصل ہوتی ہے۔ اس تعلق سے محروم حکمران اسی غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس پر یہاں تنقید ہو رہی ہے اور اپنے ساتھ اپنی پوری قوم کی تباہی کے اسباب فراہم کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں حکومت کی طاقت کا ہونا ویسا ہی ہے جیسے نادان کے ہاتھ میں تلوار ہو۔

وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ (۲۱)

حضرت داؤدؑ کے فصلِ خطاب کی ایک مثال

یہاں کی حکمت و دانش، ان کے عدل یا قرآن کے الفاظ میں ان کے 'فصلِ خطاب' کی ایک مثال بیان ہو رہی ہے جس سے چند باتیں نہایت واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ عدل کے معاملے میں ان کے نزدیک امیر اور غریب دونوں یکساں تھے۔ ان کی حکومت میں کوئی غریب سے غریب شخص بھی اپنا حق کسی بڑے سے بڑے آدمی سے نہایت آسانی سے وصول کر لیتا تھا۔

دوسری یہ کہ ان کی رعایا کو ان پر پورا اطمینان تھا۔ لوگ اپنے معاملات کے فیصلہ کے لیے بے جھجک ان کے پاس پہنچ جاتے۔ یہاں تک کہ اگر کسی سبب سے پہرے دار مانع ہوتے تو بعض اوقات لوگ دیوار پھاند کر ان کے پاس جا پہنچتے، اپنے معاملات نہایت جرأت کے ساتھ پیش کرتے اور وہ نہایت تحمل کے ساتھ ان کے قضیوں کا فیصلہ کرتے اور اس بات سے مطلق کبیدہ خاطر نہ ہوتے کہ لوگوں نے ان کے آرام میں خلل ڈالا، یا ان کو خطاب کرنے میں ان کے ادب کو ملحوظ نہیں رکھا، یا ان کے حاجبوں اور پہرہ داروں کی کوئی پروا نہیں کی۔

تیسری یہ کہ وہ جس قانونِ عدل کی روشنی میں دوسروں کے معاملات کے فیصلے کرتے اسی کی روشنی میں خود اپنے معاملات کا بھی برابر جائزہ لیتے رہتے۔ اگر کسی گوشے میں کوئی خفیف سے خفیف انحراف بھی ان کو محسوس ہوتا تو وہ فوراً اپنے رب سے استغفار اور اس غلطی کی اصلاح کرتے ——— یہ اصولی باتیں سامنے رکھتے ہوئے اب اصل واقعہ کے اجزاء پر غور کیجیے۔

'هَلْ اَتٰىكَ' کے اسلوبِ خطاب سے واقعہ کی اہمیت کا بھی اظہار ہو رہا ہے اور اس میں مخاطب کے لیے فی الجملہ تشویق و ترغیب بھی ہے۔ مخاطب ضروری نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوں بلکہ واحد کا خطاب، جیسا کہ وضاحت ہو چکی ہے جمع کے لیے بھی آتا ہے۔

لفظ 'خصم' کسی مقدمہ کے فریقوں کے لیے آتا ہے۔ یہ واحد و جمع دونوں کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے۔

'اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ'۔ 'تسوّر' کے معنی دیوار پر چڑھنے کے ہیں۔ یہاں عربیت کے قاعدے کے مطابق، یہ لفظ 'دخلوا' کے مفہوم پر متضمن ہے۔ یعنی تسوروا الجدار و دخلوا المحراب' محراب سے حضرت داؤدؑ کے محل کا کوئی کمرہ بھی مراد ہو سکتا ہے اور خود محل بھی۔ عربی میں بسا اوقات جزو بولتے اور اس سے کل مراد لیتے ہیں۔

واقعہ کی نوعیت

واقعہ کی نوعیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک جھگڑے کے دونوں فریقوں نے، اپنے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ، کسی ایسے وقت میں حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں فیصلہ کے لیے حاضر ہونے کی کوشش کی جو ان کے فصلِ مقدمات کا نہیں بلکہ آرام یا عبادت کا وقت تھا۔ صدر دروازے پر پہرہ داروں نے ان کو ناوقت محل کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہ دی ہو گی لیکن وہ اس سے مایوس نہیں ہوئے بلکہ پہرہ داروں کی نظر بچا کر کسی دوسری طرف سے چاردیواری پھاند کر محل میں جا گھسے۔ ایک عظیم حکمران کے محل میں اس طرح جا گھسنا اگرچہ ایک نہایت سنگین اقدام تھا جس کی سزا عام حالات میں نہایت سخت ہے، لیکن انھیں چونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کے حلم پر پورا بھروسہ تھا اس وجہ سے وہ یہ جسارت کر گزرے۔

اِذْ دَخَلُوْا عَلٰی دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰی بَعْضُنَا عَلٰی بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَآ اِلٰی سَوَآءِ الصِّرَاطِ (۲۲)

ان کے اس طرح داخل ہونے سے حضرت داؤد علیہ السلام پر گھبراہٹ طاری ہونا ایک امر فطری تھا۔ چنانچہ وہ گھبرا گئے کہ شاید ڈاکو یا ان کے دشمن، پہرہ داروں کی نظریں بچا کر، محل کے اندر گھس آئے ہیں لیکن داخل ہونے والوں نے ان کو اطمینان دلایا کہ ہم دشمن نہیں ہیں اس وجہ سے آپ کوئی اندیشہ نہ کریں بلکہ ہم ایک مقدمہ کے دونوں فریق ہیں، ہم میں سے ایک نے دوسرے پر تعدی کی ہے تو آپ ہمارے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیجیے اور فیصلہ میں کوئی طرفداری اور ناانصافی نہ کیجیے بلکہ ہماری رہنمائی عدل کی صراطِ مستقیم کی طرف کیجیے۔

اگرچہ ان لوگوں کی مداخلت بالکل ناوقت تھی اور اس کے لیے انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ بھی نہایت بھونڈا اختیار کیا، گفتگو کا انداز بھی، جیسا کہ 'لا تشطط' کے لفظ سے ظاہر ہے، نہایت ناشائستہ تھا لیکن وہ اپنے حکمران کے مزاج سے اچھی طرح آشنا تھے۔ وہ جانتے تھے کہ خواہ کتنے ہی غلط طریقے اور کتنے ہی ناوقت ہم حضرت داؤدؑ کے پاس پہنچیں، لیکن ہم پہنچ گئے اور ان کے علم میں یہ بات آ گئی کہ ہم طلبِ انصاف کے لیے آئے ہیں تو، وہ ہماری جسارتوں سے درگزر کرتے ہوئے اسی وقت ہمارے جھگڑے کا فیصلہ کر دیں گے۔ چنانچہ ان کی یہ توقع سو فی صد پوری ہوئی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو جب اطمینان ہو گیا کہ یہ لوگ مقدمے کے آئے ہیں تو وہ اسی وقت اس کے فیصلہ کی طرف متوجہ ہو گئے اور ان کی ان جسارتوں کا انھوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا جس کے وہ مرتکب ہوئے تھے۔

حضرت داؤدؑ اور حضرت عمرؓ

حضرت عمرؓ کے حالاتِ زندگی پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ ٹھیک یہی حال ان کا بھی تھا۔ ان کا دروازہ حاجتمندوں کے لیے کسی وقت بھی بند نہیں تھا۔ راستہ چلتے ہوئے معمولی معمولی لوگ ان کا ہاتھ پکڑ لیتے، نہایت بیباکی بلکہ بعض اوقات گستاخی کے ساتھ، ان کے سامنے اپنی ضرورتیں پیش کرتے، وہ ان کی باتیں نہایت حلم اور توجہ کے ساتھ سنتے اور بلا تاخیر ان کی حاجت برآری کرتے۔

إِنَّ هَٰذَآ أَخِى لَهُۥ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ نَعْجَةً وَلِىَ نَعْجَةٌ وَٰحِدَةٌ فَقَالَ أَكْفِلْنِيهَا وَعَزَّنِى فِى ٱلْخِطَابِ (۲۳)

اصل قضیہ کی تفصیل

یہ اصل جھگڑے کی تفصیل ہے جو مظلوم فریق نے پیش کی۔ اس نے دوسرے فریق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ میرا بھائی ہے جس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہی دنبی ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ میں اپنی دنبی بھی اس کے حوالے کر دوں۔ اس کے لیے یہ مجھ سے جھگڑتا ہے اور جھگڑے میں یہ مجھ پر غالب آگیا ہے۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ اس زمانے میں اس علاقہ کی اصلی دولت بھیڑوں اور دنبیوں ہی سے عبارت تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی زندگی بھی بادشاہی سے پہلے بھیڑ پالنے اور بھیڑوں کے چرانے ہی میں گزری ہے۔ تاریخوں سے یہاں تک پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے کے سکہ پر تصویر بھی دنبی کی تھی اور اس کو نعجۃ کہتے بھی تھے۔ یہ بات اگر صحیح نہ بھی ہو جب بھی ملکیت اور مال کی تعبیر کے لیے یہ لفظ اس زمانے میں معروف رہا ہے۔

'عَزَّنِى فِى ٱلْخِطَابِ' میں لفظ خطاب، بحث و جدال کے مفہوم میں ہے۔ چونکہ وہ دولت مند آدمی تھا اور دولت مند کو حامی بڑی آسانی سے مل جاتے ہیں اس وجہ سے اس نے دوسروں کو ہم خیال بنا کر غریب آدمی کو دبا لیا ہوگا۔

قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ إِلَىٰ نِعَاجِهِۦ ۖ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ ٱلْخُلَطَآءِ لَيَبْغِى بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ إِلَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَعَمِلُوا۟ ٱلصَّٰلِحَٰتِ وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ ۗ وَظَنَّ دَاوُۥدُ أَنَّمَا فَتَنَّٰهُ فَٱسْتَغْفَرَ رَبَّهُۥ وَخَرَّ رَاكِعًا وَأَنَابَ (۲۴)

لفظ 'سؤال' یہاں مطالبہ کے مفہوم میں ہے۔ اس مفہوم کے لیے اس کا استعمال معروف ہے۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ اس کے بعد 'الٰی' کا صلہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ لفظ یہاں 'ضم' یا 'خلط' کے مفہوم پر متضمن ہے۔

حضرت داؤدؑ کا فیصلہ

حضرت داؤد علیہ السلام نے مقدمہ کی روداد سنتے ہی اندازہ فرما لیا کہ زیادتی دولت مند کی ہے اور پھر بے رو رعایت یہ فیصلہ سنا دیا کہ اس شخص نے تمہاری دنبی کو اپنی دنبیوں میں ملا لینے کا مطالبہ کر کے تمہارے اوپر ظلم کیا ہے اور ساتھ ہی یہ ریمارک بھی دے دیا کہ اکثر شرکائے معاملہ اپنے ننانوے کو سو بنانے کی

فکر میں اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ زیادتیاں کرتے رہتے ہیں۔ صرف وہی لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جو ایمان اور عمل صالح کی روش پر گامزن ہیں اور اس طرح کے لوگ بہت ہی تھوڑے ہیں۔ 'قلیل' کے ساتھ 'ما' کے اضافہ نے اس کے اندر مبالغہ کا مفہوم پیدا کر دیا ہے۔

حضرت داؤدؑ کا تنبّہ

'وَظَنَّ دَاوُدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ'۔ اب یہ حضرت داؤدؑ کی خاص صفت اوّابیت اور انابت کی طرف توجہ دلائی کہ وہ ایک بادشاہ ہونے کے باوجود دنیا داروں کی طرح کسی گھمنڈ اور استکبار میں مبتلا نہیں تھے بلکہ اپنے رب سے ڈرنے والے بندے تھے اس وجہ سے اس واقعہ کی روشنی میں انھوں نے خود اپنے حالات کا فوراً جائزہ لیا اور اپنی ایک کمزوری پر شرمسار ہو کر اپنے رب کے آگے استغفار و توبہ کے لیے سجدے میں گر پڑے۔

یہ کمزوری کیا تھی؟ قرآن نے اس کی کوئی تصریح نہیں کی ہے۔ یہ معاملہ حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کے رب کے درمیان کا ایک راز ہے اس وجہ سے کسی کو اس کی کھوج کرید کا حق بھی نہیں ہے۔ 'اَنَّمَا فَتَنّٰهُ' کے الفاظ سے صرف یہ اشارہ نکلتا ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ کرنے کے ساتھ ہی حضرت داؤد علیہ السلام چوکنے ہوتے کہ اسی سے ملتے جلتے ہوئے امتحان میں وہ خود بھی مبتلا ہیں۔ اگر کوئی شخص اس امتحان کو کسی واقعہ کی شکل دینے پر مُصر ہی ہو تو حضرت داؤد علیہ السلام کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے وہ چاہے تو یہ حق کر سکتا ہے کہ جس طرح بادشاہوں کو کسی شخصی یا اجتماعی ضرورت سے دوسروں کی کسی ملکیت سے تعرض کرنے کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے اسی طرح کی کوئی ضرورت حضرت داؤدؑ کو بھی پیش آئی۔ عام بادشاہ تو اس طرح کے معاملات میں کسی کی کوئی پروا نہیں کرتے۔ وہ اپنے قصر و ایوان کی سڑک سیدھی رکھنے کے لیے بے دریغ غریبوں کے جھونپڑوں پر بُل ڈوزر پھروا دے سکتے ہیں لیکن حضرت داؤد علیہ السلام ایک خدا ترس بادشاہ تھے وہ اس طرح کا کوئی اقدام نہیں کر سکتے تھے اور اگر ان کے دل میں کسی کی ملکیت سے تعرض کرنے کی کوئی خواہش رہی ہوگی تو اس واقعہ سے متنبہ ہو کر اس سے بھی تائب ہو گئے اور ایک صحیح الفطرت انسان کی اصلی خوبی یہی ہے کہ وہ دوسروں کے واقعات سے خود اپنے لیے سبق حاصل کرے اور اگر اس کے اندر کوئی غلط خواہش پیدا ہوئی ہے تو اپنے رب سے معافی مانگے۔ قرآن کے الفاظ سے جو بات نکلتی ہے وہ تو زیادہ سے زیادہ اسی حد تک جاتی ہے۔ رہے وہ مزخرف قصے جو تفسیر کی بعض کتابوں میں نقل ہوئے ہیں تو ان کی نسبت ہماری دعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو معاف کرے جو اپنی کتابوں میں ان کو نقل کرنے کے مرتکب ہوئے ہیں۔

'وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ' میں رکوع اور سجدہ دونوں مراد ہیں۔ رکوع کا ذکر تصریح کے ساتھ موجود ہی ہے اور لفظ 'خَرَّ' سجدہ پر دلیل ہے۔ 'اَنَابَ' دل کے رجوع کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ رکوع اور سجدہ خدا کی طرف انابت کی صرف ظاہری دلیل ہیں۔ ان کے اندر اصلی روح دل کی انابت سے پیدا

ہوتا ہے۔

فَغَفَرْنَا لَهُ ذٰلِكَ ۖ وَإِنَّ لَهُ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ (۲۵)

توبہ آدمی کے مرتبہ کو اور بڑھا دیتی ہے

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے اس تنبہ اور استغفار کے بعد ان کی غلطی معاف فرما دی اور چونکہ ہر سچی توبہ آدمی کے مرتبہ کو پہلے سے زیادہ بڑھا دیتی ہے اور ہر رجوع الی اللہ سے اس کو مزید قرب حاصل ہوتا ہے اس وجہ سے ان کے مراتب میں اللہ کے ہاں اضافہ ہوا۔

يٰدَاوٗدُ إِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ (۲۶)

حضرت داؤدؑ کو ہدایت

مذکورہ بالا تنبیہ اور حضرت داؤد علیہ السلام کے توبہ و استغفار کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو نہایت واضح الفاظ میں یہ ہدایت فرمائی کہ اے داؤد، میں نے اپنی طرف سے کچھ اختیار و اقتدار دے کر تمھیں زمین میں خلیفہ بنایا ہے تو اس خلافت کا تقاضا یہ ہے کہ تم اس اختیار و اقتدار کو اپنے مستخلف کی مرضی کے مطابق استعمال کرو اور لوگوں کے درمیان حق و عدل کے ساتھ فیصلہ کرو اور کبھی اپنی خواہشوں کے پیچھے نہ لگو ورنہ وہ تمھیں حق و عدل کی راہ سے ہٹا دیں گی۔ اس بات کو ہمیشہ یاد رکھو کہ جو لوگ اللہ کے راستہ سے ہٹ جائیں گے وہ آخرت فراموشی کے جرم میں شدید عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

یہ ہدایت جو حضرت داؤد علیہ السلام کو فرمائی گئی یہی ہدایت دنیا کے تمام حکمرانوں بلکہ تمام انسانوں کے لیے ہے۔ جس کو بھی کوئی اختیار و اقتدار ملتا ہے وہ خدا ہی کے دیے ملتا ہے اور اس کی بابت ہر شخص قیامت کے دن جوابدہ ہوگا کہ اس نے اس کو خدا کی مرضی کے مطابق استعمال کیا یا اپنی خواہشوں کی پیروی کی۔ پھر جس نے بھی اس روزِ حساب کو نظر انداز کر کے اپنی خواہشوں کی پیروی کی ہوگی وہ اس انجام سے دوچار ہوگا جو اوپر مذکور ہوا۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۚ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنَ النَّارِ (۲۷)

روزِ حساب کی ضرورت

حضرت داؤد علیہ السلام کی سرگزشت ختم کرنے کے بعد یہ مخاطبوں کی طرف التفات ہے۔ ان کے سامنے یہ حقیقت واضح فرمائی گئی کہ یہ کیوں ضروری ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں ہر شخص اپنے رب کے سامنے مسئول ہو کہ اس نے خدا کے بخشے ہوئے اختیار کو صحیح استعمال کیا یا غلط؟ فرمایا کہ یہ اس لیے ضروری ہے کہ اگر ایک ایسا روزِ حساب نہ آئے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ دنیا ایک بالکل باطل کارخانہ اور ایک کھلنڈرے کا کھیل ہے جس میں نیکی اور بدی، خیر و شر اور حق و باطل میں کوئی امتیاز ہی نہیں ہے۔ فرمایا کہ ہم نے اس دنیا کو باطل نہیں پیدا کیا ہے بلکہ حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس حق کے ظہور کے لیے قیامت کا دن مقرر کیا ہے جس میں ہر شخص اپنی نیکی کا صلہ پائے گا اور جس نے بدی کی کمائی کی ہوگی وہ اس کی سزا

بھگتے گا۔

ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا، یعنی اس دنیا کو بازیچۂ اطفال وہ سمجھتے ہیں جو آخرت کے منکر ہیں۔ ان کے نزدیک یہ دنیا ہی سب کچھ ہے۔ اور اس دنیا میں چونکہ لازم نہیں کہ باطل پر سزا ملے یا نیکی پر انعام اس وجہ سے وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ اس کے خالق کے نزدیک نیکی اور بدی میں سرے سے کوئی امتیاز ہی نہیں ہے۔ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ، فرمایا کہ جو لوگ آخرت کے منکر اور جزا و سزا سے بے پروا ہیں وہ دوزخ کی ہلاکی سے دوچار ہوں گے۔

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ز اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ (۲۸)

یہ سوال باندازِ تعجب ہے کہ جو لوگ آخرت اور جزا و سزا کو نہیں مانتے ہیں کیا ان کا گمان یہ ہے کہ ہم ایمان و عملِ صالح کی روش اختیار کرنے والوں اور زمین میں فساد برپا کرنے والوں کو برابر کر دیں گے یا خدا سے ڈرنے والوں اور نافرمانوں کے ساتھ ہمارا معاملہ یکساں ہوگا؟ یعنی آخرت کو نہ ماننے کا بدیہی نتیجہ یہی سامنے آتا ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کا ایک حکیم و رحیم اور قادر و عزیز خدا کے متعلق تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہی حقیقت سیدنا مسیح علیہ السلام نے تاکستان والی تمثیلوں میں مختلف اسلوبوں سے سمجھائی ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک آقا اپنے تاکستان کی نگرانی پر اپنے غلاموں کو مقرر کرے جن میں سے بعض تو اس کے تاکستان کا اندر دھاندلی مچائیں اور کچھ ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض بجا لائیں اور آقا دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کرے؟ اگر کوئی آقا ایسا کرے تو ماننا پڑے گا کہ وہ یا تو بالکل بے بس اور بے خبر ہے یا نہایت ہی احمق اور نا انصاف ـــــ اور یہ دونوں ہی باتیں ایسی ہیں جن سے اللہ جل شانہٗ بالکل پاک ہے۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْۤا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۲۹)

قرآن کا مقصد

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ انہی حقائق کی یاد دہانی کے لیے ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب اتاری ہے اور یہ ایک مبارک کتاب ہے جو دلوں کے لیے زندگی بخش ہے اور اس کے اتارنے کا مقصد یہ ہے کہ جن کے اندر عقل ہے وہ اس کی آیات پر غور کریں اور ان سے یاد دہانی حاصل کریں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے جو اس نے لوگوں پر فرمایا ہے بشرطیکہ وہ گھمنڈ اور مخاصمت کی روش ترک کر کے اس نعمت کی قدر کریں۔ یہ اسی مضمون کا دوسرے الفاظ میں اعادہ ہے جو پہلی آیت میں گزر چکا ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۳۰ - ۴۰

آگے حضرت داؤدؑ کے نامور فرزند حضرت سلیمانؑ کے بعض واقعاتِ زندگی کا حوالہ دے کر واضح فرمایا ہے کہ وہ بھی ٹھیک اپنے باپ ہی کے نقشِ قدم پر چلنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بے مثال عظمت و

ثروت عطا فرمائی لیکن وہ کبر و غرور میں مبتلا ہو کر زمین میں فساد برپا کرنے والے نہیں بنے بلکہ جو قدم بھی وہ اٹھاتے اپنے رب سے ڈرتے ہوئے اٹھاتے اور اگر کوئی ادنیٰ فروگزاشت بھی ہو جاتی تو فوراً توبہ و استغفار کے لیے اپنے رب کے آگے گر پڑتے۔ یہ واقعات بھی قریش کے لیڈروں کو تذکیر و تنبیہ کے لیے سنائے گئے ہیں — آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۰-۴۰

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ۚ نِعْمَ الْعَبْدُ ۖ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿٣٠﴾ اِذْ عُرِضَ
عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ﴿٣١﴾ فَقَالَ اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ
عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴿٣٢﴾ رُدُّوْهَا عَلَيَّ ۖ فَطَفِقَ مَسْحًا ۢ
بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ﴿٣٣﴾ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ
جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿٣٤﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ
لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿٣٥﴾ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ
تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ﴿٣٦﴾ وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّ
غَوَّاصٍ ﴿٣٧﴾ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿٣٨﴾ هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ
ع ۳ ۱۴ ۱۲ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٣٩﴾ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿٤٠﴾

ترجمہ آیات ۳۰-۴۰

اور ہم نے داؤد کو سلیمان عطا کیا۔ وہ خوب بندہ تھا۔ بے شک وہ خدا کی طرف بڑا ہی رجوع ہونے والا تھا! ۳۰

ایک دن شام کو اس کے ملاحظہ کے لیے اصیل اور عمدہ گھوڑے پیش کیے گئے تو اس نے کہا کہ یہ تو مال کی محبت میں لگ کر، میں اپنے رب کی یاد سے غافل ہو گیا یہاں تک کہ سورج پردے میں چھپ گیا۔ ان کو میرے سامنے واپس لاؤ۔ تو وہ ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر تلوار مارنے لگا۔ ۳۱-۳۳

اور ہم نے سلیمان کو آزمایا اور ہم نے اس کے تخت پر ایک دھڑ کی طرح ڈال دیا۔ پھر اس نے رجوع کیا۔ اس نے دعا کی کہ اے میرے رب! مجھے معاف فرما دے اور مجھے ایسی سلطنت بخش جو

میرے سوا کسی کے لیے زیبا نہیں۔ تو بڑا ہی بخشنے والا ہے۔ تو ہم نے اس کی خدمت میں لگا دیا ہوا کو جو اس کے حکم سے سازگار ہو کر چلتی جہاں کہیں کا وہ قصد کرتا۔ ۳۴-۳۶

اور سرکش جنوں کو بھی اس کے لیے مسخر کر دیا۔ نہایت ماہر معماروں اور غوطہ خوروں کو۔ اور دوسرے جنوں کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے رہتے۔ ۳۷-۳۸

یہ ہماری بے حساب بخشش ہے تو چاہو اس کو بخشو یا روکو۔ اور بے شک اس کے لیے ہمارے پاس خاص قرب اور بہترین مرجع ہے۔ ۳۹-۴۰

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَیْمٰنَ ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ (۳۰)

حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر، حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف انتساب کے ساتھ، اس طرح یہاں آیا ہے گویا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت داؤد علیہ السلام کو ان کی نیکیوں کے انعام کے طور پر ملے ہوں۔

بندہ کا اصل کمال اس کی عبدیت ہے

'نِعْمَ الْعَبْدُ' یہ اس عظیم فرزند کی سب سے بڑی خوبی بیان ہوئی ہے کہ وہ خوب بندہ تھا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ان تمام خوارق و عجائب میں سے جن سے کتابیں بھری پڑی ہیں، کسی چیز کا ذکر یہاں نہیں ہوا۔ اگر ذکر ہوا تو ان کے کمال عبدیت کا ذکر ہوا۔ بندے کی اصلی خوبی یہی ہے کہ وہ اپنے رب کا ایسا بندہ بن جائے کہ اس کا رب بھی شہادت دے کہ 'خوب بندہ ہے!' اگر یہ کمال اس کو حاصل ہے تو دوسرے تمام کمالات اسی کی برکات میں سے ہیں اور اگر یہ چیز حاصل نہیں تو کسی کو خاتمِ سلیمان بھی حاصل ہو جائے تو اس کی عند اللہ کوئی قیمت نہیں۔

عبدیت کا اصل جمال اوّابیت ہے

'اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ' یہی صفت بعینہٖ حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے بھی اوپر بیان ہو چکی ہے۔ یعنی اس صفت میں بیٹا اپنے باپ کا ہو بہو عکس تھا۔ 'عبدیت' کا اصلی جمال 'اوّابیت' میں ہے یعنی بندے کا دل ہر وقت خدا کی طرف متوجہ رہے اور اگر کبھی کسی سبب سے ذرا بھی غفلت ہو جائے تو اس طرح ٹوٹ کر اپنے رب کی طرف گرے کہ برسوں کی منزل منٹوں میں طے کرے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کی یہی ادا سب سے زیادہ پسند ہے۔ گناہ سے آدمی جتنا کھوتا ہے اس سے کہیں زیادہ وہ اس سے پا لیتا ہے اگر وہ سچے دل سے گناہ کے بعد توبہ کر لیتا ہے۔

إِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ۙ فَقَالَ إِنِّيْٓ أَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ۟ رُدُّوْهَا عَلَيَّ ۭ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَالْأَعْنَاقِ (۳۱-۳۳)

حضرت سلیمانؑ کی اوابیت کی ایک مثال

جس طرح اوپر حضرت داؤد علیہ السلام کی اوابیت کی مثال بیان ہوئی ہے اسی طرح یہ حضرت سلیمانؑ کی 'اوابیت' کی مثال بیان ہو رہی ہے۔ پہلے واقعہ کی اصلی صورت سادہ الفاظ میں سمجھ لیجیے، اس کے بعد اجزائے کلام پر تحقیقی نگاہ ڈالیے۔

الفاظِ قرآن کی روشنی میں واقعہ کی جو صورت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی دن سہ پہر میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصیل گھوڑوں کا دستہ 'پریڈ کی شکل میں' ان کے ملاحظہ کے لیے پیش کیا گیا۔ گھوڑے زیادہ تھے اور کام دلچسپ تھا اس وجہ سے وہ اس میں اس طرح منہمک ہو گئے کہ سورج چھپ گیا اور عصر کی نماز رہ گئی۔ جب ان کو نماز کا خیال آیا تو اس حادثہ کا ان کو اتنا شدید قلق ہوا کہ یارائے ضبط نہیں رہا۔ ان کو خیال ہوا کہ یہ دنیا کی محبت تھی جس میں پڑ کر انھوں نے خدا کی یاد سے غفلت کی اور پھر غلبۂ حال سے اس طرح مغلوب ہو گئے کہ فوراً گھوڑوں کو دوبارہ طلب فرمایا اور ان کی گردنوں اور پنڈلیوں پر تلوار مارنے لگے کہ انہی کی محبت ان کے لیے خدا سے غفلت کا باعث ہوئی۔

یہ ایک غلبۂ حال کی صورت ہے جس میں محرک نہایت اعلیٰ ہے اس وجہ سے بجائے خود یہ قابلِ تعریف چیز ہے لیکن اس طرح کے غلبۂ حال میں شریعت کے صحیح نقطۂ اعتدال سے چونکہ آدمی متجاوز ہو سکتا ہے اس وجہ سے دین میں یہ چیز مستند نہیں ہے۔ یہ اسی طرح کی ایک خاص حالت ہے جس طرح کی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سن کر حضرت عمرؓ مبتلا ہو گئے تھے۔ چنانچہ جب حضرت ابوبکرؓ نے آیاتِ قرآن کے حوالہ سے، انھیں متنبہ کیا تب وہ متنبہ ہوئے۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام بھی از خود متنبہ ہو گئے ہوں یا اللہ تعالیٰ نے ان کو متنبہ فرما دیا ہو اگرچہ قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہاں ان کے اس اقدام کا ذکر ان کے جوشِ انابت اور غلبۂ اوابیت کے اظہار کے لیے ہوا ہے۔ اور اس پہلو سے بلاشبہ یہ ایک شاندار واقعہ ہے۔

'إِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ'۔ 'صَافِنَاتٌ' ایک خاص اصیل نسل کے گھوڑوں کو کہتے ہیں اور 'جیاد' اچھے گھوڑوں کی عام صفت کے طور پر آتا ہے۔ یعنی یہ گھوڑے اپنی نسل کے اعتبار سے بھی اچھے تھے اور اپنی صفات کے اعتبار سے بھی۔ تورات میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے ان گھوڑوں کی تفصیل موجود ہے۔

'فَقَالَ إِنِّيْٓ أَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ'۔ 'أَحْبَبْتُ' یہاں اعراض یا غفلت کے مضمون پر متضمن ہے اور حرف 'عن' اس کا قرینہ ہے۔

'تَوَارَتْ' کا فاعل 'الشَّمْس' یہاں محذوف ہے۔ عربی میں معروف و مشہور چیزوں کے لیے فعل بھی

اس طرح لاتے ہیں اور ضمیریں بھی۔ فاعل یا مرجع کو قرینہ سے سمجھ لیتے ہیں۔ یہاں لفظ 'عشی' کی وجہ سے قرینہ واضح تھا اس وجہ سے فاعل کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔

دین میں نماز کی اہمیت

'فَقَالَ' سے پہلے یہاں اتنی بات بربنائے قرینہ محذوف ہے کہ وہ اس پریڈ کے ملاحظہ میں ایسے مستغرق ہوئے کہ عصر کی نماز جاتی رہی۔ پھر جب متنبہ ہوئے تو کہا کہ میں نے مال کی محبت کو اپنے رب کے ذکر پر ترجیح دی یہاں تک کہ سورج چھپ گیا اور نمازِ عصر سے میں محروم رہ گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ کلمہ انھوں نے اظہارِ رنج و غم کے طور پر فرمایا۔ اگرچہ یہ گھوڑے جنگ و جہاد کے گھوڑے تھے اور جس کام میں وہ معروف رہے وہ بھی جہاد ہی کے سلسلہ کا ایک کام تھا لیکن نماز چونکہ دین میں اصل الاصول کی حیثیت رکھتی ہے اس وجہ سے مجبوری کے سوا کوئی اور چیز اس سے غفلت کے لیے عذر نہیں بن سکتی۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔

عصر کی نماز یہود کے ہاں بھی تھی

'ذِکْرِ رَبِّیْ' سے مراد قرینہ دلیل ہے کہ عصر کی نماز ہے۔ اس لئے کہ 'عشی' یعنی سہ پہر میں غروبِ آفتاب سے پہلے عصر ہی کی نماز ہو سکتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ کیا یہود کے ہاں بھی عصر کی نماز تھی؟ تو اس آیت سے تو یہ بات نکلتی ہے کہ سہ پہر میں غروبِ آفتاب سے پہلے پہلے ان کے ہاں بھی کوئی نماز تھی۔ اگر تورات میں اس کی تفصیل نہیں ملتی تو اس سے کچھ فرق نہیں پیدا ہوتا اس لیے کہ قرآن نے صریح الفاظ میں ان کو اس جرم کا مجرم ٹھہرایا ہے کہ انھوں نے نماز برباد کر دی[1]۔ نماز کے یہ اوقات جو اسلام نے مقرر کیے ہیں ایسے فطری اور عقلی ہیں کہ دل گواہی دیتا ہے کہ نماز کے یہی اوقات دوسرے ادیان میں بھی تھے، لیکن امتوں نے ان میں اختلاف کر کے ان کو ضائع کر دیا۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھیے کہ عصر ہی کی نماز کے معاملے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو غزوۂ خندق کے موقع پر آزمائش پیش آئی۔ 'صلوٰۃ وسطیٰ' کے تحت ہم نمازِ عصر کی اہمیت کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

'رُدُّوْهَا عَلَیَّ ؕ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَ الْاَعْنَاقِ' ضمیر مفعول کا مرجع 'الصافنات الجیاد' یعنی گھوڑے ہیں۔ لفظ 'مسح' قتل کرنے کے معنی میں بھی معروف ہے۔ اور 'مسحًا' فعل محذوف کی تاکید کے لیے ہے یعنی 'یَمْسَحُ مَسْحًا'۔

غلبۂ حال کے واقعات دوسروں کے لیے سند نہیں ہوتے

یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس اقدام کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے اس شدید تاثر اور مغلوبیت کی حالت میں کیا۔ انھوں نے فوراً حکم دیا کہ یہ گھوڑے پھر ان کے سامنے حاضر کیے جائیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑے جب اپنے تھانوں پر واپس جا چکے تھے تب حضرت سلیمان علیہ السلام پر اس احساس کا غلبہ ہوا کہ یہی گھوڑے ان کے لیے خدا سے غفلت کا باعث ہوئے۔ چنانچہ ان کو پھر واپس لانے کا حکم دیا اور ان کی پنڈلیوں'

---

[1] چنانچہ یہود ہی کے متعلق فرمایا ہے کہ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ۔ (مریم ۱۹: ۵۹)

اور گردنوں پر تلوار مارنے لگے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک غلبۂ حال کی صورت ہے۔ لفظ 'طفق' اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ آیت سے صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کچھ ہاتھ چلائے؛ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ انھوں نے تمام گھوڑوں کو ختم کر دیا اور ایسا کرنا ممکن بھی نہیں تھا اس لیے کہ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑے ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ غالباً انھوں نے کچھ ہاتھ چلائے اور پھر متنبہ ہو کر اس سے باز آ گئے ہوں گے۔ چونکہ یہ واقعہ ان کی انابت اور 'اوّابیت' کا ایک یادگار واقعہ ہے اس وجہ سے قرآن نے اس کا ذکر کیا ورنہ یہ واقعہ ہے اسی نوعیت کا جس کا صدور حضرت عمر فاروقؓ سے ہوا جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ غلبۂ حال کے واقعات دوسروں کے لیے سند نہیں ہوتے اس وجہ سے جن صوفیوں نے اس سے گریبان تار تار کرنے کا جواز نکالا ہے انھوں نے محض صوفیانہ نکتہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ٥ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (۳۴-۳۵)

حضرت سلیمانؑ کی انابت کا ایک دوسرا واقعہ

یہ حضرت سلیمانؑ کی انابت کا دوسرا واقعہ بیان ہو رہا ہے۔ اس واقعہ کی شکل بھی تفسیر کی کتابوں میں چونکہ بہت بدنما بنا دی گئی ہے اس وجہ سے اس کو بھی پہلے سادہ الفاظ میں سمجھ لیجیے، اس کے بعد الفاظِ قرآن پر غور فرمائیے۔

تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ سخت امتحان پیش آیا کہ دشمنوں نے یورش کر کے ان کے بیشتر علاقے چھین لیے اور باقی علاقوں میں بھی ایسی گڑبڑ پھیلا دی کہ نظمِ حکومت عملاً بالکل درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ ان کی تاخت سے صرف مرکز بچا جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام بالکل مجبور و محصور ہو کر رہ گئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک امتحان تھا لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام ایک خدا ترس بادشاہ تھے اس وجہ سے انھوں نے یہ گمان فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کسی غلطی کی سزا دی ہے۔ اس احساس نے ان کے غم کو دوبالا کر دیا اور وہ اس غم اور بے بسی کی حالت میں اپنے تختِ حکومت پر ایک جسدِ بے جان ہو کر رہ گئے۔ اس وقت انھوں نے نہایت تضرع کے ساتھ اپنے رب سے دعا کی کہ اے رب، میرے گناہ معاف کر اور اگرچہ میں تیرے فضل و انعام کا حق دار نہیں رہ گیا ہوں لیکن تو بڑا بخشنے والا ہے اس وجہ سے میرے عدمِ استحقاق کے باوجود مجھے ایسی بادشاہی دے جس کے سزاوار اس طرح کے گناہ کے ساتھ دوسرے نہ ہوتے ہیں، نہ ہوں گے۔

حضرت سلیمانؑ کا امتحان

'وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ' یعنی ہم نے سلیمانؑ کو امتحان میں ڈالا۔ یہ امتحان اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ ضروری نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کسی جرم ہی کی سزا کے طور پر امتحان میں ڈالے گئے ہوں۔ امتحان تمام نبیوں اور رسولوں کو پیش آئے ہیں جس سے ان کے صبر یا شکر کی آزمائش ہوئی ہے۔ اسی طرح

کے ایک امتحان میں حضرت سلیمان علیہ السلام بھی ڈالے گئے اور چونکہ وہ ایک بادشاہ تھے اس وجہ سے ان کو یہ امتحان ان کی بادشاہی کی راہ سے پیش آیا۔

حضرت سلیمانؑ کے غم والم اوران کی بےبسی کی تصویر

'وَاَلْقَیْنَا عَلٰی كُرْسِیِّهٖ جَسَدًا' یہ نہایت مختصر لیکن نہایت جامع لفظوں میں اس امتحان کا بیان ہے کہ کہاں تو وہ ایک وسیع الاطراف حکومت کے نہایت طاقتور اور صاحبِ اقتدار بادشاہ تھے یا ہم نے ان کو ان کے تخت پر ایک بالکل جسدِ بے جان بنا کر ڈال دیا۔ لفظ 'جَسَد' یہاں بطور کنایہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی بے بسی اور ان کے غم والم کی تصویر کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی حکومت سمٹ سمٹا کر مرکز تک محدود رہ گئی اور حالات نے ان کو اس قدر بے بس اور غم زدہ بنا دیا کہ گویا صرف جسم رہ گیا، روح غائب ہوگئی۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ایک بے بس اور غم زدہ بادشاہ کی، جو اپنے مرکز میں محصور ہو کر رہ گیا ہو، اس سے بہتر تصویر نہیں ہو سکتی۔

'ثُمَّ اَنَابَ' یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام ایسے حالات میں بھی اپنے رب سے مایوس نہیں ہوئے بلکہ ان کو احساس ہوا کہ یہ ان کی کسی غلطی پر ان کی پکڑ ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ اسی کی طرف توبہ و استغفار کے لیے متوجہ ہوئے۔

حضرت سلیمانؑ کی دُعا اور اس کا صحیح مدعا

'قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ' اس دُعا کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تو مجھے ایسی بادشاہی دے جیسی بادشاہی میرے بعد کسی اور کو نہ ملے بلکہ ان کا مطلب صرف یہ تھا کہ اگرچہ میں اپنے گناہ کے سبب سے کسی حکومت کا اہل تو نہیں رہ گیا ہوں تاہم تو اپنے فضل سے مجھے ایسی بادشاہی دے جس کا سزاوار نہ میں ہوں نہ میرے بعد کوئی اور ہوگا۔

'اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ' یعنی تو بڑا بخشنے والا ہے۔ اس وجہ سے میں بھی، اپنی غلطیوں کے باوجود، امیدوار ہوں کہ تو مجھے محروم نہیں فرمائے گا۔

اس دُعا میں اصل زور بادشاہی کی بے مثال عظمت و شوکت پر نہیں بلکہ بلا استحقاق بادشاہی دیے جانے پر ہے کہ مجھے میرے گناہوں کے باوجود بادشاہی دے جب کہ میرے بعد کوئی اور اس کا سزاوار نہیں ٹھہرے گا۔ اس دعا میں اپنے گناہ کا جو شدید احساس ہے وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی غایت خشیت و انابت کی دلیل ہے۔ خدا ترس حکمرانوں نے ہمیشہ اپنے ملک میں آنے والی ہر آفت کو اپنی ہی کوتاہیوں کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ حضرت عمرؓ کے متعلق روایتوں میں آتا ہے کہ ان کے زمانۂ حکومت میں ایک مرتبہ قحط پڑا، جو عام الرمادہ کے نام سے مشہور ہے، تو حضرت عمرؓ کا پورے زمانۂ قحط میں یہ حال رہا کہ شب کی نمازوں میں روتے روتے اپنی ڈاڑھی تر کر لیتے اور دعا فرماتے کہ اے رب! امتِ محمدؐ میرے ہاتھوں تباہ نہ ہو!

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّیْحَ تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَیْثُ اَصَابَ (۳۶)

امتحان میں کامیابی کے بعد حضرت سلیمانؑ کی عظمت میں اضافہ

اس آیت کا اسلوبِ بیان اشارہ کر رہا ہے کہ مذکورہ بالا امتحان کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کا یہ خاص فضل ہوا کہ اس نے ہوا پر بھی ان کو ایسا تصرف بخشا جو ان سے پہلے کسی کو حاصل نہیں ہوا۔ سورۂ انبیاء اور بعض دوسری سورتوں کی تفسیر میں ہم واضح کر آئے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی بحری قوت ان کے زمانہ کی سب سے بڑی بحری قوت اور ان کا بحری بیڑا اپنے زمانہ کا سب سے زیادہ طاقتور بیڑا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہوا کو کنٹرول کرنے کے لیے بادبانی نظام کو انھوں نے اتنی ترقی دی کہ ان کے جہازات ہر قسم کے سمندروں میں لمبے لمبے سفر کرتے اور ان کے سفر میں نہ ہوا کی کمی سے کوئی خلل پڑتا نہ اس کی شدت سے۔ وہ سخت سے سخت طوفانی ہواؤں کا بھی نہایت کامیابی سے مقابلہ کرتے اور موافق ہوا نہ ہونے کے باوجود اپنے سفر بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رکھتے۔ لوہے کی صنعت میں ترقی کر کے جس طرح حضرت داؤدؑ علیہ السلام نے اپنی بری قوت ناقابلِ تسخیر بنا لی تھی اسی طرح بادبانی سسٹم کو ترقی دے کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی بحری قوت میں بے مثال اضافہ کر لیا تھا۔

حضرت سلیمانؑ کا ہوا پر کنٹرول

'تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَیْثُ اَصَابَ'۔ 'اصاب' یہاں ہدف ٹھہرانے کے مفہوم میں ہے، جس طرح 'اَصَابَ السَّھْمُ' کا محاورہ ہے۔ یعنی اپنے جہاز بھیجنے کے لیے جس مقام کو وہ اپنا ہدف بناتے وہ بے روک ٹوک، فصل و موسم کا انتظار کیے بغیر، وہاں کے لیے روانہ ہو جاتے۔ اس لیے کہ ہوا ان کے کنٹرول میں تھی۔ وہ اپنے سفر کے لیے اس کو جب چاہتے سازگار بنا لیتے۔

وَالشَّیٰطِیْنَ کُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ۙ وَّاٰخَرِیْنَ مُقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ ۔ (۳۷-۳۸)

تسخیرِ جنات کا علم

ہوا کو کنٹرول کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایک ایسا علم بھی دیا تھا جس سے وہ شریر جنوں کو مسخر کر کے ان کو اپنی تعمیرات کے کاموں میں بھی لگاتے اور سمندری دولت سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان سے غوطہ خوری بھی کراتے۔ 'شیاطین' سے مراد یہاں شیاطینِ جن ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام صرف شریر جنوں ہی کو مسخر کرتے، صالحین سے تعرض نہیں کرتے تھے۔ 'کُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ' میں لفظ 'کل' میرے نزدیک صفت کی تاکید کے لیے ہے۔ یعنی وہ نہایت ماہر معماروں اور غوطہ خوروں کو مسخر کیے ہوئے تھے۔

'وَّاٰخَرِیْنَ مُقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ' یعنی جنوں کی ایک پارٹی ریزرو فورس کی حیثیت سے بھی، زنجیروں میں قید، ان کے پاس موجود تھی کہ عند الضرورت ان سے کام لیا جا سکے۔

هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَیْرِ حِسَابٍ (۳۹)

'بِغَیْرِ حِسَابٍ' کا تعلق 'هٰذَا عَطَآؤُنَا' سے ہے۔ یعنی یہ عظیم نعمتیں تمھارے قیاس و گمان اور تمھاری امیدوں اور توقعات سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں۔ تم خواب و خیال میں بھی ان کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔

اہلِ تاویل کی ایک غلط فہمی

'فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ' یہ ان کے اس اختیار کا بیان ہے جو ہر مالک کو اس کی ملکیت اور ہر بادشاہ

کو اس کی مملکت میں حاصل ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم چاہو تو اس کو لوگوں پر خرچ کرو اور چاہو تو اس پر مارِ گنج بن کر بیٹھ رہو، تم کو دونوں کا حق حاصل ہے۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ آزادی اور اختیار تو تمھیں دونوں باتوں کے لیے حاصل ہے لیکن فیاضی کرو گے تو اس کا حق ادا کرو گے اور اس کا صلہ پاؤ گے اور اگر خزانے کے سانپ بن کر اس پر مسلط ہو جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں، جس نے یہ سب کچھ تمھیں بخشا ہے، اپنا انجام دیکھو گے۔

یہ بالکل وہی بات حضرت سلیمان علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمائی گئی جو ذوالقرنین کو مخاطب کر کے ان الفاظ میں فرمائی گئی۔

قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ه (الکہف: ۸۶)	ہم نے کہا، اے ذوالقرنین! (ہم نے ان کو تمھارے اختیار میں دے دیا تو) اب چاہو ان کو سزا دو اور چاہو ان کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

جن لوگوں نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دے کر لائسنس دے دیا تھا کہ وہ جو چاہیں کریں ان سے کوئی حساب کتاب نہیں ہوگا، انھوں نے بالکل غلط سمجھا ہے۔ دوسری باتوں سے قطع نظر اوپر آیت ۲۶ میں حضرت داؤد علیہ السلام کو جو ہدایت ہوئی ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے، پھر غور فرمائیے کہ باپ کو یہ ہدایت دینے کے بعد بیٹے کو یہ کھلی چھٹی کس طرح دی جا سکتی ہے!

وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ (۴۰)

یعنی وہ کسی گھمنڈ اور استکبار میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ خدا سے ڈرنے اور اس کی طرف رجوع ہونے والے تھے اس وجہ سے ان کو اللہ کے ہاں خاص قرب اور بہترین مرجع حاصل ہوگا۔

۶۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۴۱-۶۴

آگے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے پہلے چند انبیاء علیہم السلام کا ذکر فرمایا ہے جن کو بڑی بڑی آزمائشیں پیش آئیں لیکن وہ ان سے دل برداشتہ اور مایوس نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے حالات کا صبر و عزیمت سے مقابلہ کیا، اپنی تکالیف میں اپنے رب ہی سے رجوع کیا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تمام تکلیفیں دور فرما دیں اور ان کو اپنے فضل و انعام سے نوازا۔ پھر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہترین ٹھکانا اس کے متقی بندوں ہی کے لیے ہے۔ اس کے بعد متقیوں اور طاغیوں کے انجام کی وضاحت فرمائی ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۱-۶۴ وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ

وَعَذَابٍ ﴿٤١﴾ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ﴿٤٢﴾
وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿٤٣﴾
وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ۗ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۗ
نِعْمَ الْعَبْدُ ۗ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿٤٤﴾ وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ
وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ﴿٤٥﴾ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ
ذِكْرَى الدَّارِ ﴿٤٦﴾ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ﴿٤٧﴾ وَاذْكُرْ
اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ۗ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ ﴿٤٨﴾ هٰذَا ذِكْرٌ ۗ
وَاِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿٤٩﴾ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ
الْاَبْوَابُ ﴿٥٠﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّ
شَرَابٍ ﴿٥١﴾ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ﴿٥٢﴾ هٰذَا مَا
تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿٥٣﴾ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴿٥٤﴾
هٰذَا ۗ وَاِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ﴿٥٥﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿٥٦﴾
هٰذَا ۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ﴿٥٧﴾ وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖٓ اَزْوَاجٌ ﴿٥٨﴾
هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ ۗ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ﴿٥٩﴾
قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ ۖ لَا مَرْحَبًۢا بِكُمْ ۗ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا ۚ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٦٠﴾
قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِي النَّارِ ﴿٦١﴾
وَقَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ ﴿٦٢﴾ اَتَّخَذْنٰهُمْ
سِخْرِيًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ ﴿٦٣﴾ اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ

ع ۴ اَهْلِ النَّارِ ﴿۶۴﴾

۱۲ ترجمہ آیات ۴۱-۶۴

اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو جب کہ اس نے اپنے رب سے فریاد کی کہ شیطان نے مجھے سخت دُکھ اور آزار میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ہم نے اس کو ہدایت کی کہ زمین پر اپنا پاؤں مار۔ یہ نہانے کا بھی ٹھنڈا پانی ہے اور پینے کا بھی۔ اور ہم نے اس کو بخشے اس کے اہل و عیال اور ان کے مانند ان کے ساتھ اور بھی، اپنا فضل کرنے اور اہلِ عقل کی یاد دہانی کے لیے۔ اور اپنے ہاتھ میں سینکوں کا ایک مٹھا لے اور اس سے اپنے کو مار لے اور اپنی قسم میں حانث نہ ہو۔ ہم نے اس کو نہایت صابر پایا۔ خوب بندہ! بے شک وہ بڑا ہی رجوع کرنے والا تھا۔ ۴۱-۴۴

اور ہمارے بندوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کو یاد کرو جو قوت و بصیرت رکھنے والے تھے۔ ہم نے ان کو ایک خاص شن —— آخرت کی یاد دہانی —— پر مامور کیا تھا اور وہ ہمارے ہاں برگزیدہ اور بہتر بندوں میں سے ہیں۔ ۴۵-۴۷

اور اسماعیل، الیسع اور ذوالکفل کو یاد کرو۔ اور ان میں سے ہر ایک اخیار میں سے ہے۔ ۴۸

یہ یاد دہانی ہے اور بے شک اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے اچھا ٹھکانا ہے۔ ہمیشہ کے باغ جن کے دروازے ان کے لیے کھولے ہوئے ہوں گے۔ وہ اس میں ٹیک لگائے ہوئے ہوں گے اور بہت سے میوے اور شربات طلب کرتے ہوں گے اور ان کے پاس شرمیلی ہم سن حوریں ہوں گی۔ یہ ہے وہ چیز جس کی حساب کے دن کے لیے تم کو بشارت دی جاتی تھی۔ یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔ ۴۹-۵۴

ایک طرف یہ ہے اور (دوسری طرف) سرکشوں کے لیے نہایت بُرا ٹھکانا ہو گا۔ یعنی جہنم جس میں وہ داخل ہوں گے۔ پس کیا ہی بُری جگہ ہے! یہ کھولتا ہوا پانی اور پیپ ہے۔ پس یہ لوگ

اس کو چکھیں اور اسی قبیل کی دوسری اور چیزیں بھی ہوں گی۔ ۵۵-۵۸

یہ بھیڑ بھی تمھارے ساتھ ہی جہنم میں پڑنے والی ہے۔ ان پر خدا کی مار! یہ تو دوزخ میں پڑنے والے ہیں۔ وہ جواب دیں گے بلکہ تم، تم پر خدا کی مار! تمہی نے ہمارے لیے یہ سامان کیا۔ پس کیا ہی برا ٹھکانا ہوگا! وہ کہیں گے، اے ہمارے رب! جن لوگوں نے ہمارے لیے اس کا سامان کیا ان کو دُگنا عذاب دیجیو، جہنم میں۔ ۵۹-۶۱

اور وہ کہیں گے، کیا بات ہے ہم ان لوگوں کو یہاں نہیں دیکھ رہے ہیں جن کو ہم اشرار میں سے شمار کرتے تھے۔ کیا ہم نے ان کو محض مذاق بنا یا تھا یا ان سے نگاہیں چوک رہی ہیں! بے شک اہلِ دوزخ کی یہ باہمی تو تکار ایک امرِ واقعی ہے! ۶۲-۶۴

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ (۴۱)

حضرت ایوبؑ کا ابتلاء

حضرت ایوبؑ کے ابتلاء کی تفصیل سورۂ انبیاء کی تفسیر میں ہم پیش کر چکے ہیں۔ یہاں صرف انہی چیزوں سے تعرض کریں گے جو خاص اس سورہ سے متعلق ہیں۔ بندے کو جو آزمائشیں پیش آتی ہیں وہ پیش تو اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے آتی ہیں لیکن ان کے پیش آنے میں ایک اہم عامل شیطان بھی ہوا کرتا ہے اس وجہ سے مشیئت و قدرت کے پہلو سے وہ خدا کی طرف منسوب ہوتی ہیں اور سبب کے پہلو سے شیطان کی طرف۔ اسی پہلو سے حضرت ایوب علیہ السلام نے اپنے دکھ اور آزار کو شیطان کی طرف منسوب کیا۔ سِفرِ ایوب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ایوبؑ کو بڑی دولت و حشمت حاصل تھی لیکن اس کے باوجود وہ نہایت خدا ترس اور عبادت گزار بندے تھے۔ ان کی اس حالت پر شیطان اور اس کے ایجنٹوں کو بڑا حسد ہوا اور انھوں نے ان کے خلاف یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ اگر ایوب دن رات خدا کی عبادت ہی میں لگے رہتے ہیں تو یہ کیا کمال ہوا، خدا نے جب اتنا مال و اسباب دے رکھا ہے تو عبادت نہ کریں تو اور کیا کریں، ہم تو جب جانیں جب خدا یہ ساری چیزیں ان سے چھین لے اور پھر بھی وہ اس کے عبادت گزار رہیں! بالآخر اللہ تعالیٰ نے ہر چیز سے ان کو محروم کر دیا۔ نہ ان کے پاس مال کے قسم کی کوئی چیز باقی رہ گئی اور نہ اولاد و احفاد اور خدم و حشم باقی رہ گئے لیکن وہ اس عظیم مصیبت سے مایوس نہیں ہوئے بلکہ اپنے رب کے حضور سجدے

میں گر پڑے اور فرمایا کہ میں اپنی ماں کے پیٹ سے ننگا پیدا ہوا تھا اور اب ننگا ہی اپنے رب کے پاس جاؤں گا۔ سفرِ ایوب میں ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے شیطان سے کہا کہ تو نے میرے بندے کو دیکھ لیا کہ سب کچھ چھن جانے کے بعد بھی وہ میرا ہی ہے۔ اس پر شیطان نے کہا کہ یہ مال و اولاد کا معاملہ تھا اس وجہ سے وہ صبر کر گیا، میں تو جب جانوں جب تو اس کو شدید قسم کے جسمانی آزاروں میں مبتلا کرے اور پھر بھی وہ تیرا عبادت گزار رہ جائے! چنانچہ اس کے بعد وہ ایسے شدید قسم کے جسمانی آزار میں مبتلا ہوئے کہ سفرِ ایوب میں اس کی تفصیل پڑھیے تو دل کانپ جاتا ہے لیکن اس کے بعد ان کی انابت اللہ کی طرف اور بڑھ گئی اور اس آزمائش میں بھی انھوں نے شیطان کو شکست دے دی۔ شیطان کی اس شکست کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوبؑ کو اس سے کہیں زیادہ بخشا جو ان سے چھینا گیا تھا۔

یہ تفصیل سفرِ ایوب کی روشنی میں ہم نے اس لیے پیش کی ہے کہ حضرت ایوبؑ کی فریاد مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ کا صحیح پہلو سمجھ میں آسکے کہ اس دنیا میں اپنے رب کے ساتھ اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے شیطان کے ہاتھوں ان کو کیا کیا دکھ جھیلنے پڑے ہیں اور کیسی شدید لڑائی انھوں نے اس کے ساتھ لڑی ہے۔

'نُصب' کے معنی تکان، دکھ اور مصیبت کے ہیں اور عذاب سے مراد وہ اذیتیں ہیں جو جسمانی امراض کی نوعیت کی ان کو پہنچیں۔ ان دونوں لفظوں نے ان تمام مصائب کو سمیٹ لیا ہے جن میں وہ مبتلا ہوئے۔

اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ (۴۲)

امتحان کے بعد حضرت ایوبؑ پر اللہ تعالیٰ کا فضل

اللہ تعالیٰ ایک خاص حد سے زیادہ اپنے بندے کو آزمائش میں نہیں ڈالتا۔ چنانچہ جب حضرت ایوبؑ کا امتحان پورا ہو گیا تو ان کی دعا بلا تاخیر قبول ہو گئی۔ ان کو کسی خاص جگہ کی طرف اشارہ کر کے ہدایت ہوئی کہ فلاں جگہ اپنے پاؤں سے ٹھوکر مارو، وہیں ایک چشمہ جاری ہو جائے گا جو تمہارے نہانے کے لیے بھی نہایت ٹھنڈا ہے اور پینے کے لیے بھی۔ یہ ان کو علاج بتایا گیا ان جلدی امراض کا جن میں وہ مبتلا ہو گئے تھے اور جن کے سبب سے ان کا یہ حال تھا کہ دن رات راکھ کے ڈھیر پر بیٹھے ہوئے ٹھیکروں سے اپنا سارا بدن کھجلاتے رہتے۔

پاؤں کی ٹھوکر سے اس طرح کسی چشمے کا جاری ہو جانا کوئی مستبعد بات نہیں ہے۔ ندیوں اور نالوں کے کنارے زمین کی بالائی سطح کے ذرا نیچے پانی کے سوتے دبے ہوتے ہیں جو ہاتھ یا پاؤں سے کریدنے پر فوراً جاری ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسی طرح کے کسی سوتے کو حضرت ایوبؑ کے لیے شفا کا ذریعہ بنا دیا۔

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ (۴۳)

جسمانی آزاروں سے نجات دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے اہل و عیال بھی ان کو پھر دیے اور ان کے ساتھ انہی کے برابر خدم و حشم بھی۔ اس ابتلاء کے دور میں ان کے آل و اولاد اور اقربا میں سے کچھ تو بچھڑ

گئے تھے، کچھ وفات پا گئے تھے۔ غلام اور خدام بھی سب تتر بتر ہو گئے تھے۔ آزمائش کا دور ختم ہونے کے بعد بچھڑے ہوئے اعزہ پھر مجتمع ہو گئے، جو وفات پا چکے تھے اللہ نے ان کے بدل عنایت فرمائے اور مال کے ساتھ ساتھ خدم وحشم بھی ان کو پھر مل گئے۔

اس واقعہ کی عبرتیں اہل دانش کے لیے

'رَحۡمَةً مِّنَّا وَذِكۡرٰى لِأُولِى الۡأَلۡبَابِ' یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ اپنے ایک راستباز اور کامل العیار بندے پر اپنا فضل فرمائے اور اس لیے بھی کہ اللہ کا یہ معاملہ اہلِ عقل کے لیے یاددہانی ہو۔

اہلِ عقل کی یاددہانی کے اس میں کئی پہلو ہیں۔ مثلاً:

—— یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی وفاداری کا امتحان کرتا ہے اور اس کے ہاں کامیابی انہی کو حاصل ہوتی ہے جو اس کے امتحان میں ثابت قدم رہتے ہیں۔

—— اس امتحان کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک حد مقرر ہے جس سے یہ متجاوز نہیں ہونے پاتا۔

—— اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور انابت ہی اس امتحان میں وسیلۂ ظفر ہے۔

وَخُذۡ بِيَدِكَ ضِغۡثًا فَاضۡرِب بِّهِۦ وَلَا تَحۡنَثۡ ۗ إِنَّا وَجَدۡنَٰهُ صَابِرًا ۚ نِّعۡمَ الۡعَبۡدُ ۖ إِنَّهُۥٓ أَوَّابٌ (۴۴)

حضرت ایوبؑ کی ایک قسم اور اس کی ذمہ داری سے بریت

اس دورِ ابتلا میں معلوم ہوتا ہے حضرت ایوبؑ کے دل میں کوئی ایسا خیال گزرا جو صبر اور انابت الی اللہ کے منافی تھا اس پر اپنے نفس کو سزا دینے کے لیے انھوں نے یہ قسم کھائی کہ میں اپنے آپ کو اتنے کوڑے ماروں گا۔ کوڑوں کی تعداد مذکور نہیں ہے۔ حضرت ایوبؑ کا یہ عہد اگرچہ ان کی خشیت اور محبت الٰہی کا نتیجہ تھا لیکن بندوں کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی ناروا مصیبت میں ڈالیں اگرچہ وہ خدا کی خوشنودی ہی کے لیے ہو اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی ذمہ داری سے ان کو بری قرار دے دیا لیکن قسم کا معاملہ چونکہ دین میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، اسی پر تمام عہد و پیمان کی بنیاد ہے اس وجہ سے ان کو یہ ہدایت ہوئی کہ جتنے کوڑے مارنے کی قسم کھائی ہے اتنے سینکوں کا ایک مٹھا لے کر اپنے کو مارلیں تاکہ رسمی طور پر قسم پوری ہو جائے اور دل پر قسم توڑنے کا بار نہ رہے۔

دین میں اس چیز کا اہتمام ہے کہ اگر کسی حکم کی تعمیل اس کی اصلی صورت میں متعذر ہو تو اس کی تعمیل تشبیہی صورت میں ضرور کی جائے تاکہ اس کی یاد قائم رہے۔ وضو نہ کر سکنے کی صورت میں تیمم، رکوع اور سجدہ نہ کر سکنے کی صورت میں اشارہ پر کفایت کرنے کی ہدایت اسی اصل پر مبنی ہے۔ کسی کفارہ کی ہدایت بھی ان کو ہو سکتی تھی لیکن اس وقت حضرت ایوب علیہ السلام نہ کوئی مالی کفارہ ادا کرنے کے قابل تھے نہ جسمانی۔ مال سے وہ بالکل محروم ہو چکے تھے اور بیماری نے اس طرح چور کر دیا تھا کہ روزے رکھنے کے قابل بھی نہیں رہ گئے تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ یہ خاص رعایت فرمائی۔

مفسرین نے عام طور پر یہ سمجھا ہے کہ قسم انھوں نے اپنی بیوی کو سو کوڑے مارنے کی کھائی تھی لیکن قرآن

میں اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے اور قرینہ بھی اس کے خلاف ہے اس لیے کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دورِ ابتلا میں صرف ان کی بیوی ہی کی اکیلی ذات تھی جس نے رات دن حضرت ایوبؑ کی خدمت کی۔ ایسی وفادار بیوی پر یہ عتاب بعید از عقل ہے۔

فقہا نے اس سے حیلۂ شرعی کا جواز بھی نکالنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ موضوع ایک مستقل موضوع ہے۔ اس پر ہم ان شاء اللہ اس کے محل میں گفتگو کریں گے۔ یہاں بحث صرف آیت کے سیاق و سباق تک محدود رکھیے۔

'اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا' سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ جس وسوسہ پر انھوں نے مذکورہ بالا قسم کھائی اس میں شیطان نے ان کے صبر ہی کو متزلزل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ صبر کی چٹان پر جمے رہے۔

'نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ' بعینہٖ یہی الفاظ اوپر حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعریف میں بھی وارد ہوئے ہیں۔ اس سے ان تمام واقعات کے اشتراکِ مقصد پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں اچھا بندہ بننے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی کے دل کے اندر کسی گناہ کا خطور نہ ہو بلکہ یہ کافی ہے کہ آدمی جب کسی لغزش کا احساس کرے تو فوراً اپنے رب کی طرف رجوع کرے اور حق پر ثابت قدم رہے۔

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ۝ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ۝ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ۝ (۴۵-۴۷)

حضرت ابراہیم اور حضرت اسحاق و حضرت یعقوب علیہم السلام کا خاص مشن

یہ حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کی یاددہانی فرمائی۔ یہ اسرائیلی سلسلۂ رشد و ہدایت کے اصل عماید ہیں۔ ان لوگوں کو پدرسراز قسم کی سرداری بھی حاصل رہی اور روحانی بصیرت بھی۔ اس وجہ سے ان کی صفت 'اُولُوا الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ' آئی ہے یعنی ان کو قوت اور بصیرت دونوں نعمتوں سے اللہ تعالیٰ نے نوازا تھا۔ اگر قوت کے ساتھ بصیرت نہ ہو تو آدمی ایک نہایت خطرناک جانور بن جاتا ہے۔ فرمایا کہ ان کو ہم نے آخرت کی یاددہانی کے خاص مشن پر مامور کیا تھا اور وہ ہمارے خاص برگزیدہ اخیار میں سے تھے۔

'ذِكْرَى الدَّارِ'، 'خَالِصَةٍ' سے بدل واقع ہے اور 'دار' دارِ آخرت کے مفہوم میں ہے اس لیے کہ اصلی گھر وہی ہے۔ یہ دنیا محض ایک سرائے فانی ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کا اصل کام درحقیقت آخرت کی یاددہانی ہی ہے اس لیے کہ آخرت کی یاد ہی تمام صلاح و فلاح کی کلید ہے۔ اگر انسان اس سے غافل ہو جائے تو وہ شیطان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ اور اگر اس کی یاد اس کے اندر زندہ رہے تو وہ لغزشوں کے باوجود صراطِ مستقیم پر گامزن رہتا ہے۔

حضرت اسماعیل، الیسع اور ذوالکفل علیہم السلام

وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ۭ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ ۝ (۴۸)

'ذَا الْكِفْلِ' کا ذکر سورۂ انبیاء آیت ۸۵ میں گزر چکا ہے۔ وہاں ان کا ذکر حضرت اسماعیل اور حضرت ادریس علیہما السلام کے ساتھ آیا ہے اور ان تمام انبیاء کا مشترک وصف 'صبر' مذکور ہوا ہے۔ یہاں حضرت

ذوالکفل علیہم السلام

ادریسؑ کی جگہ الیسعؑ کا نام ہے۔ 'الیسع' سے ملتے جلتے تورات میں دو نبیوں کے نام ہیں۔ ایک 'الیشع'، جن کا زمانہ ۸۳۱ قبل مسیح بتایا جاتا ہے، دوسرے 'یسعیاہ'، جن کا زمانہ ۷۴۲ قبل مسیح مذکور ہے۔ 'ذُوالْكِفْلِ' سے متعلق ہم سورۂ انبیاء میں اپنی رائے عرض کر چکے ہیں۔ سیاقِ کلام یہاں بھی صبر ہی کے ذکر کا ہے۔ یہ وصف یوں تو تمام انبیاء علیہم السلام کا مشترک وصف ہے لیکن یہ انبیاء اس میں امتیازی مقام رکھتے ہیں۔

هٰذَا ذِكْرٌ ۭ وَاِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ (۴۹)

خلاصۂ بحث

یہ مذکورہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات سنانے کے بعد خلاصۂ بحث سامنے رکھ دیا ہے۔ فرمایا کہ یہ یاددہانی ہے، یعنی یہ محض ماضی کے قصے نہیں ہیں بلکہ تمہارے لیے بھی یہ درسِ موعظت اور عظیم درسِ موعظت ہے اور یہ یاد رکھو کہ خدا کے ہاں اچھا ٹھکانا خدا سے ڈرنے والوں ہی کے لیے ہے، ان لوگوں کے لیے وہاں ذلت کی مار ہے جو خدا کی پُرنصیحت کتاب کی باتیں سن کر اکڑتے اور اس کو جھٹلاتے ہیں۔ یہاں کلام کے تسلسل کو سمجھنے کے لیے پہلی آیت کے مضمون پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ۝ مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّشَرَابٍ ۝ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ۝ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ۝ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ (۵۰-۵۴)

متقیوں کا صلہ

یہ اس بہترین ٹھکانے کا بیان ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں 'حُسْنَ مَاٰبٍ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔ فرمایا کہ ان کے لیے ہمیشگی کے باغ ہوں گے جن کے دروازے ان کے لیے پہلے سے کھولے ہوئے ہوں گے۔ جس طرح کسی معزز مہمان کی آمد کے موقع پر پھاٹک کھول کر پہلے سے اس کا انتظار کیا جاتا ہے اسی طرح ان کے خیر مقدم کے لیے جنت کے پاسبان ان کا انتظار کر رہے ہوں گے۔

'شَرَابٍ' سے مراد مشروبات ہیں۔ وہ اس میں تختوں پر ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ہوں گے اور اپنے خدام سے ہر قسم کے میوے اور مختلف قسم کے مشروبات طلب کر رہے ہوں گے۔

'وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ'۔ 'قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ' باحیا اور شرمیلی نازنینوں کو کہتے ہیں۔ عرب اور دنیا کے تمام شرفاء میں عورت کی سب سے اعلیٰ صفت یہی سمجھی گئی ہے۔ 'اَتْرَابٌ' کے معنی ہم سن کے ہیں، یعنی ان کی تکمیلِ مسرت کے لیے ان کے پہلو بہ پہلو شرمیلی اور ہم سن نازنینیں بھی ہوں گی۔

'هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ .... الاٰیۃ'۔ یعنی یہ نعمتیں دے کر ان کو بتایا جائے گا کہ جن نعمتوں کی بشارت آج کے دن کے لیے آپ لوگوں کو دی گئی تھی وہ یہ حاضر ہیں۔ اللہ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ یہ جو کچھ آپ لوگوں کو ملا ہے اس میں برابر اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس کے ختم ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں۔

هٰذَا ۭ وَاِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ (۵۵)

طاغیوں کی سزا

یعنی ایک طرف متقیوں کے لیے یہ نعمتیں اور نوازشیں ہوں گی اور دوسری طرف طاغیوں اور سرکشوں کے

لیے نہایت برا ٹھکانا ہوگا۔ طاغیوں سے مراد وہی لوگ ہیں جن کا ذکر شروع سورہ میں 'بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ عِزَّۃٍ وَّ شِقَاقٍ' سے ہوا ہے یعنی جو اللہ تعالیٰ کی یاد دہانی سے خدا کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے اس کا مذاق اڑاتے اور اللہ کے رسول سے جھگڑتے ہیں۔

جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ (۵۶)

یہ اس 'شَرَّ مَاٰبٍ' کی تفصیل ہے۔ یعنی یہ برا ٹھکانا جہنم ہے۔ 'یَصْلَوْنَهَا' یعنی اس جہنم کی ان کو دُور دُور سے سیر نہیں کرائی جائے گی بلکہ ان کو اس میں داخل ہونا پڑے گا اور کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے جس میں یہ داخل ہوں گے!

هٰذَا ۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ۙ وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖٓ اَزْوَاجٌ (۵۷-۵۸)

'هٰذَا ۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ'، 'حَمِيْمٌ' گرم کھولتے پانی کو کہتے ہیں اور 'غَسَّاق' کے معنی پیپ کے ہیں۔ یعنی ان کو اشارے سے بتا دیا جائے گا کہ یہ چیزیں ہیں ان کو چکھیں۔ اس کے بعد ان نفرت انگیز چیزوں میں سے دو کا ذکر کر کے یہ فرما دیا کہ اسی قبیل کی دوسری مختلف النوع نفرت انگیز چیزیں بھی ہوں گی جو ذکر کے لائق نہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ چیزیں ان دوزخیوں کو 'نُزُل' یعنی اولین سامانِ ضیافت کے طور پر ملیں گی۔ اصل عذاب کا دور اس کے بعد شروع ہوگا۔

هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ ۚ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ (۵۹)

اہلِ دوزخ کی تُو تکار

اوپر کی آیت میں لفظ 'طَاغِین' دلیل ہے کہ یہ کفر کے سرغنوں اور لیڈروں کا بیان ہے۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ ان کے پیرووں کی بھیڑ بھی ان کے سامنے لائی جائے گی اور ان کو خبر دی جائے گی کہ یہ لوگ بھی تمھارے ساتھ ہی جہنم میں پڑنے والے ہیں۔ وہ فوراً کہیں گے کہ یہ دفع ہوں، آخر یہ بھی تو جہنم ہی میں پڑنے والے بنے!

قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ ۟ لَا مَرْحَبًۢا بِكُمْ ۭ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا ۚ فَبِئْسَ الْقَرَارُ (۶۰)

پیرو غصہ سے دانت پیس کر جواب دیں گے کہ بلکہ تم، تم پر خدا کی مار ہو، تم ہو جس نے ہمارے لیے اس عذاب کا سامان کیا۔ اس فقرے میں مبتدا کے حذف اور دونوں مبتداؤں کے بیچ میں جملہ معترضہ پر نگاہ رہے۔ ایک ایک لفظ سے غصہ ابل رہا ہے۔ 'فَبِئْسَ الْقَرَارُ' بطور حسرت ان کی زبان سے نکلے گا کہ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے جس کا تم نے ہمارے لیے سامان کیا! ویسے یہ جملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور استدراک بھی ہو سکتا ہے، لیکن مفہوم میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوگا۔

قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِي النَّارِ (۶۱)

اس کے بعد وہ اپنے رب سے درخواست کریں گے کہ اے رب! جن لوگوں نے ہمارے لیے اس عذاب کا سامان کیا اور ہمیں گمراہ کر کے اس منزل تک لائے ان کو دوزخ میں دونا عذاب دیجیو۔

وَقَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ ۝ اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ (۶۲-۶۳)

پھر یہ سوال ان کے اندر پیدا ہوگا کہ آخر وہ لوگ کہاں ہیں جن کو ہم اشرار میں شمار کرتے تھے کہ یہ دینِ آبائی کے دشمن، ہمارے دیوتاؤں کی توہین کرنے والے اور ہماری قومی وحدت پر ضرب لگانے والے ہیں؟ کیا ہم نے محض شرارت سے ان کا مذاق اڑایا اور ان کو مفسد ٹھہرایا درآنحالیکہ وہ صالحین میں سے تھے یا وہ بھی یہاں موجود ہیں لیکن ہم کو وہ نظر نہیں آ رہے ہیں؟ یہ سوال غالباً وہ لوگ کریں گے جو اس دنیا میں جانتے تھے کہ جن مسلمانوں کو ہمارے لیڈر ہدفِ مطاعن بنائے ہوئے ہیں وہ اچھے لوگ ہیں لیکن وہ اپنے لیڈروں سے مرعوب ہونے کے باعث ان کے حق میں کوئی کلمۂ خیر کہنے کی جرأت نہ کر سکے۔

اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ (۶۴)

'ذٰلِكَ' کا اشارہ 'تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ' کی طرف ہے۔ 'تَخَاصُم' کے معنی باہمی تو تکار اور جھگڑے کے ہیں۔ فرمایا کہ اہلِ دوزخ کی جس تو تکار کا ذکر ہوا یہ ایک امرِ واقعی ہے اس کو کوئی خواب و خیال نہ سمجھے۔ آج جو لوگ حق کی مخالفت میں ایک دوسرے کے لیڈر اور پیرو بنے ہوئے ہیں وہ جو کچھ کریں اس انجام کو سامنے رکھ کر کریں۔

۸۔ آگے کا مضمون ـ آیات ۶۵ - ۸۸

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا ہے کہ میں ایک منذر ہوں اور ایک ہولناک دن سے لوگوں کو آگاہ کر رہا ہوں۔ جب وہ دن آ جائے گا تو اللہ واحد کے سوا کوئی دوسرا کام آنے والا نہیں بنے گا۔ میرا کام انذار ہے وہ میں نے کر دیا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں ایمان اتار دینا میری ذمہ داری نہیں ہے۔ جو لوگ غرور اور استکبار کے سبب سے مجھ سے جھگڑ رہے ہیں وہ یاد رکھیں کہ یہ روش انبیاء اور صالحین کی روش نہیں ہے بلکہ ابلیس اور اس کے پیروؤں کی روش ہے اور وہ اسی انجام سے دوچار ہوں گے جس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے روزِ اول سے کر رکھا ہے ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۶۵﴾ آیات ۶۵-۸۸
رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿۶۶﴾ قُلْ هُوَ نَبَؤٌا
عَظِيْمٌ ﴿۶۷﴾ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ﴿۶۸﴾ مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِۢالْمَلَاِ

الْأَعْلَىٰ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴿٦٩﴾ إِن يُوحَىٰ إِلَيَّ إِلَّا أَنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٧٠﴾
إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن طِينٍ ﴿٧١﴾ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَ
نَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ﴿٧٢﴾ فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ
أَجْمَعُونَ ﴿٧٣﴾ إِلَّا إِبْلِيسَ اسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ﴿٧٤﴾ قَالَ يَا إِبْلِيسُ
مَا مَنَعَكَ أَن تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ أَسْتَكْبَرْتَ أَمْ كُنتَ مِنَ
الْعَالِينَ ﴿٧٥﴾ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن
طِينٍ ﴿٧٦﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ﴿٧٧﴾ وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِي إِلَىٰ
يَوْمِ الدِّينِ ﴿٧٨﴾ قَالَ رَبِّ فَأَنظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿٧٩﴾ قَالَ فَإِنَّكَ
مِنَ الْمُنظَرِينَ ﴿٨٠﴾ إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ﴿٨١﴾ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ
أَجْمَعِينَ ﴿٨٢﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴿٨٣﴾ قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ
أَقُولُ ﴿٨٤﴾ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكَ وَمِمَّن تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٨٥﴾
قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ ﴿٨٦﴾ إِنْ
هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ ﴿٨٧﴾ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ ﴿٨٨﴾ ع ٥ ٢٤ ١٤

ترجمہ آیات ٦٥-٨٨

کہہ دو کہ میں تو بس ایک آگاہ کر دینے والا ہوں اور اللہ واحد و قہار کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا خداوند ہے، غالب اور بخشنے والا۔ کہہ دو کہ وہ ایک عظیم خبر ہے، تم اس سے اعراض کیے ہوئے ہو! ٦٥-٦٨

مجھے عالمِ بالا کی باتوں کی کچھ خبر نہ تھی جب کہ وہ جھگڑ رہے ہوں گے۔ یہ تو بس اس وجہ سے مجھے وحی کی جاتی ہے کہ میں ایک نذیر مبین ہوں۔ ٦٩-٧٠

اس وقت کو یاد کرو جب کہ تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں تو جب میں اس کو درست کرلوں اور اس میں اپنی رُوح پھونک لُوں تو اس کے آگے سجدے میں گر جائیو۔ تو تمام فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا بجز ابلیس کے۔ اس نے گھمنڈ کیا اور انکار کرنے والوں میں سے بن گیا۔ پوچھا، اے ابلیس، اس چیز کو سجدہ کرنے سے تجھے کیا چیز مانع ہوئی جو میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کی؟ یہ تو نے تکبّر کیا یا تو کوئی برتر ہستی ہے! اس نے جواب دیا، میں اس سے برتر ہوں۔ حکم ہوا تو یہاں سے نکل کیونکہ تو راندہ درگاہ ہوا۔ اور تجھ پر میری لعنت ہے جزا کے دن تک۔ اس نے کہا، اے میرے رب! مجھے مہلت دے اس دن تک کے لیے جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے۔ ارشاد ہوا، تجھ کو مہلت دی گئی وقت معیّن تک کے لیے۔ اس نے کہا، تیری عظمت کی قسم! میں ان سب کو گمراہ کر کے رہوں گا، بجز تیرے ان بندوں کے جن کو تو نے خاص کر لیا ہو۔ ارشاد ہوا پس حق یہ ہے اور میں حق ہی کہتا ہوں کہ میں تجھ سے اور ان تمام لوگوں سے، جو ان میں سے تیری پیروی کریں گے، جہنّم کو بھر دوں گا۔ ۷۱-۸۵

کہہ دو، نہ میں اس پر تم سے کسی عوض کا طالب ہوں اور نہ میں کوئی بناوٹ کرنے والوں میں سے ہوں۔ یہ تو بس دنیا والوں کے لیے ایک یاددہانی ہے اور تم جلد اس کی دی ہوئی خبر کو جان لوگے۔ ۸۶-۸۸

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا مُنۡذِرٌ ٭ۖ وَّمَا مِنۡ اِلٰـهٍ اِلَّا اللّٰهُ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ (۶۵)

منکروں کو انذار

یعنی تم ان کو آگاہ کر دو کہ میں تو آنے والے وقت سے تم کو ایک ہوشیار کرنے والا ہوں۔ اس سے زیادہ میری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر تم اپنی ضد پر اڑے رہ گئے تو اس کا انجام خود دیکھو گے۔ اگر تم دوسرے

دیویوں دیوتاؤں کی شفاعت کے بل پر اس دن سے بے پروا ہو تو کان کھول کر سن لو کہ ایک خدائے قہار کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے۔ لفظ 'قہار' کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ اس کے معنی ہیں سب کو اپنے کنٹرول میں رکھنے والا۔ یعنی اس نے اپنی پوری خدائی اپنے کنٹرول میں رکھی ہے وہ کوئی بے بس ہستی نہیں ہے کہ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے تمہارے دیوتاؤں کا محتاج ہو۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ (۶۶)

خدا کے ہاں سفارشوں کی کوئی گنجائش نہیں

یہ صفت 'قہار' کی وضاحت ہے کہ وہی آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کا مالک ہے اور وہ عزیز و غفار بھی ہے۔ 'عزیز' یعنی ہر چیز پر غالب اور مقتدر، مجال نہیں کہ کوئی اس کی گرفت سے باہر نکل سکے۔ ساتھ ہی وہ غفار بھی ہے۔ اس وجہ سے جو اس کی رحمت و مغفرت کے حقدار ہوں گے ان کو بڑا بخشنے والا بھی ہے۔ اس کی طرف سے کسی ظلم یا ناانصافی کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ تمہارے مفروضہ سفارشیوں کی ضرورت پیش آئے۔

قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِیْمٌ ۝ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ (۶۷-۶۸)

یعنی ان کو آگاہ کر دو کہ جس چیز سے میں تمہیں ڈرا رہا ہوں وہ کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ بڑا ہی اہم حادثہ ہے لیکن تم اس سے بے پروا ہو اور میرے انذار کا مذاق اڑا رہے ہو۔

مَا كَانَ لِیَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰۤى اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ ۝ اِنْ یُّوْحٰۤى اِلَیَّ اِلَّاۤ اَنَّمَاۤ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۶۹-۷۰)

یعنی اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ میں یوں ہی تم پر دھونس جمانے کے لیے ایک نذیر مبین بن بیٹھا ہوں اور تمہیں مرعوب کرنے کے لیے اہل دوزخ کی باہمی تو تکار کا افسانہ سنا رہا ہوں۔ بھلا عالم بالا کی ان باتوں کی مجھے کیا خبر ہو سکتی تھی؟ یہ تو اللہ تعالیٰ اپنی وحی کے ذریعہ سے مجھے اس لیے آگاہ فرما رہا ہے کہ میں ایک کھلے ہوئے ڈرانے والے کی طرح اس پیش آنے والے دن کی ہولناکی سے آگاہ کر دوں، ورنہ میں کوئی غیب دان نہیں ہوں، میں تو بس ایک نذیر مبین ہوں۔ 'نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ' کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مستقبل کے پردوں میں چھپے ہوئے ان احوال سے مجھے اس لیے آگاہ فرمایا ہے کہ میں تمہیں اس طرح ان سے ڈراؤں کہ گویا وہ میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ۝ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ (۷۱-۷۴)

استکبار کا شجرۂ نسب

یہ حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا وہ ماجرا بیان ہو رہا ہے جو پیچھے متعدد سورتوں میں جستہ جستہ بیان ہوا ہے اور ہم اس کے تمام پہلوؤں پر مفصل بحث کر چکے ہیں۔ خاص طور پر سورہ بقرہ کی تفسیر میں اس کی

اچھی طرح وضاحت ہو چکی ہے۔ یہاں اس ماجرے کا حوالہ اس استکبار کا شجرۂ نسب بیان کرنے کے لیے آیا ہے جس کا ذکر اس سورہ کی ابتدا میں 'بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ عِزَّۃٍ وَّشِقَاقٍ' کے الفاظ سے ہوا ہے اور جس پر اس پوری سورہ میں ضرب لگائی گئی ہے۔ گویا قریش کو اس آئینہ میں دکھایا گیا ہے کہ وہ جس گھمنڈ اور استکبار میں مبتلا ہو کر قرآن کی دعوت کو جھٹلا رہے ہیں یہ صالحین کی نہیں بلکہ ابلیس کی وراثت ہے۔ اسی میں مبتلا ہو کر اس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا جس کی پاداش میں وہ ملعون ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اسی کی سنت زندہ کرنا چاہتے ہیں تو اس انجام کے لیے بھی تیار رہیں جو ابلیس اور اس کی پیروی کرنے والوں کا ہو گا۔

قَالَ یٰۤاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَکَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ ؕ اَسْتَکْبَرْتَ اَمْ کُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ (۷۵)

انسان قدرت کا ایک شاہکار ہے

ابلیس کے سجدہ نہ کرنے پر اللہ تعالیٰ نے اس سے باندازِ عتاب سوال فرمایا کہ جس چیز کو میں نے خاص اپنے ہاتھ سے پیدا کیا آخر اس کو سجدہ کرنے سے تجھے کیا چیز مانع ہوئی، کیا یہ محض تیرا غرور ہے یا تو کوئی برتر مخلوق ہے! 'خَلَقْتُ بِیَدَیَّ' سے اس خاص اہتمام کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے لیے فرمایا۔ انسان اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے قدرت کا ایک شاہکار ہے۔ اگر یہ اپنی صلاحیتیں صحیح طور پر استعمال کرے تو جنوں کو مسخر کر لینا تو معمولی بات ہے، یہ فرشتوں سے بھی بازی لے جاتا ہے۔ تمام جہان اس کے لیے مسخر ہے لیکن وہ اپنے رب کے سوا کسی کا بھی محکوم نہیں بنایا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ اس اہتمام و عنایت کے ساتھ پیدا کی ہوئی مخلوق کو، جب کہ خود خدا نے اس کے سجدہ کا حکم دیا، آخر کس بنیاد پر تو نے سجدہ کرنے سے انکار کیا؟ اعتبار تو صفات و صلاحیتوں کا ہے نہ کہ مٹی اور آگ کا، اگر قدرت کے دستِ تصرف نے مٹی کے ایک لوندے ہی سے اپنا ایک شاہکار تیار کر دیا تو کیا اس بنیاد پر اس کے حسن و کمال کا انکار کیا جائے گا کہ وہ مٹی سے تیار ہوا ہے! فرمایا کہ تیری یہ حرکت محض اندھے بہرے غرور کا نتیجہ ہے یا تو اپنے زعم میں کوئی برتر ہستی ہے!

قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ ؕ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ (۷۶)

فضیلت کی بنیاد نسب پر رکھنا شیطان کی ایجادات میں سے ہے

ابلیس نے اس کا جواب دیا کہ میں اس سے برتر ہوں اور اس کی دلیل یہ دی کہ مجھ کو تو نے آگ سے پیدا کیا اور اس کو مٹی سے۔ یعنی اس نے اپنی برتری کا دعویٰ کیا اور اس کے ثبوت میں اس نے یہ چیز پیش کی کہ اس کی خلقت ایک برتر عنصر سے ہوئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اس نے فضیلت کی بنیاد صفات پر نہیں بلکہ صرف نسب اور خاندان پر رکھی۔ یہ وہی منطق ہے جو قریش کے لیڈر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے غریب ساتھیوں کے مقابل میں پیش کرتے تھے، جس کا ذکر اس سورہ میں پیچھے گزر چکا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو کوئی کتاب اتارنی ہی ہوتی تو ہم میں سے کسی پر اتارتا نہ ان کے جیسے بے مایہ آدمی پر جن کے ساتھی انہی جیسے نادار اور غریب لوگ ہیں۔

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ۝ وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِي إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ (۷۷-۷۸)

شیطان کا چیلنج اور اس کا جواب

'مِنْهَا' میں ضمیر کا مرجع جنت ہے اس لیے کہ یہ ماجرا جیسا کہ دوسرے مقامات میں وضاحت ہے، جنت ہی میں پیش آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سرکشی کے بعد اس کو ملعون قرار دے کر جنت سے نکل جانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ میری یہ لعنت تیرے اوپر قیامت کے دن تک کے لیے ہے۔ اس دن تو اپنے اس جرم کی سزا بھگتے گا۔

قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۝ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ۝ إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ (۷۹-۸۱)

اللہ تعالیٰ کی اس لعنت سے ابلیس نے گمان کیا کہ شاید اس کی مہلتِ عمل ختم کی جا رہی ہے اور اس کو انسان کے خلاف زور آزمائی کا موقع اب نہیں دیا جائے گا اس وجہ سے اس نے درخواست کی کہ اس کو اس دن تک کے لیے مہلت دی جائے جس دن لوگ اپنے اعمال کے حساب کے لیے اٹھائے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ مہلت دے دی۔

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ (۸۲-۸۳)

جب اس کو یہ مہلت مل گئی تو اس نے بڑے طنطنہ کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کی عزت و عظمت کی قسم کھا کر، کہا کہ اب میں ان سب کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا اور ان میں سے بجز اُن کے جن کو تو نے اپنی بندگی کے لیے خاص کر لیا ہو، سب میرے فتراک ضلالت کے نخچیر ہو کے رہیں گے۔ یعنی میں یہ ثابت کر دوں گا کہ اس انسان کو تو نے جس عزت و شرف کا اہل سمجھا ہے یہ ہرگز اس کا اہل نہیں ہے اور میں اس کو سجدہ نہ کرنے میں بالکل بجانبِ حق تھا ہوں۔

قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ أَقُولُ ۝ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ (۸۴-۸۵)

شیطان نے بڑے طنطنہ سے چیلنج کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب بھی پورے جلال اور کامل بے نیازی سے دیا۔ فرمایا کہ اگر تو سب کو گمراہ کر کے چھوڑے گا تو میری بھی یہ حق بات سن لے اور میں ہمیشہ حق ہی کہتا ہوں کہ میں بھی تجھ سے اور ان لوگوں سے جہنم کو بھر دوں گا جو تیری پیروی کریں گے۔

یہ ماجرا قریش کے لیڈروں اور آنکھیں بند کر کے ان کی پیروی کرنے والوں کو سنایا گیا ہے کہ وہ بھی اگر دیدۂ بینا اور گوشِ شنوا رکھتے ہیں تو اس حکایت میں اپنا حشر دیکھ اور سن لیں۔

قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ۝ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ (۸۶-۸۸)

تنبیہ باندازِ موعظت

یہ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا ہے کہ میں یہ قرآن جو تم کو سنا رہا ہوں تو اس پر تم سے کسی صلہ کا طالب نہیں ہوں کہ تم نے اس کی قدر نہ کی تو میں صلہ سے محروم رہ جاؤں گا میں

نے یہ بارِگراں خود اپنی خواہش سے نہیں اٹھایا ہے بلکہ یہ خدا کی ڈالی ہوئی ایک ذمہ داری ہے اس لیے اس کا اجر بھی اسی کے پاس ہے اور اس کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں بھی وہی میری مدد اور رہنمائی بھی فرمائے گا۔ اگر تم اس کو رد کرو گے تو یاد رکھو کہ یہ ربّ العالمین کی طرف سے دنیا والوں کے لیے ایک عظیم یاددہانی ہے اور یہ جس بات کی خبر دے رہا ہے وہ زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا کہ تمہارے سامنے ظاہر ہو جائے گی۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر توفیقِ ایزدی اتمام کو پہنچی۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

رحمان آباد

۱۲ر مئی ۱۹۷۵ء

تدبرِ قرآن

۳۹

الزّمر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ —— سورۂ صٓ —— کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس مضمون پر سابق سورہ ختم ہوئی ہے اسی مضمون سے اس کا آغاز ہوا ہے۔ سورۂ صٓ کے آخر میں فرمایا ہے کہ یہ قرآن دنیا والوں کے لیے ایک عظیم یاددہانی ہے، لوگوں کو یاد دلا رہا ہے کہ آخرت شدنی ہے اور سب کو ایک ہی رب حقیقی کے آگے پیش ہونا ہے تو جو لوگ آج اس کو جھٹلا رہے ہیں وہ بہت جلد اس کی صداقت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اب اس سورہ کی تلاوت کیجیے تو اس کا آغاز بھی اسی مضمون سے ہوتا ہے کہ خدائے عزیز و حکیم نے یہ کتاب نہایت اہتمام سے اس لیے اتاری ہے کہ لوگوں نے اللہ کی توحید کے بارے میں جو اختلافات پیدا کر رکھے ہیں ان کا فیصلہ کر دے تاکہ حق واضح ہو جائے اور جو لوگ اپنے فرضی دیویوں دیوتاؤں کے بل پر آخرت سے نچنت بیٹھے ہیں وہ چاہیں تو وقت آنے سے پہلے اپنی عاقبت کی فکر کر لیں۔ اسی پہلو سے اس میں توحید کے دلائل بھی بیان ہوئے ہیں، شرک اور شرکاء کی تردید بھی فرمائی گئی ہے اور قیامت کے دن مشرکین کا جو حشر ہو گا اس کی تصویر بھی کھینچی گئی ہے۔ سورہ کی بنیاد توحید پر ہے اور اسی تعلق سے اس میں قیامت کا بھی بیان ہوا ہے۔ یہ سورہ اس گروپ کی ان سورتوں میں سے ہے جو کشمکشِ حق و باطل کے اس دور میں نازل ہوئی ہیں جب ہجرت کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ چنانچہ بعد کی سورتوں میں یہ مضمون بالتدریج واضح ہوتا گیا ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۴) خدائے عزیز و حکیم نے یہ کتاب توحید و شرک کے قضیہ کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک قولِ فیصل کی حیثیت سے اتاری ہے تو لوگ اللہ واحد ہی کی عبادت و اطاعت کریں۔ عبادت و اطاعت کا حقیقی سزاوار وہی ہے۔ جو لوگ دوسرے معبودوں کو خدا کے تقرب کا ذریعہ بنائے بیٹھے ہیں اگر وہ اس کتاب پر ایمان نہیں لا رہے ہیں تو اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ فرمائے گا اور وہ یاد رکھیں کہ اللہ جھوٹوں اور ناشکروں کو بامراد نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے ارفع ہے کہ وہ اپنے لیے بیٹے بیٹیاں بنائے۔ وہ بالکل یکتا اور ساری کائنات کو کنٹرول کرنے کے لیے کافی ہے۔

(۵-۸) یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے غایت اور حکمت کے ساتھ پیدا کی ہے۔ رات اور دن کی آمد و شد، سورج اور چاند کی گردش اسی کے حکم سے ہے۔ اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اسی نے اس کی پرورش کا سامان کیا ہے۔ وہی خالق وہی رب اور وہی اپنی تمام کائنات کا علم رکھنے والا اور اس کا مالک ہے تو لوگ اس کو چھوڑ کر کہاں بھٹکے جا رہے ہیں! لوگ یاد رکھیں کہ اللہ لوگوں کی بندگی اور شکر گزاری کا محتاج نہیں ہے بلکہ لوگ ہی اس کے محتاج ہیں۔ سب کی واپسی خدا ہی کی طرف ہونی ہے اور اس دن کوئی کسی کا بوجھ اٹھانے والا نہیں بنے گا۔ خدا سب کے بھیدوں سے خود واقف ہے اور وہ سب کا کچا چٹھا ان کے سامنے رکھ دے گا۔ لوگوں کو جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو خدا کو پکارتے ہیں لیکن جب وہ مصیبت دور کر دیتا ہے تو اس کو اس طرح نظر انداز کر دیتے ہیں گویا کبھی اس سے کوئی واسطہ تھا ہی نہیں۔

(۹-۲۱) اللہ کے جو بندے توحید پر ایمان لانے کے جرم میں اپنی قوم کے اشرار کے ہاتھوں ظلم و ستم کا ہدف بنے ہوئے تھے ان کو فوز و فلاح کی بشارت اور یہ پیغام کہ اپنے ایمان پر جمے رہو۔ اگر یہ سرزمین تمھارے اوپر تنگ کر دی گئی تو اللہ کی زمین تنگ نہیں ہے۔ اپنی راہ میں ثابت قدم رہنے والوں کو اللہ بے حساب اجر دیتا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے شرک اور مشرکین سے برادت کا اعلان۔ مشرکین کو عذاب کی وعید اور توحید پر قائم رہنے والوں کو کامیابی کی بشارت۔ آخر میں ان لوگوں کو تنبیہ جو اپنی دنیوی زندگی کے غرور میں قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلا رہے تھے۔

(۲۲-۳۵) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی کہ اس قرآن کی دعوت پر وہی لوگ ایمان لائیں گے جن کی فطرت کا نور زندہ ہے۔ جن کے دل سخت ہو چکے ہیں۔ وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔ وہ اسی انجام سے دوچار ہوں گے جس سے رسولوں کی تکذیب کرنے والی قومیں دوچار ہوئیں۔ قرآن نے ہر پہلو سے توحید اور شرک کی حقیقت نہایت واضح طور پر بیان کر دی ہے۔ جو لوگ اب بھی اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

(۳۶-۵۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان دہانی کہ اگر یہ لوگ تم کو اپنے معبودوں سے ڈرا رہے ہیں تو ان کو بتا دو کہ میری حفاظت کے لیے اللہ کافی ہے وہ جس رحمت سے مجھے بہرہ مند کرنا چاہے گا کوئی مجھے اس سے محروم نہیں کر سکتا اور اگر وہ کوئی ضرر پہنچانا چاہے گا تو کوئی دوسرا اس سے مجھے بچا نہیں سکتا۔ پس تم اپنی جگہ کام کرو، میں اپنی جگہ کام کرتا ہوں، فیصلہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

اس امر کی وضاحت کہ زندگی اور موت تمام تر اللہ ہی کے قبضہ میں ہے تو جو لوگ باطل شفاعت کی امید پر جی رہے ہیں انھیں بتا دو کہ شفاعت اللہ کے اختیار میں ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ ان لوگوں کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو، اس کے لیے دعا کی تلقین۔

ان کی تدبیراں کے کچھ کام نہ آسکی۔ یہی حشر ان کا بھی ہونا ہے۔ رزق و فضل سب اللہ کا عطیہ ہے اس وجہ سے ہر ایک پر اللہ ہی کا شکر واجب اور یہی توحید کا تقاضا ہے۔

(۵۳-۶۱) لوگوں کو یہ تذکیر کہ خدا سے مایوس ہو کر دوسرے شرکاء و شفعاء کا دامن پکڑنا جائز نہیں ہے بلکہ ہر حالت میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے، وہ بڑا ہی غفور رحیم ہے۔ پس خدا کی پکڑ سے پہلے لوگوں کو چاہیے کہ وہ اللہ کی طرف متوجہ ہو جائیں اور اس بہترین کتاب پر ایمان لائیں جو اللہ نے اپنے فضل سے ان کی ہدایت کے لیے اتاری ہے ورنہ ایک دن وہ ایمان کی حسرت کریں گے اور اپنی محرومی پر اپنے سر پیٹیں گے لیکن وقت گزر جانے کے بعد ان کے لیے یہ چیز کچھ نافع نہیں ہو گی۔

(۶۲-۷۵) خاتمۂ سورہ، جس میں پہلے یہ وضاحت فرمائی گئی ہے کہ عبادت کا حقدار صرف اللہ تعالیٰ ہے وہی ہر چیز کا خالق ہے اور اسی کے اختیار میں آسمانوں اور زمین کی کنجیاں ہیں۔ اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے مشرکین کو خطاب کر کے یہ اعلان فرمایا ہے کہ تم لوگ مجھے غیر اللہ کی عبادت کا حکم دیتے ہو حالانکہ میری طرف اور مجھ سے پہلے تمام نبیوں کی طرف یہی وحی آئی ہے کہ جو اللہ کا شریک ٹھہرائے گا اس کے تمام عمل حبط ہو جائیں گے۔ اس کے بعد مشرکین کو ملامت کہ ان لوگوں نے خدا کی شان بالکل نہیں پہچانی۔ یہ فرضی معبودوں کی شفاعت کے بل پر جی رہے ہیں حالانکہ جس وقت صُور پھونکا جائے گا سب بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے اور پھر جب دوبارہ پھونکا جائے گا تو سب اٹھ کھڑے ہوں گے، زمین خدا کے نور سے چمک اٹھے گی، دفتر کھولا جائے گا، نبیوں اور گواہوں کی طلبی ہو گی اور لوگوں کے درمیان بالکل انصاف کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد اہلِ دوزخ اور اہلِ جنت کے حالات کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔

سُوْرَةُ الزُّمَرِ (٣٩)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ٧٥

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿١﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ آيات ١-٨
الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴿٢﴾ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ
الْخَالِصُ ؕ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا وقف لازم
لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ
يَخْتَلِفُوْنَ ؕ۬ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴿٣﴾ لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ
اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ
الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٤﴾ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى
النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ
لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿٥﴾ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ
ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ؕ
يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿٦﴾ اِنْ

تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنكُمْ ۖ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۖ وَإِن تَشْكُرُوا
يَرْضَهُ لَكُمْ ۗ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرٰى ۗ ثُمَّ إِلٰى رَبِّكُم مَّرْجِعُكُمْ
فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٧﴾ وَ
إِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً
مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُو إِلَيْهِ مِن قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ أَندَادًا لِّيُضِلَّ
عَن سَبِيلِهِ ۚ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيلًا ۖ إِنَّكَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ ﴿٨﴾

ترجمہ آیات ۱-۸

یہ کتاب نہایت اہتمام سے خدائے عزیز و حکیم کی طرف سے اتاری گئی ہے۔ بیشک ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف قولِ فیصل کے ساتھ اتاری ہے تو تم اللہ ہی کی بندگی کرو، اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ۔ یاد رکھو کہ اطاعتِ خالص کا سزاوار اللہ ہی ہے۔ اور جن لوگوں نے اس کے سوا دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا سے قریب تر کر دیں، اللہ ان کے درمیان اس بات کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ اللہ ان لوگوں کو بامراد نہیں کرے گا جو جھوٹے اور ناشکرے ہیں۔ ۱-۳

اگر اللہ اولاد ہی بنانے کا ارادہ کرتا تو وہ چھانٹ لیتا ان چیزوں میں سے جو وہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا۔ وہ پاک اور ارفع ہے۔ وہ اللہ واحد ہے سب پر قابو رکھنے والا۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو غایت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ وہ رات کو دن پر ڈھانکتا ہے اور دن کو رات پر اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ ہر ایک وقتِ مقرر کی پابندی کے ساتھ گردش کر رہا ہے سن رکھو کہ غالب اور بخشنے والا وہی ہے۔ ۵

اسی نے پیدا کیا تم کو ایک ہی جان سے، پھر پیدا کیا اسی کی جنس سے اس کا جوڑا اور تمہارے لیے (نر و مادہ) چوپایوں کی آٹھ قسمیں اتاریں۔ وہ تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں پیدا کرتا ہے، ایک خلقت کے بعد دوسری خلقت میں، تین تاریکیوں کے اندر۔ وہی اللہ تمہارا رب ہے۔ اسی کی بادشاہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو تم کہاں بھٹکا دیے جاتے ہو! ۶

اگر تم ناشکری کرو گے تو خدا تم سے بے نیاز ہے اور وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری کا رویہ پسند نہیں کرتا اور اگر تم اس کے شکر گزار رہو گے تو اس کو پسند کرے گا۔ اور کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ نہیں اٹھائے گی۔ پھر تمہارے رب ہی کی طرف تمہاری واپسی ہے تو وہ تمہیں ان کاموں سے آگاہ کرے گا جو تم کرتے رہے ہو۔ وہ سینوں کے بھیدوں سے بھی باخبر ہے۔ ۷

اور جب انسان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کو پکارتا ہے، اس کی طرف متوجہ ہو کر، پھر جب وہ اپنی طرف سے اس کو فضل بخش دیتا ہے تو وہ اس چیز کو بھول جاتا ہے جس کے لیے پہلے پکارتا رہا تھا اور اللہ کے شریک ٹھہرانے لگتا ہے کہ اس کی راہ سے لوگوں کو گمراہ کرے۔ کہہ دو، اپنے کفر کے ساتھ کچھ دنوں بہرہ مند ہو لو، تم دوزخ والوں میں سے بننے والے ہو۔ ۸

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

تَنْزِيلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (۱)

آنحضرت صلعم کے لیے تسلی اور منکرین کے لیے تہدید

لفظ 'تَنْزِيْلٌ' کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں کہ اس کے معنی صرف اتارنے کے نہیں بلکہ اہتمام کے ساتھ اتارنے کے ہیں۔ یہ تمہیدی آیت اپنے اندر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی رکھتی ہے اور قرآن کے مکذبین کے لیے تہدید و وعید بھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی کا پہلو یہ ہے کہ تم نے یہ کتاب نہ خود تصنیف کی ہے نہ خدا سے مانگ کے اپنے اوپر اتروائی ہے بلکہ تمھارے رب نے خود تمھارے اوپر نہایت اہتمام کے ساتھ درجہ بدرجہ اتاری ہے اور اتار رہا ہے تو تم اطمینان رکھو کہ وہی اس کی صداقتیں ظاہر کرے گا اور وہی اس کے لیے راہ ہموار کرے گا۔ جس خدا نے یہ کتاب اتاری ہے وہ کوئی بے بس ہستی نہیں بلکہ 'عَزِیْزٌ' یعنی غالب و مقتدر ہے، وہ جو چاہے کر سکتا ہے، کوئی اس کے ارادے میں مزاحم نہیں ہو سکتا۔ لیکن 'عزیز' ہونے کے ساتھ وہ حکیم بھی ہے۔ اس وجہ سے اگر اس راہ میں کچھ مزاحمتیں پیش آ رہی ہیں یا آئندہ آئیں تو ان کو خدا کی حکمت پر محمول کرو۔ کوئی بات خدا کے حکم کے بغیر نہیں ہوتی اور اس کا ہر کام حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔

اس کے منکرین کے لیے تہدید کا پہلو یہ ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ، نہایت اہتمام و تدریج کے ساتھ لوگوں کی ہدایت کے لیے اتار رہا ہے۔ اس کا حق یہ ہے کہ لوگ اس نعمت کی قدر اور اس سے ہدایت و روشنی حاصل کریں۔ اگر انھوں نے اس کے برعکس اس کی تکذیب کی راہ اختیار کی تو یاد رکھیں کہ یہ کسی سائل کی درخواست نہیں بلکہ خدائے عزیز و حکیم کا فرمان واجب الاذعان ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ اگر اس کے باوجود وہ تکذیب کرنے والوں کو ڈھیل دے رہا ہے تو یہ محض اپنی حکمت کے تقاضے کے تحت دے رہا ہے۔

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينَ ۝ أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ ۚ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِي مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ (۲-۳)

'حَقٌّ' کے معنی یہاں قولِ فیصل کے اور 'دین' کے معنی اطاعت کے ہیں۔ ان الفاظ کے مختلف معانی کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے۔

توحید اور شرک کے باب میں قولِ فیصل

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ ہم نے تمھاری طرف یہ کتاب قولِ فیصل کے ساتھ اتاری ہے۔ اللہ کی توحید کے بارے میں مبتدعین و مشرکین نے جو اختلافات پیدا کر دیے تھے اس کتاب نے ان کا فیصلہ کر دیا تو تم اللہ ہی کی بندگی اس کی خالص اطاعت کے ساتھ کرو۔ اطاعت خالص کا سزاوار اللہ ہی ہے۔ وہی سب کا خالق اور پروردگار ہے تو وہی سب کی عبادت کا بھی حقدار ہے اور جو عبادت کا حق دار ہے وہی اطاعت کا بھی حق دار ہے۔ یہ بالکل بے تکی بات ہے کہ عبادت کا حق دار کوئی ہو، اطاعت کا حقدار کوئی اور بن جائے اور جس طرح عبادت کا خالص ہونا ضروری ہے اسی طرح اطاعت بھی بے آمیز ہونی ضروری ہے۔ اللہ کے سوا کسی دوسرے کی اطاعت اللہ کی اطاعت

کے خلاف جائز نہیں ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے یہ بات فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کتاب کے نازل ہو جانے کے بعد تمہاری راہ معین ہو گئی۔ تم اسی راہ پر چلو، اگر دوسرے تمہارا ساتھ دیتے ہیں تو فبہا' نہیں دیتے تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ تمہارے اوپر ان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

'وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا ...... الاٰیۃ' یعنی یہ لوگ جو اللہ کے سوا دوسرے کارساز بناتے بیٹھے ہیں اور ان کے حق میں انھوں نے یہ فلسفہ ایجاد کیا ہے کہ ان کو وہ خدا سمجھ کر نہیں بلکہ خدا کے تقرب کا ذریعہ سمجھ کر پوج رہے ہیں، اگر اس کتاب کے فیصلہ کو وہ نہیں مان رہے ہیں تو اللہ ان کے اختلاف کا فیصلہ قیامت کے دن کرے گا۔

'اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ'۔ 'ھَدٰی یَھْدِیْ' کسی مقصد میں بامراد کرنے کے مفہوم کے لیے بھی قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

قیامت کے دن ان لوگوں کا جو فیصلہ ہو گا اس کے متعلق یہ اصولی حقیقت واضح فرما دی کہ جو لوگ جھوٹے اور ناشکرے ہیں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو بامراد نہیں کرے گا۔ جھوٹے سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے خدا پر یہ جھوٹ باندھا کہ اس نے فلاں اور فلاں کو اپنا شریک بنایا ہے درآنحالیکہ خدا نے ان کے باب میں کوئی دلیل یا شہادت نہیں اتاری اور ناشکرے سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو نعمتیں تو سب خدا نے بخشیں لیکن انھوں نے گن دوسروں کے گائے۔ یہ دونوں صفتیں مشرکین کی ہیں اور یہ دونوں بیک وقت ہر مشرک میں لازماً پائی جاتی ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ اس گھمنڈ میں قرآن اور پیغمبر کو جھٹلا رہے ہیں کہ قیامت ہوئی تو وہ اپنے معبودوں کی بدولت خدا کے مقرب بن جائیں گے حالانکہ ایسے جھوٹوں اور ناشکروں کی کوئی امید بھی خدا کے ہاں بر آنے والی نہیں ہے۔

لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۴)

مشرکین کے عقیدے پر تعریض

یہ مشرکین عرب کے عقیدے پر تعریض ہے کہ انھوں نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مان کر ان کو معبود بنا رکھا ہے اور ان کو خدا کے تقرب کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کم عقلوں نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ اگر خدا اپنے لیے اولاد ہی بنانے کا ارادہ کرتا تو وہ بیٹیاں کیوں بناتا، وہ اپنی مخلوقات میں سے جس بہتر سے بہتر چیز کو چاہتا اپنے لیے منتخب کرتا! 'سُبْحٰنَهٗ' وہ ایسی نسبتوں اور ایسی ضرورتوں سے ارفع، منزہ اور بالکل پاک ہے۔ اس کو کسی بیٹے بیٹی یا کسی شریک و مددگار کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بالکل یکہ و تنہا اور ساری پوری کائنات کو اپنے قابو میں رکھنے والا ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَ

سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُسَمًّى ۗ أَلَا هُوَ الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ (۵)

شرک و شفاعت کا عقیدہ اس دنیا کے باحق ہونے کے منافی ہے

اس نے آسمان و زمین بے مقصد و غایت نہیں پیدا کیے ہیں کہ نیکی و بدی اور حق و باطل کا اس میں کوئی امتیاز ہی نہ ہو، جو چاہے، سفارشوں کے بل پر، اپنے لیے اونچے سے اونچے مرتبے خدا کے ہاں محفوظ کرا لے، خواہ اس کے اعمال و عقائد کچھ ہی ہوں۔ اگر ایسا ہو تو یہ دنیا ایک بالکل باطل کارخانہ بن جاتی ہے اور ایک حکیم و عادل خالق کی شان کے بالکل خلاف ہے کہ وہ کوئی باطل کام کرے۔

اللہ تعالیٰ اس دنیا سے بے تعلق نہیں ہے۔

یُکَوِّرُ الَّیْلَ عَلَی النَّھَارِ ...... الآیۃ۔ یعنی کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ خدا دنیا کو پیدا کر کے کسی گوشے میں ایک تماشائی یا نرنکار بن کر بیٹھ رہا ہے بلکہ وہی برابر رات کو دن پر ڈھانکتا اور دن کو رات پر اڑھاتا ہے۔ اسی نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے اور یہ سب اپنے مقررہ نظام الاوقات کے مطابق گردش کر رہے ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ ان کی پابندیٔ اوقات میں منٹ اور سیکنڈ کا بھی فرق پیدا ہو جائے۔

اَلَا ھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ۔ یعنی کان کھول کر اچھی طرح سن لو کہ خدا عزیز بھی ہے اور غفار بھی۔ وہ عزیز ہے اس وجہ سے کوئی اس کے اذن کے بغیر نہ اس کے ہاں رسائی حاصل کر سکتا نہ کسی کے لیے کوئی سفارش کر سکتا اور غفار ہے اس وجہ سے وہ ان لوگوں کو خود بخشنے والا ہے جو اپنے لیے مغفرت کا حق پیدا کر لیں گے۔ ان کو کسی سفارشی کی سفارش کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِنَ الْأَنْعَامِ ثَمَانِيَةَ أَزْوَاجٍ ۚ يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَأَنَّىٰ تُصْرَفُونَ (۶)

اللہ تعالیٰ ہی خالق و رازق ہے تو وہی رب بھی ہے

یہ اسی اوپر والی بات کی مزید وضاحت ہے کہ خدا ہی خالق ہے، اسی نے پرورش کا انتظام فرمایا ہے اور اسی کا علم ہر چیز کو محیط ہے، تو اس کے سوا کوئی دوسرا کس حق کی بنا پر رب بن جائے گا! جو لوگ یہ تمام بدیہی حقائق تسلیم کرتے ہیں آخر ان کی عقل کہاں الٹ جاتی ہے کہ وہ دوسروں کو اس کی بادشاہی میں ساجھی بناتے ہیں!

خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْھَا زَوْجَھَا۔ یعنی خدا ہی نے تم سب کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا، پھر اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا۔ تمام انسان ایک ہی آدم کی نسل سے ہیں اور سب کا خالق خدا ہی ہے، پھر خدا ہی ہے جس نے آدم ہی کی جنس سے اس کے جوڑے —— عورت —— کو وجود بخشا۔ کہ جب سب کا خالق اللہ ہی ہے اور اس حقیقت سے تمھیں بھی انکار نہیں ہے تو خدا کے سوا دوسرے معبودوں کے لیے کہاں سے گنجائش پیدا ہوتی!

وَاَنْزَلَ لَکُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَۃَ اَزْوَاجٍ۔ یعنی جس خدا نے تم کو پیدا کیا اسی نے تمھاری

پرورش کا سامان بھی کیا۔ یہ نہیں ہے کہ تمھیں پیدا کر کے اس نے تمھاری پرورش کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال دی ہو۔ یہ مختلف قسم کے چوپائے جن پر تمھاری معاش و معیشت کا انحصار ہے؛ خدا ہی کے پیدا کیے ہوئے ہیں، کسی اور نے ان کو نہیں پیدا کیا ہے۔

یہاں چوپایوں کے لیے 'اَنْزَلَ لَکُمْ' کے الفاظ اسی طرح استعمال ہوئے ہیں جس طرح 'اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ قرآن میں یہ اسلوب بیان اکثر چیزوں کے لیے استعمال ہوا ہے اور اس سے مقصود لوگوں کو ہر چیز کے اصل منبع کی طرف توجہ دلانا ہے کہ ہر چیز کا نازل کرنے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اسی نے لوہا اتارا تو وہ زمین میں پیدا ہو گیا اور اس سے انسان نے طرح طرح کے اسلحہ ایجاد کر لیے، اسی نے چوپائے اتارے تو وہ انسان کی معاش و معیشت کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے زمین میں پھیل گئے۔ یہی حقیقت بینی انسان کے اندر صحیح جذبۂ شکر گزاری پیدا کرتی ہے ورنہ انسان کی نظر ہر نعمت کے سبب قریب کے ساتھ اٹک کے رہ جاتی ہے اور وہ اپنے حقیقی پروردگار کو بھول جاتا ہے۔

'ثَمٰنِیَۃَ اَزْوَاجٍ' لفظ 'زوج' جوڑے کے لیے بھی آتا ہے اور جوڑے کے ایک فرد کے لیے بھی۔ یہاں یہ اسی دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ عرب میں پالتو چوپایوں میں سے چار معروف تھے۔ چھوٹے چوپایوں میں بھیڑ بکری، بڑے چوپایوں میں اونٹ اور گائے۔ لفظ انعام انہی کے لیے بولا جاتا ہے۔ ان کے نر و مادہ دونوں کو ملا کر گنیے تو یہ آٹھ بن جائیں گے۔ عرب میں معاش و معیشت کا انحصار زیادہ تر انہی پر تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کی یاد دہانی کے لیے ان کا خاص طور پر حوالہ دیا۔ اس مضمون کی تفصیل مطلوب ہو تو انعام کی آیات ۱۴۲-۱۴۴ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

'یَخْلُقُکُمْ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ'۔ خلق اور ربوبیت کی یاد دہانی کے بعد یہ اپنی قدرت، کاریگری اور اپنے احاطۂ علم کی طرف توجہ دلائی کہ وہی خدا تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں میں، تین تین تاریکیوں کے اندر، تخلیق کے مختلف اطوار و مراحل سے گزارتا ہے۔ ان مختلف مراحل کی تفصیل سورۂ مومنون میں یوں فرمائی ہے۔

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا	پھر ہم نطفہ کو خون کی پھٹکی کی شکل میں کر دیتے ہیں
الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ	اور خون کی پھٹکی کو گوشت کا لوتھڑا بنا دیتے ہیں،
عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ق	پھر لوتھڑے میں ہڈیاں پیدا کر دیتے ہیں اور ہڈیوں
ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ	پر گوشت چڑھا دیتے ہیں۔ پھر اس کو ایک نئی خلقت
(المؤمنون: ۱۴)	میں کر دیتے ہیں۔

'تین تاریکیوں' سے اشارہ مشیمہ، رحم اور پیٹ کی تہ بہ تہ تاریکیاں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قدرت کا دستِ صنّاع اور مُعلّم یہ صناعی سورج یا بجلی کی روشنی میں نہیں کرتا بلکہ تین تین پردوں کے اندر کرتا ہے۔ یہ اس

بات کی شہادت ہے کہ اس کا علم ہر جلی و خفی کو محیط ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ...... الآیۃ: یعنی جس خدا کے تمہارے اوپر یہ یہ احسانات ہیں وہی تمہارا آقا اور مالک بھی ہے۔ ہر چیز اسی کی ملکیت اور تمام آسمان و زمین میں اسی کی بادشاہی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں، پھر تمہاری عقل کس طرح الٹ جاتی ہے کہ تم سیدھی راہ سے ہٹا کر ایک بالکل غلط سمت میں موڑ دیے جاتے ہو! تُصْرَفُوْنَ مجہول کا صیغہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ان واضح حقائقِ فطرت کے بعد کسی غلط سمت میں بھٹکنے کی گنجائش تو نہیں تھی لیکن تم نے معلوم نہیں کس شیطان کے ہاتھ میں اپنی باگ پکڑا دی ہے جو تمھیں گمراہی کی وادیوں میں گردش کرا رہا ہے۔

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۟ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۷)

اللہ تعالیٰ لوگوں کے کفر و ایمان سے بالکل بے نیاز ہے

لفظ 'کفر' یہاں ناشکری اور کفرانِ نعمت کے مفہوم میں آیا ہے۔ اس کے مقابل میں 'اِنْ تَشْكُرُوْا' ہے جس سے اس مفہوم کی وضاحت ہو رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے پیدا کرنے اور تمہاری پرورش میں تو خدا کے سوا کسی اور کو کوئی دخل ہے نہیں۔ اگر اس کے باوجود تم دوسروں کو خدا کا شریک بنا کر اس کی ناشکری کر رہے ہو تو یاد رکھو کہ تم خدا کا کچھ نہیں بگاڑ رہے ہو۔ خدا تمہارے کفر اور شکر دونوں سے بے نیاز ہے۔ وہ تمہارا محتاج نہیں ہے بلکہ تمہی اس کے محتاج ہو۔ اگر تم اس کے شکرگزار ہو گے تو وہ اس کو پسند فرمائے گا۔ دنیا میں بھی تمہاری نعمتوں میں برکت ہوگی اور آخرت میں بھی اس کا بھرپور صلہ پاؤ گے اور اگر ناشکری کرو گے تو یاد رکھو کہ خدا اپنے بندوں کی طرف سے ناشکری کے رویہ کو پسند نہیں فرماتا تو لازماً اس کا نتیجہ بھی ان کے سامنے آئے گا۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ...... الآیۃ: اور یہ حقیقت بھی یاد رکھو کہ خدا کے ہاں ہر نفس کی ذمہ داری خود اسی کے اوپر ہے۔ کوئی دوسرا اس کی طرف سے جواب دہی کرنے والا نہیں بنے گا۔ اگر تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تمہارے یہ دیوی دیوتا تمہاری وکالت و شفاعت کر کے تم کو خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے تو یہ آرزوئے باطل پوری ہونے والی نہیں ہے۔ سب کی واپسی خدا ہی کی طرف ہونی ہے۔ کوئی اور مولیٰ و مرجع نہیں بنے گا۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے سامنے اس کے اعمال کا پورا دفتر رکھ دے گا۔ وہ لوگوں کے دلوں کے بھیدوں سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔ نہ اس کو کسی کے بارے میں کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہے اور نہ کوئی اس کے آگے یہ کہنے والا بنے گا کہ فلاں کے بارے میں اس کی معلومات میں کچھ ایسی باتیں ہیں جو خدا کے علم میں نہیں ہیں۔

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ

مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا ۖۗ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ (۸)

انسان کی ناشکری پر تعجب اور افسوس

یہ انسان کی اس ناشکری کے رویہ پر تعجب اور افسوس کا اظہار ہے کہ اس کا عجیب حال ہے کہ جب اس کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تب تو وہ بڑے تضرع اور بڑی انابت کے ساتھ خدا سے فریاد کرتا ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت دور کر کے اس کو اپنے فضل سے بہرہ مند کر دیتا ہے تو وہ اپنی مصیبت کو بھول جاتا ہے اور خدا کے بخشے ہوئے فضل کو دوسرے شریکوں کی طرف منسوب کرنے لگتا ہے اور اس طرح خود بھی خدا کی راہ سے برگشتہ ہوتا ہے، دوسروں کو بھی اس سے برگشتہ کرتا ہے۔ یہاں چونکہ کفر کے سرغنوں کا رویہ زیر بحث ہے اس وجہ سے فعل 'لِيُضِلَّ' متعدی استعمال فرمایا کہ وہ لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ اس کے اندر گمراہ ہونے کا مفہوم خود شامل ہے۔

یہی مضمون آگے اسی سورہ میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ۡ	جب انسان کو کوئی مصیبت لاحق ہوتی ہے تب
ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ	تو وہ ہم کو پکارتا ہے پھر جب ہم اس کو اپنی طرف
قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ ؕ	سے کوئی نعمت بخش دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو میرے
(الزمر: ۴۹)	علم و قابلیت کا ثمرہ ہے۔

انسان کی فطرت کے اندر ایک خدا کے سوا کسی اور الٰہ کا کوئی شعور نہیں ہے اس وجہ سے جب اس پر کسی حقیقی افتقار کی حالت طاری ہوتی ہے تو وہ اسی کی طرف متوجہ ہوتا اور اسی سے دعا و فریاد کرتا ہے لیکن جب اس کی مصیبت دور ہو جاتی ہے تو مصیبت کو بھی بھول جاتا ہے اور خدا سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے اور خدا کی بخشی ہوئی نعمت کو یا تو اپنے فرضی دیویوں دیوتاؤں سے منسوب کرتا ہے یا اپنی تدبیر اور اپنی قابلیت و ذہانت کا ثمرہ قرار دیتا ہے اور اس طرح خود شریک خدا بن جاتا ہے۔

'قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا ۖۗ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ' اوپر کی بات اگرچہ عام صیغے سے فرمائی گئی ہے لیکن مقصود مخاطب گروہ کی حالت ہی پر توجہ دلانا تھا اس وجہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی کہ ان سے کہہ دو کہ اپنی اس ناشکری اور اپنے اس کفر کے باوجود اللہ کی نعمتوں سے کچھ دن بہرہ مند ہو لو، بالآخر تو تم جہنم کے ایندھن بننے والے ہی ہو، وہ ساری کسر پوری کر دے گی۔

۲- آگے کا مضمون - آیات ۹ - ۲۰

پہلے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ جن لوگوں نے شرک و شفاعت کا عقیدہ ایجاد کیا ہے انھوں نے اپنے زعم میں خدا کے نزدیک نیک اور بد دونوں کو بالکل یکساں کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ چیز بالبداہت

غلط ہے۔ بصیرت و معرفت رکھنے والے اور اپنی عقلوں کو اپنی خواہشوں کی لونڈی بنا دینے والے دونوں خدا کے ہاں یکساں نہیں ہو سکتے۔

پھر مسلمانوں کو، جو اس دور میں ہر قسم کے مظالم کے ہدف بنے ہوئے تھے، تسلی دی کہ تم اللہ کی توحید پر ثابت قدم رہو۔ اللہ کے ہاں تمہارے لیے بے حساب اجر ہے اور اگر تمہارے وطن کی زمین تم پر تنگ کر دی گئی تو اطمینان رکھو کہ خدا کی زمین تنگ نہیں ہے۔

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے شرک اور شرکاء سے نہایت آشکارا طور پر اعلان برأت کرایا ہے تاکہ کفار پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ جبر و ظلم کے ذریعہ سے وہ اللہ کے بندوں کو شرک کے آگے نہیں جھکا سکتے۔

آخر میں مسلمانوں کو فوز و فلاح کی بشارت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ تمہاری دعوت انہی لوگوں کو اپیل کرے گی جن کے اندر عقل ہے، جو اپنی شامتِ اعمال سے جہنم کے ایندھن بن چکے ہیں ان کو ہدایت کی راہ پر لانا تمہارا کام نہیں ہے ـــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۹-۲۰ أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَقَائِمًا يَحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُو
رَحْمَةَ رَبِّهِ ۗ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ
ع ۱ ۹ ۱۵ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿٩﴾ قُلْ يَا عِبَادِ الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا رَبَّكُمْ ۚ
لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۗ وَأَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةٌ ۗ إِنَّمَا
يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿١٠﴾ قُلْ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ
أَعْبُدَ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ ﴿١١﴾ وَأُمِرْتُ لِأَنْ أَكُونَ أَوَّلَ
الْمُسْلِمِينَ ﴿١٢﴾ قُلْ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٣﴾
قُلِ اللَّهَ أَعْبُدُ مُخْلِصًا لَهُ دِينِي ﴿١٤﴾ فَاعْبُدُوا مَا شِئْتُمْ مِنْ
دُونِهِ ۗ قُلْ إِنَّ الْخَاسِرِينَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ وَأَهْلِيهِمْ يَوْمَ
الْقِيَامَةِ ۗ أَلَا ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ ﴿١٥﴾ لَهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ
مِنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ۚ ذَٰلِكَ يُخَوِّفُ اللَّهُ بِهِ عِبَادَهُ ۚ

يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ﴿١٦﴾ وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا
وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿١٧﴾ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ
الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰۗىِٕكَ
هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿١٨﴾ اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ۭ اَفَاَنْتَ
تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ﴿١٩﴾ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ
فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ڛ وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا
يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ﴿٢٠﴾

ترجمہ آیات ۹ - ۲۰

کیا وہ جو عاجزانہ شب کے اوقات میں اپنے رب کے آگے سجود و قیام میں آخرت سے اندیشہ ناک اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار رہے (اور دوسرے جو ان صفات سے عاری ہیں یکساں ہو جائیں گے؟) پوچھو، کیا علم و بصیرت رکھنے والے اور وہ جو علم و بصیرت نہیں رکھتے دونوں برابر ہوں گے؟ یاددہانی تو اہلِ عقل ہی حاصل کرتے ہیں۔ ۹

کہہ دو کہ اے میرے بندو، جو ایمان لائے ہو تم اپنے رب سے ڈرتے رہو۔ جو لوگ اس دنیا میں نیکی کریں گے ان کے لیے آخرت میں نیک صلہ ہے۔ اور اللہ کی زمین کشادہ ہے۔ جو ثابت قدم رہنے والے ہوں گے، ان کو ان کا صلہ بے حساب پورا کیا جائے گا۔ ۱۰

کہہ دو کہ مجھے تو حکم ملا ہے کہ میں اللہ ہی کی بندگی کروں، اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں سب سے پہلا مسلمان بنوں۔ کہہ دو کہ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ ۱۱ - ۱۳

کہہ دو کہ میں تو اللہ ہی کی بندگی کرتا ہوں، اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ۔ سو تم اس

کے سوا جس کی چاہو بندگی کرو۔ کہہ دو کہ حقیقی خسارے میں پڑنے والے وہی ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو قیامت کے دن خسارے میں ڈالا۔ یاد رکھو کہ کھلا ہوا خسارہ وہی ہے۔ ان کے لیے ان کے اوپر سے بھی آگ کے پردے ہوں گے اور ان کے نیچے سے بھی۔ یہ چیز ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈرا رہا ہے۔ اے میرے بندو، پس مجھ سے ڈرو۔ ۱۴-۱۶

اور جن لوگوں نے طاغوت کی عبادت میں ملوث ہونے سے احتراز کیا اور اللہ کی طرف متوجہ رہے، ان کے لیے خوش خبری ہے تو میرے ان بندوں کو خوش خبری پہنچا دو جو بات کو توجہ سے سنتے اور اس میں سے اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی اور یہی ہیں جو عقل والے ہیں۔ ۱۷-۱۸

کیا جس پر عذاب کا قانون پورا ہو چکا (اور وہ دوزخ میں ہے) تو تم اس کو نجات دینے والے بنو گے جو دوزخ میں ہے۔ البتہ جو اپنے رب سے ڈرے ان کے لیے بالاخانے اور بالاخانوں کے اوپر بھی آراستہ بالاخانے ہوں گے۔ ان کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ یہ اللہ کا حتمی وعدہ ہے۔ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ ۱۹-۲۰

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَقَائِمًا يَحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُو رَحْمَةَ رَبِّهِ ۗ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ (۹)

عربیت کا ایک اسلوب

یہ وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے کہ اس قسم کے سوالیہ جملوں میں کلام کا ایک جزو محذوف ہوتا ہے جو متکلم کے زورِ بیان سے واضح ہو جاتا ہے۔ آگے آیت ۲۲ میں بھی اس کی مثال آ رہی ہے۔ یہ اسلوب متکلم کی شدتِ یقین پر بھی دلیل ہوتا ہے اور اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس سوال کے جواب

یں مخاطب کے لیے کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ مزید براں بات کا ایک حصہ بغیر اظہار کے ظاہر ہو جاتا ہے۔

اس استفہام کو کھولیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ کیا جو شخص پوری نیاز مندی اور فروتنی کے ساتھ شب کے اوقات میں، اپنے رب کے آگے کبھی سجدہ میں ہے کبھی قیام میں، وہ آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہے اور وہ شخص جو اپنے غرور میں مست ہے، نہ اس کو آخرت کا کوئی اندیشہ ہے نہ خدا کی کسی رحمت کی کوئی پروا ہے، دونوں یکساں ہو جائیں گے۔

شفاعتِ باطل کا عقیدہ حق و باطل دونوں کو یکساں کر دیتا ہے

اس سوال سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ یہ دونوں خدا کے نزدیک یکساں نہیں ہو سکتے اور یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے کہ اس سے مخاطب کے لیے بھی انکار کی گنجائش نہیں تھی لیکن اس کے باوجود نادانوں نے شرک و شفاعت کا عقیدہ ایجاد کر کے دونوں کو بالکل یکساں کر دیا تھا۔ اس لیے کہ جب نجات کا انحصار ایمان و عمل صالح کے بجائے دیویوں دیوتاؤں کی سفارش پر ہوا تو نہ خدا کے عدل کا کوئی اندیشہ باقی رہا نہ ایمان و عمل صالح کی کوئی ضرورت رہی۔

آیت کے اسلوب اور اس کے موقع و محل کو سمجھ لینے کے بعد اب اس کے اجزا پر نگاہ ڈالیے۔

'قنوت' کا اصل مفہوم اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع، فروتنی اور نیاز مندی ہے۔ یہ ایک قلبی حالت ہے جس کا بہترین اظہار نماز، بالخصوص شب کی نمازوں سے ہوتا ہے۔ 'اٰنَآءَ الَّیۡلِ' کی قید خاص طور پر اس وجہ سے لگائی ہے کہ شب کی نماز ریا کے شائبہ سے پاک ہوتی ہے اس وجہ سے جو لوگ اس کا اہتمام کرتے ہیں اللہ کے لیے ان کی نیاز مندی شبہ سے بالاتر ہے۔

'سَاجِدًا وَّقَآئِمًا' ان کی نماز کی تصویر ہے کہ کبھی سجدے میں پڑے ہوئے ہیں، کبھی حالتِ قیام میں ہیں۔ اس سے ان کی بے چینی کا اظہار ہو رہا ہے جب دوسرے اپنے نرم بستروں میں پڑے ہوئے غافل سو رہے ہوتے ہیں وہ اپنے رب کی رضا کی طلب میں سجود و قیام میں ہوتے ہیں۔

'یَحۡذَرُ الۡاٰخِرَۃَ وَ یَرۡجُوۡا رَحۡمَۃَ رَبِّہٖ' یہ ان کی نماز کے باطن کا بیان ہے کہ آخرت کے خوف اور اس کی رحمت کی امید نے ان کے اندر یہ بے قراری پیدا کی ہے کہ وہ اپنے بستروں سے الگ ہو کر کبھی سجدے میں ہیں کبھی قیام میں۔

خدا کے ساتھ بندے کے تعلق کے متوازن ہونے کی شرط

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ خدا کے ساتھ بندے کا تعلق متوازن اسی وقت تک رہتا ہے جب تک وہ خوف اور رجا دونوں کے بین بین رہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک کا بھی زیادہ غلبہ ہو جائے تو توازن بگڑ جاتا ہے۔ اگر رجائیت غالب ہو جائے تو خدا کے عدل سے انسان بے پروا ہو جاتا ہے جس سے مرجیئت بلکہ اباحیت کے دروازے آدمی اپنے لیے کھول لیتا ہے۔ اگر خوف کا غلبہ ہو جائے تو اس سے اس کے اندر مایوسی اور قنوطیت راہ پاتی ہے اور یہ چیز بھی فتنے پیدا کرتی ہے۔ سابق ادیان کے پیروؤں میں اس عدم توازن سے جو خرابیاں پیدا ہوئیں ان کی تفصیل بہت طویل ہے۔ قرآن نے اس کی طرف

اشارات کیے ہیں اور ہم ان کی طرف توجہ دلاتے آرہے ہیں۔

قرآن کے نزدیک حقیقی اہل علم

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ۔ اس سے اس محذوف پر روشنی پڑ رہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔ یعنی یہ کس طرح ممکن ہے کہ اہلِ علم اور غیر اہلِ علم دونوں اللہ کے نزدیک یکساں ہو جائیں؟ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ قرآن کے نزدیک اہلِ علم وہی ہیں جن کی تعریف أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَقَائِمًا يَحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُو رَحْمَةَ رَبِّهِ کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے۔ جن کے اندر یہ صفت موجود نہیں ہے وہ قرآن کے نزدیک علم سے عاری ہیں اگرچہ وہ چاند اور مریخ تک سفر کر آئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی کی رہنمائی کے لیے اصلی علم یہ ہے کہ انسان کو یہ پتہ ہو کہ یہ دنیا کہاں سے آئی ہے، کہاں منتہی ہو گی، اس کے خالق کی صفات کیا ہیں اور اس کے ساتھ انسان کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اگر اس علم کی کلید اس کے ہاتھ آ گئی تو وہ اپنی زندگی کا مقصد و منتہا سمجھ جائے گا اور اگر یہ علم حاصل نہ ہو سکا تو وہ اندھیرے میں ہے اگرچہ وہ آسمان و زمین کا طول و عرض ناپ ڈالے۔

إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ۔ یعنی یہ حقائق ہیں تو بالکل واضح لیکن بات کو تسلیم کرنے کے لیے صرف اس کا واضح ہونا کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ مخاطب عقل والے ہوں اور ان حقائق کو سننے اور سمجھنے کے لیے اپنی عقل استعمال بھی کریں۔ جن لوگوں کے اندر نہ علم ہے نہ عقل وہ لوگ واضح سے واضح بات سے بھی کوئی سبق حاصل نہیں کرتے۔ اس میں ضمناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی بھی دے دی گئی کہ اگر یہ لوگ قرآن کی ان یاددہانیوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں تو اس میں قصور نہ تمہارا ہے نہ قرآن کا، بلکہ یہ لوگ خود ہی بالکل بلید اور کودن ہیں۔

قُلْ يَا عِبَادِ الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا رَبَّكُمْ ۚ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۗ وَأَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةٌ ۗ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ (۱۰)

مظلوم مسلمانوں کے لیے پیامِ تسلی

قریش کے رویہ سے مایوسی کے اظہار کے بعد یہ ان غریب مسلمانوں کو تسلی دی جو قریش کے ہاتھوں ستائے جا رہے تھے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ میرے ان بندوں کو یہ بات پہنچا دو کہ تم اپنے رب سے ڈرتے رہو۔ یعنی بے وقوف لوگوں نے تو شرک و شفاعت کی راہیں نکال کر خدا کے عدل اور اس کی جزا و سزا کو بالکل بے معنی کر دیا ہے لیکن تم اپنے رب کے عدل سے برابر ڈرتے رہو۔ ان لوگوں کے لیے خدا کے ہاں اچھا صلہ ہے جو اس دنیا میں نیکی اور بھلائی کی زندگی بسر کریں گے۔ رہے وہ لوگ جو جھوٹی شفاعتوں کے بل پر جنت الحمقاء میں زندگی گزار رہے ہیں وہ اپنی اس حماقت کا انجام دیکھ لیں گے۔

وَأَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةٌ۔ یعنی اس راہ میں جو مصائب و شدائد تمہارے دشمنوں کی طرف سے پیش آ رہے ہیں یا آئندہ آئیں ان کو عزم و ہمت کے ساتھ برداشت کرو۔ اگر دیکھو کہ تمہارے وطن کی زمین تمہارے اوپر تنگ کر دی گئی ہے جب بھی بددل و مایوس نہ ہونا، خدا کی زمین بڑی وسیع ہے۔ اگر اس

شہر میں تمھارے لیے اللہ کے دین پر قائم رہنا ناممکن بنا دیا گیا تو اللہ تمھاری رہنمائی کسی اور سرزمین کی طرف فرمائے گا جہاں تم بے خوف و خطر اپنے رب کی عبادت کر سکو گے۔

اس آیت سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ سورہ کشمکشِ حق و باطل کے اس دور میں نازل ہوئی ہے جب مکہ کی سرزمین مسلمانوں پر تنگ ہو رہی تھی اور مسلمان اپنے مستقبل کے مسئلہ پر سوچنے لگ گئے تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ اطمینان دلایا کہ اگر اس شہر کے باشندوں نے تمھیں نکالا تو اطمینان رکھو کہ کوئی اور سرزمین تمھارا خیر مقدم کرے گی۔ بعینہٖ یہی مضمون، اسی سیاق و سباق کے ساتھ، سورۂ عنکبوت میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ	اے میرے بندو، جو ایمان لائے ہو، میری زمین
فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ (العنکبوت ۵۶)	بڑی کشادہ ہے تو میری ہی بندگی پر جمے رہو۔

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ یعنی یہ راہ ہے تو بڑی سخت آزمائشوں کی لیکن اطمینان رکھو کہ میرے جو بندے ان آزمائشوں میں ثابت قدم رہیں گے ان کو اس کا صلہ بھی ان کی توقعات اور ان کے اندازوں اور قیاسوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ملے گا۔ آج وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ (۱۱-۱۲)

مخالفوں سے بے تعلقی کا اعلان

مسلمانوں کو بشارت دینے کے بعد یہ مخالفوں سے بے نیازی و بے تعلقی کا اعلان ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی کہ اب زیادہ ان کی نازبرداری کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کو واضح طور پر بتا دو کہ مجھے تو یہ حکم ملا ہے کہ میں اللہ ہی کی بندگی کروں، اسی کی خالص اطاعت کے لیے اور یہ بھی حکم ملا ہے کہ میں پہلا اسلام لانے والا بنوں، قطعِ نظر اس سے کہ دوسرے کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ حکم قرآن میں جگہ جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے بلکہ نبوت کے روزِ اول ہی سے یہ حکم آپ کو مل چکا تھا۔ اس سورہ کے شروع میں بھی یہ نہایت واضح الفاظ میں مذکور ہے فرمایا ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ (۲-۳) (ہم نے تمھاری طرف کتاب اتاری ہے قولِ فیصل کے ساتھ تو اللہ ہی کی بندگی کرو اس کی بے آمیز اطاعت کے ساتھ، یاد رکھو کہ اطاعتِ خالص کا سزاوار اللہ ہی ہے) یہاں دونوں آیتوں میں دو حکم مذکور ہوئے ہیں۔ ایک اللہ ہی کی عبادت کا دوسرا سب سے پہلا مسلم بننے کا۔ یعنی ایمان اور اسلام دونوں ہی باتوں کا مجھے حکم مل چکا ہے اور یہ ہدایت ہوئی ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والا بنوں۔ اس وجہ سے میں نے تو اپنے رب کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے میرا ساتھ دے ورنہ اپنا انجام دیکھے۔ یہ امر واضح رہے کہ نبی کے عین فریضۂ منصبی کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ وہ جس ایمان و اسلام کی خلق کو دعوت دیتا

ہے اس کو سب سے پہلا قبول کرنے والا وہ خود بنتا ہے اس وجہ سے اس کا درجہ اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اور اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ کا ہوتا ہے۔

قُلْ اِنِّيْ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۳)

یعنی ان کو بتا دو کہ مجھے تو جو حکم مل چکا ہے میں اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ اگر اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے سخت دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ یہی حکم میرے واسطہ سے تمھیں بھی ملا ہے اور میں نے وہ تم کو پہنچا دیا ہے۔ اگر تم اپنے رب کی نافرمانی اور قیامت کے عذاب سے بے پروا ہو تو جو چاہو کرو۔ میں نہ تمھارا ہاتھ پکڑ سکتا اور نہ تمھارے ایمان کا ذمہ دار ہوں۔

قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ ۝ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ۭ قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ (۱۴-۱۵)

اعلانِ براءت یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نہایت واضح الفاظ میں اعلانِ براءت و بے تعلقی ہے کہ میں تو اس حکم کے مطابق جو مجھے میرے رب کی طرف سے ملا ہے اپنے رب ہی کی بندگی اور اسی کی بلا شرکتِ غیرے اطاعت کرتا ہوں اور اسی کی دعوت تم کو بھی دے رہا ہوں۔ اگر تم میری یہ بات نہیں مانتے تو تم خدا کے سوا جس کی چاہو بندگی کرو۔ میں تمھارے اس فعل سے بری ہوں۔ فرمایا کہ ان کو اس حقیقت سے بھی آگاہ کر دو کہ اصل خسارے میں وہی لوگ ہوں گے جنھوں نے اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو قیامت کے دن کے خسارے میں مبتلا کیا۔ مطلب یہ ہے کہ اور جتنے بھی خسارے ہیں وہ سب آنی اور وقتی ہیں اور ان کی تلافی ممکن ہے لیکن قیامت کے دن کا خسارہ ابدی اور دائمی ہے اس وجہ سے بدقسمت ہیں وہ جو اس دنیا کے چند روزہ عیش کے پیچھے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی آخرت برباد کر رہے ہیں۔

ہر شخص پر اس کے اہل و عیال کی بھی مسئولیت ہے 'اَنْفُسَهُمْ' کے ساتھ 'اَهْلِيْهِمْ' کے اضافہ سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ ہر شخص پر اس کے اپنے نفس کے ساتھ اس کے اہل و عیال کی مسئولیت بھی ہے۔ 'كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ' والی حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حقیقت واضح فرما دی ہے۔ اس مسئولیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص نہ صرف اپنی نجات کی فکر کرے بلکہ اپنے اہل و عیال کی نجات کی بھی فکر کرے۔ اگر کسی شخص نے اپنے غلط طرزِ عمل سے اپنے اہل و عیال کے لیے غلط مثال چھوڑی یا اپنے زور و اثر سے ان کو غلط راہ پر ڈالا تو اس نے صرف اپنی ہی تباہی کا سامان نہیں کیا بلکہ ان کو بھی ایک ابدی ہلاکت میں ڈالا۔

اصل خسارہ آخرت کا خسارہ ہے 'اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ' یعنی اچھی طرح کان کھول کر سن لو کہ کھلا ہوا خسارہ وہی ہے جس سے آخرت میں سابقہ پیش آئے گا۔ مطلب یہ ہے کہ تم آج اس دعوتِ حق سے بدک رہے ہو کہ اس کے قبول کرنے کے بعد تمھیں بہت سے مفاداتِ دنیوی سے دستکش ہونا پڑے گا۔ حالانکہ یہ کوئی خسارہ نہیں

ہے بلکہ اصل خسارہ وہ ہے جس کا نتیجہ ابدی محرومی ہے۔

لائق قبولِ عبادت وہی ہے جس کے ساتھ مخلصانہ اطاعت بھی ہو

'مُخْلِصًا لَّهُ دِيْنِيْ' میں جو حقیقت بیان ہوئی ہے اس کی وضاحت ہم پیچھے کر آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قابلِ قبول عبادت وہی ہے جس کے ساتھ اس کی خالص اطاعت بھی ہو۔ اگر عبادت اللہ کی ہو اور اطاعت اللہ کے احکام کے خلاف، دوسروں کی تو اس عبادت کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی قیمت نہیں ہے۔ اسی طرح اطاعت میں بھی اخلاص ضروری ہے۔ اگر اللہ کی اطاعت محض دکھاوے، نمائش، کسی غرض دنیوی کے لیے کی جائے تو اس قسم کی منافقانہ اطاعت بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں درخورِ اعتنا نہیں ہے۔

یہاں ایک بات قرارت سے متعلق بھی قابلِ گزارش ہے۔ وہ یہ کہ لفظ 'دِیْنِیْ' کی قرارت اسی طرح کرنی چاہیے جس طرح 'لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ' میں کی جاتی ہے اس لیے کہ یہ امر ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آیات پر وقف فرماتے تھے۔ سیبویہ کی یہ رائے ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے کہ اس قسم کا حذف، صرف شعر کے ساتھ مخصوص ہے۔ قرآن میں اس قسم کے حذف کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

لَهُم مِّن فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِن تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ۚ ذَٰلِكَ يُخَوِّفُ اللَّهُ بِهِ عِبَادَهُ ۚ يَا عِبَادِ فَاتَّقُونِ (۱۶)

'ظُلَلٌ' جمع ہے 'ظُلَّة' کی۔ اس کے اصل معنی 'غَاشِيَة' یعنی ڈھانک لینے والی چیز کے ہیں۔ یہ انجام بیان ہوا ہے ان 'خٰسِرِیْنَ' کا جن کا اوپر والی آیت میں ذکر ہوا۔ فرمایا کہ ان کے لیے آگ ہی کا اوڑھنا اور اسی کا بچھونا ہوگا۔ اوپر سے بھی ان کو آگ تہ بہ تہ ڈھانک لے گی اور نیچے سے بھی۔ فرمایا کہ یہ چیز ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈرا رہا ہے۔ یعنی یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے جو ہنسی مسخری میں ٹالی جا سکے۔ اس کے بعد نہایت پُرسوز انداز میں فرمایا کہ میرے بندو، یہ بڑی ہی سخت چیز ہے تو میرے اس عذاب سے بچو!

وَالَّذِينَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوتَ أَن يَعْبُدُوهَا وَأَنَابُوا إِلَى اللَّهِ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمْ أُولُو الْأَلْبَابِ (۱۷-۱۸)

لفظ 'طَاغُوت' کی تحقیق بقرہ: ۲۵۶ اور نساء: ۵۱ کے تحت بیان ہو چکی۔ یہ غیر اللہ کی تعبیر کے لیے ایک جامع لفظ ہے، خواہ اصنام و الٰہہ ہوں یا جنات و شیاطین اور اللہ کی بندگی و اطاعت سے برگشتہ کرنے والے لیڈر۔

فلاح پانے والوں کی صفات اور ان کو بشارت

یہ 'خٰسِرِیْنَ' کے مقابل میں 'مُفْلِحِیْنَ' کا ذکر ہے۔ ان کو ابدی فوز و فلاح کی بشارت بھی دی گئی اور ان کی ان صفات کی تحسین بھی فرمائی گئی ہے جن کی بدولت وہ اس بشارت کے اہل ٹھہرے۔ فرمایا کہ ہمارے جو بندے غیر اللہ کی پرستش سے بچتے ہیں اور وہ پورے اخلاص کے ساتھ اللہ کی طرف جھک پڑے ان کے لیے بشارت ہے تو تم میرے ان بندوں کو ابدی فوز و فلاح کی خوش خبری دے دو۔

'الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ ..... الآية' یہ ان کی اس سلیم الطبعی کا بیان ہے جس کی بدولت وہ خدا کی ہدایت اور اس کی بشارت کے مستحق ٹھہرے۔ فرمایا کہ ان لوگوں کا حال یہ نہیں رہا ہے کہ جب کوئی بات ان کے سامنے پیش کی جائے تو اس کو سننے اور سمجھنے سے پہلے ہی کہنے والے سے لڑنے اور اس کا منہ نوچ لینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں بلکہ یہ بات کو توجہ سے سنتے اور ہر اچھی بات کی پیروی کرتے رہے ہیں۔ 'أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ' ان کی اس سلیم الطبعی اور حق پسندی کا صلہ ان کو یہ ملا کہ قرآن کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے خلق کے لیے جو ہدایت اتاری اس کی انھوں نے قدر کی اور اللہ نے اس ہدایت سے ان کو بہرہ مند کیا۔

'وَأُولَٰئِكَ هُمْ أُولُو الْأَلْبَابِ' فرمایا کہ یہی لوگ عاقل ہیں اور عاقل ہی خدا کی یاددہانی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ وہی بات ہے جو اوپر آیت ۹ میں گزر چکی ہے۔ 'إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ' (یاددہانی تو صرف اہلِ عقل حاصل کرتے ہیں) اور یہی بات سورۂ ص میں یوں بیان ہوئی ہے۔ 'كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ' (۲۹) (یہ ایک مبارک کتاب ہے جو ہم نے تمھاری طرف اتاری ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر تدبر کریں اور تاکہ اہلِ عقل اس سے یاددہانی حاصل کریں)۔

أَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ۖ أَفَأَنتَ تُنقِذُ مَن فِي النَّارِ (۱۹)

ان کا بیان جو خدا کے قانون کی زد میں آچکے

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ جن کو خدا کی ہدایت نصیب ہوتی ہے ان کی صفات وہ ہیں جو اوپر بیان ہوئیں۔ رہے وہ لوگ جو خدا کے قانونِ عذاب کی زد میں آچکے ہیں وہ گویا جہنم میں پڑ چکے تو کیا تم ان لوگوں کو دوزخ سے نجات دینا چاہتے ہو جو عذاب میں گرفتار ہو چکے۔ 'كَلِمَةُ الْعَذَابِ' سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ کلی فیصلہ ہے جو اس نے ابلیس کے چیلنج کے جواب میں فرمادیا تھا کہ جو لوگ تیری پیروی کریں گے، خواہ جنوں میں سے ہوں یا انسانوں میں سے، تیرے سمیت میں ان کو جہنم میں بھروں گا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کلی فیصلہ صادر ہو چکا ہے اور یہ بالکل قطعی اور اٹل ہے تو جو لوگ اس کی زد میں آچکے وہ تو اب لازماً دوزخی ہیں۔ ان کا نجات دینے والا کون بن سکتا ہے!

لَٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّن فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ وَعْدَ اللَّهِ ۖ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ الْمِيعَادَ (۲۰)

'لٰكِنْ' یہاں استدراک کے لیے ہے اس وجہ سے اس کا موزوں ترجمہ 'البتہ' ہوگا۔

'مَبْنِيَّةٌ' یہاں آراستہ و پیراستہ (FURNISHED) کے مفہوم میں ہے۔ عربی میں 'بنی الدار' جس طرح مکان بنانے کے مفہوم میں آتا ہے اسی طرح مکان آراستہ کرنے کے مفہوم میں بھی آتا ہے، مفسرین نے اس معنی کی طرف توجہ نہیں کی ہے لیکن قرآن اور کلام عرب میں اس کے شواہد موجود ہیں۔ آگے کسی

موزوں مقام پر اس کی تحقیق آئے گی۔

'وَعْدَ اللّٰہِ' فعل محذوف سے منصوب اور اس کی تاکید کے لیے ہے۔

اوپر کفار کے لیے جو عذاب، 'لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے اس کے مقابل میں یہ ان لوگوں کا صلہ بیان ہوا ہے جو اپنے رب سے ڈرتے اور شرک سے بچتے رہے۔ فرمایا کہ ان کے لیے آراستہ بالاخانے ہوں گے اور ان بالاخانوں کے اوپر بھی آراستہ بالاخانے ہوں گے۔ ان بالاخانوں کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ یہ اللہ کا حتمی وعدہ ہے اور اللہ اپنے وعدے کی کبھی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔

۴۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۲۱ - ۳۵

آگے قرآن سے اعراض کرنے والوں کے سبب اعراض پر ضرب لگائی ہے کہ اس دنیائے فانی کی محبت نے ان کے دل سخت کر دیے ہیں جس کے سبب سے وہ حق سے بیزار ہیں ورنہ قرآن ایک عظیم نعمت ہے۔ جن کے اندر صلاحیت ہے اس کی آیتیں سن کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ البتہ جن کے دل پتھر ہو چکے ہیں وہ اس سے محروم رہیں گے اور اسی عذاب سے دوچار ہوں گے جس سے رسولوں کی تکذیب کرنے والی پچھلی قومیں تباہ ہو چکی ہیں۔ اس قرآن نے تمام حقائق بہتر سے بہتر انداز میں بیان کر دیے ہیں۔ جو لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں، ان کی شامت ہی ہے۔ مبارک ہیں وہ جو اس صداقت کو قبول کر رہے ہیں۔ وہی لوگ اللہ سے ڈرنے والے ہیں اور ان کے لیے بہترین صلہ ہے ـــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ آیات
ثُمَّ يُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ ۲۱-۳۵
يَجْعَلُهُ حُطَامًا ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿۲۱﴾ أَفَمَن ع ۲/۱۲ ۱۶
شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّن رَّبِّهِ ۚ فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ
قُلُوبُهُم مِّن ذِكْرِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۲۲﴾ اللَّهُ نَزَّلَ
أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ
يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ

هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ
هَادٍ ﴿۲۳﴾ اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَقِيْلَ
لِلظّٰلِمِيْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۲۴﴾ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ
فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۵﴾ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ وقف لازم
وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾
قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۲۸﴾ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا
رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ
يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۹﴾ اِنَّكَ
مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ
تَخْتَصِمُوْنَ ﴿۳۱﴾ ع فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ ع ۲
اِذْ جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ
وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۳۳﴾ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ
ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۴﴾ لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا وَيَجْزِيَهُمْ
اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۳۵﴾

دیکھتے نہیں کہ اللہ ہی اتارتا ہے آسمان سے پانی۔ پس اس کے چشمے جاری کر دیتا ہے ترجمہ آیات ۲۱-۲۵
زمین میں۔ پھر اس سے پیدا کرتا ہے کھیتیاں مختلف قسموں کی پھر وہ خشک ہونے لگتی ہیں اور
تم ان کو زرد دیکھتے ہو۔ پھر وہ ان کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ بے شک اس کے اندر اہل عقل

کے لیے بڑی یاددہانی ہے! ۲۱

کیا وہ جن کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے پس وہ اپنے رب کی طرف سے روشنی پر ہیں (اور وہ جن کے دل سخت ہو چکے ہیں یکساں ہوں گے ؟) تو ہلاکی ہے ان کے لیے جن کے دل اللہ کی یاددہانی قبول کرنے کے معاملے میں سخت ہو چکے ہیں! یہی لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں۔ ۲۲

اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے، ایک ہم رنگ کتاب کی شکل میں، جس کی سورتیں، جوڑے جوڑے ہیں۔ اس سے ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں۔ پھر ان کے بدن اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف جھک پڑتے ہیں یہ اللہ کی ہدایت ہے جس سے وہ ہدایت بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ اور جس کو خدا گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں بن سکتا۔ ۲۳

کیا وہ جو اپنے چہرے کو عذاب بد کی سپر بنائے گا (اور وہ جو اس سے محفوظ ہوگا، دونوں یکساں ہوں گے) اور ایسے ظالموں کو حکم ہوگا کہ جو کمائی تم نے کی ہے اس کا مزا چکھو۔ ۲۴

ان سے پہلے والوں نے بھی جھٹلایا تو ان پر عذاب وہاں سے آدھمکا جہاں سے ان کو خیال بھی نہ تھا تو اللہ نے ان کو دنیا میں بھی رسوائی کا مزا چکھایا اور عذاب آخرت تو بڑی چیز ہے! کاش یہ لوگ اس بات کو سمجھتے! ۲۵-۲۶

اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کی تذکیر کے لیے ہر قسم کی تمثیلیں بیان کر دی ہیں تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ ایک عربی قرآن کی صورت میں جس کے اندر کوئی کجی نہیں تاکہ وہ عذاب سے بچیں۔ اللہ تمثیل بیان کرتا ہے ایک غلام کی جس میں کئی مختلف الاغراض آقا شریک ہیں

اور ایک دوسرے غلام کی جو پورے کا پورا ایک ہی آقا کی ملک ہے۔ کیا ان دونوں کا حال یکساں ہو گا! سزاوارِ شکر صرف اللہ ہے۔ لیکن ان کی اکثریت اس حقیقت کو نہیں سمجھتی۔ ۲۷-۲۹

تم کو بھی مرنا ہے اور یہ بھی مرنے والے ہیں۔ پھر تم لوگ قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرو گے۔ تو ان سے بڑھ کر اپنی جان پر ظلم ڈھانے والا اور کون ہو گا جنھوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا اور سچی بات کو جھٹلایا جب کہ وہ ان کے پاس آئی! کیا ایسے کافروں کا ٹھکانا جہنم میں نہ ہو گا! ۳۰-۳۲

اور جو سچی بات لے کر آیا اور جنھوں نے اس کی تصدیق کی وہی لوگ اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ سب کچھ ہو گا جو وہ چاہیں گے۔ یہ صلہ ہے خوب کاروں کا! تاکہ اللہ ان سے دفع کر دے ان کاموں کے بدتر انجام کو جو انھوں نے کیے اور ان کو ان کاموں کا اس سے خوب تر صلہ دے جو انھوں نے کیے۔ ۳۳-۳۵

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهُ حُطَامًا ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ (۲۱)

مکذبینِ قرآن کو یاددہانی

یہ قرآن کے مکذبین کو اس حقیقت کی یاددہانی ہے کہ آج تم کو جس انجام سے قرآن اور پیغمبر ڈرا رہے ہیں وہ تم کو بہت مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ اپنی موجودہ کامیابیوں کے نشہ میں تمھاری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ تمھارے اس اقتدار پر زوال کدھر سے آجائے گا، حالانکہ تم برابر دیکھ رہے ہو کہ اس دنیا کی ہر چیز وقتی اور فانی ہے۔ بارش ہوتی ہے، جس سے زمین میں پانی کے چشمے جاری ہو جاتے ہیں، پھر اس سے طرح طرح کی نباتات، اور کھیتیاں اگ پڑتی ہیں۔ پھر وہ خشک ہونی شروع ہوتی ہیں، پھر وہ زرد پڑ جاتی ہیں، پھر اللہ تعالیٰ ان کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔

لفظ 'اَلْوَان' اقسام وانواع کے معنی میں بھی آتا ہے اِس کی تحقیق اس کے محل ہو چکی ہے۔

'ھَاجَ الْبَقْل' کے معنی ہوں گے 'اَخَذَ فِی الْیَبْس' سبزی خشک ہونے لگی۔

'اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِاُولِی الْاَلْبَابِ' یعنی جو عقل رکھنے والے ہیں اس مشاہدے میں ان کے لیے بڑی عبرت ہے۔

اس میں سب سے بڑی یاددہانی تو اس حقیقت کی ہے کہ اس دنیا کی تمام رونقیں اور شادابیاں عارضی اور وقتی ہیں اس وجہ سے ان پر ریجھنے کے بجائے عاقل کو اس ذات کی طرف متوجہ رہنا چاہیے جو ان تمام چیزوں کو وجود میں لانے والی اور مستقل بالذات ہے۔

دوسری یاددہانی اس میں یہ ہے کہ جس پروردگار نے اپنے بندوں کی پرورش کے لیے اس دنیا میں یہ انتظام فرمایا ہے اس کی اس پروردگاری کا فطری تقاضا یہ ہے کہ بندے اسی کے شکرگزار رہیں۔ اس کے سوا کسی اور کو اس شکرگزاری میں شریک نہ کریں۔

تیسری یہ کہ جس خدا نے پروردگاری کا یہ انتظام فرمایا ہے اور آسمان سے زمین تک ہر چیز کو جس نے انسان کی خدمت میں سرگرم کر رکھا ہے وہ لوگوں کو یوں ہی نہیں چھوڑ دے گا بلکہ ایک ایسا دن بھی لازماً آنا ہے جس میں وہ ہر شخص سے اس کی نیکیوں اور بدیوں کا حساب کرے گا اور انصاف کے مطابق اس کو جزا یا سزا دے گا۔

یہاں یہ چند باتیں کلام کے سیاق وسباق کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔ اس تمثیل کے اندر جو دوسرے پہلو ہیں ان کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے اور ایک خاص پہلو کی وضاحت آگے کی آیت سے ہو جائے گی۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰہُ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ فَھُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّہٖ ط فَوَیْلٌ لِّلْقٰسِیَۃِ قُلُوْبُھُمْ مِّنْ ذِکْرِ اللّٰہِ ط اُولٰٓئِکَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۲۲)

فیض بہ … است … پہنچتا

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ فیض ہمیشہ بقدر استعداد وصلاحیت پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ابرِکرم یوں تو ہر خشک وتر پر برستا ہے لیکن ہر زمین اس سے یکساں مستفید نہیں ہوتی۔ جس زمین میں صلاحیت ہوتی ہے وہ تو اس سے لہلہا اٹھتی ہے لیکن جو بنجر ہوتی ہے وہ یوں ہی ویران پڑی رہ جاتی ہے۔ اسی طرح قرآن کی صورت میں جو بارش ہوئی ہے اس کا فیض بھی ہر شخص کو یکساں نہیں پہنچے گا بلکہ جنھوں نے اپنی فطری صلاحیتیں زندہ رکھی ہیں اللہ اس کے ذریعے سے ان کے سینے اسلام کے لیے کھول دے گا۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے اپنی فطری صلاحیتیں ضائع کر کے اپنے دل پتھر بنا لیے ہیں وہ اس کے فیض سے محروم ہی رہیں گے اور ایسے سنگدلوں کے لیے، جو اللہ کی تذکیر کے بعد بھی پتھر بنے رہ گئے، صرف ہلاکی ہے۔ ایسے لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں اس لیے کہ انھوں نے رات کے اندھیرے میں نہیں بلکہ پورے دن کی روشنی میں خدا کی رہنمائی کے باوجود اپنی راہ کھوئی ہے۔

اس سوالیہ جملہ میں بھی خبر محذوف ہے جس کو ترجمہ میں ہم نے کھول دیا۔

'مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ' یہاں مِنْ تَذْكِيْرِ اللّٰهِ اِيَّاهُمْ' کے مفہوم میں ہے یعنی جن کے دل خدا کی طرف سے یاد دہانی کے باوجود پتھر بنے رہے۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (۲۳)

قرآن کی صفت اور اس کی تاثیر

'كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا' قرآن کی صفت ہے اس لیے کہ اس کا ہر جزو ایک دوسرے سے مشابہ اور ہم آہنگ و ہم رنگ ہے۔ اس کو جہاں سے بھی کھول کر پڑھیے اس کی تمام بنیادی تعلیمات آپ کے ذہن میں تازہ ہو جائیں گی۔ اس کے ہر گروپ بلکہ ہر سورہ کا رنگ اور اسلوب بیان الگ الگ ہے۔ عمود بھی مختلف ہیں لیکن اس اختلاف کے ساتھ ساتھ اس میں ایسی ہمہ گیر وحدت ہے کہ آپ جہاں سے بھی دیکھیں گے قرآن کا اصلی جمال آپ کی نگاہ کے سامنے آ جائے گا۔ ہم نے سورتوں کے مختلف گروپوں کی جو تفسیر پیش کی ہے اس پر ایک نظر ڈالنے سے ہمارے اس دعوے کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ قرآن کا اس شکل میں نازل ہونا تعلیم کے پہلو سے اپنے اندر ایک عظیم افادیت رکھتا ہے۔ اس طرح گویا قاری کو ان تمام حقائق کا مختلف زاویوں سے مشاہدہ کرا دیا جاتا ہے جن کی قرآن دعوت دیتا ہے۔

'مَثَانِيَ' کی تحقیق سورۂ حجر کی آیت ۸۷ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہ قرآن کی سورتوں کے جوڑے جوڑے ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ جن لوگوں نے اس کے معنی بار بار دہرائی ہوئی چیز کے لیے ہیں ان کی رائے لغت اور نظائر قرآن کے خلاف ہے۔ سورتوں کے جوڑے جوڑے ہونے کی، تعلیم کے پہلو سے، جو قدر و قیمت ہے اس کی وضاحت ہم نے مقدمے میں بھی کی ہے اور سورۂ حجر کی مذکورہ بالا آیت کے تحت بھی۔

لفظ 'جلود' اس آیت میں جسم کے رونگٹوں کے معنی میں بھی آیا ہے اور پورے جسم کے معنی میں بھی۔ عربی زبان میں کُل بول کر جزو بھی مراد لیتے ہیں اور جزو بول کر کُل بھی۔

'تَلِيْنُ' یہاں 'تمیل' کے مضمون پر متضمن ہے اس وجہ سے اس کے بعد صلہ 'اِلٰى' آیا ہے۔

الفاظ و اسالیب کو سمجھ لینے کے بعد آیت کے مضمون پر غور فرمائیے۔

فرمایا کہ ہم نے اس قرآن کی صورت میں بہترین کلام اتارا ہے جس کا ہر جزو ایک دوسرے سے بالکل ہم آہنگ و ہم رنگ ہے اور اس کی تمام سورتیں جوڑے جوڑے بنائی ہیں تاکہ اس کی ہر بات سامع اور قاری کے ذہن نشین ہو جائے۔ وہ جس زاویے سے بھی اس کو دیکھے اصل حقیقت اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ تورات کا حال قرآن سے بالکل مختلف ہے۔ قرآن کا حال تو یہ ہے کہ اگر بقرہ کے بعد آل عمران کی تلاوت کیجیے تو گو دونوں کے عمود، مخاطب، نہج استدلال اور طرز بیان میں

بڑا فرق ہے لیکن آلِ عمران میں بھی وہ ساری حقیقتیں از سرِ نو نگاہوں کے سامنے آجائیں گی جو بقرہ میں گزر چکی ہیں۔ برعکس اس کے تورات کا حال یہ ہے کہ اگر پیدائش کے بعد خروج، احبار یا گنتی کو پڑھیے تو آپ پچھلی تمام کتابوں سے بالکل بے تعلق ہو جائیں گے۔ یہود نے تورات کو جو بھلا یا یا اس میں تحریفیں کیں اس میں بڑا دخل تورات کے اجزائے مختلفہ کی اس بے تعلقی کو بھی تھا۔

تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ۔ فرمایا کہ اس قرآن کی تاثیر کا حال یہ ہے کہ جن کے دلوں میں خدا کی خشیت ہے اس کی تذکیر سے ان کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی اس سے اثر پذیر نہیں ہوتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا دل خدا کے نُور سے بالکل خالی ہے اور وہ پتھر کی طرح سخت بن چکا ہے۔

ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ۔ یعنی یہ قرآن دلوں میں جو گداز پیدا کرتا ہے اس کے اثر سے ان کے جسم اور ان کے دل دونوں نرم ہو کر اللہ کی یاد کی طرف جھک پڑتے ہیں۔ دلوں کا نرم ہونا تو واضح ہے۔ جسموں کے نرم ہونے سے مراد یہ ہے کہ ان کے اندر کبر و غرور کا کوئی شائبہ باقی نہیں رہ جاتا۔ آدمی کے اندر کبر و غرور ہو تو اس کی گردن تنی ہوئی، جسم اکڑا ہوا رہتا ہے اور وہ زمین پر پاؤں دھمکتے ہوئے چلتا ہے۔ برعکس اس کے جن کے اندر خدا کا خوف ہو ان کے اندر فروتنی و تواضع ہوتی ہے جس کا اثر ان کی چال ڈھال اور ان کے جسم کی ایک ایک ادا سے نمایاں ہوتا ہے۔

ذٰلِكَ هُدَی اللّٰهِ یَهْدِیْ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ۔ 'ذٰلِكَ' کا اشارہ قرآن کی طرف ہے۔ یعنی یہ قرآن اللہ کی اتاری ہوئی ہدایت ہے اس کے ذریعے سے وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس ہدایت کے لیے اس نے ایک خاص سنت ٹھہرا دی ہے۔ اس سنت کے بموجب جو ہدایت کے مستحق ہوتے ہیں وہ اس سے ہدایت پاتے ہیں اور جو مستحق نہیں ہوتے وہ اس سے محروم رہتے ہیں۔ اس سنت کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں۔

وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ۔ یعنی اس سنتِ الٰہی کے بموجب جو شخص گمراہی کا مستحق ہے اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ اس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ ایسے لوگوں کا غم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اَفَمَنْ یَّتَّقِیْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ وَقِیْلَ لِلظّٰلِمِیْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ (۲۴)

اس سوالیہ جملے میں بھی خبر محذوف ہے، ترجمے میں ہم نے اس کی وضاحت کر دی ہے۔

قیامت کے دن متکبرین کی بے بسی

یہ ان متکبرین کی بے بسی کی تصویر ہے کہ جس جزا و سزا کی انھوں نے اس دنیا میں نہایت رعونت کے ساتھ تکذیب کی ایک دن آئے گا کہ اس کا انجام ایسی ہولناک شکل میں ان پر مسلط ہوگا کہ وہ اس سے بچنے کے لیے اپنے چہروں کو ڈھال بنانے کی کوشش کریں گے۔ آدمی کا سب سے زیادہ عزیز و اشرف حصہ

اس کا چہرہ ہی ہوتا ہے۔ وہ ہر آفت سے اس کو محفوظ رکھنے کے لیے سب سے پہلے کوشش کرتا ہے تاکہ کسی طرح بھی اس کو کوئی گزند پہنچنے نہیں دینا چاہتا لیکن آخرت کے عذاب کا یہ حال ہو گا کہ اس دن متکبرین کے پاس کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہو گی جس کو وہ سپر بنا سکیں اس وجہ سے وہ اپنے وہی چہرے اس کے آگے کرنے پر مجبور ہوں گے جن سے وہ ان لوگوں کے آگے اکڑتے رہے تھے جو ان کو اس سے ڈراتے تھے۔

'وَقِيلَ لِلظّٰلِمِينَ ذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْسِبُونَ'۔ 'ظَالِمِينَ' سے یہی متکبرین مراد ہیں اس لیے کہ وہ قرآن کی تکذیب کر کے اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ فرمایا کہ ان کی اس بے بسی کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ اس وقت ان پر کوئی رحم نہیں فرمائے گا بلکہ ان سے کہا جائے گا کہ یہ جو کچھ تمھارے سامنے آیا ہے یہ تمھاری اپنی ہی کمائی ہے اس وجہ سے اب اس کا مزا چکھو۔

كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَأَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ۝ فَأَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (۲۵-۲۶)

قریش کو تنبیہ — یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ ان کو جس عذاب سے ڈرایا جا رہا ہے اس کو مذاق نہ سمجھیں۔ آج حالات سازگار ہیں اس وجہ سے ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ عذاب کدھر سے آ جائے گا۔ ان سے پہلے جو قومیں گزری ہیں وہ بھی اسی طرح کے گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اپنے رسولوں کو جھٹلاتی رہیں۔ بالآخر ان پر عذاب وہاں سے آ دھمکا جہاں سے ان کو کوئی وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

'فَأَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'۔ رسوائی کا عذاب ان قوموں پر اس وجہ سے آیا کہ اللہ کے رسولوں کے مقابل میں انھوں نے استکبار کا اظہار کیا اور پوری طرح اتمام حجت ہو جانے کے باوجود انھوں نے حق کی تکذیب کی۔ رسولوں کے باب میں اللہ تعالیٰ کی اس سنت کا حوالہ ہم بار بار دے چکے ہیں کہ جو قوم رسول کی تکذیب پر اڑ جاتی ہے اللہ تعالیٰ اتمام حجت کی مہلت گزر جانے کے بعد اس کو لازماً تباہ کر دیتا ہے۔ اس عذاب دنیا کے بعد اس کو آخرت کے عذاب سے بھی دوچار ہونا پڑے گا اور وہ بڑی ہی سخت چیز ہے۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ (۲۷-۲۸)

قرآن کی ایک خاص صفت — 'ضربِ مثل' کے معنی حکمت و موعظت کی باتیں تمثیل کے اسلوب میں پیش کرنا ہے۔ تمثیل کا اسلوب حقائق کی تعلیم و تفہیم کے لیے سب سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے، بالخصوص ان حقائق کی تعلیم کے لیے جن کا تعلق ایک نادیدہ عالم سے ہو۔ اس وجہ سے انبیاء علیہم السلام اس صنفِ کلام سے بہت زیادہ کام لیتے ہیں۔ تورات، انجیل، زبور سب امثال سے معمور ہیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے صحیفۂ حکمت کا تو نام ہی امثال ہے۔ اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے 'ضربِ مثل' کا محاورہ مجرد حکمت کی بات کہنے کے مفہوم میں بھی

استعمال ہونے لگا، عام اس سے کہ وہ تمثیل کی صورت میں ہو یا عام اسلوب میں۔ اس کی تحقیق اس کے محل میں بیان ہو چکی ہے۔

'قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ'۔ یہ قرآن کی اس صفت کا بیان ہے جس کا تعلق خاص اہل عرب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو عربی میں نازل فرمایا اور اس میں کوئی ایچ پیچ نہیں رکھا بلکہ نہایت فصیح و بلیغ زبان اور نہایت سادہ و دل پذیر اسلوب میں وہ ساری باتیں لوگوں کو سمجھا دی ہیں جو دنیا و آخرت کی فلاح کے لیے ضروری ہیں۔ اگر لوگوں نے اس کی قدر نہ کی تو گویا انھوں نے اللہ کے سب سے بڑے احسان اور اس کی سب سے بڑی عزت بخشی کی ناقدری کی اور اس اتمام حجت کے بعد اگر وہ اللہ کے عذاب کی زد میں آئیں تو وہ اسی کے سزاوار ہیں۔

پہلی آیت میں 'لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ' ہے، دوسری آیت میں 'لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ'۔ یعنی قرآن کو اس اہتمام کے ساتھ نازل کرنے کا اولین مقصد تو یہ ہے کہ جو لوگ غفلت میں سرمست ہیں وہ یاد دہانی حاصل کریں اور آخری مقصد یہ ہے کہ اس عذاب سے بچیں جو اس غفلت اور لاابالی پن کا لازمی نتیجہ ہے اور جو اس دنیا میں بھی لازماً پیش آئے گا اگر لوگ اپنی ضد پر اڑے رہے اور آخرت میں بھی اس سے دوچار ہونا پڑے گا۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۲۹)

توحید اور شرک کی تمثیل

یہ توحید اور شرک کی حقیقت ایک تمثیل سے سمجھائی ہے کہ مشرک کی مثال ایک ایسے غلام کی ہے جو بیک وقت متعدد مختلف الاغراض آقاؤں کی غلامی میں ہے اور موحد کی مثال ایک ایسے غلام کی ہے جو ایک ہی آقا کی غلامی میں ہے۔ اس کے بعد سوال کیا ہے کہ غور کرو کہ کیا دونوں غلاموں کا حال یکساں ہوگا؟ مطلب یہ ہے کہ کوئی غلام بھی اس بات پر راضی نہیں ہوتا کہ ایک آقا کی غلامی کی جگہ اس کو ایک سے زیادہ مختلف الاغراض اور برسرِ نزاع آقاؤں کی غلامی کرنی پڑے۔ انسانی فطرت ایک خدا کی غلامی پر تو اس وجہ سے راضی و مطمئن ہے کہ اس کے اندر جو افتقار و احتیاج ہے خدا کو مانے بغیر اس کا کوئی حل نہیں ملتا۔ اس کی دلیل اس کے باطن میں بھی موجود ہے اور اس کے باہر بھی۔ رہے دوسرے اصنام و آلہہ تو ایک خدا سے جب اس کی احتیاج پوری ہو گئی تو وہ ان کی غلامی کا پٹا اپنی گردن میں کیوں ڈالے! اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو وہ اپنی فطرت سے بغاوت کرتا ہے اور اپنے آپ کو ایک ایسے مخمصہ میں پھنساتا ہے جس میں پھنسنے پر کوئی ذی ہوش بھی راضی نہیں ہوتا۔

'اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'۔ یہ اس سوال کا جواب ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے دے دیا ہے کہ سزاوارِ شکر صرف اللہ ہے۔ تمام نعمتیں اسی کی عطا کردہ ہیں تو اسی کے شکر گزار رہو اور اس کی بندگی و اطاعت کرو جب

اس نے اپنے شریک کی حیثیت سے کسی کی بندگی کا حکم نہیں دیا تو تم اپنے جی سے دوسروں کی بندگی کا پھندا اپنی گردنوں میں کیوں ڈالتے ہو!

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ یعنی یہ حقیقت ہے تو بالکل واضح لیکن لوگوں کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے۔

توحید کی انفسی دلیل

یہ توحید کی نفسیاتی دلیل ہے جس کی پوری وضاحت ہم نے اپنے رسالہ 'حقیقتِ توحید' میں کی ہے۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے نہایت بلند حوصلہ مخلوق ہے۔ وہ کسی کی غلامی پر کبھی راضی ہونے والا نہیں ہے۔ ایک خدا کی غلامی تو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، وہ اس وجہ سے کرتا ہے کہ اس کی غلامی اس کی فطرت کے اندر ودیعت ہے اور وہ اپنی گوناگوں ناتوانیوں کے اندر اس سہارے کے بدون طمانیت نہیں پاتا۔ دوسروں کی غلامی کے لیے اس کے اندر اس طرح کا نہ صرف یہ کہ کوئی تقاضا نہیں ہے بلکہ اس کے خلاف ایک شدید بیزاری موجود ہے بشرطیکہ اس کی فطرت بگڑ نہ چکی ہو۔

آیت میں لفظ 'تشاکس' بھی ایک اہم نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ 'تشاکس' کے معنی 'تخالف' کے ہیں۔ 'شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ' کے معنی ہوں گے ایسے شرکاء جو مختلف الاغراض اور باہمدگر نبرد آزما ہوں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین اپنے دیوتاؤں کی نسبت یہ تصور بھی رکھتے رہے ہیں کہ ان کے درمیان برابر چشمک اور رقابت رہتی ہے جس کے سبب سے وہ کبھی کبھی ایک دوسرے سے اس طرح ٹکرا جاتے ہیں کہ مدتوں ان کی جنگ ختم نہیں ہوتی۔ آخر کس کی شامت آئی ہوئی ہے کہ وہ بیک وقت ایسے بہت سے دیوتاؤں کا غلام بننے پر راضی ہوگا! انسانی فطرت اس مصیبت و ذلت کو گوارا کرنے پر راضی نہیں ہو سکتی لیکن مشرک اس کو گوارا کرتا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ انسانیت کے شعور اور اپنے شرف کے صحیح احساس سے بالکل محروم ہوتا ہے۔

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ (۳۰-۳۱)

آنحضرت صلعم کے لیے تسلی اور مخالفین کے لیے وعید

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے لیے تسلی اور مخالفین کے لیے تہدید و وعید ہے کہ توحید اور شرک کا یہ قضیہ جو آج چھڑا ہوا ہے، ایک دن خدا کی عدالت میں بھی پیش ہونا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم بھی مرنے والے ہو اور یہ تمہارے مخالفین بھی ایک دن مریں گے پھر تم اور وہ دو فریقوں کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں پیش ہوں گے۔ تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے ان کو کیا بتایا اور سکھایا؛ ان سے پوچھا جائے گا کہ انھوں نے اس کا کیا جواب دیا۔ پھر حقیقی اور آخری فیصلہ وہاں ہوگا کہ کون حق پر تھا اور کون ناحق پر۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی کٹ حجتی اور ہٹ دھرمی پر غم کھانے کی ضرورت نہیں۔ اس دنیا میں شیطان کو بھی فرصت ملی ہوئی ہے اس وجہ سے اس کا کام بھی جاری ہے اور حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہی ہے کہ ایک وقتِ خاص تک یہ جاری رہے لیکن ایک

دن یہ مہلت ختم ہونے والی ہے اور یہ سارا معاملہ اللہ کی عدالت میں پیش ہوگا۔ اس دن غالب اور فائز المرام وہی ہوں گے جو حق پر ہیں۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَهٗ ۭ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝ وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (۳۲-۳۳)

عدالتِ الٰہی کا فیصلہ

وہاں جو فیصلہ ہوگا اس کی یہ پیشگی خبر دے دی ہے کہ اس وقت ان سے بڑھ کر محروم القسمت اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والا کون ہوگا جنھوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا اور پھر جب اس جھوٹ کی اصلاح کے لیے اللہ نے سچی چیز اتاری تو اس کی تکذیب کر دی! اللہ پر جھوٹ باندھنے سے مراد شرک ہے اس لیے کہ مشرکین اپنے مزعومہ شرکاء کے متعلق بالکل جھوٹ موٹ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خدا نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے حالانکہ خدا نے ان کے باب میں کوئی دلیل نہیں اتاری۔ 'صدق' سے مراد یہاں قرآن ہے اس لیے کہ ہر باب میں اس نے اختلاف رفع کر کے حق بات سامنے رکھ دی ہے۔

'اِذْ جَآءَهٗ' کی قید سے مقصود اتمامِ حجت کے پہلو کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اگر کسی سچائی میں کوئی خفا ہو اور آدمی اس سے محروم رہ جائے تو اس کے لیے کچھ عذر ہو سکتا ہے لیکن جو سچائی سامنے آن کھڑی ہو اور کوئی ہٹ دھرم اس کو جھٹلاتا ہی رہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ نصف النہار کے سورج کے وجود سے انکار کر رہا ہے۔

'اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ' فرمایا کہ کیا ایسے کٹر کافروں کا ٹھکانا بھی جہنم میں نہ ہوگا! یعنی جس کے اندر ذرا بھی معقولیت ہے وہ تسلیم کرے گا کہ ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہی میں ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس دن ایسا ہی ہوگا۔ اس قسم کے تمام کفار جہنم میں بھر دیے جائیں گے۔

'وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ'۔ 'وَصَدَّقَ بِهٖ' سے پہلے 'مَنْ' محذوف ہے اور لفظ 'مُتَّقُوْنَ' یہاں عذابِ دوزخ سے محفوظ رہنے والوں کے مفہوم میں ہے۔

یہ دوسرے فریق یعنی قرآن کے لانے والے اور اس کی تصدیق کرنے والوں کا صلہ بیان ہوا ہے کہ اس دن دوزخ سے صرف وہ محفوظ رہے گا جو سچائی کو لایا یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ لوگ جنھوں نے اس سچائی کی تصدیق کی۔ 'صَدَّقَ' کے بعد 'ب' کا صلہ اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ صدقِ دل سے اس پر ایمان لائے۔

لَهُمْ مَّا يَشَاۗءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ ذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الْمُحْسِنِيْنَ (۳۴)

یہ نہایت جامع الفاظ میں ان کا صلہ بیان فرما دیا کہ ان کے لیے وہ سب کچھ ان کے رب کے پاس ہوگا جو وہ چاہیں گے۔ ان کی خواہشوں اور چاہتوں کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ان کی ہر آرزو پوری کر دے گا۔ 'عِنْدَ رَبِّهِمْ' کے الفاظ سے یہ بات نکلی کہ بندوں کے لیے سب سے

اونچا مرتبہ خدا کا قرب ہے نہ کہ اس کی ذات میں ضم ہو جانا، جیسا کہ صوفیوں کے ایک گروہ نے سمجھا ہے۔ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ: یہ ایک تنبیہ ہے کہ یہ صلہ جو بیان ہوا ہے خوب کاروں کے لیے ہے قرآن پر ایمان کا ہر مدّعی اس کا حقدار نہیں ہوگا۔ اس کے حق دار صرف وہی ہوں گے جو ایمان کے ساتھ احسان کا حق ادا کرنے والے ہوں گے۔

لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا وَيَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۳۵)

روزِ جزا کی غایت

یہ غایت بیان ہوئی ہے اس روزِ جزا کی جس کا ذکر اوپر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دن اس لیے مقرر فرمایا ہے کہ اپنے خوب کار بندوں کے دامن سے ان کے اعمال کے بدتر اثرات کو جھاڑ دے اور ان اعمال کا جو خوب تر صلہ ہے اس سے ان کو نوازے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس دنیا میں آدمی نہ اپنے برے اعمال کے اثرات و نتائج ہی سے کما حقہٗ آگاہ ہو سکتا، نہ اپنے اچھے اعمال کے صلہ کی قدر و قیمت ہی سے۔ یہ دنیا چند روزہ ہے اور اس جزا یا سزا کا تعلق ایک ایسی دنیا سے ہے جس کی سزا بھی ابدی ہے اور جزا بھی۔ اس وجہ سے آیت میں 'اَسْوَاَ' اور 'احسن' کے الفاظ استعمال ہوئے۔ مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ روزِ جزا اس لیے مقرر فرمایا ہے کہ اس کے جو بندے ایمان و عمل کی روش اختیار کریں ان کو وہ ان کے اعمال کے تاریک تر پہلو کے اثرات سے بچائے اور ان کے اعمال کا جو سب سے اعلیٰ پہلو ہے اس کی برکتوں سے نوازے۔ گویا اس میں یہ رہنمائی بھی دے دی گئی کہ آدمی اپنے عمل کے صرف فوری اثرات و نتائج ہی پر نگاہ نہ رکھے بلکہ ان اثرات و نتائج پر نگاہ رکھے جو ایک ابدی زندگی میں ان پر مترتب ہونے والے ہیں۔

۶- آگے کا مضمون - آیات ۳۶-۵۲

آگے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ جو لوگ تمھیں اپنے دیویوں دیوتاؤں سے ڈرا رہے ہیں ان کو بتا دو کہ اس رب کے سوا جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے کوئی بھی مجھے نہ نفع پہنچا سکتا نہ نقصان۔ وہ جو کچھ کر سکتے ہیں، ان سے کہو کہ وہ کر دیکھیں، تم اپنا کام بے خوف و خطر کیے چلے جاؤ۔ تمھارے اوپر صرف تمھارے فرض کی ذمہ داری ہے۔ ان کے کفر و ایمان کی کوئی ذمہ داری تمھارے اوپر نہیں ہے۔ اگر ان لوگوں کو مزعومہ شفاعت پر بھروسہ ہے تو اس کی حقیقت بھی ان پر واضح کر دو اور اگر ان کو اپنی موجودہ دنیوی کامیابیوں کا غرہ ہے تو اس کی بے ثباتی بھی ان کو بتا دو ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے:

آیات ۳۶-۵۲

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ۭ وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَمَنْ
يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (۳۶) وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ۭ

أَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِي انْتِقَامٍ ﴿٣٧﴾ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْأَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ قُلْ أَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ إِنْ
أَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖ أَوْ أَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ
هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿٣٨﴾
قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ إِنِّيْ عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٣٩﴾ مَنْ
يَّأْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٤٠﴾ إِنَّا أَنْزَلْنَا
عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ
فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿٤١﴾ اللّٰهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ ع
حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا
الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرٰى إِلٰى أَجَلٍ مُّسَمًّى إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ
لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿٤٢﴾ أَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَاءَ قُلْ
أَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ﴿٤٣﴾ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ
جَمِيْعًا لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٤٤﴾ وَإِذَا
ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ
وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿٤٥﴾ قُلِ اللّٰهُمَّ
فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ
عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿٤٦﴾ وَلَوْ أَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي
الْأَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَبَدَا
لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۸﴾
فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ۡ ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ
اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ ۭ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۹﴾
قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۵۰﴾
فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۭ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ سَيُصِيْبُهُمْ
سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۱﴾ اَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ
الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ ع ۵

ترجمہ آیات ۳۶-۵۲

کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے! اور یہ تم کو ان سے ڈراتے ہیں جو اس کے سوا انھوں نے بنا رکھے ہیں اور جس کو خدا گمراہ کردے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں بن سکتا اور جس کو خدا ہدایت بخشے تو اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔ کیا اللہ غالب و صاحب انتقام نہیں! ۳۶-۳۷

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو جواب دیں گے کہ اللہ نے، کہو، بھلا بتاؤ یہ چیزیں جن کو تم پوجتے ہو، اگر اللہ نے مجھے کوئی تکلیف پہنچانی چاہی تو یہ اس کی پہنچائی ہوئی تکلیف کو دور کرنے والی بن سکتی ہیں یا اس نے مجھ پر کوئی فضل کرنا چاہا تو کیا یہ اس کو روک لینے والی ہو سکتی ہیں! کہہ دو کہ اللہ میرے لیے کافی ہے اور بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ۳۸

کہہ دو کہ اے میری قوم کے لوگو، تم اپنے طریقہ پر کام کرو، میں اپنے طریقہ پر کام کرتا رہوں گا،

تو تم جلد جان لوگے کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اس کو رسوا کر دیتا ہے اور کس پر وہ عذاب نازل ہوتا ہے جو ٹک کے رہ جاتا ہے! ۳۹-۴۰

اور ہم نے لوگوں کی ہدایت کے لیے تم پر کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے تو جو ہدایت حاصل کرے گا اپنے ہی لیے کرے گا اور جو گمراہ ہو گا تو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر پڑے گا۔ اور تم ان کے اوپر کوئی داروغہ نہیں مقرر کیے گئے ہو۔ ۴۱

اللہ ہی وفات دیتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت اور جن کی موت نہیں آئی ہوتی ہے ان کو بھی ان کی نیند کی حالت میں۔ تو جن کی موت کا فیصلہ کر چکا ہوتا ہے ان کو تو روک لیتا ہے اور دوسروں کو ایک وقتِ مقرر تک کے لیے رہائی دے دیتا ہے۔ بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔ ۴۲

کیا انھوں نے اللہ کے مقابل میں دوسروں کو سفارشی بنا رکھا ہے! کہو، اگرچہ نہ یہ کچھ اختیار رکھتے ہوں اور نہ کچھ سمجھتے ہوں؟ کہہ دو کہ سفارش تمام تر اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور جب صرف اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل کڑھتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر آتا ہے تو یہ خوش ہو جاتے ہیں۔ کہو کہ اے اللہ، آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے، غائب و حاضر کے جاننے والے، تو اپنے بندوں کے درمیان اس چیز کے باب میں فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ ۴۳-۴۶

اور اگر ان لوگوں کے پاس جنھوں نے شرک کیا وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے اور اسی کے برابر اور بھی تو وہ روزِ قیامت کے عذابِ بد سے چھوٹنے کے لیے فدیہ میں دے دینا

چاہیں گے۔ اور اللہ کی طرف سے ان کو وہ معاملہ پیش آئے گا جس کا وہ گمان بھی نہیں رکھتے تھے۔ اور ان کے سامنے آجائیں گے ان کے اعمال کے بُرے نتائج اور گھیر لے گی ان کو وہ چیز جس کا مذاق اڑاتے رہے تھے۔ ۴۷-۴۸

پس جب انسان کو کوئی دکھ پہنچتا ہے تو ہم کو پکارتا ہے پھر جب ہم اُس پر اپنی طرف سے فضل کر دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے میری تدبیر کی بدولت حاصل ہوا۔ بلکہ یہ ایک آزمائش ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ ان سے پہلے والوں نے بھی یہ بات کہی تو ان کی کمائی ان کے کچھ کام آنے والی نہ بنی۔ پس ان کے اعمال کے برے نتائج ان کے سامنے آئے اور ان لوگوں میں سے بھی، جنھوں نے شرک کیا ہے، ان کے سامنے ان کے اعمال کے بُرے نتائج جلد آکے رہیں گے۔ اور یہ ہم کو ہرانے والے نہیں بن سکتے۔ کیا ان لوگوں کو یہ حقیقت معلوم نہیں ہوسکی کہ اللہ ہی ہے جو رزق کو کشادہ کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے۔ بے شک، اس کے اندر بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لانے والے ہیں۔ ۴۹-۵۲

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ ط وَیُخَوِّفُوْنَکَ بِالَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِہٖ ط وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَمَالَہٗ مِنْ ھَادٍ ۝ وَمَنْ یَّھْدِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ مُّضِلٍّ ط اَلَیْسَ اللّٰہُ بِعَزِیْزٍ ذِی انْتِقَامٍ (۳۶-۳۷)

بندے کے لیے اللہ کی حفاظت کافی ہے

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ یہ مشرکین تمھاری دعوتِ توحید پر تم کو اپنے اصنام و آلہہ کے قہر و غضب سے ڈراتے ہیں کہ تم نے ان کی مخالفت جاری رکھی تو وہ کسی مصیبت میں پھنسا دیں گے۔ کیا ان نادانوں کے نزدیک اللہ اپنے بندے کی حفاظت و کفالت کے لیے کافی نہیں ہے کہ ان کے اصنام و آلہہ اس کو خطرے میں ڈال دیں گے! جو بندہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کی حفاظت کے لیے کافی ہے۔ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی چیز بھی اس کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتی۔ اگر کوئی اس اندیشہ

میں مبتلا ہے کہ کوئی چیز اس کو اللہ تعالیٰ کے علی الرغم نقصان پہنچا سکتی ہے تو وہ خدا کو اپنی حفاظت و کفالت کے لیے کافی نہیں سمجھتا اور یہ چیز بالبداہت کفر و شرک ہے۔

'وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ .... الآیۃ' یہ ان شرک پرستوں کی اس جہالت پر ملامت ہے کہ یہ لوگ جو ایسی سفاہت کی باتیں کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی شامتِ اعمال کے سبب سے ان پر خدا کی مار پڑ چکی ہے۔ یہ اللہ کے قانون کی زد میں آئے ہوئے لوگ ہیں اس وجہ سے اللہ نے ان کو گمراہ کر دیا ہے اور جن کو خدا نے گمراہ کر دیا، ان کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں بن سکتا۔ یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں۔ اس کا حوالہ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے پہلو سے دیا گیا ہے کہ ایسے سرپھرے لوگوں کی باتوں کی پروا نہ کرو۔ ایسے لوگوں کو راہِ راست پر لانے والا کوئی بھی نہیں بن سکتا۔

'اَلَیْسَ اللّٰهُ بِعَزِیْزٍ ذِی انْتِقَامٍ' یعنی اگر خدا اپنے بندوں کے لیے کافی نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ 'عزیز' نہیں ہے حالانکہ وہ 'عزیز' ہے اس لیے کہ جو 'عزیز' نہیں ہے وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ ساتھ ہی وہ 'ذی انتقام' بھی ہے۔ یعنی نہ وہ اپنے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے والوں کو چھوڑنے والا ہے اور نہ اپنے بندوں پر تعدی کرنے والوں کو معاف کرنے والا ہے۔ بلکہ وہ ایک ایک چیز کا بدلہ لینے والا ہے۔ اس بات کو سوالیہ اسلوب میں اس لیے پیش کیا ہے کہ یہ صفتیں خدا کی بالکل بدیہی صفتیں ہیں۔ ان کے بغیر خدا کا تصور نہیں کیا جا سکتا تو جب خدا عزیز و مقتدر بھی ہے اور صاحبِ عدل و انتقام بھی تو اس کے بندوں کو اس پر پورا بھروسہ رکھنا چاہیے، وہ ہر خطرے سے ان کی حفاظت کرے گا۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۭ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ۭ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۭ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ (۳۸)

مشرکین کا تضادِ فکر

یعنی یہ لوگ تضادِ فکر میں مبتلا ہیں۔ ایک طرف تو ان کا حال یہ ہے کہ ان سے سوال کرو کہ آسمانوں اور زمین کا خالق کون ہے تو اس کا جواب دیں گے کہ اللہ! دوسری طرف یہ اللہ کے سوا دوسروں کو اللہ کی خدائی میں شریک بنائے بیٹھے ہیں اور ان سے تم کو بھی ڈرا رہے ہیں۔ گویا اُن کے خیال میں خدا خالق تو ہے لیکن اپنی پیدا کی ہوئی دنیا کا مالک اور اس میں متصرف نہیں ہے۔ ان نادانوں سے پوچھو کہ خدا مجھے کوئی گزند پہنچانا چاہے تو کیا تمہارے یہ فرضی دیوی دیوتا مجھے اس سے بچا لیں گے؟ اسی طرح اگر وہ مجھے اپنے کسی فضل سے نوازنا چاہے تو کیا تمہاری اینٹ پتھر کی یہ مورتیاں اس کا ہاتھ پکڑ لیں گی؟ لفظ 'اَفَرَءَیْتُمْ' پر دوسری جگہ ہم بحث کر چکے ہیں کہ اس سیاق و سباق میں جب یہ آتا ہے تو تحقیر اور

اظہارِ تعجب کے لیے آتا ہے۔

قُلْ حَسْبِیَ اللّٰہُ ط عَلَیْہِ یَتَوَکَّلُ الْمُتَوَکِّلُوْنَ۔ فرمایا کہ ان نادانوں کو بتا دو کہ میرے لیے اللہ کافی ہے۔ نہ اس کے سوا مجھے کسی کا ڈر ہے نہ اس کے سوا مجھے کسی سے امید ہے۔ میری ہر ضرورت کا وہی کفیل ہے اس وجہ سے میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں جو اس کی جگہ دوسروں پر بھروسہ کرتے ہیں ان کی امیدوں کی ساری عمارت ریت پر قائم ہے۔

قُلْ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ج فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ لا مَنْ یَّاْتِیْہِ عَذَابٌ یُّخْزِیْہِ وَیَحِلُّ عَلَیْہِ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ (۳۹-۴۰)

'اِنِّیْ عَامِلٌ' کے بعد 'عَلٰی مَکَانَتِیْ' کے الفاظ تکرار سے بچنے کے لیے حذف کر دیے گئے ہیں۔

مشرکین سے براءت کا اعلان

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلانِ براءت کرایا ہے کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم لوگ میری بات سننے کے لیے تیار نہیں ہو تو تم اپنی جگہ اور اپنے طریقہ پر کام کرو، میں اپنے طریقہ پر کام کرتا رہوں گا، تم عنقریب دیکھ لو گے کن پر وہ عذاب آتا ہے جو ان کو رسوا کر کے رکھ دیتا ہے اور کن پر وہ قہر نازل ہوتا ہے جو ٹک کے رہ جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنی روش سے باز آنے والے نہیں ہو تو میں بھی اپنی دعوت سے باز آنے والا نہیں ہوں۔ اب مستقبل فیصلہ کرے گا کہ کون رسوا ہوتا ہے اور کون سرفراز؛ کون ہمیشہ کے لیے پامال ہوتا ہے اور کس کو اللہ برقرار رکھتا ہے! رسوا کرنے والے عذاب کا ذکر مخالفین کے استکبار کے پہلو سے ہے اور 'عَذَابٌ مُّقِیْمٌ' سے مراد وہ عذاب ہے جو قوم پر نازل ہوتا ہے تو گویا وہیں ڈیرے ڈال دیتا اور اس کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ کے رکھ دیتا ہے۔ ہم دوسرے مقام میں ذکر کر چکے ہیں کہ قوموں پر دو قسم کے عذاب آتے ہیں۔ ایک تو وہ عذاب جو محض تنبیہ و تذکیر کے لیے آتا ہے۔ اس طرح کا عذاب ایک جھونکے کی طرح آتا ہے اور تنبیہ کر کے گزر جاتا ہے۔ دوسرا عذاب وہ ہوتا ہے جو قوم کی ہستی ہی فنا کر دیتا ہے۔ رسول کی طرف سے اتمامِ حجت کے بعد اس کی قوم پر جو عذاب آتا ہے اس کی نوعیت یہی ہوتی ہے اس وجہ سے اس کے لیے 'عذابِ مقیم' کے الفاظ استعمال ہوئے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ج فَمَنِ اهْتَدٰی فَلِنَفْسِہٖ ج وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا ج وَمَآ اَنْتَ عَلَیْہِمْ بِوَکِیْلٍ (۴۱)

رسول پر ذمہ داری صرف اتمامِ حجت کی ہے

اعلانِ براءت کرانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ تمھارے اوپر جو ذمہ داری تھی وہ تم نے ادا کر دی اب ان کا غم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ فرمایا، ہم نے لوگوں کی ہدایت کے لیے تمھارے اوپر کتاب اتاری، حق کے ساتھ۔ یعنی اس کتاب کے ذریعے سے ہم نے دین کے معاملے میں حق و باطل کو بالکل ممیز کر دیا۔ اب جو لوگ اس کو قبول کریں گے وہ اپنی دنیا اور عاقبت سنواریں گے اور جو اس کی تکذیب کریں گے وہ خود اپنے آپ کو گمراہیوں میں مبتلا کریں گے تمھارا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ تمھارے اوپر ذمہ داری

صرف ان کو اس حق کی دعوت دینے کی تھی، یہ ذمہ داری نہیں تھی کہ تم ان کو لازماً ایمان و اسلام کے راستہ پر لا کھڑا کرو۔ تم اپنے فرض سے سبکدوش ہوئے۔ اب ذمہ داری ان کی ہے۔ اس وجہ سے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۴۲)

'وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ' کے بعد لفظ 'يَتَوَفّٰهَا' بربنائے قرینہ محذوف ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اس کو کھول دیا ہے۔

اوپر کے حقائق کے ثبوت میں بعض نشانیوں کی طرف اشارہ

یعنی انسان کی زندگی اور موت تمام تر اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ جس کی اجل مقرر پوری ہو جاتی ہے اللہ ہی اس کی روح قبض کرتا ہے اور جس کی موت نہیں آئی ہوتی ہے اس کو بھی وہ ہر روز موت اور مرنے کے بعد اٹھائے جانے کا مشاہدہ کراتا رہتا ہے۔ شب میں جب وہ سوتا ہے تو یہ گویا اللہ تعالیٰ اس کو موت کا مشاہدہ کراتا ہے اور صبح کو جب وہ اٹھ بیٹھتا ہے تو یہ اس کو بعث و نشر کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔ اس طرح گویا ہر شخص کو ہر روز یہ دکھایا جا رہا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو زندگیِ جاوید نہ سمجھے بلکہ یہ حقیقت پیشِ نظر رکھے کہ خدا نے ایک وقتِ معین تک کے لیے اس کو مہلت دی ہے۔ اس کی جان ہر وقت خدا کی مٹھی میں ہے، وہ جب چاہے اس کو قبض کر سکتا ہے۔

'اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ'۔ فرمایا کہ اس میں غور کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ اس میں پہلی نشانی تو اس بات کی ہے کہ جس طرح خلق و تدبیر تمام تر اللہ ہی کے اختیار میں ہے اسی طرح زندگی اور موت بھی تمام تر اسی کے اختیار میں ہے۔ پھر اس سے یہ بات بھی نکلی کہ جب موت اور زندگی کے معاملے میں کسی اور کا کوئی دخل نہیں ہے تو مرنے کے بعد کوئی اور کس طرح مولیٰ و مرجع بن جائے گا؟ اس وجہ سے بھروسہ کے لائق ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اسی پر بھروسہ کرنے والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے۔

دوسری نشانی اس میں یہ ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھایا جانا ذرا بھی مستبعد نہیں ہے۔ اس دنیا میں ہر روز موت اور موت کے بعد اٹھنے کا ریہرسل ہر شخص کے سامنے ہو رہا ہے بشرطیکہ آدمی اس کو دیکھنے کے لیے دیدۂ بینا رکھتا ہو۔ صبح کو سو کر اٹھنے کے بعد مومن یہ دعا جو پڑھتا ہے کہ 'اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ' یہ اس کی اسی عبرت نگاہی کی تعبیر ہے۔

تیسری نشانی اس میں یہ ہے کہ یہ کائنات اپنے وجود میں ان تمام حقائق کی تعلیم کے لیے ایک بہترین تربیت گاہ ہے جن پر انسانی زندگی کی صلاح و فلاح کا انحصار ہے اور جن کی قرآن دعوت دے رہا ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ (۴۳)

مشرکین کی حماقت پر تعجب

یہ سوال استعجاب و ملامت کی نوعیت کا ہے کہ کیا ان نادان لوگوں نے، ان تمام واضح حقائق کے باوجود، اللہ کے مقابل میں اپنے لیے سفارشی بنا لیے ہیں کہ اگر خدا نے ان پر ہاتھ ڈالا تو وہ ان کو اس کی پکڑ سے بچا لیں گے! فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ اگرچہ نہ وہ کسی چیز پر کوئی اختیار رکھتے ہوں اور نہ کسی بات کا ان کو علم و شعور ہو جب بھی ان کو امید ہے کہ وہ خدا کے حضور ان کے سفارشی بنیں گے! مطلب یہ ہے کہ جہاں تک اختیار کا تعلق ہے وہ تو اللہ کے سوا کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ رہا علم و شعور تو اس اعتبار سے بھی کسی کا یہ درجہ نہیں کہ وہ کسی کے باب میں اللہ تعالیٰ کے علم میں کوئی اضافہ کر سکے۔ بالخصوص یہ مورتیاں جن کی سفارش پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں، ان کی تو کوئی حقیقت ہی نہیں ہے چہ جائیکہ یہ کسی چیز کا علم و شعور رکھتی ہوں۔

قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ۭ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۴۴)

شفاعت کے باب میں قیود و شرائط

فرمایا کہ ان نادانوں کو بتا دو کہ شفاعت تمام تر اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ اس کے حضور میں کوئی اس کے اذن کے بدون کسی کی سفارش کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ اذن کے بعد جو زبان کھولے گا وہ صرف اس کے لیے زبان کھولے گا جس کے لیے اس کو اجازت دی گئی ہے۔ پھر وہ وہی بات کہے گا جو بالکل حق ہو گی۔ خدا کے آگے کوئی غلط بات کہنے کی کسی کے لیے گنجائش نہیں ہو گی۔ سفارش کے لیے یہ تمام قیدیں اور شرطیں نہایت تفصیل سے خود قرآن میں بیان ہوئی ہیں اور ان کی وضاحت ان کے محل میں ہم کرتے آ رہے ہیں۔ وہی حقیقت جامع الفاظ میں یہاں واضح فرمائی گئی ہے کہ شفاعت تمام تر اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ جو لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ، خواہ ان کے اعمال کچھ ہی ہوں، ان کے معبود ان کو بہرحال خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے، وہ اپنی اس طمع خام کا انجام قیامت کے دن دیکھیں گے۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ: یعنی آسمانوں اور زمین کی بادشاہی خدا ہی کے اختیار میں ہے اور سب کی پیشی اسی کے حضور ہونی ہے۔ نہ اس بادشاہی میں کسی اور کا سر مو دخل ہے اور نہ کوئی دوسرا مولیٰ و مرجع بننے والا ہے۔

وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (۴۵)

شفاعت باطل کا عقیدہ آخرت کی بازپرس سے فرار کے لیے ایک چور دروازہ ہے

یہ شرک و شفاعت کے وجود میں آنے کے ایک بہت بڑے سبب کی طرف اشارہ ہے کہ چونکہ آخرت خدا کے عدلِ کامل اور جزا و سزا کے ظہور کا دن ہے اور اس کے ماننے سے انسان پر نہایت بھاری ذمہ داریاں عاید ہو جاتی ہیں اس وجہ سے جو لوگ ان ذمہ داریوں سے گریز اختیار کرنا چاہتے ہیں وہ شرک و شفاعت کی آڑ لیتے ہیں۔ وہ ایمان و عمل کے تقاضے پورے کرنے کا نہ حوصلہ رکھتے اور نہ اپنے نفس کی خواہشوں پر کوئی پابندی ہی قبول کرنے کے لیے تیار ہیں اس وجہ سے اول تو وہ آخرت کو مانتے ہی نہیں اور اگر مانتے بھی ہیں تو شرک و شفاعت کا عقیدہ ایجاد کر کے اس کے تمام خطرات

سے، اپنے زعم کے مطابق، وہ اپنے آپ کو محفوظ کر لیتے ہیں۔ ان لوگوں کا سارا اعتماد اپنے مزعومہ شفعاء کی شفاعت پر ہوتا ہے اس وجہ سے اگر ان کے سامنے توحید کا ذکر آئے تو ان کے دل بھنچنے لگتے ہیں اس لیے کہ پھر آخرت ان کے سامنے اپنی پوری ہولناکی کے ساتھ آن کھڑی ہوتی ہے۔ البتہ جب ان کے مزعومہ شرکاء و شفعاء کا ذکر ہو تب وہ اطمینان کا سانس لیتے ہیں اس لیے کہ اس صورت میں ان کو آخرت سے بے قید زندگی گزارنے کا لائسنس مل جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شفاعتِ باطل کا عقیدہ درحقیقت آخرت کی ذمہ داریوں سے گریز کے لیے ایک چور دروازہ ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۴۶)

نبی صلعم کو منکرینِ آخرت سے اعراض اور آخرت کی تیاری کی تلقین

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دعا تلقین فرمائی گئی ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اب ان لوگوں کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ یہ لوگ ایک خیالی جنت بنا کر اس میں جو لذیذ خواب دیکھ رہے ہیں اس سے نکلنے اور حقیقت کا مواجہہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ اسی میں جئیں اور اسی میں مریں گے۔ البتہ تم دعا کرو کہ اے آسمانوں اور زمین کو عدم سے وجود میں لانے والے اور غائب و حاضر کے جاننے والے تو ایک دن ان تمام اختلافات کا فیصلہ فرمائے گا جن میں تیرے بندے اختلاف کر رہے ہیں۔ یعنی ایک ایسا دن تو ضرور لائے گا جس میں تیرے کامل عدل کا ظہور ہوگا۔ چونکہ اسی عدلِ کامل کے ظہور پر اس دنیا کے باغایت ہونے کا انحصار ہے اور اسی کے ظہور سے خدا کا ایک عادل اور حکیم خدا ہونا ثابت ہوگا اس وجہ سے اس کے لیے دعا کی تلقین فرمائی گئی۔

وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ (۴۷)

مشرکین کو ایک اہم تنبیہ

یعنی ان مشرکوں نے اس دنیا کے عشق میں آخرت سے گریز کے لیے یہ چور دروازے پیدا کیے ہیں حالانکہ جب قیامت کے دن کے ہولناک عذاب سے سابقہ پیش آئے گا تو اس وقت ان کا یہ حال ہوگا کہ زمین کے اندر جو کچھ ہے اگر وہ سب ان کو حاصل ہو جائے اور اسی کے برابر اور بھی تو وہ اس عذاب سے چھوٹنے کے لیے فدیہ میں دے چھوڑیں۔

وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ۔ انسان اول تو اپنی خواہشوں کو الاؤنس دینے ہی میں بڑا فیاض ہوتا ہے۔ پھر وہ اس دنیا میں دیکھتا ہے کہ برابر وہ بڑے سے بڑا جرم کرتا چلا جاتا ہے لیکن اس کی کوئی پکڑ نہیں ہوتی اس وجہ سے وہ آخرت کی فکر ہی سے بالکل بے پروا ہو جاتا ہے اور اگر کبھی کوئی اس کو اس کی طرف توجہ دلائے اور خدا کے عدل و انتقام کے تقاضے سمجھانے کی کوشش کرے تو وہ اس کو محض ملّاؤں کی خلاقی پر محمول کرتا اور یہ گمان کرتا ہے کہ اگر آخرت ہے بھی تو بھلا ہم جیسے لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ اس طرح

کا معاملہ کیسے کر سکتا ہے جس سے یہ قرآن ہمیں ڈراتا ہے! یہ ایک عام فتنہ ہے جس میں لوگوں کی اکثریت مبتلا ہے۔ اسی طرح کے لوگوں کو متنبہ کرنے کے لیے فرمایا کہ جب وہ روزِ حساب آئے گا تو اس طرح کے لذیذ خواب دیکھنے والوں کے لیے اللہ کی طرف سے وہ باتیں ظاہر ہوں گی جن کا وہ آج تصور بھی نہیں کر سکتے۔ آج وہ اس کی کرمی سے دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں لیکن جب وہ اس کے عدل و انتقام کی شان دیکھیں گے تب ان کی آنکھیں کھلیں گی اور انھیں نظر آئے گا کہ خدا جتنا بڑا کریم ہے اتنا ہی بڑا عادل اور منتقم و قہار بھی ہے۔

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۴۸)

ایک اور اہم تنبیہ

اسی طرح انسان پر اس کے بُرے اعمال کے نتائج کی سنگینی بھی اس دنیا میں اس کے سامنے واضح نہیں ہوتی۔ وہ یہ اندازہ یہاں نہیں کر پاتا کہ اس نے فلاں عملِ بد یا فکرِ بد کی جو فصل بوئی تھی وہ کس رنگ میں اُگی اور کس نوع کے اور کتنے زہریلے برگ و بار لائی۔ آخرت میں اس کے تمام افکار و اعمال کے نتائج اپنی اصلی شکل و صورت میں اس کے سامنے آ جائیں گے اور وہ دیکھ لے گا کہ جن چیزوں کو اس نے حقیر سمجھا اور ان کا مذاق اڑایا آج وہ پوری طرح ان کے گھیرے میں آ گیا۔

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَاۤ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۴۹)

ایک مہلک مغالطہ

اسی سورہ کی آیت ۸ کے تحت اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ انسان کی یہ عجیب کمزوری ہے کہ جب اس کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تب تو وہ خدا سے فریاد کرتا ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت دور کر کے اس کو اپنی نعمت سے نوازتا ہے تو وہ خدا اور اپنی مصیبت دونوں کو بھول جاتا ہے اور اس نعمت کو یا تو دوسروں کی طرف منسوب کرتا ہے کہ فلاں اور فلاں کی برکت اور بخشش سے یہ چیز مجھے حاصل ہوئی جیسا کہ آیت ۸ میں ذکر ہے، یا اس کو اپنی تدبیر اور اپنی حکمت و سائنس کا کرشمہ قرار دیتا ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے یعنی وہ اس نعمت کا منبع یا تو خدا کے سوا دوسروں کو قرار دیتا ہے یا اپنی ذات کو۔ اور یہ دونوں ہی صورتیں شرک کی ہیں اس لیے کہ بندے کو جو نعمت بھی حاصل ہوتی ہے خدا ہی سے حاصل ہوتی ہے دوسروں کی حیثیت اس میں ایک ذریعہ اور واسطہ سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ اس کی سائنس اور قابلیت بھی اللہ ہی کا عطیہ ہے اور اگر وہ کسی کامیابی کا ذریعہ بنتی ہے تو خدا ہی کی رہنمائی سے بنتی ہے
'بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ' یعنی کوئی نعمت بھی کسی کو نہ غیر اللہ سے ملتی اور نہ وہ اس کے علم و قابلیت اور اس کے استحقاق کا نتیجہ ہوتی بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہے اور اس کے ذریعے سے وہ بندے کا امتحان کرتا ہے کہ وہ اپنے رب کا شکر گزار رہتا ہے یا اس کو پا کر استکبار و طغیان میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لیکن لوگوں کی اکثریت اس حقیقت سے نا آشنا ہوتی ہے اور یہ چیز ان کو شرک اور فساد

میں مبتلا کردیتی ہے۔ سورۂ قصص میں قارون کا جو کردار بیان ہوا ہے اس میں یہ حقیقت نہایت واضح الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ
فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ
مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ
أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ
لَا تَفْرَحْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ
الْفَرِحِينَ ۝ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ
اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ ۖ وَلَا تَنسَ
نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا ۖ وَأَحْسِن
كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۖ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ
فِي الْأَرْضِ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ۝
قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي ۚ
أَوَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ قَدْ أَهْلَكَ مِن
قَبْلِهِ مِنَ الْقُرُونِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ
قُوَّةً وَأَكْثَرُ جَمْعًا ۚ (القصص: ۷۶-۷۸)

قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا تو اس نے ان کے
مقابل میں سرکشی کی۔ اور ہم نے اس کو اتنے خزانے
دیے تھے کہ ان کی کنجیاں ایک طاقتور پارٹی سے اٹھتی
تھیں۔ اس وقت کو یاد کرو جب اس کی قوم نے اس
سے کہا کہ اترا مت، اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا،
اور جو کچھ خدا نے تجھے دیا ہے اس میں دار آخرت کا طالب
بن اور دنیا میں سے اپنا حصہ نہ بھول اور اللہ نے جس
طرح تم پر احسان فرمایا ہے تم بھی لوگوں پر احسان کرو
اور زمین میں فساد کے طالب نہ بنو۔ اللہ فساد برپا کرنے
والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اس نے جواب دیا کہ یہ دولت
تو مجھے میرے علم کی بدولت حاصل ہوئی ہے۔ کیا اس
کو نہیں معلوم کہ اس سے پہلے ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک
کر چھوڑیں جو قوت میں اس سے بڑھ چڑھ کر اور
جمعیت میں اس سے زیادہ تھیں!

قَدْ قَالَهَا الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۵۰)

یعنی یہی بات ان سے پہلے والوں نے بھی کہی۔ اشارہ ﴿إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ﴾ والی بات کی طرف ہے کہ قریش کے ان متمردین سے پہلے بھی یہ دعوے کرنے والے گزر چکے ہیں جن میں سے ایک مدعی —— قارون —— کے قول کا حوالہ اوپر گزرا۔ فرمایا کہ اس غرور میں جو بھی مبتلا ہوئے جب وہ خدا کی پکڑ میں آگئے تو وہ چیزیں ان کے کچھ بھی کام آنے والی نہیں بن سکیں جو بزعم خویش انھوں نے اپنی قابلیت اور سائنس کے ذریعہ سے حاصل کی تھیں۔ چنانچہ قارون کی مثال خود قرآن میں بیان ہوئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو تجارت اور مالیات کا بڑا ماہر سمجھتا تھا لیکن خدا نے اس کا سارا خزانہ اس کے سمیت زمین میں دھنسا دیا اور اس وقت اس کی کوئی تدبیر اس کے کچھ کام نہ آسکی۔

فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا ۚ وَالَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ هَٰؤُلَاءِ سَيُصِيبُهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا
وَمَا هُم بِمُعْجِزِينَ (۵۱)

یعنی جو لوگ اس قسم کے خبط میں مبتلا ہوئے بالآخر ان کے اعمال کے برے نتائج ان کے سامنے آئے۔

فرمایا کہ ان لوگوں یعنی قریش کے لوگوں میں سے بھی جن لوگوں نے اس ظلم کا ارتکاب کیا ہے ان کے آگے بھی ان کے بُرے اعمال اور ان کی بری کمائی کے نتائج آ کے رہیں گے اور جب ہم ان کو پکڑیں گے تو وہ ہمارے قابو سے باہر نہ نکل سکیں گے۔

اَوَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۵۲)

رزق و فضل اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے

بعینہٖ یہی مضمون سورۂ روم آیت ۳۷ میں بھی گزر چکا ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ وہاں 'اَلَمْ یَرَوْا' کے الفاظ ہیں اور یہاں 'اَوَلَمْ یَعْلَمُوْا' ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص آنکھیں رکھنے والا اور عقل سے کام لینے والا ہو تو اس امر میں اس کے لیے کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے کہ رزق و فضل کا تعلق انسان کے علم و اختیار سے نہیں بلکہ تمام تر اللہ تعالیٰ کی مشیت و حکمت سے ہے۔ وہی جس کو چاہتا ہے زیادہ دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے۔ کتنے ہیں جو بغیر سعی و تدبیر کے چاندی کا چمچہ منہ میں لے کر اس دنیا میں پیدا ہوتے ہیں اور کتنے ہیں جو رات دن دنیا ہی کی فکر میں سر کھپاتے ہیں اور دنیا کمانے کا علم بھی رکھتے ہیں لیکن پاتے اتنا ہی ہیں جتنا اللہ نے ان کی تقدیر میں لکھ رکھا ہے۔ یہ مشاہدہ بھی آئے دن اس دنیا میں ہوتا رہتا ہے کہ ایک شخص آج کروڑپتی یا ارب پتی بلکہ تخت و تاج کا مالک ہے اور دوسرے دن وہ بالکل دیوالیہ یا کسی جیل کی کوٹھڑی میں بند ہے۔ ان کھلے ہوئے مشاہدات کے باوجود اگر کوئی شخص اپنے مال و جاہ کے متعلق 'اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ' کے گھمنڈ میں مبتلا ہو تو یہ ماننا پڑے گا کہ اس کی عقل میں کچھ فتور ہے۔

'اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ' یعنی رزق و فضل کے معاملہ میں اس بسط و تقدیر کا جو مشاہدہ کرتا ہے اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی صفات سے متعلق بہت سی حقیقتیں سامنے آتی ہیں۔ مثلاً

یہ کہ اس کائنات کی بادشاہی خدا ہی کے اختیار میں ہے سو ہی جس کو چاہے بخشتا ہے جس سے چاہے چھین لیتا ہے۔ کسی اور کی اس میں کوئی حصہ داری نہیں ہے اس وجہ سے بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ ہی پر کرنا چاہیے۔

یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ہر کام اس کی رحمت اور حکمت کے تحت ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی کو اس دنیا میں سے زیادہ دیتا ہے تو اس میں بھی اس کی حکمت ہوتی ہے اگر کم دیتا ہے تو اس میں بھی اس کی حکمت ہوتی ہے۔ وہ ایک کو زیادہ دے کر اس کے شکر کو جانچتا ہے اور دوسرے کو کم دے کر اس کے صبر کا امتحان کرتا ہے اور یہ فیصلہ قیامت کو ہو گا کہ ان میں سے کون کامیاب رہا اور کون نامراد ہوا۔

یہ کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے دار الانعام نہیں ہے۔ اس میں ہر شخص کا امتحان ہو رہا ہے اور اس امتحان کے نتائج کے ظہور کے لیے قیامت کا آنا لازمی ہے۔

'لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ' میں فعل میرے نزدیک 'ارادۂ فعل' کے مفہوم میں ہے جس کی بہت سی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کو اس دنیا میں گمراہی جو پیش آتی ہے اس میں زیادہ دخل

اس بات کو نہیں ہے کہ حقائق مخفی ہیں بلکہ بیشتر یہ ہوتا ہے کہ حقائق واضح ہوتے ہیں لیکن انسان ان کو قبول کرنے کے لیے ارادہ نہیں کرتا۔ اس کے متعدد وجوہ ہوتے ہیں جن کی تفصیل اس کے محل میں گزر چکی ہے۔

۸۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۵۳۔ ۶۳

آگے مشرکین کو دعوت دی ہے کہ تم نے خدا سے بدگمان اور مایوس ہو کر شرک و شفاعت کے جو چور دروازے پیدا کیے ہیں، یہ تمھاری نجات کی راہ نہیں کھولیں گے بلکہ تمھاری نامرادی میں اضافہ کا سبب ہوں گے فلاح کی راہ یہ ہے کہ صدقِ دل کے ساتھ اپنے رب کی طرف متوجہ ہو اور اس بہترین کتاب کی پیروی کرو جو اللہ نے تمھاری ہدایت کے لیے اتاری ہے ورنہ یاد رکھو کہ جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ تم اپنی نالائقی پر سر پیٹو گے لیکن اس وقت تمھارا پچھتانا تمھارے لیے کچھ سود مند نہیں ہو گا۔ آیات کی تلاوت کیجیے۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ آیات ۵۳-۶۳
اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾ وَاَنِيْبُوْٓا
اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا
تُنْصَرُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ
يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى
عَلٰي مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلَ
لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۵۷﴾ اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى
الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ بَلٰى قَدْ جَاۗءَتْكَ
اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۹﴾ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ
تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَي اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ۭ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى
لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۶۰﴾ وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۡ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْۗءُ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۱﴾ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۡ وَّهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۶۲﴾

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ
هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۳﴾ ع ۱۱ / ۴

ترجمۂ آیات ۵۳-۶۳

کہہ دو، اے میرے بندو، جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ تمام گناہوں کو بخش دے گا، وہ بڑا ہی غفور رحیم ہے۔ اور رجوع کرو اپنے رب کی طرف اور اس کے مطیع بن جاؤ قبل اس کے کہ تم پر عذاب آ دھمکے، پھر تمھاری کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ ۵۳-۵۴

اور پیروی کرو اس بہترین چیز کی جو تمھاری طرف تمھارے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے، قبل اس کے کہ تم پر اچانک عذاب آپڑے اور تم کو اس کی خبر بھی نہ ہو۔ مبادا کوئی کہے کہ ہائے افسوس، میری اس کوتاہی پر جو اللہ کے باب میں مجھ سے صادر ہوئی! اور بے شک میں مذاق اڑانے والوں ہی میں سے بنا رہا! یا کوئی یہ کہے کہ اگر اللہ مجھے ہدایت دیتا تو میں بھی ڈرنے والوں میں سے ہوتا۔ یا کوئی کہے جب کہ عذاب کو دیکھے کہ کاش مجھے دنیا میں پھر جانا ہو کہ میں خوب کاروں میں سے بن جاؤں! — ہاں، تمھارے پاس میری آیتیں آئیں پر تم نے ان کو جھٹلایا اور تکبر کیا اور کافروں میں سے بنے رہے! ۵۵-۵۹

اور تم قیامت کے دن ان لوگوں کو جنھوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا دیکھو گے کہ ان کے چہرے سیاہ ہیں۔ کیا ان متکبرین کا ٹھکانا جہنم میں نہ ہوگا! اور اللہ نجات دے گا ان لوگوں کو جو ڈرتے رہے ان کے مامن میں۔ نہ ان کو کوئی گزند پہنچے گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہر چیز پر نگہبان ہے۔ اسی کے قبضہ میں آسمانوں اور زمین کی کنجیاں ہیں اور جنھوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا وہی لوگ گھاٹے میں پڑنے

والے ہیں۔ ۶۰ - ۶۳

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۵۳)

مشرکین کے ایک وہم کا ازالہ

شرک و شفاعت کے عوامل میں سے ایک بڑا عامل خدا سے مایوسی یا بدگمانی بھی ہے۔ اس مایوسی و بدگمانی کے متعدد پہلو ہیں جن کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے۔ از انجملہ یہ بھی ہے کہ مشرک کو خدا کی رحمت و مغفرت پر بھروسہ نہیں ہوتا اس وجہ سے وہ اپنے تصور کے مطابق خدا کے کچھ فرضی مقربین تراشتا ہے اور ان کی عبادت کر کے یہ امید رکھتا ہے کہ وہ خدا کے ہاں اس کے سفارشی بن کر اس کی مغفرت کرا دیں گے۔ اس وہم میں جو لوگ مبتلا ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے یہ پیغام دلوایا کہ ان سے کہو کہ اے میرے بندو، جنھوں نے اپنی جانوں پر گناہ یا شرک کر کے زیادتی کی ہے خدا کی رحمت سے مایوس ہو کر تم دوسروں کا سہارا نہ پکڑو اور اسی سے مغفرت کے طالب بنو، اللہ بڑا ہی غفور رحیم ہے۔ اس کے جو بندے اس کی طرف اخلاص کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں وہ ان کے ہر قسم کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔

اس آیت کا لب و لہجہ دلیل ہے کہ مخاطب وہ لوگ ہیں جو فی الواقع اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ نہ ہر شخص خدا تک رسائی کا اہل ہوتا اور نہ ہر شخص کی بات کو خدا لائق التفات سمجھتا۔ اس غلط فہمی کے سبب سے وہ دوسرے وسائل و وسائط کا سہارا لیتے ہیں حالانکہ خدا کے متعلق اس قسم کا خیال اس سے مایوسی اور بدگمانی کے ہم معنی ہے جو کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے۔

وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (۵۴)

اللہ تعالیٰ کی رحمت کے طالبوں کے لیے صحیح راستہ

یہ اس طریقہ کی طرف رہنمائی فرمائی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کے طالبوں کو اختیار کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ دوسرے مزعومہ وسائط و وسائل سے کٹ کر اپنے رب کی طرف رجوع کرو، گناہوں سے توبہ کر کے اس کی رحمت و مغفرت کے طالب بنو اور خدا کے عذاب کے ظہور سے پہلے بالکلیہ اپنے آپ کو اپنے رب کے حوالے کر دو۔ یعنی عبادت اور اطاعت دونوں بلا شرکت غیرے اسی کی کرو۔

'مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ' سے عذاب آخرت بھی مراد ہو سکتا ہے لیکن یہاں قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عذاب کی طرف اشارہ ہے جو رسول کے اتمام حجت کے بعد اس کے مکذبین پر لازماً

آتا ہے۔ اس عذاب کے ظہور کے بعد نہ کسی کے لیے ایمان ہی کی گنجائش باقی رہ جاتی اور نہ ایسے لوگوں کی کسی کی طرف سے کوئی مدد ہی ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ اس عذاب کے متمنی اور طالب نہ بنو، بلکہ اپنی بھلائی چاہتے ہو تو اس سے پہلے پہلے توبہ اور اصلاح کی فکر کرو۔

وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (۵۵)

قرآن میں اتمامِ حجت کے پہلو

یہ اسی اوپر والے مضمون کی وضاحت ہے کہ تمھارے لیے صحیح راہ یہ ہے کہ تمھارے رب کی طرف سے جو بہترین چیز تمھاری طرف اتاری گئی ہے اس کی پیروی کرو۔ 'بہترین چیز' سے مراد ظاہر ہے کہ قرآن مجید ہے جس کے 'احسن الحدیث' ہونے کا ذکر آیت ۲۳ میں گزر چکا ہے۔ دوسرے آسمانی صحیفوں کے مقابل میں قرآن کو جو فضیلت حاصل ہے اس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ مثلاً یہ کہ

قرآن خدا کی آخری اور کامل کتاب ہے۔

یہ تحریف کے تمام شوائب سے محفوظ ہے۔

یہ دینِ فطرت کا داعی ہے اس وجہ سے پچھلی شریعتوں کے تشددات سے پاک ہے۔

خاص عربوں کے نقطۂ نظر سے بھی اس کے چند پہلو قابلِ لحاظ ہیں۔ مثلاً

یہ نہایت فصیح و بلیغ عربی میں ہے جس کی نظیر پیش کرنے سے دوسرے قاصر ہیں اور یہ اہلِ عرب پر اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان ہے کہ اس نے اپنی آخری کتاب عربی میں اتاری۔

'یہ کتاب متشابہ' اور 'سبعِ مثانی' کی صورت میں نازل ہوا ہے جس سے اس کی افادیت دوسرے صحیفوں کے مقابل میں دہ چند ہو گئی ہے۔ (وضاحت اس کی پیچھے ہو چکی ہے)۔

یہ عربوں کے جدِ اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کا داعی ہے اس وجہ سے اس کی دعوت اہلِ عرب کے لیے ایک مانوس چیز ہے۔

فرمایا کہ ان تمام خوبیوں کا تقاضا ہے کہ تم اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لو اور اس کو حرزِ جاں بناؤ۔ اگر تم نے اس کی قدر نہ کی تو یاد رکھو کہ اس کی تکذیب کی صورت میں تم پر ایک ایسا عذاب آ دھمکے گا جس کا تم کو گمان بھی نہ ہوگا۔

اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ (۵۶)

'اَنْ' سے پہلے مضاف یہاں محذوف ہے، اس کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے یہ سارا اہتمام اس لیے فرمایا ہے کہ مبادا محاسبہ کا وقت آ جائے اور جو لوگ غافل ہیں ان کو پچھتانا پڑے کہ ان سے خدا کے باب میں بڑی کوتاہی ہوئی کہ دنیا کی خود فراموشیوں میں گم ہو کر انھوں نے روزِ آخرت کو بھلائے رکھا اور مزید ظلم یہ کیا کہ جن لوگوں نے اس کی یاد دہانی کی ان کا مذاق اڑانے والے بنے رہے!

أَوْ تَقُولَ لَوْ أَنَّ اللَّهَ هَدَانِي لَكُنتُ مِنَ الْمُتَّقِينَ (۵۷)

یا یہ عذر کریں کہ اگر اللہ نے ہم کو ہدایت دی ہوتی تو ہم اس سے ڈرنے والوں میں سے بنتے۔ مطلب یہ ہے کہ اس طرح کے عذرات کا سدِّ باب کرنے کے لیے اللہ نے اپنی ہدایت نازل فرما دی ہے۔ اب جو لوگ اس سے اعراض کریں گے ان کی گمراہی کی ذمہ داری تمام تر انہی پر ہوگی۔

أَوْ تَقُولَ حِينَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ أَنَّ لِي كَرَّةً فَأَكُونَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ (۵۸)

یا عذاب دیکھنے کے بعد اس تمنا کا اظہار کریں کہ کاش ہمیں پھر دنیا میں جانے کا موقع ملتا کہ ہم خدا کے نیکو کار بندوں میں سے بنتے!

بَلَىٰ قَدْ جَاءَتْكَ آيَاتِي فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنتَ مِنَ الْكَافِرِينَ (۵۹)

یہ اس عذر کا جواب ہے جو آیت ۵۸ میں مذکور ہے کہ اس دن یہ عذر پیش کرنے والوں کو یہ جواب دیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہدایت کے لیے اپنی آیتیں اتاری تھیں لیکن تم نے ان کو جھٹلایا، تکبر کیا اور کافروں میں سے بنے رہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہدایت دینے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ اسے لوگوں کے دلوں میں زبردستی اتار دے بلکہ وہ اپنی تعلیمات سے لوگوں کو آگاہ کرنے کا سامان فرماتا ہے اور یہ چیز وہ لوگوں پر چھوڑتا ہے کہ وہ اس کو اختیار کرتے ہیں یا رد۔ سو یہ کام اللہ نے کر دیا تھا لیکن تم نے اپنے تکبر کے سبب سے اس کی قدر نہیں کی۔

وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَى اللَّهِ وُجُوهُهُم مُّسْوَدَّةٌ ۚ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِينَ (۶۰)

[مشرکین کا انجام] 'كَذَبُوا عَلَى اللَّهِ' سے مراد شرک ہے۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ لو لیں کہ خدا نے فلاں اور فلاں کو اپنا شریک بنایا ہے اور جب اللہ کی طرف سے ان کو تنبیہ کی گئی کہ خدا کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے تو بالکل بے دلیل محض اپنے غرور کی بنا پر اپنی بات کی پچ کی، قیامت کے دن ان کے چہرے ان کے اس غرور کی پاداش میں سیاہ ہوں گے۔

'أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِينَ' یہ سوال کیا ہے کہ کیا ان متکبروں کا ٹھکانا جہنم میں نہ ہوگا؟ مطلب یہ ہے کہ ایسے خود سروں کا سزاوارِ جہنم ہونا تو ایک ایسی واضح بات ہے جس میں کسی کے لیے بھی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ یہ متکبرین سب جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔

وَيُنَجِّي اللَّهُ الَّذِينَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۶۱)

[اللہ سے ڈرنے والوں کا صلہ] متکبرین کے مقابل میں یہ ان لوگوں کا صلہ بیان ہوا ہے جو اللہ سے ڈرنے والے بنے رہے۔ فرمایا کہ اللہ غرور سے پاک بندوں کو ان کے مامن میں پناہ دے گا۔ 'بمفازۃ' میں 'ب' ظرفیہ ہے اور 'مفازۃ' کے معنی 'مامن' اور 'مفلح' کے ہیں جس سے مراد جنت ہے۔ یعنی اس ہول کے دن میں یہ لوگ ایسے

ٹھکانوں میں پہنچا دیے جائیں گے جہاں نہ ان کو کوئی تکلیف پہنچے گی اور نہ ان کو کسی بات کا غم ہوگا۔ وہ ماضی کے تمام پچھتاووں اور مستقبل کے تمام اندیشوں سے بالکل محفوظ ہوں گے۔

اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۙ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۶۲-۶۳)

خلاصۂ بحث

یہ اوپر کی ساری بحث کا خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے کہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہ اپنی دنیا پیدا کر کے اس کو چھوڑ نہیں بیٹھا ہے، بلکہ وہی ہر چیز کا نگہبان بھی ہے اس وجہ سے بندوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ آسمانوں اور زمین کے تمام خزانوں کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں۔ بندوں کو جو کچھ بھی آسمان اور زمین سے حاصل ہوتا ہے سب اسی کی بخشش سے حاصل ہوتا ہے اور آخرت میں بھی جو کچھ حاصل ہو گا اسی کی عنایت سے حاصل ہوگا۔ جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا اور اپنے شرک پر جمے ہوئے ہیں وہی خسارے میں پڑنے والے ہیں۔ ان کی اس حماقت کا وبال انہی پر پڑے گا، کسی دوسرے پر نہیں پڑے گا۔

۱۰۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۶۴-۷۵

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے پہلے اعلان کرایا ہے کہ نادانو! کیا ان واضح حقائق کے بعد بھی تم مجھے اللہ کے سوا دوسروں کی عبادت کا حکم دیتے ہو۔ حالانکہ اللہ نے تمام نبیوں پر یہی وحی نازل فرمائی ہے کہ جو اللہ کا شریک بنائے گا اس کے تمام اعمال حبط ہو جائیں گے۔ اس کے بعد یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ ان جاہلوں نے خدا کی شان بالکل نہیں سمجھی کہ ایسی چیزوں کو اس کی خدائی میں شریک بنائے بیٹھے ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور ان کے بل پر آخرت سے بالکل بےفکر ہیں۔ خدا کی عظمت کا حال تو یہ ہے کہ وہ ایک دن آسمان و زمین سب کی بساط اپنے ہاتھ میں لپیٹ لے گا اور جب اس کا صور پھونکا جائے گا تو آسمان و زمین میں جو بھی ہیں سب بے ہوش ہو جائیں گے اور پھر جب دوسری بار صور پھونکا جائے گا تو سب اٹھ کھڑے ہوں گے اور زمین خدا کے نور سے چمک اٹھے گی۔ اس وقت لوگوں کے اعمال کا دفتر کھلے گا۔ نبیوں اور گواہوں کی طلبی ہوگی اور لوگوں کے درمیان بالکل انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد اہل جنت اور اہل دوزخ کے احوال کی تفصیل سنائی ہے تاکہ جو لوگ اپنے شرکاء و شفعاء کے بل پر لذیذ خواب دیکھ رہے ہیں ان کی آنکھیں کھلیں ——— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۶۴-۷۵

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ۝ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ

وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۵﴾ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۶﴾
وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۷﴾
وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ
شَآءَ اللّٰهُ ۭ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ﴿۶۸﴾ وَ
اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ
وَالشُّهَدَاۗءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۶۹﴾ وَوُفِّيَتْ
كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ ع
كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ
لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ
وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَاۗءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ
عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۱﴾ قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ
مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۷۲﴾ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ
زُمَرًا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا
سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ﴿۷۳﴾ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ
الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ
نَشَاۗءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۷۴﴾ وَتَرَى الْمَلٰۗىِٕكَةَ حَاۗفِّيْنَ مِنْ
حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ

ع۸ ۱۷ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۵﴾

ترجمہ آیات ۶۴-۷۵

کہو، اے نادانو! کیا پھر بھی تم مجھے غیر اللہ کی عبادت کا حکم دیتے ہو! درآنحالیکہ تمہاری طرف بھی اور تم سے پہلے والوں کی طرف بھی یہ وحی بھیجی جا چکی ہے کہ اگر تم شرک کرو گے تو تمہارے عمل ڈھے جائیں گے اور تم نامرادوں میں سے ہو کر رہ جاؤ گے۔ بلکہ صرف اللہ ہی کی عبادت کرو اور اسی کے شکرگزاروں میں سے بنو۔ ۶۴-۶۶

اور ان لوگوں نے خدا کی صحیح قدر نہیں جانی! زمین ساری اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور آسمانوں کی بساط بھی اس کے ہاتھ میں لپٹی ہوئی ہوگی۔ وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک بناتے ہیں۔ اور صُور پھونکا جائے تو آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب بے ہوش ہو کے گر پڑیں گے مگر جن کو اللہ چاہے۔ پھر دوبارہ اس میں پھونکا جائے گا تو دفعتہً وہ کھڑے ہو کر تکنے لگیں گے۔ اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی اور رجسٹر رکھا جائے گا اور انبیاء اور گواہ حاضر کیے جائیں گے اور لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اور ہر جان کو جو کچھ اس نے کیا ہوگا پورا کیا جائے گا۔ اور وہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔ ۶۷-۷۰

اور جن لوگوں نے کفر کیا ہوگا وہ گروہ در گروہ جہنم کی طرف ہانک کرلے جائے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس حاضر ہوں گے اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور اس کے داروغے ان سے پوچھیں گے کہ کیا تمہارے پاس تمہی میں سے رسول تمہارے رب کی آیتیں سناتے اور اس دن کی ملاقات سے ڈراتے نہیں آئے! وہ کہیں گے ہاں، آئے تو سہی، پر کافروں پر کلمۂ عذاب پورا ہو کر رہا۔ کہا جائے گا، جہنم کے دروازوں میں داخل

ہو جاؤ، اس میں ہمیشہ رہنے کے لیے۔ پس کیا ہی برا ٹھکانا ہے متکبروں کا! ۷۱-۷۲،

اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے رہے وہ گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جائے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آئیں گے اور اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور اس کے پاسبان ان سے کہیں گے، السلام علیکم، شاد رہو! پس اس میں داخل ہو جاؤ ہمیشہ کے لیے اور وہ کہیں گے شکر ہے اس اللہ کے لیے جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہم کو ارضِ جنت کا وارث بنایا، ہم جنت میں جہاں چاہیں براجمان ہوں پس کیا ہی خوب صلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کا! ۷۳-۷۴،

اور تم فرشتوں کو دیکھو گے عرشِ الٰہی کے گرد گھیرے ہوئے، اپنے رب کی تسبیح، اس کی حمد کے ساتھ کرتے ہوئے۔ اور لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ شکر کا سزاوار اللہ ہے، عالم کا خداوند! ۷۵،

۱۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ (۶۴)

بانداز اعلان براءت ایک سوال

'جاھل' اس کو کہتے ہیں جو علم اور عقل کے بجائے جذبات اور خواہشوں کی پیروی کرتا ہے۔ فرمایا کہ ان جاہلوں سے پوچھو کہ تمام دلائل و شواہد تو اس بات کے حق میں ہیں کہ ہر چیز کا خالق اللہ ہے اور اسی کے قبضہ میں تمام آسمانوں اور زمین کی کنجیاں ہیں تو کیا پھر بھی تم لوگ مجھ سے اس بات کے لیے ضد کرتے رہو گے کہ میں اللہ کے سوا دوسری چیزوں کی عبادت کروں؛ اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ مشرکین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے معبودوں سے ڈراتے تھے کہ اگر آپ نے دینِ آبائی کی مخالفت نہ چھوڑی تو ان کے معبودوں کے عتاب میں آ جائیں گے۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان سے باندازِ اعلانِ براءت سوال کیا گیا ہے کہ کیا ان واضح حقائق کے بعد بھی تم لوگ مجھ سے یہ مطالبہ کرتے رہو گے کہ میں تمہارے بتوں کا پجاری بن جاؤں؟

وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ

الْخٰسِرِيْنَ ۝ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ (۶۵-۶۶)

شرک سے تمام اعمال حبط ہو جاتے ہیں

یہ ان لوگوں کو جواب دیا ہے اور چونکہ ان کی بات بالکل جاہلوں کی بات تھی اس وجہ سے ان کو خطاب نہیں کیا بلکہ اپنے پیغمبر کو خطاب کر کے ان کو بات سنا دی۔ فرمایا کہ یہ جاہل لوگ تم سے شرک کے لیے ضد کر رہے ہیں حالانکہ تمہاری طرف بھی اور تم سے پہلے بھی جو نبی و رسول گزرے ہیں ان سب کی طرف یہ وحی ہو چکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے عمل حبط ہو جائیں گے اور تم نامرادوں میں سے ہو کر رہ جاؤ گے۔ فلاح کی راہ صرف یہ ہے کہ اللہ ہی کی بندگی کرو اور اس کے شکر گزار بندوں میں سے بنو۔

'حبط عمل' سے مراد یہ ہے کہ شرک کے ساتھ جو عمل اللہ کے لیے بھی کیے جاتے ہیں وہ بھی سب ضائع اور لاحاصل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی مشرک کے عمل کو قبول نہیں فرماتا۔ وہ صرف اپنے ان بندوں کی نیکیاں قبول فرماتا ہے جو کسی کو اس کا شریک نہیں بناتے۔

'بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ' یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کا جو حق اس کے ہر بندے پر واجب ہے وہ صرف اسی صورت میں ادا ہوتا ہے جب بندہ صرف اللہ ہی کی بندگی کرتا ہے۔ اگر اس بندگی میں وہ کسی اور کو بھی ساجھی بنا دیتا ہے تو وہ اپنے رب کا شکر گزار نہیں رہ جاتا بلکہ ناشکرا بن جاتا ہے اور اس کی ساری دینداری کی بنیاد ہی ڈھے جاتی ہے۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۶۷)

خدا کی شان سے بے خبری

یعنی ان جاہلوں نے اپنے مزعومہ شریکوں کو جو خدا کے برابر لا بٹھایا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے خدا کی شان اور اس کی عظمت بالکل نہیں پہچانی ہے۔ انھوں نے خدا کو اپنے محدود پیمانوں سے ناپا ہے اس وجہ سے ذرہ اور آفتاب، قطرہ اور سمندر میں وہ امتیاز نہ کر سکے۔ ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ پوری زمین قیامت کے دن خدا کی مٹھی میں ایک مشتِ خاک کے برابر اور تمام آسمانوں کی بساط اس کے ہاتھ میں لپٹی ہوئی ہوگی۔ ایسی عظیم ہستی کے ساتھ ان کی ان دیویوں دیوتاؤں کا کیا جوڑ کہ یہ اس کی کائنات میں شریک و سہیم بن جائیں اور وہ ان کی مدد کا محتاج ہو! 'قبضۃ' اتنی چیز کو کہتے ہیں جو ایک بار میں مٹھی میں اٹھا لی جائے۔

'سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ' یعنی اللہ تعالیٰ کی عظیم ذات ان چیزوں سے پاک اور بلند ہے جن کو یہ جاہل لوگ اس کا شریک بنائے ہوئے ہیں۔ یہ نسبتیں اس کی پاکی و تقدس کے بھی منافی ہیں اور اس کی عظمت و کبریائی کے بھی۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۭ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ (۶۸)

یہ اسی مضمون کی مزید توسیع ہے کہ یہ مشرکین اپنے معبودوں سے متعلق یہ فرض کیے ہوئے بیٹھے ہیں کہ ان کو اللہ کے ہاں بڑا تقرب حاصل ہے، وہ اپنے پجاریوں کے لیے یہ یہ کریں گے اور خدا نے ان پر ہاتھ ڈالا تو اپنے زور واثر سے ان کو چھڑا لیں گے حالانکہ قیامت کے دن ساری خدائی کا یہ حال ہو گا کہ جب پہلی بار صور پھونکا جائے گا تو سب بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے۔ صرف وہی لوگ اس سے محفوظ رہیں گے جن کو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھنا چاہے گا۔ پھر دوسرا صُور پھونکا جائے گا تو سب اٹھ کھڑے ہوں گے اور وہ حیرت سے تاکتے ہوں گے ــــ مطلب یہ ہے کہ جس دن کی ہولناکی کا یہ عالم ہے اس دن کس کی مجال ہے کہ خدا کے آگے ناز و تدلل کے ساتھ بڑھ کر کسی کی وکالت یا سفارش کر سکے اور جس خدا کی عظمت کا یہ حال ہے کہ اس کے ایک نفخۂ صور سے ساری خدائی بے ہوش اور پھر ساری خدائی بیدار ہو گی، کون ہے جو اس کا ہم سر بننے کا مدعی ہو سکے!

قیامت کے دن کی بے بسی

'اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ' کے استثناء سے یہ بات نکلتی ہے کہ کچھ لوگ اس دن اس عام بے ہوشی سے محفوظ رہیں گے۔ یہ کون لوگ ہوں گے؟ اس کا کوئی قطعی جواب دینا مشکل ہے۔ البتہ آگے کی آیت ۷۵ سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ جو ملائکہ عرشِ الٰہی کے اردگرد اس کی حمد و تسبیح میں مصروف ہوں گے وہ اس سے محفوظ رہیں گے۔ یہ محض ایک اشارہ ہے اس پر مجھے جزم نہیں ہے۔ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے اس اشارے کے بعض قرائن کی طرف توجہ دلاؤں گا۔

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِایْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۶۹)

نئی زمین کے نئے قوانین

'الارض' سے مراد وہ زمین ہے جو نئے نوامیس و قوانین کے ساتھ قیامت کے دن ظہور میں آئے گی۔ آیت 'يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ' (ابراھیم: ۴۸) میں اسی کا ذکر ہے۔ ہماری یہ زمین سورج کی روشنی سے روشن ہوتی ہے اس وجہ سے اس میں ہمارا مشاہدہ صرف محسوسات و مرئیات تک محدود ہے لیکن وہ زمین اللہ کے نور سے روشن ہو گی اس وجہ سے اس میں تمام معانی و حقائق بھی لوگوں کے سامنے آ جائیں گے۔ اس نور کی حقیقت و نوعیت یہاں واضح نہیں فرمائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی کمیت و کیفیت کی تعبیر سے ہماری زبان قاصر ہے۔ لیکن اس کے اثرات کی طرف قرآن نے جگہ جگہ اشارہ فرمایا ہے۔ مثلاً سورۂ قٓ میں ہے 'لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ' (۲۲) (تم اس سے غفلت میں پڑے رہے تو ہم نے تمہارے سامنے سے پردہ ہٹا دیا تو آج تمہاری نظر بہت تیز ہے) اس سے معلوم ہوا کہ آج جن حقائق کے مشاہدہ سے لوگوں کی نگاہیں قاصر ہیں اس زمین میں ان کے مشاہدہ کے لیے بھی تمام حجابات دور ہو جائیں گے۔ اسی طرح دوسرے مقام میں فرمایا ہے: 'وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۙ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۚ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۙ بِاَنَّ رَبَّكَ

اَوْحٰی لَهَا (الزلزال: ۲-۵) (اور زمین اپنے سارے بوجھ ظاہر کر دے گی اور انسان کہے گا، اسے اس کو کیا ہو گیا! اس دن وہ اپنی ساری سرگزشتیں سنائے گی بوجہ اس کے کہ اس کے رب نے اس کو وحی کی ہو گی) اگرچہ یہ حقائق آج بھی اہل بصیرت سے مخفی نہیں ہیں لیکن جن آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں وہ ان کو نہیں دیکھ سکتیں لیکن اس دن اللہ تعالیٰ کی روشنی سے وہ اس طرح جگمگا اٹھیں گے کہ وہ لوگ بھی ان کو دیکھ اور سن لیں گے جو آج ان سے اندھے اور بہرے بنے ہوئے ہیں۔

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِایْٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ

یہ اسی نورِ رب کے ظہور کے اثرات کی طرف اشارہ ہے کہ جس جزا اور سزا سے لوگوں کو ڈرایا جا رہا ہے، لیکن لوگوں کی سمجھ میں بات نہیں آ رہی ہے، اس دن اس حقیقت سے پردہ اٹھ جائے گا۔ کتاب سامنے رکھی جائے گی۔ کتاب سے مراد قرینہ دلیل ہے کہ لوگوں کے اعمال کا دفتر ہے۔ انبیاء اور گواہوں کی پیشی کا ذکر قرآن کے دوسرے مقامات میں تفصیل سے ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام سے اس دن ان کی امتوں کے مقابل میں گواہی دلوائے گا کہ انھوں نے لوگوں کو کیا تعلیم دی اور لوگوں نے اس کا کیا جواب دیا۔ سورۂ مائدہ میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ لفظ 'شُهَدَاء' میں وسعت و عمومیت ہے۔ یعنی وہ لوگ بھی طلب ہوں گے جو کسی معاملے میں گواہی دینے کی پوزیشن میں ہوں گے خواہ وہ انسانوں میں سے ہوں یا فرشتوں میں سے۔ اس امت کی حیثیت چونکہ 'شُهَدَاءَ اللّٰهِ فِی الْاَرْضِ' کی ہے اس وجہ سے اس کے مجددین و صدیقین بھی طلب ہوں گے اور ان سے پوچھا جائے گا کہ انھوں نے لوگوں کو کیا بتایا اور سکھایا اور لوگوں نے اس کا کیا جواب دیا؟ اس عدالت و شہادت اور اس طلبی و روبکاری کے بعد لوگوں کے درمیان بالکل انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور کسی کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی نہیں کی جائے گی۔

وَوُفِّیَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا یَفْعَلُوْنَ (۷۰)

یہ 'وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ' کی وضاحت ہے کہ ہر ایک کو وہی دیا جائے گا جو اس نے کیا ہو گا اور پورا پورا دیا جائے گا۔ اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کی جائے گی اس وجہ سے کسی ناانصافی کا کوئی سوال نہیں ہے۔ ہر ایک اپنی ہی بوئی ہوئی فصل کاٹے گا اور اپنے ہی لگائے ہوئے درخت کا پھل چکھے گا۔ 'وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا یَفْعَلُوْنَ' اور اس کا بھی کوئی امکان نہیں ہے کہ خدا کسی کا کوئی عمل بھول جائے۔ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں وہ اس سے اچھی طرح واقف ہے اور ہر چیز اس کے جامع رجسٹر میں درج ہے۔

اس ساری تفصیل سے مدعا مشرکین کی آنکھیں کھولنا ہے کہ وہ کیا آرزوئیں لیے بیٹھے ہیں اور اصل حقیقت کیا ہے جس سے سب کو لازماً دوچار ہونا ہے۔

وَسِیْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰی جَهَنَّمَ زُمَرًا ۭ حَتّٰٓی اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ یَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یَتْلُوْنَ عَلَیْكُمْ اٰیٰتِ رَبِّكُمْ وَیُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ

هٰذَا ۭ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۷۱)

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا سے مراد وہی مشرکین ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ شرک، جیسا کہ اس کے محل میں ہم وضاحت کر چکے ہیں، کفر ہے۔ اس لیے خدا کو ماننا صرف وہ معتبر ہے جو توحید خالص کے ساتھ ہو۔ اگر اس میں شرک کی آمیزش ہو جائے تو پھر یہ کفر ہی کے حکم میں داخل ہے۔

عدالت و شہادت کے بعد کفار کا انجام

اوپر کی آیت میں جس عدالت و شہادت کا ذکر ہوا ہے یہ اس کا انجام بیان ہو رہا ہے کہ اس کے بعد وہ سارے لوگ جنھوں نے کفر کیا ہو گا گروہ در گروہ جہنم کی طرف ہانک کر لے جائے جائیں گے۔ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے ان کے لیے کھول دیے جائیں گے۔ دوسرے مقام میں یہ تصریح ہے کہ اس کے سات دروازے ہوں گے اور ہر دروازے سے داخل ہونے والے اپنے جرائم کی حیثیت و نوعیت کے اعتبار سے الگ الگ حصوں میں تقسیم ہوں گے۔

وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ ...... الاٰیۃ: ان شامت زدوں کو دیکھ کر جہنم کے داروغے ان کو ملامت کریں گے کہ بدبختو، کیا تم کو اس دن کی ہولناکی سے آگاہ کرنے کے لیے تمھارے پاس رسول نہیں آئے تھے کہ تم نے یہ شامت بلائی! وہ اپنے جرم کا اقرار کریں گے کہ رسول آئے تو ضرور لیکن ہماری بدبختی کے سبب سے اللہ کا فیصلۂ عذاب، جو کافروں کے باب میں ہو چکا تھا، وہ پورا ہو کے رہا۔ كَلِمَةُ الْعَذَابِ سے مراد، جیسا کہ اس کے محل میں وضاحت ہو چکی ہے، اللہ تعالیٰ کا وہ کلی فیصلہ ہے جو اس نے ابلیس کے چیلنج کے جواب میں اس کو سنا دیا تھا کہ جو تیری پیروی کریں گے میں تجھ کو اور ان سب کو جہنم میں بھر دوں گا۔ یہاں صرف اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کا حوالہ ہے۔ دوسرے مقامات میں یہ تفصیل بھی ہے کہ وہ نہایت واضح الفاظ میں اپنے جرم کا اقرار بھی کریں گے۔ سورۂ ملک میں ہے: كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَاۗءَنَا نَذِيْرٌ ڏ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ښ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۝ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (۸-۱۰) (جب جب ان کی کوئی بھیڑ جہنم میں جھونکی جائے گی اس کے داروغے ان سے سوال کریں گے کہ کیا تمھارے پاس کوئی آگاہ کرنے والا نہیں آیا تھا؟ وہ جواب دیں گے کہ ایک آگاہ کرنے والا آیا تو سہی لیکن ہم نے اس کو جھٹلا دیا اور کہہ دیا کہ خدا نے کوئی چیز بھی نہیں اتاری ہے، تم لوگ بس ایک بہت بڑی گمراہی میں ہو اور وہ اعتراف کریں گے کہ اگر ہم سننے اور سمجھنے والے ہوتے تو دوزخ والوں میں سے نہ بنتے)۔

قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ (۷۲)

ان کے اس جواب کے بعد ان سے کہا جائے گا کہ اب جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ اور یہ داخل ہونا ابدی ہے۔

کلمۂ شکر جاری ہو جائے گا کہ اس اللہ کے لیے شکر ہے جس نے ہم سے اپنے تمام وعدے پورے کیے اور ہم کو ارضِ جنت کا وارث بنایا، ہم اس میں جہاں چاہیں فروکش ہوں۔ 'وارث بنانے' میں ایک لطیف تلمیح اس بات کی طرف ہے کہ یہ جنت ہمارے باپ آدم کو ملی تھی لیکن شیطان نے ان کو ورغلا کر اس سے محروم کر دیا تھا اور اس کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ شرط ٹھہرائی تھی کہ اولادِ آدم دنیا میں جا کر شیطان سے مقابلہ کرے تو جو شیطان سے جیت جائیں گے وہ اس جنت کے وارث ٹھہریں گے اور جو شیطان کے فتنوں میں پھنس جائیں گے وہ شیطان کے ساتھ دوزخ میں پڑیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس امتحان میں ہم کو کامیابی حاصل ہوئی اور ہم نے اپنے باپ کی کھوئی ہوئی جنت پھر حاصل کر لی۔

نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ نَشَآءُ: اہلِ جنت کے باب میں جس طرح پیچھے یہ بات گزر چکی ہے کہ ان کو وہ سب کچھ حاصل ہو گا جو وہ چاہیں گے اسی طرح یہ بات بھی ان کے باب میں ارشاد ہوئی ہے کہ وہ جنت میں جہاں چاہیں گے پورے اختیار و اقتدار کے ساتھ فروکش ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہاں کسی کی خواہشوں اور ارادوں میں مزاحم ہونے والی کوئی چیز نہیں ہو گی۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جس کا اس جہان میں کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی حقیقت اسی وقت سمجھ میں آئے گی جب وہ نیا جہان نئے نوامیس و قوانین کے ساتھ اور انسان اپنی نئی قوتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ ظہور میں آئے گا اور یہ زمین سورج کے بجائے اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔

فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ: یہ ٹکڑا بالکل فَبِئْسَ مَثْوَی الْمُتَكَبِّرِیْنَ کے مقابل میں ہے۔ اس تقابل کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہاں 'خاشعین' یا 'متقین' یا ان کے ہم معنی کوئی لفظ ہوتا لیکن اس سے صرف تقابل کا حق ادا ہوتا، معنی میں کوئی خاص اضافہ نہ ہوتا۔ لفظ 'عاملین' سے معنی میں یہ اضافہ ہو گیا ہے کہ جنت کے حصول کے لیے اصل شے عمل ہے، جو لوگ فرضی سفارشوں کے بل پر جنت کے خواب دیکھ رہے ہیں وہ جنت الحمقاء میں بس رہے ہیں۔

وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِیْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۷۵)

آیت ۷۵ کا مطلب، حاملینِ عرش فرشتوں کا حال

قرینہ دلیل ہے کہ یہ آیت اوپر آیت ۶۹ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا ... الآیۃ سے متصل ہے اور ملائکہ سے مراد حاملینِ عرش اور ان کے زمرہ کے ملائکہ ہیں، جیسا کہ حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ کے الفاظ سے نمایاں ہو رہا ہے۔ ان کا ذکر آگے والی سورہ —— سورۂ مومن —— میں ان الفاظ سے آیا ہے: اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِیْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ (۷) (جو عرش کو اٹھائے ہوئے اور جو اس کے ارد گرد ہیں وہ اپنے رب کی، اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ ایمان والوں کے لیے استغفار کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار، تیرا علم اور تیری رحمت ہر چیز کو محیط ہے تو ان لوگوں کی مغفرت فرما جنھوں نے توبہ کر لی ہے اور تیری راہ کے پیرو بن گئے ہیں اور ان کو عذابِ جہنم سے بچا)۔

اس شہادت وعدالت کے دن فرشتوں کا جو حال ہوگا یہ اس کا ذکر ہے تاکہ مشرکین پر، جن کا سارا اعتماد فرشتوں کی سفارش ہی پر ہے، یہ واضح ہو جائے کہ اس دن کے ہول سے وہ بھی ہراساں اور عرش کے پاس سمٹے ہوئے اپنے رب کی تسبیح میں مشغول ہوں گے۔ واضح رہے کہ یہ حال ان فرشتوں کا بیان ہو رہا ہے جن کی حیثیت حاملینِ عرشِ الٰہی کی ہے۔ پھر ان عام فرشتوں کا کیا حال ہوگا جن کا یہ مرتبہ نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بڑے سے بڑے فرشتوں کو بھی اس دن اپنی پڑی ہوگی وہ دوسروں کے قضیے بھلا کیا نبیڑیں گے!

وَقُضِیَ بَیْنَہُمْ بِالْحَقِّ یعنی لوگوں کے درمیان بالکل حق وعدل کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے گا، نہ کسی کی مداخلت وسفارش کی نوبت آئے گی اور نہ کوئی مداخلت کی جرأت کر سکے گا۔

وَقِیْلَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ یعنی اس کامل عدل ورحمت کے ظہور کے بعد ہر گوشے سے یہ صدا بلند ہوگی کہ شکر کا سزاوار ہے اللہ، عالم کا خداوند! یعنی اہلِ ایمان بھی یہ صدا بلند کریں گے اور حاملینِ عرش ملائکہ بھی ان کی ہم نوائی کریں گے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو جو چیز سزاوارِ حمد وشکر بناتی ہے وہ اس کا عدل اور نیک و بد کے درمیان اس کا فرق وامتیاز ہے۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو یہ دنیا ایک اندھیر نگری ہے اور ایک اندھیر نگری کے خالق کو کوئی حمد وشکر کا سزاوار نہیں مان سکتا۔ قیامت کے دن جب اس کے کامل عدل اور اس کی کامل رحمت کا ظہور ہوگا تب ہر ایک کا تردد دور ہو جائے گا اور ہر گوشے سے اس کی حمد کا ترانہ بلند ہوگا۔ گویا جس صبحِ حمد کے لوگ انتظار میں تھے وہ طلوع ہو گئی اور یہ جہان خدا کے نور سے جگمگا اٹھا!

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر اللہ تعالیٰ کی عنایت سے تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

رحمان آباد

۲۴ جون ۱۹۷۵ء

'فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ'۔ 'مُتَكَبِّرِيْنَ' سے ظاہر ہے کہ وہی لوگ مراد ہیں جن کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ اس صفت سے ان کے اصل سببِ اعراض و انکار پر روشنی پڑتی ہے کہ انھوں نے محض پرنائے تکبّر حق سے اعراض کیا اور اس ٹھکانے کے سزاوار ٹھہرے جو متکبرین کے لیے خاص ہے۔

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ (۷۳)

متقین کا انجام

لفظ 'سَوْق' کسی چیز کو کسی چیز کی طرف ہانک کرلے جانے کے معنی میں آتا ہے۔ یہ اچھے اور برے دونوں محل میں استعمال ہو سکتا ہے۔ سازگار ہوائیں ابرِ رحمت کو مرغزاروں اور چمنستانوں کی طرف لے جاتی ہیں تو اس کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اور اہلِ دوزخ جہنم کی طرف جو ہانک کر لے جائے جائیں گے اس کے لیے بھی یہ اوپر والی آیت میں استعمال ہوا ہے۔ اس آیت میں یہ اچھے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس لیے کہ ان کے آگے اور پیچھے اور دہنے بائیں ہر طرف سے خدا کے فرشتے ہوں گے جو اپنے جلو اور اپنی رہنمائی و حفاظت میں ان کو جنت کی طرف لے جائیں گے۔

اس آیت میں جوابِ شرط محذوف ہے۔ اس کی مثال سورۂ صافّات کی آیات ۱۰۳-۱۰۵ میں گزر چکی ہے۔ وہاں ہم نے اس کے موقع و محل اور اس کی بلاغت پر گفتگو کی ہے۔ بعض اوقات جوابِ شرط کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ الفاظ اس کی تعبیر سے قاصر ہوتے ہیں۔ ایسے مواقع میں اس کو حذف کر دیتے ہیں کہ ع۔

خموشی معنیٔ دارد کہ در گفتن نمی آید

'طِبْتُمْ' خیر مقدم کے کلمات میں سے ہے جس طرح ہم کہتے ہیں خوش رہو، شاد و آباد رہو، پھلو پھولو! 'اَلَّذِيْنَ اتَّقَوْا' یہاں 'اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا' کے مقابل میں استعمال ہوا ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ ان کے اندر 'تقوٰی' موجود تھا اس وجہ سے یہ تکبّر میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ اللہ کے رسولوں کی بات انھوں نے سنی اور مانی۔ فرمایا کہ یہ لوگ ملائکہ کے جلو میں جنت کی طرف لے جائے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جب اس کے دروازے ان کے لیے کھول دیے جائیں گے اور اس کے پاسبان ان کا سلام و تحیت کے ساتھ خیر مقدم کریں ...... تب ان کو جو کچھ حاصل ہوگا اس کا اندازہ آج کون کر سکتا ہے! لَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ!

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ (۷۴)

جنت کی وراثت

'الارض' سے مراد یہاں وہی 'ارضِ جنت' ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۶۹ میں گزر چکا ہے۔ اس آیت میں اس کے 'ارضِ جنت' ہونے کی تصریح ہو گئی ہے۔ اہلِ جنت جب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے جو وعدے کیے تھے وہ ایک ایک کر کے سب پورے کر دیے تو ان کی زبان پر بے ساختہ

هٰذَا ۚ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۷۱)

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے مراد وہی مشرکین ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آرہا ہے۔ شرک، جیسا کہ اس کے محل میں ہم وضاحت کر چکے ہیں، کفر ہے۔ اس لیے خدا کو ماننا صرف وہ معتبر ہے جو توحید خالص کے ساتھ ہو۔ اگر اس میں شرک کی آمیزش ہو جائے تو پھر یہ کفر ہی کے حکم میں داخل ہے۔

عدالت و شہادت کے بعد کفار کا انجام

اوپر کی آیت میں جس عدالت و شہادت کا ذکر ہوا ہے یہ اس کا انجام بیان ہو رہا ہے کہ اس کے بعد وہ سارے لوگ جنھوں نے کفر کیا ہو گا گروہ در گروہ جہنم کی طرف ہانک کر لے جائے جائیں گے۔ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے ان کے لیے کھول دیے جائیں گے۔ دوسرے مقام میں یہ تصریح ہے کہ اس کے سات دروازے ہوں گے اور ہر دروازے سے داخل ہونے والے اپنے جرائم کی حیثیت و نوعیت کے اعتبار سے الگ الگ حصوں میں تقسیم ہوں گے۔

وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا ...... الاٰیۃ: ان شامت زدوں کو دیکھ کر جہنم کے داروغے ان کو ملامت کریں گے کہ بدبختو! کیا تم کو اس دن کی ہولناکی سے آگاہ کرنے کے لیے تمھارے پاس رسول نہیں آئے تھے کہ تم نے یہ شامت بلائی! وہ اپنے جرم کا اقرار کریں گے کہ رسول آئے تو ضرور لیکن ہماری بدبختی کے سبب سے اللہ کا فیصلۂ عذاب، جو کافروں کے باب میں ہو چکا تھا، وہ پورا ہو کے رہا۔ کَلِمَةُ الْعَذَابِ سے مراد، جیسا کہ اس کے محل میں وضاحت ہو چکی ہے، اللہ تعالیٰ کا وہ کلی فیصلہ ہے جو اس نے ابلیس کے چیلنج کے جواب میں اس کو سنا دیا تھا کہ جو تیری پیروی کریں گے میں تجھ کو اور ان سب کو جہنم میں بھر دوں گا۔ یہاں صرف اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کا حوالہ ہے۔ دوسرے مقامات میں یہ تفصیل بھی ہے کہ وہ نہایت واضح الفاظ میں اپنے جرم کا اقرار بھی کریں گے۔ سورۂ ملک میں ہے: كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۝ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (۸-۱۰) (جب جب ان کی کوئی بھیڑ جہنم میں جھونکی جائے گی، اس کے داروغے ان سے سوال کریں گے کہ کیا تمھارے پاس کوئی آگاہ کرنے والا نہیں آیا تھا؟ وہ جواب دیں گے کہ ایک آگاہ کرنے والا آیا تو سہی لیکن ہم نے اس کو جھٹلا دیا اور کہہ دیا کہ خدا نے کوئی چیز بھی نہیں اتاری ہے، تم لوگ بس ایک بہت بڑی گمراہی میں ہو اور وہ اعتراف کریں گے کہ اگر ہم سننے اور سمجھنے والے ہوتے تو دوزخ والوں میں سے نہ بنتے)۔

قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ (۷۲)

ان کے اس جواب کے بعد ان سے کہا جائے گا کہ اب جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ اور یہ داخل ہونا ابدی ہے۔